مطالب القرآن

فی

دروس الفرقان

— سورۃ البقرہ (جلد ۱) —

علامہ غلام احمد پرویزؒ کے دیے گئے دروسِ قرآن

قرآنِ مجید کی تفسیر خود قرآنِ مجید سے

مدیر: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق

ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ 25 بی گلبرگ 2 لاہور

مطالب القرآن

فی

دروس الفرقان

سورۃ البقرہ (جلد 1)

علامہ غلام احمد پرویزؒ کے دیے گئے دروسِ قرآن

قرآنِ مجید کی تفسیر خود قرآنِ مجید سے

مدیر: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق

ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ 25 بی گلبرگ 2 لاہور

جملہ حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب	....	مطالب القرآن فی دروس الفرقان
دروس	....	از: جناب غلام احمد پرویز رحمۃ اللہ علیہ
ناشر	....	بزمِ طلوع اسلام، لاہور
زیر اہتمام	....	ادارہ طلوع اسلام 25 بی 2 گلبرگ، لاہور
	....	فون نمبر 5714546-5753666
ایڈیشن اول	....	مئی 2009ء
مطبع	....	باقر پرنٹنگ پریس، لاہور

ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ کی طرف سے شائع کردہ لٹریچر کی جملہ آمدنی قرآنی فکر کو عام کرنے پر صرف ہوتی ہے۔

سرٹیفیکیٹ تصحیح

سورۃ البقرۃ

میں نے اس سورت کے متن کو امعانِ نظر سے پڑھا ہے۔

الحمدللہ یہ ہر قسم کی اغلاط سے پاک ہے۔

لہٰذا تصدیق کی جاتی ہے کہ ان کے متن میں کوئی غلط نہیں ہے۔

انتساب

رسالت مآب خاتم النبیین ﷺ کے نام

جو کافۃ للناس اور رحمۃ للعالمین بن کر آیا اور اپنے ساتھ وہ نظام عدل وحریت لایا جو انسان کو دنیا بھر کی غلامی سے آزادی دلانے کا کفیل تھا۔ یہ پیغام کوئی انوکھا پیغام اور یہ تعلیم کوئی نئی تعلیم نہ تھی۔ صداقت جہاں کہیں بھی تھی اُسی کتاب مبین کا کوئی نہ کوئی ورق تھی جو محمد ﷺ کی وساطت سے دنیا کو ملی۔ روشنی جس مقام میں بھی تھی وہ اسی قندیلِ آسمانی کی کوئی نہ کوئی کرن تھی جو قلبِ نبوی ﷺ میں اتاری گئی۔ شامِ جاں نواز نے جہاں کہیں بھی عطر بیزی وعنبر فشانی کی وہ لالہ و یاسمین کی ان ہی پتیوں کی رہینِ منت تھی جن کا گلدستہ اس نبی آخر الزمان ﷺ کے مقدس ہاتھوں محراب کعبہ میں رکھا گیا۔ پیغام محمدی ﷺ کیا ہے؟ ان ہی اوراق کی شیرازہ بندی جنہیں حوادثِ ارضی وسماوی کی تیز آندھیوں نے صحنِ کائنات میں اِدھر اُدھر بکھیر دیا تھا۔ اور مقام محمدی ﷺ کیا ہے؟ ان ہی درخشندہ وتابندہ ذراتِ نادرہ کا پیکرِ حُسن وزیبائی جن کی حقیقی آب وتاب کو ان کے ستائش گروں کی غلو آمیز عقیدت کی رنگینیوں نے مستور کر رکھا تھا۔ وہاں یہ جو ہر الگ الگ پڑے تھے' یہاں یہ پیکرِ جلال و جمال ان سب کا حسین مجموعہ تھا۔ وہاں یہ الفاظ بکھرے ہوئے تھے' یہاں ایک ایسے عدیم النظیر مصرعہ میں آب وتاب سے موزوں ہوگئے تھے جو ضمیرِ کائنات میں قرنہا قرن سے پہلو بدل رہا تھا۔ وہ موتی تھے' یہ مالا تھی۔ وہ پتیاں تھیں' یہ پھول تھا۔ وہ ذرے تھے' یہ چٹان تھی۔ وہ قطرے تھے' یہ سمندر تھا۔ وہ ستارے تھے' یہ کہکشاں تھی۔ وہ افراد تھے' یہ ملت تھی۔ وہ نقطے تھے' یہ خطِ مستقیم تھا۔ وہ ابتداء تھی' یہ انتہا تھا۔

خلق و تقدیر و ہدایت ابتداست
رحمۃ للعالمینیؐ انتہا ست

خدائے جلیل نے اپنے بندوں سے جو کچھ کہنا تھا آخری مرتبہ کہہ دیا۔ شرفِ انسانیت کی تکمیل کے لیے جو قوانین دیئے جانے تھے وہ اپنی انتہائی شکل میں دیدیئے گئے۔ اس کے بعد انسان کو اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لیے کسی دوسری مشعلِ راہ کی ضرورت اور کسی اور ہادئ طریقت کی احتیاج نہ رہی۔ اب انسانیت کے مقام بلند تک پہنچنے کے لیے وہی ایک صراطِ مستقیم ہے جس پر اس ذاتِ اقدس واعظم ﷺ کے نقوشِ قدم جگمگ جگمگ کر رہے ہیں اور جنہیں دیکھ کر ہر دیدہ ور پکار اٹھتا ہے کہ

مقامِ خویش اگر خواہی دریں دیر
بحق' دل بند و راہ مصطفےؐ رو

[معراجِ انسانیت ص ۷۴ از۔ علامہ پرویز رحمۃ اللہ علیہ]

اسوۂ حسنہ

ہمارا ایمان ہے کہ جو شخص رسول اللہ ﷺ کے کسی ارشاد یا حضور ﷺ کے کسی عمل کی صداقت سے اِنکار کرتا ہے، ہمارے نزدیک وہ مسلمان ہی نہیں کہلا سکتا، اِس لیے کہ حضور ﷺ کے ارشادات و اعمالِ حیات سے تو وہ ماڈل ترتیب پاتا ہے جسے خدا نے ''اسوۂ حسنہ'' قرار دیا ہے۔ اِس اسوۂ حسنہ سے انکار، نہ صرف انکارِ رسالت ہے، بلکہ ارشادِ خداوندی سے انکار ہے۔ اس انکار کے بعد، کوئی شخص مسلمان کیسے رہ سکتا ہے؟ اِسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے اس اسوۂ حسنہ کو خود قرآن میں محفوظ کر دیا ہے۔

[طلوع اسلام۔ اگست ۱۹۸۱ء]

قیصر و کسریٰ کے استبداد اور احبار و رھبان کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی انسانیت کو آزادی سے ہم کنار کرنے والے قائدِ انسانیت ﷺ تجھ پہ لاکھوں سلام

خلق و تقدیر و ہدایت ابتدا ست
رحمۃ للعالمینی انتہا ست

[محمد اشرف ظفر]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرست مشمولات سورۂ البقرہ (1)

مطالب القرآن فی دروس الفرقان

مدیر کے قلم سے	1-9
عصر حاضر میں علوم القرآن کا تقابلی مطالعہ	1-24
جہانِ نو کی تشکیل	1-5
پہلا باب: **سورة البقرة** (1)' (آیات 1 تا 2)	
قرآنِ حکیم کے حروفِ مقطعات کی اہمیت اور حقیقت	1
عربی زبان کی فضیلت اور حروفِ مقطعات کی مزید وضاحت	2
الکتاب کا مفہوم ضابطۂ قانون کے ہیں	2
قرآنِ حکیم کے متعلق ہمارے ہاں کئی تاریخی افسانے بنیادی طور پر ہی غلط ہیں	3
قرآنِ حکیم میں لا ریب کا لفظ جن معنی میں استعمال ہوا ہے' اس کی وضاحت	3
اس کتاب کو ماننے والے کسی نفسیاتی تذبذب کا شکار نہیں ہوتے	4
قرآنِ کریم کی دوسری صفت ھدًی ہے	4
خدا کی طرف سے ایک ایسی راہنمائی جو صرف متقیوں کے لیے ہے اس پر اٹھنے والا اعتراض	5
مروجہ قرآنی تراجم کی پیدا کردہ الجھنوں کا حل	5
قرآنِ حکیم کے نزدیک صرف وہی شخص متقی ہے جو اپنی ذات کو خطرناک گھاٹیوں سے محفوظ رکھے	6
پرہیزگاری کا لفظ متقی کے مفہوم کو واضح نہیں کرتا	7
قرآنی تعلیم کے برعکس مادیت کے متعلق غلط تصورات	7
مروجہ تراجم میں متقی کا مفہوم	8
تقویٰ شعاری کا پہلا تقاضا تسخیرِ فطرت ہے	9
تسخیرِ کائنات کے ماحصل کا استعمال باہمی مفادات کی بنیاد پر ہوگا	9
دل میں گھومتے گھماتے غلط خیال کے آنے پر متقی کا ردِعمل	10
پرہیزگاری ایک انفرادی شے ہے جبکہ دین ایک اجتماعی نظام پیش کرتا ہے	11
مذہبی دنیا میں متقیوں کی پہچان اور مساجد کی اجتماعیت کی کیفیت	11
تقویٰ کی بنیاد پر بنائی گئی مسجد تو تفریق بین المؤمنین کے تصور سے پاک ہونی چاہیے	12
متقی کے لیے تین بنیادی شرطیں	13
ہمارے ہاں سِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ (6:11) کے حکم پر عمل پیرائی کا طریق	14
خدا تعالیٰ کی طرف سے دیا ہوا ٹائم ٹیبل مکمل بھی ہے' محفوظ بھی اور لا ریب بھی	15
لفظ ایمان کی نوعیت اور اہمیت	15
ظن و قیاس کے برعکس یقین ہمیشہ امن کا باعث بنتا ہے	15
انگریزی زبان میں ایمان کا صحیح ترجمہ Faith نہیں ہے	16

دلائل و براہین کے بغیر ایمان ایمان ہی نہیں کہلاتا 16
آج دنیا بھر میں اسبابِ زوالِ امت کی بنیادی وجہ 18
تقلید پرستی کی روش اور تباہ کاریاں 18
سنتِ رسول کا ماحصل یہ ہے کہ انسان دلائل و براہین کی
بنیاد پر کسی بات کو تسلیم کرے 19
پیدائشی مسلمانوں کی پوزیشن 19
کیا قرآنی حقائق کو دلی طور پر تسلیم کرنا ہی کافی ہے؟ 20
قرآن تو کسی بات کو بھی بغیر سوچے سمجھے اندھے
بہرے بن کر تسلیم کرنے کو قبول ہی نہیں کرتا 21
ضابطۂ قرآنی کے مطابق عملی نتائج حاصل کرنے
کے لیے پہلے لا کے مراحل سے گزرنا ضروری ہے 21
مومن کے لیے پہلا مرحلہ تو ہر غیر خدائی قوت سے انکار کرنا ہے 22

دوسرا باب: **سورۃ البقرۃ** (1)، (آیت 3)

خدا تعالیٰ کی بارگاہ میں بندۂ مسلم کی ایک شدتِ آرزو
کا اظہار اور اس کا جواب 24
مذہبی تعلیم کا انحصار عقل و فکر کے تحت ایمان کے بالمقابل
Faith (عقیدہ) پر ہوتا ہے 25
مذہب اور دین میں لفظ غیب کے تصور میں پایا جانے والا فرق 25
علم و شعور کی وسعتیں غیب کو بتدریج مشہود کی
منزل سے ہم کنار کر دیتی ہیں 26
فکرِ انسانی کسی شکل میں بھی لامحدودیت کا درجہ حاصل نہیں کر سکتا 27
کیا ایسا علمِ غیب جس تک انسانی عقل کی رسائی
ممکن ہی نہیں، ایمان کے خلاف ہے؟ 27
قرآنِ حکیم فکر و عمل کی بنیاد پر حواس سے بالاتر چیزوں
کو تسلیم ہی نہیں کرواتا 28
حق تک پہنچنے کے لیے غیر مبہم علامات پر غور و فکر 28
فکری طور پر غیب پر ایمان کے سلسلہ میں ایک تیسری چیز 29
نظام کی تبدیلی سے نتائج کی تبدیلی ہوتی ہے 30
ثمر بار نتائج حاصل کرنے کے لیے صحیح نظام کی تشکیل
کی ضرورت ہے 30
کسی نظام کے نتائج حاصل کرنے کے لیے مہلت
کا وقفہ ضروری ہے 30
غیب پر ایمان کا ایک محسوس انداز 32
ہماری تبلیغ بے نتیجہ کیوں ہے؟ 32
کائناتی قانون کے سلسلہ میں علمِ غیب کا ماحصل 32
کسی صاحبِ اختیار پر غیب کا علم لاگو نہیں ہوتا 33
علم غیب کے سلسلہ میں انسانی دنیا کے متعلق کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا 33
کوئی شخص یہ نہیں جان سکتا کہ اس کی موت کہاں ہوگی 34
انسان کے مستقبل کے متعلق کوئی کچھ نہیں بتا سکتا 34
قرآنِ حکیم کے مطابق پیش گوئیاں کرنے والوں کی کوئی اہمیت نہیں 35
نجومیوں کو ہاتھ دکھانا دراصل مایوسی کی انتہا ہے 35
پیشین گوئی کرنے کا دعویٰ نبوت کی مہر کو توڑنے کے مترادف ہے 36
علمِ غیب کے متعلق ایک شرط: صراطِ مستقیم کی خصوصیات
کو سمجھتے ہوئے منزلِ مقصود کا تعین 36
قوم کے اندر Pioneers (السابقون الاوّلون) پیدا
کیے بغیر جہانِ نو کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا 37
نوعِ انسانی کی منفعت سازی کے لیے السابقون الاوّلون
کمالِ جنون کے ملکہ سے ہر آن سرشار ہوتے ہیں 37

حصولِ منزل کے لیے السابقون الاولون کے عملی
پروگرام کا طریق اور صلوٰۃ کا مفہوم 38
صلوٰۃ کے پروگرام کو قرآنی اصولوں کے مطابق مرتب
کرنا اور تشکیل دینا ہوتا ہے 39
قرآنِ حکیم کے نزدیک صلوٰۃ کا ایک وسیع مفہوم ہے 39
قرآنِ حکیم میں صلوٰۃ کے لفظ کا استعمال اور اس کا مفہوم 40
تسبیح کے قرآنی مفہوم کی وضاحت کے لیے شہد کی مکھی کی مثال 41
نظامِ صلوٰۃ کو عملاً قائم کرنے کا نتیجہ اور صلوٰۃ کو
ضائع کرنے کی تباہ کاریاں 42
کرۂ ارض پر انفرادی مفاد پرستی پیدا کردہ مسائل کا
علاج صرف نظامِ صلوٰۃ میں مضمر ہے 42
قرآنی انقلاب کبھی بھی شبا شب وارد نہیں ہوا 44
فرعون کی سلطنت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پیدا کردہ
انقلاب کا مرکزی کردار 44
حضرت شعیب علیہ السلام کی صلوٰۃ اور معاشی نظام کی اہمیت 44
نماز کی اجازت تو ہر کوئی دیتا ہے البتہ صلوٰۃ کو کوئی برداشت نہیں کرتا 46
تیسرا باب: **سورۃ البقرۃ** (1)' (آیت 3 مسلسل)
الصلوٰۃ کا لفظ صرف نماز تک محدود نہیں بلکہ یہ تو
پورے نظام کی عکاسی کرتا ہے 47
نظامِ صلوٰۃ تو پوری نوعِ انسانی کے لیے ایک
عظیم انقلاب کا پیش خیمہ ہے 48
قرآن حکیم نے اقامتِ صلوٰۃ کو تمکن فی الارض کے لیے
مشروط قرار دیا ہے 48
مذہب کی دنیا میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا
مفہوم عملی طور پر ختم ہو چکا ہے 49
ایمان اور اعمالِ صالحہ کا لازمی نتیجہ تمکن فی الارض ہوتا ہے
جس کی بنیادی خصوصیت نظامِ صلوٰۃ ہوگا 49
اسلامی جمہوریت کا نظم ونسق عملی طور پر قرآنی حدود
کے تحت باہمی مشاورت سے مشروط ہے 49
دنیاوی اور دینی اجتماعات میں فرق 50
اقامتِ صلوٰۃ کے ہوتے ہوئے فرقہ بندی شرکِ عظیم ہے 50
آج ہمارے ہاں اقامتِ صلوٰۃ فرقہ بندی کا نشان بن چکا ہے 51
قرآنِ حکیم کی روشنی میں فرقوں کو ختم کرنے کا شافی علاج 52
نماز اور صلوٰۃ میں پیدا ہونے والا بیّن فرق 52
خدا کا عہد نظامِ صلوٰۃ کے تحت امن وسکون کا مہیا کرنا ہے 53
ہر قسم کی برائیوں سے پاک معاشرے کا وجود کیونکر ممکن ہے؟ 54
نظامِ صلوٰۃ کے بغیر انسان کی خود بیں عقل اسے پاگل بنا دیتی ہے 55
صلوٰۃ سے مصلین کے اندر کیسا تغیر پیدا ہوتا ہے! 56
اہلِ جہنم کا سب سے بڑا جرم مصلین نہ ہونا ہے 56
غیر قرآنی معاشرے کے لیے یہاں بھی جہنم اور
پھر مرنے کے بعد بھی جہنم ہے 57
ان مصلین کا انجام جو صلوٰۃ کی حقیقت کو عملاً جھٹلاتے ہیں 57
نظامِ صلوٰۃ کا عملی طریق، اس کے خدوخال اور اس کا ماحصل! 58
صلوٰۃ کے اجتماعات صلوٰۃ کے نظام کی ایک کڑی ہیں
جو اپنے اندر نظامِ صلوٰۃ کو قائم کرنے کی ترغیب لیے ہوئے ہیں 59
تفرقہ بازی کے خطرے سے بچنے کے لیے حضرت ہارون علیہ السلام کا عمل 60
جسمانی حرکات وسکنات کا انسانی جذبات سے گہرا تعلق ہوتا ہے 60
Parallelism (متوازیت) اور منافقت میں بنیادی فرق 61

پاکستان کے قیام کا اصل مقصد نظام صلوٰۃ کا ہی قیام تھا 62
دورِ نبوت ﷺ میں نہ دو دو، تین تین قسم کی نمازیں تھیں
اور نہ ہی یہ کچھ تھا 63
انفرادیت کے اس قدر ناگفتہ حالات میں اجتماعیت
کی طرف ایک ثمر بار سفر کی نشاندہی 63
رزق کا تعلق طبعی جسم اور انسانی ذات دونوں کی نشوونما سے ہے 63
بھوک سے مرجانے والے کے رسم قل پر حلوے کا
اہتمام اور قبروں پر لاکھوں کا خرچہ 64
خدا اپنی رزق کی ذمہ داری کو کس طرح پوری کرتا ہے؟ 65
ہم نے رزق کے خدائی قانون کو سمجھنے کی بجائے خدا کو
ہی اس کا ذمہ دار بنا رکھا ہے 65
انفاق کا مفہوم 67
نظامِ ربوبیت میں تو جمع کرنے کا تصور ہی نہیں ہے
اور یہی سنتِ رسول ہے 67
ہمارے ہاں لفظ یُنفِقُونَ اور انفاق کا پایا جانے والا مفہوم 68
قرآنِ حکیم کے معاشی نظام کے لیے صرف ایک لفظ ''قل العفو'' ہے 68
چوتھا باب: **سورۃ البقرۃ** (1)' (آیات 3 تا 5)
صراطِ مستقیم کے لیے مانگی گئی دعا کی قبولیت کے لیے
ایک شرط کو پورا کرنا ہوتا ہے 70
مَا اُنزِلَ کا قرآنی مفہوم 71
وحی کے مقابل وجدان کی حقیقت اور نوعیت 72
وحی کے اندر نبی کی اپنی عقل و شعور کا کوئی دخل نہیں ہوتا 72
ختمِ نبوت کے بعد وحی کا مسئلہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا
نیز یہ کہ کشف و الہام سب غیر قرآنی تصورات ہیں 73
وحی اور عقلِ انسانی کا باہمی رشتہ لازم و ملزوم ہے
دلائل و براہین کے بغیر ایمان ہی نہیں کہلاتا 74
خدا کا دیا ہوا دین تمام انبیائے کرام کے لیے ایک ہی تھا جب کہ
اس پر عمل کرنے کا طریق مختلف رہا 74
گاہے گاہے دین کا ایک نیا مجموعہ دینے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ 75
قرآنِ حکیم کی کوئی آیت منسوخ نہیں ہے 76
خدا کے 500 احکامات کو مذہبی پیشوائیت نے منسوخ کر دیا 76
دنیا کی ہر قوم کی طرف آنے والے نبی اور رسول کا
احترام کرنا ہمارا فرض ہے 78
کتب سابقہ میں تحریف 79
برہمو سماجی تحریک کے بنیادی محرکات اور اس کا نتیجہ 79
آج کرّہ ارض پر سوائے قرآن کے کوئی آسمانی کتاب
اپنی اصلی شکل میں محفوظ نہیں 81
اگر خدا کا صحیح تصور سامنے نہ ہو تو پھر خدا پر ایمان لانا بے سود ہو جاتا ہے 81
قرآن حکیم کو سمجھنے کے لیے پہلے ''آخرت پر ایمان''
کی بنیادی اصطلاح کا مفہوم سمجھنا ضروری ہے 82
حیاتِ آخرت پر ایمان اور خدا کا قانونِ مکافاتِ عمل 83
حیات بالآخرت پر ایمان کا نتیجہ زندگی کے ہر شعبہ میں
سکون بھی ہے اور راحت بھی 84
آخرت کے مفہوم کی وسعت 85
قرآنِ حکیم کی روشنی میں اخروی زندگی کا تصور 86
قرآن حکیم زندگی کو دو حصوں میں تقسیم نہیں کرتا 87
کفر بھی اگر خالص ہو تو وہ بھی ایک نتیجہ رکھتا ہے 88
قرآنی آیات پر یقین محکم حاصل کرنے کا انحصار

کائناتی مشاہدات پر ہے 89
قرآن حکیم میں علماء کا لفظ سائنٹسٹ کے لیے استعمال ہوا ہے
تاکہ تم تفکر سے کام لو 90
ایمان کو یقین کے درجے تک لے جانے کے لیے نظام
قدرت کے درخشندہ نتائج کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا ہوتا ہے 90
آرزو کے ساتھ اگر شوقِ عمل کی بلندی پیدا ہو جائے تو
نتائج سامنے آ کھڑے ہوتے ہیں 91

پانچواں باب: سورۃ البقرۃ (1)، (آیت 6)

ہمارے ہاں کے غلط تراجم کی صورتِ حال کے باعث
نوجوان نسل کی ذہنی پریشانی کی کیفیت 92
لفظ کفر کا قرآنی مفہوم 94
کفر اور شکر کے قرآنی معانی 94
کفر کے بعد سرکشی کا ارتقاب ہوتا ہے 95
واضح حقائق کو تسلیم کرنے اور تسلیم نہ کرنے کی آزادی اور
اسکی وجہ جواز 96
کفر ضد کی پیدا کردہ چیز ہے جس کی بنیاد حسد ہے 97
کفر کے معنی لالچی ہونا بھی ہے 98
اب ادنیٰ ایمان والے کیا کریں؟ 98
قرآن کسی گوشے کو بھی نظر انداز نہیں کرتا نیز ظاہری
طور پر نہ ماننے والوں کی کیٹگری (ثق) 99
انسانی کیریکٹر کے سامنے سب سے بڑی رکاوٹ اسکا
اپنا پندارِ نفس ہوتا ہے 99
دل پر مہر اس وقت لگتی ہے جب انسان اپنی غلطی کا
اعتراف کرنا چھوڑ دے 100
خود بینی اور اسلاف پرستی انسان کو عقلی طور پر اندھا کر دیتی ہے 101
تقلید کا قرآنی مفہوم 101
عقل و فکر سے کام نہ لینا اذیت کی گہری کھائی میں
گرنے کے مترادف ہے 102
تقلید پرستی انسان کو صرف مترفین ہی نہیں بناتی بلکہ انسان کو
محنت کرنے کی صلاحیتوں سے بھی محروم کر دیتی ہے 103
مترفین کی ایک اور کیٹگری (ثق) یعنی اللہ کی مرضی
کہہ کر اپنی ذمہ داری کو دوسروں پر تھوپ دینے والے 104
علم کی روشنی سے بے نور آنکھیں 105
قصہ ابلیس و آدم کی لم ہی یہ ہے کہ اپنی ذمہ داری دوسروں
پر ڈال دی جائے 105
کیا انسانی زندگی کا مقصد اپنے لیے اور اولاد کے لیے
’عزت کی نوکری‘ کرتے ہوئے مر جانے میں ہے 105
آخرت کا انکار اپنے نفس کا ’اپنی ذات کا انکار ہے 106
قرآن حکیم خدا پر ایمان لانے سے پہلے انسان کو اپنی
ذات پر ایمان لانے کی ترغیب دیتا ہے 107
کائنات کی تخلیق کا مقصد انسانی اعمال کے ایک ایک
ذرے کو انصاف کے ترازو میں تولنا ہے 107
دنیا بھر میں علم و بصیرت رکھنے والی قوموں کی حالت زار 108
کسی چیز کا پوری طرح علم ہوئے بغیر اس سے انکار کفر نہیں کہلاتا 109
مفاد عاجلہ کی مفاد پرستیاں انسان کو فریب کاریوں کے
جال میں الجھا دیتی ہیں 109
قوموں کی موت حیات اور تباہی و سرفرازی کے غیر متبدل اصول 110
قرآنی حقائق سمجھنے کی خاطر سزا اور جزا کا قرآنی

تصور سمجھنا نہایت ضروری ہے 110
قرآن حکیم کے نزدیک ہر وہ شخص جو انسان کی شکل
رکھتا ہوا انسان نہیں ہوتا 111
قرآن حکیم کے مطابق انسانوں میں شمار اسی کا ہوگا'
جو انسانیت کے معیار پر پورا اترے گا 112
پیدائشی طور پر نہ کوئی مسلمان ہوتا ہے نہ کافر' قدرت تو
صرف آدمی پیدا کرتی ہے' انسان تو اسے خود بننا پڑتا ہے 112
سوال تو ان لوگوں کا ہے جن تک زندگی کے حقائق پہنچ چکے ہیں 112
کیا آج پوری ملتِ اسلامیہ اپنی بربادی اور نوعِ انسانی کی
تباہ حالی کے بوجھ کی ذمہ دار نہیں؟ 113
ہمیں اس خود فریبی سے نکلنے کا کب اندازہ ہوگا؟ 113
حدیث رسول ﷺ تو چودہ سو سال سے ہمیں پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ
''جسکا آج کل جیسا ہی گزرا' وہ تباہ ہوگیا'' 114
قرآنی تعلیم انسان کو زندگی اور عمر کا فرق ہی بتانے کے لیے آئی تھی 114

چھٹا باب: **سورة البقرة** (1)' (آیت 7)

خدا خود ہی انسانوں کے دلوں پر مہر لگائے اور پھر
خود ہی عذاب دے۔ یہ کیوں؟ 116
صدیوں پہلے غلط کہی ہوئی بات آج تک ذہنوں پر
اثر انداز ہو رہی ہے 117
کسی فرد کا سمجھا ہوا قرآن دوسرے کے لیے سند نہیں ہو سکتا 117
دلوں پر مہریں لگنے کی اصلی وجہ تو انکے اپنے اعمال ہوتے ہیں 117
کفر کا قرآنی مفہوم کسی حق بات کو عقل و فکر کی بنا پر سمجھنے سے
''انکار کرنے'' کا ہے 118
قرآن حکیم کو سمجھنے کا طریق تصریفِ آیات ہے 118
قرآن کا دعویٰ یہ ہے کہ اس میں کوئی ایک بھی اختلافی
بات نہیں' کوئی تضاد نہیں 119
مہریں پہلے نہیں لگتیں بلکہ پہلے انسان کفر اختیار کرتا ہے 119
دنیا کا سب سے بڑا مسئلہ تقدیر اور عقیدہ جبر ہے 119
تقدیر کے عقیدے کو ایمان کا جزو بنا دینے کی گہری سازش 120
تقدیر کے اس غلط تصور نے مسلمانوں کو عمل سے فارغ
کر دینے کی بنا پر قوتِ ارادی سے محروم کر دیا 121
قدرت کی طرف سے اس کرہ ارض پر انسان کیلیے سب
سے بڑا عطیہ اسکا اختیار و ارادہ ہے 121
دنیا بھر کے انسانوں کے لیے تقدیر کے مسئلہ کو قرآن حکیم
نے بڑی خوبصورتی سے حل کر رکھا ہے 122
انسان کا اپنا عمل ہی اس کے مستقبل کا نقشہ مرتب کرتا ہے 123
انسان کے اپنے ہی اعمال اس کے قلب کی تبدیلی کا باعث بنتے ہیں 123
قلب دراصل انسانی ذہنیت اور قوتِ فیصلہ کا نام ہے 124
اگر کسی قوم کو اپنی حالت بدلنا مقصود ہو تو اسے پہلے
اپنی نفسیات کو بدلنا ہوتا ہے 125
کائنات کے اندر خدا کا قانون تو ہر شے کے لیے
ہر وقت ہر لحہ کارفرما ہے 125
دعا سے ہم کائناتی قانون کو بدل نہیں سکتے البتہ انسان
کو چاہیے کہ وہ خود کو قانون کے مطابق بدل لے 127
اگر کسی شخص نے ایک خاص وقت تک کے لیے
بیمار رہنا ہی ہے تو پھر علاج کا مقصد؟ 128
پوری کائنات کا ایک ایک ذرہ تقدیراتِ حق کا محتاج ہے 128
مہریں کیسے لگتی ہیں؟ جو اسکے جذبات کہیں ''وہی کرتا چلا جائے'' 129

مغربی تہذیب کے نظریاتی دلائل، انکے سرکش جذبات کے نتائج اور ماحصل 130

جبر کا عقیدہ، اور مشیت ایزدی 131

ظاہریت پر مبنی کچھ الفاظ کہہ دینے کا نام احترام رکھ دیا گیا 131

منطقی دلائل کے برعکس صبح وشام ہماری علمی اور عملی زندگی میں تضاد 133

یہ غلط روش زندگی آباؤاجداد سے چلی آرہی تھی جس کی تائیدِ علم کی بنیاد پر ہو ہی نہیں سکتی 133

قرآنِ حکیم میں بیان کردہ قصۂ ابلیس وآدم تو پوری انسانی تاریخ کا نچوڑ ہے 134

انسانوں کی دنیا میں خدا کو فاعل قرار دینے کا مفہوم اور کلمات اللہ کی اہمیت 135

قانون اور حکم میں فرق 136

خدا کی منشا سے مراد خدا کا قانون ہوتا ہے 136

انسان کو قدرت نے کائناتی علم حاصل کرنے کی صلاحیت پہلے ہی عطا کر رکھی ہے 136

قانون کے ساتھ قوتِ نافذہ کا ہونا ضروری ہوتا ہے 137

کائنات کی کسی چیز نے اپنے اپنے ہاں قانون سازی کے لیے اجلاس طلب نہیں کیے تھے 138

خارجی کائنات کی طرح انسانی دنیا کے لیے بھی کوئی انسان خود آئین وضع نہیں کرسکتا 138

قانونِ خداوندی سے آزاد انسان کی کیفیت اور اس کا نتیجہ 138

مومن کا شیوۂ زندگی 139

نتائج کے لحاظ سے انسانی زندگی کے لیے بھی قانون اسی طرح اٹل ہیں جس طرح خارجی کائنات کے لیے ہیں 139

خدا کی مشیت سے مراد خدا کا قانون ہوتا ہے جس کی وضاحت اُسکی حکمت نے خود واضح کر رکھی ہے 140

ہمارے ہاں قرآنِ حکیم کے غلط تراجم نے ملت اسلامیہ کو دنیا کی صف اول میں آنے ہی نہیں دیا 140

ساتواں باب: **سورة البقرة** (1)، (آیت 8)

قرآن حکیم کے پیش کردہ مفہوم کے برعکس لفظ عذاب کا خودساختہ تصور 142

عربی زبان کی بنیادی خصوصیت اور عذاب جہنم کا قرآنی مفہوم 143

انسانی زندگی کے لیے کسی مقام پر رک جانے کے متعلق نبی اکرم کی ایک حدیث مبارکہ 144

روشن مستقبل کے برعکس ہماری بدعملی کی انتہا کا نتیجہ 145

عذاب کی مختلف شکلیں 145

ذلت وخواری: پہلی قسم 145

اس زندگی میں کفرانِ نعمت اور مصنوعی گھڑت کا انجام بھوک اور خوف کا عذاب: دوسری قسم 146

عذاب کی خطرناک شکل معاشرتی طور پر لاقانونیت کا جنم لینا ہے: تیسری قسم 147

سیاسی پارٹیوں کے علاوہ ملت کو مذہبی فرقوں میں تقسیم در تقسیم کرنے کا عذاب: چوتھی قسم 147

قندیلِ آسمانی کی اس راہنمائی کے باوجود ہماری کم مائیگی کی حالتِ زار 148

قرآن حکیم نے اپنے ہاں تین کیٹیگریز (شقوں) کا ذکر کیا ہے 148

انسان کو مومن کہلانے کی منزل تک پہنچنے کے لیے کئی ایک کٹھن گھاٹیوں سے گزرنا ہوتا ہے 150

ایمان تو عقل وشعور کے تحت کسی بات کو پوری طرح

سمجھ کر یقین کرنے کا نام ہے 150
مومن کی پہچان یہ ہے کہ وہ اپنا مال اور جان خدا کی
راہ میں قربان کر دیتا ہے 151
کوئی شخص مسلمان ہو یا مومن اس کے لیے قرآنی
ضابطہ حیات کی صداقتوں پر ایمان لانا اور ان پر عمل کرنا لازم ہے 152
کیا کسی کو مسلمان قوم کا فرد ہونے کے باوجود بھی
ایمان لانے کی کوئی شرط ضروری ہے؟ 152
پہلے مسلمان اور اس کے بعد مومن یعنی مستقلاً
قوانینِ خداوندی کی اطاعت کرنے والا 153
سات سات سال تک دینی مدارس میں پڑھائے
اور پڑھے جانے والے نصاب کی نوعیت 154
ظہور نتائج کے وقت کوئی اس قسم کا عمل فائدہ نہیں پہنچا سکے گا 154
ظہور نتائج کے وقت اہل ایمان کو کسی قسم کا نہ خوف ہوگا نہ حزن 155
قرآن حکیم کا آئینہ تصویر کشی میں کسی کو غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہونے دیتا 156
تنہا عقل انسانی کی بنیاد پر اختیار کردہ کوئی نظریہ' تصور یا عقیدہ'
الحق کے معیار پر پورا نہیں اتر سکتا 156
خودساختہ مذہب کی افیون نے ملتِ اسلامیہ کے وجود
کو صدیوں سے لاغر بنا رکھا ہے 157
عربوں کی مہمان نوازی بے مثال ہونے کے علاوہ'
مایخدعون' کے تصور کی قائل نہ تھی 157
جماعت مومنین کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہوتی ہے
کہ ان پہ بھروسہ کیا جا سکے 159
دوسروں کے خلاف جرم کرنا اپنی ذات کے خلاف جرم کرنا ہے 159
انسانی نفس کے سلسلہ میں جزا و سزا کا قرآنی تصور اپنے
اندر بڑے بنیادی حقائق رکھتا ہے 160
اپنی ذات کے ساتھ کیے گئے جرم کی سزا کے متعلق ٹیشے
کا ایک بصیرت افروز قول 160
جسم انسانی اور ذات انسانی دو الگ الگ وجود کی حامل ہیں
اور ان دونوں کی قیمت بھی الگ الگ ہے 161
انسانی ذات کو ہونے والے نقصان کا اندازہ قرانی اقدار
کے ترازو سے ہی کرنا ہوتا ہوگا 161

آٹھواں باب: **سورة البقرة** (1)' (آیات 9 تا 16)

سابقہ درس پر نگاہِ بازگشت 163
مومن نہ ہونے کا وہ معیار جو قرآن حکیم نے اپنے ہاں
متعین کر رکھا ہے 164
منافق کی نفسیاتی کیفیت 164
لفظ مایشعرون کا قرآنی مفہوم اور امراضِ قلب کی وضاحت 165
قلب اور فواد کا باہمی فرق اور انکا قرانی مفہوم 166
دل کی سرجری پر ہمارے ہاں جاری ہونے والے فتاویٰ:
اب جنت کا داخلہ اور مشکل ہو جائے گا 166
نفسیاتی طور پر انسانی ذات کا توازن قائم نہ رہنے کا نام
قلب کا بیمار ہونا ہے' پژمردہ ہونا ہے 167
متواتر بدعملی انسان میں آہستہ آہستہ احساسِ زیاں کا
فقدان پیدا کر دیتی ہے 168
زبانی اقرار کے بعد عمل سے تصدیق کرنے کی بجائے
شفاعت کے غیر قرآنی تصور کے مضمرات 169
یَکْذِبُوْنَ کے مفہوم کی نوعیت 170
صلوٰۃ کی ظاہری شکل کو مقدم سمجھ لینا کافی نہیں 171

فساد کی اصطلاح کا تفصیلی ذکر اور اس کا بنیادی مفہوم 172
مزدوری یا مجبوری؟ 173
قرآن حکیم کے معاشی نظام کے خدوخال کے سلسلہ میں
حضرت شعیب علیہ السلام کا قوم کے نام پیغام 174
زراندوزی کے سلسلہ میں انسانی نفسیات پر اثر انداز ہونے
والی کیفیت اور قرآنی راہنمائی 175
قارون اپنی اس زراندوزی کو اپنی ہنرمندی قرار دیتا تھا 175
خدا کو ماننے والوں نے خدا کو دو حصوں میں تقسیم کر رکھا ہے
یعنی مسجد کا خدا اور 'کاروبار کا خدا اور 176
آج پوری انسانیت نے اپنی سوچ کو دو حصوں میں تقسیم کر رکھا ہے 178
محسوس شکل اختیار کیے بغیر مفسدون کا طریق کار 179
مفسدین کے مطالبہ پر خدا کا جواب 179
دولت مندوں کی محفل میں کسی غریب کی شخصیت کو مجروح
کرنے کا فرعونی طریق 180
چراغِ مصطفویٰ سے شرارِ بولہبی کا یہ قصہ حضرت نوح علیہ السلام
کے وقت سے جاری ہے 181
معاشرے میں دولت مندوں کے نزدیک محنت کشوں کا مقام 181
صراطِ مستقیم سے سب سے زیادہ ہٹا ہوا وہ شخص ہے جو اپنے
آپ کو فریب میں رکھتا ہے 182
دوسروں کو دھوکا دینے والا خود ایک ناقابل تلافی نقصان کا
شکار ہو کر رہ جاتا ہے 183
سیاسی انتشار کے سلسلہ میں سیاسی پارٹیوں کا باہمی کردار 183
قوانین خداوندی کا مذاق اڑانے والوں کا خدا 'مذاق اڑاتا ہے'
کا قرآنی مفہوم 184
منزل کے لیے راستے کا غلط چناؤ انسان کو منزل سے اور دور
لے جاتا ہے 185
غلط سوچ کی بنا پر اٹھنے والا ہر قدم دوسروں کے لیے ہنسی کا
باعث بن جاتا ہے 185
جو قوم بھی اپنے معاشرتی نظام کو قرآن کے غیر متبدل اصولوں
کی بنیاد پر استوار نہیں کرے گی اس کا یہی حال ہوگا 187
نواں باب: **سورۃ البقرۃ** (1)' (آیات 17 تا 20)
اقدار کے لحاظ سے قرآن حکیم نے انسانوں کو دو حصوں میں
تقسیم کیا ہے 188
طبعی قوانین کی کارفرمائی 189
انسانی زندگی کے طبعی قوانین اور انسانیت کی اقدار میں
بنیادی فرق کی نشاندہی 190
انسانیت کی حسین عمارت وحی کی طرف سے عطا کردہ
قانونِ مکافاتِ عمل کی بنیاد پر استوار ہوتی ہے 190
قرآنِ حکیم کی اقدار کا ماحصل ہمیشہ سدا بہار اور ثمر بار ہوتا ہے 191
انسانیت کی زندگی کے استحکام کا دارومدار قرآنی خطوط پر فطرت
کی قوتوں کو مسخر کرنے اور صرف کرنے پر ہے 191
کفر اور ایمان کے امتیاز کا بنیادی فرق کائناتی قوتوں کے
ماحصل کو صرف کرنے کے طریق پر موقوف ہے 191
میکیاوَلی سیاست کا تصورِ زندگی 193
عقلِ انسانی کی بنیاد پر استوار ہونے والے نظامِ حیات کی کیفیت 193
ظلمت کی جمع تو ظلمات ہے جبکہ نور کے لیے قرآنِ کریم میں
جمع کا صیغہ استعمال ہی نہیں کیا 193
غلط نظامِ زندگی اختیار کرنے والے ہمیشہ ظلمات میں الجھے رہتے ہیں 194

سوچنے سمجھنے کی صلاحیتوں کا سلب ہو جانا — 194
قرآن حکیم کے نزدیک بدترین مخلوق وہ ہے جو عقل وفکر سے کام نہیں لیتی — 195
خیر اور شر کی مخلوط انسانی معاشرت میں عقل وبصیرت کی رہنمائی — 196
معاشرتی امور میں انتظامی صلاحیتوں کی اہمیت — 196
سرمایہ داری کے غلط نظام میں پوشیدہ ہلاکتوں کا علاج عقل کی فسوں کاری سے ممکن ہی نہیں — 197
صحیح نظام میں خیر اور شر آشکارا ہوتے ہیں — 198
عمل اور اس کے نتائج کے درمیان مہلت کا ایک وقفہ ہوتا ہے — 198
غلط نظام کے نتائج ایک ایسی کید (تدبیر) کی مانند ہوتے ہیں جو نظر نہیں آتے — 199
مکافاتِ عمل کے قانون سے غافل لوگوں کی سوچ آخرت کے لیے تباہ کن نتائج پیدا کرتی ہے — 199
زندگی کا ایک ایک سانس، ایک ایک عمل، مکافات عمل کے ترازو میں ساتھ کے ساتھ تلتا رہتا ہے — 200
غلط نظام زندگی کے خوف ناک نتائج کا سیلاب کئی ان دیکھے راستوں سے معاشرے کو گھیر لیتا ہے — 200
غلط نظام کا علاج انسانی سوچ کی پیوند کاری سے ممکن ہی نہیں — 201
انسانی فطرت کے غلط تصور نے انسان کو نفسیاتی لحاظ سے مایوسی کی انتہا تک پہنچا دیا ہے — 201
وحی کی راہنمائی کے بغیر عملِ انسانی کی پیدا کردہ مشکلات — 202
قدرت طبعی قوانین کے دروازے مومن اور کافر کا فرق کیے بغیر ہر کسی پر کھلے رکھتی ہے — 202
زندگی کے ہر دو گوشوں کا تقابل اور ان کے نتائج کا ماحصل — 203
ذاتِ خداوندی طبعی طور پر عطا کردہ نعمتوں میں سے کسی پر پابندی نہیں لگاتی — 204
خارجی کائنات کی طرح انسانی زندگی میں وحی کی مستقل اقدار کو تسلیم نہ کرنا دو خدا بنانا ہے — 204
خدا پرستی کے بجائے جذبات پرستی کا ماحصل مادی فراوانیوں کے سوا کچھ نہیں ہوتا — 205
مفادِ عاجلہ کے مقابلے میں مستقل اقدار کے تابع زندگی بسر کرنے والے گروہ کی کیفیت — 206
دو گروہوں کے علاوہ ایک تیسرے گروہ کی حالت — 206
سورۃ البقرۃ کی انہی آیات میں انہی تین گروہوں کا ذکر ہے — 206

دسواں باب: **سورۃ البقرۃ** (1)' (آیات 21 تا 23)

قرآنِ حکیم کی پوری تعلیم نظام ربوبیتِ عالمینی کی وضاحت اور تشکیل پر مبنی ہے — 209
حیوانی سطح تک انسان اور حیوان کی ربوبیت میں کوئی فرق نہیں — 209
انسانی جسم کی طبعی ربوبیت کا بنیادی مقصد جوہرِ انسانیت کی نشو ونما کرنا ہے — 209
انسانی ربوبیت کی نشو ونما حدود نا آشنا واقع ہوتی ہے — 210
ربوبیت عالمینی کے عظیم پروگرام کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کا طریق کار — 210
رہبانیت اور حیوانی سطح زندگی کا انجام؟ — 211
قرآنی نظامِ حیات کا تقابل کس سے؟ — 211
رب ہونے کے لیے یہ لازم ہے کہ وہ مخلوق کے لیے سامان نشو ونما بھی پیدا کرے — 212
انسان احسن الخالقین کے نزدیک حیوانوں سے بدتر کیوں ہے؟ — 213

اہل تصوف کے نزدیک یہ ہے کہ تمام روحوں کو ایک ہی
مرتبہ پیدا کرتے ہوئے ان سے رب ہونے کا اقرار کروالیا گیا 213
تصوف کے سلسلہ عشق نے، ہر انسان کو فطرت کے قید خانے
میں مقید کر رکھا ہے 214
قرآن حکیم کی روشنی میں یوم الست اور قالوابلیٰ کا مفہوم
نوع انسانی کی ربوبیت کا ہی ثبوت ہے 214
نظام ربوبیت کے تحت نوع انسانی کے وجود کو بیان کرنے
میں قرآن حکیم کا حسین انداز 215
انسان کی جواب طلبی اس پر ہوگی کہ اس نے اپنے ہاں
نظام ربوبیت کیوں قائم نہیں کیا 215
کتاب وحکمت کا قرآنی مفہوم اور اس کی اہمیت 216
ہمارے ہاں عبادت کی جگہ پرستش نے لے لی ہے 217
نظام ربوبیت کے سلسلہ میں خلا کے اندر پروٹیکشن
(حفاظت) کا حیرت انگیز طریق کار 217
کائنات کا ذرہ ذرہ انسانی جسم کی نشوونما کے لیے مصروف کار ہے 218
ماں کے پیٹ میں بچے کی پرورش کا انتظام 218
سامان نشوونما کو باہمی طور پر قوانین خداوندی کے اصولوں
کے مطابق صرف کرنا ہوتا ہے 219
نظام ربوبیت کو عملی شکل دینے کے سلسلہ میں ہیرے کی
طرح چمکتی ہوئی ایک حدیث 219
رزق کے سرچشموں کو ذاتی ملکیت سمجھ لینا شرک ہے 219
نبی اکرمؐ کا ارشاد ہے کہ خدا کی زمین خدا کے بندوں کے لیے کھلی رکھو 220
حضرت صالحؑ کے عہد میں میری اور تیری کے تصور کے
تحت جاگیردارانہ ذہنیت کا خاتمہ 220
حضرت صالح علیہ السلام کی جانب سے اونٹنی کی مثال قرآن حکیم
کے پورے معاشی نظام کی ترجمان ہے 221
مکے کے متعلق نبی اکرمؐ کا ارشاد ہے کہ وہاں کوئی مکان کرائے
پر نہیں دیا جاسکتا 221
فرعونیت کے خلاف دو دو پیغمبروں کو بھیجنے کا مقصد 222
انسان کی معاشی بدحالی ہی دوسرے انسان کے سامنے جھکنے
پر مجبور کرتی ہے 223
ملکیت زمین کے سلسلہ میں ریاست سوات کے والی کی
موجودگی میں ایک مردِ حق کی حق گوئی 224
جنتِ ارضی کا راز اسی ضرب کلیمی کی ضرب کاری میں ہے 225
کائنات کی ملکیت کے ثبوت کے سلسلہ میں دنیا بھر کی عقول
جمع ہوکر بھی وحی کی راہنمائی کا مقابلہ نہیں کرسکتیں 225
گیارھواں باب: **سورة البقرة** (1)، (آیات 23 تا 25)
قدرت نے نوع انسانی کے لیے ہر قسم کا سامانِ زیست
پوری کائنات میں بکھیر رکھا ہے 227
کوئی ہے جو اس قندیلِ آسمانی کی طرح اس کی مثل ایک
بات بھی پیش کرے! 228
قرآنِ حکیم کا یہ دعویٰ زماں و مکاں کی حدود سے بھی بالاتر ہے 229
قرآن حکیم کی بلاغت اور عظمت کے سلسلہ میں لفظ سورة
کے لغوی معنی کی وضاحت 229
دنیائے عرب میں اہمیتِ زبان، قرآن حکیم کے
اسلوب بیان وکلام کا ایک کھلا چیلنج 230
قرآنِ حکیم کی طرف سے پیش کردہ نظامِ حیات کی
بلاغت وفصاحت کا ثبوت خود قرآن کریم کے آئینے میں 231

نبی اکرم ﷺ اور صحابہ کبار رضی اللہ عنہم نے تو قرآنی نظام حیات کو عملی طور پر بطور مثال پیش کر دیا تھا مگر آج تباہی کیوں؟ 232

آج دنیا بھر کی قوموں نے زندگی کو جزوی طور پر دو حصوں میں تقسیم کر دیا 232

قرآن حکیم جیسے مکمل ضابطہ حیات کی حامل قوم کا فریضہ اور اس کی اپنی حالت زار 233

ملتِ اسلامیہ کی زبوں حالی اور پسپائی کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اس نے اسلام کے پیش کردہ نظام زندگی سے اپنے آپ کو یکسر الگ کر دیا ہے 234

قرآن حکیم کے بے مثل ہونے کے عقیدے کے اتھ ساتھ مثلہٗ معہ پر ایمان کا تصور 234

قرآن حکیم کی مثل نہ لا سکنے پر پرویزؒ پر ایک ہزار علمائے کرام کی طرف سے کفر کا فتویٰ 235

انسان اور پتھر، جہنم کا ایندھن ہونے کا قرآنی مفہوم 235

جہنم میں عوام اور انکے لیڈروں کی باہمی الزام تراشی 236

جنت اور دوزخ کی سیر کی کہانی اقبالؒ کی زبانی 237

خودساختہ نظام کے قید خانے کی کیفیت اور پھر وہاں سے نکلنے کا طریق کار 238

جنت اور جہنم کا دارومدار انسانوں کے اس نظام سے وابستہ ہے جو وہ خود قائم کرتے ہیں 239

قصہ آدم آدمی ہی کی اپنی داستان ہے جہاں ہر رزق فراواں ہے 240

رزق پر ذاتی ملکیت کے تصور سے پہلے کی تمدنی زندگی کو قرآن نے جنتی زندگی سے تعبیر کیا ہے 240

دنیائے تصوف کے نزدیک اس طبعی زندگی کا خلاصہ اور اس کا ماحصل 240

جنتی معاشرے میں گروہ بندی کے سلسلہ میں زوج کا قرآنی مفہوم 241

انفرادی زندگی میں انسانی ذات کی برومندی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا 242

جنتی معاشرے میں افسردگی و پژمردگی کا نشان تک نہیں ہوتا 243

فکرِ قرآنی سے پیدا کردہ جوئے شیر انسانی قلب ونگاہ کو کبھی پژمردہ نہیں ہونے دیتی 243

کائنات کی ہر شے کے مقابلے میں انسانی ذات ایک غیر متبدل شے ہے 244

جسمانی ضروریات کا بدلتے ہوئے تقاضوں کے مطابق سامان نشوونما کا ملتے چلے جانا رحمانیت کا خاصہ ہے 245

جسمِ انسانی کی نشوونما کے ساتھ ساتھ انسانیت کی نشوونما کے تقاضے بھی پورے کرنا ضروری ہیں 246

جسم انسانی کی طرح نظام زندگی کو ٹکڑوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا 246

قدرت نے نوعِ انسانی کی تمام نفسیاتی بیماریوں کا علاج قرآن میں محفوظ کر رکھا ہے 247

تصوف کی دنیا افسردگی اور اضمحلال کی ایک کٹھن اور طویل کیفیت اپنے اندر لیے ہوئے ہے 248

بارھواں باب: **سورۃ البقرۃ** (1)، (آیات 26 تا 29)

طبعی زندگی کی ضروریات کے سلسلہ میں قرآن حکیم کے نزدیک جنت کا تمثیلی بیان 249

جہانِ فردا کی نعما کو کوئی فرد زندگی کی موجودہ سطح میں سمجھ ہی نہیں سکتا 250

مابعد الطبیعات کے حقائق زندگی کی نوعیت کو مثال کے انداز میں ہی سمجھایا جا سکتا ہے 251

اگر بنیادی حقائق کو بھی تسلیم نہ کیا جائے تو پھر انسان کی ذہنیت زنگ آلود ہو جاتی ہے 253

عربی زبان کے ہر دو مرادف کے اندر ہلکے شیڈ کا فرق ضرور ہوتا ہے 254
لفظ فسق کا تفصیلی مفہوم 255
آمریت کے بجائے اسلامی نظام وہ پیٹرن مہیا کرتا ہے
جس کے اندر رہ کر انسان کی انسانیت نشو ونما پاتی ہے 255
قرآنی تشبیہات کو اگر تشبیہات کے انداز میں نہ سمجھا جائے
تو فتنہ پیدا ہوتا ہے 255
ہمارے ہاں ہزار سال سے شائع ہونے والے
اسلامی لٹریچر کی کیفیت اور ہماری حالت زار 256
میثاقِ خداوندی کا مفہوم اور اس کو توڑنے والوں کا ذکر 257
خدا کے ساتھ کیے گئے معاہدے کی نوعیت اور اہمیت 257
میدان بدر میں میثاق کے مفہوم کا عملی ثبوت اور اس کی نوعیت 258
چند سکوں کے عوض (اور وہ بھی اس کے دیئے ہوئے)
ایک جنت کا مل جانا، اتنا سستا سودا خدا کے سوا اور کون کرے گا 259
ہمارے ہاں عہد نامے پر عمل کرنے کا طریق 260
میثاق کے سلسلہ میں ایک ضروری وضاحت 261
مقامِ مومن تو میثاق کے بغیر ممکن ہی نہیں 261
دین کا بنیادی نکتہ نوعِ انسانی کے لیے ایک ضابطہ حیات
کے تحت نظامِ خداوندی کا قیام ہے 262
پوری کائنات کے وجود کی کامیابی کا راز ایک وحدت ہونے
کی بنا پر ہے 262
وحی کی منشا کے برعکس انسانوں کے باہمی اختلافات کی
نوعیت اور اس کا علاج 263
قرآنِ حکیم کی واضح تعلیم کے باوجود ہمارا طرزِ عمل اور اس کا نتیجہ 264
قرآن کی رو سے فساد کا مفہوم: انسانوں کے مابین قدم
قدم پر لکیریں کھینچ دی جائیں 264
قرآن حکیم کا معاشی نظام انسانیت کے مابین طبقات
پیدا ہی نہیں ہونے دیتا 265
انسانی زندگی کے ابتدائی مراحل کی کیفیت 265
انسانی زندگی کوئی ایسی چیز نہیں کہ خدا اسے دے کر
پھر اس سے واپس لے لے 266
خدا کے ساتھ فروخت کردہ زندگی موت سے کبھی آشنا ہو ہی نہیں سکتی 266
زندگی اور موت کے متعلق تصوف کا پیدا کردہ ایک ابہام:
آتما، پرم آتما کا جزو ہے 267
روح کے متعلق ہندوؤں کی سوچ اور ہمارے ہاں کے عرس 268
قرآن حکیم کی روشنی میں ''اِنَا اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ'' کا مفہوم
اور ہماری سوچ کا نتیجہ 268
خدا کا قانون انسان کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے
ہوتا ہے اور انسان کا ہر قدم اسی کی طرف اٹھ رہا ہوتا ہے 269
قرآن حکیم کی دو بنیادی اصطلاحات ارض وسما کا مفہوم 271
انسان کی انگلی کا ایک ہلکا سا اشارہ پوری کائنات میں
ارتعاش پیدا کر دیتا ہے 272
عرش کا مفہوم ''مرکزی کنٹرول'' کا ہے نیز ارض وسما کی مزید وضاحت 273
محیر العقول سلسلہ کائنات کی تخلیق کا مقصد، مدعا،
وسعت وعظمت اور انسانی شعور کی محدودیت 273
کائنات کو پیدا کرنے کا مقصد یہ ہے کہ کسی انسان کا کوئی عمل
نتیجہ پیدا کیے بغیر نہ رہ جائے 274
تیرھواں باب: **سورة البقرة** (1)، (آیات 30 تا 34)
قصہ آدم کی پیدائش کا 276

مرد کے پتلے کے بعد پتلی (یعنی عورت) کی پیدائش کا قصہ اور مقصد؟ 277
مرد کے لیے عورت کو ایک کھلونے کی حیثیت سے جانا گیا 278
مرد کے مقابلے میں عورت مقصود بالذات نہ رہی: قرآن حکیم کی تردید 278
قرآن حکیم کے نزدیک زندگی کی ابتدا کا طریقِ کار 278
قرآن حکیم کے نزدیک ملائکہ کائناتی قوتیں ہیں 280
انسان کی اپنی نفسیاتی قوتوں کی کیفیت اور قوانینِ خداوندی
کے ساتھ ان کا تعلق 281
قرآن حکیم نے انسان کی نفسیاتی قوتوں کو بھی ملائکہ کہا ہے 281
قرآن حکیم کے نزدیک انسانی زندگی کے لوازمات کی فراوانی
کی کیفیت 281
ملائکہ انسانی زندگی پر کس طرح اثر انداز ہوتے ہیں؟ 283
کیا ملائکہ نظر بھی آتے ہیں؟ یہ ملائکہ ہیں کیا اور کیا کرتے ہیں؟ 283
1965ء میں پاک و ہند کی جنگ کے دوران پاک فوج کے
مجاہدین کی لازوال قربانیوں کو افسانوں میں بدلنے کی گہری سازش 284
ہم نے مجاہدین کی قربانیوں کا کریڈٹ افسانوں کی
نذر کرتے ہوئے اُسے روحانیت کے پردوں میں گم کر دیا 285
مجاہدین اسلام کے خلاف ہونے والی گہری سازش 285
ملائکہ تو قدرت کی وہ کائناتی قوتیں ہیں جو عالمِ امر اور
عالمِ خلق میں خدا کے پروگرام کو سرانجام دیتی ہیں 286
قرآن حکیم کے نزدیک ایمان کی تعریف اور ملائکہ کا حقیقی تصور 286
قرآن حکیم نے اپنی تعلیم کے ذریعے کائنات میں انسان
کا مقام متعین کیا ہے 287
ارض پر انسان کے لیے خدا کا خلیفہ ہونے کا تصور قرآنی
تعلیم کے مطابق درست نہیں 287
کسی انسان کے لیے خدا کا جانشین ہونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا 289
انسانی پیدائش کے سلسلہ میں خدا کے حضور فرشتوں کے
خدشات کو بیان کرنے کا ایک محاکاتی انداز 289
تسبیح کا قرآنی مفہوم قوانین خداوندی کی پیروی کرنا ہے 290
انسانی دنیا کو وجود میں لانے پر فرشتوں کی خدا سے فریاد 291
فرشتوں کی خدمت گزاری اور ان کے خدشات کے
جواب میں خالقِ کائنات کا جواب 291
آدم کو تمام نام بتا دینے کے متعلق ہمارے ہاں کی تفسیروں کا ذکر 291
کائنات کے علم کے تحت مادیت کو زیادہ سے زیادہ مسخر کرنا
ہی مقامِ آدم ہے 292
آدمیّت کے مقام کے بعد مقامِ مومن تک رسائی
حاصل کرنے کا نسخۂ کیمیا 293
آدم کے تفصیلی تعارف کے سلسلہ میں خدا تعالیٰ کی
مزید وضاحت اور ملائکہ کا اعتراف 294
قرآن حکیم کی سبحان اللہ جیسی جامع اصطلاح کو ہم نے
پامال کر رکھا ہے، فرسودہ بنا رکھا ہے 294
اس کرّہ ارض پر قرآن حکیم سے زیادہ لذت آفرین کوئی کتاب نہیں 295
قرآنِ حکیم کی طرف سے آدم کے بالمقابل ملائکہ کو ان
کے محدود علم کا احساس دلانے کا طریق 295
ملائکہ کو دیئے گئے علم کی حدود کا تعین اور ہمارے ہاں کے
تراجم کا پیدا کردہ خلجان 296
فطرت کی قوتوں کی نوعیت اور ماہیت 297
قوانینِ خداوندی کے سامنے سجدہ ریز ہونے کا مفہوم اور نتیجہ 297
خدا کے ہاں ابلیس کا مقدمہ اور ہزار برس سے

ہمارے ہاں کی تفسیریں 298

انسان کے اپنے اندر اختیار وارادہ کی قوت کی اہمیت اور اس کے استعمال کی نوعیت 299

اختیار وارادہ کے تحت امکانی خصوصیات کی نوعیت 299

خیر وشر کا بنیادی مسئلہ شیطان اور ابلیس کے قرآنی مفہوم سے واضح طور پر حل ہوجاتا ہے 300

آخر آج دنیا میں ویلفیئر اسٹیٹس (فلاحی مملکتوں) کی اخلاقی حالت اس قدر ناگفتہ بہ کیوں ہے؟ 300

یورپ کے ابلیسی نظام نے پوری انسانیت کو مایوسی کے سمندر میں غرق کردیا ہے 301

خدا کے حضور ابلیس کی ایک درخواست جو قبول کرلی گئی 301

قرآن حکیم کی طرف سے عطا کردہ صراطِ مستقیم انسان کو گمراہ ہونے ہی نہیں دے گا 302

چودھواں باب: **سورۃ البقرۃ** (1)' (آیات 35 تا 39)

سابقہ درس کی بازگشت 303

انسانی زندگی کی ابتدائی روئداد؛ جنتِ ارضی کی وہ زندگی' جس میں مرد وزن شامل ہوتے ہیں 304

جنت ارضی کی بنیادی خصوصیات 305

دینِ خداوندی کی دوسری بنیادی خصوصیت: کوئی انسان کسی کا نہ محکوم ہو اور نہ ہی محتاج 306

انسان کی انسانی زندگی اس وقت جہنم بنتی ہے جب اس کا اختیار سلب کرلیا جائے 306

انسانی برادری کے پارہ پارہ ہوجانے کی بنیادی وجہ: خدا کی زمین کا خدا کے بندوں کے لیے کھلی نہ رکھنا ہے 306

قصہ آدم کے سلسلہ میں لفظ شجر کے متعلق ہماری تفسیری روایات کے افسانے اور تورات کے قصے 307

قرآن حکیم کو قرآن کے آئینہ میں سمجھیے تو شجر کا مفہوم واضح ہوجائے گا 308

شجر یعنی مشاجرت کے بعد ظلم کا مفہوم 309

قرآن حکیم کی معاشرتی زندگی کا انداز ایک گھر کی طرز پر ہوتا ہے 309

قرآنی خطوط پر معاشرتی زندگی کو نظر انداز کرنے کا نتیجہ 310

تورات کے بیان کے مطابق اماں حوا شیطان کے چکر میں آ کر بابا آدم کو جنت سے نکلوانے کا سبب بنی 311

ڈگمگانے کے جذبات تو عورت اور مرد دونوں کے اندر پائے جاتے ہیں 311

یہ سارے کا سارا قصۂ آدم تمثیلی انداز میں اپنے اندر نوع انسانی کی ترجمانی کا انداز اختیار کیے ہوئے ہے 312

انسانوں کے مابین نفرت پیدا کرنے والے جذبات کو قرآن حکیم نے شیطان سے تعبیر کیا ہے 312

باہمی نفرت پیدا کرنے کے لیے ابلیس کا پہلا حربہ: اپنے اپنے بچوں کی فکر کا جذبہ پیدا کرنا تھا 313

انسانی عمل کا انجام ایک فرد سے خاندان' خاندان سے قبیلہ اور قبیلے سے قوم اور پھر باہمی عداوت 313

مستقر کی شکل میں یہاں اٹھنے والا ہر قدم زندگی کا ارتقا ہے 314

زندگی کی مصروفیت کا انداز اور اس کے ماحصل کا تعین: نبی اکرمؐ کے الفاظ میں 314

کرہ ارض کی زندگی کی حقیقت اور اس پر رہنے کا طریق کار 315

تنہا عقل انسانی کی بنا پر انسان کے سرکش جذبات سے پیدا ہونے

والی مایوسی کا علاج ''فتاب علیہ'' کے قرآنی مفہوم میں ہے 316
زندگی کے حقائق کو بیان کرنے کا قرآنی انداز بلیغ وعمیق بھی
ہوتا ہے اور روح پرور بھی 318
لفظ توّاب کا تجزیہ 318
تصوف کی دنیا میں علم لدنی کے غلط تصور کے برعکس
وحی کی راہنمائی کا طریق کار 319
وحی کی ماہیت کو' اور اسے خدا سے پانے کی کیفیت کو'
سوائے نبی کے کوئی نہیں جان سکتا 319
وحی کا سلسلہ نبی اکرم ﷺ کی ذات اقدس پر ختم ہونے
کے بعد کشف والہام کا عقیدہ بہت بڑی سازش ہے 320
جب عقل انسانی نے وحی کی اہمیت کو نظر انداز کیا تو انسان
خوف وحزن میں مبتلا ہو کر رہ گیا 320
قرآنِ حکیم کا تو خاصہ ہی یہ ہے کہ وہ اپنی کسی بات کو بھی
بغیر وضاحت کے نہیں چھوڑتا 321
محکوم قوموں کی معاشی حالت کے ساتھ ساتھ ترقی پذیر
قوموں میں طبقاتی تقسیم کا عذاب 322
تمثیلی انداز میں قوانین خداوندی کے تحت دو قوموں کا تقابلی جائزہ 322
تکذیب دین کون کرتے ہیں اور ان کی پہچان کیا ہے؟ 324
لفظ حَلٰلًا طَيِّبًا اور فاویٰ کا قرآنی مفہوم 324
شکر کا قرآنی مفہوم اور اس کو عملی شکل دینے کا طریق
کار اور اس کا ماحصل 324
پندھرواں باب: **سورۃ البقرۃ** (1)' (آیات 40 تا 45)
قرآن حکیم کی تعلیم کا ماحصل حق کو حق ثابت کرنے
کا محسوس طریق اور حکمت 326
قرآن حکیم کے تمام اصول اسباب وعلل کی بنیاد پر دلالت کرتے ہیں 327
قوموں کی موت وحیات کے اصولوں کے سلسلہ میں
قرآن حکیم ایک واضح اور مربوط کتاب ہے 329
بنی اسرائیل کی کہانی قرآن حکیم کی زبانی 329
قرآن حکیم نے قوموں کی عزت وتکریم کے پیمانوں کا
خارجی معیار' داستان بنی اسرائیل میں پیش کر رکھا ہے 330
آج کے دور میں کرہ ارض پر مسلمانوں کی حالتِ زار 331
آخر کیا اس ذلت ومسکنت کا کوئی حل' کوئی علاج بھی ہے! 332
جنتِ ارضی میں داخلے کے لیے خدا سے ایک عہد کرنا ضروری ہوتا ہے 332
قرآن حکیم کے ارشاد کے مطابق یہ عہد وپیمان تو ہر قدم پر'
ہر آن پورا کرنا ہوتا ہے 333
یہ چیز خدا کی شان کے شایان ہی نہیں کہ وہ کسی کو ڈرا کر اس
سے اپنے احکام کی پیروی کروائے 334
ڈرنے اور محتاط رہنے میں بنیادی فرق ہوتا ہے 335
خدا کے قانون کی سرکشی کے نتائج کا خوف قوموں کو
ہر قسم کی ذلت ورسوائی سے محفوظ رکھتا ہے 335
قرآنِ حکیم کی تعلیم انسان کو دو جذبوں سے روشناس کراتی ہے 336
نوع انسانی کے لیے کرہ ارض پر قرآنِ حکیم کی اہمیت 337
قرآن حکیم کے نزدیک موجودہ انجیل اور تورات
اپنی اصل شکل میں موجود نہیں ہیں 337
خدا کی طرف جانے والے راستے میں کون لوگ حائل ہیں؟
مذہبی پیشوائیت کے متعلق قرآن حکیم کا ارشاد 338
بنی اسرائیل کے کاہنوں کی خفیہ میٹنگ کی رپورٹ 339
مجھے کسی مذہبی فرد کی تنقید مقصود نہیں لیکن نماز پڑھنے کے

بعد اس کا معاوضہ کیسا؟ 340
قرآن حکیم کے نزدیک مترفین کی کیٹیگری (شق)
باہمی اختلافات کے تحت الگ الگ شریعت کو ماننے
والے بھی اپنے پروفیشن پر آنچ نہیں آنے دیتے 341
نکاح کے وقت نکاح فارم پر لکھی جانے والی آدھی آیت کیوں؟ 342
قرآنی آیات کو چھپا کر حق کو باطل کے ساتھ ملا دیا جاتا ہے 343
قرآن حکیم کی تفسیر کو قرآن حکیم کی بجائے فقہ اور اپنی
اپنی روایات کی روشنی میں پیش کرنے کا نتیجہ 343
ہمارے ہاں کیے جانے والے وعظوں کی نوعیت 343
انسانی جذبات اور عقل انسانی کا باہمی تعلق اور قرآن حکیم کی راہنمائی 344
نوعِ انسانی کی سرفرازی کے لیے صلوٰۃ اور زکوٰۃ
دین خداوندی کے دو اہم ستونوں کی اہمیت اور افادیت 345
ہمارے ہاں صدیوں سے صلوٰۃ اور زکوٰۃ کا مروجہ مفہوم اور اس کا نتیجہ 346
ملتِ اسلامیہ کی زبوں حالی کے پیشِ نظر ''جاوید نامہ''
میں اقبالؒ کی زبانی ایک اہم سوال 346
ملت کی یہ ذلت و مسکنت اقبالؒ کے الفاظ میں عجمی
اسلام کی طرف سے ملنے والی دوائی کے استعمال کا ہی نتیجہ ہے 347
ہم صدیوں سے سیکولر نظام میں مسلمان بھی ہیں اور نمازی بھی 348
صلوٰۃ اور زکوٰۃ کے سلسلہ میں ایک اسلامی مملکت کا فریضہ 348
سولھواں باب: **سورۃ البقرۃ** (1)' (آیات 46 تا 48)
خدا کے قانون میں تو ابدی مایوسی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا 351
سراپا قعرِ مذلت میں گری ہوئی قوم کے ہاتھوں ذلت آمیز گرفت 351
قرآنی نظام صلوٰۃ کا قیام تو پہاڑ کی چوٹی پر چڑھنے کے
مترادف ہے مگر ہمارا اندازِ فکر وہ نہیں 352
قرآن حکیم نے جس صلوٰۃ کو مشقت طلب کہا ہے اس کے
خدوخال تو کچھ یوں ہیں 353
نظام صلوٰۃ کے تین پہلو نیز فحشا اور منکر کا مفہوم 354
صلوٰۃ کے قبول ہونے کا معیار اور اس کی محسوس شکل 354
صلوٰۃ قائم کرنے والے مصلین کی پہچان 355
شرفِ انسانیت کے پیش نظر دوسروں کو دینے والوں کی
ذہنی کیفیت کا ادراک 356
شرفِ انسانیت کا مقام کتنا بلند اور اس کو قائم رکھنے کا عمل
کتنا کٹھن مرحلہ ہے 356
قرآنی صلوٰۃ کے یہ وہ مراحل ہیں جو عادتاً نہیں ہوسکتے 357
تکذیب دین کرنے والے مصلین کے متعلق قرآن حکیم کا ارشاد 357
صلوٰۃ کے اجتماعات کی نفی نہیں کی جاسکتی' یہ نظام صلوٰۃ
کا ہی ایک حصہ ہیں 358
نظام صلوٰۃ کو قائم کرنے کے سلسلہ میں پیدا ہونے والی
مشکلات کا تمثیلی ذکر 359
انسان کے اختیار و ارادے کی اہمیت 359
جس نظام میں کوئی شخص دوسرے کے فیصلے کو ماننے پر مجبور ہو'
وہ نظام صلوٰۃ یا خدا کا دین نہیں ہوسکتا 359
قرآن حکیم انسانی اختیار و ارادہ کے پیش نظر یک طرفہ
ٹریفک کا قائل نہیں 360
انسان کا اپنے جذبات کا غلام بن جانا بھی اپنی آزادی
سے محروم ہونے کے مترادف ہے 361
قرآنی فلسفہ حیات' انسانی آزادی کو ہر صورت برقرار رکھنا چاہتا ہے 361
جم غفیر کے اندر اپنے آپ کو تنہا محسوس کرنا شدید ترین

عذاب کی کیفیت لیے ہوتا ہے 361
بطیّب خاطر قوانین خداوندی کے سامنے سر تسلیم خم کرنے
سے تمام گھاٹیاں باآسانی سر ہو جاتی ہیں 362
قرآن حکیم کے نزدیک اہم حقائق کو بیان کرنے کا انداز 363
جس قوم میں قانون کا احترام ختم ہو جائے' وہ قوم ہر قسم کی
بیماریوں کا شکار ہو کر رہ جاتی ہے 363
جنت کے حصول کے لیے بنی اسرائیل کا عقیدہ اور
ہمارے ہاں پائے جانے والے تصورات 364
کائنات کا ایک ایک ذرہ مکافات عمل کی شہادت پیش
کرنے میں مصروف کار ہے 365
سفارش اور شفاعت کے متعلق ہمارے ہاں پایا جانے والا متضاد تصور 366
قرآن حکیم کے نزدیک شفاعت کا حقیقی مفہوم شہادت کا ہوتا ہے 367
شفاعت کے مروجہ مفہوم میں خدا تعالیٰ کے متعلق
پیدا ہونے والا غلط تصور 367
شفاعت کے سلسلہ میں عیسائیت کا اپنا عقیدہ 368
دوسروں کے عقیدے پر تنقید کرنے والوں کے اپنے تصورات 368
نظام صلوٰۃ کی بنیاد یہ ہے کہ کسی انسان کا کوئی عمل نتیجہ پیدا
کیے بغیر نہیں رہ سکتا 369
سترھواں باب: **سورۃ البقرۃ** (1) '(آیات 49 تا 52)
سابقہ درس کی بازگشت 370
قوم بنی اسرائیل کی داستان اپنے اندر عروج و زوال
کے دونوں پہلو لیے ہوئے ہے 371
حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مورث اعلیٰ کی حیثیت سے
قوم بنی اسرائیل اور بنی اسماعیل کا تعارف 372
حضرت یوسف علیہ السلام کی قوم چار سو سال تک قبطی قوم
فراعنہ کی غلامی کے شکنجے میں رہی 372
ملوکیت یعنی فرعونی سیاست کے تین شعبے اور ان کا کردار 373
فرعونیت (ملوکیت) کی سب سے بڑی گرفت کا ذکر نیز
ذبح کرنے کا مفہوم 374
غلامی کا سب سے بڑا ہتھیار یہ ہے کہ باصلاحیت افراد کو
اُوپر اٹھنے ہی نہ دیا جائے یا انہیں اپنا مقرب بنالیا جائے 375
قرآن حکیم کو سمجھنے کا طریق نیز قوم کو پارٹیوں میں الجھائے
رکھنے کے فرعونی عمل کی وضاحت 375
کسی جابر سلطان کا کسی دوسرے ملک پر حملہ کرنے کے بعد
اس کا پہلا ردِ عمل 377
غلامی میں بدل جاتے ہیں قوموں کے ضمیر 377
لفظ ''بلآء'' کا ہمارے ہاں کے غلط تراجم کے برعکس قرآنی مفہوم 378
حضرت موسیٰ علیہ السلام کے محلاتی تجربات اور وادی سینا کے
گوشہ زندگی کے صبر آزما مراحل میں الداعی کا فریضہ 378
عربی زبان میں الراعی کا مفہوم 380
سرزمین مدین میں پیاسی بکریوں کا ماجرا اور حضرت
موسیٰ علیہ السلام کی حساس خیالی کا واقعہ 381
تصوف کے دور کی ایک ہڈ بیتی کہانی' پرویزؒ کی اپنی زبانی 381
تصوف میں لطائف کو حقائق بنا کر شاعری میں تبدیل کر دیا جاتا ہے 382
فرعون کی چڑھائی کے دوران حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف
سے سمندر میں عصا مارنے کے واقعہ کی نوعیت اور حقیقت 382
قدرت نے کسی ایسے عمل کے لیے کوئی ایسا حکم صادر نہیں کیا
جو عقل انسانی کی طاقت سے باہر ہو 383

حضرت موسیٰ علیہ السلام قوم کو کسی سمندر سے لے کر نہیں گزرے تھے
بلکہ وہاں تو مدوجزر کی کیفیت تھی 384
قرآنی حقائق کو سمجھنے کا طریقہ 385
وحی کی روشنی کے بغیر انسانی عقل و شعور کے ابتدائی دور کی کیفیت 386
انسان کا قوائے فطرت کے سامنے جھکنے کا دوسرا نام شرک ہے 387
بنی اسرائیل کو تین مختلف مستبد قوتوں نے اپنے ہاں جکڑ رکھا تھا 387
غلام قومیں تو دین و دانش کے علاوہ اپنی جان تک فروخت کر دیتی ہیں 388
حضرت موسیٰ علیہ السلام کی چند دنوں کی غیر حاضری اور
سامری کے بنائے ہوئے بچھڑے کی پوجا اور لفظ ظلم کا مفہوم 389
لفظ شکر کا مروجہ تصور اور اُس کا حقیقی مفہوم 390

اٹھارھواں باب: **سورۃ البقرۃ** (1) '(آیات 53 تا 58)

سابقہ درس کی تجدید یادداشت 392
سابقہ انبیائے کرام کے سلسلہ میں قرآن حکیم کے بیان
کردہ غیر متبدل اصولوں کا ذکر اور اہمیت 393
دنیا بھر کے انسانوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع
کرنے کا بہترین اصول 394
نیکی کا یا اخلاق کا وہ معیار جو قرآن متعین کرتا ہے
اگر وہ سامنے نہ ہو تو اس کا نتیجہ انسانیت کی تباہی ہے 395
قرآن حکیم زندگی کے ہر موڑ پر راستے کا تعین کرتا دکھائی دیتا ہے 397
عقل کے مقابلے میں وحی انسانیت کا بوجھ ہلکا کر دیتی ہے
اور صدیوں کا سفر دنوں میں ہی مکمل ہو جاتا ہے 397
کائنات کا ایک ایک ذرہ انسان کے سامنے ساجد کی
حیثیت اختیار کیے ہوئے ہے 398
صحیح راستے پر گامزن ہونے کے لیے تاب کے بعد اصلح
کا عمل ضروری قرار پاتا ہے 399
لفظ فاطر کا لغوی معنی نیز انسانی زندگی اور حیوانی زندگی میں فرق 400
تخلیق نو کے سلسلہ میں الباری اور المصور کے عمل کا طریق 400
قرآنِ حکیم کی شکل میں انسانی خیالات سے پاک وحی کا
نزول اور اسکی اہمیت 401
ایک بچھڑے کے بالمقابل آج ہماری ذہنی پستی کی حالت 402
قتل یا ذبح کے دوسرے معنی قوانین کے سامنے
سرِ تسلیم خم کرنے کے بھی ہوتے ہیں 402
غلامی کا طوق انسان کو محسوسات کے پیکر کا عادی بنا دیتا ہے 404
قانون کی قوت اس پر عمل کرنے میں پوشیدہ ہوتی ہے 404
خدا کا تصور قرآن حکیم کے آئینہ میں سمجھا تو جاتا ہے دیکھا نہیں جاتا 404
مذہب کے دائرے میں اہل تصوف کی دنیا کی کیفیت 405
خدا تعالیٰ کی ہستی کے متعلق غُلو سے کام لینا حقیقت سے
بعید لے جاتا ہے 406
قوموں کی تباہی شدتِ جذبات کی بنا پر زیادہ ہوتی ہے 408
غُلو پرستی انسان کو انسانیت کے مقام سے محروم کر دیتی ہے 408
کائنات کی تمام قوتیں انسانیت کے سامنے سجدہ ریز ہیں اور
یہ حضرتِ انسان رب کی بارگاہ میں سرنگوں ہے 409
قرآن حکیم کے نزدیک موت و حیات کے پیمانے الگ الگ ہیں 409
من و سلویٰ کا وہ مفہوم جو قرآن حکیم اپنے ہاں متعین کرتا ہے 411
حلال و طیّب کے متعلق قرآن حکیم کا تصور کیا ہے؟ 412
فلسطین کو ارض بابرکت یا ارض مقدس کہنے کا مقصد 413
فاتح کے مفتوح بستی میں داخل ہونے کے لیے قرآنی ہدایت 413
بخشش کا تصور انسانی ذات کی شان کے شایاں ہی نہیں 414

انیسواں باب: **سورۃ البقرۃ** (1)' (آیات 59 تا 61)

غلام قوم زندگی کی نعمتوں سے سرفراز ہو ہی نہیں سکتی بلکہ
یوں کہیے کہ ہونا ہی نہیں چاہتی 416
فرعون کی غلامی میں بنی اسرائیل قوم کی پست ذہنیت کا ماجرا 418
غلامی کے سائے میں پرورش پانے والی قوم غلامی کی
حالت میں ہی زیادہ سکون محسوس کرتی ہے 419
قوم بنی اسرائیل اور تحریک پاکستان کی داستانِ آزادی
اپنے اندر گہری مماثلت لیے ہوئے ہے 419
حصول پاکستان کے سلسلہ میں ایک غلط بیانی یا غلط فہمی کا ازالہ 420
آزادی کی نعمت ملنے کے بعد قانونِ خداوندگی سے
سرتابی اختیار کرنے کا نتیجہ 421
کیا مملکت کے چھن جانے کی اصل وجہ ایک لفظ کی غلط
ادائیگی تھی یا کچھ اور؟ 422
قرآن حکیم کو سمجھنے کا طریق: تصریفِ آیات کو پیشِ نظر رکھنا ہے 422
قرآن حکیم کی تعلیم انسان میں مومنانہ فراست پیدا کر دیتی ہے 423
فرعون کے مقابلے کی خاطر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم سے
پکار اور اسکا جواب 423
غلامی کے ماحول میں پرورش پانے والی قوم کی ذہنی کیفیت'
انجام اور علاج 424
حصولِ پاکستان کے بعد ہمارے ہاں پائی جانے والی
غلامانہ سوچ اور نئی نسل کی جانب سے مجرمانہ غفلت کا نتیجہ 425
غلامانہ سوچ رکھنے والی قومیں اپنے ہاں افزائش نسل تو کرتی ہیں
لیکن ان کی تربیت نہیں کرتیں 426
قرآنی نظام انسان کو انسانیت کی شاہراہِ حیات پر چلنے کی
قوت اور شعور عطا کرتا ہے 427
حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عصا کے ذریعے بارہ چشموں کے
پیدا ہونے کا مفہوم اور تفسیری داستانیں 427
بخاری میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے متعلق غسل کے دوران
ایک پتھر کا آپکے کپڑے لے کر بھاگ جانے کا قصہ 428
عصا کے بنیادی معنی اجتماعیت کے ہیں 429
فرقہ بندی کے تصور کو ختم کیے بغیر ملت اسلامیہ اجتماعت
کے آبِ حیات سے لطف اندوز ہو ہی نہیں سکتی 430
قرآن حکیم نے کس چیز کو حلال اور کس کو حرام کہا ہے؟ 431
ارض کو ارض اللہ کہنے کا مقصد دراصل نوع انسانی کو شرک
سے محفوظ رکھنا تھا 431
قوموں کی رہائش خوراک تن آسانی اور سہل انگاری بھی ان کی
صلاحیتوں کو مفلوج کر دیتی ہے 432
بنی اسرائیل کو غلامی کے دور کے نوالوں کے مقابلے میں
آزادی کی فضا پسند نہ آئی 432
اقبالؒ کی نظر میں غلام قوم کی ذہنیت اور نفسیاتی کیفیت 433
نماز باجماعت کے دوران اجتماعیت کا ایک روح پرور نظارہ
اور اس کے بعد انفرادی عمل کا نتیجہ 434
صحرائے سینا میں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بنی اسرائیل قوم کا مطالبہ 435
عزت وذلت اور مسکنت کا بنیادی مفہوم 435
ملتِ اسلامیہ کی جوئے رواں تو صدیوں سے جوہڑ کی
شکل اختیار کیے ہوئے ہے 436
علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں قرآن حکیم کے ہاں اس
بے چارگی کا علاج' افکارِ تازہ کی نمود سے ہے 436

نبی کے متعلق یہودیوں کا تصور اور قرآن حکیم کا ارشاد 437
مقام نبوت اور اس کی طرف سے دعوت دینے کا طریق 437
یہودیوں کے متعلق پایا جانے والا ایک غلط تصور اور اس کی حقیقت 438
خدا کسی قوم کے عمل کو بھی نظر انداز نہیں کرتا 439
بنی اسرائیل کا جرم اور خود ساختہ عقیدہ: جنت صرف انہی کے لیے مخصوص ہے 440
نظریات و تصورات بدلے بغیر انسانوں کی خارجی دنیا میں تبدیلی ممکن ہی نہیں 440
کائنات کا ایک ایک گوشہ کافر اور مومن کے لیے برابر نشو و نما کا حامل ہے 441
کائنات کی قوتوں کو مسخر کرنا اور انہیں نوعِ انسانی کی منفعت کے لیے صرف کرنے کا نام اسلام ہے 442

بیسواں باب: **سورة البقرة** (1)' (آیت 62: کیا اسلام بھی ایک مذہب ہے؟)

ایک اہم آیت کے غلط مفہوم کا ازالہ 443
اخلاقی طور پر اچھی اچھی باتیں یک جا کرتے ہوئے ایک نیا مذہب بنانے کی کوشش 444
ہندوؤں کے مذہبی تصور کی آبیاری کرنے کے سلسلہ میں ابوکلام آزادؒ کی قرآنی تفسیر 445
1933 میں اس تفسیر کے خلاف پرویزؒ کا لکھا جانے والا پہلا تنقیدی مضمون 446
مولانا ابوکلام آزاد مرحوم کی قرآنی تفسیر کی سیاسی اہمیت کے پیش نظر اس کے تراجم 447
کیا اخلاقیات کی چند باتوں سے دین اسلام مکمل ہو جاتا ہے؟ 448
مذہبی طور پر ہم نے اپنے اپنے تصور کے مطابق ثواب اور پھر نجات کا 'مکتی کا' حصول ممکن بنا رکھا ہے 449
خدا تعالیٰ نے انسانیت کو مذہب نہیں بلکہ دین یعنی اجتماعی نظامِ حیات عطا کیا ہے 450
سلسلہ نبوت کی آخری کڑی نے بھی انسانوں کے تراشیدہ مذہب کی بجائے دین عطا کیا تھا 450
مسلمانوں میں اور دیگر اہل مذاہب میں فرق: قرآن حکیم کا محفوظ ہونا ہی ہے 450
دنیا بھر میں اگر کسی قوم کے پاس سچا دین اپنی اصلی شکل میں ہے تو وہ پیش کرے 452
قوموں کے یا انسانوں کے مابین سر پھٹول ہونے کی بنیادی وجہ نظام ہائے زندگی ہے 452
آج پوری دنیا کے کمیونزم اور کیپٹل ازم کے نتائج ہمارے سامنے ہیں 453
مغربی جمہوریت کا نظام جس میں آدمیوں کو گنا جاتا ہے تولا نہیں جاتا 453
نظام ہائے زندگی کے متعلق نبی اکرمؐ کا اعلانِ عظیم 454
الدین کے ہوتے ہوئے دنیا بھر کے مسلمان صدیوں سے مذہب کے ہی پیروکار رہیں 455
ہمارے ہاں ہونے والے مناظروں کی کیفیت میں ہماری ایک بنیادی غلطی 455
الدین کو مذہب کی شکل میں کس طرح بدلا' کس نے بدلا اور اس کی لم کیا تھی؟ 456
نظام زندگی کی شکل میں الدین کی آخری محفوظ شکل کی

نوعیت وافادیت 457
الدین کے بنیادی خدوخال اوران کا نتیجہ 458
ہندوؤں کا دین وحی کی طرف سے عطا کردہ الدین کا کیونکر ہم پلہ ہوسکتا ہے؟ 459
آخرت پر ایمان کا بنیادی مفہوم 460
اجر کا مفہوم کیا ہے اور نیکی کسے کہتے ہیں؟ 460
قرآنی نظام زندگی کی تعریف: صرف نوع انسانی کی منفعت بخشی کا پروگرام ہے 461
قوم بنی اسرائیل کا بنیادی عقیدہ جس کی بنا پر یہ قوم تباہ ہوئی: وہ نسبی طور پر ایک قوم ہے 461
کوئی بچہ خواہ وہ کسی قوم میں پیدا ہوا اسے برابر کی حیثیت حاصل ہوتی ہے، وہ نہ کافر ہوتا ہے نہ مسلم 462
ایک مسلمان بچے کو بھی بنیادی حقیقتوں پر نئے سرے سے ایمان لانا ہوتا ہے 463
مسلمان ہونے کیلیے کتاب پر ایمان بنیادی شرط ہے 463
قرآن حکیم کے مطابق ایمان کے صرف پانچ اجزا ہیں 464
قرآن حکیم کو سمجھنے کا طریق ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہیے 464
ایمان اور کفر میں حدِ امتیاز خدا کی طرف سے نازل کردہ کتاب کے مطابق فیصلے کرنا ہے 465
مملکت کے ہر شہری کے لیے ضروری ہوگا کہ وہ مملکت کے قانون کو پیش نظر رکھے 466
غیر مسلموں کیلیے حکومتِ وقت کا فریضہ اور اُن کے حقوق کا تعین 466
قرآن حکیم کے نزدیک نیکی کے عمل کی وضاحت 468
بغاوت کے سلسلہ میں قرآن حکیم کی وضاحت اور نیکی کا معیار 469

بسلسلہ ''مطالب القرآن فی دروس الفرقان''

مدیر کے قلم سے (چند گزارشات)

علامہ غلام احمد پرویز علیہ الرحمۃ کی پیدائش 9- جولائی 1903ء میں، موجودہ مشرقی پنجاب کے ضلع گورداسپور کے قصبہ بٹالہ میں ہوئی۔ ان کے گھرانے میں شریعت اور طریقت کا بڑا لطیف آمیزہ تھا۔ دادا، مولوی چودھری حکیم رحیم بخش حنفی مسلک کے ایک جیّد عالم اور سلسلۂ چشتیہ نظامیہ کے ممتاز بزرگ تھے، حاذق طبیب بھی تھے لیکن اسے ذریعہ معاش نہیں بنایا تھا۔

آپ نے 1927ء میں حکومتِ ہند کے مرکزی سیکرٹریٹ، ہوم ڈیپارٹمنٹ اسٹیبلشمنٹ ڈویژن میں ملازمت اختیار کی۔ آپ کی قلمی زندگی کا آغاز 1928ء سے ہوا۔ جب آپ نے مختلف موضوعات پر لکھنا شروع کیا جو اس زمانے کے مشہور مجلات مثلاً دارالمصنفین کے ماہنامہ ''معارف'' (اعظم گڑھ) اور حیدرآباد دکن کے رسالہ ''ترجمان القرآن'' میں شائع ہوئے اور انہوں نے بڑی مقبولیت حاصل کی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مسلمانانِ ہند نے اپنا دامن تحریک ''جنگ آزادی'' سے باندھا ہوا تھا، جو بباطن اس ملک میں ہندو راج کے قیام کے منصوبوں پر عمل پیرا تھی۔ 1930ء میں علامہ اقبالؒ نے الہٰ آباد کے مقام پر مسلمانوں کے سامنے ایک واضح نصب العین رکھا تھا۔ ڈاکٹر محمد اقبال (1938-1877ء) اور قائداعظم محمد علی جناح (1948-1826ء) کے ایماء پر ماہوار مجلّہ طلوع اسلام کے دورِ جدید کا اجرا مئی 1938ء کے شمارہ سے کیا۔ اس ماہوار مجلّہ میں آپ نے قرآن کریم کے عطا فرمودہ ''دو قومی نظریہ'' اسلامی مملکت کی ضرورت اور اس کے بنیادی تقاضوں پر گرانقدر مقالات لکھے۔

درسِ قرآن کا سلسلہ

آپ نے درسِ قرآن کریم کے سلسلے کا آغاز بہت پہلے دوران ملازمت دہلی اور شملہ میں متفرق خطبات سے ہی کر دیا تھا لیکن جب آپ اگست 1947ء میں پہلی مرتبہ بسلسلہ سرکاری مرکزی ملازمت دہلی سے براہِ راست کراچی تشریف لائے تو کچھ عرصہ بعد سعید منزل کراچی کے بزرگ ڈاکٹر سعید مرحوم (م-1956ء) سے رسم و راہ بڑھے تو پرویزؒ کے نیپیئر بیرکس کراچی والے مکان کے صحن میں، نیم کے درختوں کے سایہ تلے قرآنِ کریم سے متعلق باتیں پوچھنے والے احباب کی نجی نشست نے ہفتہ واری دروسِ قرآنیہ کی شکل اختیار کر لی۔ دروس کی ان مجالس کے بانی بھی ڈاکٹر سعید مرحوم تھے اور روح رواں بھی وہی۔ اس طرح پاکستان میں

ان کا درسِ قرآن کا یہ سلسلہ 1950ء سے شروع ہوا۔

اس وقت قرآن حکیم کا یہ درس مسلسل نہیں تھا' مختلف موضوعات سامنے آتے تھے اور ہر موضوع کے متعلق قرآن کریم میں جو کچھ آیا ہے وہ خطیبانہ انداز میں سامعین کے سامنے پیش کر دیا جاتا تھا۔ کراچی میں یہ سلسلہ 1958ء تک جاری رہا۔

مرکزی حکومت پاکستان 1955ء میں سے قبل از وقت ریٹائرمنٹ لے کر' جب علامہ پرویز علیہ الرحمۃ اپریل 1958ء میں کراچی سے منتقل ہو کر لاہور آئے تو جولائی 1958ء سے' یہ سلسلہ درس' اپنے ہی مکان (25-گلبرگ' لاہور) سے شروع کیا۔ ابتداءً درس کے موضوعات اسلام کے ایسے بنیادی تصورات اور اصطلاحات ہوتے تھے جن کے سمجھے بغیر مسلسل درسِ قرآن کی تفہیم آسان نہ ہو سکتی تھی۔

لاہور سے پہلا باقاعدہ درسِ قرآن ستمبر 1960ء میں شروع ہوا' جس کی تکمیل سوا سات سال کے بعد اتوار 31 دسمبر 1967ء میں ہوئی۔ ان دروس کو ٹیپس (آڈیو) میں محفوظ کر لیا جاتا تھا۔

اب سامعین درسِ اوّل کا اصرار تھا کہ درس کا دوسرا دَور شروع کیا جائے۔ چنانچہ 17 مارچ 1968ء میں یہ سلسلہ از سرِ نو شروع کیا گیا۔ یہ دور 5- اکتوبر 1984ء تک' 17 سال مسلسل' 30 ویں پارے کی سورۃ المطففین کی آیت 26 تک ہی پہنچا تھا کہ آپ بیمار ہو گئے اور 24-فروری 1985ء کی شام' جہانِ فردا کی پُرنور اور حسین وجمیل وادیوں کی جانب' زندگی کے اگلے سفر کی طرف جادۂ پیما ہو گئے۔

علامہ غلام احمد پرویز علیہ الرحمۃ اکتوبر 1979ء میں' درس قرآن کے اس دوسرے دور میں سورۃ لقمان تک پہنچ گئے تھے۔ ان ایام میں باہر کے احباب' جو سورۃ الفاتحۃ کے دروس' سنا کرتے تھے' کا تقاضا تھا کہ پرویزؒ صاحب اپنی آواز میں سورۃ الفاتحۃ کو دوبارہ ریکارڈ کروا دیں کیونکہ کیسٹس کی آواز کی کوالٹی میں فرق پڑ گیا تھا۔ اس طرح پرویزؒ نے دوبارہ سورۃ الفاتحۃ کے دروس ریکارڈ کروائے اور چونکہ 1968ء کے بعد 1979ء تک آپ کے فہم وبصیرتِ قرآن میں بھی اضافہ ہو گیا تھا اس لیے موجودہ دروس کی تعداد نو ہو گئی جب کہ پہلے دور کے دروسِ قرآن کی تعداد آٹھ تھی۔

درسِ قرآن کا یہ دوسرا دور' تصریف آیات کی روشنی میں' پہلے دور کی نسبت زیادہ مفصل انداز میں تھا۔ قرآنِ کریم کو ایک نصاب (Curriculum) کی کتاب کی طرح احباب کے سامنے پیش کیا گیا یعنی ایک ایک لفظ کی تشریح کرتے ہوئے متعلقہ آیت کا مفہوم متعین کیا گیا اور پھر آیت کا ربط دیگر آیات کے ساتھ قائم کرتے ہوئے قدم بقدم' آگے بڑھتے چلے گئے۔

آج محترم جی اے پرویز علیہ الرحمۃ کے ارزاں فرمودہ دروسِ قرآن آڈیو اور ویڈیو کی شکل میں قریباً سات سو سے زیادہ کی تعداد میں محفوظ ہیں۔ ان دروس کو کتابی شکل میں طبع ہونے والی تمام تفاصیل کو بعینہٖ دے دیا جائے وہ اس لیے کہ ان دروس میں پیش

کردہ تمام تحقیقی مواد ان دروس کے علاوہ کہیں اس انداز سے موجود نہیں۔ چنانچہ اس مواد کی روشنی میں متعدد عنوانات وموضوعات پر تحقیق وتدقیق کے نئے ابواب وا کیے جاسکتے ہیں۔

جناب غلام احمد پرویز علیہ الرحمۃ کی دلی خواہش تھی کہ ان کے دروسِ قرآن کو اگر کتابی شکل دے دی جائے تو آگے چل کر یہ ایک تفسیر کی صورت اختیار کرلے گی چنانچہ اس مقصد کی تکمیل کے لیے اُن کے ایک رفیق عزیز' ملک ظہور احمد مرحوم' جن کا تعلق راولپنڈی بزم سے تھا' نے لبیک کہتے ہوئے ان دروس کو Shorthand (مختصر نویسی) میں لکھ کر Reproduce (چربہ پیدا) کرنے کا بیڑا اُٹھایا۔ انہوں نے تقریباً 15 پاروں کے دروس کو' جو ٹیپس میں محفوظ تھے' صفحہ قرطاس پر منتقل کردیا تھا۔ ایک کنونشن کے موقعہ پر پرویزؒ نے ان کی اس کاوش کا ذکر کرتے ہوئے انہیں خراجِ تحسین بھی پیش کیا تھا مگر افسوس کہ (ٹرسٹ کے معتبر ذرائع کے مطابق) مرورِ زمانہ کے ہاتھوں' ان میں 70 فی صد دروس کہیں بھی مل نہیں پائے۔

بزمِ طلوعِ اسلام لاہور کا پراجیکٹ

اس لازوال علمی خزینہ کی اہمیت کے پیشِ نظر' احباب کے اصرار پر اور ادارہ طلوعِ اسلام کے زیرِ اہتمام بزمِ طلوعِ اسلام لاہور نے' ان دروسِ قرآن کے ٹیپس/کیسٹس پر سے مواد کو باقاعدہ قرطاس کے صفحات پر منتقل کرنے کے کام کا آغاز اکتوبر 2003ء سے کر دیا تاکہ ان دروس کو کتابی شکل میں ہدیۂ قارئین کیا جاسکے۔ اب تک اس سلسلہ کی متعدد کتب (سورۃ النحل سے سورۃ یٰسین تک' سورۃ الفاتحہ اور پارہ 29 اور 30 تک) زیورِ طباعت سے آراستہ وپیراستہ ہوکر منظرِ عام پر آچکی ہیں۔

پرویز علیہ الرحمۃ کا اسلوبِ بیان

آپ کا اسلوبِ بیان بڑا رواں اور دلکش ہے۔ علم کی اس قدر بلندیوں کے باوجود' آپ کی تحریر اور بیان (دونوں) میں ایسی جاذبیت ہوتی ہے کہ ایک عام سطح کا غیر فنی انسان (Non-professional) بھی اس سے لطف اندوز ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ کی تصانیف' تقاریر' دروسِ قرآن کو اگر محض ادبی نقطہ نگاہ سے دیکھا جائے تو بھی وہ اس قابل ہیں کہ ان کا عام مطالعہ کیا جائے اور آپ کے دروس اور تقاریر کو سنا جائے۔

تفسیر قرآن کے لیے دروس کی اولین اشاعت

درس کا انداز تصنیفی انداز سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ چنانچہ ان دروس کو اشاعت کے لیے ازسرِ نو مرتب شکل میں پیش کرنا ہوتا ہے۔ اس کے لیے علامہ پرویزؒ نے اپنے ایک رفیق (اخلاق احمد صاحب) سے تفسیر کو املا کرایا اور مطالب الفرقان کے نام سے اس کی اشاعت کا اہتمام کیا لیکن مطالب الفرقان کی پہلی جلد سے شروع ہوکر یہ سلسلہ جب چھٹی جلد تک ہی پہنچا تھا کہ آپ داغِ مفارقت

دے گئے۔ساتویں جلد آپ کی وفات کے بعد شائع ہوئی۔

جب بزمِ طلوع اسلام لاہور نے ان دروس کو کتابی شکل میں منتقل کرنے کا بیڑا اٹھایا تو طے یہ پایا کہ ان کتابی شکل میں طبع ہونے والے دروس کی ان تمام تفصیلات کو بعینہٖ دے دیا جائے۔وہ اس لیے کہ ان دروس میں پیش کردہ جو تفصیلاتی اور تحقیقی مواد مہیا کیا گیا ہے' وہ مواد تاریخ وتحقیق کی کتب میں کم کم ہی ملتا ہے۔پرویز صاحبؒ کی طرف سے پیش کردہ یہ مواد تحقیق کے لیے قابلِ قدر ہے اور دوسرا یہ کہ اس مواد کی روشنی میں یا اسے ترتیب سے استعمال میں لاتے ہوئے متعدد عنوانات/موضوعات پر تحقیق وتدقیق کے نئے ابواب وا کیے جاسکتے ہیں جنہیں اس مواد کے بغیر مدوّن ومرتب کرنا قریباً ممکنات میں سے نہیں تو ازبس محال ضرور ہے۔ان میں سے چندایک عنوانات وموضوعات درج ذیل ہیں:

1- **تحریک طلوع اسلام کی تاریخ:** تحریک طلوعِ اسلام ایک فکری تحریک ہے۔اس کا مقصد قرآنِ کریم کے پیغام کو بایں نمط عام کرنا ہے کہ یہ صداقت ایک محسوس حقیقت بن کر سامنے آجائے کہ انسانی زندگی کے مسائل کا حل اس دستاویز خداوندی کے سوا کہیں سے نہیں مل سکتا اور نوعِ انسانی کی مشکلات اسی نظام کی رو سے دور ہوسکتی ہیں جو اس صحیفۂ مقدس کے خطوط پر متشکل ہوگا۔دروس کے مواد سے یہ تاریخ لکھی جاسکتی ہے۔

2- **تحریک پاکستان کی تاریخ:** یہ مواد کثرت سے ان دروس میں بکھرا پڑا ہے جو کہیں اور سے نہیں مِل سکتا۔اس میں حصولِ پاکستان کے سلسلے میں پھیلائی جانے والی غلط بیانیاں ہیں' غلط فہمیاں ہیں' ان کا ازالہ بھی موجود ہے اور غرض وغایت بھی دروس کے مواد سے تحریک پاکستان کی تاریخ مرتب کی جاسکتی ہے۔

3- **اسلام کی تاریخ (مسلمانوں کی نہیں):** مثلاً 23 فروری 1969ء کا درس' اسلام کی تاریخ قابلِ مطالعہ ہے کہ موجودہ مذہب کس طرح بنا کہ یہ کہنا پڑا کہ عالمگیر صداقتیں تمام مذاہب میں یکساں طور پر موجود ہیں اور اسلام کو دین سے مذہب میں بدل کر رکھ دیا۔قریباً قریباً تمام دروس میں اس بکھرے ہوئے مواد سے اسلام کی تاریخ ترتیب دی جاسکتی ہے۔جو آج کہیں بھی کتابی شکل میں موجود نہیں ہے۔

4- **تاریخ پاکستان'** تہذیب وتمدن اور آثارِقدیمہ سے ارتقا کی تھیوری پر روشنی اور معاشرت پر' اقوام پر' تقلید کے اثرات پر بڑا فکر انگیز مواد موجود ہے' اسے اگر کتابی شکل میں پیش کردیا جائے تو اس سے علم وآگہی کے کئی ابواب مستقبل کے قاری کو شمع قرآن سے منور کرجائیں گے۔

5- **اقوام میں رسوم وروایات کی داستان اور معاشرت پر ان کے اثرات:** وہ مواد ہے جو اقوام کے اسبابِ زوال کو پیش کرتا ہے کہ جو اقوام انہی کو مقصود بالذات (End) سمجھ لیتی ہیں تو پھر وہ اس قعرِ مذلت میں جاگھرتی ہیں۔اس مواد سے علم بشریات اور

علم سماجیات پر کتب مدوّن کی جاسکتی ہیں' جوقرآن کریم نے اصولوں کو بالتصریح واضح کرسکیں گی۔

6- احیائے اسلام کے سلسلے میں کی جانے والی کوششوں کی نوعیت کی داستان اوراس تحریک کے خلاف اٹھنے والی متعدد تحاریک کی کہانی۔ یہ سب کچھ ان دروس میں موجود ہے۔

7- عالمی سطح پر دارالعلوموں کے نصاب کی حالت اوراس کے متنوع مضمرات

وہی فطرتِ اسداللّٰہی' وہی مرحبی وہی عنتری

تشتت وانتشاراورگروہی تشدد کے اس دور میں جتنی ضرورت آج اس کی ہے اس سے پہلے شاید ہی ہوگی۔ کردار کی تشکیل میں حائل موانعات سے ہماری آج کی مفلسی اور بدچلنی یہیں تو جڑ پکڑتی ہے' تعلیم (Education) سے اغماض اس کا آغاز ہے۔ یہ سارا مواد ان میں موجود ہے۔

8- انسانی فکرونظر کی ہزاروں سال پر پھیلی ہوئی داستانِ حیات کا مآل وانجام اور آج پھر تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی ہے۔ یہ سب کچھ ان دروس میں موجود ہے۔

9- مذہب پرست اقوام کی تاریخ اورانجام کی داستان جسے آج ثواب اور''حوروں'' کے پیرائے میں عام کرکے' اس جہان کو جہنم زا بنایا جارہا ہے۔ اس کی علت غائی اور تدارک کا سامان بھی ان میں وافر مقدار میں دعوتِ فکرِ قرآنی دے رہا ہے۔

10- فکری سازشوں کی طویل داستان جس نے آج سب کو جہنم کے دہانے لا کھڑا کیا ہے:

نہ ستیزہ گاہ نئی' نہ حریفِ پنجہ فگن نئے

یہ بڑا ہی اہم مواد ہے جس پر ایک فکری تاریخ کی تدوین کی جاسکتی ہے اوراس فکر کے متنوع گوشے ہیں۔

11- آج محققین اُس وقت کے مروّجہ محاورات پر کام کرسکتے ہیں تاکہ اُس دور کے تمدن اور ارتقا کو سمجھ سکیں۔ ان دروس میں پنجابی محاورات کی بھرمار ہے جواس وقت کے تمدن وتہذیب پر خوب روشنی ڈالتے ہیں اور جیتی جاگتی دنیا مالہ وماعلیہ کے ساتھ ابھر کر سامنے آجاتی ہے اور بتاتی ہے کہ دستاویزِ خداوندی سے انحراف کیسے ہوا۔ یہ مواد علم لسانیات میں گرانقدر اضافہ ہے۔

12- اسلام کے زوال کے اسباب کا مواد کہ دینِ اسلام کیسے مذہب بنا ان دروس میں بتمام وکمال موجود ہے۔ اوران اسباب کی تصریح نئے انداز سے کرنے کے لیے بہت سے نئے علوم کے راستے ہموار کرتا نظرآتا ہے۔ یہ آنے والے محقق دورمورخ کے لیے ایک انمول خزینہ ہے۔

13- مختلف نظامہائے زندگی مثلاً کمیونزم' سوشلزم' سرمایہ داری نظام وغیرہ کا پس منظر' پیش منظر' لزوماتِ جمہوریت اوراسلام کے نظام سے ان کا ٹکراؤ۔ یہ ہیں فکرانسانی کے الجھے ہوئے مسائل جن کے لیے عقلِ انسانی کے پاس آج حیرت کے سوا کچھ بھی

نہیں۔عقلِ انسانی کی گتھیوں کوسلجھانے والا یہ سب موادان دروس میں موجود ہے۔

14- پاکستان میں عائلی قوانین کی داستان کے متنوع پہلو' ضبط ولادت تاکہ گھر کا یونٹ خوشگواررہ سکے۔قرآن کی روشنی میں غوروفکر کی دعوت دے رہا ہے۔یہ مواد آج کی ضرورت بھی ہے اور قرآن کا تقاضا بھی۔

15- قوم بنی اسرائیل اورتحریک پاکستان میں مماثلت کے اس بھنور سے نکالنے کے لیے مواد کی آج جتنی دنیا کوضرورت ہے پہلے کبھی نہ تھی۔

16- قرآنِ کریم کے خلاف سازشوں کے جال: قرآنِ کریم کی حفاظت کا ذمہ تو خدا نے لیا لیکن انسان نے اس کے ساتھ کیا کیا ہے' اس کی طویل فہرست وتفصیل دروسِ قرآن کی ان کتب میں ملے گی۔

17- قرآن مجید کی حقیقی تعلیم کی قدر و قیمت کو جاننے اور سمجھنے کے اصول وطریق مثلاً یہ کہ دنیا کے مختلف مذاہب اوراقوام میں اوران کے فلسفے میں پہلے اعتقادات کیا تھے' نظریات کیا تھے اور پھر کیا سے کیا ہو گئے۔یہ تمام تفصیل معہ عنوانات ان دروس میں وافر مقدار میں موجود ہے۔

18- ''تصوف کے دور کی ہڈ بیتیاں'': یہ پرویزؒ کی اپنی زبانی ملیں گی۔یہ ان کی زندگی کا وہ حصہ ہے جو تصوف کی وادیوں کی جان لیوا مشقتوں کی نذر ہو کر رہ گیا۔اس پر تاریخی' فلسفیانہ اورعلومِ باطنیہ کے رموز وغوامض کی ایک بسیط اور غیر حقیقی دنیا موجود ہے۔جس کی تلخ حقیقت وہی پاسکیں گے جو ان مراحل سے گزرے۔

19- جناب غلام احمد پرویز علیہ الرحمۃ کی سوانح حیات' ان کی شخصیت کے نرم و نازک گوشے' موسیقی و کھیل کے لطیف پیرائے' مثلاً لکھنے لکھانے کا' مضمون نویسی کا شغف کہ افسانے لکھا کرتا تھا' عربی میں مضامین لکھا کرتا تھا' لباس کی تراش خراش' گھر کا ماحول' نانا کا احوال (حوالہ مطالب القرآن فی دروس القرآن' 3-نومبر 1968ء کا درس) مشغلہ حکمت بھی رہا' تصوف کی ریاضتیں بھی خوب کیں وغیرہ وغیرہ۔اس مواد سے سوانح پرویزؒ مرتب کی جاسکتی ہے' جو بڑی ہی مستند بھی ہوگی اور ذکر وفکر کے کئی گوشے بھی طشت از بام کردے گی۔

20- جناب پرویزؒ کے لازوال تعلقات

ا) مولانا محمد اسلم جیراجپوریؒ (1879-1955ء)

ب) قائداعظم محمد علی جناحؒ (1876-1948ء)

ج) ڈاکٹر محمد اقبالؒ (1877-1938ء)

د) ڈاکٹر عبدالوہاب عزامؒ (م1959ء)

ان کے ساتھ تعلقات سے فکرِ پرویز نکھری بھی اوران میں خاص طور پر ڈاکٹر عبدالوہاب عزام میں فکرِ اقبال کی تفہیم کے سلسلے میں نکھارقرآن بھی پیدا ہوا۔

یہ تعلقات قرآنِ کریم کے دیئے گئے نظام پر مرتکز ہوتے ہیں اورڈالتے ہیں روشنی سامعین کے قلب ونظر پر۔مگر یہ مواد اِدھر اُدھر دروس میں بکھرا پڑا ہے۔اسے مرتب کر کے سامنے لانے کی از بس ضرورت ہے۔

21- پرویز علیہ الرحمۃ پر لگائے جانے والے اعتراضات واتہامات کا قرآنِ حکیم کے نقطۂ نظر سے مکمل جواب موجود ہےاور درد و کرب کی کسک بھی۔یہ الزامات اور یہ کافرگری تو ہے ہی

اُسی سازِ کہن کی صدائے بازگشت

کہ لَاتَسۡمَعُوۡا لِهٰذَا الۡقُرۡاٰنِ (41:26)تم اس قرآن کو ہرگز نہ سننا۔یہ ان سنگلاخ وادیوں سے کس ہمت واستقلال سے گزرے،وہ ہدیۂ قارئین کرنے کی ضرورت ہے۔

22- نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دوسو سال بعد لکھی جانے والی تاریخ اورتفسیر قرآن کے نقائص اوران کے مضمرات قرآنِ کریم کی روشنی میں- یہ مواد ان میں موجود ہےاورآج وقت کی بڑی اہم ضرورت بھی ہے۔

23- حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی مکمل سیرت'اسی بیاسی جنگیں' اورحیاتِ طیبہ کے نرم ونازک گوشے جوآج ہمارے لیے اسوۂ حسنہ ہیں اورقرآن حکیم کی روشنی میں وجہ قلب ونظر بنتے ہیں۔اس مواد سے مکمل کتاب تیار کی جاسکتی ہے۔

24- سامعین کی علمی سطح کے مطابق درس کے متن ومواد کی برجستہ' والہانہ ادائیگی کا فن موجود ہےاوروہ اصول ونوعیت بھی جس سے بات ''طاقت پرواز مگر رکھتی ہے'' اورانسانی اصول نفسیات کے ابواب وا کرتی ہے۔ان دروس کے مواد میں ان پر بہت کچھ موجود ہے۔

25- شعور کی اقسام'اس کی تہیں' علاج اورطب نفسی۔

ان دروس میں انسانی نفسیات کی تہیں کھلتی ہیں اورزندگی کی بقا کو قابلِ ادراک بناتی ہیں اورحالتِ نیند پر روشنی ڈالتی ہیں۔اس مواد کی روشنی میں طبی سائنس اورنفسیات کی بالکل نئی جہتیں محققین کو دعوت فکر دیتی ہیں اورعلاج معالجے کے لیے اساس مہیا کرتی ہیں۔

26- دورِ حاضر کے تمام مسائل (معاشی' معاشرتی' سیاسی اورافلاکی) اوران کے قرآنی حل موجود ہیں مگر ہے کوئی جو اس دستاویزِ خداوندی کو بڑھ کر اٹھالے! یہاں اسے اٹھانے کا مواد دعوتِ عام دے رہا ہےمگر ہے یہ یارانِ میکدۂ قرآن کے لیے۔

27- جتنی کسی قوم میں دین کی بجائے مذہب کی گرفت زیادہ ہوتی ہے'اتنی ہی وہ قوم زیادہ ذلیل وخوار ہوتی ہے۔کیوں؟......

نہ رہی کہیں اسداللہی، نہ کہیں ابولہبی رہی

متعدد دروس میں اس ''کیوں'' کا جواب موجود ہے مثلاً فروری 1969ء کی 23 تاریخ کا درس۔

28- ایران اور یونان کی دونوں تہذیبوں کی کہانی جن کی بساط اسلام نے الٹ کر رکھ دی۔ کیسے؟ یہ ہے اہم سوال جس کا جواب ان دروس میں موجود ہے۔

29- بطلیموسی نظام اور اس کے آج تک وضع کردہ نظامہائے حیات پر اثرات- کیوں اس سے حیات فکر کی جان نہیں چھوٹی؟ اس کا صافی وشافی جواب ان دروس کے مواد میں موجود ہے۔

30- مغربی اور مشرقی مفکرین کی سوچ اور قرآنِ حکیم کا اعجاز وایجاز' جان اور تن کا معمہ۔ بس یوں کہیے

کہ کوئی کارواں سے ٹوٹا کوئی بدگماں حرم سے

کہ امیر کارواں میں نہیں خوئے دلنوا سازی

31- ایران کی تاریخ اور فتح ایران کی کہانی مگر رہا پھر بھی ''عجمی اسلام- کیوں؟

جاں لاغر وتن فربہ و ملبوس بدن زیب

دل نزع کی حالت میں' خرد پختہ و چالاک

32- مغربی مفکرین و مادیین کے انکشافات کی کتب مثلاً

کاف مین کی	Black Holes & Walked Space Time
ڈینی سن کی	Emotions as the Basis of Civilization
کارلائل کی	Hero and Hero worship
اروِن شرڈنگر کی	What is Life
راشڈل کی	Theory of Good and Evil
ایڈورڈ گبن کی	The History of the Decline and Fall of the Roman Empire
میسن (مدیر) کی	The Great Design

ایرک فرام کی بیشتر کتب اور اسی طرح دوسرے بہت سے مفکرین کے مضامین اور کتب اور کتنے ہی مفکرین سے ملاقاتیں۔ یہ چند ایک تو محض بطور نمونہ دی گئی ہیں۔ ان کے نقد ونظر میں قرآنِ کریم نے بہت سے فکری گوشے انسانی آنکھ کے سامنے کھول کر رکھ دیئے ہیں۔ ان کی روشنی میں ہمارے آج کے نصاب میں یونیورسٹی کی سطح پر تبدیلیاں ممکن ہیں

جن کی آج سخت ضرورت ہے۔

33- افراد اور اقوام کی زندگی کو صحیح خطوط پر استوار اور محکم کرنے کے لیے الفاظ اور اصطلاحات کے کردار کی اہمیت' اس میں سوچ کی بالیدگی' افراد و اقوام کے باہمی تصورات اور تعلقات کی نوعیت' ذہنی پس ماندگی اور ادراک کی مفلسی، تباہی بربادی اور زبوں حالی کی اصل وجہ سے دورِ ملوکیت کے باعث فرقہ بندی کے خودساختہ مذہبی تصورات جڑ پکڑتے ہیں اور پھر بتدریج غیر اسلامی رنگ کی درشت تہہ سے آئینہ اسلام کا حرکیاتی اور ارتقائی نظریہ یک سر جامد ہو کر رہ جاتا ہے۔ علامہ پرویزؒ کی طرف سے یہ پیش کردہ درس اسی طرح کے بے شمار مضامین' موضوعات' دعوتِ غور و فکر دے رہے ہیں۔ یہ وجہ ہے کہ اس گرانقدر تفصیل کو اسی طرح دے دیا گیا ہے تاکہ آنے والی نسل اسے اپنے نظر و فکر کے آئینے میں لا کر قرآنِ کریم کے حقائق سے مستفیض ہو سکے اور قوم کی جہالت دور کرنے اور اسے قرآنِ حکیم سے قریب تر لانے کے لیے عملی اقدامات کر سکے۔

کہ یہی ہے امتوں کے مرضِ کُہن کا چارہ

ڈاکٹر منظور الحق

مدیر و پروفیسر (ریٹائرڈ)

جامعہ سندھ' حیدرآباد

0300-8377505

قرآن حکیم کے طالب علموں کے خوشخبری

علامہ غلام احمد پرویزؒ کے سات سو سے زائد دروسِ قرآنی پر مبنی تفسیری سلسلہ کے تحت بزمِ طلوعِ اسلام لاہور کی طرف سے مندرجہ ذیل تفسیری کتب کی اشاعت الگ الگ جلدوں میں ہو چکی ہے۔ یہ جلدیں بڑے سائز کے بہترین کاغذ پر خوبصورت طباعت اور مضبوط جلد بندی کے ساتھ خصوصی رعایتی ہدیوں پر دستیاب ہیں۔ جن کی تفصیل درج ذیل ہے

نام کتاب	صفحات	نام کتاب	صفحات
سورۃ الفاتحہ (سٹوڈنٹ/اعلیٰ)	240	سورۃ الفرقان	389
سورۃ بقرہ مکمل تین جلدوں میں	1600	سورۃ الشعراء	453
سورۃ النحل	334	سورۃ النمل	280
سورۃ بنی اسرائیل	396	سورۃ قصص	334
سورۃ الکہف و مریم	511	سورۃ العنکبوت	387
سورۃ طٰہٰ	416	سورۃ روم، لقمان، السجدہ	444
سورۃ الانبیاء	336	سورۃ الاحزاب، سبا، فاطر	569
سورۃ الحج	380	سورۃ یٰسین	151
سورۃ المومنون	408	29واں پارہ (مکمل)	541
سورۃ النور	263	30واں پارہ (مکمل)	624

پہلا باب: سورۃ البقرۃ (1)' (آیات 1 تا 2)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الٓمّٓ ① ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ②

عزیزانِ من! آج مئی 1968 کی 26 تاریخ ہے اور ہم اپنے درس کے سلسلۂ نو میں دوسری کڑی تک پہنچ گئے ہیں۔

قرآنِ حکیم کے حروفِ مقطعات کی اہمیت اور حقیقت

سابقہ درس میں، ہم نے سورۃ الفاتحۃ کو ختم کیا تھا آج سورۃ البقرۃ الٓمّٓ شروع ہوتی ہے۔ اس سورۃ کے شروع میں بھی اور قرآنِ کریم میں اور سورتیں بھی ہیں جن کے ابتدا میں اس قسم کے حروف آتے ہیں جنہیں الفاظ نہیں کہا جا سکتا۔ ویسے تو ہر لفظ حروف ہی کا مرکب ہوتا ہے اور عربی زبان میں تو ہر لفظ کا مادہ حروف ہی سے بنتا ہے۔ حروف مل کر لفظ بنتے ہیں اور لفظ اپنا ایک متعین معنی دیتا ہے لیکن مقطعات سے لفظ نہیں بنتے اسی لیے جب ان کو پڑھا بھی جاتا ہے تو لفظ کی طرح نہیں پڑھا جاتا مثلاً الٓمّٓ (2:1) کو الٓمّٓ نہیں پڑھا جاتا بلکہ حروف کے اعتبار سے ہی اسے پڑھا جاتا ہے: الٓمّٓ (2:1)۔ یہ حروف مقطعات کہلاتے ہیں یعنی قطع کیے ہوئے اور یہیں سے ان کے معنی متعین ہو جاتے ہیں۔ لکھنے کو تو اس کے متعلق اتنا کچھ ہمارے ہاں لکھا گیا ہے کہ کثرتِ تعبیر سے خواب ہی پریشاں ہو گیا ہے لیکن بات بڑی مختصر اور آسان سی ہے۔ انگریزی زبان میں جنہیں Abbreviations (مخففات) کہتے ہیں وہ الفاظ کے حروف ہی کو الگ الگ لکھ دیا جاتا ہے اور اس Abbreviation (مخفف) سے اُس لفظ کے معنی لے لیے جاتے ہیں جیسے i.e, eg, PS, RSVP وغیرہ۔ یہ مقطعات ہیں۔ عربوں کے ہاں بھی اس کا رواج تھا اور عربوں کے ہاں ہی نہیں ہے بلکہ عبرانی زبان میں بھی یہ چیز ملتی ہے، تورات میں بھی یہ ملتی ہے۔ گویا Semitic Race (سامی النسل) میں ان کے ہاں زبان کا یہ ایک اسلوب تھا کہ وہ ان Abbreviations

Abbreviations (مخففات) سے شروع کیا کرتے تھے۔

عربی زبان کی فضیلت اور حروفِ مقطعات کی مزید وضاحت

قرآنِ کریم عربوں کی زبان میں نازل ہوا اور عربی مبین میں نازل ہوا۔ یاد رکھیے! عربی مبین کے اگرچہ معنی ''واضح عربی'' کے ہیں لیکن خود لفظ عربی کے معنی بھی ''واضح'' کے ہیں۔ اس لیے عربی مبین کے معنی صرف ''واضح عربی زبان'' نہیں بلکہ عربوں کے ہاں مختلف حصوں کی زبان کے لیے مختلف نام تھے اور ان میں سے بہترین، فصیح، بلیغ، صاف زبان خطہ حجاز میں قریش کے قبیلے کی تھی۔ اس قبیلے کی زبان کو ان کے ہاں خود عربی مبین کہتے تھے۔ اس لیے قرآنِ کریم نے جہاں کہا ہے کہ یہ عربی مبین میں نازل ہوا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اُس عربی میں نازل ہوا جو قریش کے ہاں حجاز کے خطے میں بولی جاتی تھی اور عربوں کے ہاں باقی حصوں کے مقابلے میں زیادہ واضح، جامع اور بلیغ تھی۔ ان کے ہاں Abbreviations (مخففات) یا مقطعات کا استعمال ہوتا تھا۔ قرآن چونکہ ان کی زبان میں نازل ہوا اس لیے قرآن نے اپنے ہاں اُسلوب بھی وہی رکھا جو عربوں کے ہاں عربی مبین میں زبان کا اُسلوب تھا اور یہی وجہ ہے کہ یہ مقطعات قرآن میں آئے تو کہیں کسی جگہ بھی یہ نہیں آتا کہ اُن میں سے کسی نے پوچھا ہو کہ صاحب! ان کے معنی کیا ہیں۔ وہ جانتے تھے کہ یہ کیا چیز ہے۔ جہاں تک میں نے غور کیا ہے یہ اللہ تعالیٰ کے جو اسماء الحسنٰی صفات خداوندی قرآن میں ہیں یہ اُنہی کے Abbreviations (مخففات) ہیں اُنہی حروف کے مقطعات ہیں۔ مثلاً الٓمّٓ (2:1) الف اللہ کے لیے ہے ل علیم کے لیے اور م حکیم کے لیے ہے۔ وہ الفاظ کے صرف پہلے حرفوں کو ہی نہیں لیتے تھے بلکہ تعین مفہوم کے لیے کسی بھی حرف کو لے لیتے تھے اور اس سے مقطعات بنا لیتے تھے۔ میں نے اپنے ہاں ''مفہوم القرآن'' میں بھی یہی معنی لیے ہیں اور درس میں بھی یہی معانی لیا کرتا ہوں۔ یہ سورۃ شروع ہوتی ہے: الٓمّٓ (2:1) خدائے علیم وحکیم کا ارشاد ہے کہ **ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ** (2:2)۔

الکتاب کا مفہوم ضابطۂ قانون ہے

اب بات یہاں سے شروع ہوگی ذٰلِکَ یہ کیا ہے؟ یہ **الْکِتٰبُ** ہے۔ میں نے اپنے تمہیدی درس میں یہ بیان کیا تھا کہ قرآنِ کریم نے اپنے آپ کو ''الکتاب'' کہا ہے۔ بنیادی معنی کی رو سے کتاب ''قانون'' کو کہتے ہیں۔ اس لیے ''اَلْکِتٰبُ'' ایک خاص ضابطۂ قانون ہوا۔ اس کی عربوں کے ہاں جو لغوی حیثیت ہے وہ یہ ہے کہ جب منتشر اوراق کی شیرازہ بندی کی جاتی تھی تو اس وقت اُسے کتاب کہا جاتا تھا۔ اس کے لیے یہ شیرازہ بندی شرط تھی۔ صحف تو منتشر اوراق کو بھی کہہ دیتے تھے لیکن کتاب اس وقت کہا جاتا تھا جب منتشر اوراق کی شیرازہ بندی کردی جائے۔ قرآن نے اپنی Introduction (تمہید) کے بعد سب سے پہلے اپنا تعارف ''اَلْکِتٰبُ''

کہہ کر کرایا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ یہ ضابطۂ قانون اس وقت ایک شیرازہ بند کتابی شکل کے اندر آ گیا تھا۔

قرآنِ حکیم کے متعلق ہمارے ہاں کئی تاریخی افسانے بنیادی طور پر ہی غلط ہیں

ہمارے ہاں وہ تمام افسانے موجود ہیں جن میں یہ کہا گیا ہے کہ نبی اکرمؐ کے زمانے میں قرآن کتابی شکل میں' اس ہیئت میں تھا ہی نہیں جس میں آج وہ ہمارے پاس ہے۔ یہ غلط ہے۔ قرآن کی داخلی شہادت اس پر شاہد ہے کہ یہ اسی صورت میں کتاب کی شکل میں تھا جس میں آج یہ ہمارے ہاں موجود ہے۔ اس کی ترتیب یہی تھی' اس کا انداز یہی تھا' یہ کتاب کی شکل میں تھا' شیرازہ بند تھا اور چونکہ خدا نے اس کی حفاظت کا ذمہ لے لیا تھا اس لیے یہ اُسی شکل میں آج تک ہمارے پاس چلا آ رہا ہے۔ اس میں کسی قسم کی کوئی تحریف نہیں ہوئی' حک و اضافہ نہیں ہوا' ردّ و بدل نہیں ہوا' نہ ہوا ہے نہ ہو سکتا ہے۔ اس لیے قرآن کے ماننے والوں کے لیے تو دلیل یہ ہے کہ خود خدا نے کہہ دیا ہے کہ ہم نے اسے نازل کیا' ہم ہی اس کی حفاظت کے ذمے دار ہیں۔ اور اگر ہم غیر مسلموں کے ہاں جائیں گے تو ہم تاریخی شہادات سے اِس چیز کو ثابت کر دیں گے کہ قرآن اُسی شکل میں ہمارے پاس چلا آتا ہے جس شکل میں اسے خدا سے پا کر نبی اکرمؐ نے امت کو دیا تھا۔ کہا ہے کہ **ذٰلِکَ الْکِتٰبُ** (2:2) یہ ہے وہ الْکِتٰبُ۔ اس "الکتاب" کی پہلی خصوصیت یہ بتائی کہ **لَا رَیْبَ ۛۚ فِیْہِ** (2:2)۔ عربی زبان میں شک بھی لفظ موجود ہے' ریب بھی موجود ہے۔ قرآنِ کریم نے خود شک کا لفظ بھی استعمال کیا ہے' ریب کا لفظ بھی استعمال کیا ہے بلکہ شک کے Adjective یعنی' صفت کے طور پر' اُس نے **شک مریب** (34:54) بھی کہا ہے۔ گویا ریب' شک سے کچھ مختلف چیز ہے اگرچہ اس کے اندر شک کے معنی آ جاتے ہیں لیکن ریب اس سے کچھ بڑھی ہوئی چیز ہے اور یہ بہت عظیم خصوصیت ہے۔

قرآنِ حکیم میں لاریب کا لفظ جن معنی میں استعمال ہوا ہے' اس کی وضاحت

قرآن نے شروع میں ہی اپنے متعلق کہہ دیا ہے کہ **لَا رَیْبَ ۛۚ فِیْہِ** (2:2)۔ اس میں ایک معنی تو یہ ہوں گے کہ اس میں کوئی چیز ایسی نہیں جسے آپ Doubtful یا مشکوک کہہ سکیں۔ یہ حقائق ہیں' یہ Realities ہیں' یہ صداقت ہے' یہ یقینی شے ہے' اس میں کوئی شے ایسی نہیں ہے جسے مشکوک کہا جا سکے۔ اور دوسری چیز یہ ہے کہ شک نہیں کہا بلکہ ریب کا لفظ آیا ہے۔ ریب کے معنی نفسیاتی الجھن کے' اضطراب کے' بے چینی کے ہوتے ہیں اور یہ بڑی چیز ہے جو قرآن کہہ گیا ہے۔ شک سے انسان میں ایک اضطرابی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ اندھیرے میں اندر جا کر جب ہم کچھ محسوس کریں' خواہ وہاں رسی پڑی ہوئی ہو اور کہہ دیا جائے کہ یہاں سانپ تھا' آپ دیکھتے ہیں کہ اس سے ایک عجیب قسم کی الجھن پیدا ہوتی ہے۔ جب تک وہ شک کی کیفیت رہتی ہے' وہ اضطراب اور الجھاؤ اور بے چینی باقی

رہتی ہے لیکن جب روشنی آجائے اور یہ معلوم ہوجائے کہ وہ کیا ہے یعنی یہ ضروری نہیں کہ وہ رسی ہو' وہ اگر سانپ بھی ہوا تو پہلی کیفیت جو آپ کے ہاں تذبذب کی ہوتی ہے وہ چلی جاتی ہے۔اب دوسری چیز آپ کے سامنے آ گئی۔سانپ بھی کیوں نہ ہو' ہوسکتا ہے کہ اُس سے آپ کو ڈر لگے' ہوسکتا ہے کہ اُس کے بعد سوچیں اُس سے بچنے کی آپ کوئی تدبیر کریں لیکن آپ کے ہاں کی نفسیاتی الجھن باقی نہیں رہتی۔

اس کتاب کو ماننے والے کسی نفسیاتی تذبذب کا شکار نہیں ہوتے

عزیزانِ من! جب کوئی شک یقین میں تبدیل ہوجاتا ہے' جب کوئی قیاس یا ظن علم کی حیثیت اختیار کرلیتا ہے تو انسان میں وہ جو ایک اضطرابی' نفسیاتی الجھن کی کیفیت ہوتی ہے' وہ باقی نہیں رہتی۔یہاں قرآن کے متعلق دونوں چیزیں آ گئیں کہ اس میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے' اُس میں کوئی چیز مشکوک نہیں ہے وہ حق ہے' یقینی ہے' سچی ہے' Reality ہے۔اور دوسرے یہ کہ اس کتاب کے Follow (پیروی) کرنے والے کے اندر کوئی نفسیاتی اضطراب' کسی قسم کا الجھاؤ' بے چینی' تردد' تذبذب نہیں رہ سکتا۔یہ کتنی بڑی چیز ہے! پہلی جو چیز ہے کہ وہ مشکوک نہ ہو' یہ خالص Intellectual چیز ہے' اُس کا تعلق ذہن سے ہے کہ علمی طور پر وہ جو شے ہے وہ غیر مشکوک ہے۔یہ دوسری چیز جو رَیۡبَ کی ہے' اس کا تعلق سائیکالوجی (علم نفسیات) سے ہے۔تو Psychologically (نفسیاتی طور پر) انسان کے Mind (ذہن) کو اس قدر اطمینان دیتی ہے کہ جو وہ اضطراب اور بے چینی قیاس اور ظن کی رو سے پیدا ہوتی ہے اس کے بعد وہ بھی باقی نہیں رہتی۔ایک لفظ میں آپ دیکھیے قرآن دونوں چیزیں کس طرح سے Cover کرکے چلا گیا۔علمی اعتبار سے غیر مشکوک' نفسیاتی اعتبار سے دل کو سکون اور اطمینان دینے والا' ایک لفظ ریب کے استعمال سے اور دو ہی گوشے ہیں' عزیزانِ من! انسانی دنیا کے۔یا ذہنی طور پر وہ قیاس آرائیوں میں گرفتار ہوگا یا قلبی طور پر اضطراب اور بے چینی کا شکار ہوجائے گا۔ایک صحیفہ' ایک الکتاب یہ ایک ان دونوں چیزوں کے لیے ایک علاج' ایک نسخۂ شفا قرآن کی صورت میں دیدیا ہے۔اس کی پہلی صفت تو اس کا یہ لَا رَیۡبَ ۛۚ فِیۡہِ ۚ (2:2) ہونا ہے۔

قرآنِ کریم کی دوسری صفت ھدًی ہے

قرآن کریم کی دوسری صفت یہ ہے' آپ اسے اس کا مقصد (Purpose) کہہ لیجیے کہ یہ ھُدًی لِّلۡمُتَّقِیۡنَ (2:2) ہے۔ ھُدًی کا لفظ سورۃ الفاتحۃ میں آچکا ہے اور اس کے متعلق تفصیل سے میں بتا چکا ہوں۔یہ اس قسم کی راہنمائی ہے جو ابھر کر سامنے آجائے' واضح طور پہ سامنے آجائے۔پہلی چیز تو یہ ہے کہ یہ راہنمائی ہے اور راہنمائی ایسی ہے جو کہیں ڈھکی ہوئی' چھپی ہوئی نہیں ہے کہ آپ کو اس طرح سے تلاش کرنی پڑے بلکہ وہ خود ابھر کر سامنے آجاتی ہے:

خدا کی طرف سے ایک ایسی راہنمائی جو صرف متقیوں کے لیے ہے۔اس پر اٹھنے والا اعتراض

اس راہنمائی کے لیے ایک شرط قرار دی ہے کہ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ (2:2) یہ راہنمائی متقین کے لیے ہے۔یعنی ان کے لیے ہے جن کی نگاہیں ان الفاظ کے معانی کی گہرائی پہ نہیں ہیں۔یہیں سے ان کے ذہن میں ایک اعتراض پیدا ہوا کرتا ہے۔ہمارے ہاں متقی تو کہتے ہی اسے ہیں جو دین میں بلند درجے پہ ہو یا دینداری میں اعلیٰ مقام پہ ہو۔ہمارے ہاں دین کا تو تصور ہی نہیں ہے اسے ہمارے ہاں دینداری کہتے ہیں جو دینداری میں بلند ترین مقام پہ پہنچ گیا ہو اُسے متقی کہتے ہیں۔ایک تو عام مسلمان ہوتے ہیں اور پھر ان مسلمانوں میں بلند درجے کے اوپر وہ ہوتے ہیں جنہیں متقی کہا جاتا ہے۔گویا یہ صحیح راستے کے اوپر چلنے والے ہیں اور اس طرح سے چلنے والے ہیں کہ وہ عام مسلمان سے بہت آگے بڑھے ہوئے ہیں، ممتاز ہیں، بلند درجہ پہ ہیں، جنہیں آپ مقربینِ خداوندی کہتے ہیں۔یعنی جنہیں متقی کہہ دیا جائے تو پھر تو کچھ اور کہنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی۔ سوال اور اعتراض یہ پیدا ہوتا ہے کہ جو پہلے ہی متقی ہے، صحیح راستے پہ چل رہا ہے اور چل بھی اس طرح رہا ہے گویا منزل پہ پہنچا ہوا ہے، اب یہ کہنا کہ اس کے لیے یہ راہنمائی ہے، وہ تو پہلے ہی صحیح راستے پہ چل رہا ہے، راہنمائی تو ان کے لیے ہونی چاہیے تھی جو صحیح راستے پہ نہ چل رہے ہوں۔صحیح راستے پہ چلنے والے کے لیے راہنمائی کے کیا معنی ہوئے!!! اگر یہ متقیوں کے لیے ہی ہدایت ہے تو پھر جو باقی ہیں ان کے لیے تو اس میں کچھ بھی نہ ہوا اور جو پہلے سے صحیح راستے پہ چل رہا ہے اُس کے لیے کہنا کہ یہ صحیح راستہ دکھانے والی ہے، تو یہ بڑی بے معنی سی چیز ہے۔یہ ہے اعتراض۔

مروجہ قرآنی تراجم کی پیدا کردہ الجھنوں کا حل

برادرانِ عزیز! آپ نے دیکھا کہ ہمارے ہاں قرآن کی اصطلاحات کا جو مروّجہ مفہوم لیا جاتا ہے اُس کی رو سے خود ہی کس قدر اعتراضات پیدا ہوتے ہیں۔ان اعتراضات کی بنا پر پھر بے چینیاں پیدا ہوتی ہیں حالانکہ کتاب وہ تھی جس کا پہلے دعویٰ یہ تھا کہ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ (2:2)۔یہ معاذ اللہ قرآن کا نقص نہیں ہے بلکہ الفاظِ قرآن کو جو معانی ہم نے خود پہنائے ہوئے ہیں یہ ان کا نقص ہے۔ ''متقین'' قرآن کی بڑی جامع اصطلاح ہے۔اس لفظ کا مادہ ''و ق ی'' ہے۔اس کو سمجھنے کے لیے یوں سمجھیے جو اربابِ لغت نے بھی سمجھایا ہے اور عربوں کے ہاں سمجھدار لوگوں نے بھی۔آپ دیکھتے ہیں کہ عربوں کا لباس بڑا ڈھیلا ڈھالا ہوتا ہے۔ کوئی ایک راستہ چل رہا ہو اور وہاں خاردار جھاڑیاں ہوں، اس میں اِدھر اُدھر سب کانٹے دار جھاڑیاں ہوں اور ڈھیلا ڈھالا لباس ہو۔اُن سے پوچھا گیا کہ بتاؤ تم اس وقت کیسے چلتے ہو۔اُنہوں نے کہا کہ ہاں صاحب! ہم کہیں اِدھر سے بچتے ہیں کہ یہ کانٹا ہمارے کپڑے میں نہ الجھ جائے، اور کہیں اُدھر سے بچتے ہیں کہ وہ دامن کو نہ الجھا دے۔اس طرح سے ہم بچتے بچاتے ہوئے اُن کانٹوں سے صحیح طور پہ نکل جاتے ہیں۔کہا ہے کہ اسے

متقی کہتے ہیں یعنی وہ جو راستے کی خطرناک گھاٹیوں سے بچ کر چلنا چاہے۔ چلنے والے اب دو قسم کے ہو گئے۔ مگر بات یوں سمجھ میں نہیں آتی۔ یوں کہو کہ ایک شخص نے دریا عبور کرنا ہے وہ دریا میں چھلانگ لگانے لگا ہے۔ آپ اُسے کہتے ہیں کہ یہاں نہ کودنا' یہاں پانی بڑا گہرا ہے' یہاں نہ جانا' اس کے نیچے مگرمچھ ہے' ٹھیک ہے وہ اس سے احتیاط برتے گا' اس سے سبق حاصل کرے گا کہ اُسے بتا دیا ہے کہ یہاں خطرہ ہے۔ اور جو شخص ڈوب کر مرنے کے لیے دریا میں کود رہا ہو' اُسے کہا جائے کہ یہاں نہ کودنا' پانی گہرا ہے وہ تو کودے گا ہی وہیں۔ جو خود ڈوب کر مرنے والا ہو' جو فیصلہ کر چکا ہو کہ میں نے خودکشی کرنی ہے' اُس سے یہ کہنا کہ یہ پڑیا نہ کھانا' سنکھیا ہے۔ اس کے لیے کسی صحیح راہنمائی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ راہنمائی کا سوال یا ہدایت کا سوال یا غلط اور صحیح میں امتیاز کا سوال اس کے لیے ہوگا جو غلط سے بچنا چاہتا ہو' جو خطرات سے محفوظ رہنا چاہتا ہو' جو زندہ رہنا چاہتا ہو' جو ہلاکت کی چیز کے قریب نہ جانا چاہتا ہو۔ جن کے اندر یہ کیفیت ہو کہ وہ زندگی میں راستے کی خطرناک گھاٹیوں سے بچ کر چلنا چاہتے ہیں' محفوظ طریق پر چلنا چاہتے ہیں' اُن کو متقی کہیں گے۔ یہ اندازِ سفر ہوگا کہ راستے میں کسی خاردار جھاڑی سے میرا دامن نہ الجھ جائے' میں راستے میں کسی گڑھے میں نہ گر جاؤں' کوئی ایسا راستہ نہ اختیار کر لوں جس میں اِدھر اُدھر کمیں گاہوں کے اندر ڈاکو چھپے ہوئے ہوں' درندے ہوں' سانپ ہوں۔ اگر ہوں تو میں ان سے بچ کر کیسے جاؤں؟ کہا ہے کہ جو راہرو اس انداز سے سفر اختیار کرنے کے لیے نکلے گا اُس کے لیے یہ صحیح راہنمائی دے گا' بتائے گا کہ جس راستے پہ چلے ہو' اس پہ نہ چلنا' یہ خطرناک ہے' یہ محفوظ راستہ ہے اور جو زندگی کے محفوظ راستے پر چلنا چاہے یہ اس کے لیے صحیح راہنمائی دیتا ہے۔

قرآنِ حکیم کے نزدیک صرف وہی شخص متقی ہے جو اپنی ذات کو خطرناک گھاٹیوں سے محفوظ رکھے

آپ نے غور فرمایا' عزیزانِ من! کہ پہلی ہی چیز جو اس نے کہی ہے وہ یہ ہے کہ یہ راہنمائی کن کے لیے ہے' یہ ہدایات (Directions) کن کے لیے دیتا ہے؟ اُن کے لیے جو زندگی کی خطرناک گھاٹیوں سے بچ کر چلنا چاہتے ہیں۔ محفوظ رکھنے کے معنوں میں' بچ کر چلنے کے معنوں میں' تو عربوں کے ہاں عام طور پہ یہ لفظ استعمال کیا جاتا تھا۔ عرب ایسے گھوڑے کے لیے جو پختہ سڑک پہ' جس کے اوپر پتھر کی کنکریاں پڑی ہوئی ہوں' اس طرح سے پاؤں رکھے کہ کنکری چبھ نہ جائے یہ لفظ استعمال کیا کرتے تھے۔ وہ زین جو اس کی پیٹھ کے اوپر اس طرح سے فٹ آ جائے کہ اُس سے اُس کی پشت زخمی نہ ہو' اُسے زخمی ہونے سے بچا دے' اس کے لیے بھی وہ یہی لفظ استعمال کیا کرتے تھے حتیٰ کہ یہ جو Preservatives (تحفظی) ہوتے ہیں' جن کے اندر کوئی چیز رکھی جاتی ہے تو وہ ہمیشہ محفوظ رہتی ہے' یہ ان Preservatives (تحفظی) کو الوقایۃ کہتے ہیں جس سے وہ شے تباہ ہونے سے بچ جائے' خراب ہونے سے بچ جائے' Disintegrate (پژمردہ) نہ ہو' اس میں فساد پیدا نہ ہو۔ Preservative (محفوظ کرنے) کا جو لفظ ہے اس کو تو سمجھا جا سکتا ہے۔ یہ

کتنی بڑی چیز بتائی ہے! کہ جو اپنے آپ کو یوں محفوظ رکھنا چاہتے ہیں ان کے لیے اس میں ایک Direction (ہدایت) دی ہوئی ہے کہ یہ نسخہ استعمال کرو گے تو تم یاد رکھو! تم محفوظ رہ جاؤ گے۔ اور انسانی ذات کا تو مقصود ہی یہ ہے کہ وہ Disintegrate (منتشر) نہ ہونے پائے' وہ خراب نہ ہونے پائے' وہ ضائع نہ ہونے پائے' وہ زائل نہ ہونے پائے' اُس میں پختگی آئے' اس میں استحکام پیدا ہو' اتنا استحکام پیدا ہو کہ موت کا جھٹکا بھی اُسے فنا نہ کر سکے۔ قرآنِ کریم یہ اِس قسم کا Preservative (تحفّظی) نسخہ ہے کہ اگر انسانی ذات کو اس کے اندر رکھ دیا جائے تو پھر کوئی شے کسی طرح سے اِس کو نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ یہ ہے هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ (2:2)۔ غور فرما رہے ہیں آپ' ایک تو زبان پہ اور پھر قرآن کے انتخاب پر کہ کس طرح سے یہ ایک لفظ لاتا ہے! اسے کھولتے چلے جائیے تو اس کی تعلیم کے وہ تمام مقاصد جتنے بھی ہیں' ابھر اور نکھر کر سامنے آتے چلے جاتے ہیں۔

پرہیزگاری کا لفظ متقی کے مفہوم کو واضح نہیں کرتا

ہمارے ہاں اس کا ترجمہ متقی پرہیزگار کیا جاتا ہے۔ متقی کا ترجمہ ہی پرہیزگار کر دیا۔ پرہیزگاری تو Negative (منفی) پہلو ہے یعنی اس سے بھی پرہیز' اُس سے بھی پرہیز' اس میں تو کوئی Positive virtue (مثبت صفت) نہیں ہے' اس میں تو کوئی مثبت صفت نہیں حاصل ہوتی۔ اور خالی پرہیز سے تو زندگی نہیں بچتی۔ پرہیز تو نقصان دہ چیزوں سے محفوظ رہنے کا نام ہے۔ اس کے بعد زندگی تو تعمیری چیزوں سے بنتی ہے' مثبت چیزوں سے بنتی ہے' اس میں کچھ Positive (مثبت) بھی ساتھ ہونا چاہیے' خالی پرہیزگاری تو کوئی شے نہیں ہے لیکن ہمارے ہاں کسی کی جو سب سے بڑی انتہائی صفت ہے وہ یہی ہے کہ وہ بڑا متقی پرہیزگار ہے۔ دونوں ہی لفظ اکٹھے کہہ دیتے ہیں۔ ہم یونہی پرہیزگار کہہ تو دیتے ہیں کبھی سوچتے نہیں ہیں کہ یہ چیزیں ہمارے ہاں کہاں سے آئیں۔

قرآنی تعلیم کے برعکس مادیت کے متعلق غلط تصورات

عزیزانِ من! یہ الفاظ جو ہمارے ہاں اس طرح سے رائج ہو چکے ہیں' ان کے پیچھے خود ایک بڑی سازش تھی۔ زندگی کے متعلق اور اس دنیا کے متعلق عام تصور یہ چلا آ رہا تھا کہ یہ مادہ (Matter) نفرت کے قابل ہے' یہ دلدل ہے جس میں انسانی روح آ کر پھنس چکی ہے۔ یہ بنیاد ہے آپ کے ہاں یونان کے فلسفے کی' ہندو کے ویدانت کی' مجوسیوں کے ہاں کے شر اور خیر کی' اور وہیں سے آپ کے ہاں کے تصوف کی۔ یہ دنیا' اس دنیا کی ساری جاذبیتیں' کششیں' یہ سب کی سب آلائشیں ہیں' کثافتیں ہیں' خباثتیں ہیں' ان سے دور دور رہنا چاہیے۔ اس کا نام آپ کے ہاں پرہیزگاری ہے۔ قرآن اس کے برعکس چلتا ہے۔ کہتا ہے کہ یہ دنیا' یہ کائنات' یہ مادہ' اس کی جاذبیتیں' کوئی کثافتیں نہیں ہیں' دلدل نہیں ہیں' قابل نفرت شے نہیں ہے' یہ تو وہ شے ہے کہ جس کو تم نے مسخر کرنا ہے' جس سے فائدہ اٹھانا ہے' یہ

تمہاری طبعی زندگی کے لیے بھی ضروری ہیں اور اس سطح حیات کے اوپر تمہاری ذات کی نشو ونما کے لیے بھی ضروری ہے کہ تم اس مادی کائنات کو مسخر کرو۔

مروجہ تراجم میں متقی کا مفہوم

ہمارے ہاں جو تصور پرہیز گاری کا ہے وہ تصور وہی ہے جو ہمارے ہاں تصوف میں چلا آتا تھا۔ آپ کے ہاں سب سے زیادہ متقی اسے گنا جاتا ہے جو دنیا سے کنارہ کش ہوتا چلا جائے' الگ ہوتا چلا جائے حتیٰ کہ انسان بوڑھا ہو کر زندگی کے آخری دنوں میں اپنی آرزو یہی یہ بتاتا ہے کہ بھئی! عمر بھر اس دنیا کے دھندے میں جی کھپاتے رہے' اب آخری دن آ گئے ہیں کچھ اللہ کا بھی نام لے لیا جائے' عاقبت سنوارنے کی بھی فکر کر لی جائے۔ یعنی وہ جو دنیا کے دھندے تھے ان میں تو سب چیز' جتنی بھی تھی' وہ ساری جہنم کی تھی اور اب اس کو چھوڑ کر کچھ ایسا کر لیا جائے کہ جس سے عاقبت کی فکر ہو۔ یہ دو الگ الگ شعبے بنا لیے۔ وہ ساری وہی چیز ہے جو مادے کی دلدل کا تصور ہے۔ آپ کے ہاں یہ غیر قرآنی آیا ہوا تھا اور اب یہ چیز ہے کہ خدا کے لیے ہیں' خدا کی طرف جانا ہے مادے سے الگ ہٹ کر پرہیز گاری کے ساتھ' ایک دوسری دنیا کے اندر چلے جانا۔ آپ نے دیکھا کہ جن الفاظ کو ہم عام طور پہ استعمال کر جاتے ہیں' ان کی گہرائیوں کے اندر کتنے خطرے چھپے ہوئے ہوتے ہیں۔ یہ صرف پرہیز گاری نہیں ہے۔ سارے قرآن میں یہ لفظ تقویٰ اور متقین آتے چلے جائیں گے اس لیے یہ تو ہم وہاں جا کر دیکھیں گے کہ قرآن ان کی کیا تصریحات کرتا ہے لیکن میں صرف دو تین آیتیں آپ کے سامنے پیش کروں گا' آپ دیکھیے گا کہ قرآن کی رو سے تقویٰ کسے کہتے ہیں؟

سب سے پہلی چیز تو یہ ہے کہ انسان کی یہ طبعی زندگی ہے' یہ طبعی کائنات ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اس Physical World of Concrete (محسوساتی طبعی دنیا) کے متعلق قرآن کا Attitude (رویہ) کیا ہے؟ وہ کیا تعلیم دیتا ہے؟ سنیے! وہ کہتا یہ ہے کہ **هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِیَآءً وَّ الْقَمَرَ نُوْرًا وَّ قَدَّرَهٗ مَنَازِلَ** (10:5)۔ اس نے چاند اور سورج اور ستارے اور یہ سارا کچھ گنایا۔ اس کے بعد ہے کہ **مَا خَلَقَ اللّٰهُ ذٰلِکَ اِلَّا بِالْحَقِّ** (10:5) خدا نے ان عناصر کو باطل پیدا نہیں کیا' بالحق پیدا کیا ہے۔ اس کے بعد اگلی آیت میں ہے کہ **اِنَّ فِی اخْتِلَافِ الَّیْلِ وَ النَّهَارِ وَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ** (10:6) یاد رکھو! یہ گردشِ لیل ونہار اور جو کچھ بھی خدا نے اس کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں پیدا کیا ہے' یہ کیا ہے؟ کہا ہے کہ **لَاٰیٰتٍ** (10:6) یہ منزلِ مقصود تک پہنچنے کی علامات ہیں اور **لِقَوْمٍ** (10:6) اس قوم کے لیے ہیں (اسے غور سے سنیے) جسے قرآن **لِقَوْمٍ یَّتَّقُوْنَ** (10:6) کہتا ہے یعنی یہ متقیوں کے لیے ہیں۔ متقی قوم یا تقویٰ شعار قوم کی پہلی چیز یہ ہے کہ وہ اس کارگہِ کائنات میں جس کے اندر اس نے اپنی طبعی زندگی

بسر کرنی ہے، ہر گوشے کے اوپر غور و فکر کرے اور اُس کے بعد اِس کو مسخر کرے۔

تقویٰ شعاری کا پہلا تقاضا تسخیرِ فطرت ہے

پہلی چیز یہ ہے کہ آپ زندگی کی خطرناک گھاٹیوں سے اُسی صورت میں بچ سکتے ہیں جب آپ فطرت کی قوتوں کو مسخر کریں۔ طبعی طور پر وہی قوم اپنے آپ کو دنیا میں محفوظ اور مامون تصور کر سکتی ہے جس نے فطرت کی قوتوں کو مسخر کیا۔ آپ نے اس کا ترجمہ پرہیزگار کیا، اس کے معنی دنیا اور دنیا کی تمام جاذبیتیوں سے پرہیز کرنے والا، الگ ہٹ جانے والا، ان کو نفرت کی نگاہ سے دیکھنے والا، جبکہ قرآن کہتا ہے کہ اِن کو مسخر کرنے والا متقی ہے۔ یعنی شروع قدم میں ہی تقویٰ کے معنی بیان کر دیئے گئے لیکن مسخر کرنے والی قومیں تو وہ بھی ہوں گی جو یورپ میں ہمیں نظر آتی ہیں۔ کیا ہم قرآن کی رو سے ان کو متقی اور تقویٰ شعار کہہ سکتے ہیں؟ سُنیئے، عزیزانِ من! خارجی کائنات کی تسخیر تقویٰ کے لیے، متقی ہونے کے لیے پہلی بنیادی شرط ہے۔ لیکن یہ یاد رکھیے گا کہ قرآن کی تعلیم کو کہیں الگ الگ کر کے نہ لے لیجیے گا۔ پوری تعلیم جامع لینی چاہیے۔ ایک چیز یہ ہے اگر یہ نہیں ہے تو تقویٰ کی سیڑھی کا جو پہلا ڈنڈا ہے ہم اس پہ بھی نہیں آ سکے۔ اگر تسخیر فطرت نہیں ہے، اگر خارجی کائنات میں فکر و تدبر نہیں ہے تو پھر متقی ہونے کی پہلی چیز بھی نہیں ہے۔

تسخیرِ کائنات کے ماحصل کا استعمال باہمی مفادات کی بنیاد پر ہو گا

ہمارے ہاں تو یہ پہلی ہی چیز پوری نہیں ہوئی۔ اب آگے چلیے کہ قرآن اس کے لیے کیا کہتا ہے؟ اگلی چیز یہ ہے کہ جب اس کائنات میں معاملات کی دنیا آئے گی تو اس میں ایک طریق تو وہ ہو گا کہ ہم قرآن کی بتائی ہوئی مستقل اقدار کے مطابق معاملات کو طے کریں اور دوسری چیز یہ ہو گی کہ ہم اپنے اپنے مفاد کے پیچھے چلیں، اپنے اپنے جذبات ہی کا اتباع کریں۔ یہ جو قوانینِ خداوندی کو چھوڑ کر اپنے جذبات کا اتباع ہے، اسے قرآن شیطان سے تعبیر کرتا ہے۔ پھر سن لیجیے کہ قرآن کی بتائی ہوئی اقدار کو چھوڑ کر جذبات کے اتباع کرنے کو قرآن شیطان سے تعبیر کرتا ہے۔ جذبات کا اتباع بری چیز نہیں ہے، اقدارِ خداوندی کو چھوڑ کر جذبات کا جو اتباع ہے، وہ انسان کو غلط راستے پہ لے جاتا ہے۔ جذباتِ انسانی کو اقدار خداوندی کے تابع رکھ کر، ان سے کام لینا، انسانیت کا شرف ہے۔ میں نے کہا ہے کہ اقدارِ خداوندی کو چھوڑ کر اپنے ذاتی مفاد یا جذبات کے پیچھے چلنے کو اتباعِ شیطان کہا گیا ہے۔ اب اگلی چیز سنیئے! فطرت کی قوتوں کو مسخر کیا، کائنات میں غور و فکر کیا، یہ سارا کچھ کرنے کے بعد جب ہم معاملات کی دنیا میں آئے تو وہاں مفاد کا ٹکراؤ ہوا۔ جونہی ہم نے مستقل قدر کو چھوڑا، اپنے کسی جذبے کے پیچھے چلے تو قرآن کے الفاظ میں اس کے معنی ہو گئے کہ شیطان نے ہم کو چھولیا۔ وہ کہتا ہے کہ یہ انسانوں کی دنیا ہے تم اس میں چلو پھرو گے تو ایسا ہو سکتا ہے۔

دل میں گھومتے گھماتے غلط خیال کے آنے پر متقی کا ردِ عمل

آپ غور کیجیے کہ قرآن کس طرح Facts (حقائق) کو سامنے رکھتا ہے' یہ شاعروں کی دنیا میں نہیں بستا۔ وہ آپ کو کہتا ہے کہ یہ ہوسکتا ہے' اس میں انسان ہی تو بستے ہیں' یہاں فرشتے تو نہیں بستے لیکن فرق ہے۔ وہ کہتا ہے کہ آؤ تمہیں بتائیں کہ متقی کسے کہتے ہیں؟ وہ فطرت کی قوتوں کو مسخر کرنے کے لیے اس کارگہ کائنات میں پھر رہا ہے۔ معاملات کی دنیا کے اندر آیا ہے۔ کہا ہے اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّيْطٰنِ (7:201) متقی اسے کہیں گے کہ چلتے پھرتے' اگر کہیں سے گھومتے گھماتے بھی کوئی شیطانی خیال اس کے سامنے آ گیا ہے قرآنِ کریم نے اسے طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّيْطٰنِ (7:201) کہا ہے۔ کیا بات ہے! یعنی اس میں دانستہ طور پر (مقصداً) Purposely یہ بات نہیں ہے کہ وہ گیا ہی اس طرف ہے' نہیں! بلکہ کہیں چل پھر رہا ہے۔ اور غلط معاشرے کے متعلق تو اس نے کہا ہے کہ اس میں شرمستطیرا (76:71) ہوتا ہے یعنی شر کی چنگاریاں اڑ کر لگ جایا کرتی ہیں۔ کہا ہے کہ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّيْطٰنِ (7:201) یونہی گھومتے پھرتے چلتے ہوئے فضا کے اندر کوئی ایک اس قسم کا خیال تھا وہ ذرا سا آ گیا۔ اب یہاں متقی اور غیر متقی کا فرق پیدا ہوا۔ کہا ہے کہ اس کے ہاں بھی ذرا سا خیال آیا: تَذَكَّرُوْا (7:201) اس نے فوراً قرآن کی قدر اور قرآن کے قانون کو اپنے سامنے رکھا' اس نے اس کی یاددہانی کر لی' اس کو وہ فوراً یاد آ گیا کہ نہیں! قرآن کا فیصلہ یہ ہے' اُس کی قدر یہ ہے' اُس کا قانون یہ ہے۔ جب یہ چیز آئی تو کیا ہوا؟ کہا کہ فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ (7:201) اُس کی آنکھیں کھل گئیں۔ اس نے کہا کہ نہیں' یوں نہیں جانا۔ مُّبْصِرُوْنَ (7:201) تھوڑی سی تاریکی آئی تھی' ذرا سا گھومتا ہوا خیال آیا تھا' سورج کے سامنے بادل کا ایک ٹکڑا آ گیا تھا' اس میں ذرا سی تاریکی آئی' گھومتے ہوئے بھی یہ خیال آیا' متقی وہ ہے کہ اس وقت فوراً خدا کا قانون اس کی نگاہوں کے سامنے آ گیا اور جونہی وہ آیا تو فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ (7:201)۔ عربی جاننے والے حضرات ہی اس کی داد دیں گے کہ قرآن کا اندازِ بیان کیا ہے۔ کہا ہے کہ فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ (7:201) ارے وہ دیکھو! جیسے ان کی آنکھیں کھل گئیں۔ سورج کے سامنے سے وہ بادل چھٹ گیا' وہ نورانیت پھر اس کے اندر آ گئی۔ یہ ہے متقی۔ متقی وہ ہے جو پہلے اس کائنات کی ان قوتوں کو مسخر کرے اور ان پر غور و فکر کرتا چلا جائے۔ یہ خالص Intellectual Process (ذہنی عمل) ہے' بالکل ذہنی چیز ہے۔ ہر سائنٹسٹ یہ ہوسکتا ہے' ہر قوم یہ کر سکتی ہے لیکن اگلی چیز اب قرآن کے متقی کی خصوصیت آ گئی ہے کہ جس میں اگر کوئی چیز بھی غیر قانونی' غیر خداوندی اقدار کی گھومتے پھرتے بھی ذہن میں آئی تو وہ فوراً خدا کے قانون کو سامنے لے آیا' اس کی آنکھیں کھل گئیں' صحیح راستے کے اوپر چل پڑا۔ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ (2:2)۔ دیکھتے جا رہے ہیں آپ! کہ یہ صحیح راستہ ابھر کر کن کے سامنے آتا ہے؟ قرآن کی رو سے پہلی چیز ہم نے یہ دیکھی کہ اس کارگہ کائنات میں غور و فکر کرنے والوں کے سامنے وہ صحیح

راستہ ابھراورنکھر کرآ جاتا ہے۔عزیزانِ من! وہ جو کہا جاتا ہے کہ یہ وعظ ونصیحت اوراخلاقیات ہی کی کتاب ہے' اب غور کیجیے کہ کائنات پہ غوروفکر کرنے والوں کے لیے بھی اس میں Guidance (راہنمائی) ملتی ہے۔اور وہ جو اس نقطہ نگاہ کو لے کر قرآن کے اندر چلتے ہیں اور یہاں سے راہنمائی لیتے ہیں تو ان سے پوچھیے کہ کیا کیا راستے ان کے سامنے صاف ہو جاتے ہیں۔ یہ صرف فطرت کے قوانین اور فطرت کے نظام کے متعلق غوروفکر کرنے والے کے لیے ہے۔اور پھر اگلی چیز یہ ہے کہ پھر جب بھی وہ جو اقدار کی دنیا میں آئے گا' اگر وہاں کوئی ذراسی' تھوڑی سی' غلط چیز کی ذہن کے اندر آمیزش بھی آ گئی تو وہ فوراً قدرِ خداوندی کے سامنے آ جائے گا' اس کی آنکھیں کھل جائیں گی' صحیح راستہ سامنے آئے گا۔یہ ہے **هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ** (2:2)۔

پرہیزگاری ایک انفرادی شے ہے جبکہ دین ایک اجتماعی نظام پیش کرتا ہے

جماعت مومنین کے ہاں پھر تیسری چیز یہ ہے کہ دین تو اجتماعی شے ہے' یہ انفرادی نہیں ہے۔ پرہیزگاری انفرادی چیز ہے۔ جتنا آپ پیچھے ہٹتے چلے جائیں گے' اتنی آپ کے اندر انفرادیت ہوتی چلی جائے گی حتی کہ سب سے بڑے پرہیزگار بن کر آپ غاروں میں بیٹھ جائیں گے۔ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔ سر درد کا وہ علاج' سر کو کاٹ دینا ہے' یہ اس کا مکمل علاج ہوتا ہے' پھر کبھی نہیں ہوتا' اس میں بگڑتا کچھ نہیں' صرف سر باقی نہیں رہتا اور کیا؟ یہ آپ کے ہاں کی پرہیزگاری ہے کہ مادی دنیا کو چھوڑتے چلے جاؤ چھوڑتے چلے جاؤ لیکن دین تو اجتماعی نظام سکھاتا ہے' اجتماعی نظام کے بغیر دین کا تصور نہیں ہوسکتا۔اور اجتماعی نظام میں تو آپ جانتے ہیں کہ تفرقہ شرک ہے۔ ہمارے ہاں جو متقی ہیں اگر انہیں ڈھونڈنا ہوگا تو بہر حال انہیں ان مساجد میں ڈھونڈنا ہوگا اس لیے کہ اس کی پہلی شرط تو یہ ہے کہ وہ نماز کا پابند ہوگا' نماز روزے کے یہ جو ارکان ہیں ان کی پابندی بڑی ضروری ہوگی۔تو متقیوں کو تلاش کرنے کے لیے سب سے پہلے ہم مساجد کی طرف رخ کریں گے۔

مذہبی دنیا میں متقیوں کی پہچان اور مساجد کی اجتماعیت کی کیفیت

یہ آپ کے ہاں کی جو مساجد ہیں' آج ان کی کیفیت یہ ہے کہ دس ہزار کا' بیس ہزار کا اجتماع ہو' سارے مسلمان اس کے اندر ہوں' اب تو ہمارے ہاں ہوتے ہی ایسے اجتماع ہیں کہ اس میں مسلمان ہی آتے ہیں۔ یہ اتنے وقت کے لیے ہیں جتنے میں وہاں تقریر ہو رہی ہے' جلسہ ہو رہا ہے۔کسی کی پیشانی پہ کچھ نہیں لکھا ہوا کہ یہ اس سے الگ ہے' وہ اُس سے الگ ہے۔ جونہی کسی وقت نماز کی اذان ہوگئی تو یہ سارے متقی نماز پڑھنے کے لیے اٹھے سو اس مسجد میں گئے' دوسو اُس مسجد کے اندر' پچاس اس مسجد کے اندر۔ یہ سارے متقی جتنے تھے ٹکڑے

ٹکڑے ہو گئے یعنی جب یہ تقویٰ کی طرف آئے تو ان میں تفرقہ ہو گیا' یہ گروہوں میں بٹ گئے' ان کے اندر تفریق پیدا ہو گئی۔ جب یہ محض جلسے میں بیٹھے تھے تو اُس وقت ان کو نہیں کہا جا سکتا کہ یہ متقی ہیں' یہ دنیا داروں کا ایک جلسہ ہے۔ وہ کہیں گے کہ صاحب! سیاسی جلسہ ہو رہا ہے' Political جلسہ ہو رہا ہے' اس کو تو ان کے تصور کے مطابق تقویٰ سے تعلق نہیں۔ تقویٰ کی آواز آئی ہے تو یہ جو ایک مقام پہ دنیا دار بیٹھے ہوئے تھے جن میں کوئی تفرقہ نہیں تھا' اب یہ سارے کے سارے گروہوں کے اندر بٹ گئے' تفرقے میں بٹ گئے مساجد کے اندر متقی بننے کے لیے جا رہے ہیں۔ یہ وہ ہے جس کے لیے اُس نے کہا تھا کہ تقویٰ تو ایک طرف' متقی تو ایک طرف' بلکہ **وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ o مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ** (30:31-32) یاد رکھنا! مومن ہونے کے بعد کہیں پھر سے مشرک نہ ہو جانا۔ یعنی اُن میں سے یہ جو ہمارے ہاں اس قسم کی تفریق ہو گئی کہ اس مسجد میں فلاں کا داخلہ ممنوع ہے' یہ جو سینے پہ ہاتھ رکھنے والے ہیں' ان کو مسجد سے نکال دیا جائے گا' یہ جو آمین اونچی کہنے والے ہیں' یہ اگر آ گیا ہے تو اس مسجد کا فرش اکھیڑنا پڑے گا یہ سب کچھ ہے۔ سنیے عزیزانِ من! مدینے میں ایک اور مسجد بنی شروع ہوئی' ہمارے ہاں تو مسجد کی تعمیر سبحان اللہ یہ ہے کہ جو مسجد کوئی یہاں بنا دے گا' یہاں وہ اینٹ اور گارے اور پتھر کی بنائے گا' اللہ میاں موتیوں کا گھر اس کے لیے جنت میں بنا دے گا۔ مسجد بڑی چیز ہے اور وہ مسجد وہاں مدینے میں بننے لگی ہے' جہاں پہلے ایک ہی مسجد تھی' دوسری مسجد یہ بننے لگی ہے۔ برادرانِ عزیز! اس مسجد کے متعلق بنانے والوں نے نبی اکرمؐ سے کہا کہ آپ ہمارے ہاں آ کر اس کی Opening Ceremony (رسم افتتاح) فرما دیجیے' ٹھیک ہے۔ قرآنِ کریم نے عین اس موقعے پہ کہا کیونکہ پہلی ہی بات ہو رہی تھی کہ ایک اور مسجد بن رہی تھی' اس کے لیے بڑی ضروری بات ہو گئی کہ ایک ہدایت دی جائے تا کہ **هُدًى** ہو' یہ بات **هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ** (2:2) ہو۔

تقویٰ کی بنیاد پر بنائی گئی مسجد تو تفریق بین المومنین کے تصور سے پاک ہونی چاہیے

کہا ہے کہ یہ جو مسجد ہے یہ **وَ تَفْرِيقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِينَ** (9:107) ہے' یہ جماعت مومنین میں تفرقہ پیدا کرنے کے لیے' فرقہ بنانے کے لیے بن گئی۔ **لَا تَقُمْ فِيهِ اَبَدًا** (9:108) اس میں کبھی نہ کھڑے ہونا۔ دیکھ رہے ہیں کہ معاملات کیا ہیں! اس لیے کہا کہ **لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ** (9:108) وہ مسجد جس کی بنیاد پہلے دن سے تقوے پہ رکھی گئی تھی اُس کو یہ حق حاصل ہے کہ تم اُس میں جاؤ' اس تفرقہ پیدا کرنے والی مسجد میں نہیں۔ بات صاف ہو گئی۔ ہر وہ مسجد جس میں **تَفْرِيقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِينَ** (9:107) کی کیفیت ہوتی ہے' وہ شرک ہے۔ تقویٰ کے اوپر بنیاد اسی مسجد کی ہو سکتی ہے جس کے اندر تفریق بین المومنین

نہ ہو۔عزیزانِ من! اب کیا آپ ان مساجد کے اندر کے نمازیوں میں متقی کوتلاش کریں گے۔ ان میں تو آپ کووہ ملیں گے جو مومنین میں تفرقہ پیدا کرنے والے ہیں' نہ کہ وہ جنہیں تفرقہ نہ پیدا کرنے کا کہا تھا کہ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ (30:31) تم مشرکین میں سے نہ ہوجانا یعنی ان میں سے جنہوں نے تفرقہ پیدا کردیا۔

متقی کے لیے تین بنیادی شرطیں

اس وقت میں صرف یہ تین ہی آیات پیش کروں گا۔آگے چلیں گے تو پھر متقی اورتقویٰ کی تفصیل تو سارے قرآن میں آئے گی لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ تین بنیادی حقیقتیں بھی بہت بڑی ہیں' اگر آپ انہی کو سمجھ لیں۔ کارگہ فطرت میں غور وفکر کر کے فطرت کی قوتوں کو مسخر کرنا تقویٰ کے لیے پہلی شرط ہے۔فطرت کی ان قوتوں کو اقدار خداوندی کے لیے' نوع انسانی کی منفعت کے لیے' صرف کرنا تقویٰ کی دوسری شرط ہے۔اس مقصد کے لیے ایک تنظیم' ایک جماعت' ایک امت کی تشکیل کرنا' جس میں کوئی تفرقہ نہ ہو' تقویٰ کی تیسری شرط ہے۔ ان میں سے اگر ایک شرط بھی کسی وقت گم ہوگئی ہے تو وہ تقویٰ نہیں ہوسکتا' برادرانِ عزیز! اور جب وہ متقی نہیں ہوسکتا تو اس کو قرآن سے ہدایت کیا مل سکتی ہے!!! اسے پڑھتے رہیے' اسے تلاوت کرتے رہیے۔یہ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ (2:2) ہے یعنی یہ ہدایت تو متقین کے لیے ہے اور جو اس شرط پہ ہی پورا نہیں اترتا اس کو اس سے راہنمائی کیا ملے گی!! سفر کی راہنمائی کے لیے تو برادرانِ عزیز! پہلی شرط یہ ہے کہ اس سفر کے لیے اٹھ کر' تیار ہو کر نکل پڑیں۔گھر میں بیٹھے ہوئے ہیں' ریل گاڑی کا ٹائم ٹیبل بھی رکھا ہوا ہے' روز اس کو دیکھ لیتے ہیں کہ فلاں وقت پر یہ ریل گاڑی یہاں سے چلتی ہے' وہ یہاں سے وہاں تک جاتی ہوئی' وہاں سے ٹرن کرتی ہوئی' فلاں وقت کے اوپر لالہ موسیٰ جا پہنچتی اور وہ اُدھر سے چلتی ہے' فلاں وقت پہ آجاتی ہے' آپ صبح اٹھ کر اس کو روز Consult کرلیا کریں' اور وہاں بیٹھے رہا کریں۔ یہ ہدایت آپ کو کچھ فائدہ بھی دے سکتی ہے؟ یہ ٹائم ٹیبل اس کے لیے بنا تھا جس نے گاڑی پہ جانا تھا جبکہ گھر میں بیٹھے ہیں ٹائم ٹیبل کنسلٹ ہو رہا ہے۔ پھر آپس میں بھی جھگڑ رہے ہیں۔وہ کہتا ہے کہ نہیں' تم نے تھرٹین ڈاؤن کا ٹائم ٹھیک نہیں نوٹ کیا' میں تمہیں بتاتا ہوں۔ یہ ہو رہا ہے اور دونوں ہی گھر میں صوفے کے اوپر بیٹھے ہوئے ہیں۔وہاں جانا کسی نے بھی نہیں ہے۔ پھر اس ٹائم ٹیبل کی تفسیریں لکھی جارہی ہیں' تشریحات کی جارہی ہیں' روز اس کے درس ہو رہے ہیں' ٹائم ٹیبل بغیر سوچے سمجھے پڑھے جارہے ہیں جب کہ آپ دیکھیں کے کہ رہنمائی کا لفظ' هُدًى کا لفظ' استعمال کر کے قرآن نے اس ایک لفظ میں یہ بات بتادی کہ یہ تو راستہ چلنے والے کے لیے ہے' بیٹھنے والے کے لیے نہیں ہے۔اور قرآن نے دوسرے مقام پہ کہہ دیا تھا کہ یاد رکھو! بیٹھا رہنے والا' چلنے والے کے کبھی برابر نہیں ہوسکتا۔ راستہ چلنے والے کے لیے رہنمائی ہے جس نے چلنا ہی نہیں ہے اس کی رہنمائی کیا ہے؟ اور شاید پہلے بھی میں نے سنایا تھا' دورِ جہالت کے اپنے قصے بھی تو یاد

آ جاتے ہیں۔قرآن نے حکم دیا ہوا ہے کہ سِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ (6:11)اٹھو! اس زمین میں چلو پھرو۔ پوچھو نہیں کہ اس ایک چیز کے اندر، زندہ قوموں نے اس اتنی سی چیز کے اندر کیا کچھ نہیں پالیا تھا' وہ چیز یہی تھی کہ سِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ (6:11) جاؤ' چلو پھرو۔

ہمارے ہاں سِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ (6:11) کے حکم پر عمل پیرائی کا طریق

عزیزانِ من! ہمارے ہاں بھی سِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ (6:11) ہوتا ہے۔ ملنے کے لیے' حضرت صاحب سے زیارت کرنے کے لیے' آئے تو انہوں نے کہا نہیں صاحب! وہ تو چالیس دن نہیں مل سکتے۔ انہوں نے کہا کہ کیوں کیا بات ہے؟ کیوں نہیں مل سکتے؟ نہیں ہیں' وہ یہاں- کہنے لگے: نہیں' یہیں ہیں' اندر ہیں' حجرے میں ہیں۔ پھر چالیس دن کیوں؟ کہنے لگے کہ وہ آج کل چلہ کر رہے ہیں۔ کاہے کا کر رہے ہیں؟ سِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ (6:11) کا یا اللہ۔ یعنی روز تو پھر بھی وہاں سے اٹھ کر باہر ہی آ جاتے ہوں گے' اب جو سِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ (6:11) شروع ہوا ہے' تو چالیس دن ہلنا ہی نہیں۔ میاں سِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ (6:11) ہو رہا ہے۔ اس کے بعد پوچھیے' سرکار یہ سِیْرُوْا (6:11) جو ہوا ہے' یہ کہاں کا ہوا ہے؟ کہتے ہیں کہ ہفت افلاک کی سیر کر کے چلے آئے وہ فِی الْاَرْضِ (6:11) کہہ رہا ہے' یہ آسمان پہ پہنچے ہوئے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ صاحب! وہ تو ارض ہے' کہنے لگے کہ وہ تو عام مسلمان تم لوگ ہو' یہ زمین کی چیزیں اُن کے لیے ہے' جو مقرب بارگاہِ خداوندی ہیں وہ آسمانوں کی سیر کرتے ہیں۔ پتہ ہے کہ یہ کیا ہے؟ سُنیے! منچلے تھے' انہوں نے ایک ''معجونِ فلک سیر'' تیار کی تھی۔ آپ کو پتہ ہے یہ بھنگ کو کہتے ہیں۔ اصل میں دونوں ہی ایک ہیں۔ اس قسم کی سیر افلاک کی

اگر نہ سہل ہوں تجھ پر زمیں کے ہنگامے
بُری ہے مستیٔ اندیشہ ہائے افلاکی

یہ بھنگ کا نشہ ہوتا ہے۔ قرآن نے سِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ (6:11) کہا ہے۔ وہ یونہی شاعری نہیں کرتا۔ اس نے کہیں بھی نہیں کہا ہے کہ سیروا فی الافلاک ہے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ (2:2) یہ ان کے لیے رہنمائی ہے جو آمادۂ سفر ہوں۔ آمادۂ سفر ہوں تو پہلے یہ سوچ لیں کہ غلط راستے پہ نہ چلے جائیں' خطرناک راہوں سے نہ گزرنا' وہاں ٹائم ٹیبل کو کنسلٹ کرو' وہاں یہ دیکھو کہ کون سا راستہ محفوظ ہے' اُس محفوظ راستے سے قدم قدم کے اوپر اپنی حفاظت کا سامان کرتے ہوئے جیسے خاردار جھاڑیوں میں سے کپڑا سمیٹتے ہوئے چلے جایا کرتے ہو' یوں کر کے چلے جاؤ تاکہ تمہاری اپنی ذات محفوظ رہے' یہ تمہاری اپنی ذات کے لیے ایسا Preservative (تحفظی) ہو جائے کہ تم موت سے بھی مر نہ سکو۔ کہا ہے کہ یہ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ o الَّذِيْنَ (2:2-3) ہے۔ اسے یہیں نہیں رہنے دیا۔ اُس نے متقین کہا ہے۔ اب بات آگے چلتی ہے۔

خدا تعالیٰ کی طرف سے دیا ہوا ٹائم ٹیبل مکمل بھی ہے، محفوظ بھی اور لاریب بھی

آپ ٹائم ٹیبل کنسلٹ کر رہے ہوں، ریل گاڑی کا یہ سارا کچھ متعین بھی کر لیا۔ اُس کے بعد اسٹیشن پہ گئے تو انہوں نے کہا کہ صاحب! وہ تو آدھا گھنٹہ ہوا چلی گئی تھی۔ انہوں نے کہا کہ میں تو تمہارا ٹائم ٹیبل کنسلٹ کر کے آیا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ کہاں ہے ٹائم ٹیبل؟ دیکھا تو وہ پچھلے سال کا تھا۔ اس لیے ٹائم ٹیبل کے متعلق یقین ہونا چاہیے کہ یہ صحیح ٹائم ٹیبل ہے یہی آج کا رواں (Current) ٹائم ٹیبل ہے، پرانا نہیں ہو گیا ہوا، اُس میں حک و اضافہ والی بات نہیں ہے، وہ تحریف شدہ نہیں ہے، مصدق ہے، صحیح ہے، یقینی ہے۔ ٹائم ٹیبل ایسا ہونا چاہیے۔

لفظ ایمان کی نوعیت اور اہمیت

اِس طرح سے کسی چیز کے متعلق، تحقیق سے، تجسس سے، تفتیش سے، یقینی طور پہ یہ معلوم کر لینے کو کہ یہی صحیح ٹائم ٹیبل ہے، ایمان کہتے ہیں۔ کہا ہے کہ اَلَّذِيۡنَ يُؤۡمِنُوۡنَ (2:3) وہ چلنے سے پہلے اس کا اطمینان کر لیتے ہیں کہ صحیح ٹائم ٹیبل Consult (کنسلٹ) کیا جا رہا ہے۔ تقویٰ کا لفظ تو پھر بھی کم آئے گا، ایمان کا لفظ تو آپ قرآن کے اندر دیکھیں گے کہ صفحے صفحے پہ پھیلا ہوا ہو گا، سطر سطر میں ملے گا، بنیاد ہی یہ ہے۔ ہر راستہ چلنے والے کو اگر عقل و شعور ہے، ذہن میں وہ آوارگی نہیں کرنا چاہتا، مسافر بننا چاہتا ہے، منزل پہ پہنچنا چاہتا ہے، تو اس کے لیے پہلی چیز یہ یقین ہے کہ جس راستے پہ میں چل رہا ہوں، یہی وہ راستہ ہے جس پہ مجھے چلنا چاہیے۔ پہلی چیز یہ ہے۔ آپ کوئی Process (عمل و طریق)، کوئی Experiment (تجربہ)، کوئی Research (تحقیق) کر نہیں سکتے جب تک اس کے جو Basic Fundamental Laws (اساسی بنیادی قوانین) ہیں اُن کے متعلق یقین نہ ہو کہ یہ صحیح ہیں۔ کسی تجربے، کسی سفر، کسی تحقیق سے پہلے اُس کے بنیادی اصولوں کے متعلق یہ یقین کر لینا کہ یہ صحیح ہے، اِسے ایمان کہتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ اس سے ہوتا کیا ہے؟ آپ اس طرح سے چل پڑے، آپ کو یقینی طور پہ معلوم نہیں ہے کہ یہی راستہ ٹھیک ہے۔ آپ کو قدم قدم پہ عدمِ اطمینان ہو گا کہ پتہ نہیں یہ ٹھیک ہے یا نہیں ہے، یہی ہے یا کوئی اور ہے، بھئی! اُس نے بتایا تو کچھ ایسا ہی تھا لیکن یقین نہیں ہے۔ آپ چل رہے ہیں لیکن آپ کا قلب ہر وقت ایک تذبذب کا، ایک اضطراب کا کاشانہ بن رہا ہے، آپ کو امن نصیب نہیں ہے۔ ایمان کا تو مادہ ہی ''ا م ن'' ہے، جو امن ہے۔

ظن و قیاس کے برعکس یقین ہمیشہ امن کا باعث بنتا ہے

امن یقین کا نتیجہ ہے، ظن اور قیاس سے امن نہیں آتا اور اسی مادہ سے یہ جو لفظ مومن ہے، بنا ہے، جو عجیب چیز ہے۔ اس کے معنی ہیں ''اس طریقے سے خود امن میں رہنے والا اور اس انداز سے باقی دنیا کو امن دینے والا''۔ خدا کی ایک صفت خود المؤمن ہے۔ اُس کے معنی

ایمان لانے والا نہیں ہو سکتے۔ مومن کے معنی ہیں: ''دوسروں کو امن دینے والا''۔ خود امن میں ہے اور دوسروں کو یہ بھروسہ ہے کہ یہ امن دینے والا ہے۔ چنانچہ ان عربوں کے ہاں نَـاقَۃٌ اَمُوْنٌ اس اونٹنی کو کہتے ہیں جس کے متعلق پورا بھروسہ اور یقین ہو کہ یہ نہ غلط راستے پہ قدم اٹھائے گی، نہ ٹھوکر کھائے گی، نہ گرے گی، نہ دھوکا دے گی، جس اونٹنی کے متعلق اتنا یقین، بھروسہ، کامل اطمینان سا ہو، اُسے وہ نَـاقَۃٌ اَمُوْنٌ کہتے تھے۔ گرامر کے اعتبار سے امن کے بعد جب ''ل'' آئے جسے صلہ کہتے ہیں تو اس کے معنی ہو جاتے ہیں: کسی پر بھروسہ کرنا، اعتماد کرنا۔ اور ایسا اعتماد جو واقعی آپ کو سچا امن دے، خود فریبی نہ دے اور جب اس کا صلہ ''ب'' ہو تو اُس کے معنی ہوتے ہیں کسی دوسرے کی بات کا یقین کر لینا، کسی بات کو صحیح سمجھ لینا۔ اِس طرح سے سمجھ کر اپنے آپ کو اطمینان دے لینا۔ یہ جو امنوا باللہ ہے اور قرآن نے جو یہ ایمان کی آگے چیزیں بتائی ہیں، اُس کے معنی یہ ہیں کہ اِن صداقتوں کے اوپر یقین رکھ لینا اور اس طرح سے ایک امن حاصل کر لینا اور معمولِ زندگی بسر کرنا، خود بھی بسر کرنا اور باقی نوعِ انسان کو بھی اس طرح سے امن دیتے چلے جانا، یہ ہے ایمان والے کی نشانی۔ ایسا کرنے والے کو مومن کہتے ہیں۔

انگریزی زبان میں ایمان کا صحیح ترجمہ Faith نہیں ہے

میں اس سے پہلے کئی دفعہ بتا چکا ہوں اور بار بار بھی بتاتا چلا جاؤں گا کہ ہمارے ہاں بنیادی غلطی یہ ہوئی کہ قرآن کے ان الفاظ کے غلط ترجمے کیے گئے۔ ہمارے ہاں ایمان کا ترجمہ تو کیا نہیں، اس کو ایمان ہی کہتے ہیں۔ انگریزی زبان میں اس کا ترجمہ Faith کیا گیا ہے جو ہمیں اپنی اصل سے بالکل دور لے گیا۔ اُن کے ہاں Faith کی Definition یہ ہے کہ وہ ہمیشہ Reason (عقل) کے بالمقابل، یعنی اُس کے خلاف، استعمال ہوتا ہے۔ ایک شے جو آپ دلیل اور برہان کی رو سے مانیں، علم و بصیرت کی رو سے مانیں، اُسے تو وہ Conviction کہتے ہیں یعنی آدمی Covince ہو جاتا ہے۔ اور کوئی چیز جو بغیر دلیل و برہان کے، جس کے لیے آپ کے پاس کوئی Reason نہ ہو، کوئی منطقی توجیہ نہ ہو، Logic نہ ہو، آپ اُس چیز کو مانتے ہیں۔ جس چیز کو اس طرح سے مانا جاتا ہے، اُسے Faith کہا جاتا ہے۔ اُنہوں نے قرآن کے ایمان کا ترجمہ Faith کیا اور اس سے ساری گاڑی دوسری پٹڑی کے اوپر جا پڑی ہے۔ یہ Faith ہے ہی نہیں۔

دلائل و براہین کے بغیر ایمان ایمان ہی نہیں کہلاتا

اس کا ترجمہ ہی Conviction ہونا چاہیے اور Conviction کی بھی اگر کوئی اسٹیج انتہائی ہو سکتی ہے تو وہ ہے جو دلیل و برہان کے اوپر مبنی ہو، علم و بصیرت کے اوپر مبنی ہو۔ اندھے طور پر کسی چیز کو مان لینا، جس کے لیے آپ کے پاس کوئی دلیل و برہان نہ ہو قرآن کی رو

سے ایمان نہیں کہلاتا۔ برادرانِ عزیز! مومن کی Definition (تعریف) قرآن نے یہ دی ہے کہ وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا (25:73) مومن وہ ہیں کہ اور تو اور جب اُن کے سامنے تیرے رب کی آیات' قوانین خداوندی' بھی پیش کی جاتی ہیں تو وہ اُن پر بھی اندھے' بہرے' گونگے بن کر نہیں جھکتے۔ وہ انہیں ایسے نہیں مانیں گے' ان کے سامنے قرآن کے قوانین ہیں۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ اگر کوئی اس طرح نہیں مانتا ہے تو قرآن کہتا ہے کہ اسے مومن نہ کہو۔ مثلاً وہ کہتا ہے کہ میں مانتا ہوں' میرا اس کے اوپر یقین ہے۔ چونکہ اس کے لیے تمہارے پاس کوئی دلیل و برہان نہیں ہے' اس لیے تم مومن نہیں کہلا سکتے وہ تو مومن کی Definition (تعریف) ہی یہ دیتا ہے۔ اگر کوئی کہتا ہے کہ میں نے اُسے ایسے مانا ہوا ہے تو قرآن کہتا ہے کہ نہیں' مومن کی Definition یہ ہے یہ اس پر پورا نہیں اترتا۔ وہ اربابِ عقل اور اربابِ ایمان کو ایک ہی بات قرار دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ فَاتَّقُوا اللّٰهَ (65:10)۔ یہ دیکھیے تقویٰ۔ فَاتَّقُوا اللّٰهَ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ ۚ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۛ (65:10)۔ اندازہ لگایئے! کہتا ہے کہ راستے کی خطرناک گھاٹیوں سے' قانونِ خداوندی کی نگہداشت کر کے بچو۔ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ (65:10) اے صاحبانِ عقل و بصیرت! الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (65:10) یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے۔ اگر وہ اولی الالباب نہیں ہیں تو وہ امنوا میں آ ہی نہیں سکتے۔ یہ بڑی بنیادی چیز ہے برادرانِ عزیز! پھر اس میں ایک اور نکتہ بھی سمجھ لیجیے۔ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا یا يُؤْمِنُوْنَ یہ Verbs (فعل) ہیں۔ اس کے معنی ہیں کہ وہ ایسا کرتے ہیں یعنی یہ سارا کچھ کر کے کوئی چیز جب حاصل ہوتی ہے تو وہ اُسے ایمان کہتے ہیں۔ پیدائشی تو کوئی مومن ہو ہی نہیں سکتا یعنی جس نے بھی کچھ کر کے نہیں مانا وہ مومن نہیں ہو سکتا۔ غور کیا کہ قرآن Verb (فعل) کیوں لایا ہے؟

Verb تو فعل کو کہتے ہیں اس میں کچھ کام کرنا ہوتا ہے۔ یہ کوئی کام کر کے ایسا بننا تھا بغیر کیے ہوئے تو ایمان کا سوال ہی نہیں۔ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اور ایمان یہ کہا کہ دلیل و برہان' علم و بصیرت' فکر و تدبر کرو اس کے بعد اندھے بہرے بن کر نہیں جھکنا۔ یہ اس طرح سے کرنے کے بعد ان صداقتوں کے اوپر جو یقین رکھنا ہے اس میں الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا آ سکے گا جس نے ایسا نہیں کیا ہے' اُس کے اوپر یہ Apply ہی نہیں ہو سکتا۔ اسی لیے اس نے یہ کہا ہے کہ اِن صداقتوں کے اوپر جب آپ ایمان لاتے ہیں یعنی ان کو اس طرح سے صحیح مانتے ہیں' تو اس کے بعد آپ کا یہ ماننا' آپ کا یہ ایمان' پھر پختہ ہوتا جاتا ہے۔ یہ صداقتیں ہیں' ان کو حق مانتا ہے وَلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ (22:54) تاکہ یہ لوگ اس حقیقت کو جان لیں کہ یہ تیرے رب کی طرف سے حق ہے۔ یہ مِنْ رَّبِّكَ (22:54) کا ہے۔ سنیے عزیزانِ من! اور فَيُؤْمِنُوْا بِهٖ (22:54) پھر کیونکر ایمان لائیں اُوْتُوا الْعِلْمَ (22:54) اربابِ علم' علم کی رو سے اس چیز کو جان لیں' پرکھ لیں کہ اَنَّهُ الْحَقُّ (22:54) یہ ایک حقیقت ہے مِنْ رَّبِّكَ (22:54) تیرے خدا کی طرف سے ہے منزل ہے۔ چیز کو علم کی رو سے جان لے یہ ہے' فَيُؤْمِنُوْا بِهٖ (22:54) پھر اس کو کہیں گے کہ تم اس کے اوپر ایمان لائے ہو۔ پھر

جب وہ اس طرح سے اس پہ ایمان لائے تو کہتا ہے کہ جب یہ کیفیت ہو جائے تو یہ چیز پھر ذہنی نہیں رہتی فَتُخْبِتَ لَهُ قُلُوْبُهُمْ (22:54) یوں مانی ہوئی جو چیز ہے' اس کے سامنے تو انسان کا دل خود جھک جاتا ہے۔

آج دنیا بھر میں اسبابِ زوالِ امت کی بنیادی وجہ

روز جو آپ کے ہاں یہ رونا رویا جاتا ہے کہ سارا معاشرہ مسلمانوں کا ہے' نماز روزہ بھی پڑھا جا رہا ہے' قرآن کی تلاوتیں بھی ہو رہی ہیں پھر بھی کرپشن دن بدن بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دل نہیں جھک رہے۔ وہ جھک کیوں نہیں رہے؟ آپ نے ان صداقتوں کو اس طرح مانا ہوا ہی نہیں ہے۔ ماننے کا ایک اور طریقہ ہے' جسے ہم مروجہ ایمان کہتے ہیں۔ وہ بھی ایک چیز ہے۔ کیا چیز ہے وہ؟ وہ چیز یہ ہے کہ یہ ہوتا چلا آ رہا ہے' یہ ہوتا چلا جا رہا ہے' یوں کرتے آ رہے ہیں' ہم کرتے آ رہے ہیں' مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہو گئے ہیں' مسلمان ہیں۔ جس گھر میں پیدا ہوئے' جو کچھ اس گھر میں مانا جاتا تھا' اُس قسم کے آپ مانتے چلے جا رہے ہیں۔ پہلے تو یہ چیز ہوئی کہ اتفاق سے مسلمان کے گھر میں پیدا ہو گئے تو مسلمان ہو گئے۔ حنفیوں کے گھر میں پیدا ہو گئے حنفی ہو گئے' شیعوں کے گھر میں پیدا ہوئے شیعہ ہو گئے۔ یہ چیز کیوں مانتے ہو؟ کہ یہ یوں مانتے چلے آ رہے ہیں۔ یہی ہے ہمارے ہاں اس وقت کا ایمان۔ عزیزانِ من! ابھی آپ نے دیکھ لیا کہ قرآن تو اس کو ایمان ہی نہیں قرار دیتا' یہ تو خود کچھ کرنے کی بات تھی۔ کہتا ہے کہ وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ (2:170) جب ان سے کہا جاتا ہے کہ بھئی! یہ جو خدا کی کتاب ہے تم اس کا اتباع کرو' اس کے پیچھے پیچھے چلو تو قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا (2:170) کہتے ہیں کہ نہیں صاحب! ہمارے اسلاف جس روش پر چلتے آ رہے ہیں' ہم تو اسی روش پر چلتے جائیں گے۔ بس ہمارے لیے یہ ٹھیک ہے۔

تقلید پرستی کی روش اور تباہ کاریاں

قرآن اس کے جواب میں کچھ زیادہ لمبی چوڑی بحث نہیں کرتا بلکہ خود دو لفظوں میں بات صاف کر دیتا ہے۔ کہا ہے کہ اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْئًا وَّ لَا يَهْتَدُوْنَ (2:170) ان کی کیفیت ایسی کیوں نہ ہو!! انہوں نے بھی نہ عقل و فکر سے کام لیا ہو اور نہ صحیح راستے پہ چل رہے ہوں اور یہ بھی ان کے اتباع میں نہ عقل و فکر سے کام لیں اور نہ صحیح راستے پہ چلیں۔ یہ اگلی آیت بڑی غور طلب ہے۔ کہتا ہے کہ بھیڑوں کا ایک ریوڑ ہے اور ان کے پیچھے گڈریا ہے' بڑی عجیب تشبیہ ہے' عزیزانِ من! شاعری کے اندر اس کو تامہ تشبیہ کہتے ہیں۔ کہتا ہے ان کی کیفیت یہ ہے کہ وَ مَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا كَمَثَلِ الَّذِىْ يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ اِلَّا دُعَآءً وَّ نِدَآءً (2:171) بڑے باپ سے کچھ آوازیں سیکھیں "تا تا تا آ آ" یہ آوازیں بغیر الفاظ ہیں اور کچھ الفاظ سیکھے بغیر معنی کے۔ اب اس کی کیفیت یہ

ہے کہ وہ چلنے والی ہیں' یہ چلانے والا ہے' وہ بھیڑیں ہیں جن میں عقل وشعور کا سوال ہی نہیں' یہ گڈریا ہے کہ جس نے کوئی چیز علم وبصیرت کی بنا پر نہیں دیکھی' چند آوازیں اپنے بڑوں سے سنیں' چند الفاظ اس کی زبان کے اوپر آئے' وہ اس نے سیکھ لیے۔ اب کیفیت یہ ہے کہ وہ یہ آواز دیتا ہے تو وہ جس آواز پہ لگی ہوئی ہیں وہ یوں مڑ جاتی ہیں۔ کچھ الفاظ یہ کہتا ہے اور وہ کچھ بھاگنے لگ جاتی ہیں۔ کہتا ہے کہ یہ کیفیت انسانوں کی ہوگئی ہے صُمٌّۢ بُكۡمٌ عُمۡىٌ فَهُمۡ لَا يَعۡقِلُوۡنَ (2:171) اندھے' بہرے' گونگے' عقل وفکر سے کام ہی نہیں لے رہے۔ کہتے ہیں کہ ایمان والے ہیں۔ کیوں' عزیزانِ من! الحمدللہ کہہ کر اس کے بعد مسلمان کہلانے کی یہ بات آپ نے سمجھ لی کہ ہمارے ساتھ کیا ہوا ہے۔ ایمان میں تقلید کا کام ہی نہیں ہے۔ حضور نبی اکرمؐ جنہوں نے سب سے پہلے دعوت دی تھی قرآنِ کریم میں حضور کی زبان سے یہ کہلوایا کہ کہہ دو کہ اَدۡعُوۡۤا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيۡرَةٍ اَنَا وَ مَنِ اتَّبَعَنِىۡ (12:108) میں جو تمہیں خدا کی طرف دعوت دیتا ہوں' علیٰ وجہ البصیرت دعوت دیتا ہوں۔ میں بھی ایسا کروں گا اور جو میرا اتباع کرنے والا ہوگا وہ بھی ایسا ہی کرے گا۔

سنتِ رسول کا ماحصل یہ ہے کہ انسان دلائل وبراہین کی بنیاد پر کسی بات کو تسلیم کرے

عزیزانِ من! سنت رسول اللہ کا اتباع یہ ہے کہ ہر بات بصیرت کے زور پہ مانی جائے' علم کے زور پہ منوائی جائے۔ تقلیداً جو چیز منوائی ہوگی وہ خدا کے حکم کے خلاف' رسول کی سنت کے خلاف ہے۔ بلا بصیرت' بلا برہان کسی چیز کو ماننا سنت رسول اللہ کے بھی خلاف ہے۔ آج جو کوئی یہ بات کہہ دے تو اُسے کہتے ہیں کہ یہ منکر سنت رسول اللہ ہے۔ جو بھیڑوں کی طرح مانتا چلا آئے' اس کے لیے کہا جاتا ہے کہ یہ اتباعِ سلفِ صالحین کر رہا ہے۔ حضورؐ نے فرمایا ہے کہ عَلٰى بَصِيۡرَةٍ میں دعوت دیتا ہوں اَنَا وَ مَنِ اتَّبَعَنِىۡ (12:108) میں بھی یہ کرتا ہوں اور میری سنت کا اتباع بھی وہ کرے گا جو علیٰ وجہ البصیرت دعوت دے گا۔ جو دعوت دے گا علیٰ وجہ البصیرت وہ مانے گا بھی تو سب سے پہلی بات علیٰ وجہ البصیرت کی ہے۔ ایمان تو یہ ہوا۔

پیدائشی مسلمانوں کی پوزیشن

اب مسلمان قوم کی ایک دوسری چیز بھی ہے۔ دنیا کے اندر ابتدائی دور کا جو مسلمان تھا آپ نے دیکھا کہ انہوں نے بڑی شان و شوکت حاصل کی' بہت بڑی سلطنت بنی۔ عرب کے اِدھر اُدھر کے جو قبائل تھے انہوں نے صرف اس عظمت کو دیکھ کر' اس حکومت کو دیکھ کر' اس مملکت کو دیکھ کر' اپنے آپ کو سرنڈر کر دیا اور یوں وہ مسلمان ہوگئے۔ مسلمان ہونے کے بعد انہوں نے یہ کہا کہ ہم بھی جماعت مومنین میں ہیں' ہم مومن ہیں۔ عزیزانِ من! غور کیجیے گا قرآنِ کریم نے عین اُس وقت ان کے کہنے کے اوپر واضح الفاظ میں کہا کہ قَالَتِ الۡاَعۡرَابُ اٰمَنَّا (49:14) یہ کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں سنو! اس Process (طریق) کی رو سے وہ ایمان نہیں لائے

تھے۔ کہا ہے کہ یہ کہتے ہیں اٰمنا یعنی ہم ایمان لائے ہیں۔ قُلْ (49:14) ان سے کہہ دو کہ لَّمْ تُؤْمِنُوْا (49:14) ذرا دیکھیے گا کہ تم نے تو یہ کچھ کیا نہیں تھا' جس کا فطری نتیجہ ایمان کہلاتا ہے' تم نے تو یہ Process (طریق) اختیار نہیں کیا تھا اس لیے ان سے کہو کہ نہیں! تم ایمان نہیں لائے' تم اٰمَنَا نہ کہو۔ وَلٰـکِنْ قُوْلُوْٓا اَسْـلَمْنَا (49:14) تم صرف یہ کہو کہ ہم نے ان کی عظمت دیکھی' شان دیکھی ہم ان کے سامنے جھک گئے۔ عزیزانِ من! وہ تو جماعت مسلمین کے اندر یہ تفریق کر رہا ہے۔ اس لیے کہ وَلَـمَّا یَـدْخُـلِ الْاِیْـمَانُ فِـیْ قُلُوْبِکُمْ (49:14) اُس Process (طریق) میں سے تم گزرتے تو ایمان تمہارے دلوں میں داخل ہو جاتا۔ یہ دلوں میں داخل نہیں ہوا۔

برادرانِ عزیز! آپ کی تاریخ کا سب سے افسوس ناک سانحہ یہ ہے کہ آپ کے ہاں کروڑوں کی تعداد کے اندر وہ لوگ مومن بن گئے جو اس طرح سے ایمان لائے نہیں تھے' وہ اَسْـلَمْنَا (49:14) کی رو سے ایمان لائے تھے۔ پوری کی پوری ایران کی سلطنت نے جب محض مسلمانوں کی میدانِ جنگ کے اندر شوکت اور عظمت اور قوت دیکھی تو اَسْلَمْنَا (49:14) کے ماتحت انہوں نے صرف سرنڈر کیا' وہ Overnight (شباشب) مسلمان ہو گئے۔ اور ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم نے انہیں مومن سمجھ لیا۔ آپ غور کیجیے میں تو یہ بات نہیں کہہ رہا قرآن یہ فرق کر رہا ہے۔ بعینہٖ یہ وہی چیز تھی جو ان اعراب کے متعلق کہی گئی ہے وہ اَسْـلَمْنَا (49:14) تھا۔ ایمان تو اس Process (طریق) میں سے گزر کر ہو سکتا تھا' اس کے بغیر اٰمَـنَا کی بات ہو نہیں سکتی۔ یہ بڑی گہری چیز ہے۔ اَسْـلَـمْـنَا کہو۔ ٹھیک ہے جماعت میں آ ملو۔ اب اس کے بعد پھر کہا کہ وَاِنْ تُـطِـیْـعُـوا اللّٰـهَ وَرَسُـوْلَـهٗ لَا یَلِتْکُمْ مِّنْ اَعْمَالِکُمْ شَیْـًٔا (49:14) اب یہ ہے اس نظام میں داخل ہو کر تم ان قوانین خداوندی کی عملی اطاعت کرو۔ اس طرح سے اب اس اطاعت میں رسول کا فریضہ یہ ہوا کہ وَیُـزَکِّیْـهِـمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَةَ (62:2) وہ تعلیم کتاب حکمت کرتا چلا جائے گا اور اس طرح پھر تمہاری ذات کی نشوونما ہوتی چلی جائے گی۔ پھر کہہ دوں جو پہلے عرض کیا تھا کہ یہ کچھ کرو گے تو اس کے بعد پھر یہ صداقتیں تمہارے سامنے علیٰ وجہ البصیرت آ جائیں گی' پھر تمہارے دل کے اندر یہ اتریں گی اور یوں تم اپنے آپ کو مومن کہلانے کے مستحق قرار پاؤ گے۔ ویسے تم سرنڈر ہو گئے' زیادہ سے زیادہ آپ حقوق Citizenship (شہریت) لے سکتے ہیں۔ قرآن کیا فرق کرتا ہے! کہتا ہے کہ آپ ابھی اس درجے کے اوپر نہیں ہیں۔ بڑی لمبی چوڑی تعلیم کا' تدبر کا' تفکر کا' بصیرت کا' علم کا جو Process (طریق) ہے' اس میں سے گزرنے کے بعد یہ چیز پیدا ہوگی۔ ابھی یہ چیز نہیں ہے۔

کیا قرآنی حقائق کو دلی طور پر تسلیم کرنا ہی کافی ہے؟

ایک طرف تو یہ چیز رہی کہ انہوں نے حکومت کو دیکھ کر اپنے آپ کو سرنڈر کیا اور یوں مسلمان ہو گئے۔ ان سے کہا ہے کہ

اَسۡلَمۡنَا (49:14) کہو۔ اپنے آپ کو مسلمان نہ کہو۔ بات اب سامنے آتی ہے اَسۡلَمۡنَا (49:14) ہم نے سرنڈر کیا ہے' ہم اس کے سامنے جھک گئے ہیں۔ ایمان ان صداقتوں کو دل کی گہرائیوں میں اتار لینے کا نام ہے۔ قلب اور دماغ کے کامل اطمینان سے ان صداقتوں کے حق ہونے کے اوپر یقین کرنا ایمان ہے۔ تو کیا پھر کافی ہوگیا کہ یہ مان لیا کہ صداقتیں بالکل صحیح ہیں؟ ایک فارمولہ کے اوپر آپ کا یقین ہوگیا کہ یہ بالکل صحیح ہے' اس کو اس طرح سے کرنے سے یہ کچھ ہو جائے گا۔ کتاب میں آپ نے پڑھ لیا' اُس کے متعلق ہر ممکن طریقے سے آپ نے اطمینان کر لیا کہ یہ فارمولہ صحیح ہے۔ اطمینان کر لیا اور آپ بس بیٹھ گئے تو کیا جو کچھ دین کا تقاضا ہے پورا ہو گیا؟ وہ کہتا ہے کہ نہیں۔ اس کے بعد اگلا قدم لیبارٹری ہے۔ ٹھیک ہے اب فارمولے کے اوپر عمل کرو' یہ جو اگلی اسٹیج ہے' جب تک یہ ساتھ نہیں ملتی قرآن اُس وقت تک خالی مومن ہونے کو کافی نہیں قرار دیتا۔ پھر میں دہرا دوں' اُدھر یہ کیفیت تھی کہ اَسۡلَمۡنَا (49:14) کی رو سے وہ مومن نہیں قرار دیتا اور جب اس طرح سے اس سارے مرحلے سے گزر کر' اس Process (طریق) میں سے گزر کر' ان کے اوپر یقین بھی کر لیتا ہے' تو وہ کہتا ہے کہ یہ نہ سمجھ لو کہ بس مقصد پورا ہو گیا۔ بھئی! کیوں؟

قرآن تو کسی بات کو بھی بغیر سوچے سمجھے اندھے بہرے بن کر تسلیم کرنے کو قبول ہی نہیں کرتا

نبی اکرمؐ سے کہا گیا کہ وَ مَآ اَنۡتَ بِهٰدِی الۡعُمۡیِ عَنۡ ضَلٰلَتِهِمۡ (30:53) اندھے کو تو تم صحیح راستے پہ لا ہی نہیں سکتے۔ ایک بات یہ ہے کہ وہ قلب کا اندھا ہے۔ اِنۡ تُسۡمِعُ اِلَّا (30:53) بات تو وہی سنے گا مَنۡ یُّؤۡمِنُ بِاٰیٰتِنَا (30:53) جو اس طرح سے ہمارے قانون کی صداقت کے اوپر ایمان لائے گا فَهُمۡ مُّسۡلِمُوۡنَ (30:53) اور اس کے بعد اپنے آپ کو ان کے سامنے جھکا دے گا۔ اب بات سمجھ میں آئی کہ مسلمان' مومن ہوئے بغیر کوئی ہو ہی نہیں سکتا' وہ پہلی شرط تھی' ورنہ وہ اَسۡلَمۡنَا (49:14) کے ماتحت آئے گا۔ وہاں سے یہ ہے جو اَسۡلَمۡنَا اور مُسۡلِمُ ہیں۔ اتنی سی چیز ہوئی۔ اور اگر ان تمام طریقوں کے باوجود ایمان لے آیا ہے تو پھر بھی یہ نہیں ہے کہ مقصد پورا ہو گیا' نہ بھائی! یوں ایمان لانے کے بعد کہا ہے کہ فَهُمۡ مُّسۡلِمُوۡنَ (30:53) اس کے سامنے جھکنا بھی ہے۔ جھکنے والوں سے یہ کہا ہے کہ یونہی اندھے' بہرے بن کر جھکنا نہیں ہے' علم و بصیرت کی رو سے جھکو تو مومن کہلاؤ گے۔ علم و بصیرت کی رو سے اس کو حق ماننے والوں کے متعلق کہا ہے کہ اتنا کچھ کر لینے کے بعد یہ نہ سمجھ لو کہ بس مقصد پورا ہو گیا' تم نے مسلم بھی ہونا ہے۔ کیا بات ہے اس کی! مسلم سے کہتا ہے کہ مومن بھی ہونا ہے' مومن سے کہتا ہے کہ مسلم بھی ہونا ہے۔

ضابطۂ قرآنی کے مطابق عملی نتائج حاصل کرنے کے لیے پہلے لا کے مراحل سے گزرنا ضروری ہے

اب سوال یہ ہے کہ پھر یہ کیسے ہو جائے گا؟ کیا ایسی چیز ہے کہ ہم بیٹھ گئے اور جو کچھ ہمارے ہاں ہے' اُس کو پیشِ نظر رکھا اور پھر

یونہی Formality (رسم) کے طور پر' Mechanically (میکانکی طور پر) خالص Intellectually (ذہنی طور پر) دلائل و براہان کی روسے' یہ چیز دیکھتے گئے کہ یہ ٹھیک ہے' یہ بھی یوں ہے' ہاں ہوسکتا ہے۔ کہتا ہے کہ آ و تمہیں بتائیں کہ Process (طریقِ کار) کیا ہے؟ اس عملی Process (طریقِ کار) کے لیے کہا ہے کہ اس کی دو Stages (منازل) ہیں' دو چیزیں ہیں: **فَمَنْ یَّکْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَ یُؤْمِنْ بِاللّٰهِ** (2:256) یہ جسے تم نے کہا ہے کہ میں ایمان لایا' اُس سے پہلے کرنے کی ایک چیز اور بھی ہے' ایمان سے پہلے کفر کرنا بڑا ضروری ہے۔ یہ ایمان سے پہلے کفر کہتا ہے' اِس کے بغیر کوئی ایمان کے درجے پہ پہنچ ہی نہیں سکتا۔ یہ کفر تو انکار ہے۔ کہتا ہے کہ ہاں انکار ہے' انکار کرنا ہوگا' انکار کرنا ہوگا۔ کس سے انکار کرنا ہوگا؟ ہر اُس چیز سے جو پہلے تمہارے دماغ میں پڑی ہوئی ہے' ان تختیوں کو دھوڈالو' ان سلیٹوں کو صاف کردو۔ روز بچہ جو لکھ کر لاتا ہے' وہاں گھر میں آ کر دوسرے دن جانے کے لیے وہ تختی دھوتا ہے' اس کو صاف کرتا ہے' اُسے کہیے کہ کل والی لے جائے' وہ رو رہا ہوتا ہے کہ ماسٹر صاحب ماریں گے۔ ٹھیک ہے لکھی ہوئی تختی کے اوپر تو کوئی صحیح چیز لکھی نہیں جاسکتی' اس کو دھونا پڑے گا۔ عزیزانِ من! یہ ہے حصہ لا الہ کا کہ کوئی صاحبِ اقتدار نہیں' کوئی صاحبِ اختیار نہیں' کسی کے قانون کی اطاعت نہیں کی جاسکتی' کسی کے سامنے جھکا نہیں جاسکتا۔ ہر طاغوت سے انکار کرتے چلے جاؤ۔ طغیٰ کے معنی ہی یہ ہے جو قانونِ خداوندی سے سرکشی برتنے والا ہو' اور یہ باہر ہی نہیں ہوتے۔ ان کو **اتَّخَذَ هَوٰىهُ** کہا ہے۔ یہ خود اپنے ہی جذبات کو معبود بنانے والا ہے۔ یہ بھی تو ایمان بالطاغوت کے اوپر بیٹھا ہوا ہے' یہ بھی تو طاغوت ہے۔ سوچ رہے ہیں عزیزانِ من! بڑی جلدی سے الحمدللہ کہہ کر مومن کہنے والے' یہ مومن تو بہت بعد میں آتا ہے' یہ جو کفر کی منزل ہے ذرا اس کفر کی منزل میں تو دیکھیے گا' اس میں سے کتنے نکلے ہیں' ابھی کتنوں نے اپنی تختی دھوئی ہے' سلیٹ صاف کی ہے' کون ہے جس نے یہ اٹھ کر' کھڑا ہو کر کہا ہے کہ ہر غیر خداوندی قوت کے خلاف میں سرکشی اور بغاوت کا علم بلند کروں گا۔ یہ تو بہت بڑا انقلابی پروگرام ہے' عزیزانِ من!

یہ شہادت گہہِ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلمان ہونا

مومن کے لیے پہلا مرحلہ تو ہر غیر خدائی قوت سے انکار کرنا ہے

''اسیں تاں جم دے ای مسلمان ہونے آں' بس ختنہ کرن دی ضرورت ہے ❶۔'' اس پہ بڑا زور دیا جاتا ہے۔ **یَکْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ** (2:256)۔ اب آپ نے سن لیا کہ ایمان کے لیے وہ Verb (فعل) کیوں استعمال ہوا تھا؟ جسے آپ ایمان لانا کہتے ہیں'

---

❶ ہم تو پیدائشی مسلمان ہوتے ہیں صرف ختنہ کرنے کی ضرورت ہے۔

کیوں اس کے لیے یہ Verb (فعل) استعمال ہوا تھا؟ یہ پہلی چیز جو ہے کہ یہ بھی Verb (فعل) ہے **یَکْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ** (2:256)۔ پہلے یہ کرنا ہے۔ ہر غیر خداوندی قوت سے انکار کر دینا ہے۔ انکار ہی نہیں، اس کے تو سرکشی معنی ہوتے ہیں۔ انقلاب اختیار کرنا، جب یہ ہو جائے **وَ یُؤْمِنْ بِاللّٰہِ** (2:256) اور پھر اس Process (طریق) کے تابع پھر Positive Side (مثبت پہلو) پہ آؤ، مثبت پہ آؤ یعنی **لَا اِلٰہَ** کہو، پھر **اِلَّا اللّٰہُ** کے اوپر آؤ۔ یہ دو چیزیں پوری ہوں۔ **فَقَدِ اسْتَمْسَکَ بِالْعُرْوَۃِ الْوُثْقٰی لَا انْفِصَامَ لَھَا** (2:256) تو پھر اس نے ایک ایسا سہارا تھاما ہے جو زندگی میں اسے کہیں دغا نہیں دے گا، کبھی دھوکا نہیں دے گا، یہ رسی ٹوٹے گی نہیں۔ اب تم اس راستے کے اوپر چلو، اب تمہیں کوئی خطرہ نہیں ہے۔ یہ کتاب **ذٰلِکَ الْکِتٰبُ** (2:2) ہے، یہ ہے وہ ضابطہ ہدایت جو **ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ** (2:2) ان کے لیے راہنمائی دکھاتی ہے، ابھار کر، نکھار کر سامنے لاتی ہے جو راستے کے خطرات سے محفوظ ہو کر منزل مقصود تک پہنچنے کے لیے آمادۂ سفر ہو جائیں۔ یعنی یہ وہ لوگ ہیں جو سب سے پہلے ہر غیر خداوندی تصور، نظریہ، عقیدہ، قوت سے انکار کریں، سرکشی برتیں، اعلان کریں، انقلاب کا نعرہ بلند کریں، بغاوت کریں، یہ سارا کچھ ختم کرنے کے بعد علم و بصیرت، دلیل و برہان کی رو سے ان صداقتوں کے حق ہونے کے اوپر یقین رکھیں: مُسْلِمُوْنَ پھر ان کے سامنے عملاً جھکیں۔ یہ کچھ کریں گے تو اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا تک پہنچیں گے۔

آگے ہے **یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ** (2:3)۔ اس کا غلط مفہوم پھر ہمیں کہیں سے کہیں لے گیا۔ اس کا صحیح مفہوم آپ دیکھیں گے کہ کس طرح ہمیں تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لے آتا ہے لیکن یہ ہم اگلے درس پہ اٹھا رکھتے ہیں کیونکہ درس کا وقت ختم ہو گیا ہے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ

❀......❀......❀

دوسرا باب: سورۃ البقرۃ(1)' (آیت 3)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَ
يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۳

عزیزانِ من! آج جون 1968 کی 2 تاریخ ہے اور ہم اپنے درسِ قرآنِ کریم کے نئے سلسلہ میں سورۃ البقرۃ کی ابتدائی آیات سے گزر رہے ہیں۔

خدا تعالیٰ کی بارگاہ میں بندۂ مسلم کی ایک شدتِ آرزو کا اظہار اور اس کا جواب

سورۃ الفاتحۃ میں ایک شدید آرزو تڑپ کر ان الفاظ کے ساتھ لبوں پہ آ گئی تھی کہ اِھۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ(1:5) ہمیں سفرِ زندگی میں اس راستے کی طرف راہنمائی ملے جو سیدھا اور ہموار ہے۔ یہ آرزو زبان پہ آئی تو اس کا جواب دیا کہ تم یہ راہنمائی مانگتے تھے تو سنو! ذٰلِکَ الۡکِتٰبُ لَا رَیۡبَ فِیۡہِ ھُدًی لِّلۡمُتَّقِیۡنَ (2:2) یہ ضابطہ ہدایت ہے جس کے اندر وہ راہنمائی ہے جس کی طلب اور تڑپ تمہارے دل میں پیدا ہوئی ہے۔ اِدھر سے دعا آپ کے لب پہ آئی اور اُدھر سے اُسے شرفِ قبولیت حاصل ہو گیا۔ تم یہ چاہتے تھے' یہ لیجیے لیکن کہا کہ راہنمائی کی تو ضرورت اُسے ہی ہوتی ہے جو راستہ چلنا چاہے' جو گھر میں بیٹھا رہنا چاہے اُسے تو راستے کی راہنمائی کی ضرورت ہوتی ہی نہیں ہے۔ پہلی شرط تو یہ ہے کہ تم چلنا چاہتے ہو اور دوسری شرط یہ ہوتی ہے کہ جب کبھی بھی تم کسی سے راستے کی بابت پوچھو تو پہلے یہ کہنا پڑتا ہے کہ بھئی! مجھے شاہ عالمی جانا ہے' کون سا راستہ اُس طرف جائے گا؟ آپ کو پہلے اپنی منزل کا تعین کرنا ہوگا کہ آپ نے جانا کہاں ہے۔ جب منزل کا تعین ہوگا تو پھر راستے کی راہنمائی کا سوال پیدا ہوگا۔ آوارگی میں تو اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس کے لیے دو شرطیں ہو گئیں: ایک تو یہ کہ چلنا چاہے اور اس کے بعد پھر متعین منزل پر پہنچنا چاہے۔ دوسرا یہ کہ اس کے ساتھ اس راہنمائی کی ایک بنیادی ضرورت یہ بھی ہے کہ راستہ بے خطر ہو' سیدھا ہو' ہموار ہو۔ لہٰذا قدم اٹھانے سے پہلے ضروری ہے کہ آپ کو اس کا یقین ہو جائے کہ جس راستے پہ میں گامزن ہوں وہ ان شرائط کو پورا کرتا ہے اور اس طرح میں منزل

دوسرا باب: سورۃ البقرۃ (1)' (آیت 3)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج جون 1968 کی 2 تاریخ ہے اور ہم اپنے درسِ قرآنِ کریم کے نئے سلسلہ میں سورۃ البقرۃ کی ابتدائی آیات سے گزر رہے ہیں۔

خدا تعالیٰ کی بارگاہ میں بندۂ مسلم کی ایک شدتِ آرزو کا اظہار اور اس کا جواب

سورۃ الفاتحہ میں ایک شدید آرزو وتڑپ کران الفاظ کے ساتھ لبوں پہ آ گئی تھی کہ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ (1:5) ہمیں سفرِ زندگی میں اس راستے کی طرف راہنمائی ملے جو سیدھا اور ہموار ہے۔ یہ آرزو زبان پہ آئی تو اس کا جواب دیا کہ تم یہ راہنمائی مانگتے تھے تو سنو! ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ (2:2) یہ ضابطہ ہدایت ہے جس کے اندر وہ راہنمائی ہے جس کی طلب اور تڑپ تمہارے دل میں پیدا ہوئی ہے۔ اِدھر سے دعا آپ کے لب پہ آئی اور اُدھر سے اُسے شرفِ قبولیت حاصل ہو گیا۔ تم یہ چاہتے تھے' یہ لیجیے لیکن کہا کہ راہنمائی کی تو ضرورت اُسے ہی ہوتی ہے جو راستہ چلنا چاہے' جو گھر میں بیٹھا رہنا چاہے اُسے تو راستے کی راہنمائی کی ضرورت ہوتی ہی نہیں ہے۔ پہلی شرط تو یہ ہے کہ تم چلنا چاہتے ہو اور دوسری شرط یہ ہوتی ہے کہ جب کبھی بھی تم کسی سے راستے کی بابت پوچھو تو پہلے یہ کہنا پڑتا ہے کہ بھئی! مجھے شاہ عالمی جانا ہے' کون سا راستہ اُس طرف جائے گا؟ آپ کو پہلے اپنی منزل کا تعین کرنا ہو گا کہ آپ نے جانا کہاں ہے۔ جب منزل کا تعین ہو گا تو پھر راستے کی راہنمائی کا سوال پیدا ہو گا۔ آوارگی میں تو اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس کے لیے دو شرطیں ہو گئیں: ایک تو یہ کہ چلنا چاہے اور اس کے بعد پھر متعین منزل پر پہنچنا چاہے۔ دوسرا یہ کہ اس کے ساتھ اس راہنمائی کی ایک بنیادی ضرورت یہ بھی ہے کہ راستہ بے خطر ہو' سیدھا ہو' ہموار ہو۔ لٰہذا قدم اٹھانے سے پہلے ضروری ہے کہ آپ کو اس کا یقین ہو جائے کہ جس راستے پہ میں گامزن ہوں وہ ان شرائط کو پورا کرتا ہے اور اس طرح میں منزل

مقصود تک پہنچ جاؤں گا۔ چنانچہ یہ کہا کہ الَّـذِیْـنَ یُؤْمِنُوْنَ (2:3) یہ وہ لوگ ہیں جو قدم اٹھانے سے پہلے اس کا یقین کر لیتے ہیں کہ راستہ صحیح ہے۔

مذہبی تعلیم کا انحصار عقل وفکر کے تحت ایمان کے بالمقابل Faith (عقیدہ) پر ہوتا ہے

میں نے پچھلی دفعہ عرض کیا تھا کہ دین جب مذہب کی سطح پر آتا ہے تو اس کی بنیادی چیز یہ ہوتی ہے کہ الفاظ اور اصطلاحات تو اس کی وہی رہتی ہیں لیکن اُن کا مفہوم بدلتا ہے اور یہ بدلا ہوا جو مفہوم ہے' اس کے مطابق اس کا ترجمہ ہو جاتا ہے۔ اب جو اس ترجمے سے اُس اصل کو ہم سمجھنا چاہتے ہیں تو وہ کبھی بھی ہم نہیں سمجھ سکتے۔ وہ ترجمہ تو کسی بدلے ہوئے مفہوم کا ہوتا ہے۔ ایمان کا ترجمہ' آپ کے ہاں تو اس کو ایمان ہی رکھا گیا' انگریزی زبان میں اس کا ترجمہ Faith ہوا جب کہ Faith کے متعلق ایک تصور ہے اور وہ یہ ہے کہ Faith کے بالمقابل Reason (عقل وفکر) آتا ہے۔ Faith اور عقل وفکر باہمی طور پر ایک دوسرے کے اندر متضاد کیفیات لیے ہوئے ہیں یعنی جہاں Faith ہوگا' اس میں Reason کا کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ اب ایمان کا ترجمہ Faith کیا تو ذہن میں چلتے ہی پہلی یہ بات آ گئی کہ عقل وفکر کے دیئے تو گل کرو اور پھر ان تاریکیوں کے اندر قدم اٹھاؤ۔ یہاں اُس نے کہا یہ تھا کہ ایمان وہ ہے جو تمہیں تاریکیوں سے روشنی کی طرف لے آئے گا۔ یہ ایمان وہ ہوا جو پہلے سے ہی تھوڑی بہت عقل وفکر کی روشنی پاس تھی اُسے بھی ہم نے پھونک مار کر بجھا دیا اور تاریکیوں میں ہی راستوں پہ چلے اور اس کا نام ہم نے ایمان رکھ لیا۔ ایمان کا ترجمہ Faith ہے ہی نہیں۔ یہ علم وبصیرت کی بنا پر' دلیل اور برہان کی رو سے' دل اور دماغ کے پورے اطمینان کے بعد' کسی صداقت کو صحیح تسلیم کرنے کا نام ہے۔ جو لفظ بھی اس کے لیے آپ موزوں سمجھتے ہیں رکھ لیجیے لیکن اس میں یہ مفہوم ہونا چاہیے۔ انگریزی کا لفظ Conviction کسی حد تک اس کو پورا کرتا ہے گو کہ بات وہ بھی ایسی نہیں۔ Conviction بھی ایک انتہائی درجے کی Conviction ہونی چاہیے جو عقل وفکر و بصیرت و دلیل' Reason کے ہر معیار کے اوپر پوری اترے اور اس طرح آپ کو اتنا کامل یقین ہو کہ وہ آپ کا یقینِ کامل کہیں بھی Fake (جعلی اور بناوٹی) نہ ہو تو یہ ہوگا جسے قرآنِ کریم نے الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ (2:3) کہا ہے۔

مذہب اور دین میں لفظ غیب کے تصور میں پایا جانے والا فرق

ایمان ہی کا ترجمہ ہمارے ہاں Faith ہوا تو اس کے ساتھ غیب کا ایک اور لفظ آ گیا۔ قرآن نے کہا ہے کہ یُـؤْمِـنُـوْنَ بِالْغَیْبِ (2:3)۔ اب جونہی غیب کا یہ لفظ ہمارے سامنے آیا تو ذہن میں دیا ہوا ایسا ایک تصور ہے کہ غیب کہتے ہی اس طرح ماننے کو ہیں جس میں عقل وفکر کا کوئی دخل ہی نہ ہو یعنی اَن دیکھی حقیقتوں کو ماننا۔ آپ دیکھیے گا کہ ایمان بالغیب ہم روز بولتے ہیں اور اس کے معنیٰ یہ

ہوتے ہیں کہ بھئی! اسے تو بس مان لینا ہے' بات یہ ہے کہ اسے مان لینا ہے۔ یہ بات نہیں ہے۔ قرآنِ کریم نے تو غیب کے بالمقابل ایک لفظ لاکر خود واضح کر دیا کہ غیب کسے کہتے ہیں۔ قرآن کا انداز ہ یہ ہے کہ وہ ہمیشہ بالمقابل اس کی ضد کا' ایک لفظ لاتا ہے اور اُس سے اس کے معنی واضح ہو جاتے ہیں۔ قرآن کے اندر خدا کے متعلق ہے کہ عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ (6:13) وہ غیب اور شہادت دونوں کا علم رکھتا ہے تو گویا غیب وہ ہے جو نا مشہود ہو۔ یہ جسے میں نے شہادت اور مشہود کہا ہے' کیا ہے؟ جتنی چیزیں آپ کے Sense Perception (ادراک بالحواس) میں آ جاتی ہیں یعنی حواس کے ذریعے جن کا علم ہو سکتا ہے' اُسے مشہود کہتے ہیں اور یہ جو علم حاصل کرنے کا طریقہ ہے' اسے شہادت کہتے ہیں۔

علم و شعور کی وسعتیں غیب کو بتدریج مشہود کی منزل سے ہم کنار کر دیتی ہیں

قرآن نے یہ بتایا ہے کہ ایک تو عالمِ مشہود ہے۔ یہ وہ کائنات ہے جس کا علم حواس کے ذریعے سے' Sense Perception (ادراک بالحواس) کے ذریعے سے' تمہیں حاصل ہو سکتا ہے لیکن ایسی حقیقتیں بھی ہیں جو تمہارے حواس کی زد میں نہیں آتیں۔ یاد رکھیے! عربوں کے ہاں ''غیب اُسی چیز کے لیے بولا جاتا ہے جو کہیں موجود تو ہو لیکن ابھی مشہود نہ ہوا ہو' جو موجود ہی کہیں نہ ہو اس کے لیے وہ غیب کا لفظ بولتے ہی نہیں ہیں''۔ اب سوال یہ ہے کہ غیب کیا ہوگا؟ ایک تو غیب کی کیفیت یہ ہوگی کہ وہ انسانی علم کی کسی سطح کے اوپر غیب ہو' حواس کی زد میں نہ آیا ہوا ہو لیکن ذرا آگے بڑھنے کے بعد وہی چیزیں Sense Perception (ادراک بالحواس) کے اندر آ جائیں۔ جب وہ یوں آ جائیں گی تو غیب نہیں رہیں گی' وہ شہادت ہو جائیں گی۔ کائنات کی سینکڑوں قوتیں' عناصر ایک دوسرے کے اندر غیب میں ہوتے ہیں' دوسرے ہی دور کے اندر Scientific Discoveries (سائنسی انکشافات) ان کو مشہود بنا کر ہمارے سامنے لے آتی ہیں۔ اس لیے ایک غیب تو یہ ہوا جو علم کی کسی سطح کے اوپر' تاریخ کے کسی دور میں' غیب کی شق میں تھا اور اس کے بعد علم انسانی آگے بڑھتا گیا تو وہ غیب مشہود ہوتا چلا گیا۔ آج کائنات کی کتنی ایسی قوتیں مشہود ہو چکی ہیں جو اس سے پیشتر ہمارے ہاں غیب تھیں۔ آپ کے ہاں یہ ریڈیو اور ٹی وی کی چیزیں دیکھیے' لہری تابنا کیاں دیکھیے' جن کے ذریعے سے اب آسمانوں پہ پہنچا جا رہا ہے۔ یہ ساری قوتیں اسی کائنات کے اندر موجود تھیں' عربوں کی Definition کے مطابق وہ تمام موجود تھیں لیکن علم انسانی کی کوتاہیٔ دامن کی وجہ سے مشہود نہیں ہوئی تھیں۔ اب یہ آہستہ آہستہ مشہود ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ ایک تو یہ چیز ہوئی۔ کہا یہ گیا ہے کہ یہی چیز نہ سمجھو کہ جو چیز تم حواس کے ذریعے سے معلوم کرو' کہو کہ یہی ہے' اس کے علاوہ کچھ اور ہے ہی نہیں۔ آپ نے دیکھا کہ قرآنِ کریم نے عالم الغیب والشھادۃ کہہ کر اس کائنات کی وسعتوں کو کتنا بڑھا دیا ہے۔ یہی نہیں کہ کسی ایک زمانے میں علم کی کسی ایک

سطح کے اوپر انسان کے ذہن کی تنگ ناؤ میں جتنی چیز آ گئی اس نے کہا کہ سارا کارگہِ کائنات ہی یہی ہے۔ یہ تو کنویں کے مینڈک کی سی چیز ہے اور جب آپ اس چیز کو دین سمجھ لیں اس کے ساتھ کوئی تقدس بھی اٹیچ (شامل) ہو جائے تو پھر اس چیز کو اکبرالٰہ آبادی (1846-1921ء) نے یوں کہا تھا کہ

چاہِ زم زم کے آپ مینڈک ہیں

یہ تو گویا آپ مقدس کنویں کے مینڈک ہیں۔

فکرِ انسانی کسی شکل میں بھی لامحدودیت کا درجہ حاصل نہیں کر سکتا

کائنات بڑی وسیع ہے ایک زمانے میں علم کی ایک سطح پر جو چیزیں غیب ہیں دوسرے وقت میں وہ مشہود ہو جاتی ہیں لیکن بعض چیزیں ایسی بھی ہیں جو انسان کی اس فزیکل زندگی میں غیب ہی رہتی ہیں مشہود نہیں ہو سکتیں مثلاً خدا کی ذات۔ ذاتِ خداوندی کیا ہے؟ یہ چیز حواس (Senses) کی زد میں نہیں آ سکتی۔ اس کے متعلق میں اس سے پہلے بھی کئی دفعہ کہہ چکا ہوں کہ یہ بات ذرا فلسفے کے دائرے میں چلی جاتی ہے اور اس قسم کی مجلس کے اندر تو اس قسم کی فنی گفتگو نہیں کی جا سکتی۔ دو لفظوں میں سمجھ لیجیے کہ جو Infinite ہو یعنی لامحدود ہو وہ محدود یا Finite کے اندر نہیں آ سکتا ہمارا ذہن اس چیز کو تسلیم ہی نہیں کر سکتا۔ جب ہم کہیں کہ وقت لامتناہی ہے یعنی کہیں سے وقت شروع نہیں ہوا تھا تو یہ ہمارے ذہن میں بھی نہیں آ سکتا۔ یا اگر ہم یہ کہہ دیں کہ کائنات کی کوئی آخری حد نہیں ہے تو یہ ذہن میں آ ہی نہیں سکتا جو جی میں آئے کر لیجیے۔ Imagination (تخیلات) اور فکر کی دنیا کو کتنا ہی Concentrate (مرتکز) کر لیجیے ذہن کسی نقطے پہ جا کر ضرور کھڑا ہو جائے گا اس لیے کہ ہمارا ذہن محدود ہے۔ جو لامحدودیت ہے وہ ہمارے ذہن میں نہیں آ سکتی۔ اس لیے یہ جو چیزیں ہوں گی یہ تو غیب کی دنیا کے اندر رہیں گی۔

کیا ایسا علمِ غیب جس تک انسانی عقل کی رسائی ممکن ہی نہیں ایمان کے خلاف ہے؟

سوال یہ ہے کہ یہ جو عالمِ غیب ہے جو Perception میں حواس کے اندر نہیں آتا تو کیا اس کے اوپر ایمان اس طرح سے کہا گیا ہے کہ سوچنا نہیں فکر نہیں کرنا غور نہیں کرنا ایسا ہی مانتے چلے جانا۔ یہی ایک ایسی Possible (ممکن) شق ہو سکتی ہے جس کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ صاحب! یہ وہ مقام ہے جہاں پھر غور و فکر نہیں ہو سکتا۔ یہ قرآن ہے برادرانِ عزیز! جب اس نے ایمان کی Definition یہ دی ہے کہ وہ غور اور فکر اور عقل و بصیرت اور دلیل و برہان کی بنا پر کسی چیز کو سچ ماننے کا نام ہے تو ہو نہیں سکتا کہ ایمان کے اندر وہ کوئی ایسی شق لے آئے جس کے متعلق کہے کہ اسے تمہیں غور و فکر کے بغیر ماننا ہو گا۔ یہ ایمان کی Definition (تعریف) کے خلاف چلا جائے گا۔

قرآنِ حکیم فکر و عمل کی بنیاد پر حواس سے بالاتر چیزوں کو تسلیم ہی نہیں کرواتا

کسی شے کا Senses (حواس) کی حد کے اندر نہ آنا اور بات ہے اور اس چیز کے متعلق بغیر غور و فکر کے ایمان لانا' دوسری چیز ہے۔ ہزاروں چیزیں ایسی ہیں جو Senses (حواس) کی حد میں نہیں آتیں لیکن غور اور فکر کے ذریعے سے انسان تسلیم کرتا ہے کہ ہاں وہ حقیقت ہے جیسے اس کائنات کے متعلق جتنی چیزیں Created (بنائی ہوئی) ہیں' ان کے متعلق عقل اور فہم' Logic (منطق) کے جو آپ کے ہاں قوانین ہیں' وہ یہ کہتے ہیں کہ مشہود پیدا کی ہوئی یہ چیز' آپ کے سامنے دیدی تو اُس کا جو بنانے والا ہے' جو خالق ہے' وہ تسلیم کرنا پڑے گا۔ وہ خالق آج کے حواس (Senses) کی زد میں آئے یا نہ آئے' فکر کا تقاضا یہ ہے کہ آپ اُس کو تسلیم کریں۔ اس لیے جو چیزیں انسان کے حواس (Senses) میں نہیں آسکتیں' قرآن انہیں بھی بغیر فکر اور علم کے ماننے کا تقاضا نہیں کرتا۔ اس کے لیے قرآن کی سند ملاحظہ فرماؤ۔ اس عالم غیب میں' مرنے کے بعد کی زندگی' میں سمجھتا ہوں کہ سرفہرست آتی ہے۔ خدا کے متعلق تو پھر بھی یہ جو اتنی کائنات ہے اس میں سے Logically (منطقی طور پر) آدمی اس نتیجے پہ پہنچ ہی جاتا ہے کہ یہ سلسلہ کائنات' جو اس قدر حسن اسلوبی سے چل رہا ہے' اس کے پیچھے کوئی قوت ہے جو اسے چلا رہی ہے لیکن مرنے کے بعد کی زندگی کے متعلق تو یہ چیز ایسے ہی نہیں آسکتی۔ اسی لیے میں نے کہا ہے کہ غیب پر ایمان کی شقوں میں مرنے کے بعد کی جو زندگی ہے' یہ ایسی نظر آتی ہے کہ صاحب! یہ تو انسان کے غور اور فکر کی حد سے باہر کی ہے لہٰذا اسے تو یونہی ماننا پڑے گا' قرآن یہ نہیں کہتا۔ یہ بڑی ہی لطیف چیز ہے اور یہیں سے تو قرآن کی عظمت سامنے آتی ہے۔ ایک ایسی حقیقت جس کے متعلق ہر شخص یہ کہے کہ یہاں تو انسانی فکر کا کوئی مقام نہیں' یہ تو اس کی سرحد سے باہر ہے' سنیئے! قرآن کہتا ہے کہ **کَذٰلِکَ یُبَیِّنُ اللّٰہُ لَکُمُ الْاٰیٰتِ لَعَلَّکُمْ تَتَفَکَّرُوْنَ ۙ فِی الدُّنْیَا وَ الْاٰخِرَۃِ** (2:219-220) اس طرح سے خدا اپنے قوانین کو واضح کر کے تمہارے سامنے پیش کرتا ہے تاکہ تم دنیا اور آخرت کے اندر فکر سے کام لے سکو۔

حق تک پہنچنے کے لیے غیر مبہم علامات پر غور و فکر

سنتے ہیں آپ' عزیزانِ من! قرآن کہاں لے جاتا ہے! خدا کے متعلق غور و فکر سے تو سارا قرآن بھرا پڑا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ حیاتِ آخرت کے متعلق' مرنے کے بعد کی زندگی کے متعلق' جو یقیناً سرحدِ ادراکِ انسانی سے بہت بہت ماوراء چیز ہے' قرآن کہتا ہے کہ **یُبَیِّنُ اللّٰہُ لَکُمْ** (2:219) یہ جو آیات ہیں' نشانیاں ہیں' نامحسوس اور نامشہود کے لیے تو کچھ علامات ہی دی جائیں گی' یہ علامات ہیں' ہم نے ان کو مبہم نہیں رکھا' **یُبَیِّنُ اللّٰہُ** (2:219) ہم تمہارے سامنے اس چیز کی نہایت واضح آیات' علامات' نشانیاں لے آئے ہیں' تاکہ تم **لَعَلَّکُمْ تَتَفَکَّرُوْنَ ۝ فِی الدُّنْیَا وَ الْاٰخِرَۃِ** (2:219-220) اس حیاتِ دنیاوی اور آخرت کے متعلق غور و فکر سے کام لے

سکو۔ لہٰذا یہ جو غیب ہے جو انسان کی سرحد ادراک میں Senses Perception (ادراک بالحواس) میں آ ہی نہیں سکتا' اس پر بھی ایمان بغیر غور وفکر کے نہیں لایا جائے گا۔

فکری طور پر غیب پر ایمان کے سلسلہ میں ایک تیسری چیز

اب آپ نے دیکھا کہ یومنون کے اندر ہی جو ایمان لانے کی چیز تھی' وہی غور وفکر کے لیے کچھ کم نہیں تھی **یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ** (2:3) کے اندر یہ چیز دینا کہ وہ چیزیں جو انتہائی غیب کے اندر ہیں' جو کبھی بھی مشہود نہیں ہوسکیں گی' ان پر بھی ایمان غور اور فکر کے بعد لایا جائے گا' ایسے نہیں تسلیم کیا جائے گا' ایک بڑی اہم چیز ہے۔ اور قرآن نے خود ہی یہ دلائل بھی اپنے ہاں دیئے ہوئے ہیں۔ جب ہم وہاں آگے جائیں گے تو آپ دیکھیں گے کہ حیاتِ اخروی کے متعلق اتنے دلائل قرآن نے دیئے ہیں' اس کے بعد فکری دلائل ہیں۔ کسی کے سامنے مردہ زندہ اٹھ کر تو کھڑا نہیں ہو جائے گا' نہ ہی کوئی یہاں سے وہاں جا کر دیکھ دکھا کر واپس آئے گا کہ ہاں صاحب! میں دیکھ آیا ہوں کہ وہ وہاں زندہ ہے' یوں تو نہیں' فکری دلائل ہی دیئے جائیں گے۔ اسی لیے **لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ** (2:219) کہا ہے کہ فکری طور پر تم اس کو تسلیم کرو کہ یہ حقیقت ہے۔ اب یہاں یہ ایک تیسری چیز ہے جو غیب میں آتی ہے۔ ہمارے ہاں کسان دیسی گندم بوتا چلا آ رہا تھا' بڑی سے بڑی محنت ہوتی تھی۔ ہمارے ہاں تو کسی نے بیس من! ایک ایکڑ میں سے نکال لیا پچیس من ایک ایکڑ میں سے نکال لیا۔ دو برس ❶ اُدھر' محکمہ زراعت نے کہنا شروع کیا کہ ہم ایک بیج لائے ہیں' تم اسے بوؤ گے تو سو من ایکڑ میں سے نکلے گی۔ کہا کہ لو! سو من نکلیں گے ایک ایکڑ سے!! مت ماری گئی پاگل کی' کہتا ہے کہ سو من ایک ایکڑ سے نکلے گا۔ او جا میاں ہوش کی دوا لو۔ اب وہ بیچارے محکمہ زراعت والے آ رہے ہیں' سمجھا رہے ہیں۔ یہ کہتے ہیں کہ کیا کہہ رہے ہو! ہم سال ہا سال سے یہ بوتے چلے آ رہے ہیں۔ وہ تو جب آدم کا نام آتا ہے تو گندم کا نام ساتھ ہی آ جاتا ہے۔ کسی نے کہیں بہت بہت تیر مارا پچیس سے تیس من فی ایکڑ کر لیا۔ سو من؟ انہوں نے کہا کہ سو نہیں' سوا سو من بھی! کہنے لگے کہ مذاق کیا ہے آپ نے۔ کہیں نہ کہیں انہوں نے اپنے ہاں گورنمنٹ ایگریکلچر فارم بنا لیے۔ اس میں انہوں نے اس بیج کو بو دیا اور جب وہ فصل کٹی ہے تو اس کے بعد جب ان کسانوں نے دیکھا تو فی الواقع اس میں سے سو من فی ایکڑ نکلا۔ اس کی کیفیت اگلے سال کے لیے یہ تھی کہ وہ بیج ملتا نہیں تھا' یہ کسان بھاگے بھاگے پھر رہے تھے۔ اب سوال یہ ہے کہ پہلے سال یہ کیوں نہیں مان رہے تھے؟ کہ انہوں نے محکمہ زراعت کے اس دعوے کو مشہود طور پر اپنے سامنے نہیں دیکھا تھا' اس وقت وہ غیب تھا اور ایک ہی سال کے بعد جب وہ غیب اپنے محسوس نتائج سامنے لے آیا تو ہر ایک اس کے اوپر ایمان لے آیا۔ یہ جو میں نے مثال دی ہے یہ تو ایک ایسی طبعی مثال ہے جس کے نتائج چھ مہینے کے اندر سامنے آ گئے۔

---

❶ یاد رہے یہ بات جون 1968ء کی 2 تاریخ کو کہی گئی تھی۔

نظام کی تبدیلی سے نتائج کی تبدیلی ہوتی ہے

انسان کی معاشرتی یا تمدنی زندگی کے اندر بھی اس قسم کا ایک نظام آتا ہے۔آج ایک نظام رائج ہے۔اب اور کوئی لفظ ہے نہیں' اس لیے بدنظمی ہی کہنا پڑتا ہے اور کیا کہا جائے!! اس نظام کے اندر کوئی چیز اپنے مقام پہ صحیح نہیں' ظاہراً فساد فی البر والبحر ہے۔اس میں بدعنوانیوں کا' قانون شکنیوں کا' بے ایمانیوں کا' بددیانتیوں کا' ہاتھوں کے ہتھکنڈوں کا' دور دورہ ہے اور اس میں انسان سیکھتا ہے کہ شاباش کس طرح سے وہ Millionaire (کروڑ پتی) ہوتا چلا جائے۔اس دور میں ایک شخص یہ کہتا ہے کہ نہیں بھئی! اگر تم ایمان داری اور دیانتداری سے اپنا معاشرہ قائم کرو تو تم دیکھو کہ اُس کے نتائج اس کے مقابلے میں کس طرح سے سومن فی ایکڑ کے حساب سے نکلتے ہیں تو ہر شخص ہنس دے گا' کہے گا کہ جاؤ میاں! ہم نے کر کے دیکھ لیا ہے' یہاں تو ایماندار کے لیے تباہی ہی تباہی ہے۔کوئی تسلیم ہی نہیں کرتا کہ اس قسم کا حق پر مبنی نظام بھی اپنے خوش گوار نتائج نکال سکتا ہے۔اس کے لیے پھر کیا کیا جائے؟ آپ بالآخر ان کو ذہنی جواب ہی دیں گے۔عوام تو نہیں مانیں گے' وہ تو کہیں گے کہ محسوس شکل میں سامنے آئے تو پھر ہے۔اب وہ آئے کیسے؟ یہ تو جب تک وہ نظام اس شکل کا قائم نہ ہو' وہ اپنے نتائج نکالے گا کیسے؟

ثمر بار نتائج حاصل کرنے کے لیے صحیح نظام کی تشکیل کی ضرورت ہے

اب ان کی شرط یہ ہے کہ پہلے نتائج نکالے' پھر ہم اُس کی صداقت کو تسلیم کریں گے۔یہ تو ہو ہی نہیں سکتا لیکن اسی معاشرے کے اندر وہ لوگ نکلیں گے جو فکری طور پر' علمی طور پر' اس چیز کو محسوس کریں گے کہ بات یہ ٹھیک کہتا ہے۔اس کے بعد کرنے کی بات کیا ہوگی؟ وہ یہ کہیں گے کہ جو کچھ بھی ہو آؤ' ہم اس پہ عمل کر کے دیکھیں۔ان میں یہ ایک گروہ پیدا ہوگا' وہ گروہ اس نظام کے اُن نتائج کو جو اس وقت آپ کے سامنے مشہود نہیں ہیں' ان کی صداقتوں پر فکری طور پر ایمان لے آئے گا اور میں نے پچھلی دفعہ کہا تھا کہ مومن جب تک مسلم نہیں ہوتا' اُس وقت تک وہ نتیجہ پیدا نہیں ہوتا۔ان صداقتوں پر یقین لے آئے گا اور پھر کیا کرے گا؟ پھر اپنے ہاں اس قسم کے کام Establish (قائم) کرے گا۔کسی محدود شکل میں ہی سہی' وہ ان Values (اقدار) کے مطابق ایک نظام قائم کریں گے' یہ جماعت بنائیں گے اور اُس کے بعد بڑی مشقتیں اٹھانی پڑیں گی۔ٹکراؤ' آپ دیکھتے ہیں کہ کن کے ساتھ ہوگا؟ وہی دنیا کے باطل نظام کے ساتھ ان کا ٹکراؤ ہوگا۔وہ باطل کا نظام پوری کوشش کرے گا کہ اِن کو شکست دے۔اس کے باوجود وہ استقامت سے' ثبات سے' اس کے اوپر چلتے جائیں گے۔یہ کیوں چلتے جا رہے ہیں؟ انہیں اس چیز پر یقین ہے کہ جو نتیجہ آج محسوس طور پر سامنے نہیں ہے' یہ اقدار وہ نتائج نکال کر رہیں گی۔یہ یقینی چیز ہے کہ یہ نکال کر رہیں گی۔کسی نظام کے اُن نتائج پر یقین جو ابھی غیب میں ہیں' یہ بھی ایمان بالغیب کہلاتا ہے اور یہ جو

السابقون الاولون ہوتے ہیں' یہ کسی نظام کے Pioneers (السابقون الاوّلون) ہوتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو اس کی صداقت پر اس وقت ایمان لاتے ہیں' یقین رکھتے ہیں جب یہ اپنے نتائج ہنوز مشہود شکل میں سامنے نہیں لا رہا ہوتا اور اس جماعت کی موجودگی کے بغیر اس Process (طریق) پر عمل ہو ہی نہیں سکتا' وہ تو کچھ انسان ایسے چاہئیں اور یہ وہ انسان ہیں جنہیں اُس وقت کا باطل معاشرہ ''سر پھرے اور مجنون'' کہتا ہے۔

کسی نظام کے نتائج حاصل کرنے کے لیے مہلت کا وقفہ ضروری ہے

آپ کو پتہ ہے کہ ہر رسول کے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ کل تک تو یہ بڑا سمجھ دار تھا' آج اسے کیا ہو گیا۔ وہ قومِ صالح علیہ السلام ان سے کہتی تھی کہ صالح علیہ السلام تم سے تو ہمیں بڑی بڑی امیدیں وابستہ تھیں۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ پاگلوں جیسی باتیں کرنے لگ گئے ہو۔ کسی نظام کی ابتدا کرنے کے لیے ایسے ہی لوگوں کی ضرورت ہوتی ہے اور اس کے بعد ایک مہلت کا وقفہ چاہیے کہ ہر بیج جو آپ بوئیں گے وہ بیج اپنے نتائج پیدا کرنے کے لیے ایک وقت لے گا۔ گندم بھی چھ مہینے لے لیتی ہے اور یہ جو انسانی ذہن کے اندر بیج بوئے جاتے ہیں یہ تو پتہ نہیں کتنا وقت لیں گے۔ اس کے لیے فریقِ مقابل کو ضرورت یہ ہوگی کہ ہم تم سے کچھ نہیں مانگتے' کہتے ہم یہ ہیں کہ اس نظام کے مطابق دل و جاں سے کام کرتے چلے جاؤ۔ یہ ہمارے نظام کی وہ اسٹیج تھی جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قسم کی ایک مختصر سی جماعت پیدا کر لی لیکن فریقِ مخالف اُس جماعت کو اتنی فرصت نہیں دیتا تھا' مہلت نہیں دیتا تھا' Opportunity (موقع) نہیں دیتا تھا کہ وہ اپنے نظام پر کاربند ہو کر اُس کے نتائج نکالیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا' خدا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ ان سے کہہ دو کہ **قُلْ يٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّىْ عَامِلٌ** (39:39) اے میری قومِ مخاطب! تم اپنے پروگرام پر عمل کرتے رہو' میں اس میں دخل نہیں دیتا' میں اس میں Interfere (مداخلت) نہیں کرتا۔ آپ دیکھ رہے ہیں' عزیزانِ من! یہ کیسا عمدہ ایک Pragmatic Process (استنتاجی طریق) ہے کہ اس کے نتائج اس دعوے کی صداقت کا ثبوت بہم پہنچائیں۔ اس دوران میں' میں تمہارے معاملے میں Interfere (مداخلت) نہیں کرتا۔ اس نظام پہ تم عمل کرو' اپنے نظام کے اوپر مجھے عمل کرنے دو تو **فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ مَنْ تَكُوْنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ** (6:135)' نتائج خود بتا دیں گے کہ آخرالامر دنیا میں کامیابی کسے حاصل ہوتی ہے۔ **فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ** (6:135) اس میں کوئی لمبا عرصہ نہیں لگے گا' بہت جلد تم دیکھ لو گے کہ انجامِ کار کس کے لیے ہوتا ہے اور تم دیکھ لو گے کہ آج جو کہا جاتا ہے کہ ظلم اور فریب کاری سے جو کچھ کوئی کماتا ہے' وہ کامیاب نہیں ہوتا' تو تم ہنس دیتے ہو کیونکہ تمہارے اس معاشرے میں تو کامیاب ہوتا ہی وہ ہے لیکن میرے اس پروگرام کے نتائج کو سامنے آنے دو' تم دیکھو گے کہ **اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ** (6:135) ظالم کی کھیتی نہیں پنپ سکتی۔ یہ

تمہارے ناقص بیج کچھ نہیں اُ گا سکیں گے۔

غیب پر ایمان کا ایک محسوس انداز

ایک یہ ہے غیب کے اوپر ایمان' برادرانِ عزیز! کسی نظام کے اَن دیکھے نتائج کے اوپر غور و فکر کے بعد اس کی صداقت پہ یقین کر کے اُسے عمل کے اندر لے آنا۔ جب اُس کے نتائج باہر آتے ہیں تو پھر یہ کیفیت ہوتی ہے کہ کہ **يَدۡخُلُوۡنَ فِىۡ دِيۡنِ اللّٰهِ اَفۡوَاجًا** (110:2) گاؤں در گاؤں' قریہ در قریہ' کسان پھر اس بیج کو لینے کی طرف بھاگتا ہے۔ کہا ہے کہ اس نظام کے اندر فوج در فوج آئیں گے۔ اس نظام کے محسوس نتائج سامنے آنے دیجیے۔

ہماری تبلیغ بے نتیجہ کیوں ہے؟

دنیا میں ہم تبلیغ کرتے پھر رہے ہیں۔ اتنی ہی تبلیغ کسی سے کیجیے۔ اگر وہ صاحبِ فکر ہے تو وہ سب کچھ سننے کے بعد یہ کہے گا کہ یہ سب ٹھیک ہے جو آپ کہتے ہیں لیکن اگر آپ کے ہاں ایسا ہی نسخۂ شفا ہے تو کیا وجہ ہے کہ مراکش سے لے کر انڈونیشیا تک آپ کی تمام کی تمام' جتنی بھی یہ مسلمین کی جماعتیں ہیں' سر سے پاؤں تک امراض کے اندر محصور ہیں۔ کسی ایک پھنسی کا علاج تو تم سے ہو نہیں سکتا اور ہمیں آ کر کہتے ہو کہ ہم پورے کا پورا نسخۂ شفا اپنے سامنے رکھتے ہیں۔ نظام کے محسوس نتائج' برادرانِ عزیز! وہ دلیلِ محکم ہے جو بڑے بڑوں کو بھی جھکا دیتی ہے۔ یہ ہے **يُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡغَيۡبِ** (2:3) اور میں سمجھتا ہوں کہ اس مقام پہ جو قرآن نے کہا ہے کہ **هُدًى لِّلۡمُتَّقِيۡنَ ۙ‏ الَّذِيۡنَ يُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡغَيۡبِ** (2:2-3) یہ شروع کر رہا ہے اپنے اس نظام کو تو یہ کہہ رہا ہے کہ یہ کتاب ان کو رہنمائی دے گی' جو اِس نظام کے ان دیکھے نتائج کی صداقت پر یقین رکھ کر پھر آمادۂ سفر ہوں گے' پھر اپنی زندگی میں اس کے اوپر عمل پیرا ہوں گے اور آگے بڑھیں گے۔

کائناتی قانون کے سلسلہ میں علمِ غیب کا ماحصل

ایک غیب یہ ہے جو قانونِ کائنات کے غور و فکر کے بعد آپ پہلے سے کوئی چیز کہہ سکتے ہوں مثلاً جو فلکیات کا حساب جانتے ہیں' وہ آج بیٹھ کر یہ بتا سکتے ہیں کہ سو سال کے بعد سورج گرہن لگے گا' اتنے بجے لگے گا' اتنا زیادہ ہوگا' اتنے وقت تک کے لیے رہے گا' فلاں جگہ نظر آئے گا' فلاں جگہ نظر نہیں آئے گا۔ وہ سو برس پیشتر' ہزار برس پیشتر بھی یہ چیز کہہ سکتے ہیں اور وہ حرفاً حرفاً صحیح ہوتا ہے۔ یہ چیز تو میں نے علم الافلاک کے متعلق کہی ہے کیونکہ کائنات کے اندر تو قانون ہے' ہر قانون کے متعلق یہ چیز ہے کہ جس کو یہ قانون واقعی صحیح طور پر معلوم ہے اور اس کی Application (اطلاق) صحیح طور پہ ہو رہی ہے' وہ اس سے پہلے Definitely (یقینی طور پر) کہہ سکتا ہے کہ اتنے

عرصے کے بعد یہ چیز ہوگی۔ ایسی دوائیاں موجود ہیں جن کے نتائج کے متعلق کہا جاسکتا ہے۔ ڈاکٹر کہتا ہے کہ دوائی دی ہے' آدھا گھنٹہ انتظار کیجئے' اس کے بعد یہ ہوکر رہے گا۔ قانون تو کہتے ہی اس کو ہیں۔

کسی صاحبِ اختیار پر غیب کا علم لاگو نہیں ہوتا

قانون تو کہتے ہی اس کو ہیں۔ اس سے سو سو برس پہلے کی یہ بات کہی جاسکتی ہے لیکن ایک نقشہ سامنے لائیے۔ یہی سائنٹسٹ' یہی علم الافلاک کے پانچ دس بیس ماہرین' ایک میز پہ بیٹھے ہیں۔ حساب کی رو سے بتا رہے ہیں کہ سورج کو سو برس کے بعد گرہن لگے گا' یہ اس مقام پہ ہوگا' یہ اس مقام پہ نہیں ہوگا۔ اسی میز کے اوپر ایک مکھی بیٹھی ہوئی ہے' یہ بیس کے بیس سائنٹسٹ یہ نہیں بتا سکتے کہ مکھی یہاں سے اڑ کر کہاں جا کر بیٹھے گی۔ جو جی میں آئے کر کے دیکھ لیں۔ یہ نہیں بتا سکتے۔ یہ کیا ہوا؟ یہ جن کے متعلق انہوں نے حساب کا قاعدہ لگایا تھا' وہ صاحبِ اختیار نہیں' وہ مشین کی طرح مجبور ہیں۔ مشین کے پرزوں کا علم آپ حاصل کر لیجئے' اس میں مشین مداخلت نہیں کرتی۔ یہ مکھی مشین کے مقابلے میں کچھ ذرا سی صاحبِ اختیار واقع ہوئی ہے۔ اگرچہ اس کو بھی اختیار تو نہیں کہا جاسکتا لیکن بہرحال مشین اور انسان کے درمیان اُسے ایک درجہ تو دیا جاسکتا ہے۔ وہ اپنی مرضی سے اُٹھ کر کہیں بیٹھتی ہے' آپ اس کے متعلق پیشین گوئی نہیں کر سکتے' اس غیب کے متعلق آپ نہیں بتا سکتے اور عزیزانِ من! اس کے مقابلے میں اگر انسان ہو تو کیا اس انسان کے متعلق' جو صاحب اختیار وارادہ ہے کوئی سائنٹسٹ' کوئی دنیا کا علم رکھنے والا Future (مستقبل) کی کوئی پیشین گوئی کر سکتا ہے؟ دوسرا تو ایک طرف رہا انسان خود اپنے متعلق بھی نہیں کہہ سکتا کہ کل مجھ پہ کیا بیتے گی حالانکہ اس کے اتنے اختیارات ہیں اور ان اختیارات کے گرد اتنے اور عناصر گھومتے ہیں۔ اس میں بھی اس کی یہ کیفیت ہوتی ہے۔

علم غیب کے سلسلہ میں انسانی دنیا کے متعلق کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا

عزیزانِ من! جب انسان کا اپنا اختیار درمیان میں آئے تو کوئی دوسرا انسان اس کے متعلق نہیں کہہ سکتا کہ کل یہ کیا کرے گا۔ انسانی دنیا کے متعلق قبل از وقت کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ دیکھیے قرآن نے یہ جو دو قسم کے غیب ہیں' ان میں کس طرح سے فرق کر کے بتایا ہے۔ ایک غیب تو وہ ہے جو اس کائنات کے Laws of Nature یا قوانین فطرت سے متعلق ہے۔ اس کے متعلق قرآن نے کہیں نہیں کہا کہ یہ غیب صرف ہم ہی جانتے ہیں' کوئی اور نہیں جان سکتا۔ وہ تو عَلَّمَ اٰدَمَ الۡاَسۡمَآءَ كُلَّهَا (2:31) ہے۔ انسان کو ان کا پورا پورا علم دے دیا گیا ہے۔ جونہی کوئی علم حاصل کر لے گا' اُس کے بعد اُس کو پتہ چل جائے گا کہ اس کا نتیجہ کیا نکلنا ہے لیکن جہاں کوئی صاحبِ اختیار سامنے آئے گا تو اس کے متعلق کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ کل کو کیا کرے گا۔ یہ وہ دوسری قسم کا غیب ہے۔

کوئی شخص یہ نہیں جان سکتا کہ اس کی موت کہاں ہوگی

اس دوسرے غیب کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ کوئی انسان یہ نہیں جان سکتا۔ قرآن کہتا ہے کہ اِنَّ اللّٰہَ عِنۡدَہٗ عِلۡمُ السَّاعَۃِ (31:34)۔ میں اس ساعت کے متعلق ابھی کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ وَ یُنَزِّلُ الۡغَیۡثَ وَ یَعۡلَمُ مَا فِی الۡاَرۡحَامِ (31:34) بارش برساتا ہے، رحم مادر کے اندر جو جنین ہے اس کے متعلق بھی وہ علم رکھتا ہے۔ دیکھیے! ان دونوں کے متعلق یہ نہیں کہا کہ کوئی اور اس کا علم نہیں رکھ سکتا، کوئی یہ جان نہیں سکتا۔ ان کا تعلق فطرت کے قوانین سے ہے۔ آگے سنیے۔ کہا ہے وَ مَا تَدۡرِیۡ نَفۡسٌ مَّاذَا تَکۡسِبُ غَدًا وَ مَا تَدۡرِیۡ نَفۡسٌۢ بِاَیِّ اَرۡضٍ تَمُوۡتُ (31:34) کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ کل وہ کیا کرے گا، کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ کس سرزمین میں اس کی موت واقع ہوگی۔ یہاں مَا تَدۡرِیۡ آیا ہے۔ یہ وہ غیب ہے کہ جو صاحبِ اختیار کے متعلق یہ چیزیں آ گئی ہیں۔ ان کے متعلق کوئی پیش گوئی نہیں کی جا سکتی، کوئی نفس، کوئی شخص، کوئی انسان، غور کیجیے گا، برادرانِ عزیز! آگے بات بڑی اہم آئے گی، ہمارے لیے اس کا جو نتیجہ نکلے گا اہم ہوگا، آدمی کے Future (مستقبل) کے متعلق کوئی نہیں بتا سکتا۔ یہ اپنا Future (مستقبل) اپنے حساب سے خود مرتب کرتا ہے، اس کے ہاتھ کی لکیروں کے اندر پہلے سے مرتب شدہ نہیں ہوتا۔ فطرت نے اس کی لوحِ جبیں خالی رکھی ہے، اس کے اوپر کچھ لکھ کر نہیں بھیجا گیا، یہ اپنے قلم سے اس کے اوپر آپ لکھتا ہے، جو اس نے لکھنا ہوتا ہے، اس لیے کوئی انسان نہیں کہہ سکتا کہ یہ اس کے اوپر کیا لکھے گا، کوئی انسان یہ نہیں جانتا کہ اِنَّ اللّٰہَ عَلِیۡمٌ خَبِیۡرٌ (31:34) یہ وہی جانتا ہے جو علیم ہے، خبیر ہے، جس کے نزدیک Future (مستقبل) کچھ شے نہیں ہے، یہ ماضی حال اور مستقبل انسان کے محدود ذہن سے، وقت کے گز پہ گرہیں لگی ہوئی ہیں، خدا کے نزدیک کوئی چیز Future (مستقبل) کی نہیں ہوتی، اس کے نزدیک سب چیز حال ہے، اس لیے وہ تو علیم و خبیر ہے۔ کوئی انسان کسی کے متعلق نہیں کہہ سکتا کہ وہ کل کیا کرے گا، کس حالت میں اس کی موت واقع ہوگی۔ کوئی یہ نہیں جان سکتا۔

انسان کے مستقبل کے متعلق کوئی کچھ نہیں بتا سکتا

یہ وہ زعم ہے جس کے متعلق کہا ہے کہ قُلۡ لَّا یَعۡلَمُ مَنۡ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ الۡغَیۡبَ اِلَّا اللّٰہُ (27:65) اس ارض و سموات میں کوئی نہیں ہے، جو اس الغیب کو جانتا ہو سوائے خدا کے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ کس سادگی سے نفی کی ہے اور نفی کرنی چاہیے۔ صاحبِ اختیار انسان کے متعلق فیوچر (مستقبل) کا کوئی بتا ہی نہیں سکتا۔ خدا کے سوا کوئی اس بات کو نہیں جانتا حتیٰ کہ انبیائے کرام کے متعلق بھی یہ کہا ہے کہ اس میں سے جتنا حصہ خدا اُن کو وحی کے ذریعے بتا دے، اتنا تو وہ جان سکتے ہیں۔ وحی کے ذریعے کچھ

غیب کی باتیں بتانے کے بعد قرآن نے نبی اکرم ﷺ سے کہا کہ **ذٰلِکَ مِنۡ اَنۡۢبَآءِ الۡغَیۡبِ نُوۡحِیۡهِ اِلَیۡکَ** (3:44) یہ غیب کی وہ کچھ خبریں ہیں، جو ہم نے تجھے وحی کے ذریعے بتائیں۔ٹھیک ہے خدا تو علیم وخبیر ہے، اسے معلوم ہے، وہ اپنے علم کو تم میں سے کسی انسان کو اس طرح وحی کے ذریعے دیتا ہے، وہ صرف صاحب وحی ہوتا ہے جس کو خدا یہ دیتا ہے اور اتنا ہی دیتا ہے، جتنا اُس نے دینا ہوتا ہے اُس کو اتنا ہی اس کا علم ہوتا ہے۔اس کے علاوہ نبی خود اس کا اعتراف اور اعلان کرتا ہے کہ **وَ لَاۤ اَعۡلَمُ الۡغَیۡبَ** (11:31) میں غیب نہیں جانتا۔وہ تو قرآن میں کچھ چیزیں آئی ہیں وہ میرے علم کا نتیجہ نہیں ہیں، وہ تو وحی نے مجھے بتائیں اور قرآن میں وہ آ گئیں، میں نے تمہیں بتا دیا **لَاۤ اَعۡلَمُ الۡغَیۡبَ** (11:31) میں بھی نہیں جانتا تمہارے فیوچر (مستقبل) کے متعلق، اپنے فیوچر (مستقبل) کے متعلق بھی میں نہیں جانتا۔ یہاں سے یہ چیز ہوئی کہ انسانوں کے مستقبل کے متعلق خدا کے علاوہ کوئی کچھ نہیں جانتا۔کوئی ذرا سا اپنا علم اگر خدا کسی کو دیتا تھا تو وہ رسول کو وحی کے ذریعے دیتا تھا، رسول خود اپنی ذاتی حیثیت کے اندر بھی غیب کا علم نہیں رکھتا تھا۔

قرآنِ حکیم کے مطابق پیش گوئیاں کرنے والوں کی کوئی اہمیت نہیں

عزیزانِ من! آپ سوچیے کہ یہ جو ہمارے ہاں اب آئے دن دعوے ہوتے رہتے ہیں اور یہ دعوے ہوتے چلے آ رہے ہیں، یہ پیشین گوئیاں ہیں۔ بزرگوں سے بھی تو آپ کے ہاں یہی کچھ ہوتا ہے، وہ آپ کے مستقبل کے متعلق یہ باتیں بتاتے ہیں۔ دیکھیے! قرآن کے ماننے والوں کے لیے یہ عقیدہ کیا ہے؟ وہ کہتا ہے کہ خدا کے علاوہ کوئی شخص مستقبل کے بارے میں نہیں جانتا۔خدا اپنے علم ہی سے کسی کو جو دیتا تھا، اُسے رسول کہتے تھے، وہ وحی کے ذریعے دیتا تھا لہٰذا اگر کوئی شخص اس کے بعد یہ دعویٰ کرے کہ میں انسانی زندگی کے مستقبل کے متعلق، سائنس کی رو سے نہیں بلکہ انسانی زندگی کے مستقبل کے متعلق کوئی چیز کہہ سکتا ہوں، پیشین گوئی کرتا ہوں، تو یا تو وہ دعویٔ وحی کرے گا، وہ رسول کا دعویٰ کرے گا اور اگر یہ دعویٰ نہیں ہے تو پھر یہ چیز غلط ہے، قرآن کی رو سے غیر از نبی کے لیے وحی کے علاوہ کسی چیز کے متعلق پیشین گوئی کر دینا ممکن ہی نہیں۔ میں یہ انسانی زندگی کے متعلق کہہ رہا ہوں۔سائنس کی لیبارٹری میں بات کچھ اور ہے۔

نجومیوں کو ہاتھ دکھانا دراصل مایوسی کی انتہا ہے

آپ نے غور فرمایا کہ اپنے مقام سے ہلا ہوا ذرا سا عقیدہ کہاں سے کہاں لے جاتا ہے اور یہ تو ہم پرستیاں نہیں، یہ وہاں راوی روڈ کے فٹ پاتھ پہ بیٹھے ہوئے، وہ جو نجومی ہوتے ہیں، ان سے جا کر ہم ہاتھ دکھاتے ہیں اور قسمتیں معلوم کرتے ہیں، وہ تو انسان کی مایوسی

کے آخری سہارے ہیں' جن کو ہم تو ہم پرستی کہتے ہیں۔ان کے پاس وہ ہاتھ دکھانے کو نہیں جاتا' جو اپنے ہاتھ سے اپنے کام کر لیتا ہے۔ جاتا وہ ہے جس کا کام رک گیا ہوا ہوتا ہے۔ یہ مایوسی کے سہارے ہیں۔کوئی انسان کسی انسان کے متعلق فیوچر (مستقبل) کی کوئی بات نہیں بتا سکتا' نہیں سمجھ سکتا' نہیں جان سکتا۔اگر کوئی دعویٰ کرتا ہے تو وہ وحی کا دعویٰ ہوگا اور خدا نے یہ کہا ہے کہ ہم رسول کو صرف وحی دیتے تھے۔ آج جو یہ کہتا ہے وہ دعویٰ نبوت ہوگا' وہ دعویٰ رسالت ہوگا۔

پیشین گوئی کرنے کا دعویٰ نبوت کی مہر کو توڑنے کے مترادف ہے

اگر کوئی شخص یہ مانتا ہے کہ فلاں حضرت صاحب میرے متعلق اس قسم کی پیشین گوئی کر سکتے ہیں تو یاد رکھیے! وہ اُن کو صاحبِ وحی مانتا ہے' وہ اُن کو نبی و رسول مانتا ہے۔اس کے بعد ختم نبوت ٹوٹ جاتی ہے اور اگر یہ بات نہیں ہے تو پھر یاد رکھیے گا' قرآن کی رو سے یہ دعویٰ خدا کے لیے Challenge ہے' خدا کہتا ہے تم نہیں جان سکتے۔وہ کہتا ہے میں جانتا ہوں' بتا سکتا ہوں۔لہٰذا غیب کے متعلق یہ جو اس قسم کی باتیں کرنا ہیں' قرآن نے ان کو رَجۡمًا بِالۡغَیۡبِ (18:22) کہا ہے۔یہ اندھیرے میں تیر تکا چلاتے رہتے ہیں۔یہ سب تیر تکے ہیں۔ کیا بات ہے قرآن کی! وہ کہتا ہے کہ توہم پرستی کی بنیاد اس پہ ہے کہ اتفاقات سے کچھ اس قسم کے بعض تکے بھی لگ جاتے ہیں۔یاد رکھیے' عزیزانِ من! یہ جتنی بڑی بڑی مسندیں ہیں اور یہ جتنے' کرامات اور پیشین گوئیوں کے دعوے ہیں' یہ محض Chances (اتفاقات) کی بنا پر ہیں۔ یہاں اتفاق سے کوئی چیز ٹھیک ہوئی تو وہ جو پہلا یقین تھا' اس کی گرہ مضبوط ہوگئی۔نہ ہونے والی جو باتیں ہیں ان کے متعلق تو کہتے ہیں کہ ''وہ تو تقدیر میں ہی ایسا لکھا ہے'' وہ تو تقدیر ہوئی'' ہونے والی بات تقدیر کی رو سے ٹھیک ہوئی ہوا اور حضرت صاحب نے بتا دی تھی'' اور پھر تو ایسے ایسے حضرت صاحب بھی ہیں' جو تقدیروں کو بدلتے ہیں ان کا کیا کہنا! ان سے تو خدا بھی پیچھے رہ جاتا ہے۔تقدیر تو خدا کی مقرر کردہ ہوتی ہے۔بہرحال یہ دوسری لائن آ گئی۔آگے جب ہم اس تقدیر پہ آئیں گے تو وہاں میں عرض کروں گا کہ قرآن کی رو سے تقدیر کیا ہے۔یہاں میں اس وقت صرف غیب کے متعلق عرض کر رہا ہوں۔

علمِ غیب کے متعلق ایک شرط: صراطِ مستقیم کی خصوصیات کو سمجھتے ہوئے منزلِ مقصود کا تعین

فرمایا ہے کہ یُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡغَیۡبِ (2:3) یہ ان کے لیے رہنمائی ہے جو راستہ چلنا چاہیں' اُن کی پہلی شرط منزل کا تعین ہے۔مثلاً یہ کہ میں نے اسٹیشن پہ فلاں مقام پہ پہنچنا ہے' کس راستے سے چلوں؟ یہ تعینِ منزل دوسری شرط ہے۔یہ آوارگی نہ ہو۔تیسرے یہ ہو کہ وہ چاہے کہ راستہ سیدھا ہو' ہموار ہو' پیچ وخم نہ ہوں' خطرات نہ ہوں۔اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان چیزوں کی صداقتوں پر یقین رکھے' جو ابھی مشہود ہو کر اس کے سامنے نہیں آئیں لیکن علم وبصیرت اور فکر کی رو سے سمجھی جا سکتی ہیں کہ بات یہ ہے۔اَن دیکھے راستے کے متعلق بھی اگر سمجھانے والا صاحبِ فکر ہو' سمجھنے والا علم رکھتا ہو' تو اَن دیکھے راستے کے متعلق بھی اس طرح سے بات سمجھائی جا سکتی

ہے اور سمجھ میں آ سکتی ہے، فکری طور پہ یقین ہو جاتا ہے کہ بات ٹھیک کہتا ہے۔ یہ ہے: یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ (2:3) اور اس مقام پہ جیسا میں نے عرض کیا ہے چونکہ یہ ابتدا ہوئی ہے اور اس سے آگے ایک نظام قائم کرانا ہے، قرآنِ کریم نے ان لوگوں سے کہا ہے کہ یہ وہ Pioneers (السابقون الاوّلون) ہیں، جو اس نظامِ خداوندی کے اَن دیکھے خوشگوار نتائج پر یقین رکھ کر اس وقت اٹھتے ہیں، جب ساری دنیا یہ کہتی ہے کہ یہ صرف ایک ہی جماعت ہے، یہ مجنون ہیں۔ یہ اٹھتے ہیں، دنیا ان پر ہنستی ہے۔ قرآن میں ایک جگہ آیا ہے کہ ان سے کہو کہ آج تم ہم پہ ہنستے ہو، کل تم دیکھنا کہ تم پہ ساری دنیا ہنسے گی۔

قوم کے اندر Pioneers (السابقون الاوّلون) پیدا کیے بغیر جہانِ نو کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکتا

عزیزانِ من! جب تک کسی قوم کے اندر یہ Pioneers (السابقون الاولون) پیدا نہیں ہوتے، جو اس وقت اس نظام کو لے کر اُٹھیں جب ساری دنیا اُن کو پاگل کہے، اور کہے کہ یہ نظام قائم نہیں ہوسکتا اور جب یہ قائم ہی نہیں ہوسکتا تو اس کے درخشندہ نتائج سے دنیا اس کی طرف آ کیسے سکتی ہے۔ قرآن کی صداقتوں کو دنیا کو منوانے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہی طریقہ ہے جو چودہ سو سال پیشتر مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ وَالَّذِیْنَ مَعَهٗ (49:29) نے اختیار کر کے بتایا۔ یہ بڑی کوہ کنی کی منزل ہوتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ السّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ کے اعلیٰ مدارج قرآن نے بتائے ہیں۔ عزیزانِ من! جب وہ گندم ایک سو بیس من فی ایکڑ دینا شروع کر دے اُس کے بعد تو پھر ہر کسان اسے بوتا ہے۔ مدارج انہی کے ہیں جنہوں نے یہ نتائج ابھی دیکھے نہیں تھے لیکن اس طرح سے اُن کو یقین آ گیا تھا۔ ساری دنیا اُن سے کہتی تھی کہ پاگل ہو گئے ہو اور اُس کے باوجود وہ اپنی دھن کے پکے تھے، اس میں لگے چلے جا رہے تھے۔

نوعِ انسانی کی منفعت سازی کے لیے السابقون الاوّلون کمالِ جنون کے ملکہ سے ہر آن سرشار ہوتے ہیں

یاد رکھیے یہ خالص جذباتی چیز نہیں تھی، جنون ہم نے اس لیے کہہ دیا کہ یہ Relative Term (اضافی اصطلاح) ہے، باقی دنیا اپنے معیار کے مطابق ان کو یہ کہتی تھی کہ اُن کو اپنے نفع و نقصان کا بھی پتہ نہیں ہے۔ دنیا میں یہ سب سے زیادہ عقل و ہوش کے مالک تھے۔ قرآن ان کو اُوْلِی الْاَلْبَابِ کہتا ہے۔ مومن کو کہتا ہے کہ یہ اُوْلِی الْاَلْبَابِ ہوتے ہی یہی ہیں۔ ایک تو عقل ہوتی ہے، یہ جو الباب ہے یہ لب لباب تو آپ نے سمجھ لیا ہوا ہے "او عقل دا تت کڈیا ہویا ہونداا ے۔"[1] یہ ہیں وہ لوگ جن کو وہ السابقون الاوّلون کہتا ہے۔ یہ جذباتیت کی بات نہیں ہے۔ یہ ہے وہ چیز جسے اقبالؒ (1877-1938ء) نے کہا ہے:

یہ ہے نہایتِ اندیشہ و کمالِ جنوں [2]

---

1. وہ عقل کا نچوڑ نکالا ہوا ہوتا ہے۔
2. بتاؤں تجھ کو مسلماں کی زندگی کیا ہے　　یہ ہے نہایتِ اندیشہ و کمالِ جنوں　　(اقبالؒ: ضربِ کلیم)

غوروفکر کی انتہا کے بعد عمل کے میدان میں اس طرح سے آنا جیسے کہ دیوانہ عمل کے میدان میں آتا ہے۔ان کا ہر عمل عقل وخرد کی انتہائی غوروفکر کا نتیجہ ہوتا ہے' یہ جذبات کے تابع نہیں چلتے ہیں۔خالی جذبات کے اوپر آدمی اٹھے تو وہ قرآن کی رو سے ایمان ہی نہیں کہلاتا اور جو جذبات پہ اٹھے ہوئے ہوتے ہیں' ان کا کوئی اعتبار ہی نہیں ہوتا ہے' جذبات ہی تو ہیں جو ہر آن بدلتے رہتے ہیں۔یہ تو کامل عقل وفکر کے بعد کسی نتیجے پہ پہنچا ہوا انسان ہے جو پھر وہاں سے ہل نہیں سکتا' اس ایمان کو کوئی ہلا نہیں سکتا۔اس لیے یہ بھی سمجھیے کہ میں نے اگر چار دفعہ لفظ جنوں کہہ دیا تو اس میں آپ وہ دیوانگی نہ لے لیں جو خالص جذبات کی پیدا کردہ ہوتی ہے۔یہ کہیے کہ وہ

فرزانہ بہ گفتارے دیوانہ بہ کردارے

سمجھ اور سوچ کی دنیا کے اندر بلند تریں ہوش میں پھر جب کام کرنے پہ اتر آئیں پھر وہ دیوانوں کی طرح کام کرتے ہیں۔یہ ہوتے ہیں السابقون الاولون۔

حصولِ منزل کے لیے السابقون الاولون کے عملی پروگرام کا طریق اور صلوٰۃ کا مفہوم

برادرانِ عزیز! یہ ہیں وہ **الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ** (2:3) جو پھر اس نظام کے ان دیکھے نتائج پر ایمان لا کر اس راستے پر چل نکلتے ہیں۔وہ کرتے کیا ہیں؟ اب آگے وہ نظام آئے گا' جس کے قائم کرنے کے لیے یہ شرطیں ضروری ہیں۔وہ نظام ہے **وَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ** (2:3)۔آپ انہی الفاظ کو لکھا ہوا پائیں گے کہ صلوٰۃ قائم کرو۔صلوٰۃ بھی وہ لفظ ہے جو آہستہ آہستہ ختم ہوا ہے' اس کی جگہ نماز ہوئی کہ ''نماز قائم کرو' یہ چیز ہمارے ہاں آئی۔نماز ہمارے ہاں ایک موجود ومشہود چیز ہے' وہ ہم میں سے ہر ایک جانتا ہے۔نماز عربی زبان کا لفظ ہی نہیں ہے' یہ پرانی فارسی کا ہے' جسے پہلوی زبان کہتے ہیں۔یہ اس زبان کا لفظ ہے اور مجوسیوں کے ہاں رائج تھا' وہ اپنی عبادت کو نماز کہتے تھے۔آج بھی یہ جو پارسی ہیں' وہ اپنی عبادت کو نماز کہتے ہیں۔یہ ان کی زبان کا لفظ ہے۔بہرحال لفظ سے کوئی بحث نہیں ہے' اگر یہ صحیح مفہوم کا آئینہ دار ہو تو لفظ کا کیا ہے۔

غواص کو مطلب ہے صدف سے کہ گہر سے! [1]

لیکن اگر اندر گوہر ہی نہ رہے تو پھر تو وہ صدف بیکار ہو جاتی ہے۔وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ (2:3) میں اقامۃ ہے۔قامۃ کے متعلق اس سے پیشتر کہہ چکا ہوں۔جب مستقیم کا لفظ آیا تھا' اسے دہرانے کی ضرورت نہیں۔قائم کرنا کسی چیز کا' یہ تو آپ سمجھتے ہیں' Establish کرنا' تاکہ اس کو تمکن حاصل ہو' وہ قرار گیر ہو جائے۔کوئی ایسی چیز ہے جس کو Establish کرنا ہے' مستحکم کرنا ہے' الصلوٰۃ کو متمکن کرنا ہے۔میں

---

[1] الفاظ کے پیچوں میں الجھتے نہیں دانا غوّاص کو مطلب ہے صدف سے کہ گہر سے! (اقبالؒ: ضربِ کلیم)

نے پہلے درس میں یہ کہا تھا کہ جب یہ چیزیں آئیں گی تو اس میں جلد بازی سے کام نہ لیجیے گا۔ نماز پہ میں آؤں گا' نماز کی اہمیت بھی بتاؤں گا' یہ بھی بتاؤں گا کہ یہ ایک فریضہ ہے لیکن اس سے پیشتر ایک بات سن لیجیے!

صلوٰۃ کے پروگرام کو قرآنی اصولوں کے مطابق مرتب کرنا اور تشکیل دینا ہوتا ہے

صلوٰۃ صرف نماز ہی نہیں' صلوٰۃ اس سے بہت وسیع چیز ہے' اس کے ایک گوشے کے اندر یہ نماز بھی آ جاتی ہے۔ صلوٰۃ مومن کی پوری زندگی کا پورا پروگرام ہے' یہ صرف مسجد کے اندر محدود نہیں' یہ زندگی کے ہر شعبے میں' ہر سانس کے اندر ہے یعنی مومن کی زندگی کا پروگرام ہے۔ ایک پروگرام تو وہ ہے' جسے ہم خود متعین کرتے ہیں' ایک پروگرام وہ ہے جو ہم خدا کے بتائے ہوئے اصولوں کے مطابق مرتب کرتے ہیں' اُسے ''الصلوٰۃ'' کہتے ہیں۔ یہ بڑے غور سے سننے کی بات ہے' اس لیے کہ اب یہ چیز ہمارے ذہنوں میں موجود ہے جو مروّج ہے۔ یہ جو اس سے ہٹی ہوئی چیز ہے جو میں کہہ رہا ہوں' اس لیے غور سے سننے کی چیز ہے۔ تفصیل طلب اس لیے ہے کہ سارا قرآن اس سے بھرا پڑا ہے۔ قرآن کی بنیادی دو ہی تو Terms (اصطلاحات) ہیں: اقامت صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ۔ ان کا مفہوم آج یہ صلوٰۃ ہے' صرف یہ پانچ وقت کے لیے جو آپ مسجد میں جتنا کچھ کر لیتے ہیں اور زکوٰۃ صرف وہ ہے جو سال کے بعد آپ اڑھائی فیصد نکال کر دے دیتے ہیں۔ یہ مذہب کی دنیا کی چیز ہے' دین کی دنیا میں یہ چیزیں ان کے اندر آ تو جاتی ہیں لیکن وہ ساری یہی نہیں ہیں' وہ اس سے زیادہ پھیلی ہوئی چیز ہے۔

قرآنِ حکیم کے نزدیک صلوٰۃ کا ایک وسیع مفہوم ہے

پہلے صلوٰۃ کو لیجیے' پھر اس کے بعد جب زکوٰۃ آئے گی تو وہاں بھی ہم بتائیں گے کہ یہ کیا ہے۔ لفظ صلوٰۃ کے عربوں کی لغت کی رو سے بنیادی معنی ہیں ''کسی کے پیچھے پیچھے التزاماً چلنا' تمسک سے چلنا۔'' ان کے ہاں ''مصلی'' لفظ تھا۔ ہمارے ہاں تو مصلی بہرحال نماز پڑھنے والے کو تو خیر کبھی کہتے ہوں گے لیکن یہ ہمارے ہاں جو منٹگمری کی بار کے پہلے سے آباد لوگ تھے وہ مصلی کہلاتے تھے۔ عربوں کے ہاں مصلی کہتے تھے۔ ''ریس میں اُس گھوڑے کو جو پہلے گھوڑے کے پیچھے اس طرح سے اس کو دباتا ہوا چلا جائے' کہ اس کی کنوتیاں اس کے سرین کے ساتھ ساتھ چل رہی ہوں۔ رہے تو وہ اس سے پیچھے' آگے تو نہ بڑھے لیکن دونوں میں وہ فاصلہ بھی نہ ہو' اتنا فرق تو رکھے کہ آگے نہیں بڑھ سکتا لیکن یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ اُس میں اور اس کے اندر کوئی تیسری چیز حائل ہو جائے۔'' آپ کو پتہ ہے کہ آپ نے دعا مانگی تھی کہ **اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ** (1:5) اور قرآن نے کہا تھا کہ ان سے کہو **اِنَّ رَبِّىْ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ** (11:56) تم **صراطِ مستقیم** پہ چلنا چاہتے ہو اور رب بھی صراطِ مستقیم پر جا رہا ہے۔ پوچھا ہے کہ ہم کیا کریں؟ کہا کہ تم مصلی بن جاؤ۔ بات صاف

ہوگئی۔ آگے آگے وہ جا رہا ہے، پیچھے پیچھے تم اس کا اتباع کرتے چلے جاؤ، آگے نہیں بڑھ سکتے۔ عزیزانِ من! آپ عربوں کی لغت اور قرآن کا انتخاب دیکھیے کہ ایک مصلی کے اندر کتنی قیامتیں سمٹ کر آ گئی ہوئی ہیں! آگے تو بڑھ نہیں سکتے لیکن دونوں میں بُعد بھی نہیں ہوسکتا، فاصلہ بھی نہیں ہوسکتا۔ مصلی وہ ہے، برادرانِ عزیز! اب خدا تو اس طرح سے محسوس شکل میں، معاذ اللہ، کسی گھوڑے پہ تو نہیں آ سکتا۔ بات تو ان کے ہاں مشہود سمجھائی جاتی تھی۔ یہ کیا ہوا؟ مصلی وہ ہیں جو زندگی کے ہر شعبے میں قوانینِ خداوندی کے ساتھ ساتھ یوں چلتے ہوئے چلے جائیں کہ اُن میں اور ان قوانینِ خداوندی میں کوئی بُعد پیدا نہ ہو، فاصلہ نہ ہو، کسی قسم کی مغائرت نہ ہو۔ کہیے کہ یہ چیز زندگی کے ہر سانس کے ساتھ کرنے کی ہے یا خاص وقتوں کے اوپر کرنے کی ہے، باقی وقتوں کے اوپر یہ نہیں۔ اگر پانچ منٹ کے لیے وہ گھوڑا ساتھ ہوا اور پھر اس کے بعد تین گھنٹے کے لیے "کھرلی" پہ بندھا ہوا ہو، وہ تو مصلی نہیں کہلائے گا، اسے عرب مصلّی نہیں کہے گا، صاحب! اسلام تو ایک طرف رہا اور جب اس چیز کو الصلوٰۃ کہا ہے کہ قوانینِ خداوندی کا اس طرح سے اتباع ہو تو اس کے لیے کہا: **یقیمون الصلوٰۃ**، یہ نظامِ زندگی ہے اسے Establish (قائم) کیا جائے گا۔ یاد رکھیے! اس نظام کو ایسے قائم کیا جائے گا۔ اب یہ انفرادی چیز نہ رہی کیونکہ یہاں تو صیغہ ہی جمع کا ہے، فرد تو نظام قائم ہی نہیں کرسکتا۔ یہ ہوا کیا؟ اس کے معنی ہوئے "وہ معاشرہ جو قوانین خداوندی اور اس کی دی ہوئی مستقل اقدار کے مطابق Establish (قائم) ہو۔" اس کے لیے آپ کو ضرورت تھی، اس نظام کے اُن نتائج پہ یقین رکھنے کی، جو ابھی سامنے نہیں آئے، لیکن آئیں گے۔ یہ کتاب ہے راستہ دکھانے والی اُس جماعت کو جو اس عزم کو لے کر اٹھے کہ ہم نے موجودہ معاشرے کی جگہ وہ معاشرہ قائم کرنا ہے، جس میں قوانینِ خداوندی رائج اور نافذ ہوں، جس میں ہر فرد اُن قوانین کے پیچھے خود بخود چلتا جائے۔ آج تو اگر آپ اس قانون کی ایک شق کے مطابق چلیں تو راستہ میں بیسیوں رکاوٹیں آتی ہیں، کوئی چلنے ہی نہیں دیتا لیکن اگر ایسا معاشرہ قائم ہو جس میں اس انتظام اور اہتمام سے اُس کے پیچھے چلا جائے تو آپ کے راستے میں کوئی رکاوٹ ہی باقی نہ رہے۔ یہ ہے اقامت صلوٰۃ۔

قرآنِ حکیم میں صلوٰۃ کے لفظ کا استعمال اور اس کا مفہوم

برادرانِ عزیز! یہ تمہیدی بات ہوئی اور ہمارا انداز تو یہ ہے کہ ہم تو قرآن سے ہر چیز کو لیتے ہیں، لینا ہی چاہیے، ہمارے لیے تو یہی نشانِ راہ ہے، یہی ضابطۂ زندگی ہے، یہی ہدایت ہے۔ سنیے! صلوٰۃ کا لفظ کہاں آتا ہے؟ اس کے معنی ہوئے "خدا کے مقرر کردہ قانون کے مطابق زندگی کے فرائض ادا کرنا"، وہ منصبی فرائضِ حیات جو خدا کے قانون نے مقرر کیے ہوئے ہیں"۔ یوں بات ہوئی ہے۔ دیکھیے! قرآن کہاں یہ لفظ استعمال کرتا ہے اور کس طرح وہ لفظ کھل کر پکارتا ہے کہ یہی معنی ہوسکتے ہیں جو ہم نے لیے ہیں۔ **اَلَمۡ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ یُسَبِّحُ لَہٗ مَنۡ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ** (24:41) اور یہاں تو وہ **یَسَبِّحُوۡنَ** "تسبیح" کا لفظ آ گیا۔

تسبیح کے قرآنی مفہوم کی وضاحت کے لیے شہد کی مکھی کی مثال

ذرا آگے چل کر ''تسبیح'' آئے گی تو میں عرض کروں گا کہ یہ تسبیح کیا ہے۔(24:41) میں کہا ہے کہ کیا تم نے اس پہ غور کیا؟ پہلی چیز تو یہ ہے کہ یہ غور کرنے کی چیز ہے کہ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ بھی ہے، وہ خدا کی تسبیح کر رہا ہے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ اگر میں تسبیح پہ آ جاؤں گا تو صلوٰۃ کے معنی ومفہوم بیان کرنے سے دور چلا جاؤں گا' ذرا آگے چل کر یہ لفظ آئے گا تو پھر آپ دیکھیے گا۔ اس وقت صرف اتنا ہی کہہ دوں کہ تسبیح کے معنی ہوتے ہیں ''کسی مقصد کے حصول کے لیے پوری پوری جدوجہد کرتے چلے جانا۔'' تسبیح کہتے ہیں ''گھوڑے کی اُس چال کو جس میں وہ دونوں پاؤں یوں اُٹھا کر لگایا کرتا ہے کہ وہ پوری توانائیوں سے' جس قدر وسعت اس کے اندر ہوتی ہے' اتنی لمبائی سے وہ پاؤں پھیلا کے دوڑتا ہے' اس کے لیے عرب لفظ تسبیح کا لیتے ہیں۔'' کائنات کے اندر جتنی چیزیں ہیں' وہ اپنے فرائض منصبی کے حصول کے لیے اس طرح پوری توانائیاں صرف کیے چلی جاتی ہیں۔ ایک شہد کی مکھی کو کسی سوئی کے ذرے کا سواں حصہ ذرا سا اس کا جو وہ نچوڑ ہوتا ہے' لے کر اپنے چھتے میں پھر واپس آنے کے لیے' ایک دن میں سینتیس ہزار میل فاصلہ طے کرنا پڑتا ہے۔ یہ تسبیح ہے اور جس رفتار سے وہ اڑ رہی ہوتی ہے وہ تو آپ جانتے ہیں۔ یہ بات آگے چل کر سورۃ النحل میں آئے گی' ابھی تو یہاں اتنا ہی کہہ کر گزر جاتا ہوں۔ قرآن نے کہا ہے کہ **كُلٌّ قَدْ عَلِمَ** (24:41) ان میں سے کائنات کی ہر شے **كُلٌّ** ہر شے' **قَدْ** یقینی بات ہے' یہ **عَلِمَ** جانتی ہے۔ کس چیز کو؟ **صَلَاتَهُ وَتَسْبِيحَهُ** (24:41) کائنات کی ہر شے اپنی اپنی صلاۃ اور تسبیح کو جانتی ہے۔ غور فرما رہے ہیں' عزیزانِ من! یہاں بھی تو صلوٰۃ کا ترجمہ نماز کیجیے تسبیح کا ترجمہ وہ تسبیح جو ہم پھیرتے ہیں' پھر دیکھیے کہ کیا مطلب ومفہوم نکلا!! میں نے عرض کیا کہ وہ چیز آئے گی جسے میں نماز کہہ رہا ہوں' اسی کے آخر میں آئے گی لیکن یہاں میں یہ عرض کر رہا ہوں کہ آپ سوچیے کہ **كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهُ وَتَسْبِيحَهُ** (24:41) ان میں سے کائنات کی ہر شے اپنی اپنی صلوٰۃ کو' اپنی اپنی تسبیح کو جانتی ہے اور جس طرح سے وہ جانتی ہے وہ تو آپ کو معلوم ہے۔ وہ ہیں صراطِ مستقیم کے اوپر چلنے والے' وہ کبھی غلطی نہیں کرتے' اس لیے کہ وہ اپنے رب کے پیچھے پیچھے چلے جا رہے ہوتے ہیں۔ یہ ہیں مصلی' یہ اپنی صلوٰۃ کو جانتے ہیں۔ ہوا یہ کہ ان میں سے ہر شے اپنی اس منزل کو بھی جانتی ہے' جہاں اس نے پہنچنا ہے اور راستے سے بھی واقف ہے' اُس تگ وتاز سے بھی واقف ہے' اس نظام سے بھی واقف ہے' اس پروگرام سے بھی واقف ہے جو اس نے سرانجام دینا ہے' ہر شے ان میں سے جانتی ہے' یہ سب کچھ ہے۔ صلوٰۃ کا لفظ یہاں آیا' برادرانِ عزیز! دوسری جگہ قرآنِ کریم نے انسانی زندگی کے متعلق یہ واضح کر کے بتا دیا ہے کہ صلوٰۃ کیا ہے اور جب صلوٰۃ کو ضائع کر دیا جاتا ہے تو اس کے معنی کیا ہوتے ہیں۔

نظامِ صلوٰۃ کو عملاً قائم کرنے کا نتیجہ اور صلوٰۃ کو ضائع کرنے کی تباہ کاریاں

سورۃ مریم میں حضراتِ انبیائے کرام علیہم السلام کا تذکرۂ جلیلہ چلا آ رہا ہے۔ یہ سارا کچھ کہنے کے بعد کہا ہے کہ یہ وہ حضرات تھے جنہوں نے اس نظام کو قائم کر کے اس کے درخشندہ نتائج سے بتا دیا کہ جو ہم کہتے تھے کس قدر سچ تھا۔ پھر وہ چلے گئے تو اس کے بعد **فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ** (19:59) ان کے بعد انہی کے نام لینے والے پھر ایسے ناخلف پیدا ہوئے۔ کیا کیا انہوں نے؟ **اَضَاعُوا الصَّلٰوۃَ** (19:59) انہوں نے صلوٰۃ کو ضائع کر دیا۔ کیا بات ہوئی؟ میں نے عرض کیا تھا کہ قرآن اپنے معانی آپ واضح کرتا ہے اور اس کا کوئی ایسا لفظ یا ترکیب نہیں ہے، جس کے اس میں معنی وہیں یا کسی دوسرے مقام پہ خود واضح نہ کیے ہوں۔ 'انہوں نے صلوٰۃ کو ضائع کیا' قرآن نے ایسے ہی نہیں چھوڑ دیا کہ ہم خود فیصلہ کر لیں کہ انہوں نے نماز پڑھنا چھوڑ دیا۔ کہا ہے کہ انہوں نے 'صلوٰۃ کو ضائع کیا۔ کیا کیا انہوں نے؟ کہا کہ **وَ اتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ** (19:59) بجائے اس کے کہ قانون خداوندی کا اتباع کرتے' وہ اپنی اپنی مفاد پرستیوں کے پیچھے لگ گئے۔ وہ جو By Contradiction (تضاد سے) میں نے کہا تھا کہ قرآن کے الفاظ کے معنی دو متضاد چیزوں کو سامنے لانے سے واضح ہوتے ہیں۔ اقامت الصلوٰۃ کے برعکس بات ''اتباع شہوات'' ہوئی۔ جونہی اپنی اپنی مفاد پرستیوں کے پیچھے لگے' صلوٰۃ ضائع ہو گئی' جونہی ہم نے اپنی اپنی مفاد پرستیوں کو چھوڑ کر قوانینِ خداوندی کا دیا ہوا جو نظام ہے' اس کے پیچھے چلے' صلوٰۃ قائم ہو گئی۔

کرۂ ارض پر انفرادی مفاد پرستی کے پیدا کردہ مسائل کا علاج صرف نظامِ صلوٰۃ میں مضمر ہے

یہ اتباع شہوات اور اقامت صلوٰۃ دو متضاد چیزیں ہیں اور یہی تو ساری بنیاد ہے۔ غلط بنیادوں پہ اٹھا ہوا معاشرہ ہوتا کیا ہے؟ اس میں ہر فرد اپنے اپنے مفاد کے پیچھے' ہر گروہ اپنے اپنے مفاد کے گرد' ہر پارٹی اپنے مفاد کے پیچھے اور ذرا بڑی بلند International (بین الاقوامی) سطح پہ ہر Nation (قوم) اپنے اپنے مفاد کے پیچھے ہوتی ہے اور نظامِ خداوندی وہ ہے' جس کے لیے کہا ہے کہ **وَاَمَّا مَا یَنْفَعُ النَّاسَ فَیَمْکُثُ فِی الْاَرْضِ** (13:17) صرف اسی چیز کی بقا کے لیے کہا ہے جو پوری انسانیت کے لیے منافع بخش ہو گی۔ بس یہ نظام قائم کیجیے' صلوٰۃ قائم ہو گئی' برادرانِ عزیز! پوری انسانیت کے لیے نفع بخش اُن کا نظام ہو گا۔ اب اس میں اتباعِ شہوات نہ رہا۔ یہ نظام قائم کیسے ہوتا ہے؟ نماز تو آپ جانتے ہیں کہ دنیا کی ہر حکومت کے ماتحت پڑھی جاتی ہے' انگریزوں کے زمانے میں بھی تھی۔ اس زمانے کی تاریخ ہی ہم بچپن میں یہ کچھ پڑھا کرتے تھے کہ

بجتا ہے فقط چرچ میں اتوار کو گھنٹہ
سنکھوں کی صدا گونجتی ہے روز برابر

حکومت نے تم کو آزادیاں دی ہیں' نماز پڑھو' تو یہ تو ہوتا تھا۔ یہ ہر نظام کے تابع پڑھی جا سکتی ہے اور اب تو اس کے لیے یہ بھی ضروری نہیں کہ کوئی چار مسلمان اکٹھے ہوں' اکیلا ہو تو وہ بھی پڑھ لیتا ہے۔ یہ آپ کی آسان ترین چیز ہے۔ کبھی کسی نے اس سے نہیں روکا لیکن آپ دیکھیے کہ قرآن صلوٰۃ کس کو کہتا ہے؟ حضرتِ موسیٰ علیہ السلام طور کی چوٹیوں پہ تشریف لے گئے اور پہلی دفعہ وہاں ان سے یہ کہا گیا کہ موسیٰ علیہ السلام! دیکھو **اَنَـا اخْتَـرْتُکَ** (20:13) میں نے تجھے ایک بڑے عظیم پروگرام کے لیے چن لیا ہے' تمام نوعِ انسانی سے تجھے منتخب کیا ہے اور ایک پروگرام ہے' اس کے لیے میں نے تجھے چن لیا ہے۔ سوچیے! خدا ایک شخص کو چن رہا ہے' جسے چن رہا ہے وہ اب تک صاحبِ ضربِ کلیم کے تعارف سے متعارف ہیں۔ ایک اولوالعزم نبی کو چن رہا ہے' کہہ رہا ہے کہ میں نے تجھے اس کام کے لیے چنا ہے۔ کام یہ ہے کہ پہلے تو یہ سمجھو کہ **اِنَّـنِیْ اَنَا اللّٰهُ** (20:14) میں ہی ہوں' صاحبِ اقتدار۔ قرآن کا بلاغت کا انداز ہے' دیکھا ہے آپ نے یہاں **اِنَّنِیْ** کہا ہے یعنی ''ہم''۔ عدالت کے اوپر بیٹھا ہوا جج ہمیشہ اپنے آپ کو ''ہم'' کہتا ہے۔ اس مقام کے اوپر ''ہم'' کہا ہے۔ غور کریں کیا کہا ہے۔ جہاں یہ کہا تھا کہ ان بے کس بندوں سے کہہ دیجیے کہ گھبرائیں نہیں وہاں کہا تھا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ کیا فرق کرتا چلا جا رہا ہے! کہا ہے کہ **اَنَـا اللّٰهُ** (20:14) میں ہی ہوں صاحب اقتدار۔ **لَآ اِلٰـهَ اِلَّآ اَنَا** (20:14) میرے سوا کوئی اور نہیں جس کی اطاعت اور محکومیت اختیار کی جائے۔ سن رہے ہیں کیا پیغامات مل رہے ہیں! کہا کہ **فَـاعْبُـدْنِـی** (20:14) اس لیے صرف میری محکومیت اختیار کرو' کسی اور کی محکومیت اختیار نہ کرو اور اس کے لیے کہا کہ **وَ اَقِـمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِىْ** (20:14) میرے شرف کو بلند کرنے کے لیے اقامت صلوٰۃ کا فریضہ ہے' جو تمہارے ذمے لگا رکھا ہے۔ یہ پروگرام ہے جس کو تم نے Establish (قائم) کرنا ہے' سنیے' عزیزانِ من! آگے **اَقِـمِ الـصَّـلٰوةَ** (20:14) کے بعد کہا ہے کہ **اِنَّ السَّـاعَةَ اٰتِيَةٌ اَكَـادُ اُخْفِيْهَـا** (20:15) وہ انقلابِ عظیم اب آنے والا ہے جس کو ہم چاہتے ہیں کہ جو اس وقت تک زیرِ زمین' اندر اندر چل رہا تھا' اب وہ اُبھر کر سامنے آ جائے۔ جاؤ اقامت صلوٰۃ کرو اور وہ انقلاب ابھر کر سامنے آ جائے گا۔ **اِذْهَـبْ اِلٰـى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى** (20:24) جاؤ فرعون کی طرف' اُس نے بڑی سرکشی اختیار کر رکھی ہے۔ دنیا کی سرکش قوتوں کے سامنے جا کر' اُن کے نظام کو الٹ کر اُس کی جگہ قوانین خداوندی کے نظام کا قیام ہی اقامت صلوٰۃ ہے۔ برادرانِ عزیز! غور فرما رہے ہیں' آپ کس مقام پہ قرآن صلوٰۃ کا لفظ لا رہا ہے! جی نہیں چاہتا کہ لفظ سامنے آ گیا ہے تو یونہی گزر جاؤں۔ کیا بات ہے قرآن کی! یہاں تو کیفیت یہ ہے کہ وہ

زفرق تا بہ قدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا ایں جا ست

محبوب کے تو حسن کی کیفیت یہ ہے کہ سر سے پاؤں تک جہاں بھی جا کر نگاہ ٹکتی ہے، وہ وہیں پکڑ کر بیٹھ جاتی ہے کہ آگے نہ جانا' حقیقت میں یہی مقام ہے۔

قرآنی انقلاب کبھی بھی شبا شب وارد نہیں ہوتا

قرآن تو یہ کہتا ہے کہ **اِنَّ السَّاعَۃَ اٰتِیَۃٌ اَکَادُ اُخْفِیْھَا** (20:15)۔اس ایک آیت کو ہی لیں تو برادرانِ عزیز! کتنے درس آ جائیں' کیا بات کہہ گیا ہے قرآن کہ انقلابات یونہی شبا شب نہیں آیا کرتے' پہلے وہ اندر ہی اندر چلتے ہیں' وہ محسوس نہیں ہوتے' پھر ایک وقت آ جاتا ہے جس میں وہ مشہود شکل میں دنیا کے سامنے آتے ہیں' دنیا اس وقت انقلاب کو دیکھتی ہے' تو کہا کہ ہم بہت پہلے سے دیکھ رہے تھے **اَکَادُ اُخْفِیْھَا** (20:15)۔ہم اب چاہتے یہ ہیں کہ جو غیر محسوس طور پر ہو رہا تھا' ایک محکوم قوم کے قلب کے اندر جو تلاطم خیزیاں برپا ہو رہی تھیں' ہم چاہتے ہیں کہ اب وہ ابھر کر سامنے آ جائے۔

فرعون کی سلطنت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پیدا کردہ انقلاب کا مرکزی کردار

جاؤ! صلوٰۃ قائم کرو۔**لِتُجْزٰی کُلُّ نَفْسٍ م بِمَا تَسْعٰی** (20:15)۔انقلاب کیا تھا برادرانِ عزیز! کہا ہے کہ ''انقلاب یہ برپا کرو کہ ہر فرد کو اس کی محنت کا صلہ مل جایا کرے''۔فرعونیت کیا ہے؟ دانہ ایں می کارد آں حاصل برد' سال بھر کے لیے محنت کرتا ہوا یہ مرجاتا ہے' بٹائی کوئی اور لے جاتا ہے۔**کُلُّ نَفْسٍ م بِمَا تَسْعٰی** (20:15) ہر فرد کو اس کی کوشش کا صلہ مل جائے۔دیکھتے ہیں' عزیزانِ من! قرآن! بہرحال میں تو بات یہ کہہ رہا تھا کہ ایک اولوالعزم پیغمبر سے اقامتِ صلوٰۃ کہاں کہی گئی ہے۔اس مقصد کے لیے چنا جاتا ہے۔کہا جاتا ہے کہ جاؤ فرعون کی طرف' بڑا اسرکش ہو گیا ہے۔وہاں جا کر اقامت صلوٰۃ کرو تا کہ وہ انقلاب جو غیر محسوس طور پر نیچے ہی نیچے چل رہا تھا' ابھر کر سامنے آ جائے اور اس کا نتیجہ یہ نکلے کہ ہر فرد کو اس کی محنت کا پورا پورا صلہ مل جائے۔یہ ہے مفہوم اقامت صلوٰۃ کا۔

حضرت شعیب علیہ السلام کی صلوٰۃ اور معاشی نظام کی اہمیت

اور آگے سن لیجیے: برادرانِ عزیز! آج بہت دھوپ ہے' اور کچھ گرمی بھی آپ احباب کو لگ رہی ہے لیکن جو بات چھڑ جاتی ہے تو پھر آخر کہنی ہوتی ہے۔صلوٰۃ کے دائرہ کار کے متعلق میں یہ کہہ رہا تھا کہ وہ مسجد کی چار دیواری تک محدود نہیں ہے۔حضرتِ موسیٰ علیہ السلام ہی کے ہم عصر ایک اور پیغمبر حضرت شعیب علیہ السلام قوم مدین کی طرف آئے ہیں۔قوم مدین کے متعلق قرآن نے یہ کہا ہے کہ ان کا معاشی نظام بڑا ناہموار ہو گیا تھا۔یہ بنیادی خرابی بتائی ہے' اس قوم کی جس کی طرف پیغمبر شعیب علیہ السلام گئے تھے۔ایسے نظر آتا ہے جس انداز سے قرآن نے

بات کہی ہے کہ اس قوم نے ان کی بڑی مخالفت کی۔ انہوں نے پوچھا ہوگا کہ تم کیا چاہتے ہو؟ تو انہوں علیہ السلام نے کہا کہ بھئی! میں تو صرف صلوٰۃ کی اجازت چاہتا ہوں، اجازت کیا یعنی Freedom (آزادی) چاہتا ہوں، صلوٰۃ کی آزادی چاہتا ہوں۔ یہ ہمارے ہی جیسے ہوں گے۔ انہوں نے کہا کہ ''کوئی چار رکعتاں پڑھ لیا کرے گا، تے کی حرج ہو جائے گا، ساڈا وگڑ کی جائے گا، سو پڑھ لیا کر، ساری رات لگا رہیا کر۔'' ❶ انہوں نے کہا کہ ہاں صاحب! کوئی حرج نہیں۔ انہوں نے صلوٰۃ شروع کی، تو قوم آ کر پوچھتی ہے کہ شعیب علیہ السلام! تو نے ہم سے صلوٰۃ کی آزادی مانگی تھی، انہوں نے کہا ٹھیک ہے۔ کہا کہ **اَصَلٰوتُکَ تَاْمُرُکَ** (11:87) کیا تیری جو صلوٰۃ ہے، وہ تمہیں اس بات کا حکم دے رہی ہے کہ **اَنْ نَّتْرُکَ مَا یَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ** (11:87) جو کچھ ہمارے اسلاف کرتے چلے آ رہے تھے، ایک ایک چیز کو بھی تم غلط کہہ رہے ہو، وہ بھی چھوڑ و، وہ بھی چھوڑ و، یہ بھی چھوڑ و، یہ سارے پرانے طریقے جو ہمارے ہاں چلے آ رہے ہیں، کیا تمہاری یہ صلوٰۃ تمہیں یہ حکم دیتی ہے؟ اور تمہیں یہ کہتی ہے کہ **اَنْ نَّفْعَلَ فِیْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا** (11:87)۔ ہم اپنے مال و دولت کو بھی اپنی مرضی کے مطابق خرچ نہ کریں لو بھئی!! تو بھئی! اگر یہ صلوٰۃ ہے تو نہ بابا! اس کی اجازت نہیں ہے۔ ''او ہناں نے کہیا سی پنڈوں باہر کڈ دیاں گے تینوں ❷۔''

قرآن میں یہ ہے کہ اے شعیب علیہ السلام! اس صلوٰۃ سے باز آ جاؤ ورنہ گاؤں سے باہر نکال دیں گے۔ ہے ہی ایسی صلوٰۃ صاحب! کیا یہ گاؤں والے اس صلوٰۃ کو برداشت کر سکتے تھے؟ یہ تو نماز ہے جس کو سب برداشت کر لیتے ہیں، اس چیز سے بگڑتا کیا ہے بلکہ وہ تو خوش ہوتے ہیں کہ

مست رکھو ذکر و فکرِ صبحگاہی میں اسے
پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے

(اقبالؒ: ارمغانِ حجاز، اردو حصہ)

''ساری ساری رات کر دیؤ ایہناں نو کسے ہور کم جو گے رہن ای ❸ نہ دیؤ''۔ شعیب علیہ السلام! تمہاری صلوٰۃ تمہیں یہ کہہ رہی ہے۔ عزیزانِ من! بڑا ہی غور طلب مقام ہے۔ یہاں سے پتہ چلتا ہے کہ صلوٰۃ کیا تھی؟ کہ تمہاری صلوٰۃ تمہیں یہ حکم دے رہی ہے کہ ہم اپنے مال و دولت کو بھی اپنی ہی مرضی کے مطابق خرچ نہ کریں۔ یہ صلوٰۃ ہے۔ انہوں نے کہا تھا کہ نہیں بھئی! اس کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔

---

❶ کوئی چار رکعتیں پڑھ لیا کرے گا تو ہمارا کیا حرج ہوگا، ہمارا کیا بگڑے گا، سو (کہا کہ) پڑھ لیا کرو، ساری رات لگے رہا کرو۔

❷ انہوں نے کہا تھا کہ تمہیں گاؤں بدر کر دیں گے۔

❸ انہیں اس کام میں تمام رات لگانے دو تا کہ یہ کسی اور کام کے ہی نہ رہیں۔

نماز کی اجازت تو ہر کوئی دیتا ہے البتہ صلوٰۃ کو کوئی برداشت نہیں کرتا

عزیزانِ من! مروجہ نماز تو یہ ہے جو میں نے ابھی عرض کیا تھا۔ یہ تو دنیا کی ہر حکومت میں، ہر معاشرے میں، ہر مقام پر پڑھی جا سکتی ہے۔صلوٰۃ کے لیے خاص شرط ہے۔شرط کیا ہے؟ پھر دہرا دوں کہ نماز تو ہم ہر محکومی کے زمانے میں پڑھ سکتے ہیں، ہر حکومت کے اندر پڑھ سکتے ہیں، ہر باطل معاشرے میں پڑھ سکتے ہیں۔قرآن کہتا ہے کہ یہ جو جماعت اٹھی ہے، وہ **یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ** (2:3) ہے، وہ اس نظام کو قائم کرنے والی ہے۔ جب یہ جماعت برسرِ اقتدار آئے گی، تو **اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ** (22:41) یہ وہ لوگ ہیں' جب انہیں اس زمین میں حکومت حاصل ہوگی، تمکن حاصل ہوگا تو پھر کیا کریں گے، اب اس کے بعد ذہن میں یہ آتا ہے کہ یہ بتایا ہوگا کہ یہ اتنا بڑا پروجیکٹ ہوگا، یہ Plans (منصوبے) ہوں گے، اور یہ فوج ہوگی اور یہ کچھ بھی ہوگا، جو ہمارے ذہنوں میں ہے۔کہا ہے کہ جب ان کی اپنی حکومت قائم ہوگی تو پھر کیا کریں گے؟ **اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ**(22:41) اقامت صلوۃ کریں گے۔

عزیزانِ من! وقت ختم ہوگیا۔اس کے بعد اسے ہم اگلے درس میں لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ط اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ

❀......❀......❀

تیسرا باب: سورۃ البقرۃ (1)' (آیت 3 مسلسل)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝۳

عزیزانِ من! آج جون 1968 کی 9 تاریخ ہے اور ہم اپنے درسِ قرآنِ کریم کے سلسلہ نو میں سورۃ البقرۃ کی ابتدائی آیات میں ہیں۔

الصلوٰۃ کا لفظ صرف نماز تک محدود نہیں بلکہ یہ تو پورے نظام کی عکاسی کرتا ہے

پچھلے درس میں يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ (2:3) کا ٹکڑا سامنے آیا تھا اور میں نے یہ عرض کیا تھا کہ الصلوٰۃ کے متعلق ہمارے ہاں تصور یہ ہے کہ یہ صرف نماز کو کہتے ہیں جو پنجگانہ پڑھی جاتی ہے۔ قرآن کی رو سے اس کا یہی تصور نہیں ہے۔ یہ الصلوٰۃ اُس بڑے دائرے کے اندر آجاتی ہے جو نظامِ صلوٰۃ کہلاتا ہے۔ یہ اقامت ہے' کسی نظام کو قائم (Establish) کرنا ہے اور اس نظام کا نام نظامِ الصلوٰۃ ہے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ قرآنِ کریم نے یہ بتایا ہے کہ کائنات کی ہر شے اپنی اپنی صلوٰۃ اور اپنی اپنی تسبیح کو جانتی ہے یعنی اس مقصدِ حیات کو'ان فرائض منصبی کو بھی پہچانتی ہے جو اس کے لیے تخلیق کیے گئے ہیں اور یہ بھی جانتی ہے کہ ان کے حصول کے لیے کس طریق سے جدوجہد کرنی چاہیے۔ اشیائے کائنات کے اندر وہ چیزیں فطرت کی طرف سے ودیعت کر کے رکھ دی گئی ہیں اور انسانوں کو وہی چیز وحی کے ذریعے دی گئی ہے جو قرآنِ کریم کے اندر ہے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس وقت کہا گیا کہ فرعون کی طرف جاؤ' وہ بڑا سرکش ہو رہا ہے اور وہاں جا کر اس نظام کو بدلو وہاں کہا گیا تھا کہ جاؤ تاکہ تم اقامت الصلوٰۃ کر سکو۔ میں نے بتایا تھا کہ حضرتِ شعیب علیہ السلام کی قوم نے اُن سے کہا کہ اے شعیبؑ! کیا تیری صلوٰۃ ہمیں اس کی بھی اجازت نہیں دیتی کہ ہم اپنے مال کو بھی اپنی مرضی کے مطابق صرف کر سکیں۔ ان شواہد سے میں نے عرض کیا تھا کہ وہ صلوٰۃ ایک ایسی چیز ہے جس سے ایک بہت عظیم الشان انقلاب برپا ہوتا ہے اور جس کا دائرہ معاشیات تک بھی پہنچتا ہے' سیاسیات بھی اس کے اندر آتی ہیں اور اسی سلسلے میں' میں سورۃ الحج کی 41ویں

آیت پہ پہنچا تھا کہ درس کا وقت ختم ہوگیا۔ یہ بڑی غور طلب آیت ہے۔

نظام صلوٰۃ تو پوری نوع انسانی کے لیے ایک عظیم انقلاب کا پیش خیمہ ہے

برادرانِ عزیز! میں سمجھتا ہوں کہ اگر اسی پہ غور کرلیا جائے اور اچھی طرح سمجھ لیا جائے تو یہ بات صاف ہوجاتی ہے کہ یہ چیز صرف نماز پڑھنا نہیں ہے کیونکہ جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا کہ نماز تو ہر جگہ ہر نظام میں' ہر حکومت کے تابع پڑھی جاسکتی ہے لیکن قرآن یہ کہتا ہے کہ **اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَ اَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَ نَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ** (22:41) یہ جماعت مومنین وہ ہے کہ جب انھیں زمین میں تمکن حاصل ہوگا' جب ان کی اپنی حکومت قائم ہوگی تو پھر یہ اقامت صلوٰۃ کریں گے اور ایتائے زکوٰۃ کریں گے۔

قرآن حکیم نے اقامتِ صلوٰۃ کو تمکن فی الارض کے لیے مشروط قرار دیا ہے

اس کو یوں کہہ کر قرآن نے مشروط قرار دیا ہے کہ جب انہیں **تمکن فی الارض** نصیب ہوگا' انہیں اپنی حکومت ملے گی' اپنا نظام ہوگا اس میں یہ اقامت صلوٰۃ کریں گے اور ایتائے زکوٰۃ کریں گے۔ ایتائے زکوٰۃ کی بات تو میں بعد میں جا کر کروں گا لیکن یہاں آپ دیکھیے کہ یہ قرآن ہے' عزیزانِ من! شاعری نہیں ہورہی۔ وہ اقامت صلوٰۃ کو تمکن فی الارض سے مشروط قرار دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ صرف وہ چیز تو نہیں ہوسکتی جو ہم بغیر **تمکن فی الارض** کے بھی ادا کرسکیں' وہ تو اس کے لیے **تمکن فی الارض** ضروری ہوگا۔ گویا یہ ایک بہت بڑی چیز ہے جس کے لیے اپنی مملکت' مملکت کے اندر پھر اپنا قرآنی نظام ہو۔ یہ دو چیزیں ہونگی تو اس کے بعد کہا ہے کہ پھر وہ اقامت الصلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کریں گے۔

مذہب کی دنیا میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا مفہوم عملی طور پر ختم ہو چکا ہے

یہ جو ہمارے ہاں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے معنی وعظ لے لیا گیا ہے' صحیح نہیں ہے۔ یہ چاروں ٹکڑے ہیں' جب دین سے ہٹ کر مذہب میں آئے ہیں تو صلوٰۃ نماز رہ گئی' زکوٰۃ سال کے بعد اپنے طور پر' خیرات کے طور پر' کچھ روپے نکال کر کسی کو دے دینا رہ گیا' امر بالمعروف نہی عن المنکر کا نام وعظ ہوگیا۔ اب یہ وہ چیزیں ہیں' جن کے لیے تمکن فی الارض کی ضرورت نہیں ہے لیکن وہ تو یہ کہتا ہے کہ یہ وہ چیزیں ہیں کہ جب انہیں تمکن فی الارض نصیب ہوگا تو پھر یہ چیزیں ہوسکیں گی' اس کے بغیر یہ نہیں ہوسکیں گی۔ اور یہی چیز ہے جو اس نے ذرا آگے چل کر سورۃ النور میں اور واضح کردی ہے کہ **وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِی الْاَرْضِ** (24:55) یہ ہمارا وعدہ ہے کہ جو لوگ بھی ان صداقتوں پر یقین رکھیں گے اور اس کے

بعد صلاحیت بخش پروگرام پر عمل پیرا ہوں گے تو ہم انہیں زمین میں حکومت عطا کریں گے۔

ایمان اور اعمالِ صالحہ کا لازمی نتیجہ تمکن فی الارض ہوتا ہے جس کی بنیادی خصوصیت نظام صلوٰۃ ہوگا

پہلی چیز تو یہاں سے یہ ہوئی کہ ایمان اور عمل صالح کا لازمی نتیجہ اس دنیا میں اپنی حکومت کا قائم ہونا ہے۔ یاد رکھیے! جب میں اپنی حکومت کہتا ہوں تو اس کے معنی مسلمان قوم کی حکومت نہیں ہوتی' وہ حکومتِ خداوندی ہوتی ہے جو اس کے قانون کو نافذ کرنے کے لیے عمل میں آتی ہے' ایمان اور عمل صالح کا لازمی نتیجہ اس قسم کی حکومت ہوگی۔ اب سوال یہ ہے کہ اُس حکومت میں ہوگا کیا؟ اس کے متعلق اس میں بہت کچھ اور ہے۔ اس کے بعد کہا ہے کہ **وَ اَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتُوا الزَّکٰوۃَ** (24:56) اقامت صلوٰۃ ہوگی' ایتائے زکوٰۃ ہوگی۔ یہ اُسی سورۃ الحج کی آیت کی مزید تفسیر اس کے اندر آ گئی۔ وہاں **تمکن فی الارض** کہا تھا' یہاں **استخلاف فی الارض** کہا ہے' معنی دونوں کے ایک ہی ہیں' یعنی ایک آزاد مملکت جس میں خدا کے قوانین نافذ ہوں۔ یہ ہوگا تو یہ چیز ہو سکے گی۔ غور فرما لیا آپ نے! اب آگے چلیے۔ حکومت کے لیے اپنی مملکت ضروری ٹھہری اور اس کے اندر یہ نظامِ صلوٰۃ۔ اب یہ دیکھیے کہ قرآن اس مملکت کی ایک بنیادی خصوصیت بتا رہا ہے اور وہاں دیکھیے کہ صلوٰۃ کیسے آ رہا ہے۔ کہا ہے کہ **وَ الَّذِیۡنَ اسۡتَجَابُوۡا لِرَبِّہِمۡ** (42:38) جماعتِ مومنین کے افراد وہ ہیں' جو اپنے خدا کے تمام قوانین پر لبیک کہتے ہیں' Respond کرتے ہیں' جب وہاں سے یہ حکم ملتا ہے تو اس کی تعمیل کے لیے لبیک کہتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو **وَ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ** (42:38) صلوٰۃ قائم کرتے ہیں۔

اسلامی جمہوریت کا نظم و نسق عملی طور پر قرآنی حدود کے تحت باہمی مشاورت سے مشروط ہے

برادرانِ عزیز! یہ جو ٹکڑا آ گیا ہے' بڑا ہی غور طلب ہے کہ **وَ اَمۡرُہُمۡ شُوۡرٰی بَیۡنَہُمۡ** (42:38) اور اپنے معاملات باہمی مشاورت سے طے کرتے ہیں' یہ تو اسلامی جمہوریت ہے۔ یہ بڑے اہم سوالات کو جنم دیتا ہے مثلاً یہ کہ قوانینِ خداوندی کو کس طرح Apply (استعمال) کرنا چاہیے؟ یہ جو اصول و قوانینِ خداوندی ہیں' اُن کے تابع ڈائیلاگ کیسے کرنے چاہئیں؟ اپنے زمانے کے تقاضوں کو Meet (پورا) کرنے کے لیے کیا طریقہ کار اختیار کرنا چاہیے؟ کہا ہے کہ یہ چیز اُن کی باہمی مشاورت سے طے ہوگی۔ یاد رکھیے! اسلامی جمہوریت صرف اس حد تک جمہوریت ہے کہ وہ قرآن کے غیر متبدل اصولوں اور غیر متغیر قوانین کو عملاً نافذ کرنے کے طریق اور ذرائع سوچ سکتی ہے' جسے آپ حکومت اسلامیہ کہیں گے' اس میں ان غیر متبدل قوانینِ خداوندی کے نفاذ کے وہ طریق اور ذرائع وہ باہمی مشاورت سے طے ہوں گے۔ یہ نہیں ہوگا کہ وہ باہمی مشاورت سے جس قسم کے جی چاہے قوانین بنا سکتی ہے۔ سیکولر

ڈیموکریسی میں اور اسلامی ڈیموکریسی میں بنیادی فرق ہے کہ وہاں ان کے اوپر کوئی اس قسم کی پابندی نہیں کہ وہ اس سے باہر نہیں جا سکتے' اُن کے اکیاون فی صد ووٹ جس قسم کا چاہے قانون بنا سکتے ہیں۔ اس کے برعکس' اسلامی ڈیموکریسی میں ان کے ہاں کا جو سو فیصد ووٹ ہے' وہ بھی خدا کے اصول اور قانون سے ٹکرانے والا قانون نہیں بنا سکتا۔ وہ قرآنی حدود کے تحت باہمی مشاورت سے کرے گا۔ یہ ہے فرق۔ اس کے لیے کہا ہے کہ وَ اَمۡرُهُمۡ شُوۡرٰی بَیۡنَهُمۡ (42:38) اُن کے معاملات باہمی مشاورت سے طے ہوں گے۔ اور یہاں اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ (42:38) کہا ہے اور یہاں سورۃ البقرۃ کی آیت ہے کہ وَ یُقِیۡمُوۡنَ الصَّلٰوۃَ وَ مِمَّا رَزَقۡنٰهُمۡ یُنۡفِقُوۡنَ (2:3)' وہاں بھی یہ کہا ہے کہ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ ۪ وَ اَمۡرُهُمۡ شُوۡرٰی بَیۡنَهُمۡ ۪ وَ مِمَّا رَزَقۡنٰهُمۡ یُنۡفِقُوۡنَ (42:38)۔ یہ اگلا ٹکڑا وَ مِمَّا رَزَقۡنٰهُمۡ یُنۡفِقُوۡنَ تو میں بعد میں لیتا ہوں' میں کہہ یہ رہا تھا کہ اقامت صلوٰۃ سے یہ جو آپ کے ہاں کا نظامِ مملکت ہے' اس نے باہمی مشاورت سے طے کرنا ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ ان دونوں کو اکٹھا کیا گیا ہے۔

دنیاوی اور دینی اجتماعات میں فرق

میں نے پہلے بھی عرض کیا تھا کہ مسلمان بازاروں میں چلتے پھرتے ہوں' عام سیاسی جلسوں میں بیٹھے ہوئے ہوں' میلے ٹھیلے میں ہوں' کسی جگہ بھی ان کا اجتماع ہو' اُن میں کوئی تفرقے کا نشان نہیں ہوتا' اُس وقت یہ ایک ایسا اجتماع ہوتا ہے' جیسا ان میں وحدت قائم ہے لیکن جونہی نماز کے لیے اذان ہوئی' ان میں ٹولیاں بننی شروع ہوئیں' ایک اس مسجد میں دوسرا اس مسجد میں' تیسرا اس مسجد کے اندر چلا گیا اور مساجد کے باہر لکھا ہوا ہے کہ یہاں وہ مسلمان نہیں آ سکتا' یہاں یہ نہیں آ سکتا حتیٰ کہ اگر کوئی غلطی سے کسی ایسی مسجد میں چلا بھی جائے' جہاں وہ نمازی دیکھ لیں کہ اس نے آمین اونچی آواز سے کہہ دی تھی تو وہ فرش دھوتے ہی نہیں' بعض اوقات اکھیڑ بھی دیتے ہیں' وہ اتنا ناپاک ہو جاتا ہے یعنی مسلمان عام حیثیت سے اگر اکٹھے تھے تو ان میں تفرقے کا کوئی نشان نہیں تھا' نماز ان کے ہاں تفرقے کا نشان ہو گیا ہوا ہے۔ یہ ہے وہ نماز جو آج ہم پڑھتے ہیں۔ اور سنیے! قرآن نے جب نظامِ صلوٰۃ کہا ہے' تو اس کی خصوصیت کیا بتائی ہے؟ مُنِیۡبِیۡنَ اِلَیۡهِ وَ اتَّقُوۡهُ (30:31) ہر معاملے میں خدا کی طرف رخ کرتے ہیں' اسی کے قوانین کی نگہداشت کرتے ہیں اور اس کے فوراً ہی بعد کہا ہے کہ وَ اَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ (30:31) نظامِ صلوٰۃ کو قائم کرو اور سنیے! آگے کہا ہے کہ وَ لَا تَکُوۡنُوۡا مِنَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ (30:31) دیکھنا! کہیں ایمان لانے کے بعد پھر سے مشرک نہ ہو جانا۔

اقامتِ صلوٰۃ کے ہوتے ہوئے فرقہ بندی شرکِ عظیم ہے

ذہن میں یہ خیال آتا ہوگا کہ صاحب! مشرک کے معنی تو ہمارے ہاں بت پوجنے والا ہے۔ اس سے ورے تو کوئی مشرک نہیں

ہے۔ ہم نے اپنے آپ کو دھوکا دے رکھا ہے۔ کہا ہے کہ دیکھنا! اس کے بعد کہیں مشرک نہ ہو جانا۔ عزیزانِ من! شرک کی تفصیل قرآن کی رو سے سنیے اور پھر ذہن میں رکھیے کہ پہلے **اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ** ہے۔ اقامت صلوٰۃ کرنا' اور پھر ہے کہ **وَ لَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ** (30:31) دیکھنا! کہیں توحید پرست ہونے کے بعد مشرک نہ ہو جانا' اگلی ہی آیت میں واضح کیا کہ **مِنَ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَهُمْ وَ كَانُوْا شِیَعًا** (30:32) ان میں سے نہ ہو جانا' جنہوں نے اپنے دین میں فرقے پیدا کر لیے اور پھر خود بھی ایک گروہ بن کر بیٹھ گئے۔ قرآن کی رو سے بہ نصِ صریح دین میں فرقوں کا وجود شرک ہے' عزیزانِ من! میں جانتا ہوں کہ یہ سن کر بہت سی پیشانیوں پہ بل پڑیں گے لیکن یہ غصہ مجھ پہ نہ نکالیے' وہ اپنے خدا پہ نکالیے' جس نے یہ کچھ کہا ہوا ہے' میں تو صرف اس کے الفاظ دہرا رہا ہوں۔ کہا ہے کہ **وَ لَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ۝ مِنَ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَهُمْ وَ كَانُوْا شِیَعًا ؕ كُلُّ حِزْبٍۭ بِمَا لَدَیْهِمْ فَرِحُوْنَ** (30:31-32)۔ اور پھر فرقہ بندی میں نفسیاتی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ ہر ایک یہ سمجھتا ہے کہ میں حق کے اوپر ہوں اور باقی سب باطل کے اوپر ہیں اور کبھی ان میں وحدت پیدا نہیں ہو سکتی۔ اس شرک کو مٹانے کا طریقہ یہ ہے کہ **اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ** (30:31) نظامِ صلوٰۃ قائم کرو۔

آج ہمارے ہاں اقامتِ صلوٰۃ فرقہ بندی کا نشان بن چکا ہے

اب سوچیے' عزیزانِ من! ہمارے ہاں جسے اقامت صلوٰۃ یا ''نماز قائم کرو'' کہا جاتا ہے وہ تو تفرقے کی بیّن علامت بن گیا ہے۔ قرآن یہ کہتا ہے کہ اس قسم کی تفرقہ انگیزی کے شرک سے بچنا چاہتے ہو تو **اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ** (30:31) نظامِ صلوٰۃ قائم کرو۔ نظر آیا کہ یہ اقامتِ صلوٰۃ اس سے کچھ اور آگے کی چیز ہے۔ بات تو صاف ہے۔ آج اعلان ہی نہیں' مجھے بڑے دکھ سے کہنا پڑتا ہے' کہ اچھے اچھے خواص بھی اور ہمارے ہاں کا دین دار طبقہ تو سارے کا سارا اس میں شامل ہے۔ جب بھی اُن سے فرقوں کی بات ہو تو یہ جتنی آیاتِ خداوندی ہیں' ان کا تو کوئی جواب ہو نہیں سکتا۔ یہاں یہ ہے کہ مشرکین میں سے نہ ہو جانا' دوسرے مقام پہ نبی اکرم ﷺ سے کہا گیا ہے کہ اے رسول! جو لوگ دین میں فرقے پیدا کر دیں' تمہارے ساتھ ان کا کوئی واسطہ نہیں ہے یعنی خدا کی توحید کے مقابلے میں یہ فرقے پیدا کرنا شرک ہے۔ ان کی وجہ سے خدا کے رسول سے کوئی تعلق باقی نہیں رہتا۔ یہ قرآن کی آیتیں ہیں اور اُن کا جواب تو ہے نہیں۔ اس کے بعد یہ کہتے یہ ہیں کہ یہ تو سب ٹھیک ہے لیکن آپ دیکھیے کہ فرقے تو موجود ہیں' ان کا مٹانا تو اب کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔ او بابا! کھلے بندوں یہ کہو کہ اب اسلام دنیا میں نہیں آ سکتا' اس سے کام نہیں لیا جا سکتا' اس لیے کہ یہ جو شرک کی کیفیت ہے' وہ موجود ہے اور اگر یہ مٹ نہیں سکتی' تو پھر آپ کے ہاں شرک نہیں مٹ سکتا تو یہ مشرکانہ اسلام کس کام کا رہے گا!!!

قرآنِ حکیم کی روشنی میں فرقوں کو ختم کرنے کا شافی علاج

قرآن نے کہا تھا کہ شرک اقامت صلوٰۃ سے مٹے گا۔اور اس نے یہ بڑی گہری بات کہی تھی۔ یہ اقامت صلوٰۃ کیا ہے؟ یہ کہ آج کی مملکت کا ایک نظام' اُس نظام کی ایک سنٹرل اتھارٹی' اُن کا آئین و دستور ایک۔اس میں خدا کی کتاب کی روشنی میں' باہمی مشاورت سے قوانین خداوندی کے تحت نہجِ زندگی' اور شعائرِ حیات کا طے کرنا اور مملکت کے اندر بسنے والے تمام مسلمانوں کے اوپر ان کو نافذ کر دینا۔جب یہ مملکت کے قانون کی حیثیت سے نافذ ہوگا تو تفرقے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ذرا سڑک پہ دائیں طرف چل کر دیکھیے۔ایک چھوٹا سا Keep to the left (بائیں طرف چلو) قانون نافذ کیا' یہ سارے پاکستان کے ٹریفک والے' تین میل پہ چلیں یا چار میل پہ چلیں' ان میں تفرقہ تو آپ نہیں دیکھتے' وحدت پیدا ہوگئی ہے' وحدت پیدا کرنے کا طریقہ یہ ہے۔اب آپ نے سمجھ لیا کہ اس کے لیے اپنی مملکت کی ضرورت کیوں ہے۔مملکت اپنی ہوتی ہے تو اس میں نظام ہوتا ہے' نظام کا مرکز ہوتا ہے' اُس مرکز کی طرف سے ہدایات نافذ ہوتی ہیں' قوانین نافذ ہوتے ہیں' انہی قوانین کی پابندی مملکت کے قانون کی حیثیت سے تمام شہریوں کے اوپر' لاگو ہوتی ہے۔اس میں اختلاف کرنے والا مجرم ہوتا ہے' سزا پاتا ہے۔اس طرح وحدت قائم ہوگئی۔اس وحدت کا میں آگے چل کر عرض کروں گا کہ سمٹا ہوا نظارہ آپ کو نماز باجماعت کے اندر ملتا ہے۔اُس میں ایک امام کی ضرورت ہے' ایک نظم کی ضرورت ہے۔اس نظم کے تابع آپ دیکھتے ہیں کہ اس میں کوئی تفرقہ نہیں ہوتا' کوئی انتشار نہیں ہوتا لیکن اس دین کے بعد جب فرضوں کی نماز باجماعت ادا کرنے کے بعد' ہم جو کچھ وہاں پڑھنا شروع کرتے ہیں' تو وہ امام بیچ میں سے ہٹ جاتا ہے۔کیا کیفیت ہوتی ہے؟ ایک کھڑا ہے' ایک لیٹا ہے' ایک سجدے میں ہے' ایک اٹھ رہا ہے' ایک بیٹھا ہے' انتشار ہی انتشار ہے' تفرقہ ہی تفرقہ ہے۔وہی نماز تھی' وہی مسجد تھی' وہی نمازی تھے۔کس چیز نے یہ فرق پیدا کر دیا کہ ملت بے امام است؟ نظام نہیں رہا' مرکزِ ملت نہیں رہا' افراد وہی ہیں۔

نماز اور صلوٰۃ میں پیدا ہونے والا بیّن فرق

اسے پھر میں دہرا دوں کہ نماز وہی ہے' مسجد وہی ہے لیکن اب امام نہیں ہے۔ یہ ان کے لیے کہا گیا ہے کہ یاد رکھنا! اسلام لانے کے بعد پھر سے مشرک نہ ہو جانا۔یعنی پھر ان لوگوں میں سے نہ ہو جانا جنہوں نے دین میں فرقے پیدا کر لیے اور خود بھی ایک گروہ بن گیا۔اس شرک کو مٹانے کے لیے اَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ (30:31) کہا۔آپ نے دیکھا اس کی اہمیت کس قدر ہے اور یہیں سے فرق سمجھ لیا' کہ قرآن جس کو اقامت صلوٰۃ کہتا ہے' ہم جس کو نماز پڑھنا کہتے ہیں' ان دونوں میں کتنا فرق آ گیا ہے۔ یہ وجۂ تفرقہ

بندی ہے، وہ وجہ وحدت ہے، اجتماعیت ہوتی ہے۔ پھر نماز کچھ اور بھی کرتی ہے۔ کہا ہے کہ اِنَّ الصَّلٰوۃَ (29:45) یہ انَّ ہے۔ پہلے یقیناً (Surely) یعنی اتنے یقین سے، یہ الصلوٰۃ کی بات کہی ہے، یہ صلوٰۃ جو قرآن کہتا ہے، جو ہم صلوٰۃ کہہ رہے ہیں، یہ وہ ہے جو (الف لام) کے ساتھ ہے۔

خدا کا عہد نظام صلوٰۃ کے تحت امن وسکون کا مہیا کرنا ہے

یہ جو صلوٰۃ ہے، یہ کیا کرتی ہے؟ کہا ہے کہ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْکَرِ (29:45) یہ ''فحشاء'' اور ''منکر'' سے روک دیتی ہے۔ ہمارے ہاں تو ''فحشاء'' کا ترجمہ فحش کر لیا گیا، یوں یہ گالی گلوچ بن گیا اور ''منکر'' ہر وہ بات ہوئی، جس سے انسان کو نفرت ہو۔ پہلے تو یہی لے لیجیے۔ سوال یہ ہے کہ اُس نے کہا ہے کہ اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی (29:45) یہ صلوٰۃ ان چیزوں سے روک دیتی ہے تو آپ غور کیجیے کہ کیا ہماری نماز ان چیزوں سے روک دیتی ہے؟ کیا روکنے کا یہ عمل، یہ صلوٰۃ کر رہی ہے؟ عزیزانِ من! ان چیزوں کے اوپر سے ایسے نہ گزر جائیے۔ یہ کوئی شاعری نہیں ہو رہی، یہ خدا کی کتاب ہے، وہ ''اِنّ'' کے ساتھ یہ کہتا ہے کہ یہ یقیناً ایسا کرتی ہے یعنی تَنْھٰی روک دیتی ہے۔ اور جب یہ چیز ہو کہ وہ ایسا نہیں کر رہی تو منطق کی رو سے دو ہی باتیں ہونگی: یا تو یہ چیز ہے معاذ اللہ کہ یہ جو دعویٰ کیا گیا ہے، یہ غلط ہے اور ایسا سمجھنے کے بعد تو پھر ہم مسلمان ہی نہ رہے۔ اور یا دوسری چیز یہ ہے کہ یہ جو صلوٰۃ ہم کہہ رہے ہیں، یہ وہ نہیں ہے جو یہاں کہا گیا ہے اور اس کا Test یہ ہے کہ جب یہ کچھ کرے گی تو یہ صلوٰۃ ہو جائے گی، نہیں کرتی ہے تو یہ صلوٰۃ نہیں ہے۔ یہ کیا ہے؟ کہا کہ وَ اللّٰہُ یَعْلَمُ مَا تَصْنَعُوْنَ (29:45) یہ جو کچھ تم مصنوعی طور پہ کچھ کرتے ہو، اس سے ہم واقف ہیں۔ غور فرمائیے، عزیزانِ من! بات کہاں جاتی ہے۔ ہم اس کو جانتے ہیں کہ یہ وہ چیز نہیں کر سکتی۔ صلوٰۃ تو یہ کرے گی۔ اور ''فحشاء اور منکر'' کے معنی بھی یہ نہیں ہیں۔ عربوں کے ہاں یہ جو فحش اور فحشاء آپ دیکھتے ہیں، ان کے اندر فرق ہے۔ فحشا ان کے ہاں بخل کو کہتے تھے یعنی ہر چیز اپنے لیے سمیٹ کر رکھ لینا، جو ہاتھ میں آ جائے کسی دوسرے کو نہ دینا۔ یہ ثانوی معنی ہیں، جسے ہم بخل کہتے ہیں، بڑی گھناؤنی چیز ہے، بری بات ہے۔

عربوں کے ہاں یہ جو دوسخاوت تواضع کی چیزیں تھیں، یہ تو انسانیت کی بنیادی خصوصیات تھیں۔ یہ میں جاہلیت کے عرب کی اسلام سے بھی پہلے کی بات کہہ رہا ہوں۔ اس لیے جو ان کے ہاں بخیل ہوتا تھا وہ انتہائی نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ یہ جو فحشا ہے، یہ وہ چیز ہے، یہ بخل ہے۔ کیا ان دونوں میں کوئی تعلق ہے یعنی کیا وَمِمَّا رَزَقْنٰھُمْ یُنْفِقُوْنَ اور صلوٰۃ میں کوئی تعلق ہے؟ آپ دیکھتے ہیں کہ صلوٰۃ نے اس کو روکنا ہے۔ یہ بخل کیوں کیا جاتا ہے؟ کیوں ہر انسان یہ چاہتا ہے کہ سب کچھ میں ہی سمیٹ لوں؟ عقلِ

فریب کار اسے یہ کہتی رہتی ہے کہ میاں! تم اپنی فکر کرو، اپنے بچوں کی فکر کرو، تمہیں دوسروں کی کیا پڑی ہے، اس کے بعد کچھ باقی ٹکڑا بچ رہے گا تو کسی فقیر کو بھی دیدینا۔ اور اس کے لیے پھر وہ بڑے بڑے فریب کارانہ دلائل وضع کرتی ہے، اس کے لیے وہ Justificatory Reasons دیتی ہے، یہ سب کچھ کرتی ہے۔ عقلِ فریب کار کے اس قسم کی جو دلائل فراہم کرنا ہے، وہ منکر کہلاتا ہے۔ صلوٰۃ ان چیزوں کو روک دیتی ہے۔

ہر قسم کی برائیوں سے پاک معاشرے کا وجود کیونکر ممکن ہے؟

عزیزانِ من! کیا ہماری ان چیزوں کو نماز روک رہی ہے؟ جب کہیے تو کہیں گے کہ صاحب! یہ نمازی اچھے نہیں رہے۔ ارے! وہ تو نماز کے متعلق اس نے کہا تھا کہ یہ روک دیتی ہے۔ یہ نماز ان نمازیوں میں یہ چیز نہیں پیدا کر رہی۔ یا تو آپ یہ کہیے کہ یہ نماز پڑھنے والے Basically (بنیادی طور پر) اس قدر غلط اندیش اور برے تھے کہ صلوٰۃ جیسی چیز بھی ان کے اندر تبدیلی پیدا نہیں کرسکی تو خدا کا یہ کام بیکار ہو گیا۔ اگر اس نے بھی ان کے اندر یہ چیزیں پیدا نہیں کیں تو پھر یہ دعویٰ کیا ہوا۔ یہ تو نمازیوں کے ہاتھوں سے ہوگا۔ صلوٰۃ تو ایک Abstract (غیر محسوس) سی چیز ہے، یہ تو ایک تصوراتی چیز ہے، یہ صلوٰۃ تو دیوار بن کر کھڑی نہیں ہوگی۔ صلوٰۃ تو ان انسانوں کے ذریعے سے ایسا کرے گی، جو صلوٰۃ کے اوپر کاربند ہونگے اور نماز تو آپ کی یہ نہیں کر رہی۔ یہ بڑے غور طلب مقامات ہیں۔ یہ صلوٰۃ تھی جو یہ کچھ کرتی ہے۔

اس کے بعد آپ سنیے کہ جسے ہم نمازی کہتے ہیں، جسے مصلین کہتے ہیں، وہ کیا ہوتے ہیں۔ جب صلوٰۃ یہ کرتی ہے تو مصلین کو ایسا ہی ہونا ہوگا جیسا قرآن کہتا ہے پھر خدا کا یہ دعویٰ سچا ہوگا کہ صلوٰۃ یہ کرتی ہے اور اس نے اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنۡہٰی (29:45) کہا تھا۔ یقینی دعویٰ ہے کہ یہ کرتی ہے۔ یہ کن کے Through (ذریعے) کرتی ہے؟ جو صلوٰۃ پہ پابند ہوتے ہیں، ان کے Through (ذریعے) کرے گی، مصلین کے Through (ذریعے) کرے گی۔ قرآن کہتا ہے کہ ٹھیک ہے آؤ! تمہیں بات بتائیں۔ قرآن بتاتا ہے کہ وہ انسان جو مصلین نہیں ہوتے، ان کی کیفیت کیا ہوتی ہے تَدۡعُوۡا مَنۡ اَدۡبَرَ وَتَوَلّٰی (70:17). قرآن نے عجیب Graphical (گرافیائی) انداز میں ایک نقشہ کھینچا ہے کہ جہنم اس کو آوازیں دے دے کر بلا رہی ہے۔ جو ان باتوں سے پیٹھ پھیر کر چل دیتا ہے یا گریز کی راہیں نکالتا ہے۔ پیٹھ پھیر کر چل دینے والا تو وہ ہوا جو سرے سے اس کو مانتا ہی نہیں ہے۔ قرآن نے اتنا ہی نہیں کہا، یہ دوسرا جو کہہ دیا ہے کہ یہ گریز کی راہیں نکالنے والے ہم ہیں، برادرانِ عزیز! وہ انہیں آوازیں دے دے کر بلا رہی ہے۔ کون ہیں یہ لوگ؟ وَجَمَعَ فَاَوۡعٰی (70:18) جن کی زندگی کا شعار یہ ہے کہ جو آتا چلا جاتا ہے، سمیٹتے چلے جاتے ہیں، جمع کرتے

چلے جاتے ہیں۔ یہ فـاوعٰی عجیب چیز ہے۔ وہ تھیلی میں روپیہ ڈال کر اس کا منہ کس کر باندھتے ہیں۔ کہتا ہے کہ یہ لوگ ہیں، انہیں جہنم آوازیں دے رہی ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ یہ جو ''فحشآ'' کی بات وہاں آئی تھی یہ اس کی کیسی تفسیر ہو رہی ہے۔ آوازیں دے رہی ہے، ان کو کہتا ہے کہ ان لوگوں کی کیفیت یہ ہے، یہ مصلین نہیں ہیں۔

نظامِ صلوٰۃ کے بغیر انسان کی خود بیں عقل اسے پاگل بنا دیتی ہے

کہا ہے کہ اِنَّ الۡاِنۡسَانَ خُلِقَ هَلُوۡعًا ۙ اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوۡعًا ۙ وَّاِذَا مَسَّهُ الۡخَيۡرُ مَنُوۡعًا ۙ (70:19-20-21) انسان کو اگر علیٰ حالہ چھوڑ دیا جائے کہ اس کے اوپر یہ صلوٰۃ نہ آئے تو اس کی کیفیت یہ ہے کہ اس کا کبھی پیٹ ہی نہیں بھرتا۔ اَلۡهٰكُمُ التَّكَاثُرُ ۙ حَتّٰى زُرۡتُمُ الۡمَقَابِرَ (102:1-2) وہ ایک دوسرے سے بڑھنے کی ریس میں چلا جاتا ہے، پاگل ہو جاتا ہے، تا آنکہ آگے قبر آ جاتی ہے۔ اس کا پیٹ ہی نہیں بھرتا، نیت ہی نہیں بھرتی۔ اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ ذرا سی بھی افتاد پڑتی ہے، اسی وقت بلبلا اٹھتا ہے اور جب یہ مال و دولت ملتا ہے تو اس کو روک کر بیٹھ جاتا ہے۔ کہا ہے کہ جہنم ان لوگوں کو آواز دے رہی ہے، اور آگے سنیے، برادرانِ عزیز! اِلَّا الۡمُصَلِّيۡنَ (70:22) مصلین ایسا نہیں کرتے۔ یہ کیوں ایسا نہیں کرتے؟ اس لیے کہ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنۡهٰى عَنِ الۡفَحۡشَآءِ وَ الۡمُنۡكَرِ (29:45) صلوٰۃ کی تو بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ان چیزوں کو روک دے گی۔ تو صلوٰۃ کے اوپر جو پابند ہیں وہی مصلین ہیں۔ کہا ہے کہ جو فحشا اور منکر سے رکتے نہیں ہیں وہ مصلّین نہیں ہوتے۔ یہ ہمارے پاس اس چیز کا ٹیسٹ ہو گیا کہ ہماری یہ صلوٰۃ ہوئی ہے یا نہیں۔ ٹیسٹ یہ ہے کہ صلوٰۃ کے جو پابند ہیں، وہ ایسے ہیں یا نہیں ہیں۔ جب آپ حتمی طور پہ کہیں گے کہ یہ دوائی آدھے گھنٹے میں بخار اتار دے گی، آدھے گھنٹے کے بعد بخار نہیں اترا، اب اس کے بعد اگر ڈاکٹر صاحب سے پوچھا جائے کہ بخار کیوں نہیں اترا، اور وہ جواب دے کہ صاحب! ''مریض ای بڑا ان موڑ ہے، میں کی کراں [1]؟'' یہ جواب ہی غلط ہے۔ کوئی اسے تسلیم نہیں کرے گا، کہنا پڑے گا کہ یا پہلا تمہارا دعویٰ غلط تھا کہ یہ دوائی آدھے گھنٹے میں بخار اتار دیتی ہے یا وہ دوائی وہ نہیں ہے۔

ڈاکٹر عام طور پہ یہ بات کہے گا کہ ذرا وہ شیشی لانا، دیکھوں تو وہ دوائی بھی ہے یا وہ نہیں ہے۔ لا کر دکھا دیا، لیبل تو وہی ہے مگر اس کے اندر دوائی وہ نہیں ہے۔ برادرانِ عزیز! یہ جو آج ہمارے ہاں یہ ملاوٹیں اور آمیزشیں ہو رہی ہیں، یہ تو طبعی چیزوں، کھانے پینے کی چیزوں میں ہو رہی ہیں، یہ جو اسلام کی ہماری خصوصیت کبریٰ کی بنیاد تھی، اس کے اندر یہ آمیزشیں ہوئی ہیں، لیبل لگے ہوئے ہیں، مگر اندر کچھ اور بھرا ہوا ہے۔ یہ بخار کو کیسے اتار دے گی۔ ''ڈاکٹر'' کے دعوے کو ہم کبھی غلط نہیں کہہ سکتے کہ ڈاکٹر وہ حکیمِ مطلق ہے جس کے سچے ہونے پہ ہمارا ایمان ہے یعنی خود خدا پر ہمارا ایمان ہے۔ بخار اس نے اتارا نہیں، اب ایک ہی چیز باقی رہ گئی کہ دوائی وہ

---

[1] یہ مریض ہی اَن موڑ ہے (اب بتاؤ کہ) میں کیا کروں؟

نہیں ہے۔ آپ لاکھ لاکر بتاتے رہیں کہ لیبل وہی ہے' کہے گا کہ لیبل وہی ہے مگر اس کے اندر دوائی وہ نہیں ہے۔ یہ ہے' عزیزانِ من! جب صلوٰۃ کو نماز بنا لیا جائے تو مصلین ایسے نہیں ہوتے۔

صلوٰۃ سے مصلین کے اندر کیسا تغیر پیدا ہوتا ہے!

مصلین کیا ہوتے ہیں؟ **اَلَّذِیۡنَ ہُمۡ عَلٰی صَلَاتِہِمۡ دَآئِمُوۡنَ** (70:23) وہ استقامت سے' دوام سے' انصرام سے اس کے اوپر قائم رہتے ہیں۔ تو پھر ہوتا کیا ہے؟ یہ جو اس کے اندر دوام ہے' اس کے اندر یہ جو انتظام ہے' اس سے ان کے اندر کیا تغیر ہوتا ہے؟

پہلا تو وہ تھا کہ مال آتا ہے' جمع کرتا ہے' روک کر رکھ لیتا ہے۔ جب یہ صلوٰۃ آتی ہے تو اس کے اندر یہ ایسا تغیر پیدا کرتی ہے کہ **وَالَّذِیۡنَ فِیۡۤ اَمۡوَالِہِمۡ حَقٌّ مَّعۡلُوۡمٌ ۔ لِّلسَّآئِلِ وَالۡمَحۡرُوۡمِ** (70:24-25) پھر وہ جانتا ہے کہ میرا مال' تنہا میرا مال نہیں ہے' اس کے اندر ہر اس شخص کا حق ہے جو یا تو ایسا ہے کہ محنت کرتا ہے لیکن اس کی محنت کا معاوضہ اس کی ضروریات کو پورا نہیں کر رہا یا وہ ایسا ہے کہ Incapacitated (معذور) ہو چکا ہے' اتنا احتیاج مند ہے کہ وہ کر ہی نہیں سکتا۔ ان سب کے لیے' ان مصلین کے مال کے اندر' خیرات نہیں ہے' حق ہے' وہ یہ As of right (بطور حق) لے سکتے ہیں' یہ ''لے سکتے ہیں'' کے معنی یہ نہیں ہیں کہ یہ اس سے چھین لیتے ہیں' وہ جانتا ہے کہ اس کے اوپر یہ میرا ہی حق نہیں ہے' یہ Common Property (مشترکہ جائداد) ہے' یہ ایک Limited Concern (محدود ادارہ) ہے' اس میں بہت سے Share holders (حصے دار) ہیں' میں بھی ان میں ایک حصے دار ہوں۔ اس میں ان کے ساتھ میرا بھی حق ہے اور پھر یہ نہیں ہے کہ جتنا میرا جی چاہے میں لے لوں۔ میں اپنا حق لے کر کہوں گا کہ اچھا بھئی! یہ تمہارا حق ہے' تم لے لو' یہ **حَقٌّ مَّعۡلُوۡمٌ** ہے۔ ہر ایک کو معلوم ہے کہ اس کے اندر کس کا کتنا حق ہے اور یہ ہیں **وَالَّذِیۡنَ یُصَدِّقُوۡنَ بِیَوۡمِ الدِّیۡنِ** (70:26) یہ ہیں' الدین کا جو دور ہے' اس کو سچا کر کے دکھانے والے۔ عزیزانِ من! انہیں مصلین کہا ہے۔ اب آپ نے دیکھ لیا کہ صلوٰۃ کس طرح وہ کچھ کر کے دکھا سکتی ہے جو قرآن نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ **تَنۡہٰی عَنِ الۡفَحۡشَآءِ وَ الۡمُنۡکَرِ** (29:45)۔ اسی کی ذرا اور تشریح اگلی آیت میں آتی ہے۔

اہلِ جہنم کا سب سے بڑا جرم مصلین نہ ہونا ہے

جہنمی جہنم کی طرف کھینچے جا رہے ہیں۔ پوچھا جا رہا ہے کہ **مَا سَلَکَکُمۡ فِیۡ سَقَرَ** (74:42) تم نے کونسا ایسا بڑا جرم کیا تھا کہ تمہیں کشاں کشاں جہنم کی طرف لیے جا رہے ہیں۔ **قَالُوۡا لَمۡ نَکُ مِنَ الۡمُصَلِّیۡنَ** (74:43) وہ کہیں گے کہ ہم مصلین نہیں

تھے' ان میں سے نہیں ہو سکے تھے جو مصلین کہلاتے تھے۔ بات اتنی ہی نہیں ہے۔ قرآنِ کریم تو تشریح کیے بغیر چھوڑتا نہیں ہے۔ وہی جو بات میں نے ابھی ابھی عرض کی ہے' آپ دیکھیے' اس کی تفسیر آ گئی یعنی **وَلَمْ نَکُ نُطْعِمُ الْمِسْکِیْنَ** (74:44) بات یہ تھی کہ جن کے چلتے ہوئے کاروبار رک جاتے تھے' ہم ان کی روٹی کا انتظام نہیں کیا کرتے تھے لہٰذا ہم مصلین نہیں تھے۔ نماز پڑھا تو کرتے تھے مگر مسکین کی روٹی کا انتظام نہیں کرتے تھے' ہمارے مال میں سائل اور محروم کا حق معلوم نہیں تھا' یہ وجہ ہے کہ ہم جہنم کی طرف آئے۔ یہ کرتے کیا تھے؟ بڑی عجیب بات ہے۔ کہا ہے کہ **وَکُنَّا نَخُوْضُ مَعَ الْخَآئِضِیْنَ** (74:45) باتیں بڑی کیا کرتے تھے' بڑے بڑے بیانات دیا کرتے تھے' بڑی وعظیں کہا کرتے تھے' بڑے لیکچر دیا کرتے تھے مگر صلوٰۃ جو کرنا چاہتی ہے وہ نہیں کیا کرتے تھے۔ معاف فرمایئے گا' یہ طعن آمیز بات نہیں کر رہا' میں ایک حقیقت بیان کر رہا ہوں۔ ہم میں سے جو ذرا سا بھی اپنی دانست میں نیک کام کر لیتا ہے اور نماز تو بڑا ہی نیک کام ہوتا ہے' آپ ذرا دیکھیے گا کہ باتیں کتنی کرتے ہیں۔ اور پھر یہی نہیں ہے بلکہ ہمارے ہاں تو باتیں کرنے والے' بیانات پہ بیانات دینے والے' لیکچر دینے والے' تقریریں کرنے والے ہیں' یہ تو دور ہی ایسا آ گیا ہے کہ بس جائز اور ناجائز ہر طریقے سے مال جمع کرتے چلے جاؤ' باتیں کرتے چلے جاؤ۔ وہ کہتا ہے کہ ہم جہنم کی طرف اس طرح سے کھنچتے آئے۔

غیر قرآنی معاشرے کے لیے یہاں بھی جہنم اور پھر مرنے کے بعد بھی جہنم ہے

عزیزانِ من! پھر عرض کر دوں جیسا کہ گزشتہ پانچ سات برس سے عرض کرتا چلا آ رہا ہوں کہ مرنے کے بعد کی جہنم برحق ہے' اس پہ ہمارا ایمان ہے' اور اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ جہنم وہیں سے نہیں' جہنم تو یہاں سے ہی شروع ہو جاتی ہے۔ ہم اس جہنمی معاشرے میں اس لیے مبتلا ہیں کہ ہم یہ کچھ کرتے ہیں۔ آج بھی جہنم ہے۔ کہا ہے یہ کہ ہم مصلین نہیں تھے یعنی ہم یہ کچھ نہیں کیا کرتے تھے اور یہی ہے' وہ حقیقتِ کبریٰ' برادرانِ عزیز! جسے قرآنِ کریم کی ایک پوری سورۃ میں' جسے سورۃ الماعون کہتے ہیں' اور یہ اس سے پہلے کے دورِ درس' آخری درسوں میں' ہمارے سامنے تفصیل سے آ چکی ہے' اسی حقیقت کو دہرا دیا ہے کہ **اَرَءَیْتَ الَّذِیْ یُکَذِّبُ بِالدِّیْنِ** (107:1) تو نے اسے بھی دیکھا ہے' جو دین کی تکذیب کرتا ہے۔ انکار نہیں کرتا 'الحمدللہ مسلمان ہے' یہ تو کہتا ہے کہ عملاً اس کو جھٹلاتا ہے کہ دین کے جو دعاوی ہیں اپنے اعمال سے ان میں سے ایک ایک کو جھوٹا ثابت کر رہا ہے۔ کم بخت خود نہیں جھوٹا ثابت ہو رہا ہے' جس دین کی طرف اپنی نسبت کر رہا ہے' اسے جھوٹا ثابت کرتا جا رہا ہے۔

ان مصلین کا انجام جو صلوٰۃ کی حقیقت کو عملاً جھٹلاتے ہیں

عزیزانِ من! جب صلوٰۃ کے متعلق کہا ہے کہ یہ فحشا اور منکر سے روکے گی اور جو مصلی ہے' وہ اس سے رکتا نہیں ہے تو اس نے

قرآن کے اس دعوے کو لوگوں کی نگاہوں میں جھٹلا دیا ہے۔ اب ہر ایک کو یہ کہاں کہتے پھریں گے کہ صاحب! یہ وہ صلوٰۃ نہیں ہے۔ وہ تو یہ نہیں مانیں گے، وہ تو یہ کہیں گے کہ یہ دعویٰ ہی جھوٹا ہے۔ یہ ہے اَرَءَیۡتَ الَّذِیۡ یُکَذِّبُ بِالدِّیۡنِ (107:1) اچھا! کون ہے یہ جو دین کو جھٹلا رہا ہے؟ کہا ہے کہ فَذٰلِکَ الَّذِیۡ یَدُعُّ الۡیَتِیۡمَ . وَلَا یَحُضُّ عَلٰی طَعَامِ الۡمِسۡکِیۡنِ (3-107:2) یہ وہ ہے کہ جو لوگ معاشرے میں تنہا رہ جاتے ہیں، یہ انہیں دھکے دیتا ہے، یہ وہ ہے کہ جس کا چلتا ہوا کاروبار رک جاتا ہے، وہ اس کی روٹی کا انتظام کرنے کے لیے دوسروں کو ترغیب نہیں دیتا۔ پھر پوچھا گیا کہ یہ لوگ کون ہیں۔ کیا ابھی تک تم نے انہیں پہچانا نہیں؟ کہا کہ فَوَیۡلٌ لِّلۡمُصَلِّیۡنَ . الَّذِیۡنَ ہُمۡ عَنۡ صَلَاتِہِمۡ سَاہُوۡنَ (5-107:4) یہ وہ نمازی ہیں جو نماز کی حقیقت سے بے خبر چلے جا رہے ہیں۔ ان کے لیے تباہی ہے۔ صلوٰۃ کی حقیقت سے بے خبر رہ رہے ہیں۔ کیا کرتے ہیں؟ سنیے، عزیزانِ من! اور پھر سوچیے کہ اس کے بعد کسی مزید تشریح کی بھی ضرورت رہے گی۔ الَّذِیۡنَ ہُمۡ یُرَآءُوۡنَ (107:6) یہ وہ کچھ تو کرآتے ہیں، جو لوگ دیکھ کر کہہ لیتے ہیں کہ جی! نمازی ہے، نماز پڑھ آیا ہے حتیٰ کہ مسجد میں بھی جب امام صاحب فرماتے ہیں کہ تیری نماز نہیں ہوئی، وہ نہیں ہوئی کے متعلق اتنا ہی کہتے ہیں کہ تیرے ہاتھ اگر ناف پر باندھنے والے ہیں تو کہیں گے ذرا اونچے تھے، چھاتی پہ باندھنے والے ہیں تو کہیں گے کہ ذرا نیچے تھے، تمہارے دونوں پاؤں ملے ہوئے نہیں تھے، اللہ اکبر پر تمہارے ہاتھ کانوں کی لو کو نہیں چھو کر گئے، رکوع میں جاتے وقت زاویہ ایسا نہیں بنا، سجدے میں جاتے وقت یہ پانچوں رکن زمین پہ نہیں ٹکے، تیری نماز نہیں ہوئی اور اگر یہ سارا کچھ ہو گیا تو الحمدللہ نماز ہو گئی۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ ہیں الَّذِیۡنَ ہُمۡ یُرَآءُوۡنَ (107:6) یہ جتنی چیزیں دیکھنے میں آتی ہیں، یہ سب درست ہیں، وہ کرتے ہی یہ ہیں کہ جو میری چیز دیکھی جا رہی ہے، وہ سب ٹھیک ہو لیکن وَیَمۡنَعُوۡنَ الۡمَاعُوۡنَ (107:7) اس رزق کو جسے بہتے پانی کے چشمے کی طرح سے جاری رہنا چاہیے تھا، بند لگا کر روک رکھتے ہیں۔ فَوَیۡلٌ لِّلۡمُصَلِّیۡنَ (107:4) ان نمازیوں کے اوپر تباہی ہے۔ غور فرما رہے ہیں آپ؟

نظامِ صلوٰۃ کا عملی طریق، اس کے خدوخال اور اس کا ماحصل!

عزیزانِ من! صلوٰۃ کیا ہے اور اقامتِ صلوٰۃ کے معنی کیا ہیں؟ میں پھر عرض کر دوں کہ یہ اسلامی مملکت کا پورا نظام ہے، اور صلوٰۃ کے جو بنیادی معنی میں نے عرض کیے تھے وہ یہ ہیں کہ مصلی وہ ہے جو اگلے گھوڑے کے ساتھ ساتھ پیچھے پیچھے چلتا جائے یعنی قوانینِ خداوندی کا اس طرح سے اتباع کرنا کہ اس میں اور ان کے درمیان کوئی بُعد نہ ہو، کوئی فصل نہ ہو، تسلسل کے ساتھ، التزاماً، اس کے پیچھے پیچھے چلے جانا۔ قرآن نے کہا ہے کہ اِنَّ رَبِّیۡ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ (11:56) خدا صراطِ مستقیم پہ چل رہا ہے۔ یہ اس کے

پیچھے پیچھے صراطِ مستقیم پہ چلے جا رہے ہیں۔ ایسا معاشرہ‘ جس میں تمام افرادِ معاشرہ قوانینِ خداوندی کا اتباع اندر سے نکلتے ہوئے‘ دل کی گہرائیوں سے نکلتے ہوئے‘ جذبات کے تابع کریں‘ یہ ہوگا نظامِ صلوٰۃ اور اس کے قائم کرنے کے لیے قرآنِ کریم نے یہ تاکید کی ہے لیکن ہر پھیلے ہوئے نظام کے لیے اس کی ایک محسوس سمٹی ہوئی شکل ہوتی ہے۔ فوج کا نظام آپ دیکھیے کتنا پھیلا ہوا ہے! صبح کے وقت ان کے ہاں کی ہر پلٹن‘ ہر کور‘ ہر ڈویژن‘ میدان میں آ کر کچھ مشقیں کرتی ہیں‘ جنگ نہیں ہو رہی ہوتی‘ دشمن نہیں سامنے ہوتا لیکن وہ پورا نظام جس کو انہوں نے قائم کرنا ہے‘ اس کے لیے اس سے مطابقت پیدا ہوتی ہے اس کے لیے یہ Exercises (مشقیں) ہوتی ہیں‘ وہ چیز یاد رہتی ہے‘ ریفریشر کورس ہوتا ہے‘ ہر سپاہی کو یاددہانی ہو جاتی ہے‘ کہ میرے قوانین کیا ہیں‘ میرے ڈسپلن کے کونسے قاعدے ہیں‘ میرا فرض کیا ہے۔ یہ ان کے قواعد وضوابط کی یاددہانی بھی کرائی جاتی ہے اور عملاً یہ چیزیں کرائی جاتی ہیں۔ میں نے یہ مثال دی ہے کہ ہر بڑے پھیلے ہوئے نظام کو ایک سمٹائی شکل کے اندر بطور یاددہانی بھی قائم کیا جاتا ہے۔

صلوٰۃ کے اجتماعات صلوٰۃ کے نظام کی ایک کڑی ہیں جو اپنے اندر نظام صلوٰۃ کو قائم کرنے کی ترغیب لیے ہوئے ہیں

یہ جو ہمارے ہاں کے اجتماعاتِ صلوٰۃ ہیں‘ ہمارے ہاں کے یہ اس نظام کی ایک سمٹی ہوئی شکل ہے‘ جسے اس لیے دہرایا جاتا ہے۔ یہ ہمارا بڑا عجیب نظام ہے‘ چھوٹے چھوٹے سے پیمانے کے اوپر‘ محلوں کے اندر‘ شہر کی بڑی مسجدوں کے اندر‘ مختلف مقامات پر یہاں ان کے اجتماعات ہیں۔ ان اجتماعات کی کیفیت یہ ہے کہ اس میں وہ آپ کے ہاں کا جو سارا نظام ہے‘ جیسا میں نے ابھی عرض کیا تھا‘ سمٹ کر آ گیا ہے۔ پہلی چیز یہ ہے کہ ایک آواز کے اوپر جو کاروبار تم کر رہے ہو‘ چھوڑ کر چلے آ ؤ۔ **اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوۃِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَۃِ فَاسْعَوْا اِلٰی ذِکْرِ اللّٰہِ وَذَرُوا الْبَیْعَ** (62:9) آواز آئے تو بھاگتے ہوئے اس کی طرف آؤ‘ چھوڑ دو جو کچھ کاروبار کرتے ہو۔ اس نظام کی پہلی چیز تو یہ ہے‘ برادرانِ عزیز! یہ سارا کچھ اس لیے تھا کہ یہ نظام قائم رہے‘ اس پہ جب اس نے آواز دی ہے تو سب کچھ چھوڑ کر اس کی طرف چلے آ ؤ۔ یہ بڑا نظام ہے‘ اس کی سمٹی ہوئی شکل آپ دیکھیے کہ کیا چلی آ رہی ہے! یہاں آ گئے صاحب! اپنے میں سے جو سب سے بہتر انسان ہے‘ اس کو اپنا راہنما مقرر کر لو‘ لیڈر مقرر کر لو جسے آپ امام کہتے ہیں‘ اسے اپنے میں سے چن لو‘ صفیں سیدھی کر لو‘ چھوٹے اور بڑے امتیازات ختم کر دیجیے۔ آپ دیکھتے ہیں وہ فوج کے نظام میں جس طرح سے یہ ہوتا چلا آ رہا ہے‘ کیسے یہ صفیں سیدھی ہو رہی ہیں۔ اس کے اوپر کھڑے ہو جاؤ‘ اپنے میں سے جو تم نے بڑا چنا ہے‘ وہ آواز دیتا ہے اس کی اطاعت کرتے چلے جاؤ‘ کھڑا ہے تو کھڑے رہو۔ اس کی ایک آواز کے اوپر پوری کی پوری جماعت پیچھے بعینہٖ وہی کچھ کرے جو کچھ

وہ کررہا ہے، جو کچھ وہ کہہ رہا ہے اور اتنا ہی نہیں، وہ اگر کسی وقت بھولتا ہے، ٹھیک ہے اس کو آواز تو دو لیکن اس کے باوجود اگر وہ بھول کی چیز کرتا ہے، اس کو چھوڑ کر اپنے طور پہ، جسے تم ٹھیک سمجھتے ہو، وہ نہ کرنے لگ جاؤ، جو بھول کر وہ کررہا ہے تم وہی کرنے لگ جاؤ صاحب! یہ ہے مرکز کی اطاعت۔ بھول ہوسکتی ہے، سہو ہوسکتا ہے لیکن سہو میں اگر آپ نے انتشار پیدا کردیا، تو یہ وہ صلوٰۃ نہ رہی جو تفرقہ مٹاتی تھی، یہ تو تفرقہ پیدا کررہی ہے۔

تفرقہ بازی کے خطرے سے بچنے کے لیے حضرت ہارون علیہ السلام کا عمل

عزیزانِ من! آپ اس نظام کے اندر دیکھ رہے ہیں کہ اگر وہ کسی وقت بھولتا بھی ہے تو پھر بھی تفرقہ نہ پیدا کرو، وہی کرو جو وہ کرتا ہے۔ سہواً کوئی چیز ایسی کرلینا، یہ کوئی ایسا تباہ کن نتیجہ نہیں پیدا کرے گی جیسا انتشار اور تفرقہ نتیجہ پیدا کردے گا۔ آپ کو معلوم ہے کہ حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کی عدم موجودگی میں جب بنی اسرائیل نے وہ گئو سالے کی پرستش شروع کی تھی اور حضرتِ ہارون علیہ السلام موجود تھے اور آپ علیہ السلام نے آکر حضرتِ ہارون علیہ السلام سے پوچھا تھا کہ ہارون علیہ السلام! تم بیٹھے دیکھتے رہے اس قوم کو اس سے روکا نہیں، گئو سالہ پرستی تو شرک ہے۔ حضرتِ ہارون علیہ السلام نے یہ کہا تھا کہ میں نے یہ اس لیے نہیں کیا کہ تم آکر مجھے کہو گے کہ تم نے بنی اسرائیل میں تفرقہ ڈال دیا، میں نے انہیں تفرقے سے بچالیا ہے، یہ جو ان کے ہاں کی جہالت ہے یہ تو ٹھیک ہوجائے گی، تفرقہ پیدا ہوجاتا تو تباہی آجاتی۔ اور یہ آپ کی ساری صلوٰۃ اس حسنِ نظم و نسق کے ساتھ یہ کچھ کیا کرتی ہے۔ پوری قوم خاموش ہے، ان کا نمائندہ ہی کچھ کہہ رہا ہے، ان میں سے کوئی اس وقت بھانت بھانت کی بولیاں نہیں بول رہا، وہ جو کہتا ہے یہ کرتے چلے جاتے ہیں۔ اس انداز سے یہ صلوٰۃ آپ کی پوری ہوتی ہے۔ اس میں ہوتا کیا ہے؟ وہ کہہ کیا رہا ہوتا ہے؟ وہی احکام جن کی ہم نے اطاعت کرنی ہے، خدا کے انہی احکام واصول کو وہ بیان کرتا ہے، انہی کا ہم اقرار کرتے ہیں۔

جسمانی حرکات و سکنات کا انسانی جذبات سے گہرا تعلق ہوتا ہے

یاد رکھیے! یہ نفسیات کا ایک گہرا مسئلہ ہے کہ انسان کے اندر سے جو خیال اور ارادہ پیدا ہوتا ہے، غیر شعوری طور پر اس کے مطابق جسم سے ایک حرکت سرزد ہوتی ہے۔ آپ تقریر کرنے والے کو دیکھتے ہیں، وہ اس کے بیان کے اندر جس قدر انداز ہوتا ہے کہیں زور دینے کا اور کہیں نرمی برتنے کا، کہیں اونچے لے جانے کا، اس کے جسم کی ساری حرکتیں Automatically (خود بخود)، غیر شعوری طور پہ، وہ کچھ کرتی چلی جاتی ہیں۔ کسی مقرر سے کہیے کہ صاحب! یہ کچھ آپ نہ کیجیے۔ آپ دیکھیں گے کہ وہ پانچ منٹ سے زیادہ تقریر نہیں کرسکتا۔ اس لیے کہ وہ غیر شعوری طور پہ جو ہو رہا تھا، اس پہ آپ نے بند لگا دیا ہے۔ خالی شعور تو دنیا میں کچھ نہیں کہتا، یہ

دونوں چیزیں متوازی چلتی ہیں۔ اصطلاح میں اسے Parallelism (متوازیت) کہتے ہیں یعنی اندر سے خیالات کا مظاہرہ' جسم کی حرکات کے ذریعے سے۔ اس صلوٰۃ میں سمٹی ہوئی یہ ساری چیز آ گئی: ہم نے جھکنا ہے تو صرف ایک اس کے قانون کے سامنے جھکنا ہے اور جونہی ہم نے جھکنا کہا' آپ دیکھتے ہیں' انسان کا سر جھک جاتا ہے۔ سلام کرتے وقت بے اختیار آپ کا ہاتھ اٹھ جاتا ہے' تعظیم کے لیے آپ کا سر جھک جاتا ہے۔ یہ وہ چیز ہے لیکن اگر آپ کے اندر یہ جھکاؤ' اطاعت کے یہ خیالات ہی نہ ہوں' یہاں نماز میں آپ حساب کر رہے ہوں' اور معاف رکھیے گا بعض اوقات بعض چیزیں نماز میں ہی سمجھ میں آتی ہیں' پہلے بھی یہ بات آئی تھی کہ وہ دوکاندار تھا' وہ پیچھے سے سودا کر آیا' بیٹے سے آ کر بات کی' اُس نے کہا یہ تو آپ نے غلط کیا' اس میں تو بڑا نقصان ہو جائے گا' اُس نے کہا کوئی بات نہیں میں صرف بیعانہ دے کر آیا ہوں' انتظام کر لیں گے۔ اس نے کہا کہ آپ کیا انتظام کر لیں گے؟ کہنے لگا ''اسیں رپھڑ پا دیاں گے۔ او کہن لگا: جے رپھڑ پانا ہیگا' تے ہُنے ای جا کے پا' تازہ تازہ گل ہیگی اے' دیر کیوں کر دے او؟ کہن لگا ایس ویلے میری عصر دی نماز دا ویلا کھنجدا جاندا پیا ہیگا' نالے نماز پڑھ آوانگا' نالے تفصیل طے کر لاں گا کہ رپھڑ پانا کیویں ہیگا''[1]۔

Parallelism (متوازیت) اور منافقت میں بنیادی فرق

عزیزانِ من! یہ Parallelism (متوازیت) نہیں ہے۔ Parallelism (متوازیت) اور منافقت میں فرق ہوتا ہے' فرق یہ ہوتا ہے کہ اندر سے آپ کے دل سے' وہی چیزیں Automatically (خود بخود) اٹھیں۔ آپ کے ہاں وہی حرکات ہوں۔ یہ Parallelism (متوازیت) ہوتی ہے۔ اندر کچھ اور ہو' ظاہر میں آپ کچھ اور کر رہے ہیں' اسے منافقت کہتے ہیں۔ ان دونوں کی ہم آہنگی کا نام ہی ایمان ہوتا ہے۔

برادرانِ عزیز! میں نے کہا تھا کہ یہ صلوٰۃ کی سمٹی ہوئی شکلیں ہیں جنہیں اجتماعاتِ صلوٰۃ کہتے ہیں۔ وہ فوجی کے لیے آواز دینے پر میدانِ جنگ میں جانا ہی ضروری نہیں ہوتا' صبح کے وقت جو اس کی پی ٹی ہوتی ہے' اس میں حاضری بھی ویسی ہی ضروری ہوتی ہے۔ یہ اجتماعاتِ صلوٰۃ بھی نہایت ضروری ہیں بشرطیکہ یہ الصلوٰۃ کے اجتماعات ہوں۔ یاد رکھیے! قرآنِ کریم نے' جسے ہم اب نماز کہتے ہیں' اسی کو ہم صلوٰۃ کے معنی میں لے لیں گے' اس کی جزئیات خود متعین نہیں کیں' اس کی بہت تھوڑی سی جزئیات ہیں۔ ایک جگہ یہ ملتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے ساتھ جماعت میں جنگ کے دوران میں دو رکعتیں ادا کی تھیں' اس میں سجدہ کا لفظ بھی ہے' قیام بھی ہے لیکن

---

[1] ہم بکھیڑا ڈال دیں گے۔ وہ کہنے لگا: اگر بکھیڑا ہی ڈالنا ہے تو ابھی ڈال دو' بات ہی تازہ ہے۔ دیر کیوں کر رہے ہو؟ کہنے لگا: اس وقت میری عصر کی نماز کا وقت تنگ ہو رہا ہے۔ نماز کے ساتھ ساتھ اس بکھیڑا ڈالنے کی تفصیل بھی طے کر آؤں گا کہ یہ بکھیڑا ڈالنا کیسے ہے۔

قرآن نے باقی جزئیات نہیں دیں۔ البتہ نماز سے پہلے جو وضو ہے یا پاکیزگی کے لیے غسل ہے' کیا بات ہے قرآن کی! ان کے متعلق بڑی تفصیل سے بیان آیا ہے۔ صفائی اور پاکیزگی جو جسم کی ہے' اس کے اوپر بھی وہ کتنا زور دیتا ہے۔ یہ چیزیں ہیں۔ نماز کی جزئیات کا سارا ذکر قرآن میں نہیں ہے لیکن بہرحال اس وقت قوم جو نماز پڑھنے والی ہے' آپ دیکھتے ہیں کہ ان کے اندر تفرقہ اور انتشار کتنا ہے اور یہ ہے وہ تفرقہ جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ مٹ سکتا ہی نہیں ہے۔ اس لیے کہ ان میں سے کوئی بھی اس کے لیے تیار نہیں کہ کسی دوسرے کے طریقے کے مطابق نماز پڑھ لے۔ یہاں تو ہم صدیوں سے روزہ کھولنے کے چار منٹ کا فرق مٹانے کے لیے بھی تیار نہیں ہیں۔ جب آپ نے دین کی یہ چیز اتنا متشدد جز و بنا دی بلکہ بنیاد بنادی تو وہ ٹھیک کہتے ہیں کہ تفرقے مٹ ہی نہیں سکتے اور تفرقہ تو قرآن کی بہ نصِ صریح شرک ہے۔ پھر کیا مایوس ہو کر بیٹھ جائیے؟ نہیں' قطعاً نہیں۔

پاکستان کے قیام کا اصل مقصد نظام صلوٰۃ کا ہی قیام تھا

اس کا طریقہ یہی تھا جو قرآن نے بتایا تھا کہ اپنے تمکن فی الارض' اپنے استخلاف' اپنی آزاد مملکت کے اندر' اقامتِ صلوٰۃ کرو جس کے لیے پاکستان حاصل کیا تھا۔ یہاں اسلامی مملکت یا جہاں کہیں بھی یہ قائم ہو' جسے استخلاف فی الارض ہم کہیں گے' اس کا فریضہ یہ ہوگا کہ ایک ایسا نظام قائم کرے جس کے اندر تمام افرادِ معاشرہ قوانینِ خداوندی کا اتباع دل کی گہرائی سے کرتے چلے جائیں اور اس کی سمٹی ہوئی شکل' جسے ہم صلوٰۃ کہتے ہیں' اس کا انتظام بھی اسی کے ماتحت ہو۔ وہ مرکزیت اگر آپ کے ہاں قائم ہوگئی تو یاد رکھیے! جس طرح اس پیمان کا اتباع ضروری ہے کہ Keep to the left' (بائیں طرف چلو)' وہ جو شکل مقرر کر دے گا' بہرحال قرآنِ کریم کی روشنی میں' امت جس طرح سے کرتی آئی ہے' ان چیزوں کو سامنے رکھتے ہوئے' وہ جو ایک واحد شکل قائم کرے گا اس کا اتباع اسی طرح سے واجب ہو جائے گا جس طرح مملکت کے دوسرے ہر قانون کا اتباع لازم ہوتا ہے۔ اس تفرقے اور انتشار میں اس طرح سے وحدت پیدا ہوگی کہ پھر سے حکومتِ خداوندی کا قیام ہو جائے۔ اس کے بغیر کوئی شکل نہیں ہے۔ اب یہ ہماری انفرادی چیز ہے' ایسی انفرادی چیز کہ آپ کے ہاں کی مملکت بھی ان معاملات کے اندر دخل نہیں دیتی۔ یہ تو خیر پھر عبادات ہیں ہمارے ہاں تو ان لوگوں نے جب سے یہ ہمارے ہاں ثنویت (Dualism) ہوئی' سیکولر حکومت اور نظامِ مذہب اور' آپ کے ہاں جو یہ شخصی قوانین (Personal Laws) ہیں' ان میں بھی حکومت دخل نہیں دیتی۔ حکومتِ خداوندی یا اسلامی مملکت ایسی نہیں ہوگی اس میں تو مومن کی زندگی کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا گوشہ بھی اس سے باہر نہیں آتا۔

دورِنبوت ﷺ میں نہ دودو، تین تین قسم کی نمازیں تھیں اور نہ ہی یہ کچھ تھا

برادرانِ عزیز! وہ سیکولر حکومت نہیں ہوتی ' وہ نظامِ خداوندی ہوتا ہے۔اس کا یہ فریضہ ہوگا کہ وہ یہ چیز پیدا کرے' یہ وہ شکل ہوگی جو نبی اکرم ﷺ کے زمانے میں تھی' صحابہؓ کے زمانے میں تھی۔ وہاں دو قسم کی نمازیں نہیں تھیں' نمازوں کی دو شکلیں نہیں تھیں' برادرانِ عزیز! لیکن آج اگر آپ یہ کہیں کہ موجودہ نمازوں کی شکلوں میں سے کسی طرح سے متعین کرلیں کہ نبی اکرم ﷺ نے کس طریق سے نماز پڑھی تھی تو آپ کے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے۔اس لیے کہ ہر گروہ جس طرح سے خود نماز پڑھتا ہے اس کے لیے وہ ثبوت بہم پہنچا دیتا ہے کہ حضور ﷺ نے ایسے ہی نماز پڑھی تھی۔اس کے بعد آپ کے پاس کونسا ذریعہ رہ جاتا ہے۔نبی اکرم ﷺ خود تشریف لانے سے رہے۔

انفرادیت کے اس قدر ناگفتہ حالات میں اجتماعیت کی طرف ایک ثمر بار سفر کی نشاندہی

لہٰذا اس انفرادیت کے زمانے میں تو کوئی صورت نہیں ہے کہ آپ اس نماز میں وحدت پیدا کرلیں' مرکزیت کے زمانے کے اندر یہ چیز ہوجائے گی۔اور میں ضمناً یہ عرض کردوں کہ اس باب میں میرا مسلک یہ ہے کہ امت کے مختلف فرقے جس جس طریق سے اس وقت انفرادی طور پر' جس طرح اپنے اپنے یہ شعائر ادا کر رہے ہیں ان میں کوئی دخل نہ دیا جائے' کوئی لڑائی جھگڑا نہ کیا جائے' ان کو اسی طرح سے کرنے دیا جائے' یہ مذہب کی چیز ہے' یہ انفرادی چیز ہے لیکن یہ سمجھ لیا جائے کہ یہ چیز دین کی نہیں ہے۔دین کے نظام میں ان اجتماعات کی ایک ہی شکل ہوگی اور وہ شکل ہوگی جسے مرکزِ ملت کہا جاتا ہے۔یاد رکھیے! یہ کسی شخص کا نام نہیں ہے' اس کے معنی اسلامی مملکت کی سنٹرل اتھارٹی ہوتے ہیں۔وہ آپ کے ہاں قانون کی رو سے دستور کی رو سے جو بھی ہوجائے۔وہ جو کچھ مقرر کرے گی' اس سے آپ کے ہاں پھر دوبارہ وہ وحدت پیدا ہوگی اور جب وحدت پیدا ہوگی پھر یہ دین کی الصلوٰۃ بنے گی۔عزیزانِ من! جو صلوٰۃ آپ کے عام اجتماعات میں بھی تفرقہ پیدا کردے کہ چار اِدھر اٹھیں' دس اُدھر اُٹھیں' وہ تو الصلوٰۃ نہیں ہوسکتی۔قرآنِ کریم نے بتایا یہ تھا۔هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ (2:2) کہا تھا۔یہ قرآن ان لوگوں کو منزلِ مقصود کی طرف لے جانے والی راہ بتاتا ہے جو غلط راستوں کے خطرات سے بچنا چاہیں اور آگے بات چلی تھی کہ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ (2:3). یہ بات اب تک کے دروس میں ہوگئی۔اور آگے ہے کہ وَ يُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ (2:3)۔یہ بات ہم نے ابھی طے کرلی۔قرآن کی اور خصوصیت کیا ہے؟

رزق کا تعلق طبعی جسم اور انسانی ذات دونوں کی نشو ونما سے ہے

ابھی ابھی جو صلوٰۃ کے ساتھ ہم دیکھتے چلے آرہے ہیں' وہ ہے کہ وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ (2:3)۔سارے قرآن میں آپ

دیکھیے کہ اَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ کا وَ اٰتُوا الزَّکٰوۃَ کے ساتھ چولی دامن کا ساتھ چلا آ رہا ہے۔ میں نے الزکٰوۃ کے متعلق عرض کیا ہے کہ جب یہ لفظ کسی آیت میں آگے چل کر آئے گا تو اس وقت عرض کرونگا۔ یہاں صرف یہ ہے کہ وَ مِمَّا رَزَقۡنٰـھُمۡ یُنۡفِقُوۡنَ (2:3) جو کچھ انہیں ہم نے رزق دیا ہے' یہ اسے کھلا رکھتے ہیں۔ یُنۡفِقُوۡن کا ابھی میں مفہوم بیان کرتا ہوں۔ رزق جو صرف طبعی طور پر انسان کی جو زندگی ہے' اسی کو قائم رکھنے کے ذرائع کو نہیں کہتے۔ یہ قرآن ہے۔ جب اس نے یہ رزق کہا' تو مفہوم یہی ہے کہ تمام وہ سامان جس سے زندگی قائم رہے۔ قرآن کی رو سے زندگی تو یہ طبعی زندگی ہی نہیں ہے' اس کے علاوہ انسان کے اندر ایک اور شے بھی ہے' جسے انسانی ذات کہتے ہیں۔ اس ذات کی زندگی اور نشوونما تو اس سے بھی کہیں زیادہ اہم ہے۔ تو اسے بتانے کے لیے کہ یہ جو رزق کا لفظ ہے' اسے صرف طبعی چیزوں کے اوپر محدود کر کے نہ رکھ لینا بلکہ اس کے علاوہ وہ شے جو انسان کے طبعی جسم سے ماوراء ہے' الگ ہے' اس سے اونچا ہے' اس کی نشوونما کے سامان کے لیے بھی رزق کا لفظ قرآن کے اندر آیا ہے۔ دیکھیے قرآن سورۃ الحج میں کیا کہتا ہے؟ کہا ہے کہ وَالَّـذِیۡـنَ هَـاجَرُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ ثُمَّ قُتِلُوۡۤا اَوۡ مَاتُوۡا (22:58) جو لوگ خدا کے مقصد کے حصول کے لیے اپنا گھر بار چھوڑ دیتے ہیں' جو کچھ کہا جاتا ہے اسے چھوڑ دیتے ہیں' ہجرت کرتے ہیں' پھر میدانِ جنگ میں پہنچ کر وہ قتل ہو جاتے ہیں' یا راستے میں ہی مر جاتے ہیں' بات میں یہ کہہ رہا تھا کہ لَیَـرۡزُقَنَّـهُـمُ اللّٰـهُ رِزۡقًا حَسَنًا(22:58) یہ جو مر جاتے ہیں یا قتل ہو جاتے ہیں' خدا انہیں رزقِ حسنہ عطا کرے گا۔ تو طبعی جسم کے نہ رہنے کے بعد بھی جو نشوونما کے سامان ہوتے ہیں قرآن نے انہیں بھی رزق کہا ہے۔ یاد رکھیے! میں نے یہ آیت صرف یہ بیان کرنے کے لیے پڑھی ہے۔ لہٰذا اس زندگی میں بھی انسان کا جو طبعی جسم ہے' اس کی نشوونما کے لیے اور اس کے علاوہ وہ شے جس نے اس جسم کے Disintegrate (فنا) ہونے کے بعد باقی رہنا ہے' اس کی نشوونما کے لیے بھی جو سامان ہونگے انہیں رزق کہا جائے گا۔ اور یہ جو ایک اور ہے' اس میں ایک شرط عائد کرتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ ضروریاتِ زندگی کا جو بروقت دینا ہے' اس کو رزق کہا جاتا ہے۔ بڑی قوم تھی صاحب!

بھوک سے مرجانے والے کے رسم قل پر حلوے کا اہتمام اور قبروں پر لاکھوں کا خرچہ

عزیزانِ من! ورنہ مردے دے قل کرن واسطے اوہدے تے تسی حلوہ رکھ دیؤ مرگیا ہو یا اے بھک نال''[1]۔ آپ ہنس رہے ہیں' آپ نے اپنے ہاتھوں سے کئی بڑے بڑے ہیں' جن کے گلے گھونٹے ہیں' وہ بھوک سے مرے ہیں' ان کے مرنے کے بعد آپ نے ان کی قبروں کے اوپر لاکھوں روپے کے مقبرے بنائے ہوئے ہیں۔ آپ یہ قوم ہیں۔ یہ تھی وہ قوم۔ وہ رزق کہتی ہی اسے تھی جو بروقت دیا جائے۔

---

[1] وہ مرا تو بھوک سے تھا اور اس کے رسمِ قل پر تم حلوے مانڈے رکھتے ہو۔

خدا اپنی رزق کی ذمہ داری کو کس طرح پوری کرتا ہے؟

جب خدا کہتا ہے کہ ہم رزق دیتے ہیں تو وہ جسم کی نشوونما کے لیئے' انسانی ذات کی نشوونما کے لیئے' سامانِ نشوونما دیتا ہے اور بروقت دیتا ہے۔ دیتا کیسے ہے؟ ذمہ داری کے لیے اس نے تو یہ کہہ دیا کہ **وَ مَا مِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَی اللّٰهِ رِزْقُهَا** (11:6) زمین میں کوئی متنفس ایسا نہیں ہے جس کے رزق کی ذمہ داری خدا پر نہ ہو۔ اب اگر اس کو اسی طرح سے لیا جائے' دوسرے مقامات کی روشنی میں نہ سمجھا جائے' تو پھر تو' برادرانِ عزیز! بڑے الجھاؤ پیدا ہوتے ہیں۔ ایک ایک قحط میں لاکھوں آدمی مر جاتے ہیں اور آج تو ساری دنیا میں آدھی سے زیادہ آبادی رات کو بھوکی سوتی ہے۔ پھر اگر یہ چیز ہے کہ ہر متنفس' ہر ذی حیات' ہر چلنے والے' کے رزق کی ذمہ داری خدا پہ ہے تو یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ یہ ذمہ داری کیسی ہے!! لوگ بھوک کے مر رہے ہیں۔ یہ اس لیے پیدا ہوتا ہے کہ جو قرآن نے قرآن کی بات سمجھنے کا طریقہ بتایا ہے' ہم اس طریق سے نہیں سمجھ رہے۔ اس نے بات خود سمجھا دی' ہم نے اس کو یہ سمجھا کہ یہ خدا کے ذمے ہے۔ کیسے دیتا ہے؟ ''جنوں اسیں کہنے آں چھت پھاڑ کے دیندا ہیگا''[1]۔ وہ ٹھیک ہے کہ انہیں تو ملتا ہوگا جنہوں نے آندھی کے بیر لوٹے ہیں' محنت کش بیچارے کو تو نہیں ملتا۔ تو یہ ذمہ داری کیسے پوری ہوتی ہے؟ کہا ہے کہ تمہیں یہ کہنے والے آ کر بہکائیں گے کہ بھئی! یہ بھوکے مر رہے ہیں' خدا کے ذمہ رزق ہے' جب وہی نہیں دینا چاہتا تو ہم کون ہیں ان کے لیے جو انتظام کریں' یہ تو خدا کے خلاف اعلان ہوجائے گا' یہ تو لڑائی مول لینے والی بات ہوجائے گی' وہ اسے رزق نہیں دینا چاہتا ہم اسے رزق پہنچائیں' یہ تو اس کی مشیت کے خلاف ہے۔ اگر اللہ چاہتا تو اسے خود کیوں نہ دیتا' اس کی مشیت ایسی تھی۔ اس نے اسے اپنے ہاتھ میں رکھا ہوا ہے۔ آپ کے ہاں یہ مسلمہ ہے' آپ ان چیزوں کو صبح سے شام تک سنتے ہیں۔

ہم نے رزق کے خدائی قانون کو سمجھنے کی بجائے خدا کو ہی اس کا ذمہ دار بنا رکھا ہے

سنیے! وہ کہتا ہے کہ **وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ** (36:47) جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جو یہ کچھ اللہ نے رزق بکھیر کر رکھ دیا ہے' جو کچھ یہ دیا ہے اسے تم دوسروں کی ضروریات کے لیے بھی کھلا رکھو۔ تم ایسا کیوں نہیں کرتے' بھوکوں کو روٹی کیوں نہیں کھلاتے تو یہ کہتے ہیں کہ **قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا** (36:47)۔ سنیے! عزیزانِ من! یہ کن کا قول ہے۔ یہ کافر مومنین کو جواب دیتے ہیں کہ **اَنُطْعِمُ مَنْ لَّوْ يَشَآءُ اللّٰهُ اَطْعَمَهٗ** (36:47) ارے! کیا ہم اس کو روٹی دیں کہ اگر اللہ کی مشیت میں ہوتا تو وہ اس کو روٹی دیتا' توبہ توبہ! کیا کہتے ہو! قرآن کہتا ہے کہ کافر یہ جواب دیتے ہیں۔ عزیزانِ من! ماتھا پکڑ کر بیٹھ جایئے۔

---

[1] جسے ہم کہتے ہیں کہ چھت پھاڑ کر دیتا ہے۔

ہمارے ہاں یہ باتیں عام چلتی ہیں' جتنا زیادہ شدت سے اس کو بیان کرتا ہے اتنا زیادہ کچھ خدا کا مقرب سا سمجھا جاتا ہے۔ مشیت پہ سب کچھ موقوف ہے صاحب! یہ چیز کہ راضی برضا رہنا ہے' یہی شعارِ زندگی ہے۔ ''او ککھوں لکھ کردے' لکھوں ککھ کردے' او بے نیازا ئے بے پرواہ جو ہویا جناب! اوہدی مشیت دے معاملیاں اچ دخل دینا۔ بندہ بشر کی کرسکدا اہیگا''❶۔ وہ کہتا ہے کہ یہ جو کفر کرتے ہیں' وہ یہ کہتے ہیں کہ اگر یہ خدا کی مشیت میں ہوتا' اگر وہ یہ چاہتا' تو وہ ان کو کھلا نہ دیتا' ہم کون ہیں' یہ کچھ کرنے والے! کہا ہے کہ **اِنۡ اَنۡتُمۡ اِلَّا فِیۡ ضَلٰلٍ مُّبِیۡنٍ** (36:47)۔اس سے زیادہ کھلی گمراہی بھی کوئی اور ہوسکتی ہے جو یہ بکتے ہیں۔تو معلوم ہوا کہ یہ جو چیز ہے' خدا براہِ راست یہ رزق نہیں دیتا۔ یہ پھر کس طرح سے ملتا ہے؟ یہ ملتا ہے اس نظام کے ذریعے جو جماعتِ مومنین قائم کرتی ہے' جسے اقامتِ صلوٰۃ کہتے ہیں۔ یہ جو خدا کے نام کے اوپر حکومت کرتے ہیں' یہ خدا کی ساری ذمہ داری اپنے اوپر لے لیتے ہیں۔ اگر یہ اس ذمہ داری کو پورا نہیں کرتے تو ان کو کوئی حقِ حکومت نہیں پہنچتا۔ یہ تو ایک طرف رہے اس نے تو اپنے متعلق کہا ہے کہ **اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ** (1:1) حمد وستائش اس کے لیے ہے' جو **رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ** (1:1) ہے' جو تمام اقوامِ عالم کی' تمام جہان کی' پرورش کرتا ہے۔ جو پرورش کرتا ہے' جو خدا کے اس نظام کو قائم کرتا ہے' وہ وجہ مستحقِ حمد وستائش ہے' جو خدا کے نام پہ حکومت کرتا ہے خدا کی ان ذمہ داریوں کو اپنے اوپر لیتا ہے۔ یہ ہے وہ جن کے متعلق خدا نے کہا ہے کہ **وَیُطۡعِمُوۡنَ الطَّعَامَ عَلٰی حُبِّہٖ مِسۡکِیۡنًا وَّیَتِیۡمًا وَّاَسِیۡرًا** (76:8) وہ ان تمام کا' جو تنہا رہ جانے والے ہیں' جن کے کاروبار رک چکے ہوئے ہیں یا ان کے اوپر معاشرے نے کوئی اور ایسی پابندیاں عائد کردی ہیں کہ وہ اس میں مقید ہو کر رہ گئے ہیں' ان کی آزادیاں سلب ہوچکی ہیں' اپنی منشا کے مطابق کچھ کر نہیں سکتے ہیں' یہ جتنے لوگ ہیں۔ وہ ان سب کی روٹی کا انتظام کریں گے۔ اور کریں گے تو یہ کہتے ہوئے کریں گے کہ **اِنَّمَا نُطۡعِمُکُمۡ لِوَجۡہِ اللّٰہِ** (76:9) ہم تو یہ اس لیے کرتے ہیں کہ خدا کی ذمہ داری ہم نے اپنے اوپر عائد کی ہوئی ہے' تمہاری خاطر نہیں کرتے **لَا نُرِیۡدُ مِنۡکُمۡ جَزَآءً وَّلَا شُکُوۡرًا** (76:9) اس کے بدلے میں ہم تم سے نہ کوئی معاوضہ چاہتے ہیں' معاوضہ تو ایک طرف' ہم تو شکریہ بھی نہیں چاہتے۔ ارے! شکریہ تو وہ چاہے جو احسان کرے' ہم تو اس ذمہ داری کو پورا کررہے ہیں جو ہم نے خدا کی طرف سے لے رکھی ہے۔

---

❶ وہ مفلس وقلاش کو کروڑپتی بنادے۔ وہ بے نیاز وبے پرواہ ہے۔ اس کی مشیت کے معاملات میں دخل اندازی کرنا کیا! بندہ بے کس وبے بس ہے۔ کیا کر سکتا ہے؟ کچھ بھی نہیں۔

انفاق کا مفہوم

عزیزانِ من! اور یہ جو نُطْعِمُكُمْ طریق ہے اس کو قرآن نے انفاق سے تعبیر کیا ہے۔ یہاں کہا ہے کہ وَ مِمَّا رَزَقْنٰـهُمْ يُنْفِقُوْنَ (2:3)۔ اس کا ترجمہ ہم نے اپنے ہاں کیا کہ ' خرچ کرتے ہیں' یہ صحیح طور پر اس کے معنی کو ادا نہیں کرتا۔ یہ خرچ کرنا نہیں ہے' اس کے بنیادی معنی اور ہیں۔ یہ جنگلی چوہے ہوتے ہیں' آپ نے دیکھا ہوگا کہ وہ جو اپنے بل نکالتے ہیں' وہ ہمیشہ اس کے دو تین منہ رکھتے ہیں' جن میں مثلاً ایک چوہا' اِدھر سے گھستا ہے اور اُدھر سے اس نے اور منہ رکھے ہوتے ہیں' اگر کوئی ادھر سے اس کو پکڑنے والا ہو تو وہ دوسرے منہ سے آ کر نکل جائے۔ اس قسم کی سرنگ' اس قسم کا بل' کوئی اس قسم کی چیز' جس کے دونوں منہ کھلے رکھے جائیں' یہ ہے جس کو النفقہ کہتے ہیں۔ ''آ نیفے داتے پتہ اے ناتہانوں'' ❶ یوں بات سمجھ آئے گی اور تو کوئی ایسی چیز نہیں ہے' جس کے دونوں منہ کھلے رکھے ہیں۔ ہم نے تو قرآن میں پڑھا کہ وَجَمَعَ فَاَوْعٰى (70:18) وہ کہتا ہے کہ ڈالتا ہے نیچے سے تھیلی پہلے بند ہوتی ہے' اوپر ایک منہ کھلا تھا ''اوہنوں رسی نال بن دیندااے'' ❷۔ دونوں منہ کھلے ہوں۔ میانیاں آپ نے دیکھی ہیں' اب تو روپیہ ہی نہیں' ہمارے ہاں وہ میانی کیا ہوگی' وہ میانی ہوتی تھی' اس میں وہ روپیہ ڈالا کرتے تھے اس کا جو اگلا حصہ تھا' اس کو باندھ کر رکھا ہوا ہوتا تھا یہ ینفقون نہیں ہے۔ کہتا ہے کہ جماعتِ مومنین کا نظام یہ ہے کہ اس کے ہاں معاشیات میں دونوں منہ کھلے ہوتے ہیں' اُدھر سے محاصل ہوتا ہے اُدھر سے مخارج ہوتا ہے' آتا چلا جاتا ہے' نشو ونما کے لیے صحیح طریقے سے چلا جاتا ہے' اس کو ینفقون کہتے ہیں۔

نظامِ ربوبیت میں تو جمع کرنے کا تصور ہی نہیں ہے اور یہی سنتِ رسول ہے

برادرانِ عزیز!۔ اس میں جمع کرنے کا تصور ہی نہیں ہے۔ قرآن نے یہ کہا ہے کہ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَ الْفِضَّةَ (9:34) یہ جو اس طرح سے اس کو جمع رکھ لیتے ہیں' خزانے بھرتے ہیں' اس سب کو دوزخ کی آگ میں تپا کر ان کی پشتوں کو پیشانیوں کو داغا جائے گا۔ اس نے بدترین جہنم کا انسان بتایا' جس کی کیفیت یہ ہوگی کہ جَمَعَ مَالاً وَّ عَدَّدَهٗ (106:2) جمع کرتا ہے پھر گنتا ہے کہ کتنے ہو گئے' ابھی ننانوے کے پھیر میں پڑتا ہے۔ قرآن تو جو جمع کرنا ہے' اسکی یہ کیفیت دیتا ہے۔ اور یہ عزیزانِ من! وہ سنتِ رسول اللہ ﷺ ہے۔ آج حسنِ اتفاق سے یومِ عید میلادِ النبی ﷺ بھی ہے' حضور ﷺ کی سنت بھی آ گئی' کبھی یہ سنت آپ کے سامنے نہیں لائی جاتی ہوگی کہ حضور ﷺ نے ساری زندگی میں کبھی دو روپے بھی جمع کر کے نہیں رکھے۔ وفات کے وقت ایک روایت

---

❶ نیفے کا تو آپ کو علم ہی ہے (بس یہ وہی ہے)۔

❷ اسے بھی رسی سے باندھ دیتا ہے۔

میں آتا ہے کہ کہیں سے سات دینار آئے تھے' غشی کی حالت میں تھے' جب حضور ﷺ کی' آنکھ کھلی تو بیوی سے پوچھا کہ وہ جو روپے آئے تھے' بیت المال میں بھیج دیئے ہیں؟ انہوں نے کہا کہ ہم تو آپ ﷺ کی پریشانی میں تھے' اس لیے ابھی نہیں بھیجے' رکھے ہیں۔ کہا کہ جلدی سے اس کو بھیج دو' کہیں یہ نہ ہو کہ وہ یہاں ہوں اور میں خدا کے ہاں جاؤں اور وہ مجھ سے کہے کہ اس حالت میں آتا ہے کہ روپیہ جمع کیا ہوا تھا کہ دنیا سے آ گئے ہو' بھیجو تاکہ میں سکون کے ساتھ وفات پاؤں۔ کوئی جائیداد نہیں' کوئی ترکہ نہیں' کوئی جمع کیا ہوا روپیہ نہیں' کوئی کچھ چیز نہیں۔ جب جمع ہی نہیں کیا تو جس طریق سے یہ آج زکوٰۃ کا کہہ رہے ہیں' سال بھر جمع کیجیے' اس میں سے اتنا نکالیے تو حضور ﷺ نے ساری عمر زکوٰۃ ہی نہیں دی۔ اس سنتِ رسول اللہ ﷺ کو کوئی آپ کے سامنے نہیں لائے گا۔ یہ تھا خدا کا حکم۔ یُنفِقُوْنَ میں یہ دونوں سرے کھلے رکھتے ہیں۔ برادرانِ عزیز! اس میانی میں روپیہ ڈالیے جس کو نیچے سے نہ باندھا ہوا ہو' اس میں ٹکتا ہی نہیں ہے' رہ ہی نہیں سکتا۔

ہمارے ہاں لفظ یُنفِقُوْنَ اور انفاق کا پایا جانے والا مفہوم

یہ تو زبان عربی ہے اور قرآن کا انتخاب ہے' اعجاز ہے۔ اس میں ایک لفظ یُنفِقُوْنَ کے اندر آپ کا سارا نظامِ معیشت بند کر کے رکھ دیا ہے۔ انفاق کے معنی اب آپ کے ہاں سمٹ کر رہ گئے' لاکھوں کروڑوں روپے جمع کرتے جایئے اور سال کے بعد پھر اس میں سے اڑھائی فیصد نکال کر خیرات کے طور پہ دیدیجیے' باقی سارا شیرِ مادر کی طرح حلال وطیّب ہے۔ کیا یہ انفاق ہے؟ نہیں' قطعاً نہیں۔ کیا یہ ہے وہ معنی جس کے دونوں منہ کھلے ہوئے ہوں؟ نہیں ہرگز نہیں۔ اب یہ چیز ہے۔

قرآنِ حکیم کے معاشی نظام کے لیے صرف ایک لفظ ''قل العفو'' ہے

عزیزانِ من! جو نظامِ معیشت ہے اسے کتنا کھلا رکھا جائے؟ یہ بڑا اہم سوال ہے۔ یہ قرآن ہے' میں نے ہی یہ سوال نہیں کیا' آج ہی یہ سوال نہیں ہوا' اُس وقت بھی یہ سوال ہوا تھا۔ کہا تھا کہ یَسْئَلُوْنَکَ مَاذَا یُنفِقُوْنَ (2:219). یہ پوچھتے ہیں تجھ سے کہ کتنا کھلا رکھیں۔ سوال سن لیا' برادرانِ عزیز! آپ نے۔ آج اس کا جواب خدا نے اپنے رسول ﷺ کی وساطت سے دیا تھا: قُلِ الْعَفْوَ (2:219) ان سے کہو کہ اپنی ضروریات کے علاوہ جتنا ہے' سارے کا سارا۔ یاد رکھیے! عزیزانِ من! آپ کا یہ جو نظام ہے جس میں آپ یہ سارا کچھ جمع کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اسلام میں یہ شرعاً بالکل جائز ہے' اگر اس میں سے یہ اتنا نکالا جائے۔ یاد رکھیے! یہ قرآن کا نظام نہیں ہے' سنتِ رسول اللہ ﷺ کا اتباع نہیں ہے۔ یہ کیا ہے؟ یہ تو یہ جانیں' مجھے کیا ضرورت ہے کہنے کی۔ یہ قرآن کریم راہنمائی ہے ان متقین کے لیے۔ اب آپ یہ سمجھے کہ نظام کے وہ جو اَن دیکھے نتائج تھے' ان کے اوپر وہ کیسے ایمان لاتے

تھے۔ شروع میں تو یہ دینا ہی دینا ہے' رکھنا ہی نہیں ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ آدمی کیسے اس کے لیے آمادہ ہونگے۔ اس کے لیے آمادگی مشکل نظر آتی ہے۔ آگے آونگا تو میں بتاؤنگا کہ قرآن کیا کہتا ہے۔ کہا ہے کہ **اُولٓـئِکَ عَـلٰی ھُدًی مِّنۡ رَّبِّھِمۡ وَ اُولٓئِکَ ھُمُ الۡـمُـفۡلِحُوۡنَ** (2:5) یہ کسان ہیں' کسان نے جو گھر میں تھوڑا سا غلہ دانہ رکھا ہوا ہوتا ہے' اس سے کچھ اس کے بچوں کا پندرہ بیس دن یا مہینے بھر کے لیے تو پیٹ بھر سکتا ہے' یہ اس کا آخری اثاثہ ہوتا ہے' وہ اس کو سر پہ اٹھا کر لے جاتا ہے اور باہر جا کر مٹی میں ملا کر چلا آتا ہے' ایک دانہ بھی گھر میں نہیں رکھتا۔ یہ انفاق ہے' اس نے منہ کو کھول دیا' یہ وہاں بکھیر آیا ہے' یہ کیوں بکھیر آیا ہے؟ کس چیز نے اس کے اندر یہ جرأت اور ہمت پیدا کر دی؟ یہ اس ایمان بالغیب نے کیا کہ یہ ایک ایک دانہ' میرے گھر کے اندر سات سات سو دانے لائے گا۔ اس قانونِ زراعت پر ایمان ہے جو اس کو یہ انفاق کے لیے جرأت دلا دیتا ہے۔ کہا ہے کہ **یُـقِیۡـمُـوۡنَ الـصَّلٰوۃَ وَ مِمَّا رَزَقۡنٰـھُمۡ یُنۡفِقُوۡنَ** (2:3)۔ میں نے عرض کیا ہے کہ دو آیتوں کے بعد یہ بات آئے گی کہ انہوں نے ایسا کیوں کیا؟ اس لیے کیا کہ **یُـؤۡمِـنُوۡنَ بِالۡغَیۡبِ** (2:3). اس نظام کے اَن دیکھے نتائج پر' یہ اتنا یقین محکم رکھتے ہیں جیسا کسان رکھتا ہے یعنی محکم یقین رکھتے ہیں اپنے دانے کو مٹی میں ملا دینے کے نتائج سے۔ انہیں یہ ہدایت قرآن دے گا۔

عزیزانِ من! یہاں تک ہم آئے اور درس کا وقت ختم ہو گیا۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا ط اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ

❀......❀......❀

چوتھا باب: سورۃ البقرۃ(1)' (آیات 4 تا 5)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۝۴ اُولٰۗىِٕكَ عَلٰي هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ ۤ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝۵

عزیزانِ من! آج جون 1968ء کی 16 تاریخ ہے۔ ہم اپنے درسِ قرآن کے سلسلۂ نو میں سورۃ البقرۃ کی ابتدائی آیات پڑھ رہے ہیں۔

صراطِ مستقیم کے لیے مانگی گئی دعا کی قبولیت کے لیے ایک شرط کو پورا کرنا ہوتا ہے

خدا کی طرف سے کہا یہ گیا ہے کہ تم نے سورۃ الفاتحۃ کی ایک آیت (1:5) میں اس آرزو کا اظہار کیا تھا کہ تمہارے سامنے سفرِ زندگی میں منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لیے سیدھا اور متوازن راستہ آجائے۔ یہ راستہ یہ ہدایت یہ راہنمائی تمہیں قرآن میں ملے گی جس میں کسی قسم کا شک وشبہ نہیں ہے اور چونکہ شک وشبہ نہیں ہے اس لیے اس کی وجہ سے دلوں کی بے چینی ذہنوں کی سب تکلیف دور ہو جائے گی لیکن راہنمائی تو اسی کے لیے فائدہ مند ہوتی ہے جو سفر کے لیے آمادہ ہو اور یہ چاہتا ہو کہ وہ سفر کی خطرناک گھاٹیوں سے محفوظ رہتا ہوا منزلِ مقصود تک پہنچ جائے۔ یہ تھی هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ (2:2)۔ اور پھر اس کے بعد یہ کہا کہ تم نے ابھی وہ منزل تو دیکھی نہیں اس کے لیے ضروری ہے کہ تمہیں یہ یقین ہو کہ یہ راستہ اس منزل تک پہنچا دے گا۔ یہ منزل کیا ہے؟ انسانی نظامِ تمدن کو اقدارِ خداوندی کے مطابق متشکل کرنا تاکہ اس سے افراد کی ذات کی نشوونما ہوتی جائے اور پوری انسانیت اپنی ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی آگے بڑھتی بلند ہوتی چلی جائے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ اس نظام کے ان دیکھے نتائج پہ تمہیں یقین ہو اس میں پہلا قدم یہ ہوگا کہ تمہیں نظامِ صلوٰۃ کو متشکل کرنا ہوگا جس میں ہر فردِ معاشرہ خدا کے قوانین کا اتباع کرتا چلا جائے۔ اور جو کچھ بھی تمہیں حاصل ہے خواہ وہ مال و دولت ہو یا تمہاری اپنی ذاتی صلاحیتیں ہوں انہیں دوسروں کی نشوونما اور سود و بہبود کے لیے کھلا رکھا جائے۔ یہاں تک ہم پہنچے تھے۔ یہ تھا يُقِيْمُوْنَ

الصَّلٰوةَ وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ (2:3)۔اس سے آگے ہے کہ یہ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَ مَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ (2:4) یہ وہ لوگ ہیں جو اس کی صداقتوں پر علیٰ وجہ البصیرت یقین رکھتے ہیں۔اب سوال یہ ہے کہ کن صداقتوں پر یقین ہو؟ کہا کہ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ (2:4) جو کچھ تمہاری طرف نازل کیا گیا ہے۔

وحی کیا ہوتی ہے؟ خاصۂ نبوت کیا تھا؟ اس کے متعلق تو میں ابھی کچھ گفتگو نہیں کرونگا۔جب وحی کا لفظ ہمارے سامنے آئے گا تو میں اس وقت تفصیل سے عرض کرونگا کہ وحی کہتے کسے ہیں۔اِس وقت صرف اتنا عرض کردوں کہ قرآنِ کریم نے اس کے لیے جو لفظ منتخب فرمایا ہے' وہ کیا ہے۔

مَا اُنْزِلَ کا قرآنی مفہوم

آپ کو معلوم ہے اور میں بار بار کہے جا رہا ہوں کہ عربی زبان کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ بڑی جامع' بڑی ہی گہری زبان ہے اور پھر یہ عربی زبان قرآن کا انتخاب ہے۔یہ ہے وہ چیز جو قرآن کو سمجھا دیتی ہے۔انـزال کا یہ لفظ استعمال کیا ہے۔اس کے معنی ہوتے ہیں ''کسی چیز کا اوپر سے نیچے اترنا''۔یہ بات کیا ہوئی؟ یوں تو میں نے کہا ہے کہ وحی کے متعلق تفصیلی گفتگو آگے چل کر کرونگا' اس ایک لفظ کے اندر ہی یہ ساری لم اور کیفیت سمٹ کر آجاتی ہے۔انسان جو کچھ چاہتا ہے' وہ اس کی اپنی سوچ کا نتیجہ ہوتا ہے' یہ اس کی داخلی فکر ہوتی ہے اور اس سوچ و بچار کے بعد وہ کسی نتیجے پہ پہنچتا ہے' پھر اس کو Express (بیان) کرتا ہے' اس کا اظہار کرتا ہے۔اسے آپ یوں کہیں گے کہ یہ چیز انسان کے اندر سے باہر آتی ہے' اس میں داخلیت (Subjectivity) ہوتی ہے۔انسان کے اندر سے ایک چیز باہر آتی ہے۔اس کے بالکل برعکس نبوت یا وحی کے متعلق یہ کہا ہے کہ یہ چیز اس نبی کے اندر سے باہر نہیں آتی' یہ باہر سے اس کے اندر آتی ہے۔غور فرمایا آپ نے! ایک لفظ کے انتخاب نے یہ جو پورا پروسیس (عمل) ہے' یہ کس طرح نمایاں کر کے بتا دیا کہ اس میں Subjectivity (داخلیت) نہیں ہے' اس کے اندر' Objectivity (خارجیت) ہے' خارج سے کوئی شے اس کے اندر آتی ہے اور یہ ہے جس کا پھر یہ اظہار کرتا ہے۔یہ انسانی دنیا میں اتنی بڑی Exception (استثنا) ہے یا اب کہنا چاہیے کہ تھی کیونکہ اب سلسلۂ نبوت ختم ہوا' کہ اس کی مثال کہیں اور مل نہیں سکتی۔یہ صرف نبوت کی خصوصیت تھی۔صرف اس لیے کہ یہ نبی کی اپنی سوچ بچار کا نتیجہ نہیں ہوتا تھا۔جسے وہ وحی کہتا تھا وہ اعلان یہ ہوتا تھا کہ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى . اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى (53:4) یہ جو کچھ کہتا ہے' یہ اس کے اپنے خیالات' آرزوئیں' خواہشات' فکر' غور و تدبر کا نتیجہ نہیں ہے' یہ تو وحی ہے جو اس کے اوپر کی جاتی ہے۔

وحی کے مقابل وجدان کی حقیقت اور نوعیت

آپ نے دیکھا کہ وحی کو کس طرح سے علمِ انسانی سے الگ کر کے رکھ دیا۔ یہ ایک Exception تھی' یہ ایک استثنا تھی انسانیت کی دنیا کے اندر جس میں نبی کے علاوہ کوئی اور شریک نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہمیں شاعروں کی دنیا کے Intuition یا وجدان کے الفاظ ملتے ہیں۔ وہ کہتے یہ ہیں کہ

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالب صریر خامہ نوائے سروش ہے

لیکن یہ Intuition (وجدان) بھی جب ہمارے اس زمانے میں علم کی بارگاہ میں آئی ہے' تو برگسان (1859-1941ء) جو Intuition (وجدان) کا ہمارے دور میں سب سے بڑا محقق گزرا ہے' اس نے اس کے متعلق یہ کہا کہ

Intuition is also a higher form of intellect.

Intuition (وجدان) بھی فکرِ انسانی ہی کی ایک شکل ہے جو بلند ہوتی ہے' لطیف ہوتی ہے۔

ہمارے ہاں اس کے لیے عربی میں کشف کا لفظ تھا لیکن میں کہہ یہ رہا تھا کہ اس کے لیے خواہ کوئی یہ Explanation (وضاحت) دے سکے یا نہیں کہ اس Intuition یا وجدان کی شاعروں میں کس طرح سے آمد ہوتی ہے لیکن یہ چیز جب فکر کی دنیا میں گئی ہے تو اس کے متعلق کہنا پڑا کہ یہ بھی Intellect (عقل) ہی کی ایک شکل ہے خواہ یہ اس کی Higher Form (اعلیٰ صورت) ہی کیوں نہ ہو' یہ فکرِ انسانی ہی کی ایک شکل ہے اور جب میں وحی پہ آؤنگا تو پھر تفصیل سے عرض کرونگا کہ جسے وجدان کہا جاتا ہے' یہ کس طرح سے وہ فکر ہے جو انسان کے تحت الشعور کے اندر گڑی ہوتی ہے' شعوری طور پہ اس کا علم نہیں ہوتا' یہ تحت الشعور میں سے نکلتی ہے لیکن جو کچھ بھی ہو' بہر حال وہ اندر سے باہر آتی ہے' باہر سے اندر نہیں آتی۔

وحی کے اندر نبی کی اپنی عقل و شعور کا کوئی دخل نہیں ہوتا

یہ چیز صرف وحی کا خاصہ تھی' جو قرآن نے بتایا کہ یہ خارج سے اس نبی کو ملتی تھی اور یہ نبی اسی طرح' انہی الفاظ میں' جن الفاظ میں قلبِ نبوی پر اس کا القاء کیا جاتا تھا' وہ اس کا اظہار کر دیتا تھا' اسے Communicate (منتقل) کر دیتا تھا۔ یہ ہے وہ چیز جو قرآن نے ایک لفظ تنزیل یا انزال کے اندر چھپا کر رکھ دی ہے' اس تمام پروسیس سے' اس طریق سے' فکری شعوری طریق سے' جو انسانی علم کی بنیاد ہوا کرتا تھا' اس کو الگ کر دیا' لہٰذا وحی وہ ہے' جس میں صاحبِ وحی کی اپنی فکر اور آرزو کا کوئی دخل نہیں ہوتا' یہ خارج سے اسے ملتی تھی اور اسی

طرح سے وہ اسے دوسروں تک پہنچا دیتا تھا۔ اس کے متعلق کہا ہے کہ یہ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ (2:4) ہے۔

ختمِ نبوت کے بعد وحی کا مسئلہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا نیز یہ کہ کشف والہام سب غیر قرآنی تصورات ہیں

یہ بات یاد رکھیے کہ نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ اقدس پر نبوت کا خاتمہ ہوا تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ یہ خارج سے علم حاصل ہونے کا طریق تھا کہ کوئی شئے' کوئی علم' براہِ راست انسان کو ملے جس میں انسان کی اپنی فکر' غور' تدبر' کسی کوشش' محنت' کسب اور ہنر کا کوئی دخل نہ ہو' اس طریقِ علم کا ختمِ نبوت ﷺ کے ساتھ خاتمہ ہو گیا۔ لہٰذا یہ جو ہمارے ہاں بعد میں کشف اور الہام کے دعوے کیے جاتے ہیں اور کہا یہ جاتا ہے کہ نہیں صاحب! یہ نبوت نہیں ہے' یہ محض الفاظ کا فرق ہے' عزیزانِ من! Definition (حدودِ کار) کے اعتبار سے کشف اور الہام اسی کیٹگری (شق) کے اندر آتا ہے جس کے اندر نبوت آتی تھی۔ کہا یہ جاتا ہے کہ کشف اور الہام صاحبِ کشف والہام کی اپنی فکر کا نتیجہ نہیں ہوتا' اسے خدا کی طرف سے براہِ راست علم حاصل ہوتا ہے۔ اسی کو تو وحی کہا جاتا تھا۔ اس کے متعلق کہہ دینا کہ یہ ختمِ نبوت ہے اور یہ سلسلہ ختم ہوا اور اُس کا ایک اور نام رکھ کر بعینہٖ اسی پروسیس سے' اسی ذریعے سے کہنا کہ خدا کی طرف سے ہمیں براہِ راست علم ملتا ہے یہ تو دعویٰ نبوت ہے۔ یاد رکھیے! اسلام میں اس کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ قرآن کی رو سے وحی کا اور خاصۂ نبوت کا خاتمہ ہوا۔ اور اس کے بعد ساری دنیا میں علم کے ذرائع اب دو ہی ہیں: خدا کی طرف سے جو کچھ علم براہِ راست انسانوں کو ملنا تھا' وہ قرآنِ کریم کے اندر محفوظ ہے اور اس کے علاوہ اب انسان کی فکر علم غور تدبر بصیرت' یہ دوسرا ذریعہ ہے' علم کا کوئی تیسرا ذریعہ دنیا میں اب باقی نہیں ہے۔ کہا یہ ہے کہ یہ لوگ ایمان رکھتے ہیں ان اقدار پر' ان قوانین پر' ان احکام پر' جو اے نبی! تیری طرف خدا کی طرف سے' تجھ پر نازل کیے جاتے ہیں۔

میں پھر دہرا دوں اس لیے کہ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ یا وحی کے متعلق سمجھ لینا' بڑی بنیادی چیز ہے۔ دنیا میں حقائق (Realities) پر پردے پڑے ہوئے ہوتے ہیں Scientists (سائنسدان) صاحبِ فکر' صاحبِ علم انہیں Discover (بے نقاب) کرتا ہے' ان سے پردہ اٹھا دیتا ہے اور اس طرح سے انہیں معلوم کر لیتا ہے۔ نبی ان حقائق سے جا کر پردہ نہیں اٹھاتا' یہ حقائق اس کے سامنے خود بے نقاب ہوتے ہیں' یہ اس کے اوپر Reveal (ظاہر) ہوتے ہیں۔ اس میں اور سائنٹسٹ کے پروسیس میں بنیادی فرق یہ ہے کہ سائنٹسٹ حقائق کو Discover (بے نقاب) کرتا ہے' اور نبی پر یہ حقائق از خود منکشف ہوتے ہیں' اپنے آپ کو نبی کے اوپر' Reveal (منکشف) کرتے ہیں' اس میں Discover (بے نقاب) کرنے کے پروسیس کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ کہا ہے کہ یہ لوگ ان صداقتوں پر ایمان رکھتے ہیں' جو وحی کے ذریعے اے رسول! تجھے دی گئیں۔

وحی اور عقلِ انسانی کا باہمی رشتہ لازم و ملزوم ہے' دلائل و براہین کے بغیر ایمان ہی نہیں کہلاتا

وحی کی کنہ و حقیقت سے تو ہم واقف نہیں ہو سکتے کہ اس میں غیر از نبی شریک ہی نہیں تھا لیکن وحی کے جو Contents (عبارات) ہیں' یعنی جو اس کا متن ہے' جو کچھ وحی نے دیا ہے' وہ انسانوں کے لیے ہے اور انسان غور و فکر' علم و بصیرت' مطالعہ و مشاہدہ اور تجربات کے بعد وحی کے متن کو پورا پورا سمجھ سکتا ہے۔ اس میں کوئی راز کی بات نہیں ہے' اس میں کوئی اسرارِ درونِ پردہ نہیں ہیں' اس میں کوئی باطنی معنی نہیں ہیں' اس میں کچھ In between the lines (بین السطور) نہیں' کھلی کھلی عربی مبین کے اندر ایک تعلیم ہے جسے ہر شخص علم اور بصیرت کے ذریعے سمجھ سکتا ہے۔ اس پر ایمان لانے کے معنی یہ ہیں جیسا کہ میں نے ایمان والے درس میں یہ عرض کیا تھا کہ ایمان بالغیب کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ عقل اور فکر کے دیوں کو گل کر کے' آنکھیں بند کر کے' ان کو مان لیتا ہے۔ ایمان کے معنی ہی علم اور بصیرت کے ذریعے ایک Conviction (یقین) حاصل کرنا ہے۔ یہ Faith (عقیدہ) نہیں ہے' اندھا یقین نہیں ہے' بغیر سوچے سمجھے کچھ مان لینا نہیں ہے۔ قرآن اسے ایمان نہیں کہتا جو بلا سوچے سمجھے یونہی کسی چیز کو تسلیم کر لیا جائے۔ وہ تو اعلانِ عام کرتا ہے کہ **لَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ** (17:36) جس چیز کا تمہیں خود علم نہ ہو' اس کے پیچھے لگا ہی نہ کرو۔ لہٰذا یہ جو یہاں کہا ہے کہ **مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ** (2:4) کے اوپر وہ ایمان رکھتے ہیں' تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ان کی بات سمجھ میں آئے یا نہ آئے' دلیل و برہان کی رو سے انہیں اطمینان نصیب ہو یا نہ ہو' یہ تو بہرحال بھئی! ماننا ہے' یہ یوں بات ماننے والے نہیں ہے۔ اس کا یہ ترجمہ کیجیے کہ وہ وحی کی صداقتوں کو علم اور برہان' فکر و بصیرت کی رو سے پرکھتے ہیں اور پھر ان **مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ** اور اس کے ساتھ **وَ مَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ** (2:4) کی' صداقتوں کو علیٰ وجہ البصیرت قبول کر لیتے ہیں۔

خدا کا دیا ہوا دین تمام انبیائے کرام کے لیے ایک ہی تھا جب کہ اس پر عمل کرنے کا طریق مختلف رہا

اے رسول! تجھ سے پہلے جو کچھ خدا کی طرف سے آیا تھا' اس پر بھی ایمان رکھتے ہیں۔ یہ بڑا اہم مقام آ گیا۔ قرآنِ کریم نے یہ بتایا ہے کہ سلسلۂ انبیائے کرامؑ جو شروع ہوا ہے' وہاں سے لے کر آخر تک' جہاں حضورِ نبی اکرم ﷺ کی ذات پہ ختم ہوا ہے' دنیا کی ہر قوم میں نبی آتا رہا' ہر ملک میں آتا رہا' ہر زمانے میں آتا رہا' ان انبیائے کرامؑ کا سرچشمۂ علم ایک واحد خدا تھا۔ لہٰذا انہیں جو کچھ دین کے طور پر دیا گیا' وہ اصولی طور پر ایک ہی تھا۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں تھا۔ اصولاً دین شروع سے آخر تک ایک چلا آ رہا ہے۔ سورۃ الشوریٰ میں ہے کہ **شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ** (42:13) دین کا راستہ شروع سے ایک ہی رہا ہے' ان تمام انبیائے کرامؑ کو یہی کچھ دیا گیا جو

تجھے اے رسولؐ! دیا جا رہا ہے اور ان سے کہا یہ گیا تھا کہ جب دین ایک ہے تو اس میں تم تفرقہ نہ کرنا۔ یعنی ان کی امتوں سے یہ کہا گیا تھا' نبی تو خیر اس میں تفرقہ کرتا ہی نہیں ہے' ان کی امتوں سے یہ کہا گیا تھا کہ دین میں تفرقہ نہیں کرنا۔ تو الدین خدا کی طرف سے ایک ہی رہا ہے۔ البتہ اس دین پر چلنے کے طور طریق زمانے کے تقاضوں کے لحاظ سے بدلتے رہے ہیں۔ یہ جو طریقِ کار ہے' اس میں مختلف زمانوں میں اختلاف ہوتا رہا ہے۔ اسے آپ شریعت کہہ لیجئے' ان طور وطریق کو آپ By - Laws (ضمنی قوانین) کہہ لیجئے' یہ بدلتے رہے ہیں لیکن الدین شروع سے ایک ہی رہا ہے۔ قرآنِ کریم کے متعدد مقامات میں یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ دین ایک رہا ہے لیکن اس پر چلنے کے طریقے مختلف ہوتے رہے ہیں۔ مثلاً سورۃ الحج میں لِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا هُمْ نَاسِكُوْهُ (22:67) ہے۔ یعنی ہر قوم کے لیے دین پر چلنے کے طور طریقے کچھ مختلف تھے' اس میں کوئی جھگڑے کی بات نہیں تھی۔ فَلَا يُنَازِعُنَّكَ فِي الْاَمْرِ (22:67) لیکن جو الامر ہے' جو الدین ہے' جو وحی کی اصل و بنیاد ہے' اس معاملے کے اندر تو کوئی جھگڑے کی بات نہیں ہونی چاہیے۔ اے رسول! یہ تم سے اس کے متعلق جھگڑا کرتے ہیں۔ وَادْعُ اِلٰى رَبِّكَ ط (22:67) لہٰذا تو اُن چیزوں کی پرواہ نہ کر' اپنے خدا کی طرف دعوت دیتا جا۔ اِنَّكَ لَعَلٰى هُدًى مُّسْتَقِيْمٍ (22:67) اور یقینی بات ہے کہ تو ہی اب خدا کے بتائے ہوئے سیدھے راستے پر ہے۔

گاہے گاہے دین کا ایک نیا مجموعہ دینے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟

ہوتا کیا تھا؟ ایک رسول آتا' خدا کی طرف سے دیا ہوا دین اپنی امت کے سامنے پیش کرتا' اس پر چلنے کے طور طریقے' اس زمانے کے تقاضوں کے اعتبار سے وضع کرتا اور ان کے مطابق اس امت کو اس کے اوپر چلاتا۔ وہ چلا جاتا' بعد میں مفاد پرست گروہ اس دین میں آمیزشیں کرتا' تحریف کرتا' کبھی ایسا بھی ہوتا کہ یہ خدا کی طرف سے دی ہوئی کتاب وحی کا صحیفہ ارضی وسماوی حادثے کی نذر ہو جاتا' وہ اپنی اصل شکل میں باقی نہ رہتا۔ جب یہ صورت پیدا ہو جاتی تو پھر خدا کی طرف سے ایک دوسرا رسول آ جاتا' یہ دین کی اصل کو اس فرق کے ساتھ پھر دنیا کے سامنے پیش کرتا کہ ان میں کوئی چیزیں جو ایسی تھیں' جو وقتی طور پہ دی گئی تھیں' ان کو خدا کی طرف سے منسوخ کر دیا۔ یا جو ایسی چیزیں تھیں جن کو انسانوں کے حافظے نے محو کر دیا' حوادثِ ارضی اور سماوی نے ان کو گم کر دیا' ان کی جگہ انہی جیسی اور تعلیم خدا کی طرف سے آ جاتی۔ اب یہ نیا مجموعۂ دین نئے رسول کی وساطت سے دنیا کو دیا جاتا۔ سورۃ البقرۃ کی یہ آیت (2:106) بڑی اہم آیت ہے جس کے غلط مفہوم نے پوچھیے نہیں ہمارے ساتھ کیا کر رکھا ہے۔ یہ آیت ہے کہ مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا ط اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (2:106) ہمارا طریقِ کار یہ رہا ہے کہ جب کسی رسول کی تعلیم میں' یاد رکھیے! دوسری جگہ قرآنِ کریم نے بتایا ہے کہ یہ شیاطین' یہ فتنہ پرداز لوگ' رسول کی تعلیم کے اندر اپنی طرف سے آمیزش کر دیا کرتے تھے' کہا کہ جب یہ ہوتا تھا تو پھر ہم ایک نیا نبی بھیج دیتے تھے۔ اس کے ذریعے سے وہ سابقہ تعلیم کی اس فرق کے ساتھ پھر تجدید ہو جاتی تھی کہ جتنی

چیزیں تو ایسی تھیں، جنہیں برقرار رکھنا مقصود تھا لیکن وہ محو ہو چکی تھیں بھلا دی گئی تھیں، مٹ گئی تھیں، ان کو تو علیٰ حالہٖ دیدیا جاتا تھا اور اگر کوئی ایسی چیز تھی جو پہلے رسول کے زمانے میں وقتی طور پر، ہنگامی طور پر، دی گئی تھی، اس کی جگہ دوسری چیز ہم دیتے تھے نَـاْتِ بِـخَيْـرٍ مِّـنْـهَـآ (2:106) جو اس سے بہتر ہوتی تھی اور جو محو ہو جاتی تھی، مٹ جاتی تھی اَوْ مِثْـلِـهَـا اسی جیسی دوسری تعلیم دے دیتے تھے، یوں یہ دین کا سلسلہ آگے بڑھتا تھا۔

قرآنِ حکیم کی کوئی آیت منسوخ نہیں ہے

ضمناً میں نے جو ابھی عرض کیا تھا کہ اس آیت کے غلط مفہوم نے ہمارے ہاں دین کو ہی جڑ بنیاد سے اکھیڑ کر رکھ دیا۔ اس کے متعلق کہا یہ گیا کہ یہ خود قرآن کی آیتوں کے متعلق ہے کہ قرآن میں خدا نے ایک دفعہ ایک حکم دیا، کچھ عرصے کے بعد اس کو منسوخ کر دیا، کوئی اور حکم دیدیا، پھر منسوخ کر دیا، کوئی اور حکم دیدیا۔ بہت اچھا جی! پہلی تو یہی بات سمجھ میں آنے والی نہیں تھی کہ ایک ضابطۂ ہدایت اسی رسول کی زندگی میں اور وہ ضابطۂ حیات جسے قیامت تک کے لیے تمام انسانوں کے لیے غیر متبدل محفوظ ضابطہ بننا تھا، اس میں کیفیت یہ ہو کہ آج ایک حکم دیا جائے کچھ عرصے کے بعد پھر یہ کہا جائے کہ نہیں! یہ نہیں ہونا چاہیے تھا، کوئی اور ہونا چاہیے تھا، اس کی جگہ ایک اور حکم دیدیا جائے۔ بفرضِ محال اسے بھی تسلیم کیا جائے تو آپ کے ہاں جو آئے دن قانون میں Corrections (اصلاحات) ہوتی رہتی ہیں، Alterations (تبدیلیاں) ہوتی رہتی ہیں، تو اس میں سب سے پہلے یہ بتانا ہوتا ہے کہ فلاں قانون کی جو فلاں شق ہے، اسے منسوخ کیا جاتا ہے اس کی جگہ یہ آئے گی۔ یہ تو ضروری ہے کہ آپ کو معلوم ہو جائے کہ کونسی شق منسوخ ہوئی ہے، اس کی جگہ یہ دوسری شق آئی ہے۔ قرآن میں کہیں یہ لکھا ہی نہیں ہے کہ یہ جو آیت ہے، اس نے فلاں آیت کو منسوخ کر دیا ہے لہٰذا حکم اس کے اوپر نہیں ہوگا، اس کے اوپر ہوگا۔ کہیں یہ آیا ہی نہیں ہے۔ یہ عجیب قسم کی تنسیخ ہے، یہ نسخ عجیب ہے کہ بتایا ہی نہیں گیا۔

خدا کے 500 احکامات کو مذہبی پیشوائیت نے منسوخ کر دیا

کہا آپ کو معلوم ہے کہ پھر کیا کچھ کیا گیا؟ آپ کے ہاں کی مذہبی پیشوائیت بیٹھی اور انہوں نے خدا کی اس کتاب کے اندر خود یہ بتانا شروع کیا کہ یہ بھی منسوخ، یہ بھی منسوخ، یہ بھی منسوخ اور احکام کی پانچ سو آیات تک کو بغیر کسی اتھارٹی کے منسوخ قرار دیدیا، رسول بھی موجود نہیں ہے، رسول نے بھی کسی آیت کے متعلق یہ نہیں کہا کہ یہ منسوخ ہے، مگر یہ ہیں کہ جنہوں نے کہا کہ یہ بھی منسوخ، یہ بھی منسوخ۔ پھر اس کے بعد آگے سلسلہ چلا۔ کسی نے کہا کہ نہیں صاحب! یہ پانچ سو نہیں، قصہ مختصر، یہ کہ میں جب اس آیت (2:106) پہ آؤنگا تو اس کی تفصیل عرض کرونگا۔ وہ ان کی منسوخ کی گئی 500 آیات سمٹتی سمٹتی شاہ ولی اللہؒ کے [1] زمانے میں پانچ آیتیں رہ گئیں۔

---

[1] قطب الدین احمد ولد عبدالرحیم المعروف بہ شاہ ولی اللہ (1114-1176)

اس کے متعلق مولانا عبید اللہ سندھی (1865-1935ء) نے اس کے بعد یہ کہا کہ نہیں! یہ پانچ بھی شاہ صاحب نے مصلحتاً کہہ دیا تھا کہ اس زمانے میں نسخ کے عقیدے کا سرے سے انکار کرنا تو ایک قیامت برپا کرتا تو انہوں نے عقیدے سے انکار نہیں کیا' یہ پانچ آیتیں ایسی رکھ لی ہیں جن کو آسانی سے بتایا جاسکتا ہے کہ ان میں تطبیق ہوسکتی ہے' یہ منسوخ نہیں ہیں' قرآن میں کوئی آیت منسوخ نہیں ہے لیکن یہ ان کا عقیدہ تھا۔ آپ کے ہاں یہ علمائے کرامؒ آج بھی یہ مانتے ہیں اور وہاں جہاں ذراسی ان کو کہیں دقت پیش آتی ہے یا کسی ایک آیت کے اوپر عمل کرنے میں کہیں زد پڑتی ہے' اس کے لیے سیدھا حساب ہے کہ صاحب! یہ آیت منسوخ ہے۔ بھئی! منسوخ کرنے والے خدا نے کیا کہیں اس کے لیے کچھ کہا ہے؟ کہ نہیں جی! اسلاف نے یہ کہہ دیا ہے' علمائے کرام کا یہ فیصلہ ہے' اجماعِ امت ہے' اس کے اوپر چلیے صاحب۔

ان کے ہاں یہ اجماعِ امت بھی عجیب چیز ہے' بہرحال! اس پہ بھی جب آؤنگا تو پھر عرض کرونگا۔ اس آیت کے یہ معنی لے لیے گئے کہ قرآن کی آیتیں منسوخ ہیں۔ قرآن میں آیتیں موجود ہیں' مگر ان کا حکم منسوخ ہے۔ بھئی! اگر منسوخ ہیں' تو قرآن کریم سے نکال دی جاتیں' کہا کہ جی! وہ تلاوت کا ثواب ہے' وہ کتنا کم رہ جاتا۔ ہاں بات ہوئی ''او کھجوراں دیاں گِٹکاں گنن اچ فرق پے جاندا''۔ [1] ملاحظہ فرمایئے! ہنسیے نہیں' عزیزانِ من! روئیے۔ قرآن کی پانچ سو آیتیں قرآن کے اندر موجود ہیں' مگر ان کا حکم منسوخ ہے۔ اور ان کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ بعض آیتیں ایسی ہیں جو قرآن کے اندر نہیں ہے' لیکن ان کا حکم موجود ہے۔ قرآن میں آیتیں ہیں حکم منسوخ ہے' یعنی بعض آیتیں ہیں جن کا حکم چلتا ہے' مگر قرآن میں ہیں نہیں۔ کس قرآن کے متعلق بات ہورہی ہے؟ اس کے متعلق جس میں کیا گیا ہے کہ **تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ۭ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ** (6:115) تیرے خدا کی بات' قانون' ضابطہ' صدق اور عدل سے مکمل ہوگیا' کوئی اس میں تبدیلی پیدا نہیں کرسکتا۔ **اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ** (15:9) ہم نے اسے نازل کیا ہے' ہم اس کی حفاظت کا ذمہ لیتے ہیں۔ ان کے عقیدے کے مطابق یہ حفاظت کا ذمہ لیا ہوا ہے! یاللعجب!!!۔ عزیزانِ من! قرآنِ کریم کا ایک شوشہ تک بھی ہمالیہ پہاڑ کی طرح محکم اور مستحکم ہے' اس میں نہ کوئی آیت منسوخ ہے' نہ اس میں تحریف ہے' نہ اس میں اضافہ ہے' نہ اس میں حک ہے' اس لیے کہ خدا نے اس کو مکمل کیا ہے' خدا نے اس کی حفاظت کا ذمہ لیا ہوا ہے۔

میں اس ضمن میں کہہ یہ رہا تھا کہ وحی کا طریق یہ تھا کہ دوسرے رسول کے ذریعے سے' پہلے رسول کی وساطت سے آئی ہوئی وحی میں جو آمیزشیں ہوجاتیں' تحریف ہوجاتی' ان کی جگہ جو احکام رکھنے مقصود ہوتے' ان جیسے لے آتے' اگر کوئی حکم وقتی طور پہ دیا گیا تھا تو اس کی جگہ اس سے دوسرا بہتر حکم دیا جاتا۔ یہ سلسلہ چلتا آیا تا آنکہ نبی اکرم ﷺ کا زمانہ آیا جس میں اس سلسلۂ وحی کو ختم کرنا مقصود ہوگیا۔

---

[1] وہ کھجور کی گٹھلیاں گننے میں فرق آجاتا۔

قرآنِ کریم مکمل طور پر ابدی احکام لیے ہوئے دے دیا گیا۔ میں ختمِ نبوت ﷺ پہ آ ؤنگا تو عرض کرونگا کہ نبوت کے ختم کرنے کا یہ انقلاب بھی کتنا عظیم تھا۔ اب بچہ جوان ہو گیا تھا' اسے کسی انگلی پکڑ کر چلانے والے کی ضرورت نہیں رہی تھی' اسے صرف زندگی کے موڑوں کے اوپر یہ سائن بورڈ لکھے ہوئے ملنے چاہیے تھے کہ یہ راستہ ادھر جاتا ہے اور یہ راستہ اُدھر جاتا ہے۔ جوان بچے کو آپ کسی وقت انگلی پکڑ کر چلا کر دیکھیں تو سہی کہ مثلاً انارکلی میں وہ کیا کرتا ہے۔ رسالتِ محمدیہ ﷺ انسانیت کے اوپر احسان ہے کہ نبوت کا خاتمہ کر دیا۔ اب کسی شخص کو حق حاصل نہیں ہے کہ مجھ سے یا آپ سے آ کر یہ کہے کہ خدا نے مجھے یہ کہا ہے تم یہ مانو۔ خدا اب کسی سے کچھ نہیں کہے گا۔ اس نے انسانیت کو اس کے بعد کتنی بڑی آزادی دیدی ہے۔ یہ ہے ضابطۂ قوانین۔ اس کو سوچو' سمجھو' جی میں آئے مانو' جی میں آئے نہ مانو۔ کسی انسان کو اب حق حاصل نہیں ہے کہ کسی انسان سے اپنے کسی قول کو یہ کہہ کر منوائے کہ خدا نے ایسا کہا ہے۔ لیکن میں نے عرض کیا ہے کہ پھر یہ وَمَآ اُنۡزِلَ مِنۡ قَبۡلِکَ ۚ (2:4) پر ایمان کیا ہوا؟ ایمان یہ ہوا کہ اپنے اپنے وقت کے اوپر یہ سلسلہ یوں چلا آیا۔ یہ تمام انبیائے کرامؑ خدا کی طرف سے ہی دین لائے تھے۔ ایک تو یہ دیکھیے کہ اس میں کشادہ نگہی' رواداری کی وسعتیں کتنی پیدا ہو گئیں۔ قرآن کہتا ہے کہ دنیا کی ہر قوم کے اندر نبی آتا رہا لہٰذا دنیا کی کوئی قوم جو اپنے مذہب کے بانی کو یہ کہے' خواہ وہ اسے رسول کہے یا کچھ بھی کہے' آپ اس کے خلاف ایک لفظ نہیں کہہ سکتے۔

دنیا کی ہر قوم کی طرف آنے والے نبی اور رسول کا احترام کرنا ہمارا فرض ہے

قرآن نے کہا ہے کہ ان انبیاء میں سے کچھ تو وہ ہیں جن کا نام ہم نے لے لیا ہے' اے رسول! بہت سے ایسے ہیں جن کا ہم نے اس طرح سے ذکر نہیں کیا لیکن یاد رکھو! دنیا کی ہر قوم میں نبی اور رسول آتے رہے۔ اس لیے لَا نُفَرِّقُ بَيۡنَ اَحَدٍ مِّنۡ رُّسُلِهٖ (2:285) ہمارا ایمان قرآن کی رو سے ہے۔ ہم ان کے نبیؑ ہونے کی جہت سے ان میں کسی قسم کی تفریق نہیں کرتے۔ اس لیے دنیا کی کوئی قوم اگر یہ کہتی ہے کہ ہمارے مذہب کا یہ بانی تھا ہمیں ماننا ہوگا کہ یہ خدا کی طرف سے نبی ہو سکتا ہے۔ ہم اس کے احترام میں اور رسول اللہ ﷺ کی نبوت کے احترام میں قرآن کی رو سے کوئی فرق نہیں کر سکتے بلکہ پہلے اُنہیں ماننا پڑے گا کیونکہ زمانے کے اعتبار سے وہ پہلے آئے ہوئے ہیں اور آخر میں جا کر آپ کو اپنے رسول ﷺ کو ماننا ہوگا۔ آپ مسلمان نہیں ہو سکتے تاوقتیکہ حضرتِ عیسیٰؑ کو بھی خدا کا نبی نہ مانیں اور خدا کا رسول نہ مانیں۔ پھر دوسری چیز وَمَآ اُنۡزِلَ مِنۡ قَبۡلِکَ ۚ کی یہ ہے۔ وَمَآ اُنۡزِلَ مِنۡ قَبۡلِکَ ۚ (2:4) پر ایمان لانے کے معنی یہ ہیں کہ یہ انبیائے کرامؑ اپنے اپنے وقتوں میں آئے' انہوںؑ نے خدا کا یہ نظام پیش کیا' ان کی قوموں نے اس نظام پہ عمل کیا' ان کے مخالفین نے اس کی خلاف ورزی کی' ان کے نتائج دنیا نے دیکھ لیے۔ جس قوم نے اس ضابطے پر' اس نظام پر' عمل کیا' اسکی زندگی کی خوشگواریاں بھی تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہیں' جنہوں نے مخالفت کی تھی ان کی تباہیاں اور بربادیاں بھی وہاں مشہود طور پہ

سامنے آجاتی ہیں۔ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِکَ ج (2:4) پر ایمان لانے کے معنی یہ ہیں کہ اصولی طور پر یہی نظام' یہی دین شروع سے آتا رہا ہے' تاریخ اس کی شاہد ہے اور قرآن نے ان تاریخی شواہد کو اپنے دامن میں محفوظ بھی کرلیا ہے۔ تاریخ اس کی شاہد ہے کہ جن قوموں نے اس کے مطابق زندگی بسر کی تھی' ان کو دنیا کی سرفرازیاں نصیب ہوئی تھیں' جنہوں نے اس کی مخالفت کی تھی ذلت اور مسکنت ان کے حصے میں آئی تھی۔ لہٰذا یہ جو Historical Evidences (تاریخی شہادات) ہیں' یہ قرآن کے ان دعاوی کی صداقت کا بھی ثبوت بنتی ہیں' اس لیے بھی وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِکَ (2:4) پر ایمان لانا ضروری ہے۔ یہ تاریخی شہادت اس کا افادی پہلو ہے جو میں نے ابھی عرض کیا ہے۔

کتب سابقہ میں تحریف

عزیزانِ من! اس سے پہلے جتنی بھی آسمانی کتابیں آتی رہیں' ان میں سے کوئی کتاب' کسی مذہب والے کے پاس' اس کی اپنی اصلی شکل کے اندر موجود نہیں ہے۔ یہ ہمارا دعویٰ نہیں' دنیا کے ہر مذہب والے اپنی کتاب کے متعلق یہ تسلیم کرتے ہیں کہ یہ غیر محرف نہیں ہے' اپنی اصلی حقیقی شکل میں نہیں ہے۔ تفصیل اس اجمال کی دور چلی جائے گی' میں عرض کرونگا کہ اگر آپ کو دلچسپی ہو تو میں نے یہ جتنے بڑے بڑے مذاہبِ عالم ہیں' ان کی مبینہ آسمانی کتابوں کی تاریخ اپنی اس کتاب میں لکھ دی ہے' جس کا نام ہی ''مذاہبِ عالم کی آسمانی کتابیں'' ہے' وہ موجود ہے یہاں چھپی ہوئی ہے۔ اس میں' میں نے اپنی طرف سے کچھ نہیں لکھا' جس اہلِ مذہب کی وہ کتاب ہے انہی کی اتھارٹی سے' سند سے' یہ بتایا ہے کہ ان کے پاس ان کے بانی کی اصلی کتاب موجود نہیں ہے۔

برہموسماجی تحریک کے بنیادی محرکات اور اس کا نتیجہ

ہمارے ہاں ایک تحریک پیدا ہوئی۔ میں اس تحریک کے سیاسی پس منظر میں نہیں جانا چاہتا' وہ موضوع اور ہو جائے گا۔ اسے برہمو سماجی تحریک کہا جاتا ہے۔ اُنہوں نے کہا کہ صاحب! یہ لڑائی جھگڑے کی باتیں جو مذہب میں ہوتی ہیں' بڑی غلط بات ہے' رام بھی وہی رحیم بھی وہی' یہ بھی اچھا وہ بھی اچھا' یہ بھی ٹھیک وہ بھی ٹھیک۔ اب کیا کریں؟ کہا کہ مختلف مذاہب کی کتابوں میں سے جو اچھی اچھی چیزیں ہیں' وہ اکٹھی کرلیں اور اس کے اوپر ہم ایمان لے آئیں' اس کو اپنی زندگی کا ضابطہ بنالیں۔ بظاہر یہ کتنی سی آسان بات نظر آتی ہے کہ اس میں سے اچھی اچھی باتوں کو چن لیا جائے۔ دوسرے اہلِ مذاہب سے تو ہمیں سروکار نہیں لیکن اس کے معنی یہ ہوئے کہ خود قرآن میں بھی کچھ اچھی باتیں ہیں اور کچھ (معاذ اللہ) خراب باتیں بھی ہیں' اس میں سے اچھی اچھی بھی چن لی جائیں اور یوں اس کو اکٹھا کرلیا جائے۔ اس کا نام برہموسماجی مذہب [1] تھا۔ یہ بنگال میں چلا۔ راجہ رام موہن رائے اس کا بانی تھا۔ یہ چل سکتا ہی نہیں تھا' اور چلا ہی نہیں' بس

---

[1] اس کی بنیاد 1830ء میں راجہ رام موہن رائے نے بنگال میں رکھی۔

کچھ ایک سوسائٹی سی قائم ہوگئی۔ غلط تصور تھا' اپنی موت آپ مر رہا تھا کہ وہاں ایک سیاسی مصلحت نے مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم (1888-1958) کو اس چیز کے اوپر آمادہ کیا کہ اسی برہموسماجی دین کے تصور کو اسلام کی حیثیت سے پیش کریں۔ انہوں نے اپنی تفسیر 'ترجمان القرآن' کے شروع میں' سورۃ الفاتحہ کی جو تفسیر لکھی ہے' اس میں تصور ہی یہ دیا ہے کہ خدا کی طرف سے ہر اہلِ مذہب کے پاس جو دین آیا تھا' وہ اپنی سچائیوں کے اعتبار سے موجود ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ اگر تم اپنی اپنی کتابوں کی سچائیوں پر عمل پیرا ہو جاؤ تو میرا کام ہو گیا۔ چلیے صاحب! بڑی تفصیل سے اس میں یہ کچھ کہا گیا ہے۔ میں نے کہا ہے کہ میں اس کے سیاسی پس منظر میں نہیں جانا چاہتا۔ اتنا ہی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ یہ وہ میدان تھا جس میں' میں خود موجود تھا۔ بطورِ تحدیثِ نعمت عرض کرونگا کہ اس تفسیر کے خلاف سب سے پہلے جس نے آواز اٹھائی تھی وہ آپ کا یہی بھائی تھا۔ دوسری طرف کیفیت یہ تھی کہ کانگریس کمیٹی نے خود مولانا (ابوالکلام) آزاد کی اس تفسیر کا جو وہ حصہ تھا' اس نے اپنی مختلف زبانوں میں اس کے ترجمے کرائے تھے اور سارے ہندوستان میں اس کو پھیلایا تھا۔ (موہن داس) گاندھی جی (1869-1948ء) نے اس کو خاص طور پہ آشیرباد دی تھی اور کہا تھا کہ ہندوستان میں تمام مذاہب والے مل کر چونکہ ایک قوم بنتے ہیں' ان لیے یہ مذہب کی بنا پہ جو آئے دن جھگڑے ہوتے رہتے ہیں اس کا حل یہی ہے جو مولانا صاحب (ابوالکلام آزاد) نے فرما دیا۔ یعنی ہندومت جیسے مذہب کو اٹھا کر اسلام کے ہمدوش کھڑا کر دیا۔ آپ سوچیے کہ اس سے اسلام اپنے مقام سے کتنا نیچے آ گیا۔ رام بھی وہی ہے' رحیم بھی ہے صاحب! اس کی طرف سے جو کچھ سچائیاں ملی ہیں' وہ عالمگیر ہیں اور ہر ایک کے ہاں موجود ہیں۔ میں اس کے بعد عرض کرونگا کہ اس کے پھر نتائج کتنے دور رس تھے۔ یہ تو اللہ کا احسان ہے کہ اس قوم میں اس زمانے میں اقبالؒ (1877-1938) جیسا دیدہ ور اور (محمد علی) جناحؒ (1876-1948) جیسا صاحبِ نظر پیدا ہوا۔

میں پھر یہ عرض کرونگا کہ بطورِ تحدیثِ نعمت مجھے بھی اس میں کچھ حصے لینے کی توفیق ہوئی' طلوعِ اسلام نے اس دور میں جو کام کیا ہے اس کی فائلیں اس کے اوپر شاہد ہیں۔ بہرحال یہ جو تصور آ رہا تھا' اس سے اسلام اپنی جڑ بنیاد سے اکھڑ رہا تھا کہ تمام مذاہب کی اچھی اچھی باتیں لے کر ان کا ایک مجموعہ بنا کر ایک نیا دین قائم کیا جائے' یہ وہیں ختم ہوا۔ وہ کہتے تھے کہ یہ تعلیم خدا کی تعلیم ہے' تم اعتراض کیوں کرتے ہو؟ اعتراض یہ تھا کہ جس خدا نے ہمیں یہ بتایا ہے کہ اس نے ہر قوم کے اندر نبی اور رسول بھیجا تھا' اُسی خدا نے ہی ہمیں بتایا ہے کہ ان نبی اور رسولوں کی جو وحی تھی وہ دنیا کے اندر اپنی اصلی شکل میں موجود نہیں رہی تھی۔ اس خدا کے پہلے قول کے اوپر تو ایمان آ رہا ہے' یہ جو دوسرا حصہ ہے' اس کو گول کیا جا رہا ہے۔ اسی نے ہمیں یہ بتایا تھا اور اس نے پھر یہ بات بتائی تھی کہ یاد رکھو! اب نجات وسعادت کے لیے یہ الفاظ ہیں' مولانا! اس کے لیے سنیے! عزیزانِ من! تمام اہلِ مذاہب سے یہ کہا جا رہا ہے کہ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاٰمَنُوْا بِمَا نُزِّلَ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّهُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ (47:2) یہ وہ لوگ ہیں' جو ایمان لاتے ہیں' اعمالِ صالحہ

کرتے ہیں۔ ایمان لاتے ہیں اس کے اوپر جو محمد ﷺ پر نازل کیا۔ وہ تو خدا ہے وہ تو عالم الغیب ہے' اسے تو معلوم تھا کہ برہموسماجی تصورات اٹھنے ہیں' اسے پتہ تھا کہ قرآن کی یہ تفسیر ہونی ہے۔ اس نے یہاں اس چیز کو مبہم رہنے ہی نہیں دیا ہے۔ یہاں یہ نام دیدیا ہے۔ یہ دیکھیے قرآن کا اعجاز' برادرانِ عزیز! کہا ہے کہ وَاٰمَنُوْا بِمَا نُزِّلَ عَلٰى مُحَمَّدٍ (47:2) اور اس کی پھر آگے تعریف یہ کی ہے کہ وَّهُوَ الْحَقُّ (47:2) الحق یہی ہے۔

آج کرّہ ارض پر سوائے قرآن کے کوئی آسمانی کتاب اپنی اصلی شکل میں محفوظ نہیں

لہٰذا خدا کی طرف سے دین جو مختلف انبیائے کرامؑ کو ملتا رہا' اپنی اصل کے اعتبار سے ایک تھا' ان کے ہاں کہیں محفوظ نہ رہا۔ وہی دین اپنی آخری مکمل شکل میں قرآن کے اندر آ کر اتمام کو پہنچا' خدا نے اس کی حفاظت کا ذمہ لیا۔ اب قیامت تک کے لیے خدا کی طرف سے دین کا ضابطہ یہی ہے' اس پر ایمان لانے سے انسان مومن یا مسلم ہوتا ہے' اسی کے مطابق عمل کرنے سے نجات وسعادت کی راہیں ملتی ہیں۔ لہٰذا وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ج (2:4) کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ان کے اوپر جو اپنے اپنے زمانے میں نازل ہوا تھا' آج وہ جس شکل میں ہے' اس کے اوپر ایمان لے آیا جائے۔ یہ دیکھیے جو نازل ہوا تھا' اس کے اوپر' اس کے متعلق' یہ عقیدہ رکھا جائے کہ وہ خدا کی طرف سے ٹھیک تھا' یہ نہیں کہ جو ان کے ہاں آج موجود ہے' اس کے متعلق یہ عقیدہ رکھا جائے کہ یہ خدا کی طرف سے بالکل ٹھیک ہے۔ آپ نے غور فرمایا کہ اس میں کتنا فرق ہے' اور وہ جو کہا کرتے ہیں' قرآن ان کی تصدیق کرتا ہے' جب میں اس آیت کے اوپر مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ (2:97) آؤنگا تو وہاں عرض کرونگا کہ تصدیق کے معنی کیا ہیں اور کس چیز کی تصدیق کرتا ہے۔ اس وقت صرف اسی پہ اکتفا کرتا ہوں کہ جو ان انبیاؑ کے اوپر نازل کیا گیا تھا' ان کے متعلق یہ ایمان ضروری ہے کہ وہ بھی اُس زمانے میں' خدا کی طرف سے تھا' اب وہ اپنی اصلی شکل میں موجود نہیں ہے۔ اسی خدا کی طرف سے دین کا جو آخری ایڈیشن ہے' وہ مکمل شکل میں اب قرآن کے اندر ہے' ساری دنیا کی طرف یہ نازل ہوا ہے' ساری دنیا کو دعوت دی جارہی ہے کہ اس پہ ایمان لائیں۔ اگر جو کچھ کسی کے پاس تھا' اسی کو ماننا اور اسی کے مطابق چلنا تھا' یہی اسلام کی رو سے کافی تھا' تو نبی اکرم ﷺ نے جو اہلِ کتاب کے ساتھ اتنے برسوں تک یہ جنگیں اور لڑائیاں جاری رکھیں' وہ کاہے کے لیے تھیں۔ ان کے رسولوں کا اور ان کی کتابوں کا تو خود قرآن میں ذکر ہے لیکن ان سے بھی یہ کہا جارہا ہے کہ تم بھی خدا پر ایمان لاؤ مگر یہ ہیں جو کہتے ہیں کہ جی! وہ اہلِ کتاب ہیں' خدا پر ایمان کے معترف ہیں' نبی پر ایمان رکھتے ہیں' نبی کی کتاب پہ ایمان رکھتے ہیں' ان سے بھی ایمان کا تقاضا اور مطالبہ کیا جاتا ہے۔

اگر خدا کا صحیح تصور سامنے نہ ہو تو پھر خدا پر ایمان لانا بے سود ہو جاتا ہے

سوال خدا کے نام کا نہیں ہے' سوال یہ ہے کہ خدا کا تصور کیا ہے۔ ہر مذہب والا خدا کو اپنے تصور کے مطابق مانتا ہے' یہ خدا کا تصور ہی

باطل ہے۔خدا کا وہی تصور صحیح ہے' جو خدا نے اپنی کتاب محفوظ میں دیا ہے۔لہٰذا خدا کو ماننے والا وہی تسلیم کیا جائے گا جو اس تصور کے مطابق خدا کو مانے۔اسی لیے قرآن نے یہ کہا ہے کہ ان لوگوں سے کہہ دو کہ فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ (2:137) اگر یہ اس طرح سے خدا کو اور رسول کو اور رسالت کو مانیں جس طرح سے تم مانتے ہو' پھر سمجھو کہ یہ راہِ راست کے اوپر ہیں۔یہ نہیں ہے کہ اپنے اپنے طور پہ جس نے مان لیا وہ سب ٹھیک ہے' رام بھی وہی ہے رحیم بھی وہی ہے۔یہ ایسا نہیں ہے۔لہٰذا ایمان بِمَا نُزِّلَ عَلٰى مُحَمَّدٍ (47:2) پر ہے۔خدا کی اس کتاب قرآن کریم پر ہے' یہی ضابطۂ ہدایت ہے۔

قرآن حکیم کو سمجھنے کے لیے پہلے ''آخرت پر ایمان'' کی بنیادی اصطلاح کا مفہوم سمجھنا ضروری ہے

برادرانِ عزیز! اگلا ٹکڑا اب آیا۔یہی جو میں نے يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ (2:3) میں کہا تھا کہ یہ اس نظام کے ان دیکھے نتائج پر ایمان رکھتے ہیں۔اور یہاں کہا ہے کہ ان کی اگلی شرط یہ ہے کہ وَ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ (2:4)۔آخرت قرآنِ کریم کی اہم اصطلاحات میں سے ایک اصطلاح ہے' یہ بڑی بنیادی اصطلاح ہے' عزیزانِ من! جیسا کہ میں کہتا چلا آ رہا ہوں ان اصطلاحات کے متعلق ہمارے ذہنوں کے اندر جو عام تصور ہے' جب تک اس تصور کی جگہ ہم قرآن کا متعین کردہ تصور نہیں لے آتے' قرآن کی ان اصطلاحات کا صحیح مفہوم سمجھ میں نہیں آ سکتا۔اور جب ان کا صحیح مفہوم سمجھ میں نہ آئے تو دین قطعاً سمجھ میں نہیں آ سکتا۔

''اٰخِرٌ'' جس کی مونث ''آخرت'' ہے' اسے غور سے سنیے کہ یہ کیا چیز ہوتی ہے۔یہ ہے ''کسی سلسلے کی ایسی کڑی جس کے بعد پھر اس جیسی اور کڑیاں نہ آئیں''۔غور فرمایا آپ نے کہ قرآن کیا بات کہہ گیا ہے۔پیچھے سے جو کچھ چلا آ رہا ہے' وہ وہاں ختم ہو' ختم ہونے کے بعد بالکل خاتمہ ہی نہ ہو جائے' اور آگے بات چلے لیکن وہ بات اس جیسی نہ ہو جو پیچھے سے چلی آ رہی ہے۔پہلی چیز تو یہ ہے کہ جب قرآن کی رو سے اس زندگی کے بعد کی زندگی' جسے ہم حیات بالآخرت کہتے ہیں کے متعلق سوچا جائے تو کتنی عظیم بات قرآن کہہ گیا ہے کہ زندگی کا 'حیات کا' لائف کا' یہ سلسلۂ دراز' جو زندگی کے اولیں جرثومہ (Life cell) سے' مختلف ارتقائی منازل طے کرتا ہوا' پیکر بدلتا ہوا چلا آ رہا ہے' اس میں کتنی ہی تبدیلیاں کیوں نہ ہوئی ہوں' بہرحال یہ ایک Physical Process ہے' زندگی کا طبیعاتی طریق ہے' Refine ہوتا چلا جائے گا' بلند ہوتا چلا جائے گا' لطیف ہوتا چلا جائے گا' اس کے اندر قانون وہی طبعی ہے' وہی Physical Laws کے تابع زندگی چلتی آ رہی ہے۔انسان کی منزل میں پہنچ کر اس میں ایک اضافہ ہوا ہے' یہ اس کے اندر الوہیاتی توانائی آئی ہے لیکن اس کے بعد بھی زندگی آگے چلتی ہے' اسے آخرت کے لفظ سے تعبیر فرمایا۔آپ نے غور کیا کہ کیا ہوا؟ کہ جس طریقِ کار سے زندگی پیچھے سے چلی آ رہی تھی' اس طریقِ کار کا یہاں آ کر خاتمہ ہوا' زندگی آگے بڑھے گی' ایک نئے پروسیس کے تابع کیونکہ آخرت وہ کڑی ہے جس کے بعد پھر

اس جیسی اور کڑیاں نہیں آئیں گی' نئی قسم کی کڑیاں آئیں گی۔ اسی لیے قرآنِ کریم نے اس زندگی کو خلقِ جدید سے تعبیر کیا ہے۔ تخلیق تو ایک ہی چیز ہے لیکن خلقِ جدید کہا ہے۔ کہا ہے کہ وَقَالُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّ رُفَاتًا ءَ اِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا (17:49)۔ جب یہ مر جائیں گے Disintegration (انتشار) ہو جائے گا' اس Physical Body (مادی پیکر) کا انتشار ہو جائے گا' اس کا تو کیا اس کے بعد پھر ہم ایک نئی زندگی میں اٹھائے جائیں گے۔ قرآن نے مختلف مقامات پر اسے کہا ہے۔ یہ سلسلۂ تخلیق ہی ہے لیکن یہ جو اس طبعی زندگی کے آخر تک طریق کار تھا' وہ جو تھی نفس کی آمد و شد کا سلسلہ' اس کے ختم ہونے کے بعد تخلیق کا ایک نیا طریق ہو جائے گا' وہ کیا ہوگا؟ ہم اپنے شعور کی موجودہ سطح پر اس کی کیفیت کو نہیں جان سکتے لیکن اس پر ایمان ہے کہ وہ ہوگا۔ اور جیسا میں نے عرض کیا ہے اس سے پیشتر تو شاید یہ ایمان ایسے ہی رکھنا پڑتا' ہمارے اس دور میں آپ حیران ہونگے کہ خود یہ جو محققین ہیں' ان کی تحقیق یہ ہے کہ کم از کم Survival after death (بقا بعد از موت) کے اوپر تو وہ پہنچ چکے ہیں کہ اس Physical (طبعی) زندگی کے بعد' جسے ہم موت کہتے ہیں' پھر ایک حیات کا امکان موجود ہے۔ اور اب تو بات اس سے آگے بھی بڑھ گئی ہے۔ یہ Immortality (غیر فانیت) تک پہنچ رہے ہیں۔ میں نے دو الفاظ استعمال کیے ہیں۔ Survival (بقا) تو یہ ہے کہ کسی طرح اس کے بعد حیات کے امکان ہیں اور Immortality (غیر فانیت) حیاتِ جاوید ہے' جسے قرآن کہتا ہے کہ پھر یہ زندگی آگے چلے گی۔ ہمارے زمانے میں لوگ یہاں تک پہنچ چکے ہیں۔ بہر حال یہ بنیادی چیز ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ ہے کاہے کے لیے؟ کیا یہ محض ایک Academic' ایک نظری سا سوال ہے کہ صاحب! کیا مرنے کے بعد زندگی ہے؟ یا اس کا کچھ ہماری زندگی سے تعلق بھی ہے' اس کا کوئی عملی مفہوم بھی ہے؟

حیاتِ آخرت پر ایمان اور خدا کا قانونِ مکافاتِ عمل

قرآن تو کوئی چیز بھی ایسی نہیں دیتا جس کا تعلق ہماری زندگی سے نہ ہو یا جس کا کوئی عملی مفہوم نہ ہو۔ اس کا بڑا گہرا بنیادی عملی مفہوم ہے اور میں کہہ رہا ہوں کہ جو سارا نظام تمدن ہے' اس کی بنیاد اس چیز کے اوپر ہے۔ آپ کو قانونِ مکافاتِ عمل کا تو اب علم ہوگا' برسوں سے ہم اس لفظ کو دہراتے چلے آتے ہیں کہ انسان کا ہر عمل ایک نتیجہ مرتب کرتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ہمارا مشاہدہ یہ ہے کہ یہاں ظالم ظلم کیے چلا جا رہا ہے' ستم گر ستم روا رکھے چلا جا رہا ہے' کبھی شاید ہی ایسا ہوتا ہے کہ یہاں اس کی گرفت ہو جائے مواخذہ ہو جائے اور وہ پکڑا جائے' ورنہ وہ دندناتا ہوا زندگی بسر کرتا ہے' موجیں مارتا ہوا مر جاتا ہے۔ Materialistic Concept (مادی تصور) کے معنی یہ ہیں کہ زندگی یہی ہے مر گئے تو ختم ہوا قصہ۔ اس کا فطری نتیجہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص' کوئی گروپ' کوئی جماعت' کوئی گروہ' کوئی قوم' ایسا انتظام کر لے کہ ان کی بدعنوانیوں کے اوپر کوئی مواخذہ نہ کر سکے' فرد بھی ایسا انتظام کر سکتا ہے' ہزار طریقے ہیں' ایک قوم بھی ایسا انتظام کر سکتی ہے'

کیا کرلے گی سیکورٹی کونسل اس کا؟ وہ اسرائیل کہہ دیتا ہے کہ ہم تمہاری Resolution (قرارداد) نہیں مانتے' معاملہ ختم ہوا۔ یہاں جو گرفتار نہیں ہوتا' اس کا کوئی کیا کرلیتا ہے۔ اس چیز کو اپنے ہاں ہم روز روتے ہیں کہ صاحب! ظلم وزیادتی ہوتی ہے' کوئی پوچھتا نہیں ہے یہی اس کی مصیبت ہے۔ یہ کیا ہے؟ یہ اس نظریۂ زندگی کا فطری نتیجہ ہے کہ زندگی یہی طبعی زندگی ہے' اسے اچھی طرح سے گزارنے کی کوئی تدبیر کرلی جائے تو اس کے بعد راوی عیش لکھتا ہے لیکن قرآن کی رو سے حیاتِ آخرت بنیاد ہے' وہ یہ کہ جسے تم نے یہ سمجھ لیا ہے کہ یہ جو زندگی ہے' ختم ہوئی اور مرگیا' معاملہ ختم ہوا' تم نے یہی سمجھ لیا جیسے پاکستان میں یہ سب چوریاں ڈکیتیاں کرکے سرحد پار ہوگئے' اب کرلو کیا کرتے ہو۔

وہ کہتا ہے کہ یہ بات نہیں ہے۔ زندگی اس موت کے ساتھ ختم نہیں ہوتی' تمہاری زندگی آگے چلے گی' تم ہوگے' یہاں کی ساری زندگی کے اثاثات ہونگے بلکہ وہ تو یَتَعَارَفُوْنَ بَیْنَھُمْ (10:45) کہتا ہے۔ وہاں موجود ہونگے ہم آپ سب ہونگے' پہچانتے ہونگے۔ تمام وہ ذرائع حتیٰ کہ وہ کہتا ہے کہ دل میں گزرنے والے خیالات اور نگاہوں کی خیانتیں' جن کے اوپر یہاں کوئی گرفت نہیں کرسکا تھا' ساری کی ساری مشہود ہوکر سامنے آئیں گی' اور تمام اس کے جو نتائج ہیں' تمہیں بھگتنے پڑیں گے۔ آپ نے دیکھا کہ اس ایمان کا عملی نتیجہ کیا ہے۔ عزیزانِ من! آپ لمبی چوڑی وعظیں چھوڑ دیجیے' اس ایک حیاتِ آخرت کے عقیدے پر جسے ایمان کہتے ہیں' قرآن کی رو سے ایمان لے آیئے۔ یہ یقین ہو اس بات کا کہ میرا ہر عمل نتیجہ پیدا کرکے رہے گا' یہاں اگر کسی طرح سے مواخذہ نہیں ہوسکا تو اس کے بعد بھی میں سرحد پار کرکے کسی دوسری مملکت میں جانہیں سکتا۔ قرآن نے سورۃ الرحمٰن میں یہ کہا ہوا ہے کہ ان سے کہو کہ تم ہمارے مواخذے سے بچنا چاہتے ہو' عجیب انداز سے کہا ہے کہ سَنَفْرُغُ لَکُمْ (55:31) میں اب ادھر سے فارغ ہوکر تمہارے پیچھے آیا اور کہا یہ ہے کہ جاؤ تو تم اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (55:33) سے کہیں آگے نکل جاؤ' نکلو تو سہی۔ یہاں سے نکلنے کے لیے ہمارے پروانۂ راہداری کی ضرورت ہوگی اور وہ تو ہم نے دیا ہوا ہے نہیں' اب نکل کر بتاؤ تو سہی۔ کائنات کی سرحد سے کہیں باہر نکل جاؤ گے تو پھر تو ہماری گرفت سے بچ جاؤ گے اور وہاں سے آگے تو تم جا ہی نہیں سکتے۔ کتنی Graphical (گرافیائی) ایک چیز کہی گئی ہے کہ ایمان یہ ہے کہ ہم اس کے مواخذے کی حد سے آگے نہیں نکل سکتے' ایمان یہ ہے کہ ہم دل میں گزرنے والے خیال تک کے مواخذے سے نہیں بچ سکتے۔

حیات بالآخرت پر ایمان کا نتیجہ زندگی کے ہر شعبہ میں سکون بھی ہے اور راحت بھی

یہ ہے' عزیزانِ من! حیاتِ آخرت پر ایمان کے معنی۔ آپ سوچتے ہیں کہ اگر آج انسانوں کا اس کے اوپر ایمان ہوجائے تو یہ

معاشرہ کیا ہو جائے گا! اس تمدنی زندگی میں اگر کسی مملکت میں، کسی ملک میں، ملک کے کسی خطے میں یہ ایسی کیفیت ہو کہ وہاں ہر شخص اس کا یقین رکھے کہ میں جو کچھ کرونگا، اس کا مواخذہ ہوگا، مجھے اس کی سزا بھگتنی پڑے گی، آپ دیکھیے کہ وہاں کتنا امن ہو جاتا ہے۔ لاقانونیت تو پھیلتی ہی، اس وقت ہے جب یہ یقین اٹھ جاتا ہے کہ میری ضرور گرفت ہوگی۔ جب یہ خیال عام ہو جائے کہ نہیں صاحب! کرو، بچ نکلنے کے ہزار طریقے ہیں، پھر وہ کچھ ہوتا ہے جو ہو رہا ہے اور یہ تو اسی زندگی کی بات ہے۔ اگر یہ ایمان ہو جائے کہ سوال اس زندگی کا اور اُس زندگی کا نہیں ہے، 'زندگی جوئے رواں است و رواں خواہد بود' یہ تو مسلسل چلنے والی بات ہے، میرے ہر عمل کا، دل میں گزرنے والے خیالات تک کا، مواخذہ ہوگا اور اس کا حساب ہوگا تو آپ دیکھتے ہیں پھر زندگی کیا بنتی ہے۔

آخرت کے مفہوم کی وسعت

یہ تو پہلی چیز ہے۔ آخرت، اس مرنے کے بعد کی زندگی ہے لیکن آخرت کے یہی معنی نہیں ہیں۔ آخرت تو ہر سانس میں ہوتی ہے۔ اس کے معنی مستقبل ہیں، اسکے معنی Future ہیں۔ ذرا ترجمہ کیجیے، یہ وہ لوگ ہیں جو صرف اپنے حال کی سرفرازیوں پر ہی یقین نہیں رکھتے، Future (مستقبل) کے متعلق بھی ان کو بڑا ایمان ہے کہ وہ بھی شاندار ہونا چاہیے۔ کونسا Future (مستقبل)؟ صرف مرنے کے بعد کا نہیں، میرے ہر سانس کے بعد دوسرا آنے والا سانس آخرت ہے، عمر کے ہر دن کے بعد دوسرا آنے والا دن مستقبل کا ہے، ہر جنریشن کے بعد، ہر نسل کے بعد اگلی نسل جو آ رہی ہے، وہ مستقبل کی ہے، انسانیت کے ہر دور میں اگلا دور جو آ رہا ہے، وہ مستقبل ہے، ہر نظام کے بعد نیا نظام جو آ رہا ہے وہ آخرت اور مستقبل ہے اور انسان کی اس زندگی کے بعد کی جو زندگی ہے، وہ بھی مستقبل ہے۔ آخرت کے سارے معنی یاد رکھیے۔ اسی لیے قرآنِ کریم اس لفظ کو **عاجلہ** (17:18) کے مقابلے میں **اَلْاٰخِرَۃَ** (17:19) لایا ہے، یہ بڑی چیز ہے۔ **عاجلہ** کے معنی ہیں ''پیش پا افتادہ (Immediate) بات، جھٹ سے جو سامنے آ جائے۔ آپ کو پتہ ہے قوموں کا عروج و زوال کس بات پہ منحصر ہے؟ جو قومیں یہ چاہتی ہیں کہ اب تو آرام سے گزرتی ہے عاقبت کی خبر خدا جانے، یعنی وہ صرف اپنا خیال رکھے، اپنے آنے والی نسل کا خیال نہ رکھے، قوم کے Future (مستقبل) کا خیال نہ رکھے، انسانیت کے مستقبل کا خیال نہ رکھے، وہ چار دن عیش تو کر جائے گی لیکن اس کے بعد اسی قوم کا جو انجام ہوگا، آپ سوچتے ہیں کہ وہ کیا انجام ہو سکتا ہے۔ یہ جو پیش پا افتادہ مفاد، قریبی مفاد ہے 'اس کو قرآن نے **الدنیا** کہا ہے۔ دنیا کے معنی ہی قریبی، پیش پا افتادہ ہیں اور **الْعَاجِلَۃَ** کا لفظ اس کے لیے استعمال کیا ہے۔ (17:18) میں کہا گیا ہے کہ یہ لوگ ہیں، جو صرف عاجلہ پر نگاہ رکھتے ہیں، Future (مستقبل) کا ان کو کوئی خیال نہیں ہوتا، ان کی کوئی Long range policy (طویل مدت کی پالیسی) نہیں ہوتی۔ کسی کاروباری سے ذرا پوچھیے کہ وہ صرف Incoming (آنے والی) آمدن کا

حساب رکھے، شام کو جو آمدنی آئے اسے اپنا منافع سمجھے اور کھاتا چلا جائے، پھر دیکھیے کہ اس کے کاروبار کا حشر کیا ہوتا ہے۔ آپ کو پتہ ہے کہ کتنا لمبا سوچنا پڑتا ہے۔ کسی قوم کی، کسی فرد کی، جتنی نگاہ دوررس ہوگی، برادرانِ عزیز! اتنا ہی زیادہ زندگی میں اس کا حصہ ہوگا یعنی جتنا وہ آخرت بیں ہوگا، اتنا ہی بہتر ہوگا۔ اس کے معنی مرنے کے بعد کی آخرت ہی نہیں ہے، یہاں کے Future (مستقبل) کا سوچنے والا کے بھی ہیں، جو باپ اپنی زندگی عیش میں گزارتا ہے، بچوں کے مستقبل کا خیال نہیں رکھتا آپ سوچتے ہیں کہ اسے کیا کہتے ہیں۔ جماعتِ مومنین کو تو یہ کہا گیا تھا کہ وَ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ (2:4) اسے تو سب سے زیادہ مستقبل کی فکر کرنے والی قوم ہونا چاہیے تھا۔

قرآنِ حکیم کی روشنی میں اخروی زندگی کا تصور

اس آخرت کے معنی ہم نے مرنے کے بعد کی آخرت تصور کر لیا اور اس کے متعلق یہ سارا کچھ لے گئے کہ وہاں مواخذہ ہوگا اور سب کچھ ہو جانے کے بعد ہم نے ایک شفاعت کا مسئلہ اپنے ذہن میں رکھ لیا کہ سب کچھ ہوگا، جہنم میں بھی جائیں گے، رسول اللہ ﷺ چھڑا لیں گے، جنت میں پہنچ جائیں گے۔۔ چلیے صاحب! قصہ ختم ہوا۔ عزیزانِ من! آخرت، مستقبل بینی کا نام ہے۔ قرآنِ کریم میں انسانوں کی تین Categories (شقیں) بتائی ہیں۔ ایک شق تو یہ ہے کہ كَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ . وَتَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ (75:20-21) یہ وہ لوگ ہیں، جو کچھ پیش پا افتادہ، جلدی سے سامنے آنے والی، Immediate Gain (مفادِ عاجلہ) اس کا ترجمہ ہے، وہ صرف اس پہ نگاہ رکھتے ہیں، مستقبل کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ یہ جو نظریہ ہے، اسے سیکولر کہتے ہیں یعنی دنیا کی اسی زندگی کو زندگی سمجھنا، اسی کے مفادات کو مقصود سمجھنا۔ یہ تو مادہ پرستوں کا نظریۂ زندگی ہے۔ دوسرا نظریہ مذہب پرستوں کا ہے یعنی اس دنیا میں تو یہ سب غریبی، محتاجی، احتیاج، فقر، بھوکے مرنا، ننگے رہنا، یہ سارا بسر کرنا صاحب! خدا کے مقرب بندوں کی یہ نشانیاں ہیں، اس سے ان کی عاقبت سنورتی ہے۔ مذہبی تصورِ حیات یعنی Theocratic Concept of Life قرآن کی رو سے یہ تصور بھی باطل ہے۔ یاد رکھیے! قرآن کی رو سے جسے آپ مادیت (Materialism) کہتے ہیں یا Materialistic Concept of Life (مادی تصورِ حیات) کہتے ہیں، یہ بھی باطل ہے۔ مذہب کا یہ جو Theocratic Concept ہے، یہ بھی اسی طرح سے باطل ہے یاد رکھیے! تیسرا Concept (تصور) یہ ہے کہ اس دنیا کے اندر جو عاجلہ (مفادات) ہیں، یہ بھی سارے کے سارے حاصل ہوں اور اس کے ساتھ مستقبل بھی سنورتا چلا جائے، اسے دین کہتے ہیں۔ قرآن اس دین کو لے کر آیا تھا۔ اس نے پہلا Concept (تصور) رکھنے والوں کے متعلق واضح طور پر کہہ دیا کہ فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا وَ مَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ (2:200) یہ ان کا سارا یہی ہوتا ہے کہ سب کچھ ہمیں مل جائے جو کچھ ہے۔ مستقبل میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ الدُّنْيَا کے معنی Immediate Gain ہیں، یہ پیش پا افتادہ، قریبی

مفاد حاصل کرنا ہے، وہ ذرا دور تک، مستقبل کے لیے، نگاہ نہیں رکھتا۔ قرآنِ کریم کہتا ہے کہ جو یہ کرے گا، اس کا مستقبل میں کوئی حصہ نہیں ہو سکتا۔

قرآن حکیم زندگی کو دو حصوں میں تقسیم نہیں کرتا

دوسرا تصور جو تھا کہ میاں! یہاں کی جو زندگی ہے، وہ بے شک ذلت اور خواری کی زندگی ہو، یہاں کوئی حصہ نہ ملے، کوئی بات نہیں ہے۔ قرآنِ کریم یہ کہہ رہا ہے کہ اس زندگی کی ذلت وخواری بھی خدا کا عذاب ہے یاد رکھیے! یہاں اس چیز کو، بڑے حسین انداز میں کہا ہے کہ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَ تَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ (2:85)۔ یہاں Context (سیاقِ عبارت) تو کچھ اور ہے، مفہوم اس کا یہی ہے کہ اس ضابطۂ قانون کے ایک حصے پر ایمان رکھتے ہیں اور دوسرے حصے کو نظر انداز کرتے ہیں۔ میں کہتا ہوں یہ معنی بھی ہیں کہ یہ حصہ جو اس کا اس دنیا سے متعلق ہے، اس سے انکار کرتے ہو حالانکہ اس نے تو قارون سے بھی یہ کہا تھا کہ وَ لَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا (28:77) اس دنیا میں جو تمہارا حصہ ہے اس کو فراموش مت کرو۔ وہ کہتا ہے کہ یہ جو لوگ ہیں، یہ کتاب کے اس حصے کے اوپر تو یقین رکھتے ہیں، جس کا تعلق آخرت سے ہے، اس دنیا سے متعلق جو چیزیں ہیں اس پہ ایمان نہیں رکھتے یعنی دو حصے کر دیئے۔ آپ کے ہاں جب ثنویت (Dualism) آئی تو دین ختم ہوا۔ یہ چیز تو ہو سکتی ہے کہ دنیا کے اس حصے کے متعلق انکار کیا، آخرت کے متعلق ایمان رکھا۔ بات صاف سی نظر آتی ہے۔ اپنے ذہن سے فیصلہ نہ کیجیے، قرآن سے سنیے۔ کہتا ہے کہ یہ جو کہنے والے ہیں کہ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ (2:85) جو یہ تصور رکھتا ہے اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (2:85) اس دنیا کی زندگی میں بھی ذلت وخواری اس کے حصے میں آتی ہے، یہ ہے وہ مذہب پرست طبقہ جو صرف عاقبت سنوارنے کی فکر میں رہتا ہے۔ یہاں تو ان کی ذلت وخواری ہم سب کے سامنے ہوتی ہے، یہ الگ بات ہے کہ یہ اب اس کا نام تقرب رکھ لیں۔ یہ بھی ہوتی ہے اور اگلی بات سننے کی ہے کہ وَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ (2:85) قیامت کے دن یہ بدترین، شدید ترین عذاب کی طرف گھسیٹے جائیں گے۔ عزیزانِ من! جس کا عاجلہ (Immediate) نہیں سنورتا اس کا مستقبل کیا سنورے گا۔ جس کسان کے بیج میں سے کونپل نہیں پھوٹے گی، وہ فصل کیا کاٹے گا۔ وہ فصل تو اسی کونپل کے ہی ارتقائی نشوونما کا آخری نتیجہ ہے۔ قرآن تو یہ کہتا ہے۔ آپ کو یاد ہے کہ کہا تھا کہ وَمَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى (17:72) یہاں کا اندھا وہاں کا بھی اندھا ہی ہوگا۔ اور پھر اس سے بھی زیادہ واضح الفاظ میں کہا تھا تاکہ دو معنی ہی نہ ہو سکیں۔ کہا کہ وَّ نَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى (20:124) جو ہمارے قوانین سے اعراض برتتا ہے اس دنیا میں اس کی روزی تنگ ہو جاتی ہے۔ پہلی چیز تو یہ ہوگئی۔ جس کی روزی یہاں تنگ ہوگی تو

وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى (20:124) قیامت کے دن بھی وہ اندھا ہی اٹھایا جاتا ہے۔

کفر بھی اگر خالص ہو تو وہ بھی ایک نتیجہ رکھتا ہے

Materialistic World (مادی دنیا) کا' وہ جو تصور تھا کہ وہ اس پہ نگاہ ہی نہیں رکھتے تھے' اتنا سا نظام تھا' اس کے اندر Dualism (ثنویت) نہیں تھی۔ عجیب بات ہے' عزیزانِ من! جو میں کہہ رہا ہوں کہ کفرِ خالص بھی اپنا نتیجہ رکھتا ہے خواہ وہ عاجلہ ہی کیوں نہ ہو۔ یہ جو بین بین چلنے والی صورت ہے کہ یہ جو حصہ ہے' اس کے اندر تو ذلت اور خواریاں ہوں اور عاقبت سنور رہی ہے۔ قرآن یہ کہہ رہا ہے' عزیزانِ من! کہ یاد رکھو! معیار یہ دیکھنا ہو کہ عاقبت کس قوم کی سنور رہی ہے' دیکھو یہ کہ اس دنیا کے اندر اس کی کیفیت کیا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ جس کی یہ دنیا سنوری ہوئی ہے' عاقبت بھی سنوری ہوئی ہو کیونکہ اس کے کفر کا نتیجہ تو دنیا کا سنورنا ہے۔ وہ تو نہیں ہے لیکن جس کی یہ دنیا خراب ہے' اس کی عاقبت کبھی سنوری ہوئی نہیں ہو سکتی۔ قرآن نے یہ کہا ہے۔ یہ دوسرا تصور تھا اور اب دین کا تیسرا تصورِ حیات' عزیزانِ من! ہمارے سامنے آتا ہے اور دیکھیے وہ کتنا حسین تصور ہے' اتنا حسین جتنا حسین خود ہمارا دین ہے۔ یہ کہا ہے کہ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ (2:201) اور ان میں سے وہ بھی ہیں جو یہ آرزوئیں رکھتے ہیں کہ اے ہمارے نشوونما دینے والے! اٰتِنَا فِى الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّ فِى الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً (2:201). ہماری یہ دنیا بھی حسین ہو' ہماری عاقبت بھی حسین ہو۔ کہتا ہے کہ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّمَّا كَسَبُوْا (2:202) یہ وہ لوگ ہیں' جن کی کمائیوں کے اس طرح سے بدلے ان کو ملیں گے کہ یہ دنیا بھی حسین ہوگی' وہ دنیا بھی حسین ہوگی۔ ہمارے ہاں لفظِ ثواب ہے' وہ تو خیر جب لفظ آئے گا تو میں عرض کرونگا کہ اس اصطلاح کے کیا معنی ہیں لیکن ثواب کے متعلق تو ہمیں ذہن میں ایسا ہی ہے کہ یہ آخرت میں جا کر ملتا ہے۔ وہ بنک میں ایک اکاونٹ ہوا کرتا ہے کہ وہ جلدی نہیں ملا کرتا' کسی خاص Date (تاریخ) کے بعد جا کر ملا کرتا ہے' ثواب کا تصور تو وہی ہمارے ہاں ذہن میں ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ وَ ثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَ انْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ○ فَاٰتٰـهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَ حُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ (3:147-48) یہ وہ لوگ ہیں' جن کے اعمال کا ثواب (ثواب کے معنی بدلہ ہوتا ہے' یہ اس کا عملی نتیجہ ہوتا ہے) اس دنیا میں بھی ان کو ملتا ہے' آخرت میں بھی ملتا ہے۔ قرآنِ کریم تو عزیزانِ من! ان آیات سے بھرا پڑا ہے جن میں یہ کہا گیا ہے کہ دین کا نتیجہ یہ ہے کہ اس دنیا کی زندگی کے اندر بھی ان کو سرفرازیاں اور خوشگواریاں ملتی ہیں اور اسی کے تسلسل میں یہی خوشگواریاں آگے چلی جاتی ہیں جنہیں آپ عاقبت سنورنا کہتے ہیں۔ وَقِيْلَ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا مَاذَآ اَنْزَلَ رَبُّكُمْ (16:30) یہ جو ایمان لائے ہیں' ان سے پوچھا جاتا ہے کہ تمہارے خدا نے تمہارے اوپر کیا نازل کیا ہے۔ یہ بہت Common (مشترک) سوال ہے' جواب ایک لفظ میں ہے کہ قَالُوْا خَيْرًا (16:30)۔ کیا بات ہے' ایک

لفظ کی! کیا عرض کروں کتنا جامع لفظ ہے! رزق کی کشائشوں سے لے کر اختیارات کی وسعتوں تک' سب چیز اس میں آ جاتی ہے۔ کہا ہے کہ خدا نے ہمارے لیے یہ بھیجا ہے لیکن یہ تو قرآن ہے' یہ تو یونہی ایک لفظ لکھ کر چھوڑ نہیں دیتا کہ پھر اس کے بعد پتہ ہے کہ اس کی تفسیریں بلکہ تاویلیں بھی ہونگی۔ یہ خود ہی واضح کرتا ہے کہ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ ؕ (16:30) جو لوگ حسن کارانہ انداز سے' اس قرآن کے مطابق' زندگی بسر کریں گے اس دنیا کے اندر ان کی زندگی حسین ہو جائے گی۔ یہ ہمارے خدا نے نازل کیا ہے' جس کے متعلق کہا ہے کہ وَ لَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ (16:30) اور جس کی یہ زندگی حسین ہوگی آخرت کا گھر بھی اس کا خیر کا ہوگا۔ وَ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ (2:4) یہ وہ لوگ ہیں' جو صرف Immediate Gain (پیش پا افتادہ مفاد) کے اوپر نگاہیں نہیں رکھتے' مستقبل کا بھی وہ فکر کرتے ہیں۔ یہ ہیں متقی جن کے لیے یہ کتاب ہدایت دے رہی ہے' راہنمائی دے رہی ہے۔ دیکھ رہے ہیں آپ کہ یہ کتاب کس طرح سے ہدایت دے رہی ہے۔ کہا ہے کہ وَ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ (2:4) پہلے تو ایمان ہی کہا تھا' یہاں کہا ہے کہ ان کو یقین ہوتا ہے۔ اور یقین کے معنی ہوتا ہے علم و تحقیق کے بعد کسی چیز کا پایۂ ثبوت تک پہنچ جانا۔ کہا ہے کہ یہ آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔ آپ نے سوچا کہ وہ جو ایمان بالغیب کا تصور تھا کہ یونہی بغیر سوچے سمجھے ہوئے مان لینا ہے' بلکہ غیب کے ہی نہیں' ایمان کے بھی معنی یہی تھے۔ آپ دیکھیے کہ یہ یقین کہا جا رہا ہے۔

قرآنی آیات پر یقین محکم حاصل کرنے کا انحصار کائناتی مشاہدات پر ہے

میں اگر اس ایک لفظ یقین کے اوپر ہی آ جاؤں تو آپ دیکھیے گا کتنے درس اس تصور کے لیے چاہئیں کہ یقین کسے کہتے ہیں' یہ کیسے حاصل ہوتا ہے؟ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ایک آدھ آیت ہی اپنے سامنے رکھ لیجیے کہ یقین کیسے ہوتا ہے۔ ایمانِ ابراہیمؑ کا تو آپ کو علم ہے۔ دیکھیے جو یقین ہے' وہ کیسے حاصل ہوتا ہے۔ کہا ہے کہ وَ كَذٰلِكَ نُرِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (6:75) ہم نے ابراہیمؑ کو اس کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں یہ جتنا کچھ بھی اس کارگہ کائنات کے اندر ہو رہا ہے ہم نے اس کی چیزوں کو اس کے سامنے لا کر بتایا۔ دیکھ رہے ہیں' عزیزانِ من! ہمارے نزدیک تو نبی یا تو کوئی گدڑی پوش فقیر سا ہوتا ہے' زیادہ سے زیادہ واعظ سا ہوتا ہے۔ نبی کی کیفیت یہ ہے کہ یقین پیدا کرنے کے لیے' اس فطرتی زندگی' اس کارگہ کائنات کے جو ملکوت ہیں' ان کو اس کے سامنے دکھایا گیا' اس کو ان چیزوں کے متعلق بتایا گیا۔ یہ سب کچھ کاہے کے لیے کیا؟ وَ لِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ (6:75) تاکہ اسے یقین آ جائے۔ یقین تو اس طرح سے حاصل ہوتا ہے۔

قرآن حکیم میں علماء کا لفظ سائنٹسٹ کے لیے استعمال ہوا ہے تا کہ تم تفکر سے کام لو

اس محسوس کارگہ کائنات کی ہر چیز کس انداز سے قانون کے تابع چل رہی ہے؟ اس کے اوپر غور وفکر سے' مشاہدہ سے' مطالعہ سے' تجربے سے' یقین حاصل ہوتا ہے۔ اور آپ کو معلوم ہے' میں نے قرآنِ کریم میں بتایا تھا کہ علماء کا یہ لفظ ایک جگہ آیا ہے' وہ آیا ہی سائنٹسٹ کے لیے ہے۔ یہ یقین ہے۔ یقین ایک نبی کو مشاہداتِ فطرت کی رو سے دلایا جا رہا ہے۔ بہرحال میں یہ کہہ رہا تھا کہ **وَ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ** (2:4)۔ اور یہ تو میں نے عرض کیا تھا کہ آخرت کی زندگی جیسی چیز جس کے متعلق بہرحال کہا جائے گا کہ صاحب! اس کا تو غور وفکر سے کوئی تعلق نہیں ہوسکتا۔ یہ تو اس سے کچھ ماوراسی چیز ہے' اس پہ کیا غور وفکر ہوگا۔ عزیزانِ من! میں نے پہلے بھی یہ آیت عرض کی تھی' پھر سن لیجیے گا۔ کہا ہے کہ **كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ** (2:219) اس طرح سے خدا اپنی ان علامات وقوانین اور اصولوں کو نمایاں طور پر تمہارے سامنے لاتا ہے **لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ** (2:219) تا کہ تم غور وفکر سے کام لو۔ کس میں غور وفکر سے کام لو؟ کہا ہے کہ **فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ** (2:220) دنیا اور آخرت میں غور وفکر سے کام لو۔ وہ تو آپ کو تفکر فی الآخرت کہہ رہا ہے' وہ تو آخرت پر بھی یوں ایمان لانے کو نہیں کہہ رہا' تفکر کے بعد جو آپ مانیں گے وہ ہے جو یقین کے درجے میں آجائے گا **وَ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ** (2:4) کہا ہے۔ اور یہ چیز پیدا ہوتی ہے۔

ایمان کو یقین کے درجے تک لے جانے کے لیے نظامِ قدرت کے درخشندہ نتائج کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا ہوتا ہے

جب کسی نظام پر' جو نظری طور پر دیا جائے' عمل کرتے ہیں تو اس عمل کرنے سے جو اس کے محسوس نتائج سامنے آتے ہیں' عزیزانِ من! وہ انسان میں یقین پیدا کر دیتے ہیں' وہ **يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ** (2:3) ہے۔ اس عقیدے کو لے کر چلے تھے' اس ایمان کو لے کر چلے تھے کہ اس نظام کے درخشندہ نتائج ضرور ہمارے سامنے آئیں گے۔ اس کے بعد یہ نتائج سامنے آتے ہیں تو یہ ایمان یقین کے اندر بدل جاتا ہے۔ کہا ہے کہ تم نے کہا تھا کہ **اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ** (1:5) ایک زندگی کے متوازن سیدھے راستے کی طرف ہماری راہنمائی کر دے۔ کہا ہے کہ یہ راہنمائی اس کتاب کے اندر ہے۔ یہ ان لوگوں کو ملے گی جو **هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ** (2:2) جو زندگی کی خطرناک گھاٹیوں سے بچ کر چلنا چاہیں گے۔ اس کے بعد ان کے متعلق بتایا کہ **يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ** (2:3)۔ ایمان لانے والے ہیں **بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَ مَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ج وَ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ** (2:4) پر۔ یہ ساری چیزیں' عزیزانِ من! دیکھتے ہیں کہ ایک پروگرام کی مختلف کڑیاں ہیں۔ کہا ہے کہ **اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى**

مِّنۡ رَّبِّهِمۡ ق (2:5) یہ ہیں' وہ جو اس ہدایت کے اوپر ہیں۔ دن میں چالیس مرتبہ نماز کے وقت میں اِهۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِيۡمَ (1:5) دہرا لینا ہے۔ اس سے یہ کام نہیں چلتا۔ یہ تو ایک آرزو کے اظہار کا نام ہے اور یہ بڑا ضروری ہے کہ شدتِ آرزو بار بار آپ کے لب پہ آئے لیکن محض شدتِ آرزو سے تو کام نہیں چلتا۔ اس سے کیا ہوتا ہے؟

غمِ آرزو کا حسرت سبب اور کیا بتاؤں
مری ہمتوں کی پستی میرے شوق کی بلندی

آرزو کے ساتھ اگر شوقِ عمل کی بلندی پیدا ہو جائے تو نتائج سامنے آ کھڑے ہوتے ہیں

بات ساری یہ ہے کہ یہ آرزوئیں جو اس طرح سے دعا بن کر لب پہ آتی ہیں' اس کے بعد شوق عمل کی بلندیاں ہوں تو منزلِ مقصود مل جاتی ہے۔ اب تو وہ آرزوئیں بھی دعا بن کر نہیں آ رہی ہیں' کچھ Mechanical (میکانکی) الفاظ ہیں' جو دہرائے جا رہے ہیں' برادرانِ عزیز! لیکن میں کہتا ہوں اگر یہ فی الواقعہ شدتِ آرزو کا اظہار بھی ہو جائے' شوق کی بلندیاں ہوں مگر حوصلے کی پستیاں ہوں پھر تو آرزوئیں غم میں بدلتی ہیں۔ اس کے بعد کیا ہوتا ہے؟ اس عالم کی صورت نہ پوچھیے۔ اُولٰٓئِکَ عَلٰی هُدًی مِّنۡ رَّبِّهِمۡ (2:5) یہ لوگ ہیں جن کو کہنے کا حق حاصل ہے کہ ہم زندگی کی متوازن راہ پہ چلتے ہیں۔ اور وَاُولٰٓئِکَ هُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ (2:5) یہ ہیں' جن کی کھیتیاں پروان چڑھتی ہیں۔ جنہوں نے زراعت کے قوانین کی محکمیّت پر یقینِ کامل رکھتے ہوئے وہ تھوڑا سا اثاثہ جو ان کے گھر میں دانے کی شکل میں رکھا ہوا تھا' اپنے آپ کو اس سے محروم کیا' اپنے بچوں کو بھی اس سے محروم کیا' جا کر اس کو مٹی میں ملا آئے' پھر اس کے بعد اس یقینِ محکم سے مسلسل محنت کرتے چلے گئے' کہ اس میں سے کونپلیں پھوٹیں پھر وہ نشوونما پائیں۔ یہ ہیں جن کی کھیتیاں پروان چڑھتی ہیں۔

عزیزانِ من! ہم پانچویں آیت پوری کر چکے' چھٹی آیت سے آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا ط اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِيۡعُ الۡعَلِيۡمُ

❀......❀......❀

پانچواں باب: سورۃ البقرۃ (1)، (آیت 6)

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ
اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ۝۶

عزیزانِ من! آج جون 1968ء کی 23 تاریخ ہے اور ہم اپنے درسِ قرآنِ کریم کے سلسلۂ نو میں سورۃ البقرۃ کی ابتدائی آیات میں ہیں۔ آج چھٹی آیت ہمارے سامنے آ رہی ہے: (2:6)۔

ہمارے ہاں کے غلط تراجم کی صورتِ حال کے باعث نوجوان نسل کی ذہنی پریشانی کی کیفیت

آیت ہے کہ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ - خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَ عَلٰى سَمْعِهِمْ وَ عَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ وَّ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ (2:6-7)۔ قرآنِ کریم کے پڑھنے کا جو ہمارا قدیم انداز چلا آ رہا ہے اور جو ہمارے ہاں ترجمے مروج ہیں' ان کی رو سے آپ دیکھیں کہ سورۃ البقرۃ کی ان ابتدائی پانچ چھ آیات میں ہی انسان اتنا الجھاؤ میں پڑتا ہے کہ بات سمجھ میں نہیں آتی۔ اتنا ہی نہیں کہ سمجھ میں نہیں آتی بلکہ ایک اور کشمکش شروع ہو جاتی ہے۔ یعنی پہلے یہ کہا کہ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ (2:2)۔ میں ان تراجم کی رو سے اور اس مفہوم کی رو سے عرض کر رہا ہوں جو عام طور پر ہمارے ہاں چلا آ رہا ہے اور جس کی وجہ سے ہمارے نئے طبقے کو جو ذرا سوچ سمجھ کر قرآن پڑھنا چاہتا ہے بجا طور پر ایک شکایت پیدا ہوتی تھی۔ یہاں تو وہ یہ کہتا تھا کہ یہ ہدایت ہے متقیوں کے لیے' وہ کہتا یہ ہے کہ جو پہلے ہی متقی ہیں ان کو ہدایت کی ضرورت کیا ہے۔ اس مرحلے سے ہم آگے بڑھ چکے ہیں' یہ بات آ گئی ہے۔ میں نے یہ عرض کر دیا تھا کہ یہ جو ہمارے ہاں مفہوم مروج تھا' وہ صحیح نہیں ہے۔ اس نے کہا یہ ہے کہ یہ زندگی کی منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لیے ایک متوازن اور سیدھے راستے کی طرف ان لوگوں کی راہنمائی کرتا ہے جو راستے کی خطرناک گھاٹیوں سے بچ کر محفوظ منزل تک پہنچنا چاہیں۔ وہ بات صاف ہو گئی کہ راہنمائی کی ضرورت ہی اسے ہوتی ہے جو آمادہ بہ سفر ہو' جو کسی جگہ

بہ سفر ہو جو کسی جگہ پہنچنا چاہتا ہو اور بہ حفاظت پہنچنا چاہتا ہو لیکن اس پرانے ترجمے اور پرانے مفہوم کی رو سے پہلا الجھاؤ یہ پیدا ہوتا تھا کہ جو متقی ہیں ان کو ہدایت کی کیا ضرورت ہے۔

اور یہاں سے جب وہ دو قدم آگے چلتا تھا تو اگلی آیت یہ سامنے آتی تھی کہ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَ اَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ (2:6) وہ جو کافر ہیں ان کے لیے برابر ہے' چاہے تُو ان کو اس سے آگاہ کرے یا نہ آگاہ کرے' وہ تو ایمان لائیں گے نہیں۔ ہدایت ہے ان کے لیے جو پہلے ہی متقی ہیں' جو کافر ہیں ان کے لیے برابر ہے چاہے تُو انہیں ڈرائے یا نہ ڈرائے' وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ آپ سوچ رہے ہیں کہ جب تک قرآن کو محض ثواب کی خاطر پڑھا جائے' اس وقت تک تو یہ ٹھیک ہے لیکن ذرا سوچنے کے لیے جو کوئی رکا' اس کے سامنے یہ کشمکش آتی ہے کہ پھر یہ کتاب ہے کیا؟ جو Already (پہلے ہی) متقی ہیں' ان کے لیے ہدایت ہے' جو کافر ہیں ان کے لیے برابر ہے کہ انہیں ڈراؤ یا نہ ڈراؤ وہ تو ایمان لائیں گے نہیں۔ پھر اگلا سوال یہ پیدا ہوگا کہ صاحب! وہ کیوں ایمان نہیں لائیں گے؟ کیوں ان کے لیے برابر ہے چاہے تُو ان کو آگاہ کرے یا نہ آگاہ کرے اس لیے کہ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَ عَلٰى سَمْعِهِمْ وَ عَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ (2:7) اللہ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہوئی ہے' ان کے کانوں میں ڈاٹ لگا دی ہے' ان کی آنکھوں پہ پردے ڈال دیئے ہیں۔ چل بھئی! معاملہ ختم ہوا۔ یہ کتابِ عظیم آئی ہے نوعِ انسانی کے لیے صحیح راستہ دکھانے کو اور اس کی یہ کیفیت ہے' جو Already (پہلے سے) متقی ہیں ان کے لیے ہدایت ہے اور جو کافر ہیں ان کے لیے برابر ہے کہ تُو انہیں ڈرائے یا نہ ڈرائے' یہ ایمان ہی نہیں لائیں گے۔ کیوں نہیں لائیں گے؟ کیونکہ خدا نے ان کے دلوں پہ مہر کر دی۔ بہت اچھا! خدا نے ان کے دلوں پر مہر کر دی' کانوں میں ڈاٹ لگا دیئے' آنکھوں پہ پردے ڈال دیئے تا کہ وہ اس کتاب سے کوئی رہنمائی ہی حاصل نہ کر سکیں۔ خیر! انہوں نے کہا کہ چلو ستے چھوٹے۔ اور اس کے آگے ہے کہ وَّ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ (2:7) ان کے لیے ہم بڑا سخت عذاب دیں گے۔

آپ نے غور فرمایا' برادرانِ عزیز! یہ جو ہماری نئی جنریشن کو قرآنِ کریم کے سمجھنے کے سلسلے میں الجھاؤ پیدا ہو رہے تھے' ان کی نوعیت کیا تھی؟ ان کا جواب ماتھے پہ شکن اور لاحول کی گالی نہیں تھا' وہ سمجھنا چاہتے تھے' انہیں سمجھانے کی ضرورت تھی۔ اور بات بڑی صاف ہے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ میں نے جہاں یہ کہا تھا کہ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ (2:3) تو میں نے یہ کہا تھا کہ ہمارے ہاں یہ جو تصور ہے کہ مسلمانوں کے گھر میں ہم پیدا ہو گئے' تو ہم مسلمان ہو گئے' عربی زبان میں اسے مومن کہیے تو مومن ہو گئے۔ یہ غلط تصور ہے۔ یہاں فعل کا صیغہ استعمال ہوا ہے' اور مقامات میں بھی یہی چیز آئے گی۔ فعل (Verb) کے معنی ہوتے ہیں ''کچھ کرنا''' یعنی یہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ مثلاً مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہو گیا تو وہ مومن یا مسلمان ہو گئے۔ یہ بالکل نہیں ہے۔ کہا ہے کہ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ یا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا یعنی یہ وہ لوگ ہیں جو یہ کرتے ہیں۔ ایمان ایسی چیز ہے جسے کچھ کر کے عملاً حاصل کیا جاتا ہے۔ یہ میں نے پوری تفصیل سے سمجھایا تھا کہ

پیدائش کے اعتبار سے کوئی بچہ مومن یا مسلم نہیں ہوتا' اسے مومن بننا پڑتا ہے' اسے کچھ کرنا پڑتا ہے جس کے بعد پھر وہ کہہ سکتا ہے کہ اب میں ایمان لے آیا۔ کوئی بچہ پیدائش کے اعتبار سے بی اے نہیں ہوتا' اسے Graduate (گریجوایٹ) ہونے کے لیے کچھ کرنا پڑتا ہے۔ کچھ کرنے کے بعد پھر وہ اس لسٹ میں آتا ہے جسے آپ Graduate (گریجوایٹ) کہتے ہیں۔ مثال کے طور پہ میں نے کہا ہے یہ چیزیں حاصل کرنے کی ہیں' کچھ کرنا ہوتا ہے' اسی لیے وہاں یہ فعل (Verb) کا استعمال ہوا ہے۔ جس طرح سے کوئی بچہ' عزیزانِ من! پیدائش کے اعتبار سے مسلمان یا مومن نہیں ہوتا' اسی طرح کوئی بچہ پیدائش کے اعتبار سے کافر بھی نہیں ہوتا۔ جس طرح وہاں فعل (Verb) استعمال ہوا ہے' یہاں بھی فعل (Verb) استعمال ہے۔ کہا ہے کہ اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا (2:6) یہ بھی کچھ کرنا ہے۔ جو یہ کچھ کرے گا' اسے آپ کافر کہیں گے۔ کافر کے معنی کفر کرنے والا کے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ بات سمجھ میں آ گئی ہوگی۔ ہمارے ہاں تو یہ ہے کہ ہم مسلمانوں کے گھر میں مسلمان پیدا ہوئے اور جو ہمارے گھروں میں پیدا نہیں ہوا وہ کافر۔ یہ بنیادی تصور ہی غلط ہے۔ پیدائش کے اعتبار سے صرف انسان پیدا ہوتا ہے' اس کے بعد اسے خود کچھ بننا ہوتا ہے۔ اگر وہ اس طرح سے مومن نہیں بنتا تو وہ مومن نہیں ہوتا اور اسی طرح سے آگے جو بات آئے گی وہ یہ ہے کہ اگر وہ کافر نہیں بنتا تو کافر نہیں ہوتا۔

لفظ کفر کا قرآنی مفہوم

بات ذرا مشکل سی ہے' میرا خیال ہے کہ شاید یہ پہلی دفعہ سامنے آئی ہے لیکن ابھی آسان ہو جائے گی۔ قرآن کی کوئی بات مشکل نہیں ہوتی' ہمارے لیے نئی ضرور ہوتی ہے۔ ''کفر'' کا مادہ ''ک ف ر'' ہے۔ اس کے بنیادی معنی ''چھپانے اور ڈھانپنے'' کے ہیں۔ یہ تو کچھ کیا جاتا ہے' کچھ چھپایا جاتا ہے' کچھ ڈھانپا جاتا ہے۔ قرآنِ کریم کے مقامات میں یہ کفر اور ایمان بنیادی چیزیں ہیں۔ اگر ان کی بھی تفصیل' اور تفسیر قرآن خود نہیں دے گا' تو اور کن چیزوں کی دے گا۔ سارے قرآن میں یہی تشریح بھری پڑی ہے کہ ایمان لانا کسے کہتے ہیں' کفر کرنا کسے کہتے ہیں۔ ملخص ان کا یہ ہے کہ حق ٹھوس سچائیوں کو کہتے ہیں۔ جو ٹھوس سچائیوں کو پسِ پردہ رکھنے والے ہیں' جو ابدی حقائق کو پوشیدہ رکھنے والے ہیں' جو انہیں ڈھانپنے والے ہیں' وہ کافر کہلاتے ہیں۔

کفر اور شکر کے قرآنی معانی

آپ آگے چل کر دیکھیں گے کہ ہمارے نزدیک تو صرف خدا کا جو انکار ہے' وہی کفر ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ انسان کا اپنی ذات کا انکار اس سے بھی زیادہ کفر ہے۔ انسان کا اپنی صلاحیتوں کو دبائے ہوئے رکھنا یا دوسروں کی صلاحیتوں کو ابھرنے نہ دینا' ان کو نشو ونما پانے نہ دینا' ان کو دبائے رکھنا' ان کو چھپائے رکھنا' اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار نہ آنے دینا' اور دوسروں کی صلاحیتوں کو چھپائے رکھنا' نشو ونما نہ

ہونے دینا کفر ہے۔ یہ لفظ شکر کے مقابلے میں بھی قرآن میں آیا ہے۔ ہمارے ہاں بھی کفرانِ نعمت' شکر کے مقابل میں کہتے ہیں۔ جب بھی میں شکر پہ آؤنگا تو وہاں تفصیلاً عرض کرونگا کہ شکر کے معنی کیا ہوتے ہیں۔ یہ ہے ''کسی چیز کا لبالب بھر جانا' اُبھر کر نکھر کر سامنے آجانا''۔ کفر کے معنی ہوتا ہے اس طرح سے نہ ہونے دینا۔ یہ تمام نعمتیں جو خدا نے نوعِ انسانی کی نشوونما کے لیے دی ہیں اس کے لیے وہ کہتا ہے کہ ان کو ابھار کر سامنے لاؤ' ہر ایک کو بھرپور طور پر دو۔ یہ شکر ہے اور ان کو چھپا چھپا کر رکھنا' پوشیدہ رکھنا' سامنے نہ آنے دینا' تاکہ دوسروں کی نشوونما نہ ہوسکے' کفر ہے۔ یہ شکر کے مقابلے میں ہے۔ تو گویا کفر ہے ٹھوس سچائیوں کو پوشیدہ رکھنا۔ میں لفظ ٹھوس پہ اس لیے زور دے رہا ہوں کہ عربی زبان میں حق کے لیے ضروری ہے کہ Reality (حقیقت) یا Truth (صداقت) ایک ٹھوس نتیجے کی شکل میں سامنے آئے۔ ایک Abstract Truth (غیر محسوس سچ) جو محض ذہنوں کے اندر ہوتا ہے اس کو وہاں حق نہیں کہا جاتا۔ وہ حق کی ایک ایسی شکل ہوتی ہے جو عالمِ امر سے متعلق ہوتی ہے۔ ہمارے لیے الحق یا حق وہ شے ہے جو زندگی کے تقاضوں کے اوپر پوری طرح سے فٹ آجائے اور ٹھوس نتائج کی شکل میں Reality (حقیقت) یا Truth (صداقت) سامنے آجائے وہ الحق ہوتا ہے۔ اس حق کو چھپائے رکھنا' جو یہ ابدی حقائق ہیں انہیں پوشیدہ رکھنا' اپنی یا دوسروں کی صلاحیتوں کو بروئے کار نہ آنے دینا' سامانِ نشوونما کو ڈھانپ کر پوشیدہ رکھنا' یہ ساری چیزیں کفر کے اندر آتی ہیں۔ بنیادی طور پر اس کے معنی یہ ہیں۔ اب **کفو** کے معنی ہونگے ''یہ کچھ کرنا''۔ اب آگے چلیے۔ قرآن یہ کہتا ہے کہ جو لوگ یہ کچھ کرتے ہیں' ان کے لیے برابر ہے کہ تُو انہیں زندگی کے آنے والے خطرات سے آگاہ کرے یا نہ کرے۔ یہ کون لوگ ہیں؟ میں نے عرض کیا ہے کہ کفر اور ایمان کی اصطلاحیں' الفاظ' تشریحات تو سارے قرآن میں الحمد سے والناس تک چلی آئیں گی اس لیے کسی ایک نشست میں تو ان کا احاطہ کیا ہی نہیں جاسکتا۔

بہر حال ہم نے اس دفعہ جو درس کا اسلوب اختیار کیا ہے اس میں نصاب (Carriculum) کے طور پر کم از کم اس کی جو مبادیات ہیں انہیں تو سامنے لانا ضروری ہوگا (اور ہم نے انہیں سامنے رکھا ہے)۔ پہلی چیز یہ ہے کہ آپ اسی چیز کو چھپائیں گے جو آپ کے سامنے پہلے آئی ہوگی' وہ آپ کے پاس ہوگی' آپ کو اس کا علم ہوگا۔ اسی لیے قرآنِ کریم کی رو سے کفر یہ ہے کہ ''کسی کے سامنے حقائق لائے جائیں' اس کے سامنے ان چیزوں کو پیش کیا جائے اور اس کے بعد وہ اس چیز کو چھپائے' اس سے انکار کرے''۔ چھپانے کی جہت سے اس کے معنی انکار کے آتے ہیں۔

کفر کے بعد سرکشی کا اِرتکاب ہوتا ہے

میں ایک چیز کہنا بھول گیا۔ ایک شخص ایک چیز کو چھپاتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جب اس سے یہ پوچھا جاتا ہے تو وہ انکار کرتا

ہے۔ اگر وہ اس کے بعد فوراً کہہ دے کہ نہیں! میں نے چھپا کر رکھی ہوئی ہے' تو اس کا وہ چھپانا کیا ہوا۔ اس کا لازمی نتیجہ انکار ہوتا ہے۔ یہ اس کفر کے انکار کے ثانوی معنی ہیں۔ اور پھر جب وہ اس کے اوپر شدت سے کاربند ہوتا ہے' اس کی مخالفت کرتا ہے' روک تھام کرتا ہے' تو پھر اس کے معنی سرکشی کے بھی آجاتے ہیں۔ میں نے یہ کہا ہے کہ کوئی بچہ پیدائشی طور پر نہ کافر ہوتا ہے' نہ مسلمان یا مومن ہوتا ہے۔ اسے اپنی زندگی میں کچھ کرنا پڑتا ہے کہ اس کا کچھ نتیجہ ہوتا ہے' یہ کرنا ہوتا ہے جس کا نتیجہ کفر ہوتا ہے۔ کفر ہوتا ہے حقائق کو چھپانا۔ چھپانے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے حقائق اس کے سامنے آئے ہوئے ہوں۔ جس کے سامنے حقائق آئے ہی نہیں ہیں' اس کے متعلق یہ کہنا کہ اس نے یہ حقائق چھپا لیے ہیں' غلط ہے۔

اب یہ دیکھیے کہ قرآن کہتا ہے کہ اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا وَ صَدُّوۡا عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ وَشَآقُّوا الرَّسُوۡلَ (47:32) وہ لوگ ہیں جنہوں نے کفر کیا' میں یہی لفظ ترجمہ کرتا جاؤں گا' اور لوگوں کو خدا کے راستے کی طرف آنے سے روکا یا روکتے ہیں اور یوں خدا کے اس پیغامبر کی مخالفت کرتے ہیں۔ آگے وہ بات ہے جو میں کہنا چاہتا ہوں کہ مِنۡۢ بَعۡدِ مَا تَبَیَّنَ لَہُمُ الۡہُدٰی (47:32) اس کے بعد جب ان کے سامنے زندگی کا صحیح راستہ ابھر کر آ گیا تھا۔ اب دیکھیے ہدایت کا' زندگی کے صحیح راستے کا' حقائق کا' کسی کے سامنے ابھر کر' نکھر کر' واضح طور پہ آ جانا' اس آجانے کے بعد اگر وہ اس سے انکار کرتا ہے' اس کو چھپاتا ہے' اس کو تسلیم نہیں کرتا ہے تو تبیانِ حقیقت کے بعد یہ کفر ہوا۔ کہا ہے کہ قُلِ الۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّکُمۡ (18:29) ان سے کہہ دو کہ یہ ہے تمہارے رب کی طرف سے الحق۔ کھل کر ان کے سامنے رکھو۔ اور اس کے بعد ہے کہ فَمَنۡ شَآءَ فَلۡیُؤۡمِنۡ وَّ مَنۡ شَآءَ فَلۡیَکۡفُرۡ (18:29) اب جس کا جی چاہے اسے تسلیم کرلے' جس کا جی چاہے اس سے انکار کر دے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ یُـؤۡمِـنۡ بھی کچھ کرنے کا کام ہے' الحق سامنے آئے پھر اسے وہ علیٰ وجہ البصیرت تسلیم کر لے۔ یہ ہے فلیؤمن۔ اس کے برعکس اگر یہ الحق اس طرح سے اس کے سامنے آئے اور وہ اس کو Reject (رد) کر دے تو یہ ہے فَلۡیَکۡفُرۡ۔ دیکھا یہ کام کرنے کا ہے۔ یہ کس وقت کرنے کا ہے؟ کہا ہے کہ قُلِ الۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّکُمۡ (18:29) کہہ دو کہ تمہارے پروردگار کی طرف سے یہ الحق کسی کے سامنے آ جائے (تو پھر یہ کرنے کا کام ہے)۔

واضح حقائق کو تسلیم کرنے اور تسلیم نہ کرنے کی آزادی اور اسکی وجہ جواز

عزیزانِ من! مجھے ان خیالات اور کشمکشوں کا پوری طرح احساس ہے جو اس وقت آپ کے دل میں ابھر رہے ہیں۔ قرآن اس کی طرف آئے گا مگر آپ تھوڑا سا انتظار کیجیے۔ جن کے سامنے الحق آیا ہی نہیں پھر ان کی کیا کیفیت ہوگی؟ یہ قرآن بتاتا ہے۔ لیکن ابھی تو یہ سمجھتے جائیے کہ جب آپ کسی کے سامنے ایک حقیقت پیش کریں گے' اسے سمجھائیں گے' سمجھنے کی صلاحیت اس کے اندر ہوگی' اس کے بعد

اگر وہ اس سے انکار کرتا ہے' اسے چھپاتا ہے' اس کو سامنے نہیں لاتا ہے تو یہ کفر ہے۔ چلیے! جب یہ الحق دلیل و برہان کی رو سے' علم و بصیرت کی رو سے' ان کے سامنے آ جائے تو پھر قرآن کہتا ہے کہ وہ کیا وجوہات ہیں جن کی بنا پر انسان ان چیزوں سے انکار کرتا ہے؟

کفر ضد کی پیدا کردہ چیز ہے' حسد دوسری چیز ہے اور انکار کی وجہ استکبار فی الارض ہے

کہتا ہے کہ **بِئۡسَمَا اشۡتَرَوۡا بِہٖۤ اَنۡفُسَہُمۡ اَنۡ یَّکۡفُرُوۡا بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ بَغۡیًا اَنۡ یُّنَزِّلَ اللّٰہُ مِنۡ فَضۡلِہٖ عَلٰی مَنۡ یَّشَآءُ مِنۡ عِبَادِہٖ** (2:90)۔ پہلی چیز یہ ہے کہ ان اہلِ کتاب کے سامنے یہ حقائق آ گئے۔ اب یہ نہیں ہے' کہ وہ حقائق ایسے تھے جو ان کے نزدیک نا قابلِ تسلیم تھے' محکم دلائل نہیں تھے' وہ علم و بصیرت کی کسوٹی پہ پورے نہیں اترتے تھے۔ کہتا ہے کہ یہ نہیں تھا۔ یہ محض اس ضد کی بنا پر تھا کہ یہ نبی ہمارے گروہ میں سے کیوں نہیں ہے' اسماعیلؑ گروہ میں سے کیوں ہے' اور اسرائیل گروہ میں سے کیوں نہیں ہے۔ یہ کچھ **بغیاً** یعنی ضد کی بنا پر ہے۔ تو پہلی چیز یہ ہے کہ کفر ضد کی بنا پر ہوتا ہے۔ کہا ہے کہ **وَدَّ کَثِیۡرٌ مِّنۡ اَہۡلِ الۡکِتٰبِ لَوۡ یَرُدُّوۡنَکُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ اِیۡمَانِکُمۡ کُفَّارًا ۚۖ حَسَدًا مِّنۡ عِنۡدِ اَنۡفُسِہِمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ مَا تَبَیَّنَ لَہُمُ الۡحَقُّ** (2:109) ان اہلِ کتاب میں سے اکثریت ان لوگوں کی ہے کہ الحق ان کے سامنے آ جاتا ہے اور وہ آتا بھی اس طرح سے واضح ہے کہ **تَبَیَّنَ لَہُمُ الۡحَقُّ** (2:109)۔ یہ چیز واضح طور پر' ابھر کر' نکھر کر' ان کے سامنے آ جاتی ہے پھر بھی وہ اس سے انکار کرتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ کس بنا پر انکار کرتے ہیں؟ کہا ہے کہ **حسدًا** پر۔ حسد ایک دوسری چیز ہے جس کی بنا پر حقائق کو تسلیم نہیں کیا جاتا۔ ضد ایک چیز ہے' حسد دوسری چیز ہے۔

حق کو نہ ماننے کا قرآن نے ایک اور جذبہ بتایا ہے۔ کہا ہے کہ وہ لوگ جو دنیا میں کسی طور سے قوت حاصل کر لیتے ہیں' اقتدارات ان کی مٹھی میں ہوتے ہیں' کسی قسم کی کوئی پوزیشن ان کو میسر ہوتی ہے اور اب اگر الحق ان کے سامنے آئے تو اسے تسلیم کرنے سے وہ بات باقی نہیں رہتی کیونکہ انہوں نے ظلم اور دھاندلی سے وہ چیز حاصل کر رکھی ہوتی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ حقائق سے' کفر کرنے کا یہ ایک جذبہ ہوا کرتا ہے۔ **وَ اَقۡسَمُوۡا بِاللّٰہِ جَہۡدَ اَیۡمَانِہِمۡ لَئِنۡ جَآءَہُمۡ نَذِیۡرٌ لَّیَکُوۡنُنَّ اَہۡدٰی مِنۡ اِحۡدَی الۡاُمَمِ** (35:42) یہ وہ لوگ ہیں جو اس سے پیشتر قسمیں کھایا کرتے تھے کہ اگر ان کی طرف بھی کوئی حقیقت کو بتانے والا' آگاہ کرنے والا آ جائے تو یہ باقی تمام قوموں کے مقابلے میں سب سے زیادہ ہدایت یافتہ ہوں گے مگر **فَلَمَّا جَآءَہُمۡ نَذِیۡرٌ مَّا زَادَہُمۡ اِلَّا نُفُوۡرَا** (35:42) جب ان کے پاس اس قسم کا یہ پیغمبر آیا تو ان کی کیفیت یہ ہو گئی کہ اس سے ان کی نفرت اور بڑھ گئی۔ یہ نفرت کیوں بڑھ گئی؟ اس لیے کہ **اسۡتِکۡبَارًا فِی الۡاَرۡضِ وَ مَکۡرَ السَّیِّیٴِ** (35:43) فریب کاریوں سے یہ جو اقتدارات اور اختیارات حاصل کر لیے تھے' وہ ان سے چھن رہے تھے۔ یہ سمجھتے جائیے تو آپ دیکھیے گا کہ اگلی آیت جسے ختم اللہ کہا گیا ہے خود سمجھ میں آ جائے گی۔ ان کی کیفیت یہ تھی' انہوں نے مکر اور فریب کاریوں سے

یہ چیزیں حاصل کی ہوئی تھیں چونکہ حقیقت وصداقت کو تسلیم کرنے سے' وہ چیز چھنتی تھی' اس لیے اسۡتِكۡبَارًا فِى الۡاَرۡضِ (35:43) کی وجہ سے انہوں نے اس سے انکار کیا۔

کفر کے معنی لالچی ہونا بھی ہے

عزیزانِ من! آپ قرآن کی یہ آیات سنتے جایئے اور ذہن میں دیکھتے جایئے۔ کفر کے معنی محض لالچی ہونا بھی ذہن میں رکھیے۔ کفر کے معنی خدا کی بیان کردہ صداقتوں سے انکار کرنا' ان کو چھپانا' ان کو پوشیدہ رکھنا' ان سے سرکشی برتنا' انہیں تسلیم نہ کرنا' یہ تمام چیزیں بھی ذہن میں رکھیے۔ مسلمان بھی یہ کرے گا' غیر مسلم بھی یہ کرے گا۔ مسلمان کے معنی ہیں ہم۔ جو مومن ہے' جو اس طرح سے ان کے اوپر ایمان لے آیا ہے وہ تو یہ کرے گا ہی نہیں' وہ تو مومن ہی اس وقت کہلائے گا جب اس نے یہ کچھ نہیں کیا۔

اب ادنیٰ ایمان والے کیا کریں؟

اب جو شخص نہ ابھی ایمان لایا ہے' نہ اس نے کفر کیا ہے یا کم از کم جو ایمان نہیں لایا' جس کیٹگری (شق) میں ہم لوگ ہیں' یہ چیزیں ان پہ بھی Apply (منطبق) کریں گے کہ حقائق ان کے سامنے آئیں اور وہ ان کو تسلیم نہ کریں۔ یہ تو ایک ایک سانس میں' عزیزانِ من! فیصلہ کرنے کی چیز ہوگی کہ ایمان لایا ہے یا کفر کیا ہے۔ یہ کوئی مستقل رجسٹر میں نمبر درج کرنے والی بات نہیں ہے۔ قومی اعتبار سے تو ایک شخص مسلمان ہوسکتا ہے اور ایک شخص ہندو ہوسکتا ہے لیکن قرآن جس چیز کا نام حقائق کو تسلیم کرنا یا انکار کرنا کہہ رہا ہے' اس میں یہ تو ہوسکتا ہے کہ اور حقائق کو تسلیم کیا ہو مگر ایک ایسی حقیقت آپ کے سامنے آئے جس سے آپ کے کسی مفاد پہ زد پڑتی ہے' اب اس میں آپ کی یہ کیفیت پیدا ہو جائے کہ آپ اس سے انکار کرتے ہیں تو یہ بھی کفر ہے۔ استکبار کے متعلق دوسری آیت ہے کہ وَاَمَّا الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا قف اَفَلَمۡ تَكُنۡ اٰيٰتِىۡ تُتۡلٰى عَلَيۡكُمۡ فَاسۡتَكۡبَرۡتُمۡ وَكُنۡتُمۡ قَوۡمًا مُّجۡرِمِيۡنَ (45:31) یہ کفر کی چیز ہے کہ جب بھی خدا کے قوانین سامنے لائے جائیں' وہ اس اعتبار سے کہ انہیں استکبار تھا' تکبر تھا' ان کے اندر نخوت تھی' ان کے اندر مے اقتدار کا نشہ تھا جس سے مدہوش ہو رہے تھے' کسی چیز کو خاطر میں نہیں لانا چاہتے تھے' سامنے بات پیش کی' تحت الشعور میں یہ چیز تھی کہ اس سے اپنا یہ سارا نشہ ہرن ہو رہا تھا' یہ اقتدارِ باطل چھن رہا تھا' فریب کاریوں کے پردے اٹھ رہے تھے' اس لیے انہوں نے اس چیز کے ماننے سے انکار کر دیا۔ آپ دیکھتے جایئے کہ کفر کسے کہتے ہیں۔ اب بات سمجھ میں آجائے گی کہ اِنَّ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا سَوَآءٌ عَلَيۡهِمۡ (2:6) کے معنی کیا ہیں۔ دیکھ رہے ہیں آپ! جن کا Attitude (رویہ) اور Mind (ذہن) یہ ہو' جن کا طرزِ زندگی یہ ہو' جن کا انداز یہ ہو کہ حقیقت کے سامنے آجانے سے' محض ضد کی بنا پہ' اسے نہیں ماننا' حسد کی بنا پہ اسے نہیں ماننا' ایک دن نہیں' آپ ساری عمر ان کے ساتھ یہ کچھ کرتے رہیے

سَوَآءٌ عَلَيۡهِمۡ (2:6)ان کے لیے برابر ہے۔ دیکھتے ہیں' عزیزانِ من! قرآن کس طرح سے اپنی تفسیر کرتا چلا جاتا ہے۔ اسۡتِكۡبَارًا فِي الۡاَرۡضِ کی ایک اور کیٹگری (شق) ہمارے سامنے آتی ہے۔

قرآن کسی گوشے کو بھی نظر انداز نہیں کرتا نیز ظاہری طور پر نہ ماننے والوں کی کیٹگری (شق)

عزیزانِ من! قرآن ہے کسی چور کو نہیں چھوڑتا' چوری کے کسی گوشے کو بے نقاب کیے نہیں چھوڑتا۔ کہتا یہ ہے کہ آؤ! تمہیں نہ ماننے والوں کی ایک اور کیٹگری (شق) بتائیں۔ وَجَحَدُوۡا بِهَا وَاسۡتَيۡقَنَتۡهَآ اَنۡفُسُهُمۡ ظُلۡمًا وَّعُلُوًّا (27:14)۔ بات ہو رہی ہے حضرتِ موسیٰؑ کی' وہ دربارِ فرعون میں اپنے دلائل پیش کر رہے ہیں۔ حقائق کلیمی ہیں' یدِ بیضا بھی ہے' جلال بھی ہے' اس کی رو سے ان حقائق کو فرعون' اس کے سارے سرداران اور تمام اہلِ حکومت کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے۔ جو یہ پیش کر رہا ہے' وہ یہ چیز ہے کہ

سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے

کوئی انسان دوسرے انسان کے اوپر حکومت نہیں کر سکتا۔ یہ سارا کچھ دلائل و براہین کی رو سے پیش کر رہا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ وَجَحَدُوۡا بِهَا وہ پیش کر رہا ہے۔ مگر وہ انکار کیے چلے جا رہے ہیں۔ وَجَحَدُوۡا بِهَا (27:14) انکار کیے جا رہے ہیں' نہیں مان رہے ہیں۔ سنیے' عزیزانِ من! قرآن کہتا ہے کہ وَاسۡتَيۡقَنَتۡهَآ اَنۡفُسُهُمۡ (27:14) اندر سے دل مان گیا تھا کہ بات سچی کہہ رہا ہے لیکن اس کے باوجود اس چیز پر اڑے ہوئے ہیں' نہیں مان رہے ہیں اس لیے کہ ظُلۡمًا وَّعُلُوًّا (27:14) دھاندلی سے یہ سب کچھ کرنا چاہتے تھے' دوسروں کو دبانا چاہتے تھے۔ آپ نے یہ کیٹگری (شق) دیکھی ہو گی کہ اندر سے دل مان رہا ہے لیکن پندارِ نفس ہے کہ اس کو اس ماننے پر آنے نہیں دیتا۔ قرآن نے اسے الۡعِزَّةُ بِالۡاِثۡمِ (2:206) کہا ہے۔ ایک Evasive Tendency (حیلہ جویانہ اور گریزانہ رجحان) ہوتی ہے۔ اس سے انسان کے نفس کو ٹھیس لگتی ہے۔ وہ محض اس بنا کے اوپر نہیں مان رہا۔ اور اب آپ سوچیے کہ دل مان رہا ہے کہ بات ٹھیک کہہ رہا ہے' جو محض پندارِ نفس ہے وہ درمیان میں حائل ہو رہا ہے۔ آپ دن بھر دلائل و براہین دیتے چلے جائیے' اس پر کچھ اثر نہیں ہو گا' وہ اپنے آپ کو کچھ نہیں بدلے گا۔ اس نے آپ کے Arguments (دلائل و براہین) سے تو انکار نہیں کیا' یہ بات نہیں ہوئی کہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی' وہ مطمئن نہیں ہوا۔ وہ دل سے مان رہا ہے لیکن ایک خاص Prestige (عزتِ نفس) ہے جو اس چیز کو تسلیم کرنے پہ آمادہ نہیں کر رہی کہ ابھی تو میں کہہ رہا تھا کہ نہیں صاحب! جو کچھ ہم کہتے ہیں بالکل ٹھیک ہے' ابھی میں یہ کیسے کہہ دوں کہ صاحب! ٹھیک ہے' میں غلطی کرتا تھا۔ یہ اس کے لیے مشکل ہے۔

انسانی کیریکٹر کے سامنے سب سے بڑی رکاوٹ اسکا اپنا پندارِ نفس ہوتا ہے

دنیا میں' عزیزانِ من! یہ کہنے کے لیے بہت بڑے کیریکٹر کی ضرورت ہے کہ رَبَّنَا ظَلَمۡنَآ اَنۡفُسَنَا (7:23) ہاں' بارِالٰہا! مجھ

سے غلطی ہوگئی۔ سب سے بڑی روک جو انسان کے راستے میں آتی ہے' یہ False Prestige (جھوٹی عزتِ نفس یا پندارِ نفس) ہے۔ یہ ہے ایک چیز جو قرآن کہتا ہے۔ یہ ذہن میں رکھیے۔ کہا ہے کہ اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا (2:6) جن کی کفر کی یہ کیفیت ہو' سَوَآءٌ عَلَیْهِمْ ءَ اَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ (2:6) تو ان کے ساتھ ٹکر مارے ہے۔ اسی سلسلے میں (7:101) میں اسی کی ذرا سی اور لطیف سی تشریح کی ہے کہ وَ لَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَیِّنٰتِ (7:101) یہ پیغامبر بالکل کھلے ہوئے دلائل لے کر ان کے سامنے آئے تھے۔ فَمَا كَانُوْا لِیُؤْمِنُوْا بِمَا كَذَّبُوْا مِنْ قَبْلُ (7:101) ایک دفعہ جو ''نہ'' کر دی' اب اس کے بعد محض اپنی ضد پہ اڑے ہوئے ہیں۔ پہلے ''نہ'' کر دی تھی تو وہ سوچ سمجھ کر نہیں کی تھی' بس کر دی تھی' اب جو ''نہ'' کر دی ہے' تو اس کے بعد وہ کہتا ہے کہ بالکل نہیں مانیں گے کیونکہ ''باقی کچھ نئیں رہندا ایناں دا اگر من لین تے ❶''۔ کہتا ہے ایک یہ کیٹگری (شق) بھی ہے ان کی' جس کی یہ کیفیت ہو' یہ ذہنیت ہو کہ سَوَآءٌ عَلَیْهِمْ ءَ اَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ (2:6)۔

دل پر مہر اس وقت لگتی ہے جب انسان اپنی غلطی کا اعتراف کرنا چھوڑ دے

یہ جو قرآن نے خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ (2:6) کہا ہے یہ بات تو میں آگے جا کر کہوں گا کیونکہ یہیں وہ آیت اسی کے ساتھ آ گئی ہے وہ آیت پوری نہیں کہ ایک دفعہ یوں کہہ دیا اور اس کے بعد جو جی میں آئے کر لیجیے' اب یہ محض اپنی اس بات کی پت کے لیے ہاں نہیں کرتے۔ کہا ہے کہ كَذٰلِكَ یَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِ الْكٰفِرِیْنَ (7:101) کافروں کے دلوں کے اوپر یوں مہریں لگا کرتی ہیں۔ اس مہر کو کون توڑ سکتا ہے۔ اُس آیت میں یہ تھا کہ اندر سے دل یقین کر رہا ہے کہ ٹھیک کہہ رہے ہیں' محض پندارِ نفس کی خاطر نہیں مان رہے۔ یہاں کہہ رہے ہیں کہ ایک دفعہ جو ''نہ'' نکل گئی ہے' اب اس کے بعد پھر ''ہاں'' پہ آتے ہی نہیں ہیں۔ کہتا ہے کہ یہ مہریں نہیں ہیں تو اور کیا ہے جو لگے گا۔ میں ابھی عرض کروں گا' برادرانِ عزیز! مہروں کی بات بھی۔ ایک اور کیٹگری (شق) ہے کہ عقل و ہوش رکھتے ہیں' لکھے پڑھے بھی ہیں' دیدہ ور ہیں' Intellectuals (دانشور) ہیں' Intelligentsia (روشن خیال طبقہ) ہے' یہ ساری چیزیں موجود ہیں لیکن قرآن کہتا ہے' عجیب انداز ہے! کہ وَ لَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِیْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ (7:179) یہ شہری آبادیاں ہوں یا نامانوس اعراب' ان میں سے تمہیں ایسے نظر آئیں گے جن کے اندازِ زیست یا ذہنیت سے تمہیں پتہ چل جائے گا کہ یہ ہیں ہی جہنمی۔ کتنی کھلی ہوئی ایک بات بتائی ہے! کون ہیں؟ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا یَفْقَهُوْنَ بِهَا (7:179) سینے میں دل تو رکھتے ہیں' اس سے سمجھنے کا کام نہیں لیتے۔ وَ لَهُمْ اَعْیُنٌ لَّا یُبْصِرُوْنَ بِهَا (7:179) ماتھے کے اوپر آنکھیں ہیں' دیکھنے کا کام نہیں لیتے۔ قرآن نے یُبْصِرُوْنَ کہا ہے' برادرانِ عزیز! یَنْظُرُوْنَ نہیں کہا۔ جو Physical Eye Sight (طبعی نظر) ہوتی ہے' اسے نظر کہتے ہیں اور جس سے یہ کام نہیں لے رہے اسے بصر

---

❶ اگر مان لیں تو اُن کا کچھ باقی نہیں رہتا۔

کہتے ہیں۔ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا (7:179) کان رکھتے ہیں لیکن اس سے سننے کا کام نہیں لیتے۔ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ (7:179) ان کی زندگی کی انسانی سطح نہیں ہے حیوانی سطح زندگی ہے بلکہ اس سے بھی بدتر۔ حیوان اپنی جبلت (Instinct) پر تو چلتا ہے' یہ اس پہ بھی نہیں چلتے ہیں۔

خود بینی اور اسلاف پرستی انسان کو عقلی طور پر اندھا کر دیتی ہے

جن کی کیفیت یہ ہو کہ ذرائع علم رکھتے ہیں' سمجھنے سوچنے دیکھنے بھالنے کی صلاحیتیں موجود ہیں لیکن ان کو کام میں ہی نہیں لاتے' اس طرح سے اپنی ذاتی مفاد پرستیوں نے انہیں مدہوش اور اندھا گونگا بہرا بنا رکھا ہے' اس طرف آتے ہی نہیں ہیں۔ اگر ان کے اپنے مطلب کی کوئی بات ہو' تو سنیے! اس کے لیے کتنے کتنے عجیب دلائل لائیں گے' نظر آئے گا کہ ہمارے سامنے افلاطونِ زماں بیٹھا ہوا ہے۔ جونہی کوئی ایسی بات کہیے جس سے ان کے مفاد پہ زد پڑتی ہو تو اب انہوں نے نہ سوچنا' نہ سمجھنا' نہ سننا ہے۔ اس کا تو سوال ہی نہیں ہے۔ کہیے! جن کی ذہنیت یہ ہو' ان کے متعلق کہا جائے گا یا نہیں کہ وہ سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ (2:6) ہیں۔

ایک اور کیٹگری (شِق) بھی ہے۔ صبح سے شام تک آپ بیٹھے دلائل دیتے رہیے' آپ سمجھاتے جائیے قرآنِ کریم کی آیات کی آیات سامنے رکھتے چلے جائیے' سامنے سے کوئی جواب بن نہیں پڑتا' کوئی دلیل نہیں سوجھتی۔ جب پوچھا جائے کہ کیوں بھئی! مانتے کیوں نہیں ہو؟ کہتے ہیں کہ جی! یہ اسلاف کے طریقے کے خلاف جا رہا ہے۔ یعنی نہ اپنی عقل' نہ ہوش' نہ اپنا فیصلہ' نہ دلیل' نہ برہان' نہ حجت' نہ قرآن کی آیت کے مقابلے میں یہ چیز کہ چلو صاحب! اس آیت کی رو سے ہم یہ نہیں مانتے' کوئی سند نہیں ہے' صرف یہ بات ہے کہ یہ اسلاف کے مسلک کے خلاف جاتا ہے صاحب! فرمائیے! ساری عمر آپ انہیں سمجھاتے رہیے جس کے بعد انہوں نے دلیل یہ دینی ہو کہ صاحب! ہمارے ہاں چونکہ یہ ہوتا چلا آ رہا ہے' اس لیے ہم تو اس راستے سے ہٹ نہیں سکتے تو پھر کیا دنیا کی کوئی طاقت انہیں اس پہ لے آئے گی کہ وہ اس چیز کو تسلیم کر لیں۔ یہ ہے سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ (2:6)۔

تقلید کا قرآنی مفہوم

قرآنِ کریم کی آیت ہے کہ وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ (2:170) جب ان سے کہا جاتا ہے بابا! یہ خدا کا نازل کردہ کلام' اس کا ضابطۂ ہدایت' تمہارے سامنے ہے۔ اس کا اتباع کرو' اس کے پیچھے پیچھے چلو۔ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا (2:170) وہ کہتے ہیں کہ نہیں صاحب! ہمارے اسلاف جس راستے پہ چلے جا رہے ہیں' ہم تو انہی کے نقشِ قدم پہ آنکھیں بند کیے ہوئے چلے جائیں گے۔ اسے تقلید کہتے ہیں۔ آپ کو پتہ ہے کہ یہ جو لفظ ہے یہ ''قلد'' سے ہے۔ قلد کہتے ہیں ''آ مجھ دے گل اچ جیہڑا رسہ جیا پایا

ہونداا ے ❶''یعنی یہ حیوان کے گلے میں جو طوق ڈال دیتے ہیں' جس سے پکڑ کر جس کا جی چاہے اسے جدھر کھینچ کر لیتا چلا جائے۔ یہ ہے جسے تقلید کہتے ہیں۔ وہ تو جس نقشِ قدم پہ وہ پہلی بھیڑ چلی تھی' پچھلی بھیڑیں چلتی جا رہی ہیں۔ پوچھیے ان سے کیوں جا رہی ہو؟ وہ کہتی ہے کہ اگلی جو جا رہی ہے۔ اگلی سے یہ پوچھیے تو پھر اس سے تو آگے کچھ ہوتا ہی نہیں ہے' وہ ''میں میں'' کر کے آگے چلی جاتی ہے' بتاتی کچھ نہیں ہے۔ یہ میں نے اپنی طرف سے نہیں کہا۔ قرآن کہتا ہے کہ **اَوَلَوۡ کَانَ اٰبَآؤُہُمۡ لَا یَعۡقِلُوۡنَ شَیۡئًا وَّ لَا یَہۡتَدُوۡنَ** (2:170) خواہ یہی کیفیت کیوں نہ ہو کہ یہ جن کے نقشِ قدم پہ چلنے کے لیے اتنا فخر کر رہے ہیں' نہ وہ خود راہِ ہدایت پہ ہوں اور نہ انہوں نے عقل و فکر سے کام لیا ہو' یونہی کسی راستے پہ چل پڑے ہوں' یہ ان کے پیچھے چلتے جا رہے ہیں۔ سنیئے! برادرانِ عزیز! جو میں نے کہا تھا کہ میں نے یونہی کہہ دیا کہ ''میں میں'' کرتی ہے اور آگے چلی جاتی ہے' کہا ہے کہ **وَ مَثَلُ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا** (2:171)۔ سنیئے! یہاں لفظ **کَفَرُوۡا** آیا ہے۔ یہ لوگ جو اس طرح سے کفر کرتے ہیں' ان کے لیے کہا ہے کہ **کَمَثَلِ الَّذِیۡ یَنۡعِقُ بِمَا لَا یَسۡمَعُ اِلَّا دُعَآءً وَّ نِدَآءً** (2:171) کیفیت یہ ہے' کہ ایک ریوڑ ہے' بھیڑیں ہیں' ایک ان کا چرواہا ہے' چرواہے کی بھی یہ کیفیت ہے کہ وہ کچھ نہیں جانتا سوائے ان آوازوں کے جو اس نے اپنے باپ سے سن رکھی ہیں۔ اس کے لیے تو کہا ہے کہ سوائے ان چند الفاظ کے جو اس نے باپ سے سن رکھے ہیں' اور اُن کے لیے کہا کہ بھیڑیں کچھ نہیں سمجھتیں سوائے چند آوازوں کے جو ان کے کان میں بچپن سے پڑتی جا رہی ہیں۔ وہ یہ الفاظ دہرا رہا ہے' اسے کچھ پتہ نہیں کہ ان کے کیا معنی ہیں ''تتا تتا تتا'' پوچھیے کہ صاحب! اس کے معنی کیا ہوئے یہ کیوں کہتے ہو؟ ''او جی! میرا پیوا یہو کچھ کیندا ہونداسی ❷''۔ سند یہ ہے۔ وہ گدھایوں کیوں چل پڑتا ہے؟ وہ بچپن سے یہ تتا تتا سنتا چلا آ رہا ہے۔ اگر وہ اس کے اوپر اُدھر نہیں چلتا تو اس کے بعد ''عذابِ خداوندی کا ڈنڈا'' اس کی پیٹھ پہ پڑتا ہے' وہ اس کو اُدھر موڑ دیتا ہے۔ کیا کہتا ہے قرآن؟ کہ کیفیت یہ ہے کہ بھیڑوں کا ایک گلہ اس قسم کا اَن پڑھ سا گڈریا' وہ کچھ الفاظ دہراتا ہے' یہ آواز پہ لگے ہوئے ہیں' چلے جا رہے ہیں صاحب! اور دونوں مست چلے جا رہے ہیں کہ بالکل صحیح راستہ ہے' سیدھا جنت میں پہنچ جائے گا۔ کہا ہے کہ **صُمٌّۢ بُکۡمٌ عُمۡیٌ** (2:171) اندھے بہرے گونگے۔ او! اتنے زور سے کیوں؟ کیا ہوا اللہ میاں؟ کیا کر دیا؟ کہا ہے کہ **فَہُمۡ لَا یَعۡقِلُوۡنَ** (2:171) عقل و فکر سے کام نہیں لے رہے۔

عقل و فکر سے کام نہ لینا اذیت کی گہری کھائی میں گرنے کے مترادف ہے

قرآن ہے' برادرانِ عزیز! عقل و فکر سے کام نہ لینا کفر کی بنیادی شرط ہے' اسی سے اس کی ساری کونپلیں پھوٹتی ہیں۔ آپ نے دیکھ لیا

---

❶ یہ جو بھینس کے گلے میں رستہ سا ڈلا ہوا ہوتا ہے۔

❷ جناب! میرا باپ بھی یہی کچھ کہا کرتا تھا۔

پھر یہ کس قسم کا کفر ہے جو ہمارے سامنے آیا ہے۔ کرتے کون ہیں یہ کچھ؟ دنیا کے مفکرین سے پوچھیے' وہ آپ کو بتائیں گے کہ سوچنا بڑا ہی محنت طلب مرحلہ ہے' یہ مذاق نہیں ہے۔ بغیر سوچے ہوئے کرتے چلے جانے میں کچھ محنت ہی نہیں کرنا پڑتی' تقلیداً کچھ کرتے چلے جانے میں کوئی محنت ہی نہیں پڑتی۔ پھر بڑی چیز یہ ہے کہ اس کے اپنے اوپر ذمہ داری نہیں عائد ہوتی۔ جب کہا جائے کہ یہ چیز کیوں کرتے ہو؟ جھٹ انہوں نے کہا کہ یہ اسلاف نے کیا تھا' میں یہی کرتا ہوں۔ بیچ میں سے یہ خود نکل گئے' ذمہ داری ان پہ عائد نہیں ہوتی لیکن جو خود سوچ کر کسی نتیجے پہ پہنچنے کے بعد ایک فیصلہ کرے گا اور اس کے اوپر عمل کرے گا' اس سے جب پوچھا جائے گا تو وہ اپنی Responsibility (ذمہ داری) کو Accept (تسلیم) کرے گا۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ سوچنا' عقل وفکر سے کام لینا' برادرانِ عزیز! بڑا مشکل مرحلہ ہے۔ دیکھیے! قرآن کیا کہتا ہے؟ اگر صورت یہ ہو کہ سوچا سمجھا بھی نہ جائے'' نہ ہنگ لگے نہ پھٹکڑی رنگ آوے چوکھا'' سوچا سمجھا کچھ نہ کیا جائے اور کھانے پینے کو وہ کچھ ملے جو سوچنے سمجھنے والوں کے باپ کے نصیب میں بھی نہ ہو'' فیر راوی عیش لکھدا اے کہ نہیں [1]''۔ جب ان سے یہ کہو کہ یہ بات سوچ سمجھ کر مانو تو **بَلْ قَالُوْٓا اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓی اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓی اٰثٰرِهِمْ مُّهْتَدُوْنَ** (43:22) وہ کہتے ہیں کہ نہیں صاحب! سوچنے سمجھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ آباؤ اجداد ایک راستے پہ چلے آ رہے ہیں' انہی کے اوپر ہم چلتے چلے جا رہے ہیں۔

تقلید پرستی انسان کو صرف مترفین ہی نہیں بناتی بلکہ انسان کو محنت کرنے کی صلاحیتوں سے بھی محروم کر دیتی ہے

قرآن نے کہا ہے کہ **وَكَذٰلِكَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓی اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓی اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ** (43:23)۔ کیا بات ہے صاحب! کہتا ہے کہ یہ آج کی بات نہیں ہے' ہمیشہ یہ ہوتا چلا آ رہا ہے کہ جب بھی کسی نے آ کر ان سے یہ کہا کہ زندگی کا صحیح راستہ یہ نہیں ہے' یہ دوسرا راستہ ہے تو اُنھوں نے یہ کہہ دیا کہ نہیں صاحب! جس راستے پہ ہمارے آباؤ اجداد چلتے آ رہے تھے ہم اسی پہ چلیں گے۔ کہا ہے کہ یہ ایسا کہنے والے کون ہیں؟ کہا کہ یہ وہ ہیں جو تن آسان ہیں' محنت نہیں کرنا چاہتے' مفت کی روٹی کھانا چاہتے ہیں۔ یہاں مترفوھا آیا ہے۔ ان کو مترفین کہتے ہیں۔ یہ وہ ہیں جو دوسروں کی محنت کی کمائی کے اوپر عیش کریں' ورنہ اگر ذرا سوچ سے کام لیا جائے تو آپ دیکھتے ہیں کہ یہ جو مترفین ہیں پہلی ہی دلیل میں ان کی بات ختم ہو جاتی ہے کہ محنت وہ کرے' وہ بیٹھا ہوا اس کی محنت کا ماحصل لے جائے' کوئی دلیل ہے اس کے لیے؟ پہلی سوچ میں دلیل ختم ہو جاتی ہے' برادرانِ عزیز! کہتا ہے کہ یہ مترفین ہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ یہ جو پورا طبقہ ہے یہ آپ کو دلیل دیتا ہے کہ صاحب! یہ اس طرح سے آباؤ اجداد کے راستے کے

---

[1] پھر راوی عیش لکھتا ہے کہ نہیں جی! یہ نہیں ہے۔

اوپر چلے جا رہے ہیں۔ پتہ نہیں اب وہ کتاب ملتی ہے یا نہیں، بچپن میں تو ہم بھی پڑھتے تھے۔''اوس کتاب داناں ہونداسی'' پکی روٹی'' ناں ای دسداسی پیا، پئی! اسی اے کجھ کیوں کرن ڈیے آں❶''۔ کہتا ہے کہ مترفین کی یہ کیفیت ہوتی ہے۔ جن کی یہ کیفیت ہو انہیں پتہ ہے کہ اگر ان دلائل کو تسلیم کیا، اگر ان حقائق کو ہم سامنے لے آئے، تو یہ جو اس طرح سے بغیر محنت مشقت کیے ہوئے، اتنا کچھ ملتا ہے، کھانے کو بہترین ملتا ہے''ناں آکے اوگوڈے چمدے ہیگے❷'' کہتا ہے کہ کہو انہیں کتنی دلیلیں دیتے چلے جاؤ گے، کیوں ٹکریں مار رہے ہو؟ لا یؤمنون ''اے گل تیرے والی ایناں منی نئیں❸ ہیگی''۔ ٹھیک ہے یہ بات جو قرآن نے کہا ہے کہ سَوَآءٌ عَلَيۡهِمۡ ءَاَنۡذَرۡتَهُمۡ اَمۡ لَمۡ تُنۡذِرۡهُمۡ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ (2:6)۔

مترفین کی ایک اور کیٹگری (شِق) یعنی اللہ کی مرضی کہہ کر اپنی ذمہ داری کو دوسروں پر تھوپ دینے والے

ایک اور کیٹگری (شِق) آئی کہ صاحب! تم جو یہ کچھ اس طرح سے کرتے ہو، کیوں ایسا کرتے ہو؟'' کہ جی! مولا دی مرضی ایویں ہیگی، اللہ دا حکم ای ایویں ہیگا❹'' اس کے حکم کے بغیر تو ایک پتہ بھی نہیں ہل سکتا، انسان میں اس چیز کی کیا قدرت ہے کہ وہ خود یہ کچھ کر سکے۔ سوچ رہے ہیں آپ۔ یہاں سے بات آگے چلی کہ امیری غریبی سب اس نے اپنے ہاتھ میں رکھی ہوئی ہے، جسے چاہے وہ لکھ کر دے، جسے چاہے لکھ سے لکھ کر دے، عزت اور ذلت بھی سب اس کی مرضی پہ منحصر ہے، یہ سب تقدیر کے لکھے ہیں، اللہ اگر چاہے تو ہو سکتا ہے کہ ایسا نہ ہو، خدا کی منشا ہی یہ ہے کہ یہ اس طرح سے ہو۔ یہ انتہا ہے، عزیزانِ من! غیر ذمہ دارانہ ذہنی رویے (Irresponsible Attitude of Mind) کی، کہ ساری ذمہ داری دوسرے کے اوپر سونپ دینا۔ بات ساری یہ ہے کہ خود محنت نہ کرنی پڑے۔ راستہ بدلنے کے لیے، سوچنے سمجھنے کے لیے، ایک نئی روش اختیار کرنے کے لیے، بڑی محنت کرنا پڑتی ہے۔ پھر جیسا میں نے عرض کیا ہے، خود فیصلے کرنے کے بعد اس کی ذمہ داری لینی پڑتی ہے۔ یہ جو Mind (ذہن) کا Attitude (رویہ) ہے کہ ذمہ داری لینے سے گھبرا رہا ہے، Escapism (فراریت) ہے، فرار کی راہ اختیار کر رہا ہے، یہ ہے جو کفر ہے۔ جو یہ کہہ دے کہ صاحب! خدا کو ہی ایسا منظور تھا اس لیے یہ میں کر رہا ہوں اسے آپ اس کے بعد اور کیا دلائل دیدیں گے۔ وَقَالُوۡا لَوۡ شَآءَ الرَّحۡمٰنُ مَا عَبَدۡنٰهُمۡ (43:20) ان سے یہ کہو کہ صاحب! یہ جو اس قسم کے آستانوں پہ جا جا کر سجدے کرتے پھرتے ہو، یہ پتھروں اور اینٹوں سے جا کر مرادیں مانگ رہے ہو، وہ مردہ کہ

---

❶ ''پکی روٹی'' ہی اس کتاب کا نام تھا۔ نام ہی بتا رہا ہے کہ ہم یہ کچھ کیوں کر رہے ہیں۔

❷ پھر ساتھ ہی وہ قدم بوسی بھی کرتے ہیں۔

❸ تمہاری یہ بات انہوں نے ماننی ہی نہیں ہے۔

❹ جی! مولا کی یہی مرضی ہے۔ اللہ کا یہی حکم ہے

جسے ابھی ابھی تم نے اپنے ہاتھ سے جہاں جی میں آیا گڑ دیا ہے اس کو زندوں کی دنیا کا مالک اور مختار تصور کر رہے ہو یہ کیوں کر رہے ہو؟ وہ کہتے ہیں کہ صاحب! اگر اللہ کی مشیت میں ایسا نہ ہوتا تو ہم اس طرح سے کیسے کرتے۔ وہ بہت بڑے مقرب بن رہے ہیں کہ ہم تو چل ہی اس کی مرضی کے مطابق رہے ہیں۔

علم کی روشنی سے بے نور آنکھیں

کہا ہے کہ **مَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ** (43:20) ان سے کہو کہ جہالت کی باتیں کر رہے ہو علم کی دنیا سے تم اس کے لیے کوئی سند اور دلیل نہیں لا سکتے۔ **اِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ** (43:20) کیفیت ان کی یہ ہے کہ قیاسات کے اوپر عمارتیں کھڑی کرتے چلے جاتے ہیں۔ ٹھیک ہے یہ منطقی دلائل دیتے چلے جائیں گے اور آپ کو تو معلوم ہے کہ یہ تقدیر کے اس مسئلے کے اوپر جتنے منطقی دلائل ان لوگوں نے فراہم کیے ہیں کسی اور مسئلے پہ ایسا کچھ نہیں آئے گا۔ کمروں کے کمرے بھر جائیں گے اگر اس ایک مسئلے کے اوپر جو کچھ لکھا گیا ہے اسے جمع کر دیا جائے۔ قرآن کہتا ہے کہ **مَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ** (43:20) یہ سارا طومار جس کو یہ علم کہتے ہیں جس کی بنا پر یہ عالم کہلاتے ہیں علم کی بارگاہ سے روشنی کی ایک کرن بھی ان کو نہیں مل سکتی اس پر ساری کی ساری چیزیں قیاس کی ہوتی ہیں یہ چیز مبنی بر قیاس ہے۔

قصہ ابلیس و آدم کی لم ہی یہ ہے کہ اپنی ذمہ داری دوسروں پر ڈال دی جائے

جیسا کہ میں درس میں کئی دفعہ کہہ چکا ہوں قرآن نے تو قصۂ ابلیس و آدم میں بات صاف کر کے رکھ دی ہے۔ سوال ہی یہ ہے کہ اپنی غلط روش کی ذمہ داری انسان خود قبول کرتا ہے یا یہ ذمہ داری اس کے سر ڈالتا ہے۔ یہی تقدیر ہے یہی یہ سارا مسئلہ ہے: لکھے کا قسمت کا نوشتہ خداوندی کا خدا کی مرضی کا۔ آدم سے بھی ایک لغزش ہوئی ابلیس سے بھی ایک معصیت ہوئی۔ آدم سے کہا گیا کہ تُو نے یہ کیوں کیا؟ اس نے کہا کہ **رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا** (7:23) بارِ الٰہا! مجھ سے غلطی ہوئی میں نے اپنے آپ پہ زیادتی کی۔ یہ کہنے کے لیے کتنے بڑے وسعتِ ظرف کی ضرورت ہے لیکن آپ دیکھیے کہ جو یہ تسلیم کرتا ہے اپنی ذمہ داری کو قبول کرتا ہے اس کے لیے بازیابی کا راستہ کھلا ہوا ہے۔ آدم کی توبہ قبول ہو رہی ہے اس کو باز آفرینی کا موقع مل سکتا ہے۔ ابلیس سے پوچھا گیا کہ تُو نے یہ کچھ کیوں کیا؟ کہتا ہے کہ میں کون ہوں یہ کچھ کرنے والا سارا کچھ تیری مشیت کرا رہی ہے میں تو مجبورِ محض تھا۔ اس نے کہا کہ جاؤ! ہمیشہ کے لیے راندۂ درگاہ ہو گئے باز آفرینی کا تمہیں موقع ہی نہیں مل سکتا۔ جو اپنی غلطی کا اعتراف نہیں کرتا ذمہ داری قبول نہیں کرتا ہے وہ اپنی اصلاح کس طرح کر سکتا ہے۔

کیا انسانی زندگی کا مقصد اپنے لیے اور اولاد کے لیے 'عزت کی نوکری' کرتے ہوئے مر جانے میں ہے

قرآن کہتا ہے کہ **سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَ اَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ** (2:6)۔ یہ تقدیر کے عقیدے رکھنے والے ہیں یہ تقلید کو اپنے ہاں کا مسلک بنانے والے ہیں ان کے سامنے ٹکریں مارنے سے کیا حاصل؟ **سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَ اَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ**

لَا یُؤْمِنُوْنَ (2:6)۔کہتا ہے کہ اصل بات یہ ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنی نگاہ صرف دنیاوی مفاد کے اوپر رکھتے ہیں۔اب آیا! قرآن نے دکھتی ہوئی رگ پکڑ لی۔قرآن تو انسان کی زندگی کو اس کے اعمال سے مرتب کرتا ہے۔اس کا ہر عمل اس کی زندگی کی تعمیر کرتا ہے' اس کا آج (Today) اس کے کل (Tomorrow) کی تشکیل کرتا ہے۔اور جو کل (Tomorrow) پہ یقین ہی نہیں رکھتا' جو مستقبل پہ ایمان ہی نہیں رکھتا' جو Future کو مانتا ہی نہیں ہے' جو یہ کہتا ہے کہ آج تو عیش سے گزرتی ہے' اب تو آرام سے گزرتی ہے' اس کے لیے یہ کہنا کہ بھئی! کل کے لیے بھی کچھ سوچو' جو اس کو مانتا ہی نہیں ہے' اس کے لیے سَوَآءٌ عَلَیْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ . وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا (47:12)۔کہا آؤ! تمہیں بتائیں کہ کون ان صداقتوں کے ماننے سے انکار کرتا ہے۔یہ وہ لوگ ہیں جو یَتَمَتَّعُوْنَ وَیَاْكُلُوْنَ كَمَا تَاْكُلُ الْاَنْعَامُ (47:12) زندگی کا مقصد کھانا پینا بچے پیدا کرنا اور بس مرجانا سمجھتے ہیں۔کہا ہے کہ جن کا مقصدِ حیات یہ ہے' وہی جو ہر حیوان کا مقصدِ زندگی ہوتا ہے' ان کے سامنے زندگی کے کارِ نمایاں یہ ہوتے ہیں۔اکبرالہ آبادی (1846-1921ء) کے الفاظ میں:

کیا کہیں احباب کیا کارِ نمایاں کرگئے؟
بی اے کیا' نوکر ہوئے' پنشن ملی اور مر گئے

ان کے کارِ نمایاں ہی یہ ہیں۔کہتے ہیں کہ اللہ کا بڑا فضل ہے جی! نوکری کی' بڑی عزت سے نوکری کی' اللہ نے صاحبِ اولاد کیا' انہیں پروان چڑھایا' سب اپنی اپنی جگہ نوکر ہو چکے ہوئے ہیں۔مجھے اتنا مل سکتا ہے کہ اپنی دال روٹی کا گزارہ کرسکوں' میں تو قدم قدم پہ اللہ کی درگاہ میں سجدے کرتا ہوں کہ صاحب! اس نے اس قسم کی میری زندگی دی۔اب جو اٹھنے بیٹھنے سے ناکارہ ہو چکے ہیں تو بھئی! اب کچھ آخرت کی فکر بھی ہے' اب ہم کچھ اللہ اللہ بھی کرلیتے ہیں ''اوہنں کچھ کرن جوگا نئیں رہیا ہیگا' تے ہور کی کرے گا[1]''۔ان کے ہاں زندگی کا معراج الَّذِیْنَ كَفَرُوْا یَتَمَتَّعُوْنَ وَیَاْكُلُوْنَ كَمَا تَاْكُلُ الْاَنْعَامُ (47:12) ہے۔قرآن ان کا انجام وَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ (47:12) بتاتا ہے۔دیکھنا چاہتے ہو کہ جہنم میں کون ہوتے ہیں' آؤ! تمہیں دکھائیں۔یہ وہ ہے جو Future (مستقبل) میں Believe ہی نہیں کرتا' جو مستقبل پہ یقین ہی نہیں رکھتا' اسے یہ کہنا کہ کل کے لیے بھی کچھ سوچو بےکار ہے۔ یہ محض سَوَآءٌ عَلَیْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ (2:6) ہے۔

آخرت کا انکار اپنے نفس کا' اپنی ذات کا انکار ہے

Future (مستقبل) پہ یقین کے معنی یہ ہیں کہ زندگی یہی طبعی زندگی نہیں' اس کے بعد آگے بھی زندگی چلتی ہے۔طبعی جسم تو یقیناً ہمارے سامنے ختم ہوجاتا ہے۔اب سوال یہ ہے کہ آگے کیا چلتی ہے؟ انسان کے اندر ایک چیز ایسی بھی ہے جو طبعی جسم کے انتشار کے ساتھ ختم نہیں

---

[1] اب تو وہ کچھ کرنے کے قابل ہی نہیں' اب سوائے اس کے اور کیا کرے گا۔

ہوجاتی۔اس کوانسان کی ذات (Human Personality)، نفس، خودی کہتے ہیں، یہ آگے چلتی ہے۔یہ کہہ کہ مستقبل یا آخرت سے انکار کرنے والا، درحقیقت اپنی ذات سے انکار کرتا ہے، اپنی Personality (شخصیت) سے انکار کرتا ہے، اپنے Future (مستقبل) سے انکار کرتا ہے۔عزیزانِ من! قرآن کا نکتہ عجیب ہے۔جب میں نفس کے اوپر آؤنگا تو وہاں عرض کرونگا۔وہ یہ کہتا ہے کہ خدا کے اوپر جو تمہیں ایمان لانے کے لیے کہا جاتا ہے، وہ درحقیقت تمہاری اپنی ذات پر ایمان لانا ہوتا ہے۔جو اپنی ذات سے انکار کردیتا ہے اس کے لیے تو سَوَآءٌ عَلَيۡهِمۡ ءَاَنۡذَرۡتَهُمۡ اَمۡ لَمۡ تُنۡذِرۡهُمۡ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ (2:6) ہے۔کفر تو انسان کا اپنی ذات کے ممکنات سے انکار کا نام ہے۔اسی لیے اس نے کہا تھا جس کی نگاہ بڑی گہری تھی کہ

شاخِ نہالِ سدرۂ خار و خسِ چمن مشو
منکرِ او اگر شدی منکرِ خویشتن مشو

(اقبالؒ: زبورِ عجم)

ارے! اس (خالق) کا انکار کر گیا ہے تو کر جا، اپنا انکار نہ کر۔اس کا انکار کرے گا تو بعد میں اس کا اقرار آجائے گا، اگر تُو نے اپنی ذات سے انکار کردیا پھر کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس کے اوپر تُو اقرار کرے، جس پہ تُو ایمان لے آئے۔ تُو تو سدرہ کے پودے کی شاخ ہے، چمن کا کوڑا کرکٹ نہ بن۔

قرآن حکیم خدا پر ایمان لانے سے پہلے انسان کو اپنی ذات پر ایمان لانے کی ترغیب دیتا ہے

پہلا ایمان انسان کو اپنی ذات پہ لانا پڑتا ہے۔قرآن ایمان باللہ سے پہلے انسان کو اپنی ذات پر ایمان لانا سکھاتا ہے، برادرانِ عزیز! جو اپنی ذات پہ ایمان نہیں لاتا، اسے آخرت کا منکر، Future (مستقبل) کا منکر کہتے ہیں۔ذات پہ ایمان کے معنی ہیں Future (مستقبل) کے اوپر Believe (اعتقاد) کرنا۔اس سے انکار کے معنی یہ ہیں کہ ''اسی طبعی زندگی کو اپنا منتہا اور مقصود سمجھ لینا''۔

کائنات کی تخلیق کا مقصد انسانی اعمال کے ایک ایک ذرے کو انصاف کے ترازو میں تولنا ہے

سنیئے، عزیزانِ من! غور سے سنیئے، قرآن کہتا ہے کہ وَخَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ بِالۡحَقِّ (45:22)۔یہ سلسلۂ کائنات ہم نے الحق پیدا کیا ہے، یہ سوچ ایک Reality (حقیقت) ہے، یہ Plato (افلاطون: 347-428 ق م) کا خواب نہیں ہے، یہ مایہ نہیں ہے، یہ فریب نہیں ہے، اس کو ہم نے بالحق پیدا کیا ہے۔کاہے کے لیے پیدا کیا ہے؟ بالحق کے معنی ہیں ''Purpose (مقصد) کے ساتھ'' پیدا کیا ہے، یہ ٹھوس Reality (حقیقت) ہے، کاہے کے لیے؟ وَلِتُجۡزٰى كُلُّ نَفۡسٍ ۢ بِمَا كَسَبَتۡ وَهُمۡ لَا يُظۡلَمُوۡنَ

(45:22) تا کہ ہر شخص کو اس کے کام کا بدلہ مل جائے اور کسی پہ کوئی زیادتی نہ ہو۔ یہ سارا آسمان و زمین اس لیے گردش میں ہے کہ انسان کا کوئی عمل بلا نتیجہ نہ رہ جائے۔ عزیزانِ من! دیکھ رہے ہیں یہ کتنی عظیم آیت ہے! پوچھا جاتا ہے کہ تخلیقِ کائنات سے مقصد کیا ہے؟ قرآن مجید میں تخلیقِ کائنات کا مقصد یہ بتایا جارہا ہے۔

دنیا بھر میں علم وبصیرت رکھنے والی قوموں کی حالت زار

اس کے مقابلے میں کہا ہے کہ **اَفَرَءَيۡتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰـهَهٗ هَوٰهُ** (45:23) تم نے اس شخص کی حالت پہ بھی غور کیا ہے جس نے اپنے ہی جذبات، اپنی ہی خواہشات، اپنے ہی مفادات، کو اپنا خدا بنالیا۔ زندگی کے Higher Purpose (بلند مقصد) کا سوال ہی نہیں۔ جس نے اپنی خواہشات اور جذبات کو خدا بنالیا، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ **وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلۡمٍ** (45:23) علم وبصیرت رکھنے کے باوجود یہ وہ شخص ہے جو راہِ راست کے اوپر نہیں جاتا، گمراہی پہ جاتا ہے۔ یہ کتنی بڑی بڑی قومیں علم وبصیرت کی بارگاہ میں دیکھیے تو اس کہکشاں سے تارے توڑ لاتی ہیں، زندگی کے حقائق کے متعلق دیکھیے تو آپ دیکھیں گے کہ یہ لوگ کیا کر رہے ہیں۔ ساری دنیا کے علم وفہم اور عقل وبصیرت کی نچوڑ کی قومیں اس پہ چیخ رہی ہیں کہ ویت نام کا جہنم کسی طرح سے ختم ہو، یہ ختم ہونے میں نہیں آرہا[1]۔ کیا ہو رہا ہے؟ یہ کہ **مَنِ اتَّخَذَ اِلٰـهَهٗ هَوٰهُ** (45:23) ہر ایک نے اپنے اپنے مفاد کو اپنا معبود بنا رکھا ہے، علم کے باوجود اندھے ہو رہے ہیں۔ یہ ہے **خَتَمَ عَلٰى سَمۡعِهٖ وَقَلۡبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً** (45:23)۔ یہ بات پھر آگے میں لاؤں گا۔ کہو کہ جو **فَمَنۡ يَّهۡدِيۡهِ مِنۡۢ بَعۡدِ اللّٰهِ** (45:23) اپنے ہاں کی یہ ذہنیت رکھ لے تو پھر کون اس کو ہدایت کا راستہ دکھا سکتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو **وَقَالُوۡا مَا هِىَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنۡيَا نَمُوۡتُ وَنَحۡيَا وَمَا يُهۡلِكُنَاۤ اِلَّا الدَّهۡرُ** (45:24) کہتے یہ ہیں کہ زندگی بس یہی زندگی ہے، اس میں ہم Physical Laws (طبعی قوانین) کے تابع جیتے ہیں، ان کے ماتحت ہم مرجائیں گے۔ یہ جو Passage of Time (وقت کا گزرنا) ہے بس اس کے بعد موت آجاتی ہے۔ پھر قرآن کہتا ہے کہ **وَمَا لَهُمۡ بِذٰلِكَ مِنۡ عِلۡمٍ** (45:24) علم کی بارگاہ سے اگر یہ کبھی جا کر پوچھتے تو وہ اس کی کبھی تائید نہ کرتا جو کچھ یہ کہتے ہیں۔ زندگی یوں ختم ہونے والی چیز نہیں ہے، زندگی کا جو وہیکل (گاڑی) ہے وہ ختم ہو رہا ہے، گاڑی کا یہ ڈبہ اپنی Terminal Stage پہ پہنچا ہے، یہاں آ کر مسافر مر نہیں گیا۔ **اِنۡ هُمۡ اِلَّا يَظُنُّوۡنَ** (45:24) یہ قیاس آرائیاں ہیں، علم نہیں ہے۔ کہتا ہے کہ یہ لوگ ہیں جو کفر کرتے ہیں، عقائد سے انکار کرتے ہیں، سامنے آنے کے بعد اسے چھپاتے ہیں۔ ان کے لیے تو بس **سَوَآءٌ عَلَيۡهِمۡ ءَاَنۡذَرۡتَهُمۡ اَمۡ لَمۡ تُنۡذِرۡهُمۡ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ** (2:6) ہے۔ یہ حقائق آپ دن بھر ان کے سامنے پیش کرتے چلے جائیے، وہ انہیں تسلیم نہیں کریں گے۔

---

[1] یاد رہے کہ یہ بات جون 1968ء کی 23 تاریخ کو کہی گئی تھی۔

کسی چیز کا پوری طرح علم ہوئے بغیر اس سے انکار کفر نہیں کہلاتا

اب میں پھر اسی پہ آتا ہوں کہ کفر وہ کرے گا جس کے سامنے حقائق آجائیں گے، ہدایت آجائے گی۔ یہ ایک چیز ہے، کچھ فیصلہ ہے جو انسان کرتا ہے، یہ کوئی Negative Attitude of Mind (ذہن کا منفی رویہ) نہیں ہے، یہ کچھ نہ کرنے کا نام نہیں ہے، یہ کچھ کرنے کا نتیجہ ہے۔ اور پہلی چیز اس کے لیے یہ ہے، عزیزانِ من! میں نے کہا یہ ہے کہ کفر یہ ہے کہ ان کے سامنے یہ ہدایت آچکی ہو، یہ پیش ہو چکی ہو۔ جن کے سامنے یہ پیش نہیں ہو چکی، ان کی بات میں قرآن کی رو سے ابھی کرتا ہوں۔ پہلی شرط یہ ہے کہ وہ ہدایت آچکی ہو۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ جو جہنم میں جانے والے ہیں، وہ جہنم کے داروغے سے کہیں گے کہ رب سے ذرا پکار کیجیے، ہماری فریاد پہنچا دیجیے، کہ کچھ تو اس عذاب کے اندر تخفیف ہو جائے۔ قَالُوْٓا اَوَ لَمْ تَکُ تَاْتِیْکُمْ رُسُلُکُمْ بِالْبَیِّنٰتِ (40:50) ان سے کہا جائے گا کہ کیا تمہارے پاس ان حقائق کے پہنچانے والے آئے تھے یا نہیں؟ غور فرمایا آپ نے کہ یہ چیز کہی گئی ہے اور اس کے بعد ہے کہ قَالُوْا بَلٰی ط (40:50) وہ کہیں گے کہ ہاں صاحب! ہمارے پاس آئے تھے۔ یعنی یہ ہے وہ چیز۔ اور اس کے بعد اس نے کہا کہ جب یہ صورت تھی تو الُوْا فَادْعُوْا وَمَا دُعٰٓؤُا الْکٰفِرِیْنَ اِلَّا فِیْ ضَلٰلٍ (40:50) وہ کہیں گے کہ پھر اب خدا کو پکارتے پھرو۔ آئے تھے! قَالُوْا بَلٰی ط ہاں آئے تھے۔ آگے چل کر ایک مقام آئے گا، برادرانِ عزیز! میں قرآنِ کریم کی بہت سی آیات اس کی تائید میں لاؤں گا جو قرآن نے کہا ہے کہ وہ پہلے آنے والا آئے، حقائق ان کے سامنے پیش ہوں، ہدایت ان کے سامنے آئے، پھر اس کے بعد اگر وہ یہ جو چیزیں کہی گئی ہیں، وہ یہ کریں اور اس بنا پر ان کا انکار کریں، تو یہ ہیں جن کو آپ کہیں گے کہ اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا (2:6) جنہوں نے کفر کیا ہے۔ دوسرے مقام پہ ہے کہ یٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ اَلَمْ یَاْتِکُمْ رُسُلٌ مِّنْکُمْ یَقُصُّوْنَ عَلَیْکُمْ اٰیٰتِیْ وَ یُنْذِرُوْنَکُمْ لِقَآءَ یَوْمِکُمْ ھٰذَا (6:130) اے معشرِ جن و انس! اے شہری مہذب اور اے دیہی غیر مہذب لوگو! کیا یہ واقع نہیں ہے کہ تمہارے پاس ہمارے پیغامبر آئے، انہوں نے ہمارے قوانین کو تمہارے سامنے پیش کیا، انہوں نے تمہاری غلط روشِ زندگی کے تباہ کن نتائج سے تمہیں آگاہ کیا، تمہیں کہا کہ مکافاتِ عمل برحق ہے، تمہیں بتایا کہ ان اعمال کے یہ نتائج نکل کر رہیں گے۔ کیا ایسا نہیں ہے؟ قَالُوْا شَھِدْنَا عَلٰٓی اَنْفُسِنَا (6:130) وہ کہیں گے کہ ہاں آئے تھے، ہم اپنے خلاف خود گواہی دیتے ہیں۔ ٹھیک ہے وہ یہ کہہ گئے۔

مفادِ عاجلہ کی مفاد پرستیاں انسان کو فریب کاریوں کے جال میں الجھا دیتی ہیں

کہا ہے کہ وَ غَرَّتْھُمُ الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَا وَ شَھِدُوْا عَلٰٓی اَنْفُسِھِمْ (6:130) بات یہ ہوئی کہ یہ جو فریب پرستیوں کے، مفاد پرستیوں کے، دنیاوی مفاد تھے، انہوں نے دھوکے میں رکھا۔ آئے تو تھے، انہوں نے ہمیں دھوکے کے اندر رکھا۔ اَنَّھُمْ کَانُوْا

کٰفِرِیۡنَ (6:131)۔ یہ ہیں وہ لوگ جو یوں کافر ہوئے تھے۔ بات ہوگئی' سامنے آگئی۔ اور آگے تو بات اور واضح ہے۔ کہا ہے کہ ذٰلِکَ اَنۡ لَّمۡ یَکُنۡ رَّبُّکَ مُہۡلِکَ الۡقُرٰی بِظُلۡمٍ وَّ اَہۡلُہَا غٰفِلُوۡنَ (6:131) ہو ہی نہیں سکتا کہ کہیں یہ چیزیں نہ آچکی ہوں' ان کو وارننگ نہ دی ہوئی ہو اور خدا محض دھاندلی اور ظلم سے ہی ان کو تباہ کرتا رہے۔ ہم یہ کچھ نہیں کیا کرتے۔ پہلی چیز یہ ہے۔

قوموں کی موت حیات اور تباہی و سرفرازی کے غیر متبدل اصول

دوسری چیز یہ ہے کہ ان میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہو چکی ہو یعنی وہ اس سطح پہ آ چکے ہوں' ان کی سمجھ سوچ Develop (آشکار) ہو چکی ہو' ان میں شعور پیدا ہو چکا ہو' Self Consciousness (شعورِ خویش) آ چکا ہو' سمجھنے سوچنے کی صلاحیت آ چکی ہو' یہ دوسری شرط ہوگئی۔ کہا ہے کہ وَلَقَدۡ مَكَّنّٰهُمۡ فِيۡمَاۤ اِنۡ مَّكَّنّٰكُمۡ فِيۡهِ (46:26) یہ اقوامِ سابقہ' جن کی تباہیوں کی داستانیں تمہارے سامنے یوں آ رہی ہیں' انہیں بڑا تمکن فی الارض حاصل تھا' بڑا اقتدار حاصل تھا۔ ایسا اقتدار' اے مخاطبین! تمہیں بھی حاصل نہیں ہے۔ وَجَعَلۡنَا لَهُمۡ سَمۡعًا وَّاَبۡصَارًا وَّاَفۡـِٕدَةً (46:26) وہ زندگی کی اس سطح پہ پہنچ چکے تھے جہاں وہ عقل و ہوش سے کام لینا جانتے تھے' علمی صلاحیتیں بیدار ہوگئی تھیں۔ فَمَاۤ اَغۡنٰى عَنۡهُمۡ سَمۡعُهُمۡ وَلَاۤ اَبۡصَارُهُمۡ وَلَاۤ اَفۡـِٕدَتُهُمۡ مِّنۡ شَىۡءٍ اِذۡ كَانُوۡا يَجۡحَدُوۡنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ (46:26) لیکن جب انہوں نے قوانینِ خداوندی سے اس طرح سے انکار کرنا شروع کیا' اس طرح سے اس کی تکذیب شروع کی' اس طرح سے ان کی مخالفت شروع کی' تو ان کے یہ سمع اور فواد اور علم کے ذرائع کچھ کام نہ آسکے۔ یہاں یہ بتایا کہ اس قوم کے اندر یہ اسٹیج آئی ہوئی ہونی چاہیے کہ وہ صاحبِ علم و ہوش ہو' اس کے پاس سمجھنے سوچنے کی صلاحیتیں موجود ہوں۔ دونوں شرطیں ہوں کہ وہ اس سطح پہ پہنچ چکے ہوں اور ان کے سامنے یہ ہدایات آ چکی ہوئی ہوں اس کے بعد اگر وہ ان وجوہات کی بنا پہ' جو قرآن نے گنائی ہیں یا آگے اور گنائے گا ان کے ماننے سے' انہیں صحیح تسلیم کرنے سے' انکار کر دے' ان کو صحیح تسلیم نہ کرے اور چھپا دے' ان کو باہر نہ آنے دے' اس چیز کو اندر رکھے' ان چیزوں کو چھپائے تو یہ ہے وہ' جسے کہا ہے کہ اِنَّ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا (2:6) جو لوگ یہ کرتے ہیں' اس کے بعد ان کے لیے برابر ہے کہ تُو ان کو زندگی کی خطرناک گھاٹیوں سے آگاہ کرے یا نہ کرے' لَا يُؤۡمِنُوۡنَ (2:6) وہ ایمان نہیں لائیں گے۔

قرآنی حقائق سمجھنے کی خاطر سزا اور جزا کا قرآنی تصور سمجھنا نہایت ضروری ہے

اب وہ جو میں نے شروع میں کہا تھا کہ آپ کے دل میں یہ خیال پیدا ہوگا کہ صاحب! ایک قوم ایسی ہے' یہ ہمارے ہاں کے Primitive (قدیم) قبائل ہیں جو بیچارے علم اور ہوش کی سطح پہ آئے ہوئے ہی نہیں ہیں' وہ ابتدائی غاروں کی سی زندگی بسر کر رہے ہیں' وہ تو انسانی زندگی میں ہی نہیں ہیں' وہ تو اس سطح پہ بھی نہیں ہیں' تو اب ان کے لیے تو یہ سمجھنا ہی ممکن نہیں یا کوئی اور آپ لے آئیں گے کہ ایسی قوم ہے تو سہی لیکن ان تک یہ بات ہی نہیں پہنچی' پیغام ہی نہیں پہنچا' تو پھر ان کو یہ سزا کیوں؟ یہ ہے لفظ جس کی وجہ سے آپ کے ذہن میں

کشمکش پیدا ہو رہی ہے۔ یہ لفظ ہے سزا۔ ان کے لیے سزا کا سوال ہی نہیں ہے۔ قرآن کی رو سے جب تک آپ جزا اور سزا کا تصور نہ بدلیں گے' اس وقت تک قرآن کے یہ حقائق آپ کو سمجھ میں ہی نہیں آئیں گے۔ سزا کا تصور یہ ہوتا ہے کہ جو خارج سے کسی کے اوپر کوئی چیز عائد کی جائے۔ ایک شخص کو علم حاصل نہیں ہے' وہ جاہل ہے' نقصانات تو اس کو ہو رہے ہیں' آپ نے اسے یہ سزا نہیں دی' علم کے نہ ہونے کا فطری نتیجہ ہے جو یہ نقصانات کی صورت میں مرتب ہو رہا ہے۔ ذمہ دار کون ہے؟ اس کو چھوڑ دیجیے' اگر یہ خود اس کا ذمہ دار نہیں ہے' آپ یہ کہیے کہ کسی گاؤں میں جہاں مدرسہ نہیں' دور دور تک مدرسہ نہیں' علم وہاں تک گیا ہی نہیں' وہاں کا بچہ پڑھا نہیں' پڑھ سکا نہیں۔ اس کے بعد وہ بڑا ہو گیا' وہ جوان ہو گیا' یہ آپ نے سی ایس پی کے داخلے کی شرط ایم اے یا بی اے رکھ لی' وہ تو اس میں آنے سے محروم رہے گا' نہیں آ سکے گا۔ میں یہ آگے چل کر بتاؤں گا کہ یہاں تو آپ کا معاشرہ ذمہ دار ہے۔ آپ صرف اس فرد کو لیجیے' کیا اس کی حالت پہ رحم کھا کر' یہ کر دیا جائے کہ اس کو ہائی کورٹ کا جج بنا دو؟ میں کسی دیسی ریاست کی بات نہیں کر رہا' میں وہاں کی بات کر رہا ہوں جہاں کوئی قاعدہ قانون مقرر ہوتا ہے۔ ''او چوروں قطب [1] بنان والی عدالتاں دی' گل نئیں کردا پیا [2]''۔ میں پوچھتا یہ ہوں کہ جہاں علم کی' Qualification (ڈگریوں) کی ضرورت ہو' یہ جو جاہل ہے' کیا وہ اس کے لیے آ سکے گا؟ سنیے! یہ سزا نہیں ہے' یہ اس کے عدمِ علم اور اس کی جہالت کا فطری نتیجہ ہے۔ آپ نے اس پہ غور فرمایا۔ قرآنِ کریم کی رو سے یہ جو زندگی آگے چلتی ہے' انسان کی ذات کی نشوونما ہوتی ہے' اس نشوونما کی رو سے جو اس معیار پہ پوری اترتی ہے' انسان کی ذات آگے بڑھتی ہے' جو پوری نہیں ہے وہ رک جاتی ہے۔ اب جو ذاتِ اس پیمانے پہ پوری نہیں اتری ہوئی' اس کے لیے کچھ بھی اسباب کیوں نہ ہوں' پوری نہیں اتری ہوئی' وہ آگے بڑھ ہی نہیں سکتی۔ یہاں نہ Grace Marks (رعائتی نمبروں) کا سوال ہے' نہ رحم کا سوال ہے۔ یہاں تو ایک چیز کا ایک فطری نتیجہ ہے۔

قرآن حکیم کے نزدیک ہر وہ شخص جو انسان کی شکل رکھتا ہوا انسان نہیں ہوتا

پھر ذہن میں یہ بات آئے گی کہ صاحب! پھر ان کا قصور کیا ہے جن تک نہ یہ پہنچا ہے' نہ جن کی نشوونما ہوئی ہے' نہ یہ علمی سطح پہ یا اپنی ذہنی سطح پہ وہاں پہنچے ہیں' یہ Primitive (قدیم) ہیں' ان کا قصور کیا ہے؟ ہم پوچھتے یہ ہیں کہ یہ اُس وقت کہو جب ان کو کوئی سزا دی جا رہی ہو۔ قرآن انہیں جزا اور سزا سے مرفوع القلم سمجھتا ہے۔ یہ انسانوں کی سطح پہ آئے ہوئے نہیں ہیں۔ مغالطہ ہمیں اس لیے لگتا ہے کہ ہمیں ان کی شکلیں انسانوں جیسی نظر آتی ہیں۔

---

[1] (اہلِ تصوف کے ہاں) ''لقب اس ولی کا جس کے قبضۂ قدرت میں کسی ملک کا انتظام عالم معنوی میں خدا کی جانب سے سپرد ہو''۔ (لغات کشوری طبع نول کشور' ص۔366)۔ (یہ معنی اہلِ تصوف کے ہاں لیے جاتے ہیں)۔

[2] ''وہ چوروں کو قطب بنانے والی عدالتوں کی بات نہیں کر رہا۔''

قرآن حکیم کے مطابق انسانوں میں شمار اسی کا ہوگا' جو انسانیت کے معیار پر پورا اترے گا

قرآن کی رو سے انسان کی شکل رکھنے والا انسان نہیں کہلاتا۔ ہر وہ شخص جو انسان کی شکل رکھتا ہو وہ انسان نہیں ہوتا' انسان اس کے اندر ہوتا ہے۔ اس کے اندر اگر وہ انسانیت کی سطح کے اوپر آ گیا ہوا ہے تو اس کا معاملہ انسانوں جیسا ہوگا' اگر وہ اس سطح کے اوپر نہیں آیا ہوا' کسی ذریعے سے بھی جو نہیں آیا ہوگا' اس کا معاملہ انسانوں جیسا نہیں ہوگا۔ اور بھی تو حیوان' اور بھی تو جاندار' دنیا کے اندر پیدا ہوتے ہیں' کروڑوں کی تعداد میں آتے ہیں' کروڑوں کی تعداد میں چلے جاتے ہیں' انہی میں ان کا شمار ہو جائے گا۔ وہ شک یوں پیدا ہوتا' اُس وقت پیدا ہوتا اگر یہ بات ہوتی کہ انہیں اٹھا کر جہنم میں پھینک دیا جاتا۔ ہمارا جو اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا کا تصور تھا کہ جو مسلمانوں کے گھر میں پیدا نہیں ہوئے' وہ کافر ہیں اور جو کافر ہے وہ جہنم میں ہے۔ ٹھیک ہے وہاں سے یہ اعتراض پیدا ہوتا ہے' وہاں یہ شک بھی پیدا ہوتا ہے کہ صاحب! ان کا قصور کیا تھا جس کی سزا دی گئی ہے۔

پیدائشی طور پر نہ کوئی مسلمان ہوتا ہے نہ کافر' قدرت تو صرف آدمی پیدا کرتی ہے' انسان تو اسے خود بننا پڑتا ہے

عزیزانِ من! ان انسان کی شکل رکھنے والوں کے لیے قرآن کی رو سے جزا اور سزا کا سوال نہیں ہے۔ یہاں تو جو کچھ انسان بنا ہوا ہے' اس کے مطابق اس کا مستقبل مرتب ہونا ہے۔ ایک چیز یاد رکھیے! انسان اگر اس سطح پہ پہنچ گیا ہے جسے Self Consciousness (شعورِ خویش) کہتے ہیں' یہ ذرا سا مشکل مسئلہ ہے۔ انسان جسے شعورِ خویش شعورِ ذات کہتے ہیں' اس کی سطح پہ پہنچ گیا ہے اور اس کو عقل اور ہوش آ گئی' اس کو علم اور بصیرت آ گئی ہے تو یہ پہلی شرط پوری ہو گئی۔ اگلی شرط یہ ہے کہ ہدایت کی یہ چیز اس تک بھی پہنچی ہوئی ہو۔

سوال تو ان لوگوں کا ہے جن تک زندگی کے حقائق پہنچ چکے ہیں

آج ہمارے اس دور میں تو جو لوگ علم و بصیرت کی رو سے اس سطح پہ پہنچ چکے ہیں' ان میں سے تو کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا کہ یہ حقائق ان تک نہیں پہنچے۔ آج تو علم کے ذرائع اتنے ہیں کہ یہ تو فضا کے اندر اس طرح سے پھیل رہے ہیں' منتشر ہو رہے ہیں' یہ تو گھر کے کمرے کے اندر بیٹھے ہوئے خود بخود کانوں کے اندر گھستے' آنکھوں کے سامنے آتے چلے جا رہے ہیں۔ اس سطح پہ آیا ہوا انسان کم از کم آج تو یہ نہیں کہہ سکتا کہ میرے سامنے یہ چیزیں نہیں آئیں۔ چھپی ہوئی فارم میں یہ چیزیں ان کے سامنے موجود ہوتی ہیں' دنیا بھر میں یہ چیزیں کہی جاتی ہیں۔ میں پوچھتا ہوں کہ ان کو تو چھوڑ دیجیے کہ ان کے سامنے آئیں یا نہیں' ہمارے سامنے قرآن کی یہ بات آئی ہے یا نہیں۔ اور ہم اس سطح پہ آ چکے ہوئے ہیں یا نہیں کہ جہاں ہم قرآن کو سمجھ سکتے ہیں۔ دونوں شرطیں پوری ہو چکی ہوئی ہیں۔ ہمارے لیے تو کوئی Excuse

(بہانہ) نہیں ہے، ہم اس جہنم کی زندگی کے مستوجب ہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ اس کی یہ ذمہ داری کتنی بڑھ جاتی ہے۔ یہ جو عقل و ہوش کی سطح کے اوپر آنا ہے، یہ ہے تو بڑی لذت انگیز چیز لیکن اس کی قیمت بڑی سخت ادا کرنا پڑتی ہے۔ وہ ستایا ہوا ٹھیک کہہ گیا تھا کہ ''پاگل ہو جا، تیری مصیبت دوسرے بھگتیں''، لیکن یہاں پاگل تو ہوا نہیں جاتا۔

کیا آج پوری ملتِ اسلامیہ اپنی بربادی اور نوعِ انسانی کی تباہ حالی کے بوجھ کی ذمہ دار نہیں؟

سوچیے، عزیزانِ من! عقل و ہوش کی سطح کے اوپر ہم پہنچ چکے ہیں، قرآن کی یہ ہدایات سامنے آچکی ہیں۔ کسی اور کے لیے تو وہاں جا کر شاید کوئی Excuse (بہانے) کی بات نکل ہی آئے، ہمیں کیا ان سے واسطہ، وہ تو کہتا ہے کہ تم اپنے متعلق سوچا کرو کہ کیا تمہارے پاس کوئی ایسا عذر ہے جو وہاں جا کر پیش کر سکو گے؟ کیا کہہ سکو گے کہ ہمارے سامنے قرآن نہیں آیا؟ عزیزانِ من! آپ تو اٹھتے بیٹھتے ساری دنیا کو یہ کہتے ہیں کہ ہم اس کتاب کے وارث ہیں۔ کیا کہہ سکو گے کہ ہم اس سطح کے اوپر نہیں تھے جہاں ہم اس کو سمجھ سکتے؟ پھر اس کے بعد کیفیت یہ ہے کہ اس کے حقائق کو دبایا جاتا ہے، چھپایا جاتا ہے، پوشیدہ رکھا جاتا ہے، انکار کیا جاتا ہے، سرکشی برتی جاتی ہے۔ لوگوں کو چھوڑ دیجیے اپنے متعلق سوچیے، عزیزانِ من! ہماری کوئی گنجائش کسی قسم کی ہے کہ ہم کوئی معذرت پیش کر سکیں؟ ان کے متعلق نہ سوچیے جو اس سطح پہ نہیں آئے، ان کے متعلق نہ سوچیے جن تک یہ نہیں پہنچا۔ خدا کہتا ہے کہ ہم ظالم نہیں ہیں، انہیں سزا نہیں دی جائے گی۔ پہلی چیز ان کے لیے یاد رکھیے! یہ ہے کہ شعور کی اس سطح پہ آچکے ہوئے ہوں، جو حقائق ہیں یہ سامنے آچکے ہوئے ہوں اور اس کے بعد اگر پھر ان سے وہ یوں انکار کریں تو اس کے لیے تو کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ ہمارا اشاراں کے اندر ہے۔

ہمیں اس خود فریبی سے نکلنے کا کب اندازہ ہوگا؟

عزیزانِ من! اس لیے اس الجھن میں نہ پھنسیے کہ ان کا کیا ہوگا؟ یہ سوچیے! کہ ہمارا کیا ہوگا۔ وہ ایک نظری سی بحث رہ جائے گی اور ہم اس لیے اس میں الجھتے ہیں کہ کہیں یہ بات ہمارے سامنے نہ آجائے کہ ہمارا کیا ہوگا۔ یہ آپ دیکھتے ہیں کہ انسان کے اس نفس کی کتنی بڑی فریب کاری ہے، یہ اس کو ان نظری مباحث کے اندر، فلسفیانہ موشگافیوں کے اندر، منطقی نکات آرائیوں کے اندر الجھائے رکھتا ہے۔ ساری طاقت اس میں لگ رہی ہے اور اپنے آپ کو فریب دے رہے ہیں کہ بڑے کارنمایاں کر رہے ہیں، عام حقائق کی چھان بین کر رہے ہیں۔ اس نے کہا ہے کہ کیا اپنے متعلق بھی کبھی سوچ رہے ہو؟ **يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ** (59:18) اوروں کی باتیں نہ کیا کرو، دیکھا یہ کرو کہ تم نے اپنے کل (Future) کے لیے کیا بھیجا ہے۔ اس لیے یہ چیز ہے۔

حدیث رسولؐ تو چودہ سو سال سے ہمیں پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ ''جسکا آج کل جیسا ہی گزرا' وہ تباہ ہو گیا''

عزیزانِ من! کہ شعور کی اس سطح پہ بھی آ چکے ہیں' قرآن کی ہدایات بھی ہمارے سامنے آ چکی ہیں' اس کے باوجود کیفیت یہ ہے کہ ٹس سے مس نہیں ہوتے' کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہو رہی' نہ افراد کے اندر' نہ ملت کے اندر' نہ آپ کے معاشرے کے اندر۔ میں کہتا ہوں کہ اب تو اس معاشرے کے اندر جتنا قرآن قرآن اور اسلام اسلام ہوتا چلا آ رہا ہے اگر آپ ان بیانات کو' ان تحریروں کو' ان کتابوں کو اکٹھا کریں تو ایک طومار کھڑا ہو جائے گا لیکن اس کے بعد اس کا نتیجہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ بھی آپ دیکھ رہے ہیں۔ ہر آنے والی صبح' جانے والی صبح سے بدتر ہوتی ہے۔ یہ کفر کیوں اختیار ہو رہا ہے؟

یہ کہنے سے تو ہمارا بہت جی ڈرتا ہوگا کہ ہم یہ کہیں کہ ہم یہ کفر کیوں اختیار کر رہے ہیں لیکن ہم کیا کریں' قرآن تو یہ کہتا ہے۔ یہ چار پانچ دس چیزیں' جو میں نے آپ کے سامنے پیش کی ہیں کہ جو یہ یہ کرنے والے ہیں ان کے سامنے جب یہ حقائق آتے ہیں' تو کیا وہ ان کو تسلیم کرتے ہیں؟ کیا وہ انہیں مانتے ہیں؟ اور ماننے کے معنی یہ ہیں کہ کیا وہ ان کے مطابق اپنی زندگی کو ڈھالتے ہیں؟ اگر نہیں' تو یہی تو کفر ہے۔ اس لیے عزیزانِ من! جب ذہنیت یہاں تک پہنچ چکی ہو تو سَوَآءٌ عَلَیۡهِمۡ ءَاَنۡذَرۡتَهُمۡ اَمۡ لَمۡ تُنۡذِرۡهُمۡ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ (2:6) ہی ہوتا ہے۔ یہ انذرتھم کیا چیز ہے؟ انذار کس چیز کو کہتے ہیں؟ یہ ہوتا ہے یہی کہ ''کسی کو اس کے ہونے والے عمل کے نتیجے سے قبل از وقت آگاہ کر دینا''۔ یہ پیش گوئی نہیں ہوتی' یہ علمِ غیب نہیں ہوتا۔ جب یہاں کائنات قانون کی رو سے چل رہی ہے تو قانون کا جاننے والا تو یہ بتا دے گا کہ یہ جو اتنی Sleeping Pills (خواب آور گولیاں) شام کے وقت کھا گیا ہے' یہ صبح مر جائے گا۔ اسے یہ کہہ دینا کہ یہ Sleeping Pills (خواب آور گولیاں) ہیں' ایک کھا سکتے ہو یا شاید دو کھا سکتے ہو' اس سے زیادہ اگر تم نے کھا لیا تو موت واقع ہو جائے گی۔ یہ انداز کہلاتا ہے۔ یہ ان سے کہا کہ خواہ تو ان کو اس سے آگاہ کرے یا نہ کرے' برابر ہے' وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ جس نے سوچا ہے کہ میں نے رات کو خودکشی کرنی ہے' وہ ڈاکٹر صاحب اس کو جتنی مرضی تلقین کریں کہ دو سے زیادہ نہ کھانا' وہ تو شیشی لے کر اس لیے گیا ہے کہ وہ ساری کی ساری کھائے گا۔ یہ ہے سَوَآءٌ عَلَیۡهِمۡ (2:6)۔ کس کے لیے یہ مفید ہے؟ سنیئے' عزیزانِ من! وقت ہو گیا' ورنہ میں سمجھتا ہوں کہ اس کے لیے بھی ایک درس چاہیے تھا۔ کس کے لیے یہ جو اِنۡذَارٌ ہے' یہ جو تَنۡذِیۡرٌ ہے' مفید ہے؟

قرآنی تعلیم انسان کو زندگی اور عمر کا فرق ہی بتانے کے لیے آئی تھی

رسول اللہ ﷺ سے کہا کہ ہم تمہیں یہ کتاب اس لیے دیتے ہیں کہ لِیُنۡذِرَ مَنۡ کَانَ حَیًّا (36:70) جو زندہ رہنا چاہتا ہے اس کو ان خطرناک گھاٹیوں سے آگاہ کر دے۔ یہاں ایک لفظ ہے کہ جو زندہ رہنا چاہتا ہے۔ اور قرآن نے خود ہی پھر یہ کہہ دیا ہے کہ اس سے

کہیں یہ نہ سمجھ لینا کہ زندگی اس سانس کی آمد ورفت کا نام ہے۔ نفس شماری کو وہ زندگی ہی نہیں گنتا۔ وہ کہتا ہے کہ یہ حیوانات کی سطح ہے۔ اس کے نزدیک زندگی نفس شماری کا نام نہیں ہے۔ کہتا ہے یہ ٹھیک ہے کہ ان کو علم نہیں ہے کہ یہ کتنی Dose (خوراک) چاہیئے' کتنی کھانی ہے' کیا پرہیز کرنا ہے۔ یہ چیز اس مریض کو فائدہ دے سکے گی جو مریض زندہ رہنا چاہتا ہے۔ جس میں ہنوز زندہ رہنے کی صلاحیت ہے' اسے ان چیزوں سے آگاہ کر۔ جو اس میں Believe (یقین) ہی نہیں کرتا' جو زندہ رہنا ہی نہیں چاہتا' جو زندگی میں ایمان ہی نہیں رکھتا' اس کو اس سے آگاہ کرتے رہو گے تو کیا بات ہوئی؟ کچھ بھی نہیں۔ کہا ہے کہ لِیُنۡذِرَ مَنۡ کَانَ حَیًّا وَّیَحِقَّ الۡقَوۡلُ عَلَی الۡکٰفِرِیۡنَ (36:70) اور جو اس زندگی سے انکار ہی کرتے ہیں' ان پر اس قانون کی صداقت ثبت ہو جائے کہ ساری شیشی کھا جانے والا مر جایا کرتا ہے۔ چار چار لفظوں کے دو ٹکڑے' برادرانِ عزیز! ریفرنس لے لیجیے اور ہفتہ بھر غور کرتے رہیے کہ قرآن کہہ کیا گیا ہے۔ بات ہم نے آج یہی (2:6) کی کہی ہے کہ اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا سَوَآءٌ عَلَیۡهِمۡ ءَاَنۡذَرۡتَهُمۡ اَمۡ لَمۡ تُنۡذِرۡهُمۡ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ [1] (2:6) اور اگلی بات یہ آئے گی کہ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰی قُلُوۡبِهِمۡ (2:7)۔ یہ پھر میں سمجھتا ہوں کہ پورا درس ہی لے لے گی۔ اسے ہم آئندہ درس پہ اٹھا رکھتے ہیں۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ

❀......❀......❀

---

[1] (یہ) گروہ ان لوگوں کا ہے کہ زندگی کا صحیح راستہ نمایاں طور پر ان کے سامنے آجاتا ہے لیکن وہ ضد' حسد' تکبر' سرکشی اور اپنی مفاد پرستیوں کی بنا پر اسے اختیار نہیں کرتے (2:89,90,109;27:14;35:42-43;47:32) وہ خود بھی اس راستے پر نہیں چلتے اور دوسروں کو بھی اس پر چلنے سے روکتے ہیں (6:246:41:26:47:32)۔ ان لوگوں کو اس روش کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کیا جائے یا نہ کیا جائے' ان کے لیے برابر ہے۔ یہ صحیح راستہ کبھی اختیار نہیں کریں گے (جو شخص خودکشی پر تلا بیٹھا ہو اس سے یہ کہنا کہ سنکھیاں مہلک ہوتا ہے' اس سے' بچنا بے سود ہوتا ہے)۔ ایسی نصیحت اسی کے لیے نفع بخش ہو سکتی ہے جو زندہ رہنا چاہیے (36:70)۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔3)۔

چھٹا باب: سورۃ البقرۃ (1)' (آیت 7: مسئلہ تقدیر اور اس کا حل)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ ؕ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ۡ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝

عزیزان من! آج جون 1968ء کی 30 تاریخ ہے اور ہم اپنے قرآنِ کریم کے سلسلۂ نو کی ابتدائی آیات میں ہیں۔ آج سورۃ البقرۃ کی 7ویں آیت زیرِ درس آئے گی: (2:7)۔

خدا خود ہی انسانوں کے دلوں پر مہر لگائے اور پھر خود ہی عذاب دے۔ یہ کیوں؟

سابقہ آیت میں' میں نے یہ بتایا تھا کہ یہ دو آیات ہیں جن کا صحیح مفہوم سامنے نہ ہونے کی وجہ سے صدیوں سے ہمارے ہاں بڑی الجھنیں سی پیدا ہوتی چلی آ رہی ہیں۔ ان میں ایک آیت یہ ہے کہ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ (2:6)۔ اس کا عام ترجمہ یہ کیا گیا ہے کہ یہ جو کافر ہیں' ان کے لیے برابر ہے چاہے تو انہیں ان چیزوں سے آگاہ کرے یا نہ کرے' وہ تو ایمان لائیں گے ہی نہیں۔ میں نے عرض کیا تھا کہ اس میں آپ دیکھیے کہ اس مفہوم کی رو سے پہلی دشواری تو یہی آتی ہے کہ اگر کافر ایمان ہی نہیں لائیں گے تو پھر یہ سارا سلسلۂ رشد و ہدایت کیا ہوا؟ یہی کہ وہ کافر ہیں' وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ بہرحال یہ مرحلہ ہم نے پچھلے درس میں طے کر لیا تھا کہ اس کا مفہوم یہ نہیں ہے۔ کہا تھا کہ یہ جو اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا (2:6) ہے' یہ کچھ کرنے کا کام ہے۔ جو لوگ یہ کرتے ہیں ان کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ وہ کبھی ایمان نہیں لائیں گے۔ اس کے بعد اگلی الجھن اس سے پیدا ہوتی ہے کہ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ (2:7)۔ وہ ایمان کیوں نہیں لائیں گے؟ اس لیے کہ خدا نے ان کے دلوں پر مہریں کر دی ہیں۔ آپ نے دیکھا کہ یہ ترجمہ الجھن در الجھن پیدا کرتا چلا جاتا ہے۔ کافر ایمان نہیں لائیں گے تو یہ سارا ہی سلسلۂ رشد و ہدایت (معاذ اللہ) بیکار ہو گیا۔ وہ ایمان لائیں گے کیوں نہیں؟ اس لیے کہ اللہ نے ان کے دلوں پر مہریں لگا دی

پر مہریں لگا دی ہیں۔ چلیے یوں ہی سمجھ لیا کہ یہ تو نظری چیز ہے اور یہ کہ ان کے لیے عَـذَابٌ عَظِيْمٌ (2:7) ہے اور انہیں بہت بڑا عذاب دیا جائے گا!! اللہ نے مہریں لگا دیں' اس لیے کہ وہ ایمان نہیں لائیں گے یا لا سکتے نہیں اور پھر انہیں عذاب بھی دیا جائے گا' آخر یہ کیوں؟

صدیوں پہلے غلط کہی ہوئی بات آج تک ذہنوں پر اثر انداز ہو رہی ہے

میں نے عرض کیا تھا کہ قرآنِ کریم کا صحیح مفہوم سامنے نہ ہونے کی وجہ سے اس قسم کی ساری دشواریاں لاحق ہوتی ہیں۔ اور انسان سر پکڑ کر بیٹھ جاتا ہے جب وہ دیکھتا ہے کہ صدیوں پہلے کسی ایک شخص نے' بہر حال انسانی ذہن تو ہے غلطی کر جاتا ہے' بات کو غلط سمجھا اور اس کے بعد وہ بات جو آگے چلی ہے تو تقلیداً چلتی آ رہی ہے۔ سند یہ ہے کہ اسلاف نے یہ کہہ دیا۔ پہلے تو وہ سلف میں ایک ہی تھا اور وہ جو آگے جوں جوں زمانہ گزرتا چلا گیا' وہ سلف اسلاف میں بدلتے چلے گئے۔ اب وہ Snowball (گولہ برف) کی طرح وہ جو اتنی سی غلطی ہے' وہ اتنا بڑا ضخیم طومار بن کر آگے آ گئی۔ جوں جوں آگے بڑھی یہ سند اور محکم ہوتی گئی۔ پہلے سلف نے یہ کہا تھا اب اسلاف نے یہ کہا۔

کسی فرد کا سمجھا ہوا قرآن دوسرے کے لیے سند نہیں ہو سکتا

قرآنِ کریم نے اسی لیے ہر نسل اور ہر نسل کے ہر فرد کے لیے لازم قرار دیا تھا کہ وہ از خود قرآن پہ غور کرے۔ نہ کسی فرد کا سمجھا ہوا قرآن دوسرے کے لیے سند ہو سکتا ہے' نہ کسی ایک Age یا دور کا سمجھا ہوا قرآن کسی آنے والے زمانے کے لیے سند اور حجت ہو سکتا ہے۔ سند اور حجت' اور قرآن کے سمجھنے کے لیے انسانی علم اور بصیرت از بس ضروری ہے۔

بہر حال پچھلی آیت تو سابقہ درس میں ہمارے سامنے آ گئی تھی کہ یہ بات نہیں ہے کہ جو Non Muslims (غیر مسلم) ہیں وہ ایمان ہی نہیں لائیں گے' ان کے لیے برابر ہے کہ تُو انہیں ڈرائے یا نہ ڈرائے یہاں Muslim (مسلم) اور Non Muslim (غیر مسلم) کا Question (سوال) نہیں ہے۔

دلوں پر مہریں لگنے کی اصلی وجہ تو انکے اپنے اعمال ہوتے ہیں

اب اگلی بات آئی کہ خَتَـمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَ عَلٰى سَمْعِهِمْ (2:7) ۔ بات ذرا سی ہے۔ سمجھا یوں گیا کہ وہ جو کافر ہوئے ہیں' جو ایمان نہیں لائیں گے' وہ اس لیے ایمان نہیں لائیں گے کہ ان کے دلوں کے اوپر مہریں لگی ہیں۔ اور اس بات کو ذرا سا یوں لٹا دیجیے کہ چونکہ ان کے دلوں کے اوپر مہریں ہیں' اس لیے ان کے لیے برابر ہے چاہے تُو سمجھائے یا نہ سمجھائے یعنی ان کے ایمان نہ لانے کی علت یہ ہے۔ یہ تو میں ابھی سمجھاؤں گا کہ اس کے کیا معنیٰ ہیں لیکن بنیادی طور پر یہ سمجھ لیجیے کہ یہ کیوں ہے؟ پھر سمجھ لیجیے کہ ان کے دلوں کے اوپر مہریں کیوں لگی ہوئی ہیں؟ ہم نے یہ سمجھا کہ وہ اس لیے کافر ہوئے ہیں کہ ان کے دلوں کے اوپر مہریں لگی ہوئی ہیں۔ قرآن یہ کہتا ہے

کہ ان کے دلوں کے اوپر مہریں اس لیے لگی ہوئی ہیں کہ وہ کفر کرتے ہیں۔ یعنی کفر ایک Positive Attitude (مثبت رویہ) ہے' ذہنیت ہے' عمل ہے' فیصلہ ہے۔ اس کا ایک نتیجہ یہ بھی ہے کہ اس سے دلوں کے اوپر مہریں لگ جاتی ہیں۔ کفر کی وجہ سے دلوں کے اوپر مہریں لگتی ہیں۔ یہ نہیں ہے کہ خدا نے پہلے مہریں لگا دی ہیں اس لیے وہ کفر کرتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ بات سمجھ میں آ گئی ہوگی۔ یہ اس کے اندر دو آیتوں میں علت اور معلول (Cause & Effect) ہے۔ پھر سمجھ لیجیے کہ کفر اس لیے نہیں کرتے کہ اللہ نے دلوں پہ مہریں لگا دی ہیں۔ مہریں اس لیے لگتی ہیں کہ وہ کفر تے ہیں۔

کفر کا قرآنی مفہوم کسی حق بات کو عقل وفکر کی بنا پر سمجھنے سے ''انکار کرنے'' کا ہے

کفر کا میں نے پچھلی دفعہ سمجھایا تھا کہ اگر ہر فرد وہ کچھ کرے جو قرآن نے کرنے سے منع کیا تھا تو وہ اس وقت کفر کرتا ہے۔ اس میں پہلی چیز یہ تھی کہ وہ کہتا یہ ہے کہ میں سمجھنے سوچنے سے کام نہیں لونگا۔ اسے کہا تھا کہ یہ کفر کر رہا ہے۔ جو یہ کہتا ہو کہ میں سمجھنے سوچنے سے کام نہیں لینا چاہتا' اب اس کے لیے برابر ہے خواہ تُو اس کو ڈرائے یا نہ ڈرائے' آگاہ کرے یا نہ کرے۔ اور یہی چیز ہے جس نے اس کے دل پہ مہر لگا دی ہے کہ پھر وہ سمجھنے سوچنے کی صلاحیت ہی ختم ہو جاتی ہے۔ یہ جو میں نے کہا ہے کہ ان کے کفر کی وجہ سے ان کے دلوں کے اوپر مہریں لگیں' یہ نہیں ہے کہ میں اپنے طور پر اس منطقی نتیجے پہ پہنچا ہوں۔

قرآن حکیم کو سمجھنے کا طریق تصریفِ آیات ہے

میں نے آپ سے عرض کیا تھا اور بار بار یہ عرض کرتا ہوں کہ قرآنِ کریم کے سمجھنے کا طریقہ یہ ہے کہ ایک مقام پہ جو بات آئی ہو اس کے لیے یہ دیکھیے کہ قرآنِ کریم کے دوسرے مقامات میں اس کے لیے کیا آیا ہے۔ قرآن کا سمجھنے کا یا قرآن کا اپنے آپ کو سمجھانے کا طریقہ تصریفِ آیات ہے۔ اور تصریفِ آیات کے معنی ہوتا ہے بات کو پھیر پھیر کر' لوٹا لوٹا کر' مختلف مقامات پر' اس کے مختلف گوشوں کو سامنے لانا۔ سارے قرآن کا یہی انداز ہے۔ قرآن کی کسی بات کو کسی ایک مقام پہ نہ سمجھیے' یہ دیکھیے کہ اس کے متعلق باقی مقامات میں کیا کہا گیا ہے۔ اور یہ قرآن کا اعجاز ہے کہ اگر آپ کے سامنے یہ تمام متعلقہ مقامات آ جائیں تو پھر کوئی آیت ایسی نہیں رہتی جو سمجھ میں نہ آئے اور اس کا ایک متعین (Definite) اور Precise (واضح' غیر مبہم) مفہوم آپ کے سامنے نہ آ جائے۔ یہ جو اور باتوں کے علاوہ آج کل بھی عام طور پر چرچا کیا جاتا ہے کہ صاحب! ٹھیک ہے قرآن کا متن تو متفق علیہ ہے لیکن اس کی تعبیرات میں اتنا اختلاف ہے کہ پھر اس متن کا متفق علیہ ہونا کچھ معنی ہی نہیں دیتا کہ جی! یہ بیکار ہو گیا!!

قرآن کا دعویٰ یہ ہے کہ اس میں کوئی ایک بھی اختلافی بات نہیں' کوئی تضاد نہیں

خدا یہ کہہ رہا ہے کہ اگر قرآن خدا کے علاوہ کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس میں بہت سے اختلافات ہوتے۔ متن تو متفق علیہ ہے' اب اگر اس متن کی کیفیت یہ ہے کہ وہ ہر سمجھنے والے یا ہر شخص کو اس کی مرضی کے مطابق معنی دیتا چلا جاتا ہے یعنی اس کتاب کا یہ نقص ہے (معاذ اللہ) تو اس کے متن کا متفق علیہ اور محفوظ رہنا کیا فائدہ دیتا ہے۔ یہ ساری الجھنیں اس لیے ہیں کہ قرآن کے اوپر نگاہ نہیں ہے ورنہ قرآن نے جس انداز سے اپنے آپ کو سمجھایا ہے' اگر اس انداز سے سمجھ لیا جائے تو یہ مشکل پیدا ہی نہیں ہوتی۔ عزیزانِ من! چھوٹا منہ اور بڑی بات' چونکہ ایک عمر گزر گئی ہے اسی دشت کی سیاحی میں' اس لیے یہ چیز تو میں اپنے تجربے کی بنا پہ آپ کو کہہ سکتا ہوں کہ قرآن کی کوئی آیت ایسی نہیں ہے' اس کا کوئی لفظ ایسا نہیں ہے جسے اس نے خود اس طرح سے نہ سمجھا دیا ہو۔ اس کے کبھی دو معنی ہو ہی نہیں سکتے۔ بہر حال میں کہہ یہ رہا تھا کہ ان دو آیتوں کے اندر ربط یوں ہے کہ یہ نہیں ہے کہ چونکہ ان کے دلوں پہ پہلے سے مہر لگ گئی ہوئی ہے اس لیے وہ کفر کرتے ہیں بلکہ یہ ہے کہ چونکہ وہ کفر کرتے ہیں' اس وجہ سے ان کے دلوں کے اوپر مہریں لگ جاتی ہیں۔ یوں کہیے کہ چونکہ وہ یہ چیز کہتے ہیں کہ ہم سمجھنا سوچنا چاہتے ہی نہیں ہیں' اس روش کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آہستہ آہستہ سمجھنے سوچنے کی صلاحیت ہی ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے لیے میں نے کہا تھا کہ میں خود اس نتیجے پہ نہیں پہنچا۔ سورۃ النسآء (4:155) میں اوپر سے یہودیوں کا ذکر چلا آ رہا ہے جو کچھ وہ کرتے تھے' اس کے بعد یہ ہے کہ بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا (4:155) ان کے کفر کی وجہ سے ان کے دلوں کے اوپر مہریں لگ گئیں۔ وہ دیکھا جو میں نے ابھی عرض کیا تھا کہ دل پہ مہریں لگنے کی وجہ سے کفر نہیں کیا بلکہ کفر کی وجہ سے دل پر مہریں لگ گئیں: بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ (4:155)۔

مہریں پہلے نہیں لگتیں بلکہ پہلے انسان کفر اختیار کرتا ہے

اب یہ چیز کہ ان سب نے یہ کہا ہوا ہے کہ اللہ نے مہریں لگا دیں۔ یہ بات میں آگے چل کر واضح کرونگا۔ سرِ دست اتنا سا سمجھتے چلے جایئے جو میں عرض کر رہا ہوں کہ یہ کفر کی وجہ سے ایسا ہوا ہے۔ یہ نہیں تھا کہ پہلے مہریں لگی ہوئی تھیں اس لیے انہوں نے کفر کیا' اب نہ مہریں توڑ سکتے ہیں نہ ایمان لا سکتے ہیں۔ یہ صورت نہیں ہے۔ کفر کی وجہ سے مہریں لگیں' کفر کرنا چھوڑ دیں گے تو مہریں ٹوٹ جائیں گے۔

دنیا کا سب سے بڑا مسئلہ تقدیر اور عقیدہ جبر ہے

یہ آیت چونکہ شروع میں ہی آئی ہے' اس سے بہت بڑا مسئلہ جو صرف دین کا ہی نہیں بلکہ انسانی فکر کا' مذہب کی دنیا کا' بڑا مسئلہ سامنے آتا ہے۔ اور یہ وہی ہے جسے ہمارے ہاں مسئلہ تقدیر کہا کرتے ہیں آپ نے خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ (2:7) کہا تو انسان مجبور

محض ہو کر رہ گیا' اللہ نے ان کے دلوں کے اوپر مہریں لگا دیں اور ان مہریں لگنے کی وجہ سے انہوں نے کفر کیا' کفر کیا تو ان کے لیے برابر ہے خواہ آگاہ کرو یا نہ کرو' وہ ایمان ہی نہیں لائیں گے۔ آپ نے دیکھا کہ کس طرح سے Determinism (جبر) کے اوپر آپ آ گئے انسان صاحبِ اختیار رہا ہی نہیں لیکن آپ کو معلوم ہے کہ کس بات نے یہ Suggestion (تجویز) دی کہ نہیں! جلدی سے یوں نہ سمجھ لو' بات کچھ گہرائی میں جانے کی ہے' سطحی بات نہیں ہے۔ کس چیز نے یہ Suggest (تجویز) کیا؟ کس چیز نے آپ کے دل کے اندر یہ کھٹک پیدا کی؟ یہ خود آپ کے دل کے اندر کی کسی چیز نے نہیں کی۔ قرآن ہے' برادرانِ عزیز! اس نے جو کہا ہے کہ **وَّ لَھُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ** (2:7) یہ ہے وہ مقام جہاں ایک غور کرنے والا کھڑا ہو جائے گا کہ اگر مہریں اللہ نے لگائی ہیں' اگر انہوں نے کفر اس کی وجہ سے کیا ہے' تو یہ جو اگلی چیز وہ کہہ رہا ہے کہ ان کے لیے عذاب عظیم ہے' یہ دو ایسی چیزیں ہیں جو آپس میں میل نہیں کھاتیں' ان میں ربط نہیں ہے' بڑی بے جوڑ سی چیز ہے' یہ دھاندلی ہے۔ قرآن پہ تدبر کا نتیجہ آپ نے دیکھا کہ کیا نکلا۔ ایسی چیز پہ اگر کوئی یوں گزر جاتا تو ذہن میں یہی ہوتا کہ ہاں صاحب! مہریں خدا ہی لگاتا ہے' اس کی وجہ سے کفر ہوتا ہے۔ اب یہ سیدھی بات ہے کہ اگر تو خدا کے ہاں سے ہر شخص کے متعلق چیزیں پہلے سے طے شدہ ہیں کہ یہ ایمان لے آئے گا' یہ کفر کرے گا' اس لیے یہ باقی جو کچھ انسان کوششیں کرتا ہے' دھندہ کرتا ہے' یہ تو بے معنی چیز ہے۔ یہ ہے عقیدۂ تقدیر۔ یہ سب سے بڑا اور قدیم مسئلہ ہے۔

تقدیر کے عقیدے کو ایمان کا جزو بنا دینے کی گہری سازش

یہ جو ہمارے ہاں کا عقیدہ چلا آ رہا ہے اور اس قوم کی انتہائی بدقسمتی ہے اور میں کہہ رہا ہوں کہ اس کے خلاف کی گئی بڑی کامیاب سازش تھی کہ اس قوم کے اندر یہ عقیدہ دین کا جزو بنا دیا گیا۔ اس میں کہا ہے کہ **وَالْقَدْرِ خَیْرِہٖ وَشَرِّہٖ مِنَ اللّٰہِ تَعَالٰی**۔ پانچ اجزائے ایمان تو قرآن نے بیان کیے تھے' سارے قرآن میں پانچ ہی ہیں کہ اللہ پر ایمان' ملائکہ پر ایمان' کتابوں پر ایمان' رسولوں پر ایمان' آخرت پر ایمان۔ اب یہ چیز ہوئی کہ انسان کو جبر کے عقیدے پہ لایا گیا' اس کے لیے یہ اتنی گہری سازش ہوئی کہ آپ کے اجزائے ایمان میں ایک اور جز کا اضافہ کر دیا گیا۔ اب جو آپ کے ہاں اجزائے ایمان ہیں وہ ہیں کہ **اٰمَنْتُ بِاللّٰہِ وَمَلٰٓئِکَتِہٖ وَکُتُبِہٖ وَرُسُلِہٖ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْقَدْرِ خَیْرِہٖ وَشَرِّہٖ مِنَ اللّٰہِ تَعَالٰی وَالْبَعْثِ بَعْدَ الْمَوْتِ**۔ عزیزانِ من! ہماری نئی Generation (نسل) کو تو خیر پتہ ہی نہیں ہوگا کہ یہ کیا ہے۔ یہ جو پرانے تھے تقسیم سے پہلے کے جو نکاح پڑھے ہوئے تھے اس میں نکاح کے وقت یہ پڑھایا کرتے تھے۔ بہر حال اس وقت بھی اس دولہا کو کیا پتہ چلتا تھا کہ کیا کہہ رہا ہوں۔ میں کہہ یہ رہا ہوں کہ آپ کے ہاں ایمان کے پانچ اجزا قرآن میں ہیں' سارے قرآن میں پانچ ہی ہیں۔ انہی پانچوں پہ ایمان لانے سے مومن بنتا ہے ان سے انکار کرنے سے کافر۔ آپ کے ہاں ایمان کا

یہ چھٹا جزو بنا کر اس میں داخل کر دیا ہوا ہے۔ یہ ہے Fatalism (نصیبہ) Determinism, (جبریت) کہ انسان مجبورِ محض ہے' یہ سب چیز خدا کی طرف سے ہوتی ہے' یہ پہلے سے مقدر ہے' لکھا ہوا ہے' قسمت کا لکھا جھولی میں پڑتا ہے۔ جب صورت یہی ہو کہ یہ سارا کچھ پہلے سے مقدر ہے' لکھا ہوا ہے' انسان میں کوئی اختیار و ارادہ نہیں' وہ اپنے کسی عمل کا ذمہ دار ہی نہیں رہتا تو صورتِ حال ہی بدل جاتی ہے۔

تقدیر کے اس غلط تصور نے مسلمانوں کو عمل سے فارغ کر دینے کی بنا پر قوتِ ارادی سے محروم کر دیا

یہی چیز تھی جس کی وجہ سے اس قوم کی یہ حالت ہوگئی:

عمل سے فارغ ہوا مسلماں' بنا کے تقدیر کا بہانہ

یہ وجہ ہے کہ اس آیت پہ میں نے پچھلی دفعہ کہا تھا کہ یہ معاملہ بڑا نازک ہے' مسئلہ بڑا اہم ہے اور یہ سامنے آیا ہے' اس لیے اس کو اچھی طرح سے سمجھ لینا چاہیے۔

قدرت کی طرف سے اس کرہ ارض پر انسان کیلیے سب سے بڑا عطیہ اسکا اختیار و ارادہ ہے

عزیزانِ من! زندگی جو اولیں جرثومے سے چلی ہے' ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی پیکرِ انسانی میں آئی ہے' تو یہاں پہنچنے کے بعد اس کے اندر ایک ہی تبدیلی ہوئی ہے اور وہ یہ ہے جو اسے روحِ خداوندی کا شمہ ملا ہے۔ روح کے معنی Soul نہیں ہے' اس کے معنی Energy (توانائی) کے ہیں یاد رکھیے! یہ الوہیاتی توانائی ہے۔ یہ توانائی کیا چیز ہے؟ یہ ایک ہی چیز ہے جسے Will Power (قوتِ ارادی) کہتے ہیں' جسے Will (ارادہ) کہتے ہیں جسے Freedom (آزادی) کہتے ہیں۔ اس سے پیشتر جہاں تک زندگی آئی ہے' کسی شے کو Freedom of Action & Freedom of Thought (آزادی فکر اور آزادی عمل) حاصل نہیں تھی۔ تمام قانون کی زنجیروں کے اندر بندھے ہوئے چلے آ رہے تھے۔ بکری کا بچہ پیدا ہونے کے ساتھ بکری ہوتا تھا' مرنے تک بکری رہتا تھا' اسے اپنی اس کیفیت میں تبدیلی پیدا کرنے کی قطعاً کوئی توانائی حاصل نہیں تھی' قوت' استعداد' صلاحیت حاصل نہیں تھی' بلکہ کسی میں بھی یہ حاصل نہیں ہے۔ وہاں تو

گندم از گندم بروید' جو ز جو
از مکافاتِ عمل غافل مشو

پیچھے یہ کیفیت تھی۔

انسان کے پیکر میں آ کر زندگی نے ایک بڑی چیز لی جو اس سے پیشتر صرف خدا کو حاصل تھی۔ نَفَخَ فِیۡهِ مِنۡ رُّوۡحِهٖ (32:9) کے یہ معنی ہیں۔ کسی اور جاندار کے متعلق یہ نہیں کہا ہے۔ قرآن میں یہ ہے کہ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پھر یہ سمجھنے سوچنے فیصلہ کرنے کے قابل ہوگیا۔

نظر آ گیا کہ روحِ خداوندی نے اس میں کیا کیا ہے۔ اس کو سماعت' بصارت' اور فواد دیا یعنی یہ ذرائع علم دیئے اور اس کے بعد فیصلے کرنے کی قوت یعنی Mind دیا۔ یہ ہے وہ چیز جو انسان کو آ کر ملی۔ یہی تو زندگی کی ایک خصوصیت ہے کہ جب یہ انسانی پیکر میں آئی ہے تو اسے یہ اختیار و ارادہ کی چیز حاصل ہوئی ہے۔ اب یہی وہ چیز ہے جس سے یہ اپنے تمام فیصلوں کا خود ذمہ دار ہو جاتا ہے۔ اس کا Future (مستقبل) پہلے سے لکھا ہوا نہیں ہے' یہ اپنا Future (مستقبل) آپ مرتب کرتا ہے۔ اس کی لوحِ جبیں خالی سلیٹ ہوتی ہے جو پیچھے سے آتی ہے' یہ اس سلیٹ پہ اپنے ہاتھوں سے خود لکھتا ہے۔

دنیا بھر کے انسانوں کے لیے تقدیر کے مسئلہ کو قرآن حکیم نے بڑی خوبصورتی سے حل کر رکھا ہے

تقدیر کے عنوان کے اوپر تو میں کسی دوسرے وقت میں آؤنگا' میں اس وقت قرآنِ کریم کی صرف ایک چیز پیش کرتا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ میں اربابِ بصیرت ہیں' اور اللہ کا شکر ہے' کہ اس ایک آیت سے یہ بات سمجھ لیں گے۔ اور میں کہتا ہوں کہ اگر اسی کے اوپر ہمارے ہاں غور کر لیا جاتا تو آپ کے ہاں کی تقدیر کا سارا مسئلہ حل ہو جاتا۔ سوال یہی ہے کہ میرا جو Future (کل) ہے' کیا وہ میرے ہاتھ میں ہے یا پہلے سے مرتب شدہ ہے اور مرتب شدہ بھی ایسا ہے کہ جس کے اندر میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا؟ پھر سن لیجیے کہ سوال یہ ہے کہ کیا اپنا مستقبل میں اپنے ہاتھوں سے خود بناتا ہوں یا وہ پہلے سے بنا ہوا ہوتا ہے اور میں اس میں کوئی Change (تبدیلی) بھی نہیں کر سکتا؟ میں نے عرض کیا ہے کہ اگر قرآنِ کریم کی ایک آیت بھی سامنے رکھ لی جاتی تو یہ سارا مسئلہ حل ہو جاتا۔ اور وہ سورۃ حشر کی 18 ویں آیت ہے اور بڑی اہم آیت ہے۔ اس قسم کی اور بھی متعدد آیات قرآنِ کریم میں ہیں' میں عرض کرونگا۔ میں کسی دن یہی ایک سوال لونگا اور اس میں یہ تمام آیات آپ کے سامنے لاؤنگا لیکن میں ان میں سے اس وقت صرف ایک ہی آیت پیش کرتا ہوں۔

سوال یہ تھا کہ کیا انسان اپنا Future (مستقبل) اپنے ہاتھوں سے مرتب تعمیر و تشکیل کرتا ہے یا جب وہ آتا ہے تو پہلے سے مرتب شدہ ہوتا ہے؟ قرآن نے کہا ہے' غور سے سنیے' برادرانِ عزیز! کہ **يَـٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ ءَامَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ** (59:18) اے اربابِ ایمان! قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرو۔ آگے کہا ہے کہ **وَلْتَنظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ** (59:18) ہر شخص اس بات کو سوچے کہ میں اپنے ''کل'' کے لیے ''آج'' کیا بھیج رہا ہوں۔ عزیزانِ من! بتایئے کہ ایک آیت کے اندر بات صاف ہو گئی یا نہیں۔ یہاں قرآن نے **قَدَّمَتْ** کہا ہے' یہ لفظ **قَدَّمَتْ** بڑی جگہ استعمال کیا ہے۔ اس کے معنی ہیں ''اپنے لیے پہلے سے کوئی چیز بھیج دینا''۔ انسان جو عمل آج کرتا ہے' اس کا نتیجہ اس کے بعد جا کر مرتب ہوتا ہے۔ ہر نتیجے کا عمل پہلے کیا جاتا ہے' وہ نتیجہ گویا پہلے بھیجا جاتا ہے' اس وقت وہ سامنے آتا ہے جب وہ مہلت کے وقفے کے بعد محسوس شکل میں مرتب ہو جاتا ہے لیکن بھیجا پہلے سے جاتا ہے۔

انسان کا اپنا عمل ہی اس کے مستقبل کا نقشہ مرتب کرتا ہے

آپ قرآن کی یہ آیت دیکھیے وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ (59:18) ہر شخص کو یہ غور کرنا چاہیے' اس چیز کو دیکھتے رہنا چاہیے کہ وہ اپنے کل (Future) کے لیے آج (Present) کیا کرتا ہے۔ سیدھی سی بات ہے' عزیزانِ من! اس کا کل تو اس سے مرتب ہوتا ہے جو کچھ یہ آج کرتا ہے۔ اگر وہ پہلے سے مرتب شدہ ہے تو اسکا سوال ہی نہیں ہے کہ یہ آج کیا کرتا ہے۔ میں نے ان آیات میں سے اس آیت کو اس لیے چنا ہے کہ اس میں خاص طور پہ قرآن نے لغد کہا ہے کہ یہ آنے والے ''کل'' کے لیے ''آج'' کیا کرتا ہے۔ اس بات کو ہر شخص کو ذہن میں رکھنا چاہیے کہ میں اپنے آنے والے کل کی ترتیب کے لیے آج کیا کرتا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس ایک آیت کی موجودگی میں قرآن کا یہ جو تقدیر کا مسئلہ تھا' یہ سارے کا سارا طے ہو جاتا ہے کہ خود انسان اپنے لیے کرتا ہے۔ دوسری جگہ کہا ہے کہ یَوْمَ یَنْظُرُ الْمَرْءُ قَدَّمَتْ یَدٰہُ وَیَقُوْلُ الْکٰفِرُ یٰلَیْتَنِیْ کُنْتُ تُرٰبًا (79:40) جس دن ہر شخص یہ دیکھ لے گا کہ اس کے ہاتھوں نے اس کے آج کے لیے کیا بھیجا تھا۔ یہاں قَدَّمَتْ یَدٰہُ آیا ہے اور بات صاف ہوگئی ہے۔ اس کے اپنے ہاتھوں نے اپنے Future (مستقبل) کو مرتب کرنے کے لیے پہلے سے کیا بھیجا تھا وہ آ کر خود دیکھ لے گا۔ وہ تو اپنے ہاتھوں سے یہ سب کچھ بھیج رہا تھا۔ اور اس کے بعد یہ ہے کہ جس نے ان صداقتوں سے انکار کر کے غلط چیزیں اپنے Future (مستقبل) کے لیے بھیجی ہونگی وہ جب وہاں اپنا Future (مستقبل) مرتب شدہ دیکھے گا تو چیخ نکل جائے گی کہ اے کاش! میں صاحبِ اختیار و ارادہ انسان ہونے کی بجائے مٹی کا تودہ ہوتا تو یہ کیفیت تو نہ ہوتی۔ یہ تراب میں اور انسان میں فرق کیا ہوا؟ یوں تو انسان بھی پیکرِ آب و گل ہی ہے' جسے کہتے ہیں کہ مٹی کا ہی بنا ہوا ہے۔ یہ کیا کہا تھا اس ''کافر'' نے کہ میں مٹی ہوتا۔ فرق ہی یہ ہے کہ مٹی صاحبِ اختیار نہیں ہے' وہ اپنے اعمال کی ذمہ دار نہیں' اس کی تقدیریں مقدر ہیں' لکھی ہوئی ہیں۔ انسان اپنا Future (مستقبل) آپ مرتب کرتا ہے۔ یہ چیز آپ سارے قرآن میں دیکھیں گے۔ میں ابھی عرض کرونگا کہ خدا کو جہاں ان چیزوں کا فاعل قرار دیا ہوا ہے اس کے معنی کیا ہیں؟ لیکن بنیادی طور پر یہ سمجھ لیجیے کہ قرآن کہتا کیا ہے۔

انسان کے اپنے ہی اعمال اس کے قلب کی تبدیلی کا باعث بنتے ہیں

اگلی چیز ہے جو اس سے بھی زیادہ گہری اور اہم ہے' وہ (61:5) میں کہی ہے۔ قومِ بنی اسرائیل کی داستان چلی آ رہی ہے کہ انہوں نے یہ کیا' انہوں نے یہ کیا۔ یہ کیا تو یہ ہوا' یہ کیا تو یہ ہوا' یہ چلا آ رہا ہے۔ اور اس میں ایک جامع حیثیت سے ایک فقرہ آیا ہے جو ایک کلیہ یا ایک اصول کے طور پر بیان ہوا اور وہ یہ ہے کہ فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰہُ قُلُوْبَھُمْ (61:5) جب وہ خود غلط راستے کی طرف پلٹ گئے تو خدا کے قانون نے ان کے دلوں کو اسی طرح سے الٹا دیا: فَلَمَّا زَاغُوْٓا ۔ آپ دیکھتے ہیں کہ یہاں جو Initiative

(پہل) ہے' یہ ان کی طرف سے ہے کہ انہوں نے اس میں یہ پہل کی ہے۔ جب انہوں نے اپنی یہ ذہنیت اختیار کر لی تو اس کے بعد ان کا جو قلب تھا جس نے ان کو فیصلے دینے تھے' وہ قلب ہی الٹ گیا اور وہ خود ہی دوسری پٹڑی پر پڑ گیا۔ یہ ہے فَلَمَّا زَاغُوْٓا یعنی جب وہ غلط راستے کی طرف مڑ گئے۔ پھر سوچ لیجیے جب یہاں اللہ آتا ہے تو میں عرض کرونگا کہ قرآن یہ کیوں لاتا ہے۔ جب وہ خود غلط راستے کی طرف مڑ گئے تو ان کے اندر جو فیصلے کرنے کی قوت تھی' سمجھنے سوچنے کی قوت تھی' جسے قلب کہا جاتا ہے' وہ قلب اسی طرح سے الٹ گیا۔

قلب دراصل انسانی ذہنیت اور قوتِ فیصلہ کا نام ہے

عزیزانِ من! قرآن کے اور مقامات میں بھی یہ ہے مثلاً آپ (9:127) نکالیے۔ وہاں بھی یہی چیز دوسرے الفاظ میں آئی ہے۔ کہا ہے کہ ثُمَّ انْصَرَفُوْا صَرَفَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ (9:127) جب وہ پلٹ گئے تو پھر خدا کے قانون نے ان کے دلوں کو اسی طرح سے پلٹا دیا اس لیے کہ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ (9:127) انہوں نے غور وفکر اور تفقہ اور تدبر چھوڑ دیا تھا۔ اس چھوڑ دینے سے یہ ہوا کہ وہ غلط راہوں کی طرف پلٹ گئے۔ اور جب انہوں نے اپنے لیے یہ روش اختیار کر لی تو اس کے بعد ان کی جو اندر کی ذہنیت تھی' ان کی قوتِ فیصلہ کی جو چیزیں تھیں' جو صلاحیتیں اندر ہیں' جن کو قرآن قلب یا فواد سے تعبیر کرتا ہے' جسے آپ انسان کا Mind (قلب و دماغ) کہتے ہیں' وہ چیز جو اس کا Attitude (رویہ) بناتی ہے' وہ کہتا ہے کہ پھر وہ بھی اس کے مطابق ہو گیا۔ بات کیا ہوئی؟ جس قسم کا انسان آپ ہو گیا' اسی قسم کی اندر سے اس کے فیصلے کرنے والی جو قوتیں ہیں' وہ اسی انداز میں انہی پیکروں کے اندر Mold (ڈھل) ہو گئیں۔ جو کچھ اس نے اپنے لیے روش اختیار کی' اسی کے مطابق یہ جو اس کو صلاحیتیں دی تھیں' انہوں نے ویسا ہی کام کرنا شروع کر دیا۔ یاد رکھیے! انسان کے اندر خود کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو اس کو نیکی کے اوپر لے آئے یا بدی کے اوپر لے آئے' حتیٰ کہ نیکی اور بدی کی' خیر اور شر کی' تو تمیز بھی اس کے اندر نہیں رکھی ہوئی۔ انسان کے اندر صرف کچھ قوتیں ہیں' کچھ صلاحیتیں (Potentialities) دی ہوئی ہیں۔ اگلا سوال یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی صلاحیتوں کو' اپنی استعداد کو' Potentialities کو' استعمال کیسے کرتا ہے۔ وہ جس طرح سے ان کو استعمال کرتا ہے' اس کے مطابق نتائج نکلتے ہیں اور اس کے مطابق خود اندر ہی اس کی ذہنیت بنتی چلی جاتی ہے۔ پہلے دن جب یہ خیال کرتا ہے کہ فریب دہی سے کچھ حاصل ہو جانا چاہیے تو اسی دن اس کے اندر وہ قلب کی تبدیلی نہیں ہو جاتی۔ جب وہ یہ روش اختیار کر لیتا ہے' روز اسی لائن پہ Think (سوچ و بچار) کرنا شروع کرتا ہے' اسی طریق کے اوپر سوچتا چلا جاتا ہے تو آہستہ آہستہ جیسے وہ کہتے ہیں کہ انسان کا ضمیر مر جاتا ہے' اس کے بعد آہستہ آہستہ اندر خود اس کے سمجھنے سوچنے کی صلاحیتیں یا فیصلہ کرنے کی صلاحیتیں اسی پٹڑی پہ اس کو لے جاتی ہیں۔ وہ فیصلہ کرتا ہے کہ کہاں میں فریب دوں' اور اندر کی جو اس کی سوچنے سمجھنے کی قوت تھی وہ اس کو طریقے سجھاتی ہے کہ فریب کیسے دیا جائے' فریب دینے کے بعد پھر

Justificatory Reasons (وجہ جواز) کیا تلاش کیے جائیں۔ پھر اگر کہیں گرفت ہوتی ہے تو اس سے بچنے کے لیے کیا شکلیں اختیار کی جائیں، پھر یہ کچھ ہوتا چلا جاتا ہے۔

اگر کسی قوم کو اپنی حالت بدلنا مقصود ہو تو اسے پہلے اپنی نفسیات کو بدلنا ہوتا ہے

آپ نے فلما زاغوا (61:5) دیکھا ہے جب اس نے اپنے لیے یہ روش اختیار کی تو اس کے بعد اس کی جو اندر کی صلاحیتیں تھیں، وہ خود اسی روش کے پیچھے پیچھے چل پڑیں۔ یہ وہ چیز ہے جسے قرآنِ کریم نے افراد کی بجائے اقوام کے سلسلے میں بھی کہا ہے۔ کہا ہے کہ یاد رکھو! یہ بڑا بنیادی اصول وقانون ہے۔ عزیزانِ من! یہ کہا ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ (13:11) یاد رکھیے! خدا کسی قوم کی حالت میں کوئی تغیر نہیں کرتا تاوقتیکہ وہ خود اپنی داخلی دنیا کے اندر ایک تغیر نہیں کر لیتی۔ اس سے قوم کی حالت بگڑتی یا سنورتی ہے کہ وہ قوم اپنے اندر کس قسم کی تبدیلی پیدا کرتی ہے۔ خارجی طور پر قوموں کے اندر جو یہ کچھ ہم کرتے ہیں، یہ ٹھیک ہے یہ مادی اسباب وذرائع اور وسائل ہوتے ہیں لیکن اس کا نام قوم کی حالت میں تغیر نہیں ہوتا۔ برادرانِ عزیز! قوم کی حالت میں تغیر اس سے آئے گا جس قسم کی وہ اپنے اندر تبدیلی پیدا کرے گی۔ جس قسم کی اندرونی تبدیلی ہوگی اس قسم کی باہر کی دنیا کے اندر اس قوم کی کیفیت ہو جائے گی۔ جس قسم کی نفسیاتی تبدیلی اس کے اندر آئے گی، جس قسم کی ذہنیت ان کے اندر آئے گی، جس قسم کا سیرت وکردار اس قوم کے افراد کا بنے گا، اس کے مطابق اس قوم کی خارجی دنیا مرتب ومتشکل ہوگی۔ یہی چیز افراد کے اوپر ہے۔ جس قسم کی ذہنیت وہ خود اپنے اندر مرتب کرتے ہیں، اسی اندازے کے مطابق اس کے اعمال نتیجہ مرتب کرتے چلے جاتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں یوں ہے کہ جس قسم کا انسان خود بن جاتا ہے اس کے مطابق خدا کا قانون اس کے پیچھے چلتا ہے۔

کائنات کے اندر خدا کا قانون تو ہر شے کے لیے ہر وقت ہر لمحہ کارفرما ہے

خدا کا قانون یہ ہے کہ آگ جلاتی ہے، انسان آگ میں انگلی ڈالتا ہے تو خدا کا یہ قانون اس کے اوپر حاوی ہو جاتا ہے کہ آگ جلا دیتی ہے۔ اگر یہ انگلی نہیں ڈالتا، خدا کا قانون تو اپنے مقام کے اوپر ہوتا ہے، وہ اس پر لاگو نہیں ہوتا۔ بات ذرا گہرائی میں سمجھنے کی ہے۔ میں بھی کوشش کرونگا کہ اسے دہرا دہرا کر سمجھاؤں۔ خدا کے قوانین تو کائنات میں جاری وساری ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کسی Particular Individual (خاص فرد) کے اوپر خدا کا کونسا قانون لاگو ہوتا ہے۔ سیر کرنے والا جو انسان ہے، جو اپنی عادات میں ریگولر ہے، جو صحت کے قوانین کی احتیاط برتتا ہے، اس پر خدا کا یہ قانون لاگو ہوتا ہے کہ اس کی صحت اچھی ہوتی ہے۔ زہر کھا لینے والے کے اوپر خدا کا یہ قانون لاگو ہوتا ہے کہ اس کی موت واقع ہونی شروع ہو جاتی ہے۔ جس قسم کا انسان خود اپنے آپ کو بناتا ہے، اس قسم کا قانون اس کے اوپر

Apply (لاگو) ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ قوانین خداوندی موجود ہیں۔ کسی فرد یا قوم پہ اس کا کونسا قانون لاگو ہوتا ہے' اس کا فیصلہ اس سے ہوتا ہے کہ وہ فرد یا قوم خود کس قسم کی بن جاتی ہے۔ اقبالؒ (1938-1877) نے اس چیز کو اپنے خاص انداز میں کہا ہے لیکن وہی جو میں دشواری کہا کرتا ہوں' عربی کی آیات ہیں' ان کا وہ ترجمہ کرنا پڑتا ہے' اسی طرح اس کے جو اشعار ہیں وہ فارسی میں ہوتے ہیں لیکن بہر حال میں کوشش کرونگا کہ ان کو بھی سمجھاؤں۔ کہتا ہے:

رمزِ باریکش بحرفے مضمر است

تقدیر کی رمز تو بڑی باریک سی ہے لیکن ایک لفظ کے اندر وہ بات آجاتی ہے اگر اس کو سمجھ لیا جائے۔ اور وہ بات یہ ہے کہ

تُو اگر دیگر شوی' او دیگر است!

اس (اقبالؒ) کو بھی سمجھانے کا وہ طریقہ فطرت نے دیا تھا۔ یہ ''بحرفے مضمر است'' کتنی بڑی چیز ہے! عزیزانِ من! آپ کو معلوم ہے کہ اسلام میں ہی نہیں' فکر کی دنیا کے اندر بھی' Plato (افلاطون: 347-428 ق م) کے زمانے سے آج تک یہ جبر اور قدر کے مسئلہ کے اوپر کتنا کچھ لکھا گیا ہے۔ اور اس کے بعد یہ ہے کہ ڈور کو سلجھا رہے ہیں اور سرا ملتا نہیں' کسی مسئلے کے حل پہ پہنچ ہی نہیں پاتے۔ وہ کہتا ہے کہ ''بحرفے مضمر است'' وہ تو ایک لفظ کے اندر ساری بات کہتا ہے کہ طے ہو جاتی ہے۔ اور وہ بات یہ ہے کہ

تو اگر دیگر شوی' او دیگر است!

اقبالؒ نے اس چیز کو کہاں سے لیا جو یہ ایک لفظ میں کہہ گیا ہے؟ وہ ہے کہ **اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ** (13:11)۔ اسی لیے تو اس نے پہلی مثنوی میں یہ کہا تھا کہ میں نے جو کہا ہے وہ تو قرآن سے کہا ہے۔ قرآن نے ایک لفظ میں یہ بات سمجھائی تھی کہ **فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ** (61:5) جیسے تم ہو' تقدیر کے خدا کے قانون کے معنی یہ ہیں: جس قسم کے تم بن جاتے ہو' اسی قسم کا خدا کا قانون تمہارے اوپر Apply (لاگو) ہو جاتا ہے۔

تو اگر دیگر شوی' او دیگر است!

اگر تُو بدل جائے تو تقدیر بھی بدل جاتی ہے۔ اب سمجھاتا ہے کہ

خاک شو نذر ہوا سازد ترا

تُو اگر گرد و غبار بن جائے تو کوئی ہوا کا جھونکا جو آئے گا' تجھے اپنے ساتھ اڑا کر لے جائے گا۔

سنگ شو بر شیشہ اندازد ترا!

تُو پتھر جیسی سختی پیدا کر لے' تُو ہر زجاج کو' ہر شیشے کو' چکنا چور کر کے رکھ دے گا۔ یہ کیا ہوا؟

تُو اگر دیگر شوی' او دیگر است!

آپ دیکھتے ہیں کہتا ہے کہ تیرے اپنے بدلنے سے تقدیر کیسے بدلتی ہے۔ تیرے اپنے بدلنے سے تیری تقدیر بدل جاتی ہے۔

شبنمی؟ افتندگی تقدیرِ تست!

کیا تُو شبنم ہے؟ اگر یہ بات ہے تو تیری تقدیر میں اوپر سے نیچے گرنا ہے' زمین کی پستیوں کی طرف آنا ہی تیری تقدیر ہے۔

قلزمی؟ پایندگی تقدیرِ تست!

کیا تُو سمندر ہے؟ اگر یہ بات ہے تو ہمیشہ رہنا تیری تقدیر ہے۔ اور اسی لیے آگے چل کر وہ یہ کہتا ہے کہ رونا پیٹنا کاہے کے لیے ہے؟

گر زیک تقدیر خوں گردد جگر

اگر کسی ایک تقدیر سے تیرا دل خون ہو رہا ہے' مصیبت آ رہی ہے' تنگی آ رہی ہے' تو یہ بات نہیں ہے کہ تُو اس کے اوپر بیٹھ کر رونا شروع کر دے کہ صاحب! یہ تو تقدیر اٹل ہے اس لیے

خواہ از حق حکمِ تقدیرِ دگر

اس سے ایک دوسری تقدیر مانگ لے۔ یعنی اگر ایک تقدیرِ خداوندی سے تُو مصیبت میں ہے تو اسکی دوسری تقدیر اختیار کر لے

تو اگر تقدیرِ نو خواہی رواست

تُو اگر نئی تقدیر چاہتا ہے تو یہ کوئی بری بات نہیں ہے۔ تُو یہ کچھ کر لے' کوئی دوسری نئی تقدیر اختیار کر لے کیونکہ

زانکہ تقدیراتِ حق لا انتہاست ❶

اللہ تعالیٰ کی تقدیرات کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ یعنی اگر تو تقدیر بدلنے کے لیے نئی تقدیر چاہتا ہے تو ضرور طلب کر۔

دعا سے ہم کائناتی قانون کو بدل نہیں سکتے البتہ انسان کو چاہیے کہ وہ خود کو قانون کے مطابق بدل لے

خدا کے لاانتہا قوانین پڑے ہوئے ہیں۔ ایک قانون جو تجھ پہ Apply (لاگو) ہو رہا ہے' اس سے اگر تُو دیکھتا ہے کہ دل گرفتگی ہو رہی ہے' مصیبت آ رہی ہے تو بجائے اس کے کہ اسی طرح سے اپنے آپ کو رکھے اور اس کو اپنے اوپر لاگو ہونے دیتا چلا جائے اور وہ تمہارے اوپر لپٹا چلا جائے تو دوسرا قانون اختیار کر لے کیونکہ وہ خود تو پیچھا چھوڑے گا نہیں اس لیے کہ تُو جیسا ہے' اس نے اسی طرح سے تیرا پیچھا کرتے چلے جانا ہے۔ اسی لیے تو اس کو عقوبت کہتے ہیں' عقاب کہتے ہیں۔ اس کے معنی ہوتا ہے ''کسی کا پیچھا کرنا'' اے کھوجی جو

---

❶ اقبالؒ: جاوید نامہ' شیخ محمد بشیر اینڈ سنز' لاہور' ص ص۔ 149 تا 150۔

کچھ کر دے نیں۔ یہ ہوتا ہے' عقب کہ کسی کے پیچھے پیچھے چلنا۔ خدا کا قانون انسان کے پیچھے پیچھے چلتا ہے۔ اگر یہ کوئی تکلیف دینے والی چیز ہے تو تُو دوسری طرف جو اس کا قانون ہے' اس طرف رُخ موڑ لے پھر وہ تیرے پیچھے چلے گا۔ اور یہ کوئی بُری بات نہیں ہے کہ دوسری تقدیر چاہتا ہے۔ اس کے ہاں تو لاانتہا تقدیرات ہیں' تُو ہی ایک تقدیر کے اوپر مطمئن ہو کر بیٹھ گیا اور پھر رونا شروع کر دیا۔ اب روتے رہو۔ عزیزانِ من! غلط راستے پر چلتے جایئے اور اس کے بعد روتے جایئے کہ ''ایناں پینڈا کر لیا' اے پیراں اچ چھالے وی پے گئے' پنڈ آیا نئیں ہیگا۔ روندے جاؤ تے ترے جاو اوسے رستے اتے' تے فیر روندے جاؤ' اوسو ہری دیا! آ راہ کیوں نئیں بدل دا؟ کہ جی! اللہ نے لکھیا ایہوای ہیگا ایسے رستے چلنا۔ تے فیر رونا کیوں ❶ این؟''۔

اگر کسی شخص نے ایک خاص وقت تک کے لیے بیمار رہنا ہی ہے تو پھر علاج کا مقصد؟

عزیزانِ من! یہ الجھاؤ ہیں۔ میں نے کہا ہے کہ یہ الجھاؤ آپ بیچارے عوام کو ہی نہیں دیکھیں گے اسمیں خواص بھی مبتلا ہیں کہ صاحب! بیماری آتی ہے تو خدا کے حکم سے آتی ہے اور جب اس نے لکھا ہے کہ آئے گی' اور اس دن جائے گی تو پھر اس کے ساتھ ہی آپ یہ علاج ولاج کیوں کراتے ہیں؟ کہ جی! یہ فریضہ ہے۔ ''کیوں نئیں کیندا لڑائی ہے خدا نال ❷''۔ یعنی اس نے کہا ہے کہ تین دن کے بعد بخار اتر جائے گا' تم ڈاکٹر صاحب سے یہ کہتے ہو کہ ڈاکٹر صاحب! ایسا Injection (ٹیکا) دیجیے کہ شام تک کسی طرح سے اتر جائے' یہ تو خدا کے ساتھ جنگ ہو رہی ہے۔ دیکھا آپ نے کہ ایک غلط اٹھا ہوا قدم کہاں کہاں لے جا رہا ہے۔ بات ساری یہ تھی جو قرآن نے کہی تھی کہ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ (13:11) اپنے اندر تبدیلی کرو' باہر سے میرا قانون بدل جائے گا' دوسرا قانون آ کر لاگو ہو جائے گا۔

پوری کائنات کا ایک ایک ذرہ تقدیراتِ حق کا محتاج ہے

کہا ہے کہ فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ (61:5) جب انہوں نے اپنے آپ کو بدل لیا تو پھر ہمارا وہ قانون ان کے پیچھے لگ گیا جو بدلنے والا ہوا کرتا ہے۔ یہ ہیں تقدیراتِ حق۔ آپ کی ہر کیفیت' ہر فیصلے' ہر ذہنیت' کے مطابق ایک قانون ہے۔ ہر سانس میں بدلتا چلا جا' ہر سانس میں اس کا دوسرا قانون آتا چلا جائے گا۔

---

❶ اتنا فاصلہ طے کر لیا کہ پاؤں میں چھالے پڑ گئے مگر گاؤں نہیں آیا۔ روتے جاؤ اور اسی راستہ پہ چلتے جاؤ اور پھر روتے دھوتے چلے جاؤ۔ او پگلے! راستہ کیوں نہیں بدلتے؟ کہ جی! اللہ نے اسی راستے پہ چلنا لکھا ہے۔ پھر روتے کیوں ہو؟

❷ کیوں نہیں کہتے کہ خدا کے ساتھ جھگڑا ہے۔

زانکہ تقدیراتِ حق لاانتہاست

اللہ تعالیٰ کی تقدیرات کی کوئی انتہا نہیں ہے' بس یہ Initiative (پہل کرنا) تمہارے ہاتھ میں ہے' یاد رکھو!

ابھی میں آگے چل کر بتاتا ہوں کہ یہ قوانین کیا ہیں اور اس میں اللہ کا کیوں نام آیا ہوا ہے۔ بات چلی آئی تھی کہ خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوۡبِہِمۡ (2:7) دلوں پر مہریں لگ جاتی ہیں۔ اس کے لیے پہلی چیز میں نے یہ کہی تھی کہ کفر کی وجہ سے دلوں پر مہر لگتی ہے۔ یہ پہلی بات آ گئی۔ اب وہ جو دونوں آیتیں ہیں' ان کا ربط سمجھ میں آ گیا۔ کہ کفر کی وجہ سے دلوں پہ مہریں لگیں' یہ نہیں ہے کہ اللہ نے پہلے دلوں پہ مہریں لگا دی تھیں اس لیے یہ کافر ہی پیدا ہوئے' کافر ہی مر گئے۔ پہلی بات صاف ہوگئی۔ اب دو چار آیات اور دیکھیے کہ مہریں کیسے لگتی ہیں۔ کہا ہے کہ وَخَلَقَ اللّٰہُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ بِالۡحَقِّ (45:22)۔ یہ جس کو نو آسماں بہ گردش و درمیانہ ایم کہتے ہیں' ہمارے ہاں تو یہ ہوگیا کہ جو گردشِ افلاک ہے' وہ پیس رہی ہے۔ اس میں پس رہے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ یہ جو سلسلۂ کائنات ہم نے پیدا کیا ہے تو یہ بالحق پیدا کیا ہے۔ یہ بالحق والی بات تو پھر کبھی بتاؤنگا قرآن میں یہ کیا بتایا گیا ہے۔ یہ سلسلۂ کائنات کس لیے پیدا کیا؟ وہ پوچھتے ہیں کہ صاحب! بالآخر اس Universe (کائنات) کی Creation (تخلیق) کا Purpose (مقصد) کیا ہے۔ کہا ہے کہ وَلِتُجۡزٰی کُلُّ نَفۡسٍۭ بِمَا کَسَبَتۡ وَہُمۡ لَا یُظۡلَمُوۡنَ (45:22) تاکہ ہر فرد کو اس کے اعمال کا صحیح صحیح بدلہ مل جائے اور کسی پہ ظلم اور زیادتی نہ ہو۔ یہ سارا سلسلۂ کائنات اس لیے چکر میں ہے' اس لیے پیدا کیا گیا ہے کہ ہر فرد کو اس کے عمل کا صحیح صحیح بدلہ مل جائے۔ برادرانِ عزیز! آپ دیکھتے ہیں کہ ان آیات کی موجودگی میں یہ چیز کہنا کہ یہ ساری چیزیں پہلے سے ہی طے ہیں اور انسان پر ان کی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی کیسے دُرست ہوسکتی ہے۔

مہریں کیسے لگتی ہیں؟ جو اسکے جذبات کہیں ''وہی کرتا چلا جائے''

آگے چلیے! مہریں کیسے لگتی ہیں؟ کہا ہے کہ اَفَرَءَیۡتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰـہَہٗ ہَوٰىہُ (45:23) کیا تُو نے اس شخص کی حالت پہ بھی غور کیا ہے جس نے اپنی خواہشاتِ نفسی کو اپنا خدا بنالیا' وہ انہی کا محکوم ہوگیا؟ وہ اپنے ہی جذبات سے مغلوب ہوگیا' نہ قاعدہ قانون' نہ کوئی مستقل اقدار' نہ عقل و فکر۔ یہ ہیں ھوٰہ۔ اور پھر ھوٰہ کی کیفیت یہ ہے۔ عربی زبان میں یہ جو لفظ ہے اس کے اندر ''کسی چیز کا بلندیوں سے پستیوں کی طرف چلے آنا'' ہوتا ہے۔ پہاڑ کی چوٹی سے پتھر کو چھوڑ دیئے' اسے وہاں سے لڑھکا دیجیے تو وہ اپنے ہی Momentum (معیار حرکت) سے جوں جوں نیچے آتا چلا جاتا ہے' اس کی رفتار میں تیزی آتی چلی جاتی ہے۔ اس کیفیت سے جو گرنا ہوتا ہے' وہ ھوٰہ ہوتا ہے۔ اور یہ چیز ہے جو عربوں نے اپنے ہاں جذبات کے لیے یہ لفظ تجویز کیا تھا۔ کیا بات ہے اس قوم کی! عزیزانِ من! ذرا سے آپ اس کے

پیچھے لگ گئے' پہلے دن تو اس کی رفتار بڑی خفیف سی ہوتی ہے' جوں جوں آگے بڑھتے چلے جایئے' یہ اپنے ہی Momentum (معیارِ حرکت) سے تیزی اختیار کرتا چلا جاتا ہے۔ اتنی تیزی اختیار کر لیتا ہے کہ پھر راستے میں روکنا مشکل ہو جاتا ہے۔

مغربی تہذیب کے نظریاتی دلائل' انکے سرکش جذبات کے نتائج اور ماحصل

ارشاد خداوندی ہے کہ تم نے اس کی حالت پہ بھی غور کیا ہے جس نے اپنے اس قسم کے پست جذبات ہی کو اپنا معبود بنالیا۔ **وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ** (45:23) اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ علم و بصیرت رکھنے کے باوجود غلط راستے کے اوپر چل رہے ہیں۔ آپ خاص طور پر جذبات کو خدا بنانے والوں کو دیکھیے گا یہ ہمارے ہاں کا علم و بصیرت والا طبقہ ہے یا جو ساری دنیا کا علم و بصیرت والا طبقہ ہے یا قوم کے اعتبار سے West (اہلِ مغرب) کو لے لیجیے تو وہ سب سے بڑی Inellectual (دانشور) سی قوم نظر آتی ہے' ہم بھی جو لوگ Intellectual (دانش) والے بتاتے ہیں آپ ان کو جذبات کے اوپر دیکھیے کہ جب وہ ان پہ چلتے ہیں تو اسی چیز کے خلاف' پلیٹ فارم پہ یا درسگاہ میں' ان کے ہاں سے دلائل سنیئے' تو اتنے اتنے منطقی دلائل لائیں گے صاحب! کہ نظر آجائے گا کہ Conviction (ایمان) ہے' محکم دلائل ہیں' دوسری طرف ان کی زندگی دیکھیے تو انہی مفاد کے پیچھے اس طرح سے لگے ہوئے ہیں کہ آنکھیں بند ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ علم و بصیرت کے باوجود پھر یہ اندھے ہو جانے والے ہیں اور آگے ہے کہ **وَّخَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً** (45:23) اور یوں ان کے کانوں پر ڈاٹ لگ جاتی ہیں' دلوں پہ مہریں لگ جاتی ہیں' ان کی آنکھوں پہ پردے پڑ جاتے ہیں۔ اب کہیے کہ **فَمَنْ يَّهْدِيْهِ مِنْ ۢ بَعْدِ اللّٰهِ** (45:23) اس قانونِ خداوندی کے بعد اب ان کو صحیح راستے کے اوپر کون لے آئے گا۔ آپ نے دیکھا کہ مہریں کیسے لگتی ہیں۔ اپنے جذبات ہی کو اپنا خدا بنالینا' اس کے بعد سمجھنے سوچنے کی' صحیح فیصلہ کرنے کی' قوت ہی مفقود ہو جاتی ہے۔ یہ ہے جسے کہا ہے کہ مہریں لگ جاتی ہیں۔ قرآنِ کریم نے اس زمانے کے ایک خاص گروہ کا ذکر کیا ہے۔ کہتا ہے کہ ان لوگوں کی کیفیت یہ ہے کہ **وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُ اِلَيْكَ حَتّٰۤى اِذَا خَرَجُوْا مِنْ عِنْدِكَ قَالُوْا لِلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مَاذَا قَالَ اٰنِفًا** (47:16) تمہاری مجلسوں میں آکر بیٹھتے ہیں' قرآن پیش کیا جاتا ہے' تُو ان کو سمجھاتا ہے' بظاہر نظر آتا ہے کہ بڑے Attentively (غور و فکر سے) سن رہے ہیں۔ کیفیت یہ ہے کہ تمہاری محفل سے اٹھ کر جاتے ہیں تو اُن لوگوں سے' جنہوں نے یہ باتیں دھیان سے سنی تھیں پوچھتے ہیں کہ اس نے کیا کہا۔ غور کیا آپ نے۔ ایسے سننے والے جو ہیں ان کے متعلق کہا ہے کہ **اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ** (47:16) یہ ہیں جن کے دلوں کے اوپر مہریں لگتی ہیں۔ یہ کیا ہوا؟ محفل میں بیٹھا بھی تھا' آوازیں بھی آرہی تھیں۔ آپ نے بھی کسی محفل میں بیٹھے ہوئے اسے Experience کیا ہوگا۔ اور خیالات اپنے کہیں اور لے جایئے' سوچے کچھ اور' بیٹھے محفل میں' ایک لفظ بھی جو آپ کے کان میں پڑتا ہے' سنائی دیتا ہے؟ آپ کی سماعت کی قوت تو اس وقت برقرار ہوتی ہے' اس میں کوئی نقص نہیں ہوتا۔ یہ کیا ہوا ہے؟ کہ کانوں میں

ڈاٹ لگ گئے' جسے کہتے ہیں کہ بیٹھے یہاں ہیں' سوچ کچھ اور رہے ہیں۔ اور وہیں یہ بات کہہ دی کہ یہ ایسا کیوں ان کے ساتھ ہوتا ہے اس لیے کہ وَاتَّبَعُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ (47:16) ہر وقت یہ اپنے مفاد کے پیچھے لگنے کی سوچتے رہتے ہیں۔ اس لیے بظاہر Physically (طبعی طور پر) جو چیز ان کے کان میں جا کر پڑتی ہے وہ بھی ان کو سماعت کا کام نہیں دیتی۔ اس کو یوں کہیے کہ کہنے والے کی آواز کانوں میں جاتی ہے' آگے ایک ڈاٹ لگا ہوا ہے' جو اس کو اندر نہیں جانے دیتا۔ یہ ڈاٹ کیا ہے؟ کہا ہے کہ وَاتَّبَعُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ (47:16) وہ اپنی ہی مفاد پرستیوں کی سوچتے رہتے ہیں۔ اور ایک آیت (83:14) نے تو معاملہ بالکل صاف کر دیا۔ کہتا ہے کہ یہ پوچھتے ہیں کہ یہ جو قلوب کے اوپر کہتے ہو کہ مہریں لگتی ہیں' یہ زنگ لگتے ہیں تو سوال یہ ہے کہ یہ کیسے لگتے ہیں؟ کہا کہ اس کے جواب میں کوئی کچھ کہے گا' کوئی کچھ کہے گا۔ یہ بڑی عجیب بات ہے کہ قرآن کا جواب دینے کا انداز بھی خوب ہوتا ہے' جہاں وہ باقی چیزوں کو کاٹ کر رکھ دیتا ہے کہ کچھ ایسا کہے گا تو کہا کہ کلا نہیں بھئی! بات یوں بالکل نہیں ہے بل' بلکہ بات یہ ہے کہ رَانَ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ (83:14) جو کچھ یہ اعمال کرتے ہیں' وہی زنگ بن کر ان کے دلوں کے اوپر بیٹھ جاتا ہے' اسی کو خدا کی طرف سے لگائی ہوئی مہریں کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد تو عزیزانِ من! میں سمجھتا ہوں کہ کچھ اور کہنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔

جبر کا عقیدہ' اور مشیت ایزدی

یہ جو جبر کا عقیدہ ہے کہ خدا ہی سب کچھ کرتا ہے' اسی کی مشیت سے یہ کچھ ہوتا ہے' انسان تو مجبورِ محض ہے' اس میں یہ تبدیلی نہیں کر سکتا۔ یہ کوئی نیا عقیدہ نہیں جو اسلام کے بعد مسلمانوں ہی کے ہاں پیدا ہوا ہو' یہ پرانا چلا آ رہا تھا۔ اس میں Escapism (فرار) کے لیے بڑی گنجائش نکلتی ہے' وہ ذمہ داریوں سے بچ جانا ہے۔ آپ کے خلاف ہزار الزامات عائد کیے جائیں' ایک ہی ان کا جواب ہوتا ہے کہ میاں صاحب! خدا کی مرضی یہ ہے' ہم اس کے بعد کر کیا سکتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ اتنی سی ہی بات ہے کہ

گناہ اگرچہ نبود اختیارِ ما حافظ
تو در طریقِ ادب کوش و گو گناہِ من ست

یہ جو گناہ ہے اس کا اصل ذمہ دار تُو نہیں ہوتا' یہ تیری وجہ سے نہیں ہوتا' ہوتا تو خدا کی وجہ سے ہے۔ اب یہی ہے کہ چونکہ وہ بڑا واقع ہوا ہے' اس لیے ادب کا تقاضا یہ ہے کہ تُو کہہ دیا کر کہ ہاں صاحب! میں نے ہی کیا ہے۔

ظاہریت پر مبنی کچھ الفاظ کہہ دینے کا نام احترام رکھ دیا گیا

لے بھئی! آپ دیکھ رہے ہیں احترامِ خداوندی!! یہ احترام کس قسم کا احترام ہے؟ ''او ہو جیا ای احترام ہے جیس طراں نال اوتھا نے

وچ اقبالِ جرم کرلیندا اے گا[1] ''لیکن میں نے کہا ہے کہ آپ دیکھیے کہ یہ چیز کیسے چلی آرہی ہے؟ یہ چیز چلی آرہی تھی اور میں نے عرض کیا ہے کہ اس میں چونکہ راہِ فرار(Escapism) ہوتی ہے' اس لیے یہ جو عقیدہ ہے' وہ اس سے چسپاں رہتا ہے۔قرآن کے زمانے میں بھی یہ تھا کہ وَاِذَا قِيۡلَ لَهُمۡ اَنۡفِقُوۡا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ (36:47)ان سے کہا جاتا ہے کہ ایسا نظام قائم کرو کہ کوئی بھوکا نہ رہے' جو کچھ خدا نے زندگی کے لیے سامانِ زیست دیا ہے اسے یوں کھلا رکھو کہ ہر ایک کو ملتا جائے اور کوئی بھوکا نہ رہے۔کتنی معقول بات ہے! قَالَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا لِلَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا (36:47)۔عزیزانِ من! کیا بات قرآن کی ہے! کفر اور ایمان کا آپ امتیازی نشان' ذہنیت' حدِ فاصل' امتیازی چیز دیکھیے کہ وہ کافر ایمان والوں سے یہ کہتے ہیں کہ اَنُطۡعِمُ مَنۡ لَّوۡ يَشَآءُ اللّٰهُ اَطۡعَمَهٗۤ (36:47)ارے! کیا تم نے کہہ دیا!! جن کو خدا بھوکا رکھنا چاہتا ہے اس کی مشیت میں یہ ہے کہ یہ بھوکے رہیں' تو کیا ہم ان کو کھلائیں؟ ارے! خدا کے خلاف جنگ ہم کریں!! کہا ہے کہ کافر مومن سے یہ کہتے ہیں۔اور جب یہ اسلام کی گاڑی دوسری پٹڑی پہ پڑی تو مومن یہی کچھ کہنے لگ گئے' برادرانِ عزیز! کہ یہ سب اس کی مشیت سے ہوتا ہے۔ان سے کہو کہ اِنۡ اَنۡتُمۡ اِلَّا فِىۡ ضَلٰلٍ مُّبِيۡنٍ (36:47) گمراہی اور ایسی کھلی ہوئی گمراہی اس سے بڑی گمراہی اور کیا ہوسکتی ہے۔یہاں ضلٰل آیا ہے اور ضلٰل بھی ضَلٰلٍ مُّبِيۡنٍ ہے۔اور آپ کے ہاں یہ عین اسلام بن گیا ہوا ہے' یہ جزوِ ایمان بن گیا ہوا ہے۔

ایک اور آیت (43:20) میں کہا ہے کہ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ بھئی! ان بتوں کی پرستش کیوں کرتے ہو' مزاروں پہ کیوں جاتے ہو' انسانوں کو کیوں خدا بنا رہے ہو' یہ غیر خدا کی عبودیت کیوں اختیار کیے ہوئے ہو؟ جب ان غلط راستوں کے متعلق کہا جاتا ہے تو کہتے ہیں کہ وَقَالُوۡا لَوۡ شَآءَ الرَّحۡمٰنُ مَا عَبَدۡنٰهُمۡ (43:20)اگر خدا کی مشیت میں یہ ہوتا' وہ چاہتا تو ہم کیسے ان غلط چیزوں کی پرستش کرتے صاحب! یہ تو مشیتِ ایزدی ہے' یہ تو اس نے ہی وہ چاہا ہے ہم جو کچھ کر رہے ہیں۔دیکھ رہے ہیں آپ! وہی الفاظ ہیں جو ہم صبح سے شام تک دہراتے چلے جاتے ہیں۔اور دہراتے ہی نہیں' جو زیادہ دہراتا ہے اس کو ہم زیادہ خدا پرست اور مقرب سمجھتے ہیں' وہ راضی برضا ہو جاتا ہے۔کہا ہے کہ مَا لَهُمۡ بِذٰلِكَ مِنۡ عِلۡمٍ (43:20)۔کیا بات ہے قرآن کی! محض عقیدے کے زور پہ یہ بات نہیں منواتا کہ نہیں! یہ نہیں' یہ عقیدہ رکھو۔کہا ہے کہ ان سے کہو کہ علم کی بارگاہ سے پوچھیں' ان کو تو وہاں سے بھی اس کی سند نہیں ملے گی۔اِنۡ هُمۡ اِلَّا يَخۡرُصُوۡنَ (43:20) یہ قیاس آرائیاں ہیں' یہ Escapism (فراریت) کی وہ ہے' جسے ہم Justificatory Reason (وجہ جواز) کہتے ہیں۔

---

[1] وہ اسی طرح کا احترام ہے جس طرح پولیس تھانے میں اقبالِ جرم کرالیا جاتا ہے۔

ساتواں باب: سورۃ البقرۃ (1)، (آیت 8)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ یَّقُوۡلُ اٰمَنَّا بِاللّٰہِ وَبِالۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَمَا ہُمۡ بِمُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۸﴾

عزیزانِ من! آج جولائی 1968ء کی 7 تاریخ ہے اور ہم اپنے قرآنِ کریم کے سلسلۂ نو میں سورۃ البقرۃ کی ابتدائی آیات سے گزر رہے ہیں۔

قرآن حکیم کے پیش کردہ مفہوم کے برعکس لفظ عذاب کا خودساختہ تصور

سابقہ درس میں یہ حقیقت سامنے آئی تھی کہ وہ لوگ جو اپنی یہ کیفیت پیدا کرلیں کہ سمجھنا سوچنا چھوڑ دیں اور جو بات ان کے سامنے پیش کی جائے، محض ضد، تعصب، حسد، کینہ یا اندھی تقلید حتیٰ کہ تقدیر کے عقیدے کے ماتحت بھی، اس پہ غور وفکر نہ کریں، بلکہ اسے یونہی رد کردیں، تو ان کے لیے کہا یہ ہے کہ ان کی اس روش کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آہستہ آہستہ ان کے سمجھنے سوچنے کی صلاحیتیں ہی مفلوج ہوجاتی ہیں۔ جب یہ صلاحیتیں مفلوج ہوجاتی ہیں تو وہ کہتے ہیں کہ چلو اچھا ہوا، غور وفکر کی محنت سے بچ گئے لیکن یہ لوگ وہ ہیں جیسا کہ میں نے تفصیلاً عرض کیا تھا کہ جن میں سمجھنے سوچنے کی صلاحیتیں ہوتی ہیں، انکار کے معنی یہ ہیں کہ ان کے خلاف روش اختیار کرتے ہیں تو ان کے لیے کہا گیا ہے کہ وَ لَہُمۡ عَذَابٌ عَظِیۡمٌ (2:7) ان کے لیے عذاب عظیم ہے۔ یہ نہیں ہے کہ سمجھنے سوچنے کی صلاحیتیں نہیں ہیں تو نہ سہی بلکہ ان کی اس روش کا نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ عذاب کا یہ لفظ بڑا غور طلب ہے۔ قرآنِ کریم میں آپ دیکھیں گے کہ شروع سے آخر تک اس لفظ کو دہرایا گیا ہے۔ ہمارے ذہنوں میں تو اس کے لیے کچھ تصور ہی اپنا قائم کردہ ہے اور وہ تصور یہ ہے کہ مرنے کے بعد قبر میں ہی، حالانکہ یہ بھی عقیدہ ہے کہ جو حساب کتاب ہے وہ قیامت میں جا کر ہوگا، تو گویا حساب کتاب سے پہلے ہی Undertrial (زیرِ آزمائش) ملزموں کے ساتھ یہ کچھ ہوتا ہے، کہتے ہیں کہ وہیں قبر سے یہ عذاب شروع ہوجائے گا۔ یعنی یہ فیصلہ تو بعد میں جا کر ہوگا کہ یہ مجرم بھی ہے یا نہیں۔ اور

پھر وہ عذاب کی شکلیں بتاتے ہیں۔

اب تو وہ گھروں میں نہیں آتیں البتہ ہمارے بچپن میں ''اوزیارتاں وکھانوالیاں اوندیاں ہوندیاں سن ❶''۔ ہماری عمر کے بڑے بوڑھے جانتے ہیں کہ یہ کیا ہوتی تھیں۔ اس کتاب میں اتنی اتنی ڈراونی شکلیں بنی ہوتی تھیں کہ وہ بھی رو رہی ہیں' وہ تو مصنوعی روتی تھیں اور جناب یہ بیٹھی ہوئی ساری عورتیں سہمی ہوئی ڈری ہوئی رو رہی ہیں' برا حال ہو رہا ہے۔ اور جب وہ اس طرح سے ان کے دل کو یوں نرم کر لیتی تھیں تو پھر کہا کرتی تھیں کہ اس عذاب سے بچنے کے لیے ''سٹو پیسے ❷''۔ عذاب کا تصور کچھ اس قسم کا ہے۔ اس کے بعد جہنم کا تصور بھی کچھ اسی قسم کا ہے جس میں اذیت' تکلیف' اور سختی ہے۔

عربی زبان کی بنیادی خصوصیت اور عذاب جہنم کا قرآنی مفہوم

برادرانِ عزیز! بات یوں نہیں ہے۔ اور میں کہونگا' جیسا کہ میں دہرایا کرتا ہوں' خود عربی زبان کا یہ اعجاز ہے اور اسی سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کتاب کے لیے جو مصنف کی آخری کتاب ہے' اور مصنف خود خدا ہے' جس زبان کا انتخاب کیا گیا ہے' وہ زبان واقعی اس قابل تھی کہ قرآن جیسے حقائق کی متحمل ہو سکتی۔ آپ دیکھیے گا کہ اس ایک لفظ عذاب کے اندر ساری معنویت کس طرح سمٹ کر آ گئی ہے کہ یہ بات ہے کیا۔ قرآن کی رو سے زندگی کا تصور Progressive (حرکی) ہے یعنی حرکت ہے' حرارت ہے' ترقی ہے' آگے بڑھنا ہے' اور بڑھتے چلے جانا ہے۔ کسی مقام پہ رک جانا زندگی کے منافی ہے۔ یہ جو کہیں سلسلۂ ارتقا میں' Evolution (ارتقا) کے Process (طریق کار) میں اس شدید احساس کے ساتھ رک جانا ہے کہ میں آگے نہیں بڑھ سکتا' عذاب ہے۔ اس میں یہ بھی شدید احساس ہوتا ہے کہ اس مقابلے میں دوسرے افراد' اقوام جو زندگی کی دوڑ میں آگے بڑھتے چلے گئے' میں نہیں آگے بڑھ سکتا۔ وہ رک جانے والا' وہ امتحان میں فیل ہو جانے والا' امتحان بھی وہ کہ آخری چانس ہو' اس کے بعد دوبارہ چانس نہ مل سکے' اس رکنے کا جو شدید احساس ہے' وہ ہے یہ عذاب کہ پھر زندگی کی شیرینیوں سے' آگے بڑھنے سے' متمع ہونے کی صلاحیت ہی نہ رہے۔ اس میں روکنے کا پہلو نمایاں ہے۔

آپ سوچیے کہ اگر فی الواقعہ وہ بچہ حساس ہے' تو وہ رک جانا اس کے لیے کیا معنی رکھتا ہے اور زندگی کی دوڑ میں اس شدید احساس کے ساتھ کسی ایک مقام پہ رک جانا' کہ میں کبھی آگے نہیں بڑھ سکوں گا' حقیقت میں یہ جو اس طرح کا رک جانا ہے یہ عذاب ہے۔ اسی لیے قرآنِ کریم نے جہنم کے لیے **جحیم** کا لفظ اختیار کیا ہے اور **جحم** کے معنی ہی ہیں ''کسی کو کسی مقام پہ روک دینا''۔ ہمیں تو اس کا احساس ہو ہی نہیں سکتا اس لیے

---

❶ وہ (اس عذاب کی) زیارتیں دکھانے والی آیا کرتی تھیں (اور مختلف قسم کے عذابوں کی تصاویر دکھاتی تھیں)۔

❷ رقم ادا کرو۔

کہ ہم تو رکنے کے ایسے عادی ہو گئے ہیں کہ ہمارے نزدیک جو Progress (ترقی) ہے، وہ جہنم میں لے جانے والی ہے۔ ہر خطبے میں، ہر جمعہ میں، ہر نماز میں کُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ وَكُلُّ ضَلَالَةٍ فِي النَّارِ دہرایا جاتا ہے کہ ہر نئی چیز گمراہی ہے، ہر گمراہی جہنم میں لے جاتی ہے۔ اب جہاں تصور یہ ہو کہ اگر کوئی نئی چیز ذہن میں بھی آئے تو جہنم میں چلے گئے، اس قوم کو یہ کیا معلوم ہو کہ جو رکنا ہے وہ کیسے عذاب ہوتا ہے۔ کسی ایک مقام پہ جو رک جانا ہے پھر اس رکنے کی صورت یہ ہے کہ کوئی خارجی موانع ہوں، کوئی آپ کے راستے میں کھڑا ہو جائے، آپ مجبور ہو گئے ہیں، یوں روک دیئے گئے، یہ عذاب نہیں ہے کیونکہ آپ کے اندر بڑھ جانے کی تڑپ ہے، آرزو ہے، خواہش ہے، آپ چاہتے ہیں کہ یہ بند ٹوٹے تو میں جست لگا کر آپ چلا جاؤں مگر اسمیں کوئی خارجی موانع سامنے آ گئے ہیں، یہ عذاب وہ بات نہیں ہے۔ اندر اس قسم کی تبدیلی پیدا ہو جائے کہ آپ اندر کی ایک تبدیلی سے کسی چیز پہ رک جائیں، اس رکنے میں خارجی موانع نہ ہوں تو یہ ہے جسے عذاب کہا جاتا ہے۔

اور سنیے! ان عربوں کے ہاں اس چیز کو سمجھانے کے لیے کیا کیفیت تھی جس کے اظہار کے لیے یہ لفظ استعمال کرتے تھے؟ عرب کی سی سرزمین میں شدت کی گرمی تھی، صحرا میں پانی کی کم یابی تھی، اُس میں جانوروں کو پیاس لگتی تھی اور ایک عرصے تک پیاس کی وجہ سے ان کے اندر یہ کیفیت پیدا ہو جاتی تھی کہ ان کے سامنے چارہ رکھا ہوا ہوتا تھا تو وہ چارہ نہیں کھا سکتے تھے۔ یہ ہوتی تھی شدتِ پیاس۔ آپ کی بھی اگر یہاں یہ حالت ہو تو آپ دیکھیں گے کہ کھانے کی طرف طبیعت نہیں جاتی، انسان اس سے رکتا ہے۔ یہ جو کیفیت تھی کہ شدتِ پیاس سے اندر ایک اس قسم کی کیفیت پیدا ہو کہ وہ جانور زندگی کے سامان کے تمتع حاصل کرنے سے، فائدے حاصل کرنے کے سے، رک جائیں تو یہ جو کیفیت تھی، وہ اس کو عذاب کہا کرتے تھے۔ اب آپ سوچیے کہ عذاب کیا ہوا؟ یہ کہ سامانِ زیست سے فائدہ حاصل ہونے سے رک جانا اور یہ نتیجہ ہو انسان کے اپنے ان اعمال کا، جو اس کے اندر اس قسم کی کیفیتیں پیدا کر دیں۔ اصل چیز رک جانا ہے اور روک ہی ہے جو عذاب ہے۔

انسانی زندگی کے لیے کسی مقام پر رک جانے کے متعلق نبی اکرم کی ایک حدیث مبارکہ

برادرانِ عزیز! ایک مقام پہ رک جانا تو اتنا بڑا عذاب ہے۔ حضورِ نبی اکرم ﷺ کی وہ حدیث ہے، جو پتھروں کے ڈھیر میں بھی چمکتے ہوئے موتی کی طرح درخشندہ نظر آتی ہے، اس میں پورے قرآن کی تعلیم کا نچوڑ آ جاتا ہے کہ فَمَنِ اسْتَوٰی يَوْمَاهُ مَغْبُوْنٌ جس کے دو دن ایک جیسے گزر جائیں سمجھ لیجیے کہ وہ تباہ ہو گیا۔ ''آج''، جس کا قدم ''کل'' سے آگے نہیں پڑا، تباہ ہو گیا۔ چار الفاظ ہیں، عزیزانِ من! ساری بات اس میں کہہ دی گئی کہ جس کے دو دن ایک جیسے گزر جائیں ''آج'' کل کے مقابلے میں اس کا ایک قدم آگے نہیں اٹھا، وہ تباہ ہو گیا۔

سلسلۂ ارتقا میں قوموں کی یا افراد کی تو کیفیت یہ ہونی چاہیے کہ ہر نیا چڑھنے والا سورج انہیں ایک قدم آگے لے کر جائے۔

روشن مستقبل کے برعکس ہماری بدعملی کی انتہا کا نتیجہ

اس کے برعکس جس قوم کی کیفیت یہ ہو جائے اور پھر قیامت بالائے قیامت وہ یہ کہ اپنی اس کیفیت کے لیے کہ وہ کچھ روایات وضع کریں اور انہیں اس ذاتِ اقدس و اعظم ﷺ کی طرف منسوب کر دیں جنہوں نے اپنی امت کی بے کسی و بے بسی کے لیے یہ فرمایا ہے۔ پھر آپ کے ہاں روایات اور اسکی بنا پہ تصور یہ ہو کہ جتنا آپ پیچھے ہٹتے چلے جائیں' اتنا ہی آپ کے ہاں کے جو ماضی کے دور ہیں وہ درخشندہ ہوتے چلے جائیں یعنی آپ کے ہاں سے پیچھے ہٹنے سے' زندگی درخشندہ ہو' اور جتنا آگے بڑھتے چلے جائیں' وہ تاریک سے تاریک تر ہوتی چلی جائے۔ وہ تو یہ کہا گیا تھا کہ ایک مقام کے اوپر جو کھڑے ہو جاتا ہے' جو رک جاتا ہے' وہی تباہی ہے چہ جائیکہ کیفیت یہ ہو کہ

'' اس کے دل سے پوچھیے' اس کے جگر سے پوچھیے
آج جس کی منزل مقصود کل سے دور ہو''

ہر نیا دن ایک قدم پیچھے لے جا رہا ہو۔ آپ سوچتے ہیں' عزیزانِ من! کہ اس سے بدتر' شدید تر' سنگین تر' عذاب کی شکل کوئی اور بھی ہو سکتی ہے!!! لیکن ہم نے تو وہ جہنم مقام ہی دوسروں کا رکھا ہوا ہے' اپنا مقام ہی نہیں رکھا ہوا۔ یہاں کہا ہے کہ **وَّ لَهُمۡ عَذَابٌ عَظِيۡمٌ** (2:7)۔ یہ ہماری کیا حالت ہوگئی؟ اور کیوں ہوگئی اس امت کی یہ حالت؟ سمجھنے اور سوچنے کی صلاحیتیں ہی گم ہوگئیں' چھوڑ ہی دیا سوچنے سمجھنے کو یا تو کچھ کیا نہیں اور اگر کہیں کچھ کیا ہے تو محض جذبات سے مشتعل ہو کر اس قوم نے کیا ہے۔ سوچنے سمجھنے کے بعد' ٹھنڈے دل سے پروگرام بنا کر' اس کے اوپر نہایت استقامت سے جادہ پیما ہونے کی بات ہی اس کے اندر نہیں رہی۔

عذاب کی مختلف شکلیں

میں نے عرض کیا ہے کہ سارے قرآن میں آپ دیکھیں گے کہ بڑی تفصیل سے یہ عذاب کا لفظ آئے گا' اس لفظ کی تشریح آئے گی' تفسیر آئے گی' عذاب کی مختلف شکلیں سامنے آئیں گی۔ آج کی نشست میں تو میں اس کی صرف دو ایک شکلیں پیش کر دونگا جن سے تصور آپ کے سامنے آ جائے کہ یہ ہے کیا چیز۔

ذلت و خواری: پہلی قسم

پہلی چیز تو یہ ہے کہ ہم نے عذاب کو صرف قیامت کے اوپر ملتوی کر رکھا ہے' یہاں کی زندگی میں یہ بات نہیں ہے' وہ وہیں ہوگا۔ دیکھیے قرآنِ کریم اس کے لیے (2:85) میں کیا کہتا ہے۔ بات تو وہ یہ کہتا ہے کہ جب کسی کی یہ کیفیت ہو جائے کہ وہ اپنے ضابطۂ زندگی کے کسی ایک حصے کے اوپر ایمان لائیں اور دوسرے سے انکار کریں تو بظاہر ایسا نظر آتا ہے کہ چلیے جس حصے پہ ایمان لائے ہیں' اتنے حصے کا

تو فائدہ ہو جانا چاہیے اور جو حصہ انہوں نے غلط اختیار کیا ہے' اس سے نقصان ہونا چاہیے لیکن یہ چیز یوں سمجھ میں نہیں آتی۔ نظامِ زندگی تو ایک ناقابلِ تقسیم وحدت ہے' اس کا پروگرام بھی ایک Indivisible Whole (غیر تقسیم کل) ہوتا ہے۔ جیسے آپ فارمولا کہتے ہیں' اس کے جو مختلف اجزا ہیں' ان میں یہ نہیں ہوسکتا کہ آپ نے اس میں سے پانچ میں سے تین لے لیے' دو چھوڑ دیئے تو آپ نے کہا کہ 50% پاس مارکس تو آ ہی گئے۔ فارمولے کے اجزا میں سے تو کسی ایک چھوٹے سے جزو کے بدلے' کوئی دوسرا جزو اس کے اندر رکھ لیجیے' ساری محنت اکارت چلی جاتی ہے۔ کسی ڈاکٹر کے نسخے میں کبھی ملا کر دیکھیے کہ جی! پانچ چار دوائیاں جو انہوں نے لکھ کر دی ہیں' دو ایک ان کی لے لیجیے' ایک آدھ حکیم صاحب سے لے لیجیے اور پھر اسے کھا کر دیکھ لیجیے اور کہیے کہ صاحب! اس میں سے 50% تو ان کا لیا ہے' فائدہ ہو ہی جائے گا۔ آپ دیکھیں گے کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔

قرآن یہ کہہ رہا ہے کہ یہ تو زندگی کے لیے ایک ایسا فارمولا ہے' Context (حوالہ متن) ہے' اس کو اسی طرح سے استعمال کرو گے تو فائدہ ہوگا لیکن اگر یہ کیفیت ہے کہ اس کا جو آدھا حصہ ہے یعنی جو اپنے لیے منفعت بخش نظر آئے اس کے اوپر کاربند ہو گئے اور جس سے اپنے مفاد پہ زد پڑ جاتی ہے اس کے لیے کہہ دیا کہ صاحب! ''سارے قرآن تے کن عمل کتا میاں! جناں ہو سکے کر لینا چاہیدا ہیگا اے❶''۔ قرآن کہتا یہ ہے کہ یہ بات میں یوں کہہ رہا تھا کہ فَمَا جَزَآءُ مَنْ یَّفْعَلُ ذٰلِکَ مِنْکُمْ (2:85) تم میں سے جو یہ روش اختیار کرتا ہے اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ اور نہیں ہوسکتا کہ اِلَّا خِزْیٌ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا (2:85) اس دنیا کی زندگی کے اندر ذلت اور خواری وَ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ یُرَدُّوْنَ اِلٰٓی اَشَدِّ الْعَذَابِ (2:85) اور اس کے بعد کی زندگی کے اندر اس سے بھی زیادہ شدید تباہی۔

اس زندگی میں کفرانِ نعمت اور مصنوعی گھڑت کا انجام بھوک اور خوف کا عذاب: دوسری قسم

اس دنیا کے اندر کی ذلت اور خواری دیکھ لیجیے۔ یہ یہاں خدا کا عذاب ہے۔ آپ دیکھتے جائیے پھر ذلت وخواری ہی نہیں' یہ بھی کوئی چھوٹی چیز نہیں ہے' اس کے بعد محسوس شکلوں میں یہ ہے کہ وَ ضَرَبَ اللّٰہُ مَثَلًا قَرْیَۃً کَانَتْ اٰمِنَۃً مُّطْمَئِنَّۃً یَّاْتِیْھَا رِزْقُھَا رَغَدًا مِّنْ کُلِّ مَکَانٍ (16:112) مثال کے ذریعے خدا کہتا ہے کہ میں ایک بات واضح کرنا چاہتا ہوں کہ ایک بستی تھی اس کی کیفیت یہ تھی کہ رزق کی فراوانیاں ہر طرف سے چلی آ رہی تھیں فَکَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰہِ (16:112) انہوں نے خدا کی ان نعمتوں کو' ان آسائشوں کو' رزق کے اس سامان کو' ڈھانپ کر' چھپا کر رکھ لیا' اس کو عام نہ ہونے دیا' ہر ایک نے سمیٹ لیا اور چھپا چھپا کر رکھ لیا۔ اس قوم کے اوپر اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فَاَذَاقَھَا اللّٰہُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَ الْخَوْفِ بِمَا کَانُوْا یَصْنَعُوْنَ (16:112) قوم کے اندر بھوک کا عذاب آ گیا' باہر سے ہر وقت خطرہ اور دھڑکا لگا رہنے لگا۔ بِمَا کَانُوْا یَصْنَعُوْنَ (16:112) وہ جو کچھ اپنے لیے مصنوعی طور پہ گھڑا کرتے تھے' حقیقی نظام نہیں تھا

---

❶ میاں! سارے قرآنِ پاک پہ کس نے عمل کیا! جتنا ہو سکے کر لینا چاہیے۔

بلکہ حقیقی نظام کا صرف نام تھا۔ یہ یَصۡنَعُوۡنَ یہاں قرآن نے عجیب چیز کہی ہے کہ وہ نام تو حقیقی نظام کا رکھتے تھے لیکن وہ ہوتا مصنوعی تھا۔ صبح سے شام تک اسلام کا نام لیتے تھے۔ اس کی وجہ سے اس قوم پہ یہ ہوا کہ بھوک اور خوف کا عذاب اس پہ مسلط ہوگیا۔ غور فرمایا آپ نے کہ عذاب کی یہ دوسری شکل کیا ہے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ دو چار ایسی مثالیں پیش کرونگا جن کے آئینے میں ہمیں اپنی صورت نظر آجائے کہ بات ہماری کہی جارہی ہے۔

عذاب کی خطرناک شکل معاشرتی طور پر لاقانونیت کا جنم لینا ہے: تیسری قسم

عذاب کی مختلف شکلیں قرآن نے بتائی ہیں۔ کہا ہے کہ **قُلۡ هُوَ الۡقَادِرُ عَلٰٓى اَنۡ يَّبۡعَثَ عَلَيۡكُمۡ عَذَابًا مِّنۡ فَوۡقِكُمۡ** (6:65) کہتا ہے کہ کبھی ہمارے عذاب کی شکل یہ ہوتی ہے کہ اوپر کا جو طبقہ ہے، وہ اس قسم کی حرکتیں کرتا ہے کہ اس کی وجہ سے اس معاشرے کے اندر بھوک اور خوف قسم کی تباہیاں آجاتی ہیں اور یہ تمام چیزیں اوپر کے طبقے کی بداعمالیوں کی وجہ سے ہوتی ہیں۔ کبھی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ نیچے کا طبقہ تنگ آجاتا ہے۔ **اَوۡ مِنۡ تَحۡتِ اَرۡجُلِكُمۡ** (6:65) یہ جو نیچے Masses (عوام) ہیں پھر ان کے اندر قانون کا احترام اٹھ جاتا ہے، بے راہ روی پیدا ہوجاتی ہے، فساد کے جراثیم فضا کے اندر پرورش پانے لگ جاتے ہیں۔ اور وہ تنگ آمد بہ جنگ آمد کی کیفیت سے معاشرے میں ایک لاقانونیت، فوضویت، اور انارکی پیدا ہوجاتی ہے۔ کبھی عذاب اس شکل کے اندر آیا کرتا ہے۔ **اَوۡ يَلۡبِسَكُمۡ شِيَعًا وَّ يُذِيۡقَ بَعۡضَكُمۡ بَاۡسَ بَعۡضٍ** (6:65) یا یہ ہوجاتا ہے کہ اس میں مخلوط قسم کی پارٹیاں بن جاتی ہیں: اوپر کے لیڈروں نے نیچے سے کچھ ووٹرز ملائے اور انہوں نے مختلف پارٹیاں بنائیں اور لگے ایک دوسرے کے خلاف جنگ کرنے۔ کبھی یہ شکل پیدا ہوجایا کرتی ہے۔ **اُنۡظُرۡ كَيۡفَ نُصَرِّفُ الۡاٰيٰتِ لَعَلَّهُمۡ يَفۡقَهُوۡنَ** (6:65) دیکھو! ہم کس طرح سے حقیقت کے مختلف پہلوؤں کو ان کے سامنے لاتے ہیں تاکہ کسی طرح سے یہ بات ان کی سمجھ میں آجائے لیکن جنھوں نے اپنی ایسی کیفیت پیدا کرلی ہو کہ مہریں ہی لگا رکھی ہوں، تو ان میں یَفۡقَهُوۡنَ کی یہ کیفیت کیسے پیدا ہوسکتی ہے۔ وہ تو لوٹا لوٹا کر، پھرا پھرا کر، بات کرتا ہے، مختلف پہلو لاتا ہے، گردشیں کرتا ہے لیکن یہ تو انہی کے لیے ہے جو سمجھ سوچ سے کام لینے والے ہیں۔

سیاسی پارٹیوں کے علاوہ ملت کو مذہبی فرقوں میں درتقسیم کرنے کا عذاب: چوتھی قسم

عذاب کی ایک اور مثال ہے۔ اس کے بعد جب آگے (3:104) پر آؤں گا تو اس کی تفصیل عرض کروں گا، سوچیے، عزیزانِ من! یہ عذاب کی کتنی سنگین ترین (شکل) ہے۔ کہا ہے کہ **وَ لَا تَكُوۡنُوۡا كَالَّذِيۡنَ تَفَرَّقُوۡا وَ اخۡتَلَفُوۡا مِنۡۢ بَعۡدِ مَا جَآءَهُمُ الۡبَيِّنٰتُ** (3:105) دیکھو! ان لوگوں کی طرح نہ ہوجانا کہ خدا کی واضح ہدایت اور دلائل ان کے سامنے آگئے، اس آنے کے بعد انہوں نے باہمی

اختلاف کیا اور اپنے اندر فرقے پیدا کر لیے۔ بات وہاں سے ہوئی تھی کہ وَّ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ (2:7) یہ تھا جہاں سے میں نے عذاب کے معنی لیے ہیں۔عَذَابٌ عَظِيْمٌ (3:105)۔ یہاں آپ نے دیکھا کہ واضح ہدایت آ جائے' قرآن سے زیادہ ہدایت اور کونسی ہوسکتی ہے؟اس کے بعد اختلافات پیدا کیے جائیں اور دین کے اندر فرقے بنالیے جائیں۔ کیا نتیجہ ہوگا ؟ کہا ہے کہ وَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ(3:105) یہ ہیں جن کے لیے عذابِ عظیم ہوتا ہے۔

قندیلِ آسمانی کی اس راہنمائی کے باوجود ہماری کم مائیگی کی حالتِ زار

برادرانِ عزیز! ہم اس چیز کے دیکھنے کے لیے کمیشن بٹھاتے ہیں کہ ہماری یہ کیفیت کیوں پیدا ہوگئی۔اس کی ضرورت ہی نہیں ہے۔اگر قرآن کی چار آیتیں آپ کے سامنے ہوں تو ساری بات واضح ہوجاتی ہے کہ یہ عذابِ عظیم کیوں ہے لیکن ہماری تو کیفیت یہ ہے کہ قرآن کی آیتوں کو ہم نے تقسیم کر رکھا ہے مثلاً یہ کہ جو غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ ' یعنی جو مغضوب ہوئے' وہ یہودی ہیں' یہ جو ضآلین ہیں' وہ عیسائی ہوئے۔اس کے بعد یہ چیز ہے کہ منافقت کرنے والوں کا مدینے میں ایک گروہ ہوا کرتا تھا' یہ کہتے ہیں کہ یہ اس کے لیے ہے۔سارا قصہ ماضی کا بس یوں ختم ہوا۔آپ کو پتہ ہے کہ قرآنِ کریم' ان انکار کرنے والوں کا ایک قول نقل کیا کرتا ہے۔وہ ان کے سامنے کہتا ہے کہ جب یہ باتیں بیان کرو تو کہتے ہیں کہ یہ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ہیں' یہ پہلے لوگوں کی کچھ باتیں ہیں جو اس کے اندر آئی ہوئی ہیں' ان سے ہمارا تعلق نہیں ہے۔ہم نے سارے قرآن کو اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ قرار دیدیا ہوا ہے۔کوئی آیت پڑھیے' یہ بتادیں گے جی! یہ فلاں تھا' اس کے متعلق آئی ہے۔''او کچھ تہاڈے متعلق وی اوہدے اچ ہیگا ہے' کہ جی! اے جنت دا پاسپورٹ جیہڑا ہیگا او ساڈے لئی ہیگا[1]''۔ یہ باقی سارا جو قرآن ہے' وہ ایک ایک آیت میں تقسیم ہو چکا ہوا ہے' کہ یہ آیت اس کے متعلق ہے وہ آیت اس کے متعلق ہے۔اب وہ کہہ یہ رہا ہے کہ یہ دین میں فرقے پیدا کرتے ہیں عزیزانِ من! فرقوں کو قرآن کریم نے بہ نصِ صریح شرک کہا ہے اور یہاں کہا ہے کہ وَّاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ (3:105) یہ وہی عذابِ عظیم ہے جہاں سے ہم نے بات شروع کی تھی کہ ان کے لیے عذابِ عظیم ہے۔اب مجھے آگے بڑھنا چاہیے۔

قرآن حکیم نے اپنے ہاں تین کیٹیگریز (شقوں) کا ذکر کیا ہے

اب جگر تھام کر بیٹھو میری باری آئی۔دو گروہوں کا ذکر ہو گیا: ایک وہ ہے جو زندگی کی خطرناک گھاٹیوں سے بچ کر چلنا چاہتے تھے اور پھر اس کے عملی پروگرام کے اوپر عمل پیرا ہو جاتے تھے' ان کے لیے کہا ہے کہ اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (2:5) یہ ایک گروہ صحیح راہنمائی پر ہے اور ان کی کھیتیاں پروان چڑھتی ہیں۔اب دوسرا گروہ ہمارے سامنے آیا اس کے لیے

---

[1] کیا تمہارے لیے بھی اس میں کچھ دیا ہوا ہے؟ (کہتے ہیں) کہ جی! یہ جو جنت کا پاسپورٹ ہے یہ ہمارے لیے ہے۔

کہا ہے کہ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ (2:6) جن لوگوں نے کفر کی روش اختیار کی۔ یہ دوسرا گروہ ہمارے سامنے آ گیا۔ یہ دونوں گروہ ہیں جو متمیز ہیں' ان کے وجود میں کوئی اختلاف نہیں ہے' کوئی التباس نہیں ہے۔ ایک کھلے بندوں ایمان وتقویٰ کی جماعت ہے اور دوسرا' کھلے بندوں اس سے انکار کرنے والی' مخالفت کرنے والی جماعت ہے۔ یہ دونوں جماعتیں کھلے بندوں کام کرتی ہیں۔

اب ایک تیسری کیٹگری (شق) ہمارے سامنے آتی ہے' عزیزانِ من! اس کے متعلق کہا ہے کہ وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ مَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ (2:8) جو اقرار کرتے ہیں' اعتراف کرتے ہیں' اس چیز کو کہتے ہیں کہ ہم اللہ اور آخرت کے اوپر ایمان لائے ہوئے ہیں۔ وہ یہ بات کہتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ وَ مَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ (2:8) وہ مومن نہیں ہیں۔ جب ہمارے سامنے یہ آیت آئی تو ہم نے کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر کے کہہ دیا کہ مدینے میں منافقوں کی ایک جماعت ہوا کرتی تھی' یہ آیت ان کے متعلق ہے۔ میں نے' عزیزانِ من! جب یہ اَلَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ آیا تھا' کہا تھا کہ یہ دیکھیے یہ لفظ گرامر کی رو سے Verb (فعل) ہے: جو لوگ یہ کرتے ہیں۔ ایمان کوئی ایسی چیز ہے' جس میں کچھ کرنا ہوتا ہے۔ اسی لیے اسی کے بعد جب اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا آیا تھا تو میں نے کہا تھا کہ یہاں پھر Verb (فعل) ہے۔ یہ کچھ اس کے خلاف کرنا ہوتا ہے جس کو آپ پھر کافر کہیں گے یعنی ایسا کرنے والا کافر اور ویسا کرنے والا مومن' یہ کرنے کی بات ہے۔ آپ قرآن کا اعجاز دیکھیے۔ یہی چیز ہے جو میں کہہ رہا تھا کہ Verb یا فعل کی بنا پہ قرآنِ کریم نے پہلے دونوں فعل کے صیغے استعمال کیے ہیں جس کے معنی مومن ہونے کے لیے ''کچھ کرنا ہے''۔ یہاں کہتا ہے کہ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا (2:8) وہ ''کرنا کچھ نہیں''۔ صرف کہتے ہیں کہ ہم ایمان والے ہیں۔

قرآن ہے' عزیزانِ من! بات سوچنے کی یہ ہے اور اس میں میرے سمیت ہم سب شامل ہیں کہ کیا ہم نے کچھ کیا ہے جس کے بعد ہم یہ کہیں کہ ہاں ہم مومن ہیں؟ وہ جو Verb (فعل) کا صیغہ ہے اس کے مطابق تو ''کچھ ہوا ہے'' تو پھر ہم مومن کہیں۔ ہمارے ہاں ایک پوری کیٹگری (شق) تو یہ ہے۔ یہ من یقول میں بھی نہیں آتے یعنی انہوں نے کبھی زبان سے کلمہ پڑھ کر بھی اسلام قبول نہیں کیا۔ آپ کے ہاں جو بھی نیا نیا داخل ہونا شروع ہوتا ہے آپ اس سے بھی' زبان سے کچھ کلمے پڑھوا لیتے ہیں۔ ہم بھی اپنے متعلق اگر زیادہ سے زیادہ کچھ کہیں تو یہی کہیں گے کہ یہ جو چیزیں ہیں ہم بھی ان کو دہرا لیتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ مَنْ يَّقُوْلُ (2:8) جو یہ چیز زبان سے کہتے ہیں' اس میں تو کوئی شبہ نہیں۔ اس نے کہا ہے کہ یہ چیز تو کرنے کی تھی انہوں نے نہیں کی۔ ان کی کیفیت یہ ہے کہ صرف زبان سے کہتے ہیں تو سنو! وَ مَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ (2:8) یہ مومن نہیں ہیں۔ کیوں نہیں ہیں؟ اس لیے کہ انہوں نے ''کچھ کیا'' نہیں ہے۔ اس کی تفصیل تو آگے جا کر کریں گے لیکن بنیادی طور پر' Logically (منطقی طور پر) یہ یہاں Contradiction (تضاد) ہے کہ ایک بات کرنے کی ہے لیکن ایک شخص کرتا نہیں ہے' صرف کہتا ہے کہ میں نے وہ کیا اور یہ کیا۔ یہ کہنا تو کرنے کے بعد کا ہے۔ مثلاً سیر بڑی اچھی چیز ہے۔ اس کا

صحت پہ بڑا خوشگوار اثر پڑتا ہے اس سے زندگی بڑھ جاتی ہے۔ اب ایک انسان یہ سارا کچھ بستر میں لیٹے ہوئے' سگریٹ منہ میں لیے ہوئے' اخبار سامنے رکھتے ہوئے' دہرائے چلا جا رہا ہے: **وَاللّٰهِ بِاللّٰهِ الْعَظِيْمِ**۔ خدا کی قسم بالکل سچ کہتا ہوں یہ بڑی عجیب چیز ہے ٹھیک ہے کیا یہ کچھ کہنے والا' ہر روز یہ کچھ زبانی دہرانے والا وہ کچھ ہو جائے گا جو سیر کرنے والا ہوتا ہے؟ نہیں' قطعاً نہیں' سیدھی سی بات ہے وہ تو کچھ کرنے کا نام ہے اور جو وہ کر رہا ہے وہ تو صرف کہنے کا نام ہے۔

انسان کو مومن کہلانے کی منزل تک پہنچنے کے لیے کئی ایک کٹھن گھاٹیوں سے گزرنا ہوتا ہے

یہ ہے **مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا** (2:8)۔ اعجاز ہے قرآن کا' عزیزانِ من! یہ سوال کچھ یونہی نہیں ہے کہ کوئی منافقین کا گروہ ہے جس کی طرف ہماری توجہ جائے' یہ (2:8) بڑی صاف سی بات ہے' کہ زبان سے کچھ کہنے کے بعد وہ کیفیت پیدا نہیں ہوئی جس کو ایمان کہتے ہیں' وہ زبان سے کہتا ہے کہ **يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ مَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ** (2:8)۔ چیز یہ ہے کہ فعل کے ساتھ ایک فاعل ہوتا ہے اور وہ ہوتا ہے ''کچھ کرنے والا''۔ مثلاً یہ جو علم حاصل کرنا ہے' یہ ایک Verb (فعل) ہے کہ اس نے علم حاصل کیا۔ جب وہ علم حاصل کیا تو اسے عالم کہتے ہیں یعنی علم حاصل کرنے والا یہ فاعل ہوا۔ یہ جو مومن ہے یہ اسی قسم کا فاعل ہے یعنی ایمان کی کیفیت پیدا کر لینے والا۔ یہ چیز تو کچھ کرنے کے بعد آنی تھی۔ وہ کہتا یہ ہے کہ اس نے یہ کچھ نہیں کیا جس کے بعد گرامر کے لحاظ سے ہی اس کے اوپر اسم فاعل کا یہ صیغہ عائد ہوتا تھا۔ اگر وہ یہ کچھ کرتا تو یہ اس کے اوپر عائد ہو جاتا۔ یہ تو زبان سے صرف کہہ رہا ہے تو مومن کس طرح سے کہلائے گا!! اگر علم حاصل نہیں کرتا تو عالم کیسے کہلائے گا!! ''اے وکھری گل اے پئی' ساڈے کون پوچھے۔ ساڈے تے ہونداای ایہو عالم ہیگا' جنوں لکھ نہ اونداہووے ❶''۔ علم حاصل نہ کرنے والے کے اوپر زبان کے اعتبار سے بھی لفظ عالم کا اطلاق نہیں ہوتا۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے جو بیٹھا ہوا ہے اس پر چلنے والے کے لفظ کا اطلاق نہیں ہو سکتا' جو لکھ نہیں رہا اس پر لکھنے والے کے لفظ کا اطلاق نہیں ہوتا۔ قرآن یہ کہہ رہا ہے کہ یہ ''کچھ کرنے کی بات تھی''۔ یہ کچھ کرنے کے بعد یہ جو کرنے والا ہے وہ یہ کچھ کہلا سکتا تھا۔ ایمان Verb (فعل) کا صیغہ ہے مگر وہ محض زبان سے کہہ رہا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ گرامر کے لحاظ سے زبان کے اعتبار سے' تم اس کو یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ مومن ہے۔ اسے قرآن نے **وَ مَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ**(2:8) کہا ہے کہ یہ مومن نہیں ہے' کچھ اور کہلائے۔

ایمان تو عقل و شعور کے تحت کسی بات کو پوری طرح سمجھ کر یقین کرنے کا نام ہے

عزیزانِ من! میں چند مثالیں عرض کروں گا' ورنہ ان دو کیٹگریز (شقوں) کے اندر تمیز کرنا کہ مومن ہے' مومن نہیں ہے' میں تو سارا

---

❶ یہ ایک الگ سی بات ہے کہ ہمارے ہاں کون پوچھے؟ ہمارے ہاں تو عالم ہی وہ ہوتا ہے جسے کچھ نہ آتا ہو۔

قرآن سامنے آجائے گا مدینے میں جب اس جماعتِ مومنین کی اپنی مملکت قائم ہوگئی' حکومت قائم ہوگئی' شوکت وحشمت دولت وثروت کی یہ چیزیں ملیں تو اردگرد کے جو قبائل تھے' یہ بدو وغیرہ وہ ان چیزوں سے متاثر ہوکر' خواہ وہ کہیے کہ ان کی قوت کی وجہ سے یعنی جسے ڈر کہتے ہیں' یا کہیے کہ یہ جو ایک قوم حاکم کے ساتھ مل جانے میں Attraction (کشش) تھی اس کی وجہ سے' وہ بھی کہنے لگے کہ ہم ایمان لے آئے' یہ کچھ بھی بات تھی' انہوں نے ابھی اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ کہا تھا یعنی کلمہ پڑھا اور ''مسلمان'' ہوگئے تھے۔ اس کے بعد' بہرحال' انہوں نے کہا کہ ہم مومن ہیں۔ غور سے سوچتے چلے جایئے' برادرانِ عزیز! اس لیے کہ بات چودہ سو سال پہلے کی نہیں ہورہی' بات آج کی ہورہی ہے' ہماری ہورہی ہے۔ انہوں نے یہ چیز کہنا شروع کیا' اور ہم تو صبح سے شام تک کہتے ہیں' رجسٹروں میں جو کالم ہوتا ہے' اس کے اندر ہم یہ لکھتے ہیں۔ بہرحال ان بدو وغیرہ نے یہ کہنا شروع کیا کہ قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا (49:14) یہ بدو کہتے ہیں' جو تمہاری جماعت کا جزو بن چکے ہیں' کہ اٰمَنَّا (49:14) ہم ایمان لائے۔ یہاں وہی Verb کا صیغہ آیا ہے۔ کہتے ہیں کہ ہم نے یہ کیا ہے' جسے ایمان کہتے ہیں۔ انہیں کہا گیا کہ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا (49:14) یہ مت کہو' تم نے وہ کچھ نہیں کیا ہے' ہاں البتہ یہ کہہ دو کہ ہم نے سرنڈر کردیا' ہم جھک گئے' ہم تمہارے ہاں شامل ہوگئے۔ یہ نہ کہو کہ ایمان لے آئے' یہ ''کہہ دینے سے'' تو ایمان والی بات نہیں ہوتی ہے' یہ تو کرنے کی بات تھی۔ وہاں انہوں نے کہا امنا ہے' کہا ہے کہ یہ غلط کہتے ہو کیونکہ وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ (49:14) ایمان تو ایسی چیز ہے جو مسلسل غور وفکر' تدبر وتفکر' علم وبصیرت' دلائل وبراہین کی رو سے دل کے اندر ایک چیز کا جاگزیں ہوجانا ہے' ایک Conviction (ایمان) پیدا ہوجاتا ہے۔ اس کا نام ایمان ہے۔ وہ تو تمہارے ہاں نہیں ہوا' ابھی تک ایمان تمہارے دل کی گہرائیوں میں نہیں گیا۔ آپ دیکھتے ہیں کہ دو کیٹگریز (شقیں) قرآن نے خود یہاں واضح کرکے بیان کردیں۔ وہ اسی قوم کے افراد ہیں۔ اب میں نے قوم کا لفظ استعمال کیا ہے' میں ابھی اس کی تشریح کرونگا' لیکن اس کے اندر اس نے خود یہ تمیز کردی کہ ابھی یہ بات نہ کہو کیونکہ وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ (49:14) ابھی تک ایمان تمہارے دل کی گہرائیوں میں نہیں پہنچا ہے۔

مومن کی پہچان یہ ہے کہ وہ اپنا مال اور جان خدا کی راہ میں قربان کردیتا ہے

برادرانِ عزیز! سوال یہ ہے کہ کیا کرو اس کے بعد؟ کہا ہے کہ وَاِنْ تُطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَا يَلِتْكُمْ مِّنْ اَعْمَالِكُمْ شَيْئًا (49:14) ٹھیک ہے اس کے اندر تم آگئے' اب اگر تم اس پروگرام کے مطابق عمل پیرا ہوتے چلے جاؤ گے تو جو کچھ تم کروگے اس کے بعد اس میں کسی قسم کی کمی نہیں آئے گی۔ اس 'کروگے' میں اعمال آگئے مگر وہ تھی زبانی بات' کہتا ہے کہ اس کہنے کے بعد آگے کچھ کرکے دکھاؤ۔ یہ کچھ کرنے کے بعد' پھر یہ مومن ہوا کرتے ہیں۔ اس کے بعد کہا ہے کہ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ (49:15)

مومن وہ کہلاتا ہے جو اٰمنوا کے لیے کچھ کرتا ہے اور پھر اس طرح سے ان چیزوں کی صداقتوں پر یقین رکھتا ہے۔ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا (49:15) پھر اس کے دل کے اندر کسی قسم کی بے چینی' اضطراب' خلش' پریشانی کچھ باقی نہیں رہتی ہے۔ یقین سے جو اطمینان حاصل ہو جاتا ہے وہ کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (49:15) اور پھر وہ انسانیت کی بہبود کی راہوں میں' جسے سبیل اللہ کہا جاتا ہے' اپنے اموال سے مسلسل جدوجہد کرتے رہتے ہیں اور اگر وقت آپڑے تو پھر اپنی جانیں بھی اس کے اندر دیدیتے ہیں۔ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ (49:15) یہ ہیں جو سچ بولتے ہیں۔ کیا بات ہے یہاں! ''سچی گل اے کردے نیں[1]'' یہ وہ نہیں ہیں جو زبان سے کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے اور اس کے بعد سمجھ لیا کہ صاحب! معاملہ ہو گیا۔ یہ وہ نہیں ہیں۔

کوئی شخص مسلمان ہو یا مومن اس کے لیے قرآنی ضابطہ حیات کی صداقتوں پر ایمان لانا اور ان پر عمل کرنا لازم ہے

پہلی چیز تو عزیزانِ من! یہ ہوئی کہ ٹھیک ہے انسان یہ کر کے اس قوم کے گروہ کے اندر داخل ہو سکتا ہے' وہ ابھی مومن نہیں ہوتا ہے اس کے بعد اس کو یہ کچھ کرنا ہوگا پھر وہ اس کیٹگری (شق) میں آئے گا۔ یہاں تو یہ کہا ہے کہ اَسْلَمْنَا (49:14) کہنے والے اسلام پہ جھک گئے۔ اب ان کو مومن ہونے کی ضرورت ہے۔ دوسرے مقام کے اوپر قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ مومن وہ ہے جو خدا کے قوانین کے سامنے جھک گیا' اس کو مسلم ہونے کی ضرورت ہے۔ پہلے بھی یہ بات آچکی تھی' یہ بڑی اہم بات ہے۔ مسلم کے لیے' مومن ہونے کی ضرورت ہے اور مومن کے لیے مسلم ہونے کی ضرورت ہے۔

کیا کسی کو مسلمان قوم کا فرد ہونے کے باوجود بھی ایمان لانے کی کوئی شرط ضروری ہے؟

ایمان تو پھر بھی ایک فارمولے' ایک صداقت پر یقین کا نام ہے۔ ابھی بات تو آگے عمل سے آنی ہے۔ اس کے بعد جب عمل کر کے اس پر آگے چلے گا تو پھر اس پر یہ جو مسلم کا لفظ ہے اس کا اطلاق ہوگا' مومن کے لیے مسلم ہونا ضروری ہے۔ کہا ہے کہ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاٰيٰتِنَا وَكَانُوْا مُسْلِمِيْنَ (43:69) ان کو ہمارے قوانین پر Conviction (قطعیت یقین) ہوتی ہے' یہ ان پر یقین رکھتے ہیں اور اس کے بعد پھر وہ ان کے سامنے اپنے آپ کو جھکا دیتے ہیں۔ یہاں یہ دونوں چیزیں اکٹھی ہوگئیں۔ میں نے یہ کہا ہے کہ اس قوم کے اندر داخل ہونا ہے' یہ ٹھیک ہے' اور اس کو میں واضح کردوں کہ یہ ٹھیک ہے قومی اعتبار سے ایک جماعت ہے جسے آپ مسلمان کہتے ہیں۔ جیسے کسی مملکت کا Citizen (شہری) ہونے کے لیے کچھ شرائط ہوتی ہیں' ان کو پورا کرلیا جائے تو وہ اس کا شہری ہو جاتا ہے۔ اسی طرح سے اس جماعت کے اندر' اس قوم کے اندر' داخل ہونے کے لیے اگر ان چیزوں کا اعتراف کرلیا جائے تو وہ قومِ مسلم کا ایک فرد ہو

---

[1] سچی دوٹوک بات تو یہ کرتے ہیں۔

جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ جو اس طرح سے مسلم قوم بن جاتی ہے' کیا اس قوم سے بھی یہ تقاضا کیا جاتا ہے کہ تم ایمان لاؤ۔ بظاہر تو یہ نظر آتا ہے کہ اب اس کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن دیکھیے قرآن کہاں جاتا ہے؟ جو شخص اس قوم کا فرد بن گیا ہے' کیا اس کے بعد پھر اس سے ایمان لانے کا تقاضا کیا جائے گا؟ سنیے! قرآن کہتا ہے کہ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (61:10) اس قوم سے تخاطب ہے۔ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِیْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ (61:10) دیکھیے یہاں عذاب کا لفظ آیا۔ ''کیا تمہیں میں اس قسم کے کاروبار کا' ایک اس قسم کی تجارت کا' سراغ دوں جو تمہیں عذاب الیم سے بچالے؟''۔

یہ وہی بات ہے جو میں کہہ رہا ہوں آپ اس پہ اپنی توجہ مرکوز کیجیے۔ کہا ہے کہ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (61:10) یہ کہہ کر مخاطب کیا جا رہا ہے۔ اس کے بعد ہے کہ آؤ! تمہیں سراغ دوں کہ تم کیا کرو؟ کہا کہ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ (61:11) اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ۔ اور خطاب یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا سے کیا جا رہا ہے یعنی اس کے بعد ان سے یہ کہا جا رہا ہے کہ ایمان لاؤ۔ آپ نے غور فرمایا پہلا جو یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ہے' وہ قومیت کے اعتبار سے ہے جو ایک شخص مسلمان ہو جاتا ہے' اس قوم کے اندر شامل ہو جاتا ہے۔ ٹھیک ہے جو ان صداقتوں پہ یقین رکھنے کے بعد اس کا جزو بنتا ہے ہم اس سے انکار نہیں کر سکتے' نہ ہی یہ جو ہم اور اس وقت ہمارے ہاں کی کروڑوں کی قوم ہے' یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ مسلم قوم نہیں ہیں' یہ کفار ہیں۔ ان سے مخاطب کیا جا رہا ہے' ان سے کہا جا رہا ہے کہ یہ کچھ تمہیں بھی کرنے کی ضرورت ہے: تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ (61:11)۔ یہ کیا بات ہوگی؟ کیا کیا جائے گا؟ کہا ہے کہ وَتُجَاهِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ (61:11)۔ وہی بات جو ابھی پہلے کہی گئی تھی کہ تم نے ان صداقتوں پہ علیٰ وجہ البصیرت یقین کرنے کے بعد' اللہ کے راستے میں اپنے مال اور جانوں سے مسلسل جدوجہد کرنا ہے۔ ذٰلِكُمْ خَیْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (61:11) اگر تم علم و بصیرت سے کام لے کر غور کرو تو تمہیں نظر آ جائے گا کہ یہ چیز جو ہم کہہ رہے ہیں تمہارے لیے کتنی بہتر ہے!

پہلے مسلمان اور اس کے بعد مومن یعنی مستقلاً قوانینِ خداوندی کی اطاعت کرنے والا

یہاں یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا سے خطاب ہے' کہا جا رہا ہے کہ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ (61:11)۔ دوسرے مقام پہ بھی یہی چیز دہرائی ہے۔ کہا ہے کہ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یہاں تو بات ہی Direct (براہِ راست) ہوگئی کہ اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ الْكِتٰبِ الَّذِیْ نَزَّلَ عَلٰى رَسُوْلِهٖ (4:136) آپ دیکھ رہے ہیں کہ ایک زیر اور زبر کے فرق سے عربی زبان میں کیا ہوتا ہے۔ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (4:136) اے قومِ مسلم کے افراد! اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ الْكِتٰبِ الَّذِیْ نَزَّلَ عَلٰى رَسُوْلِهٖ (4:136) ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسول پہ اور اس کتاب پر کہ جو خدا نے اپنے رسول پر نازل کی ہے۔ جماعتِ مسلمین کے اندر داخل ہونے کے بعد بھی یہ جو چیز

ہے' یہ کرنے کی ہوتی ہے۔ جب یہ کیا جاتا ہے تو اس کے بعد یہ جو مسلمان ہے پھر مومن کہلانے کا مستحق ہوتا ہے۔ اور جو مومن بنتا ہے اس کو پھر مستقلاً ان قوانین کی اطاعت کرتے چلے جانا پڑتا ہے۔ اس صورت میں وہ مومن رہتا ہے۔

سات سات سال تک دینی مدارس میں پڑھائے اور پڑھے جانے والے نصاب کی نوعیت

میں سمجھتا ہوں کہ آپ کہیں گے "اگے وی گل بڑی مشکل جئی ہیگی اے ❶"، ہاں' عزیزانِ من! بات مشکل ہی ہے۔ صدیوں سے کس مقام پہ ہم کھڑے ہیں اور کیا کہہ رہا ہے قرآن؟ اور اسی لیے تو انہوں نے دینی مدارس میں اپنا جو نصاب مقرر کیا ہے جن میں ہے' ہمارے ہاں کے یہ علمائے کرام جو سات سال کے بعد سند لے کر آتے ہیں' ان میں اٹھارہ علوم سات سال میں پڑھائے جاتے ہیں' آپ کو پتہ ہے کہ ان کے نصاب میں قرآن نہیں ہوتا۔ مغالطے میں نہ رہ جائیں' میں پھر عرض کر دوں کہ ان کے نصاب میں قرآن نہیں ہوتا۔ اٹھارہ علوم پڑھتے ہیں' آخری سال تبرکاً سورۃ البقرۃ کی ایک تفسیر بیضاوی ہے جو اس طرح پڑھائی جاتی ہے جیسے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کی جگہ 786 کا ہندسہ لکھتے ہیں۔ بس وہ پڑھا دی جاتی ہے۔

ظہور نتائج کے وقت کوئی اس قسم کا عمل فائدہ نہیں پہنچا سکے گا

قرآن تو یہ تھا کہ ایمان بھی لے آئے یعنی علم و بصیرت دلائل و براہان کی رو سے ان صداقتوں پر یقین بھی کر لیا' یہ کیفیت بھی پیدا کر لی۔ پھر بھی کہا کہ یاد رکھو! جب اعمال کے محسوس نتائج سامنے آنے کا وقت آئے گا تو اس وقت **لَا يَنفَعُ نَفْسًا إِيمَانُهَا لَمْ تَكُنْ آمَنَتْ مِن قَبْلُ** (6:158) جس نے اس سے پیشتر اس طرح سے ایمان نہیں لایا ہوگا یعنی جب اس کے وہ نتائج سامنے آجائیں' تو اس وقت یہ کہنا کہ میں ایمان لایا ہوں' تو وہ تو قرآن کی رو سے اس پہ پھٹکار پڑتی ہے۔ وہ ایمان لانا بجائے خویش کچھ نہیں کرتا' وہ تو اس صداقت پہ یقین کرنے کے بعد اس کے مطابق کام کرنا ہوتا ہے۔ اور جب کام کرنے کے لیے وقت ہی آپ کے پاس باقی نہ رہے' موت آپ کے سامنے کھڑی ہو جائے تو اس وقت یہ جو کہنا ہے یہ کیا فائدہ دیتا ہے؟ کچھ نہیں دیتا۔ عام لوگ تو ایک طرف رہے۔ عزیزانِ من! آپ کو معلوم ہے فرعون جیسا ایک بادشاہ' صاحبِ ضربِ کلیمؑ کے مقابلے میں کھڑا ہے' اور بہر حال اس کا بہت بڑا مقام تھا آج کے الفاظ میں ہم یہ کہیں گے کہ اس ایک کے ایمان لانے سے پوری کی پوری قوم مسلمان ہو سکتی تھی۔ جب وہ ڈوبنے لگا ہے تو موت سامنے نظر آئی۔ یہ قرآن میں ہے' عزیزانِ من! یہ افسانہ نہیں ہے کہ اس نے یہ کہا کہ میں موسیٰؑ اور ہارونؑ کے رب پر ایمان لاتا ہوں۔ ہم آپ ہوتے تو نعرۂ تکبیر بلند کر لیتے۔ نپولین (1821-1769ء) کے متعلق' جب وہ فتح کرتا چلا گیا' تو کہا کہ صاحب! یہ تو ہوا مسلمان۔

---

❶ یہ اگلی بات بھی بڑی مشکل سی ہے۔

ہٹلر (1945-1889) کے متعلق یہ تھا کہ جی! وہ مسلمان ہوگیا۔ دیکھیے! ہر جنگ جمعہ کے دن شروع کرتا ہے۔ یعنی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ ہر بڑا آدمی خواہ وہ بڑا نہ بھی ہو ہم تو یونہی کہہ دیتے ہیں۔ ایک فرعون جیسا وہ شخص موت کو سامنے دیکھ کر اعلان کر رہا ہے کہ میں ایمان لایا اور اُدھر سے جواب آتا ہے کہ لعنت ہے تجھ پہ:

در کفر ہم پختہ نہ زنّار را رسوا مکن ❶

او تُو تو کفر میں بھی پختہ نہ نکلا' موت کو دیکھ کر' اس طرح سے ڈر کر' یہ کچھ کہہ رہا ہے۔ لعنت ہے تجھ پہ۔

کیا بات ہے قرآن کی! بات یہ ہے' عزیزانِ من! میں محض ان صداقتوں کے اعتراف میں یہ کہتا ہوں کہ اگر دل سے بھی ایمان قبول کر لیا جائے اور اس وقت کیا جائے جب عمل کے لیے موقع باقی نہیں ہے تو اس سے کچھ فائدہ نہیں ہے۔ جس کو آخری سانس آ رہے ہیں' وہ طبیب کی حذاقت پر اور دوائی کی مقبولیت پر' ایمان لے بھی آئے کہ واقعی اس میں شفا ہے اور سانس ہو آخری' تو اس کا یہ ایمان لے آنا اس کو کچھ فائدہ نہیں دے گا۔ یہ تو اس وقت کی بات تھی جب ابھی اس علاج کے لیے وقت باقی تھا۔ لَا يَنْفَعُ نَفْسًا اِيْمَانُهَا لَمْ تَكُنْ اٰمَنَتْ مِنْ قَبْلُ (6:158) جو اس سے پہلے نہیں ایمان لایا تھا یہ اس کو کچھ فائدہ نہیں دے گا۔ اگلی بات یہ ہے کہ اَوْ كَسَبَتْ فِيْٓ اِيْمَانِهَا خَيْرًا (6:158) یا ایمان تو پہلے لے آیا تھا اور اپنے ایمان میں اس نے کوئی نیکیوں کی بات کی نہیں تھی تو بھی یہ ایمان کچھ فائدہ نہیں دے گا: لَا يَنْفَعُ نَفْسًا اِيْمَانُهَا (6:158)۔ قرآن ہے' برادرانِ عزیز! لَا يَنْفَعُ کہا ہے کہ فائدہ ہی نہیں دے سکتا۔ یہ اس کے لیے ہے کہ اَوْ كَسَبَتْ فِيْٓ اِيْمَانِهَا خَيْرًا (6:158) اس نے اپنے ایمان کے ساتھ خیر نہیں کیا۔

ظہورِ نتائج کے وقت اہلِ ایمان کو کسی قسم کا نہ خوف ہوگا نہ حزن

آپ دیکھ رہے ہیں کہ قرآن کہاں لے جا رہا ہے۔ اسی میں آیت (6:82) ہے اور یہ تو بڑی کپکپا دینے والی بات ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یاد رکھو! دو ہی فریق ہیں۔ ایک فریق ہے جس کے دلوں پر خوف مسلط رہے گا وہ ایمان والے نہیں ہیں۔ ایک دوسرا وہ ہے جن کو پورا

---

❶ اس ایمان سے تو وہ کفر ہزار درجہ بہتر ہے جس پر انسان مصائب و خطرات کے باوجود قائم رہے۔ اس سے اس شخص کی پختگی کردار کا پتہ چلتا ہے۔ اس کا کفر اس کی فکری غلطی یا تقلید کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اسی حقیقت کو مرزا اسد اللہ خاں غالب (1869-1797ء) نے اپنے مخصوص انداز میں یوں بیان کیا ہے:

وفاداری' بشرطِ اُستواری' اصلِ ایماں ہے
مرے بُت خانہ میں' تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

(پرویزؒ: مطالب الفرقان جلد دوم' ادارہ طلوع اسلام' لاہور' 1983' ص ص 250-249)۔

امن نصیب ہوگا۔ یہ کون ہیں؟ اَلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا (6:82) یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان لے آئے۔ اور یہ ٹھیک ہے جب قرآن کہتا ہے کہ اَلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا تو پھر کیا ہوا؟ کہا کہ وَ لَمۡ یَلۡبِسُوۡۤا اِیۡمَانَھُمۡ بِظُلۡمٍ (6:82) اور اس کے بعد اپنے ایمان کو ظلم' ناانصافی اور دھاندلی سے ملوث نہیں کیا' یہ ہیں جن کا ایمان' ایمان کہلا سکتا ہے۔ کہا ہے کہ اُولٰٓئِکَ لَھُمُ الۡاَمۡنُ وَ ھُمۡ مُّھۡتَدُوۡنَ (6:82) ایمان کا صرف دعویٰ کرنے کے بعد نہیں' بلکہ یہ کہہ کر کہ واقعی تم نے ایمان کی شرائط پوری کر کے ان کو تسلیم کر لیا لیکن یہ کرنے کے بعد اگر تم نے اس ایمان کو ظلم کے ساتھ ملوث کر لیا تو پھر یہ کچھ فائدہ نہیں دے سکتا۔

قرآن حکیم کا آئینہ تصویر کشی میں کسی کو غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہونے دیتا

عزیزانِ من! قرآن کا آئینہ کسی کو دھوکا نہیں دیتا' وہ صحیح خدوخال سامنے لے آتا ہے۔ ہم اسے برداشت کریں یا نہ کریں' اس کو اس کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی۔ یہ قرآن کی آیات ہیں' یہ ان کے ریفرنسز (حوالہ جات) ہیں۔ آپ نے دیکھ لیے ہیں' جا کر خود ان پہ غور کرتے رہیے گا اور پھر سوچ لیجیے گا کہ ہم کس مقام پہ کھڑے ہیں۔

بات یہ ہوئی تھی کہ وَ مِنَ النَّاسِ مَنۡ یَّقُوۡلُ اٰمَنَّا بِاللّٰہِ وَ بِالۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَ مَا ھُمۡ بِمُؤۡمِنِیۡنَ (2:8) یہ کچھ کہنے والے مومن نہیں ہوتے اور ہم نے دیکھ لیا کہ یہ کیوں نہیں ہوتے؟ یہ دیکھ لیجیے گا کہ یہ بالکل وہی کیٹگری (شق) نہیں ہے جو زبان سے کہتے وقت ہی' اپنے دل میں کہہ دیں کہ ہم نے کسی نہ کسی طرح سے' کسی لالچ میں آ کر' کچھ ڈرنے کے بعد کہہ تو دیا ہے اور دل میں اُسی وقت وہ یہ چیز کہیں کہ یہ نہیں صاحب! یہ غلط ہے۔ منافق کی ایک کیٹگری (شق) تو یہ آتی ہے۔ یہ تو وہ کیٹگری (شق) ہے جو کسی چیز کو صرف زبان سے کہتے ہیں' اس چیز کو کر کے ایمان نہیں لاتے۔ ایمان لانے کے بعد کی یہ چیزیں نہیں ہوتیں وہ مطمئن ہو جاتے ہیں۔ یہ فریبِ نفس' (Self Deception) ہے۔ یہ Genuine (اصلی) بھی ہوتا ہے اور نیک نیتی سے بھی فریبِ نفس ہوتا ہے۔ کہا ہے کہ یہ کیٹیگری (شق) کن لوگوں کی ہے؟ یہ کیا کرتے ہیں؟ کہا ہے کہ یُخٰدِعُوۡنَ اللّٰہَ وَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا (2:9)۔ قرآن یہ عجیب چیز کہہ گیا ہے۔ یُخٰدِعُوۡنَ اللّٰہَ کے عام معنی ہوتے ہیں کہ یہ اللہ کو اور جماعتِ مومنین کو فریب دیتے ہیں۔ اُس جماعتِ مومنین کو فریب دیتے ہیں جو ان تمام معیاروں پہ پورا اترنے کے بعد فی الحقیقت مومنین کی جماعت کہلانے کی مستحق ہے۔

تنہا عقلِ انسانی کی بنیاد پر اختیار کردہ کوئی نظریہ' تصور یا عقیدہ' الحق کے معیار پر پورا نہیں اتر سکتا

یہ یُخٰدِعُوۡنَ ایک بڑا جامع لفظ ہے۔ یہ ''خ دع ک'' مادے میں بولا جاتا ہے۔ پہلے تو یہ ''خ دع'' ایسا راستہ ہے جو بظاہر نظر آئے کہ منزل کی طرف لے جائے گا لیکن منزل کی طرف نہ لے جائے۔ یہ بڑی گہری بات ہے۔ آپ یونہی اپنے ذہن میں دھوکے میں نہیں رہ

رہے۔ آپ نے جو سمجھا ہے اس کے مطابق سمجھ رہے ہیں کہ یہ منزلِ مقصود کی طرف لے جائے گا لیکن یہ تو آپ کے ذہن پہ فیصلے پہ بات چھوڑتا نہیں ہے۔ وہ تو یہ کہتا ہے کہ یہ جو سائن پوسٹ (نشانِ راہ) لگے ہوئے ہیں' تم نے ان سے بھی Consult (مشورہ) کیا ہے' ان سے پوچھ لیا ہے کہ صحیح جا رہے ہو یا اپنے جی سے فیصلہ کر لیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ فیصلہ وہ ہو جسے ہم کہتے ہیں کہ نہایت ایمانداری سے' نیک نیتی سے کیا ہوا ہو۔ کتنے غلط فیصلے ہیں جو بڑی ہی نیک نیتی سے کیے ہوئے ہوتے ہیں۔ ان کا بھی نتیجہ تباہی ہوتا ہے۔

خود ساختہ مذہب کی افیون نے ملتِ اسلامیہ کے وجود کو صدیوں سے لاغر بنا رکھا ہے

میں اکثر یہ کہا کرتا ہوں کہ ہماری بڑی بوڑھیاں' رات کو جو بچہ سوتا نہیں تھا' یہ کبھی تحقیق نہیں کرتی تھیں کہ یہ سوتا کیوں نہیں ہے' اس کو وہ ذرا سی افیون دے دیتی تھیں تا کہ سو جائے۔ وہ ماما سے دیتی تھیں' محبت سے دیتی تھیں اس لیے دیتی تھیں کہ بچہ چیخ چیخ کر نڈھال ہو رہا ہے' سوئے گا نہیں تو بیمار ہو جائے گا۔ یہ کیفیت ہے کہ وہ بچے کو ہلاک کرنے کے لیے ایسا نہیں کرتی تھی لیکن اُن کی نیک نیتی' افیون کے اس مضر اثر کو' روک نہیں سکتی تھی جو وہ کر رہی تھیں۔ لہٰذا یہ چیز کہ صاحب! بڑی نیک نیتی سے وہ چیز کرتے ہیں' بڑی عقیدت مندی سے وہ تو مزاروں پر جاتے ہیں۔ یہاں عقیدت مندی اور نیک نیتی کا سوال نہیں ہے۔ Objective Standards (معروضی معیارات) ہیں' حق تو کہتے ہی اسے ہیں جو ٹھوس حقیقت کی شکل میں آپ کے سامنے ہو' آپ کے ذہن کا تصور یا عقیدہ یا نظریہ حق نہیں کہلاتا۔ اس میں نیک نیتی کی بنا پہ فریبِ نفس کا امکان ہوتا ہے۔ جب Objective Standard (معروضی معیار) ہو تو پھر اس کا امکان نہیں رہتا۔ ترازو صحیح باٹ کا ہو تو اس سے تلنے کے بعد تو فریب کا موقع نہیں رہتا۔ قیاس میں یہ چیز رہ سکتی ہے۔ دوائی' پینے کے بعد اس کا نتیجہ دھوکا نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا یہاں یہ بھی سوال نہیں ہے کہ بڑی نیک نیتی سے سمجھ رہا ہے۔ وہ راستہ جو وہ سمجھ رہا ہو کہ صحیح منزل کی طرف لے جائے گا لیکن وہ منزل کی طرف نہ لے جائے ''خ د ع'' ہے۔ وہ دینار جسے پورے اطمینان سے جیب میں یہ سمجھ کر رکھا ہے کہ کھرا ہے لیکن وہ کھوٹا ہوا' اسے ''خ د ع'' کہتے ہیں اس چیز کو خوش فہمی یا فریبِ نفس کہتے ہیں یہ تو ہوئی افراد کی کیفیت۔ یہاں **یُخٰدِعُوْنَ اللّٰہَ** کہا ہے۔ میں ابھی اس پہ آتا ہوں۔ یہاں ہے کہ **وَ مَا یَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَھُمْ** (2:9)۔ دوسری چیز یہ ہے کہ جماعتِ مومنین کو بھی یہ کس طرح فریب میں رکھتے ہیں' یہ بات بڑی سمجھنے کی ہے۔ یہ کیا کیٹگری (شق) ہے؟

عربوں کی مہمان نوازی بے مثال ہونے کے علاوہ 'مایخدعون' کے تصور کی قائل نہ تھی

برادرانِ عزیز! پھر آ جائیے عربوں کی طرف' پھر آ جائیے ان کی زبان کی طرف۔ بدوؤں کی زندگی یہ تھی کہ صحرا میں چار درخت ہوں' پانی کا چشمہ ہو' تو وہ اپنے دو خیمے لگا لیتے تھے۔ ان کی چند بکریاں تھیں' دو چار اونٹ تھے۔ یہ تھی ان کی کل کائنات۔ دور دور میلوں تک کہیں

آبادی کا نشان نہیں۔ ان کی فطرت میں مہمان نوازی تھی اور اسلام سے پہلے کے عربوں میں بھی ان کی مہمان نوازی کی بڑی بڑی داستانیں چلی آ رہی تھیں۔ کسی مہمان کا بغیر کچھ کھائے پیئے گھر سے اٹھ کر چلے جانا' اس فرد کو ہی نہیں' اس کی آنے والی نسلوں کو ان کی نگاہوں میں مذموم قرار دیتا تھا اور وہ قبیلہ ختم ہو جاتا تھا۔ ایک طرف یہ کیفیت تھی۔ دوسری طرف یہ صورت نہیں ہے کہ کہیں ریلوے کے ہیڈ کے اوپر اسٹیشن کے پاس گاؤں ہے یا وہ قصبہ ہے' یہ معلوم ہے کہ اتنے بجے گاڑی آنی ہے' اس میں شاید کوئی مسافر آ جائے' اس کا بھی انتظام کرو' گاڑی چلی گئی' پھر شام کو آئے گی' درمیان میں تو آئے گی نہیں۔ یہ صحرا ہے یہاں نہ کوئی سڑک ہے' نہ کوئی ریل ہے' پتہ نہیں کس وقت کوئی مہمان آ جائے۔ مہمان کے آنے کا پتہ نہیں اور کیفیت مہمان نوازی کی یہ ہے کہ اس وقت گھر میں کچھ نہ ہوا تو بس سب کچھ ختم ہوا۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ اس ختم ہونے سے بچنے کے لیے کیا کرتے تھے؟ کسی ایک اونٹنی یا بکری کو چراگاہ میں جانے کے لیے وہ چھوڑتے ہی نہیں تھے' بلکہ اس کو خیمے کے پاس ہی باندھ دیتے تھے لیکن باندھتے اس بکری کو تھے' جو اچھا دودھ دینے والی ہو۔ انہیں اس کا اطمینان ہوتا تھا کہ کسی وقت بھی کوئی مہمان آیا تو اسی وقت انہوں نے جا کر اس کو دوہیا' دودھ کا پیالہ لیا' مہمان کو دیدیا۔ یہ ان کے لیے بڑے اطمینان کی بات تھی لیکن کبھی کبھی اس قسم کی اونٹنی بھی بیچ میں آ جاتی تھی کہ ایک وقت میں اس کو دوہیے' پانچ سات سیر دودھ اس میں سے آ رہا ہے اور دوسرے وقت میں اس کو دوہیے تو وہ دودھ چڑھا جاتی ہے' ایک قطرہ دودھ کا نہیں نکلتا۔ اب سوچیے کہ اس قسم کی' اونٹنی بندھی ہوئی ہو مہمان آ جائیں' اور اس کے بعد آپ اس یقین کے ساتھ دودھ دوہنے گئے' وہاں جو جا کر اس کے تھنوں کو دودھ نکالنے کے لیے ہاتھ لگائیں تو دیکھیں کہ اس میں سے دودھ کا ایک قطرہ بھی کہیں نہیں ہے تو اس میزبان کی کیفیت کیا ہوگی۔ یہ جو اس قسم کی اونٹنی ہوتی تھی کہ کبھی تو اس کی کیفیت یہ ہے کہ پانچ چار سیر دودھ دیدیتی ہے' کبھی کیفیت یہ ہے کہ ضرورت اتنی شدید پڑ رہی ہے' اور ایک قطرہ نیچے نہیں اتارتی' سب چڑھا گئی ہے' یہ جو اونٹنی تھی' وہ اس کو خدع کہتے تھے۔

کہا ہے کہ اگر جماعتِ مومنین میں اس قسم کے افراد جمع ہو جائیں تو وہ قابل اعتماد نہیں ہو سکتے۔ اگر کیفیت یہ ہو کہ کبھی کسی وقت کچھ دیں ہی نہیں' تو چلیے! آپ نے Write off (خارج) کر دیا کہ صاحب! ان کو تو اس میں آپ گنیے ہی نہیں' شمار ہی نہ کیجیے لیکن کیفیت یہ ہو کہ کسی وقت ان کے جذبات کو جو اپیل کیا اور وہ جذبات میں آ گئے' تو وہ سب سے زیادہ بڑھ کر یہ کچھ کر رہے ہیں۔ آپ نے یہ اعتماد کیا اگر کوئی وقت آ پڑا تو کوئی بات نہیں ہے' یہ ہیں کہ اتنا کچھ دیدیں گے۔ عین ایسا Crisis آ گیا' وقت آ گیا'' تے او دودھ چڑھا گئی''۔ معاشرے میں ان افراد کے اوپر کبھی اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ہے خدا' برادرانِ عزیز! جو کہتا ہے کہ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (2:9)۔ یہ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ان لوگوں کی جو خدا کے ساتھ کیفیت ہوتی ہے بیان کر رہا ہوں۔

جماعت مومنین کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ ان پہ بھروسہ کیا جاسکے

عزیزانِ من! قرآن ایسی جماعت تیار کرتا ہے جس کے افراد اس قسم کے مشتعل مزاج والے نہیں ہوتے کہ ان کے جذبات کو اپیل کیا جائے تو پتہ نہیں وہ کیا کچھ کر دکھائیں اور دوسرے وقت میں دیکھا جائے اگر جذبات ٹھنڈے ہو چکے ہیں تو پھر اس کے بعد یہ کیفیت ہو تو تباہ ہو جاؤ گے۔ وہ تو ایک Balanced Personality (متوازن شخصیت) چاہتا ہے۔ کہا ہے کہ وَالَّذِیۡنَ قَالُوۡا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسۡتَقَامُوۡا (41:30) ایک دفعہ کہہ دیا کہ ہاں! ربوبیت کا نظام خدا ہی کا ہے تو پھر اس کے بعد جم کر کھڑے ہو گئے۔ تَتَنَزَّلُ عَلَیۡہِمُ الۡمَلٰٓئِکَۃُ (41:30) یہ ہیں جن کے اوپر ملائکہ اترا کرتے ہیں۔ جماعت کے وہ افراد ایسے ہونے چاہئیں جن پہ ہر وقت بھروسہ کیا جاسکے کہ یہی کریں گے' کوئی وقت کیوں نہ آ جائے' یہ ایسا ہی کریں گے۔ کہتے ہیں کہ یہ وہ لوگ ہیں جو جماعتِ مومنین کے اندر رہتے ہوئے' ان کے لیے اس طرح سے دھوکے کا باعث بنتے ہیں۔

دوسروں کے خلاف جرم کرنا اپنی ذات کے خلاف جرم کرنا ہے

اب یہ جو اللہ کو دھوکا دینے والے' یوں جماعت کے اندر اس طرح کی کیفیت رکھنے والے ہیں' ان کے متعلق کہا ہے کہ وَ مَا یَخۡدَعُوۡنَ اِلَّاۤ اَنۡفُسَہُمۡ (2:9) بظاہر وہ سمجھتے ہیں کہ ہم اللہ کو بھی دھوکا دے گئے' اس جماعت کو بھی دھوکا دے گئے۔ کہا ہے کہ یہ غلط ہے۔ دھوکا اپنے آپ کو دے رہے ہیں۔ اسے Self Deception کہتے ہیں' خود فریبی کہتے ہیں' فریبِ نفس کہتے ہیں۔ یہ اپنے آپ کو دھوکا دینے والی بات ہے۔ یہ جو انسان کا اپنا نفس' اپنی ذات' ہے قرآن کی رو سے اس کا اور خدا کا تعلق انسان کی اپنی ذات کی بنیاد پر ہے' اس ذات پر ایمان ہے' اپنے آپ پر ایمان ہے' اپنے آپ سے سچا ہونا ہے' اپنے آپ کو دھوکا نہ دینا' یہ دوسروں کو دھوکا نہیں' اپنے آپ کو دھوکا نہ دینا ہے۔ یہ جو اپنے آپ کو دھوکا نہ دینے کی چیز ہے دوسرے مقام پہ قرآن نے کہا ہے کہ وَلَا تَکُوۡنُوۡا کَالَّذِیۡنَ نَسُوا اللّٰہَ (59:19) ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے خدا کو فراموش کیا۔ کہا کہ خدا کو فراموش کیا تو یہ کیا بات ہوئی؟ کہا کہ فَاَنۡسٰہُمۡ اَنۡفُسَہُمۡ (59:19) یعنی یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے آپ کو بھلا دیا۔ یہ خود فراموشی ہے۔ اپنے متعلق یہ کیفیت ہے کہ خود اپنے آپ کو نہیں پہچانتے' اس کو بھلایا تو یہ ہے خدا فراموشی۔

عزیزانِ من! خدا کو یاد رکھنا' اس پہ ایمان لے آنا' یہ سارا کچھ کر لینا' اس سے تو خدا کا کچھ نہیں بنتا وہ تو فَاِنَّ اللّٰہَ غَنِیٌّ عَنِ الۡعٰلَمِیۡنَ (3:97) یہ سارا جتنا بھی پروگرام ہے' وہ انسان کی اپنی ذات کی' اپنی Personality کی' اپنے نفس کی Development

(نشوونما) کے لیے ہے۔ اس لیے قرآن کہتا ہے کہ خدا کو بھلا دینے کے عملی معنی یہ ہیں' کہ تم نے حقیقت میں اپنے آپ کو بھلا دیا ہے۔ اور یہاں کہا ہے کہ جسے خدا کو دھوکا دینا کہا گیا ہے' یہ درحقیقت اپنے آپ کو دھوکا دینے والی بات ہے۔ اپنے آپ کی چیز ہے۔ قرآن نے ایک جگہ سورۃ النساء کی آیت 111 میں بھی ایک عجیب بات کہی ہے۔

انسانی نفس کے سلسلہ میں جزا و سزا کا قرآنی تصور اپنے اندر بڑے بنیادی حقائق رکھتا ہے

یہ تو عزیزانِ من! جب میں نفس پہ' ذات پہ' Personality پہ' آگے چل کر آؤنگا' اس وقت قرآنِ کریم کی متعلقہ آیات کو سامنے لاؤنگا کہ وہ Human Personality (انسانی ذات) کے متعلق' کیا کچھ کہتا ہے لیکن قرآن یہاں ایک بڑی عجیب چیز کہہ گیا ہے۔ مجرم کرتا کیا ہے؟ کسی کی چیز چھین لیتا ہے' کسی کو مارتا پیٹتا ہے' کسی کو قتل کر دیتا ہے' خوش ہوتا ہے کہ میں نے اس کو کچھ نقصان پہنچایا' اس کے خلاف میں نے کچھ کیا۔ عزیزانِ من! یہ ایک آیت اگر سامنے رکھ لی جائے قرآن کی رو سے نظامِ عدل اور جزا و سزا کا جو فلسفہ ہے' جو یہاں کے معاشرے کی جزا اور سزا کا فلسفہ ہے' تو ایک آیت یہ بات صاف کر جاتی ہے۔ اور اگر اس کی تعلیم کہیں دلوں کے اندر جا گزیں ہو جائے تو معاشرے میں جرم باقی ہی نہیں رہ سکتا۔ وہ کہتا ہے کہ یہ سمجھتا یہ ہے کہ میں نے دوسرے کے خلاف یہ کچھ کیا' یہ جرم کیا تو سنو! وَ مَنۡ یَّکۡسِبۡ اِثۡمًا (4:111) جس نے یہ ایسا کچھ کیا ہے فَاِنَّمَا یَکۡسِبُهٗ عَلٰی نَفۡسِهٖ (4:111) کسی دوسرے کو اس نے کیا نقصان پہنچایا ہے' اس نے اپنے آپ کو تباہ کر لیا۔ یہ جرم اس نے اپنے خلاف کیا ہے۔ یہ لفظ عَلٰی نَفۡسِهٖ ہے یعنی اپنے خلاف کیا ہے۔ یہ عظیم آیت ہے کہ وَ مَنۡ یَّکۡسِبۡ اِثۡمًا فَاِنَّمَا یَکۡسِبُهٗ عَلٰی نَفۡسِهٖ (4:111) ۔ اور پھر یہاں اثم کا لفظ لانا بڑا ہی معنی خیز ہے۔ یہ ''ا ث م'' سے ہے' جس کے معنی ہیں ''ایسے کام جس سے زندگی کی توانائیوں میں اضمحلال' کمزوری' افسردگی پیدا ہو جائے''۔ جو سمجھتا ہے کہ میں نے کسی دوسرے کو دھوکا دیا ہے' اس کے خلاف جرم کیا' وہ اپنی ذات کے خلاف جرم کرتا ہے۔

اپنی ذات کے ساتھ کیے گئے جرم کی سزا کے متعلق نٹیشے کا ایک بصیرت افروز قول

عزیزانِ من! اگر یہ چیز کہیں ایمان کے درجے پہ پہنچ جائے کہ دوسرے کے متعلق جو میں جرم کرونگا' فریب دونگا' نقصان پہنچاؤنگا' وہ درحقیقت میں اپنی ذات کے خلاف یہ کچھ کرونگا' تو اپنے خلاف دنیا میں کون جرم کرتا ہے؟ کوئی نہیں۔ اس سے جرم کا وجود نہیں رہتا۔ مدینے میں مجسٹریٹ کی ایک اسامی حضرت ابوبکر صدیقؓ (634-573ء) نے Create کی تھی۔ سال بھر تک کے لیے وہ اسامی رہی' سال کے بعد وہ اسامی Abolish (ختم) کر دینی پڑی' جرم کا مقدمہ ہی کوئی نہیں آیا۔ آئے گا کیوں؟ ان کا تو ایمان تھا کہ دوسرے کے خلاف جو کچھ میں کر رہا ہوں وہ میری اپنی ذات کے خلاف ہو رہا ہے۔ اور جو اپنی ذات کے خلاف ہو رہا ہے' اس کے لیے میں نے آپ کو

نیٹشے (1900-844ء) کا قول پیش کیا تھا۔ اسے پھر دہرادوں۔ یہ بڑی گہری چیز ہے۔ وہ شخص کہتا ہے کہ جو جرم تم نے میرے خلاف کیا تھا میں تو اسے تمہیں معاف کر دونگا لیکن اس سے تم نے جو اپنے خلاف جرم کیا ہے اسے کون معاف کرے۔ اس کی معافی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ اپنی ذات کے خلاف ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَظۡلِمُ النَّاسَ شَیۡئًا (10:44) خدا کسی پر کوئی ذرا سی بھی زیادتی نہیں کرتا' ظلم نہیں کرتا۔ وَّ لٰکِنَّ النَّاسَ اَنۡفُسَہُمۡ یَظۡلِمُوۡنَ (10:44) لوگ اپنے آپ پر زیادتی اور ظلم کرتے ہیں۔ اور یہی ہیں جن کے متعلق کہا ہے کہ درحقیقت نقصان تو یہ سمجھتے ہیں کہ ہم نے دوسروں کا کیا' انہوں نے دوسروں کا نقصان نہیں کیا قُـلۡ (39:15) ان سے کہو کہ خوش ہوجاتے ہیں کہ میں نے یہ کرکے اسے نقصان پہنچایا اِنَّ الۡخٰسِرِیۡنَ الَّذِیۡنَ (39:15) وہ نہیں ہیں جن کو نقصان پہنچایا' صحیح نقصان اٹھانے والے وہ لوگ ہیں الَّذِیۡنَ خَسِرُوۡۤا اَنۡفُسَہُمۡ (39:15) جنہوں نے خود اپنا نقصان کیا وَ اَہۡلِیۡہِمۡ (39:15) اور اپنے متعلقین کا نقصان کیا یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ اَلَا ذٰلِکَ ہُوَ الۡخُسۡرَانُ الۡمُبِیۡنُ (39:15) ان کو اعلان کردو کہ وہ تو کچھ نقصان ہی نہیں تھا جو تم نے اس کا کیا ہے' یہ ہے نقصان جو تم نے کھلا ہوا کیا ہے ظہورِ نتائج کے وقت پتہ چل جائے گا کہ وہ نقصان اپنے آپ کا ہے جو تم نے کیا ہے۔

جسم انسانی اور ذات انسانی دو الگ الگ وجود کی حامل ہیں اور ان دونوں کی قیمت بھی الگ الگ ہے

قرآن عجیب چیز کہتا ہے۔ یہ چیز' عزیزانِ من! پہلے بھی دہرا چکا ہوں' اسے پھر دہراؤں۔ ایک چیز ہے جسے آپ ''میں'' (Iam-ness) کہتے ہیں۔ دوسری چیز وہ ہے جسے آپ ''میری'' کہتے ہیں یعنی میرا مال' میرا مکان' میری دولت' میری اولاد' میرا جسم حتیٰ کہ میری جان۔ یہ بھی کوئی میری 'میں' ہے۔ جس کی یہ چیزیں ہیں 'میں' کچھ اور ہے۔ وہ 'میں' ہے جسے نفس یا ذات یا Personality کہتے ہیں۔ قرآن کہتا یہ ہے کہ یہ جتنے نقصانات تم دوسروں کے کرتے ہو' اس سے اس کی جو کوئی اپنی چیز ہے' اس کا نقصان ہوتا ہے۔ یہ تمہاری ذات ہے اس سے تمہاری 'میں' کا نقصان ہوجاتا ہے۔ جن اشیاء کا نقصان ہوگا وہ تو Relative (اضافی) چیزیں ہیں' پھر بھی آجائیں گی۔ یہ جو تم نے اپنی 'میں' کا نقصان کرلیا' یہ پھر کہیں سے بھی نہیں آئے گی۔ کہا ہے کہ کہو! گھاٹے میں کون رہا؟

انسانی ذات کو ہونے والے نقصان کا اندازہ قرآنی اقدار کے ترازو سے ہی کرنا ہوتا ہوگا

اب وہ جو کہا ہے کہ پھر تم تو ہمارے پاس فُرَادٰی (6:94) آؤ گے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جتنی چیزوں کو تم ''میری'' کہتے ہو حتیٰ کہ میرا جسم' میری جان بھی' وہ کہتا ہے کہ جنہیں تم ''میری'' کہتے ہو' وہ ساری موت کے ساتھ یہاں رہ جائیں گی اور تمہاری ''میں'' میرے سامنے آئے گی۔ اس لیے کہا ہے کہ یہ جو چیزیں Relative (اضافی) ہیں' ان پہ کبھی نقصان بھی ہوتا ہے تو اس کی فکر نہ کرو' سوچو یہ کہ اس 'میں' کا نقصان نہ ہوجائے اس نے ہمارے سامنے آنا ہے۔ وَ مَا یَخۡدَعُوۡنَ اِلَّاۤ اَنۡفُسَہُمۡ (2:9) وہ اپنی ''میں'' کو فریب دے رہے

ہیں۔اوراس کے بعد یہ کہا ہے کہ وَ مَا یَشْعُرُوْنَ (2:9) یہ جو ہمارے ہاں یہ شعور ذہنی طور پہ کوئی چیز ہے جس کے لیے یہ استعمال ہوتا ہے یعنی یہ ہے جسے Conceptual Knowledge (علمِ تصورات) کہتے ہیں' یہ ذہن کے اندر ایک نظری تصور ہے' عربوں کے ہاں یہ بات نہیں تھی۔ وہ تو بڑے ٹھوس حقائق پہ چلنے والی قوم تھی۔ ان کے ہاں شعور کہتے تھے ''کسی چیز کو حواس کے ذریعے سے معلوم کر لینا''۔کہا ہے کہ یہ وہ چیز ہے' جو تم اپنی ذات کو نقصان پہنچا رہے ہو' دھوکا دے رہے ہو۔ مشکل یہ ہے کہ حواس کے ذریعے سے یہ بات محسوس نہیں ہوتی کہ میرا کچھ گیا ہے۔ تمہارا جو کچھ جاتا ہے اس کو تو تم شعور کے ذریعے سے معلوم کر لیتے ہو مثلاً چوری ہو گئی' روپیہ چلا گیا' یہ چیز چلی گئی' وہ چیز چلی گئی' کہتا ہے کہ وہ شعور کے دائرے میں آجاتی ہے۔ یہ جو تمہاری اپنی 'میں' کے متعلق یہ کچھ ہوا ہے' یہ شعور کے ذریعے سے سمجھ میں آنے والی بات نہیں ہے۔ اس کے لیے تمہارے پاس ایک Value Criterion (اقداری کسوٹی) ہونا چاہیے' اقدار کا ایک پیمانہ ہونا چاہیے' اس سے ماپ کر دیکھیے کہ ان میں سے کتنا کم ہو گیا۔ اس کو ذہنی طور پہ سمجھنے کی کوشش نہ کرو۔

عزیزانِ من! وقت ہو گیا۔ سورۃ البقرۃ کی آٹھویں آیت ہمارے سامنے آ گئی اور اسی کے متعلق آگے بات اب ذرا تفصیل سے چل رہی ہے کہ یہ ایسا ہوتا کیوں ہے' یہ جو فریبِ نفس ہے یا یہ جو دوسروں کو فریب دینے کی چیزیں کرتے ہیں' یہ ہوتا کیوں ہے؟ کہا ہے کہ یہ ایک مرض ہے۔ اسے ہم' برادرانِ عزیز! آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ط اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ

❀......❀......❀

آٹھواں باب: **سورۃ البقرۃ** (1)' (آیات 9 تا 16)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۝٩ فِيْ
قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ ۙ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۢ ۙ بِمَا كَانُوْا
يَكْذِبُوْنَ ۝١٠ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ ۙ قَالُوْٓا اِنَّمَا نَحْنُ
مُصْلِحُوْنَ ۝١١ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ۝١٢ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ
اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَاۗءُ ۭ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ
السُّفَهَاۗءُ وَلٰكِنْ لَّا يَعْلَمُوْنَ ۝١٣ وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ښ وَاِذَا خَلَوْا
اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ ۙ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ ۝١٤ اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ
وَيَمُدُّهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ۝١٥ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى ۠
فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ۝١٦

عزیزانِ من! آج جولائی 1968ء کی 21 تاریخ ہے۔ افسوس ہے کہ پچھلے اتوار کو بارش کی وجہ سے درس کا ناغہ رہا۔ جو احباب بارش کے باوجود تشریف لے آئے تھے لیکن انہیں محروم لوٹنا پڑا' ان سے ہم معذرت خواہ ہیں۔ آج صبح بھی یہاں موسم بڑا غیر یقینی تھا اس لیے انتظام میں بہت سی تبدیلیاں کرنا پڑیں۔ بہرحال اس وقت بھی سنا ہے کہ شہر میں تو بارش ہو رہی ہے اس لیے احباب پوری تعداد میں نہیں پہنچ سکے اور ہم نے بھی تھوڑا سا ان کا انتظار کیا ہے۔

سابقہ درس پر نگاہِ بازگشت

سابقہ درس میں سورۃ البقرہ کی آٹھویں آیت زیرِ نظر تھی۔ دو گروہ پہلے سامنے آچکے تھے: ایک وہ جو کھلے دل اور زبان کی پوری ہم آہنگی سے' ایمان اور عمل کی یکسر ہم رنگی سے' قوانینِ خداوندی کی صداقت پر یقین رکھتے ہوئے' ان کے مطابق زندگی کو ڈھال رہے تھے'

ڈھالتے ہیں' ڈھالتے رہیں گے اور دوسرا گروہ ان لوگوں کا سامنے آیا جو ان قوانین کی کھلے بندوں مخالفت کرتے ہیں' انکار کرتے ہیں' انہیں تسلیم نہیں کرتے۔ اور اس کے بعد تیسرا گروہ وہ سامنے آیا تھا جو وَ مِنَ النَّاسِ مَنۡ یَّقُوۡلُ اٰمَنَّا بِاللّٰہِ وَ بِالۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَ مَا ھُمۡ بِمُؤۡمِنِیۡنَ (2:8) زبان سے کہتے ہیں کہ ہم اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لائے لیکن وہ مومن نہیں ہوتے۔ اب اس گروہ میں دو شقیں' دو کیٹگریز' ہمارے سامنے آئی تھیں: ایک تو وہ ہے جو ان چیزوں کا اقرار کرتے ہیں لیکن ان کے مطابق عمل نہیں کرتے۔ ان کے متعلق بھی قرآن نے کہا تھا کہ وَ مَا ھُمۡ بِمُؤۡمِنِیۡنَ (2:8) اس لیے کہ مومن ہونے کے لیے مسلم ہونا نہایت ضروری ہے' ان قوانین کی صداقت کو ماننے کے بعد' ان کے سامنے جھکنا' ان کے مطابق اپنے فیصلے کرنا' ان فیصلوں کے مطابق عمل کرنا' یہ بھی مومن ہونے کے لیے ضروری قرار دیا گیا تھا۔ ایک کیٹگری (شق) تو ان کی ہے جو کہتے تو ہیں کہ ہم مومن ہیں لیکن اس کے مطابق عمل نہیں کرتے' وہ بھی مومن نہیں ہیں۔

مومن نہ ہونے کا وہ معیار جو قرآن حکیم نے اپنے ہاں متعین کر رکھا ہے

میں نے عرض کیا تھا کہ ایک چیز تو سیاسی نوعیت سے ایک قوم بنتا ہے' اس اعتبار سے تو یہ ٹھیک ہے کہ ہم مسلمان ایک قوم ہیں' ایک قدرِ مشترک ہے' اس کی بنا پر ہم ایک قوم کے افراد بنتے ہیں لیکن قرآن کی رو سے مومن ہونے کا جو معیار ہے اس پہ تو اسی صورت میں پورا اترا جا سکتا ہے کہ جن قوانین کی صداقت کا اعتراف کیا جائے ان کے مطابق اپنے انفرادی اور اجتماعی امور کے فیصلے کیے جائیں۔ اس لیے کہ وَ مَنۡ لَّمۡ یَحۡکُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الۡکٰفِرُوۡنَ (5:44) جو بھی خدا کی کتاب کے مطابق فیصلے نہیں کرتے تو یہی لوگ ہیں جنہیں کافر کہا جاتا ہے۔ اس لیے مومن کہلانے کے باوجود اگر کتابِ خداوندی کے مطابق امور کے فیصلے نہیں کیے جاتے تو یہ بھی مومن نہیں۔ قرآن کی نص صریح کی رو سے یہ بھی کافروں کے زمرے میں شامل ہوتے ہیں۔

منافق کی نفسیاتی کیفیت

اسی میں دوسری شق ان لوگوں کی ہے جنہیں ہم منافق کہتے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ان کا زبان سے اقرار بھی ایک دھوکا ہوتا ہے' ایک فریب ہوتا ہے۔ پہلی کیٹگری (شق) کے اندر آپ دیکھیں گے کہ ان کا زبان سے اقرار فریب نہیں ہوتا' وہ دھوکا نہیں دیتے لیکن یہ دوسرے لوگ وہ ہیں جو شروع سے ہی اپنی مفاد پرستیوں کے پیشِ نظر زبان سے ان کا اقرار بھی دھوکا ہوتا ہے' فریب ہوتا ہے۔ آگے چل کر ان کو منافق کے لفظ سے یاد کیا جائے گا۔ میں نے پہلے بھی ان الفاظ کے لغوی معنی بتائے ہوئے ہیں۔ یہ میں نے انفاق کے سلسلے میں عرض کیا تھا۔ منافق کے معنی کے سلسلے میں' میں نے عرض کیا تھا کہ آپ کو معلوم ہے کہ یہ جنگلی چوہے جب اپنی بل بناتے ہیں تو اس میں ایک طرف تو اندر گھسنے کا راستہ ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ہی وہ دوسری طرف باہر نکلنے کا راستہ بھی بنا لیتے ہیں۔ یہ جو اس قسم کا بل ہوتا ہے اس

کے لیے وہ لفظ ''ن ف ق'' ہوتا ہے' جہاں سے منافق نکلا ہے جو کسی جماعت کے اندر داخل ہونے کے ساتھ' پہلے یہ سوچ لے کہ یہاں سے باہر نکلنے کا راستہ کونسا ہے۔ وہ داخل اس طرح سے ہو کہ پہلے سے وہ طے کر لے کہ میں نے تو اس میں سے نکلنا ہے' اندر رہنے کے لیے تو داخل نہیں ہوا۔ دونوں راستے رکھنے والا جو ہے اسے لفظی اعتبار سے بھی منافق کہا جائے گا۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کا جو زبانی اقرار' اعتراف اور ایمان ہے' وہ بھی فریب پر مبنی ہوتا ہے۔ انہیں منافق کہا جاتا ہے۔ یہ ان لوگوں کی دوسری کیٹگری (شق) آ گئی کہ **وَ مِنَ النَّاسِ مَنۡ یَّقُوۡلُ اٰمَنَّا بِاللّٰہِ وَ بِالۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَ مَا ھُمۡ بِمُؤۡمِنِیۡنَ** (2:8) اور انہی کے متعلق کہا تھا کہ **یُخٰدِعُوۡنَ اللّٰہَ وَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ مَا یَخۡدَعُوۡنَ اِلَّاۤ اَنۡفُسَھُمۡ وَ مَا یَشۡعُرُوۡنَ** (2:9) وہ بزعمِ خویش اپنے اس اقرار و اعتراف سے نظامِ خداوندی کو' جماعتِ مومنین کو' دھوکا دینا چاہتا ہے لیکن قرآن نے کہا ہے کہ یہ درحقیقت اپنے آپ کو اس سے دھوکا دیتے ہیں' کسی دوسرے کو دھوکا نہیں دیتے۔

لفظ مایشعرون کا قرآنی مفہوم اور امراضِ قلب کی وضاحت

یہ جو فریب دہی ہے یہ درحقیقت سب سے پہلے فریب خوردگی ہوتی ہے۔ اور اس کے متعلق اگلا لفظ یہ کہا ہے کہ **وَ مَا یَشۡعُرُوۡنَ** (2:9)۔ میں نے عرض کیا تھا کہ عربوں کے ہاں شعور ''وہ علم ہوتا ہے جسے حواس کے ذریعے حاصل کیا جائے'' وہ اسے Sense Perception (ادراکِ بالحواس) کہتے ہیں۔ ہمارے ہاں یہ لفظ شعور اس معنی میں استعمال نہیں ہوتا' ہم تو فکر اور شعور اور Consciousness' ان سب کے لیے' یہ لفظ بول لیتے ہیں لیکن ان عربوں کے ہاں' یاد رکھیے! جو مجرد حقیقتیں یا Abstract (غیر محسوس) چیزیں تھیں' ان کے لیے یہ لفظ نہیں بولا جاتا تھا۔ وہ معلومات' وہ علم جو محسوسات کے ذریعے سے حاصل کیا جائے' اس کے لیے وہ شعور کا لفظ عام طور سے بولتے تھے۔ اور جب یہ کہا کہ **وَ مَا یَشۡعُرُوۡنَ** (2:9) تو اس میں بڑی حقیقت ہے کہ وہ اپنی اس چیز سے جو چیزیں محسوس طور پر' Concrete (ٹھوس محسوس) شکل میں' سامنے آئیں' وہ انہی کو سمجھتے ہیں کہ ان سے کچھ علم حاصل ہوا' اور وہ ذہن میں یہ سمجھتے ہیں کہ لوگوں کو بھی ہمارے متعلق اسی صورت میں علم ہوگا۔ کہا ہے کہ جب کوئی چیز محسوس ٹھوس شکل میں ان کے سامنے آئے لیکن اب اگلی آیت کے جو الفاظ ہیں وہ **وَ مَا یَشۡعُرُوۡنَ** کے مفہوم کو زیادہ واضح کر رہے ہیں۔ کہا ہے کہ **فِیۡ قُلُوۡبِھِمۡ مَّرَضٌ** (2:10) بیماری ان کے دل کے اندر ہے۔ اب دل کے اندر کی جو بیماری ہے' وہ محسوسات کی آنکھوں سے کس طرح سے دیکھی جا سکتی ہے۔ جو نفسیاتی امراض ہیں' وہ تو محسوسات کے آلے سے ماپے بھی نہیں جا سکتے' دیکھے بھی نہیں جا سکتے۔ اس لیے کہا ہے کہ ان کے دل کے اندر بیماری ہے اور وہ چاہتے یہ ہیں کہ محسوسات کے ذریعے' اس کے متعلق علم ہو جائے یا وہ سمجھتے یہ ہیں کہ لوگوں کو اس کے متعلق علم ہو نہیں سکتا۔

قلب اور فواد کا باہمی فرق اور انکا قرآنی مفہوم

فِیۡ قُلُوۡبِهِمۡ مَّرَضٌ (2:10) کہا ہے۔ قلوب کا واحد قلب ہے۔ قلب کے معنی تو عام طور پہ دل ہی کیے جائیں گے لیکن عربی زبان میں اس کے لیے بھی دو الفاظ آتے ہیں اور قرآنِ کریم نے خود وہ دو الفاظ استعمال کیے ہیں: قلب بھی ہے اور فواد بھی ہے۔ اور یہ اس زبان کی وسعت اور اس کی باریکیاں ہیں کہ ان دونوں کے اندر بھی ایک فرق ہے۔ اگر چہ یہ دونوں الفاظ عام طور پر ایک ہی معنی میں بھی استعمال ہوتے ہیں لیکن جو فواد ہے' وہ فئد سے ہے اس سے وہ لفظ نکلا ہے' اس میں سوز و گداز کا پہلو ہوتا ہے' وہ بھوننے کے معنی میں آتا ہے۔ اس لیے ان کے ہاں فؤاد تو عام طور پر انسان کے اندرونی احساس کا وہ حصہ ہے جس کا تعلق جذبات سے' سوز و گداز سے ہو' اور قلب وہ ہے جس کا تعلق فکر اور تدبر' فہم اور شعور سے ہو۔ کہا ہے کہ لَهُمۡ قُلُوۡبٌ لَّا يَفۡقَهُوۡنَ بِهَا (7:179) جس سے تفقہ حاصل ہو۔ انگریزی زبان میں اس کے لیے Mind (قلب) کا لفظ آتا ہے' اگر چہ Heart (قلب) کا لفظ بھی استعمال کر جاتے ہیں لیکن اب جو ان کے ہاں کی اصطلاح ہے' وہ Mind (قلب) ہی ہے۔ اور Mind (قلب) ان کے ہاں جامع اصطلاح ہے۔ اس میں یہ فہم و شعور اور جذبات آتے ہیں' وہ Mind (قلب) کو اِن دونوں کا ہی مرکز اور منبع سمجھتے ہیں۔ آپ میں سے جاننے والے تو جانتے ہونگے کہ جب پوچھا جائے کہ Mind (قلب) ہوتا کیا ہے تو وہ یہ بھی نہیں بتا سکتے۔ ان کے ہاں کے خاص Materialists (مادیین) بالکل مادہ پرست' جو مادیت سے آگے کسی چیز میں Believe (یقین) ہی نہیں کرتے' Mind میں وہ بھی Believe کرتے ہیں لیکن جو Mind (قلب) ہے' وہ جسم کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ وہ ایک بڑی جامع اصطلاح ہے جس کے متعلق ابھی تک یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ ہے کیا۔ بہر حال یہ بات تو آگے آئے گی جب میں انسانی نفس پہ' ذات پر' Personality پر آؤنگا' وہاں یہ چیز سامنے آئے گی۔ ان کے ہاں Psyche کا بھی ایک لفظ ہے' Personality بھی کہتے ہیں' Individuality کا بھی لفظ ہے' Mind کا ایک جامع لفظ ہے۔ اور یہ چیزیں وہ ہیں جن کا تعلق اس Physical Body (طبعی جسم) سے نہیں یعنی وہ Physical Body (طبعی جسم) کا حصہ نہیں ہے۔ یہ بات آگے چل کر آئے گی۔ میں اس وقت صرف قلب کے متعلق کہہ رہا تھا کہ ان کے دل کے اندر بیماری ہے۔ یہ جو گوشت کا لوتھڑا ہے' اس کے متعلق بات نہیں ہو رہی۔

دل کی سرجری پر ہمارے ہاں جاری ہونے والے فتاویٰ: اب جنت کا داخلہ اور مشکل ہو جائے گا

میں نے یہ اس لیے عرض کیا ہے کہ پچھلے دنوں جو ہمارے سامنے واقعات آئے کہ دلوں کو تبدیل کیا ہے' ایک سینے سے ایک دھڑکنے

والا کمزور بیمار دل نکال کر، کسی دوسرے کا تندرست دل اس کے اندر سرجری سے لگا دیا ہے۔ یہ واقعات تو آپ کو پتہ ہیں۔ وہاں تو یہ چیز ہے کہ سائنس کی رو سے ان چیزوں کی تحقیق کر رہے ہیں کہ انسانی جسم کے جو کمزور فرسودہ حصے ہیں، ان کی جگہ تندرست توانا، نئے پرزے بدل کر لگا دیئے ہیں۔ وہ ان چیزوں پہ جا رہے ہیں۔ یہ انسانیت کے لیے بڑی منفعت بخش چیز ہے لیکن ہمارے ہاں تو ہر معاملے کے اندر فتویٰ آ جاتا ہے۔ ہمارے ہاں بحثیں ہی یہ شروع ہو گئیں کہ صاحب! یہ جو چیز کی جا رہی ہے، یہ تو بہت بڑا کفر ہے، الحاد ہے۔ اس لیے کہ اگر کسی مسلمان کے سینے کے اندر کسی غیر مسلم کا دل لگا دیا، تو قیامت میں مشکل ہو جائے گی۔ مسلمان جنت میں، کافر کا دل جہنم میں جانا ہے، وہاں کیا کیا جائے گا؟ یعنی ہمارے ہاں یہ بحثیں شروع ہو گئیں۔ قوموں کی بدبختیاں یوں آتی ہیں۔

برادرانِ عزیز! اب اس کے اوپر یہ بحث چل رہی ہے کہ یہ حلال ہے یا حرام ہے؟ اور وہ مسخرے آگے بڑھے ہیں تو انہوں نے ایک انسان کا دل، دوسرے انسان میں نہیں لگا دیا، ایک خنزیر کا دل لے کر ایک انسان کے اندر لگا دیا۔ چل بھئی! فتاویٰ تک بات جا پہنچی۔

دہن کا ذکر کیا؟ یہاں سر ہی غائب ہے گریباں سے

''او کہن گے چنگا بھلا بندہ حرام دا ہو گیا❶''۔ میں کہہ یہ رہا تھا کہ ''قلب'' کو کہا گیا ہے کہ بیماری ''قلب'' کے اندر ہے تو اس کے معنی وہ لوتھڑا نہیں جس کا کام Circulation of Blood یا خون کی گردش ہے۔

نفسیاتی طور پر انسانی ذات کا توازن قائم نہ رہنے کا نام قلب کا بیمار ہونا ہے، پژمردہ ہونا ہے

قلب وہ شے ہے جسے آپ Mind کہہ لیجیے۔ یہ نفسیاتی بیماری ہے جو کہا ہے کہ فِیۡ قُلُوۡبِهِمۡ مَّرَضٌ (2:10). ''مرض'' کے معنی ان عربوں کے ہاں ''اعتدال کا بگڑ جانا'' ہوتے تھے۔ آپ دیکھیے کہ یہ قوم بالکل جہالت کے پردوں کے اندر پرورش پا رہی تھی لیکن ان کے الفاظ آپ دیکھیے کہ وہ کتنی گہرائیوں تک پہنچے ہوئے تھے۔ صحت نام ہی اعتدال کا ہے، مرض نام ہی اعتدال کے بگڑنے کا ہے۔ جسم جس طرح سے Function (کام) کر رہا ہے، اس میں اعتدال بگڑ جائے تو جسمانی بیماری ہو جاتی ہے۔ انسانی قلب، میں اب قلب ہی کا لفظ استعمال کروں گا، انسانی قلب کے معنی ذات کے ہیں۔ یہ جسے آپ Balanced Personality (متوازن شخصیت) کہتے ہیں، اس میں توازن بگڑ جائے تو اسے آپ فِیۡ قُلُوۡبِهِمۡ مَّرَضٌ کہیں گے۔ یہ نفسیاتی توازن بگڑ جانا ہے۔ کہا ہے کہ ان کی کیفیت یہ ہے کہ ان کا یہ توازن بگڑا ہوا ہے، یہ Unbalanced (غیر متوازن) ہو گئی ہے۔ اور اسی لیے دوسری جگہ قرآنِ کریم کے متعلق کہا ہے کہ **شِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوۡرِ** (10:57) یہ شفا ہے اس مرض کے لیے جو اس کے سینے کے اندر ہے۔ یہ پھر سمجھ لیجیے کہ یہ جو سینے کی بیماریاں ہیں، جنہیں آپ Chest Diseases نمونیا وغیرہ کہتے ہیں، یہ وہ امراض نہیں ہیں۔ یہاں قلب کی بیماری کہی ہے، اس کے مقابلے میں شفا کہا ہے۔ یہ ان روگوں

---

❶ وہ کہنے لگے کہ اچھا بھلا آدمی تخمِ حرام جا ٹھہرا۔

کے لیے کہا ہے جو دلوں کے اندر پیدا ہوتے ہیں۔ جو نفسیاتی بیماریاں ہیں یہ ان کے لیے شفا ہے۔ اگلی چیز ہے کہ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا (2:10)۔ یہاں پھر وہی بات آ گئی کہ فاعل بھی اس کے اندر ہے وہ پھر اللہ ہے۔ یہ وہی خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ (2:7) والی بات ہے۔ آپ کو اب یہ چیزیں تو یاد ہونگی کیونکہ آپ تو التزاماً اور تسلسل سے اس کا تتبع کر رہے ہیں' اس لیے اس درس میں انہیں دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔

میں نے اس دن یہ عرض کیا تھا کہ یہاں اگرچہ خدا فاعل کی حیثیت سے آتا ہے' خَتَمَ اللّٰهُ کے معنی ہونگے اللہ نے مہریں لگا دیں لیکن میں نے اس دن بڑی تفصیل سے یہ بتایا تھا اور پورا ایک درس اس پر صرف کیا تھا کہ جہاں یہ چیزیں آتی ہیں کہ اللہ نے یہ کر دیا تو اس کے معنی کیا ہوتے ہیں۔ اور یہاں تو خود یہ بات اگلے ہی دو لفظوں میں واضح کر دی۔ اگر آپ اسے یوں پڑھیں تو یہ شبہات ہی پیدا نہیں ہونگے کہ صاحب! یہ تو خدا ہی ان کے مرضوں کو زیادہ کر رہا ہے تو یہ بیچارے کیا کریں گے۔ کہا یہ ہے کہ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا ۚ وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (2:10)۔ یہ وہی دقت ہے جو آپ کو وہاں خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ (2:7) میں درپیش تھی اور اس کے لیے وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (2:7) ہوتا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ اگر اللہ نے دلوں پہ مہریں لگا دیں' تو اس کی وجہ سے پھر ان کو وہ عذاب دے رہا ہے۔ میں نے یہ عرض کیا تھا کہ اس کے اندر ایک دوسری آیت بِكُفْرِهِمْ ہے' ان کے کفر کی وجہ سے خدا کے قانون نے یہ کیا کہ ان میں سمجھنے سوچنے کی صلاحیت ختم ہو گئی۔ یہاں بھی یہ کہا ہے کہ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا ۚ وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (2:10)۔ آگے ہے کہ بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ (2:10) یہ ہے اس کی وجہ کیونکہ وہ صداقتوں کی' حقیقتوں کی' تکذیب کرتے ہیں' جھٹلاتے ہیں' اس وجہ سے ان کے دلوں کے اندر مرض پیدا ہوتا ہے۔

متواتر بدعملی انسان میں آہستہ آہستہ احساسِ زیاں کا فقدان پیدا کر دیتی ہے

جھوٹ کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ جوں جوں انسان اس روش میں آگے بڑھتا ہے' اپنے Momentum (معیارِ حرکت) سے وہ زیادہ ہوتی چلی جاتی ہے۔ ایک جھوٹ کوئی انسان بولے' اس کے چھپانے کے لیے دس جھوٹ اور بولنے پڑتے ہیں' اس کے بعد کہا کہ پہلی دفعہ جب انسان یہ کچھ کرتا ہے تو اندر کچھ کھٹک پیدا ہوتی ہے' کچھ گرفت سی ہوتی ہے لیکن اگر دو چار مرتبہ اس قسم کی کوئی چیز کر لے تو اس کے بعد آپ دیکھتے ہیں کہ پھر وہ کھٹک بھی پیدا نہیں ہوتی اور پھر تو اس کی عام روش ہو جاتی ہے۔ یہ جو چیز ہے کہ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا ۚ...... بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ (2:10) ان کی تکذیب کی وجہ سے پھر یہ ہوتا ہے کہ یہ جو نفسیاتی مرض پیدا ہوا تھا وہ اپنی روش میں آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں اور اس کی وجہ سے یہ مرض بھی بڑھتا چلا جاتا ہے۔ اس کے لیے پہلی چیز تو یہ ہے کہ اس روش سے رکا جائے اور

رکنے کے بعد جو Damage (نقصان) ہو چکا ہے اس کی اصلاح کی جائے۔ کسی ڈاکٹر کے پاس آپ چلے جائیے جو مرض آپ اسے بتائیں گے اس کے متعلق جب وہ تحقیق کر لے گا اپنی تفتیش سے دیکھ لے گا کہ اس کی وجہ یہ ہے تو پہلی چیز وہ یہ کہے گا کہ صاحب! آپ کو یہ چھوڑنا پڑے گا۔ اس چھوڑنے کے بعد پھر اگلی چیز یہ ہوگی کہ دوبارہ ایسا نہ ہو۔ تو کہا یہ ہے کہ یہ مرض **بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ** (2:10) سے پیدا ہوتا ہے اور جوں جوں یہ اس اپنی روش میں آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں وہ مرض اور زیادہ بڑھتا چلا جاتا ہے۔

زبانی اقرار کے بعد عمل سے تصدیق کرنے کی بجائے شفاعت کے غیر قرآنی تصور کے مضمرات

یہ دونوں ہی چیزیں ہیں۔ پہلے ٹکڑے میں جو ہم آئے تو وہاں **وَ مَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ** (2:8) ہے یعنی ایک وہ کہ زبانی اعتراف کیا منافقت کے طور پہ رسمی طور پہ جیسے پیدائشی طور پر ہم مسلمان ہو چکے ہیں یہ ہوا۔ اور اس کے بعد اس کی ضرورت نہ سمجھی کہ ہم اپنے اعمال سے اپنے کاموں سے بھی اپنے اس اقرار کی تصدیق کر لیں یعنی قومی طور پر مسلمان ہوئے تو مطمئن ہو گئے کہ بہر حال ہم مسلمان ہیں۔ اس کے بعد کبھی ذرا کھٹک پیدا ہوئی تو یہ ایک اور عقیدہ وضع کر لیا کہ کوئی بات نہیں! ہم خدا کے محبوب کی امت ہیں وہاں جائیں گے تو رسول اللہ ﷺ ہمیں بخشوا لیں گے۔ اس کے بعد ہوا کیا؟ ہم نے ضرورت ہی نہیں سمجھی کہ جس بات کا زبان سے اقرار کرتے ہیں اپنے اعمال سے ان کی تصدیق بھی کریں۔ دوسری کیٹگری (شِق) یہ ہوئی کہ جو اقرار ہی فریب دہی سے کرتے ہیں تو وہ تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ اعمال سے اس کی تصدیق کریں گے۔ دونوں میں سے کوئی کیٹگری (شِق) ہو اگر اپنی روش کے اندر آگے بڑھتے چلے جائیں گے تو آپ دیکھیں گے کہ یہ چیز زیادہ ہو جائے گی۔ ہم بھی پیدائشی طور پہ جب ہماری پہلی نسل یوں آئی تھی کہ اس نے عمل کو ضروری نہیں سمجھا تھا اگر کوئی روکنے والا اسی وقت اس کو روک دیتا کہ اس سے تم مومن نہیں ہو سکتے تو یہ مرض آگے نہ بڑھنے پاتا۔ ہزار برس سے ہماری اتنی جنریشن اتنی نسلیں گزر گئیں باپ سے بیٹے کو بیٹے سے آگے پوتے کو اس طرح سے نسلاً بعد نسلٍ یہ چیز متواتر ہم میں آتی چلی گئی کہ مسلمان کے گھر میں مسلمان پیدا ہوئے اسی طرح سے مر گئے مرتے وقت بھی اگر کلمہ نصیب ہو گیا تو از حد بہتر ہوا۔ سب سے بڑی دعا یہ ہوتی ہے کہ مرتے وقت کلمہ نصیب ہو جائے اور بد دعا یہ ہوتی ہے کہ تجھے مرتے وقت کلمہ نصیب نہ ہو۔ تو ضرورت اتنی سمجھی کہ میں مسلمان کے گھر میں پیدا ہوا جس کے اوپر کوئی اختیار نہیں تھا مرتے وقت کلمہ نصیب ہو جائے تو درمیان میں یہ سارے کا سارا جو Period (عرصہ) ہے سب اسلام کے مطابق ہو گیا۔ اور جب اس پہ جنریشن نسلاً بعد نسلٍ گزرتی چلی جائے تو آپ دیکھیں گے کہ یہ چیز پختہ ہو جاتی ہے۔ یعنی اب ہمیں پیدائشی مسلمانوں کو کبھی یہ خیال ہی نہیں آتا کہ ہم مسلمان نہیں ہیں بلکہ اگر کبھی یہ خیال پیدا بھی ہونے لگے تو ایک جھرجھری سی آتی ہے جی چاہتا ہے کہ کہنے والے کے منہ پہ تھپڑ مار دیا جائے کہ مسلمان کو مسلمان نہیں سمجھتا۔ آپ نے دیکھا کہ **فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا** ج (2:10)

کس طرح سے یہ مرض بڑھتا چلا جاتا ہے، چوتھے درجے میں تپ دق (T.B) پہنچ جاتا ہے۔ اس کے بعد یوں قوموں کی تباہی ہوتی ہے۔

یَکْذِبُوْنَ کے مفہوم کی نوعیت

کہا ہے کہ بِمَا کَانُوْا یَکْذِبُوْنَ (2:10)۔ یہ یَکْذِبُوْنَ بڑی چیز ہے گو کہ ترجمہ تو اس کا جھوٹ ہے لیکن قرآنِ کریم عجیب انداز میں بتاتا ہے۔ کذب کسے کہتے ہیں؟ ہمارے ہاں تو یہ چیز ہے کہ باہر کہیں ایک واقع ہوا، ہم نے اس واقع کو غلط بتایا، اسے جھوٹ کہتے ہیں۔ ٹھیک ہے کوئی بات واقع کے خلاف کہنا جھوٹ ہے۔ قرآن کہتا ہے ٹھیک ہے یہ تو جھوٹ ہے لیکن آؤ! تمہیں بتاؤں کہ جھوٹ کی ایک اور قسم ہے اور وہ اس سے بھی زیادہ شدید قسم کا جھوٹ ہے۔ غور سے سنیے، قرآن کی رو سے برادرانِ عزیز! جھوٹ کی Definition۔ کہا ہے کہ اِذَا جَآءَکَ الْمُنٰفِقُوْنَ (63:1) اے رسول! یہ منافق تیرے پاس آتے ہیں۔ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّکَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ (63:1) وہ کہتے ہیں کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ تُو اللہ کا رسول ہے۔ یہ کتنی سچی بات ہے! کہا ہے کہ وَاللّٰهُ یَعْلَمُ اِنَّکَ لَرَسُوْلُهٗ (63:1) بالکل ٹھیک کہتے ہیں کہ تُو خدا کا رسول ہے۔ خدا بھی اس کو جانتا ہے کہ تُو اس کا رسول ہے۔ اب یہ دیکھ لیجیے جو ہمارے ہاں کی سچ اور جھوٹ کی Definition (تعریف) ہے اس کے اعتبار سے انہوں نے بالکل سچ بولا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے متعلق آ کر کہا ہے کہ آپ ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔ اس میں بھی کوئی جھوٹ نہیں ہوسکتا ہے۔ اور پھر اس کی تصدیق خدا کرتا ہے کہ وَاللّٰهُ یَعْلَمُ اِنَّکَ لَرَسُوْلُهٗ (63:1) انہوں نے بالکل ٹھیک کہا ہے، خدا کہتا ہے کہ میں جانتا ہوں کہ واقعی انہوں نے ٹھیک کہا ہے کہ تُو خدا کا رسول ہے۔ لیکن سنیے! آگے کہا ہے کہ وَاللّٰهُ یَشْهَدُ (63:1) لیکن اس کے ساتھ ہی خدا اس بات کی شہادت بھی دیتا ہے کہ اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ لَکٰذِبُوْنَ (63:1) یہ کہنے والے جھوٹے ہیں۔

آپ نے غور فرمایا کہ قرآن کیا کہہ گیا ہے۔ یہ منافق بات وہ کہہ رہا ہے جو واقع کے مطابق ہے کہ آپ ﷺ اللہ کے رسول ہیں، خدا کہتا ہے کہ میں بھی اس بات کی شہادت دیتا ہوں کہ بالکل ٹھیک ہے، تم اللہ کے رسول ہو لیکن یہ جھوٹے ہیں۔ جھوٹ کی Definition (تعریف) یہ ہوئی کہ جب دل اور زبان موافق نہ ہوں، ہم آہنگ نہ ہوں تو اسے جھوٹ کہا جاتا ہے۔ بات بالکل سچی کہہ رہے ہیں، خدا پہلے کہہ رہا ہے کہ ہم بھی کہتے ہیں کہ یہ ٹھیک ہے جو یہ کہتے ہیں لیکن اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ لَکٰذِبُوْنَ (63:1) منافق جھوٹے ہیں۔ تو جھوٹ کی Definition (تعریف) یہ ہوئی کہ جب آپ کا قلب اور زبان یعنی آپ کی زبان قلب کی تصدیق نہ کرے، قلب آپ کا زبان کی تائید نہ کرے، ان دونوں میں ہم آہنگی نہ ہو، تو اسے کذب کہتے ہیں۔ اور یہ ہے وہ جھوٹ۔ آپ سوچیے تو سہی کہ جس وقت ہم ان چیزوں کا اقرار کرتے ہیں، جسے ایمان کے اجزا کہا جاتا ہے، قرآن کے متعلق یہ آیات پڑھتے ہیں، تو کیا ہم اس وقت اپنے قلب کی ترجمانی کر رہے

ہوتے ہیں؟ کیا قلب اور زبان دونوں ہم آہنگ ہوتے ہیں؟ ایک تو جھوٹ یہ ہوا ہے۔ پہلی بات آپ نے دیکھ لی کہ قلب اور زبان کی ہم آہنگی نہ ہو تو وہ جھوٹ ہے۔

اب جھوٹ کی ایک دوسری قسم دیکھیے اور یہ جھوٹ کی اتنی نکھری ہوئی قسم ہے کہ اس کے بعد تو میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے پاس کچھ گنجائش ہی نہیں رہتی۔ کہا ہے کہ اَرَءَ یْتَ الَّذِیْ یُکَذِّبُ بِالدِّیْنِ (107:1) کیا تُو نے ان لوگوں کی حالت پر بھی غور کیا ہے جو دین کو جھٹلاتے ہیں؟ یہ وہی تکذیب ہے' وہی کذب ہے۔ یہ کیا چیز ہے؟ یہ کہ یہ دین کو جھٹلاتے ہیں۔ یہ کفار کے متعلق تو ہو نہیں سکتا۔ یہ ان کے متعلق ہے جو دین کا اقرار تو کر رہے ہیں' انکار نہیں کر رہے' اس کے باوجود اس کی تکذیب کر رہے ہیں۔ کیسے تکذیب کر رہے ہیں؟ جب پوچھیے کہہ رہے ہیں کہ مسلمان ہیں' رجسٹر میں نام درج ہے' الحمد للہ کہہ کر یہ کہتے ہیں کہ خدا کا شکر ہے۔ اس کے باوجود دین کی تکذیب کر رہے ہیں۔ کیسے تکذیب کر رہے ہیں؟ کہا ہے کہ فَذٰلِکَ الَّذِیْ (107:2) یہ وہ لوگ ہیں جو یَدُعُّ الْیَتِیْمَ . وَلَا یَحُضُّ عَلٰی طَعَامِ الْمِسْکِیْنِ (107:2.3) جو معاشرے میں تنہا رہ جاتے ہیں' یہ ان کو دھکے دیتے ہیں' جن کے چلتے ہوئے کاروبار رک جاتے ہیں' ذریعۂ معاش کچھ نہیں رہتا' ان کی روٹی کا انتظام نہ خود کرتے ہیں نہ دوسروں کو اس کے لیے ترغیب دیتے ہیں۔ یہ دین کی تکذیب ہو رہی ہے' انکار نہیں ہو رہا۔

صلوٰۃ کی ظاہری شکل کو مقدم سمجھ لینا کافی نہیں

آپ دیکھتے ہیں کہ کون دین کو جھٹلا رہا ہے۔ اور آگے بڑھیے۔ بڑے پکے نمازی ہیں لیکن فَوَیْلٌ لِّلْمُصَلِّیْنَ (107:4) تباہی ہے ان نمازیوں کے لیے۔ یہ جو نماز نہ پڑھنے والے تھے' یہ تو ملا کی شریعت میں جہنم میں جانے ہی تھے۔ یہ تو اس پورے مجمع کے متعلق کہا جا رہا ہے جو مسجد میں کھڑے ہیں۔ ان نمازیوں کے لیے تباہی ہے۔ الَّذِیْنَ ھُمْ عَنْ صَلَاتِھِمْ سَاھُوْنَ (107:5) وہ لوگ جو اپنی صلوٰۃ کے غرض' مقصد' منتہا' مطلوب' سے غافل ہیں' اس کو پسِ پشت ڈالے ہوئے ہیں۔ کرتے کیا ہیں؟ الَّذِیْنَ ھُمْ یُرَآءُ وْنَ (107:6) نماز کے متعلق جو چیزیں یوں محسوس شکل میں دیکھی جاتی ہیں' وہ کچھ تو وہ ٹھیک ٹھیک کرتے ہیں' اس کے ارکان کی تاکید کے ساتھ' پابندی کرتے ہیں کہ ہاتھ یہاں تک اٹھنے چاہئیں' یہاں باندھنے چاہئیں' رکوع میں اتنا جھکنا چاہیے' سجدے میں پانچوں چیزیں زمین پہ لگنی چاہئیں' الفاظ بھی اپنے صحیح مخرج سے نکلنے چاہئیں۔ یہ سارا کچھ ہو جائے گا تو اس کے مطابق نماز صحیح ہو جائے گی' وہ یہ سارا کچھ کرتے ہیں۔ ھُمْ یُرَآءُ وْنَ (107:6) تباہی ہے ان نمازیوں کے لیے جو چیزیں یوں محسوس طور پہ نظر آتی ہیں' اس میں تو وہ بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں لیکن وَیَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ (107:7) رزق کے وہ چشمے جن کو بہتے پانی کی طرح ہونا چاہیے تھا' ان کے آگے بند لگا کر بیٹھ جاتے ہیں۔

اَرَءَیۡتَ الَّذِیۡ یُکَذِّبُ بِالدِّیۡنِ (107:1) تم نے اس کی حالت پہ بھی غور کیا جو دین کی تکذیب کرتا ہے۔ اس تکذیب کے متعلق برادرانِ عزیز! تفصیل ہمارے سامنے آتی رہے گی۔

میں نے اس وقت صرف دو مثالیں دی ہیں۔ ایک مثال منافقین کی ہے' قرآن نے کہا ہے کہ یہ واقع کے مطابق بات کہہ رہے ہیں لیکن قرآن کہتا ہے کہ یہ کٰذب ہیں' جھوٹ بول رہے ہیں' اس لیے کہ ان کا دل اس بات کی گواہی نہیں دے رہا جو یہ زبان سے کہہ رہے ہیں۔ یہ ایک جھوٹ ہے۔ دوسرا جھوٹ یہ ہے کہ دین کے مدعی ہیں' نمازیں پڑھتے ہیں' ان کے یہ جتنے ظواہر ہیں' ان کی پابندیاں بھی کر رہے ہیں لیکن معاشرے کے اندر جو معاشی نظام ہے' وہ صحیح خطوط پر متشکل نہیں کرتے' رزق کے چشموں کے اوپر بند لگا کر ان کو اپنے لیے مخصوص اور محدود کر لیتے ہیں۔ یہ ہیں جو دین کی تکذیب کرنے والے ہیں۔ یہ دونوں Categories (شِقیں) آ گئیں۔

اب آپ دیکھ لیجیے کہ جسے قرآن نے کـــذب کہا تھا' وہ کیا ہوتا ہے؟ یہ کہ یا تو یہ چیز ہو کہ قلب و زبان کی ہم آہنگی نہ ہو یا یہ چیز تو ہو لیکن جس چیز کا اقرار کر رہے ہو' اعمال سے اس کی تصدیق نہ ہو رہی ہو۔ یہ بھی کـذب ہے اور یہ بھی وہ کـذب ہے جس سے دلوں کے اندر ایک مرض پیدا ہوتا ہے اور اتنی گہرایوں تک یہ مرض پہنچ جاتا ہے کہ سارا کچھ سمیٹنے کے بعد اتنی سے بات اگر سمجھ لیں کہ اس میں اڑھائی فیصد نکال کر ان کو دے دیا جائے تو باقی سارا شیرِ مادر کی طرح حلال و طیّب ہو جاتا ہے۔ یہ مرض دل کی گہرائیوں میں اس طرح پیوست ہو چکا ہوتا ہے کہ وہاں سے نکل ہی نہیں سکتا۔ اس کا علاج شِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوۡرِ (10:57) یہ قرآن ہے۔ اس کے علاوہ کوئی اور نسخہ ایسا نہیں جو اس مرض کا علاج ہو۔

فساد کی اصطلاح کا تفصیلی ذکر اور اس کا بنیادی مفہوم

برادرانِ عزیز! آگے آیئے۔ یہ چیز یہاں تک تو نظری بحث تھی کہ یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں کے اندر مرض ہے' ان کا کـذب اس مرض کو زیادہ کرتا چلا جاتا ہے' اس کی وجہ سے ان کے لیے ایک المناک تباہی ہے۔ یہ کرتے کیا ہیں؟ وَ اِذَا قِیۡلَ لَہُمۡ لَا تُفۡسِدُوۡا فِی الۡاَرۡضِ قَالُوۡۤا اِنَّمَا نَحۡنُ مُصۡلِحُوۡنَ (2:11) کہا جاتا ہے کہ بھئی! ملک میں' قوم میں' معاشرے میں' فساد نہ پیدا کرو۔ کہتے ہیں کہ ہیں! کیا ہم فساد پیدا کرنے والے ہیں؟ کیا کہہ دیا آپ نے صاحب! ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں' ہم مُصۡلِحُوۡنَ ہیں۔ یہ مُصۡلِحُوۡنَ کیا چیز ہوئی؟ عربی زبان میں جو ''ص ل ح'' ہے اس سے صلح' اصلاح' مصلح' کے الفاظ آتے ہیں۔ ''جس چیز کو جس حالت کے اوپر ٹھیک رہنا ہو' اس کا اسی حالت کے اندر رہنا'' یہ اس کی اصلاح ہوتی ہے۔ ''جس حالت پہ رہنا ہو'' کے معنی ہیں ''قانونِ خداوندی کی رو سے رہنا' نظامِ فطرت کی رو سے رہنا'' یہی وہ چیزیں ہیں جنہیں آپ ہمواریاں کہتے ہیں۔ اور اس کا الٹ یہ ہے کہ صحیح شے

اس حالت کے اوپر نہ ہو' جس کے اوپر نظامِ خداوندی' قوانینِ خداوندی کی رو سے اسے رہنا چاہیے۔ جب وہ چیز الٹ جائے تو اسے فساد کہا جاتا ہے' اسی کو ناہمواریاں کہتے ہیں یعنی معاشرے کے اندر ناہمواریاں پیدا کرنا' یہ ہے فساد۔ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ تم معاشرے میں ناہمواریاں نہ پیدا کرو' تو کہتے ہیں کہ ہم تو ناہمواریاں نہیں پیدا کرتے' ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں۔ ذرا اس فساد کی دو تین مثالیں قرآن سے دیکھ لیجیے' پھر آگے بات سمجھ میں آئے گی کہ یہ جو کہتے ہیں کہ ہم تو معاشرے کی اصلاح کرنے والے ہیں وہ کہاں کھڑے ہوئے ہمیں نظر آتے ہیں۔ فساد کیا ہے؟ فساد اور اصلاح قرآن اور ایمان کی دو ہی تو Terms (اصطلاحات) ہیں۔ سارے قرآن میں اس کی تفصیل آپ کے سامنے آئے گی کہ فساد کیا ہے لیکن میں اس وقت دو تین مثالیں آپ کو دوں گا جن سے بالوضاحت کچھ بات سامنے آجائے۔ آپ فساد کا لفظ دیکھیے۔ کہا ہے کہ وَ اِلٰی مَدۡیَنَ اَخَاھُمۡ شُعَیۡبًا (7:85) قومِ مدین کی طرف ان کا بھائی بند شعیبؑ پیغمبر بن کر آیا۔ قَالَ یٰقَوۡمِ اعۡبُدُوا اللّٰہَ مَا لَکُمۡ مِّنۡ اِلٰہٍ غَیۡرُہٗ ' (7:85) وہ جو آ کر وہی پہلا اعلان جو ہر نبی کرتا رہا کہ اے میری قوم! اطاعت اور محکومیت صرف قوانینِ خداوندی کی ہے' اس کے علاوہ کوئی ایسی ہستی نہیں ہے جس کی اطاعت کی جائے۔ قَدۡ جَآءَتۡکُمۡ بَیِّنَۃٌ مِّنۡ رَّبِّکُمۡ (7:85) تمہاری طرف بھی نہایت واضح چیزیں تمہارے رب کی طرف سے آ گئیں۔ آگے سنیے کہ وہ کیا چیزیں تھیں' جو واضح طور پر آ گئی تھیں۔ کہا کہ فَاَوۡفُوا الۡکَیۡلَ وَ الۡمِیۡزَانَ (7:85) دیکھو! تم ماپ تول کے پیمانے صحیح صحیح رکھو۔ وَ لَا تَبۡخَسُوا النَّاسَ اَشۡیَآءَھُمۡ (7:85) دیکھو! جو کسی کا حق ہے' جو کسی کا واجب ہے' اس کے اندر کمی نہ کرو۔ قرآن نے یہ تین چیزیں کہہ دیں کہ پیمانے صحیح رکھو' محنت کش کی محنت کا معاوضہ پورا دو' جو کچھ اس کی محنت سے پیدا ہوتا ہے اسے دو۔

مزدوری یا مجبوری؟

یاد رکھیے! میں معاوضے کے متعلق یہ کہہ دوں کہ ہم لوگ جو دوسروں کی محنت لیتے ہیں' ہم کیا کرتے ہیں؟ مزدور کو تین روپے روز لینے چاہئیں۔ یہ تین روپے روز کا کس نے فیصلہ کر لیا؟ آپ کہیں گے کہ صاحب! وہ جو مزدور ہے' وہ تین روپے روز کے اوپر آ جاتا ہے اس واسطے اس پہ کوئی زیادتی نہیں۔ یہ آپ نے کیا کہا ہے؟ ''پنجابی اچ کیندے نیں بھا کناں وگاڑیا؟ رات دیاں بھوکیاں نیں' رات دا بھوکا بھاوگاڑ دا[1] ہے''، جس کے بچے رات سے بھوکے بیٹھے ہوئے ہیں' آپ تین روپے کیا کہتے ہیں' آپ اس کو دو روپے بھی کہہ دیں گے تو وہ چلا آئے گا' اس کو پتہ ہے کہ اگر میں نہ گیا تو دوسرا دن پھر فاقے کا میرے لیے آ جائے گا۔ اس کے متعلق یہ کہنا کہ ہم نے باہمی رضامندی سے یہ کیا ہے' غلط ہے۔ یاد رکھیے! سب سے بڑا فتنہ معاشی نظام کا یہ ہے' جو Wages (اجرتیں) مقرر کی جاتی ہیں' جو معاوضہ مقرر

---

[1] پنجابی زبان میں کہتے ہیں کہ بھاؤ کس نے مندا کیا؟ رات کو جو بھوکے سوئے' انہوں نے بھاؤ بگاڑا ہے۔ رات کو بھوکا سونے والا بھاؤ بگاڑ دیتا ہے۔

کیا جاتا ہے۔ یہ کون مقرر کرتا ہے؟ جوان کی محنت لیتا ہے' وہ مقرر کرتا ہے۔ اندازہ فرمایئے! یعنی اگر دوکاندار کا اور خریدار کا انداز یہ ہو جائے کہ دوکاندار جو قیمت لگائے' وہ خریدار کو دینی پڑے تو کیا یہ اچھا انصاف ہے؟ نہیں ہرگز نہیں۔ یہاں یہ جوان کی محنت لیتا ہے ان کو Employ (ملازم) کرتا ہے' وہ مل بیٹھ کر طے کرتے ہیں' کہ کتنا دینا ہے۔ اسے کہتے ہیں اس کی محنت کا معاوضہ۔ اور جب وہ اتنا دیدیتا ہے تو اس کے بعد وہ کہتا کہ صاحب! جو مقرر ہوا تھا میں نے دیا ہے۔ اب ان کے مطابق' قانون کے مطابق' وہ بیچارہ کہیں کچھ کہہ نہیں سکتا' کہ جی! یہ طے ہوا تھا۔ یہ غلط ہے۔ معاوضہ اس کا ہے کہ محنت کر کے جو چیز بھی اس محنت سے حاصل ہو' وہ اس کی محنت کا ماحصل ہے' معاوضہ ہے' تم کون ہوتے ہو یہ چیز طے کرنے والے!!! یہ بات لمبی چلی جائے گی۔

قرآن حکیم کے معاشی نظام کے خدوخال کے سلسلہ میں حضرت شعیبؑ کا قوم کے نام پیغام

قرآن نے کہا ہے کہ **وَ لَا تَبۡخَسُوا النَّاسَ اَشۡیَآءَہُمۡ** (7:85) جو کچھ ان کا ہے اس میں کمی مت کرو۔ بات حضرتِ شعیبؑ اور قومِ مدین کی ہو رہی تھی' حقائق آج کی Economy (معیشت) کے متعلق بیان کیے جا رہے ہیں۔ ساری دنیا میں اس وقت جہنم برپا ہے' برادرانِ عزیز! اس لیے کہ **فَاَوۡفُوا الۡکَیۡلَ وَ الۡمِیۡزَانَ وَ لَا تَبۡخَسُوا النَّاسَ اَشۡیَآءَہُمۡ** (7:85) یہ جو چیز ہے' اس پر عمل نہیں ہو رہا۔ ساری لڑائی آپ کے ہاں Capital (سرمایہ) اور محنت کی ہو رہی ہے۔ یہ آواز حضرتِ شعیبؑ نے بلند کی۔ بات میں فساد **فِی الۡاَرۡضِ** کی کہہ رہا تھا۔ سنیئے آگے' عزیزانِ من! کہا ہے کہ **وَ لَا تُفۡسِدُوۡا فِی الۡاَرۡضِ بَعۡدَ اِصۡلَاحِہَا** (7:85)۔ فساد اور اصلاح کے دونوں الفاظ ایک ہی جگہ آ گئے۔ یعنی ماپ اور تول کے اندر یہ ڈنڈی مارنا' محنت کا وہ معاوضہ نہ دینا جو اس کا ماحصل ہے' یہ جو چیز ہے یہ فساد ہے۔ یہ چیزیں صحیح پیمانے پہ آ جائیں تو اصلاح ہے۔ قرآن خود کہہ رہا ہے۔ اب آپ نے دیکھ لیا کہ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ **لَا تُفۡسِدُوۡا فِی الۡاَرۡضِ** (2:11)۔ میں عرض کرونگا کہ خود الارض جو ہے اس کے معنی قرآن کی رو سے معاشی نظام کے ہیں۔ اسی لیے قرآن نے خدا کے متعلق کہا ہے کہ یاد رکھو! اللہ کو مانتا وہ ہے جو اسے **اِلٰـــہُ الۡاَرۡضِ** اور **اِلٰـہُ السَّمَآءِ** مانتا ہے۔ صرف آسمانوں پہ خدا نہیں مانتا' اس زمین میں بھی وہ کہتا ہے کہ اقتدار' اختیار' قانون اس ارض پہ تمہاری ارضی زندگی کے اندر بھی اسی کا چلنا چاہیے جس کا قانون تمہاری افلاکی زندگی میں چلتا ہے۔ فساد **فِـی الۡاَرۡضِ** نہ کرو۔ یہاں سے چیز واضح ہو گئی کہ یہ جو معاشی نظام ہے' اس معاشی نظام کو' اس صحیح حالت پہ نہ رہنے دینا' جو قانونِ خداوندی چاہتا ہے' یہ فساد ہے۔ اور اصلاح یہ ہے کہ اس کو ان خطوط کے اوپر متعین اور متشکل کیا جائے۔ دوسری جگہ وہی حضرتِ شعیبؑ کا قصہ ہے' وہی بات پھر کہی ہے کہ **اَوۡفُوا الۡکَیۡلَ وَلَا تَکُوۡنُوۡا مِنَ الۡمُخۡسِرِیۡنَ وَزِنُوۡا بِالۡقِسۡطَاسِ الۡمُسۡتَقِیۡمِ وَلَا تَبۡخَسُوا النَّاسَ اَشۡیَآءَہُمۡ** (26:181-83)۔ یہ وہی دہرایا گیا ہے ماپ

اورتول کے پیمانے کا کہ **الْمُخْسِرِیْنَ** میں سے نہ ہونا۔ **الْمُخْسِرِیْنَ** کہتے ہی ڈنڈی مارنے کو ہیں۔ کہا ہے کہ یہ نہ کیا کرو‘ اپنا معاشی نظام ان قوانین خداوندی کے خطوط پر متشکل کرو۔ کہا ہے کہ **بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِیْمِ** (26:182) بہرحال میں جب یہاں آؤنگا تو پھر عرض کرونگا کہ یہ کیا الفاظ قرآن کہہ گیا ہے۔ یہاں بھی کہا ہے کہ **وَ لَا تَعْثَوْا فِی الْاَرْضِ مُفْسِدِیْنَ** (26:183) یاد رکھو! ملک میں ‘معاشی نظام میں‘ فساد نہ پیدا کرو‘ اصلاح کی شکلیں پیدا کرو۔ اس کی اور بیّن شکل تو آگے آتی ہے۔

زراندوزی کے سلسلہ میں انسانی نفسیات پر اثر انداز ہونے والی کیفیت اور قرآنی راہنمائی

قارون کو قرآنِ کریم نے نظام سرمایہ داری کے نمائندے کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ اس کے متعلق کہا ہے کہ **اِنَّ قَارُوْنَ کَانَ مِنْ قَوْمِ مُوْسٰی** (28:76) بات چلی آرہی ہے کہ قارون قوم موسیٰؑ میں سے تھا۔ اس سے کہا گیا ہے کہ **وَ ابْتَغِ فِیْمَآ اٰتٰـکَ اللّٰہُ الدَّارَ الْاٰخِرَۃَ وَ لَا تَنْسَ نَصِیْبَکَ مِنَ الدُّنْیَا وَ اَحْسِنْ کَمَآ اَحْسَنَ اللّٰہُ اِلَیْکَ** (28:77) یہ جو اتنا کچھ سمیٹ کر تم نے اپنے لیے رکھ لیا ہے‘ اور اس کے بعد ایک بڑی لطیف بات کہی کہ پھر یہ زراندوزی کی ہوس اتنی زیادہ گہری ہوگئی کہ کسی اور کو اس میں دینا تو ایک طرف رہا‘ یہ کم بخت اپنے آپ پر بھی اس میں سے کچھ نہیں خرچ کرتا۔ ارے! تیرا اپنا حصہ جو دنیا میں اس میں سے ہوسکتا ہے‘ تم اس کو تو لے لو۔ دیکھتے ہیں کہ یہ ہوس انسان کو کہاں تک لے جاتی ہے۔ یہ سنیے اور اسے نگاہ میں رکھیے کہ یہ جتنے بھی بڑے بڑے ہیں‘ یہ ننانوے کے پھیر میں پھرتے ہیں۔ اس دنیا کی زندگی میں بھی اپنا کتنا حصہ رکھتے ہیں اور اس کے بعد کہا ہے کہ یاد رکھو! معاشرے کے اندر حسن پیدا کرو۔ **لَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِی الْاَرْضِ** (28:77) تم معاشی نظام میں فساد نہ پیدا کرو۔ **اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْمُفْسِدِیْنَ** (28:77) یاد رکھو! فساد پیدا کرنے والے نظامِ خداوندی کی نگاہ میں پسندیدہ نہیں ہوتے۔ اب سوچیے تو سہی کہ قارون کونسا فساد پیدا کررہا تھا۔ ہمارے ہاں تو فساد کے معنی یہ لڑائی جھگڑا ہے ’’اے فساد ہوگیا جی او تھے‘‘ یعنی اب ہمارے ہاں فساد کے کوئی اور معنی ہی نہیں رہے۔ یہ جو اس طرح سے خاموشی ہی خاموشی سے خون چوسا جاتا ہے‘ یہ ہمارے ہاں کوئی فساد نہیں۔ کہیں کسی کے سر پہ وہاں لٹھ لگ جائے اور اتنے سے ذرا سا خون نکلے تو فساد ہوا صاحب! پھر وہ قانون کی ساری مشینری حرکت میں آجاتی ہے لیکن اب ہمارے ہاں ان چیزوں کو فساد کہا ہی نہیں جاتا‘ اس کا نام ہی فساد نہیں ہے۔ آپ دیکھیے کہ قارون نے تو اس قسم کا کوئی فساد نہیں کیا تھا۔ اسے کہا ہے کہ تو یہ فساد نہ کر۔ اور وہ فساد یہ تھا جو اوپر کہا ہے کہ اس نے اتنا کچھ سمیٹ لیا کہ اس کے خزانے کو بڑی طاقتوروں کی ایک جماعت تھی جو اٹھا سکتی تھی۔

قارون اپنی اس زراندوزی کو اپنی ہنرمندی قرار دیتا تھا

سنیے! فساد کیا تھا؟ عجیب چیز‘ عزیزانِ من! قرآن کہتا ہے: فساد تھا قارون کی ایک ذہنیت اور وہ ذہنیت یہ تھی کہ جب اس سے کہا گیا

کہ بھئی! اتنا کچھ جو تُو اپنے لیے جمع کر رہا ہے کچھ اپنی ذات پہ خرچ کر اور پھر اس سے کچھ معاشرے کا حسن پیدا کر۔ اس کے جواب میں اس نے کہا ہے کہ قَالَ اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِيْ (28:78) کیا کہہ رہے ہو تم! یہ جو کچھ میں نے کمایا ہے یہ میری اپنی ہنرمندی کا نتیجہ ہے اس میں سے کسی دوسرے کا کیا حق ہے جو مجھ سے کچھ طلب کرے میں کیوں دوں؟ قرآن کہتا ہے کہ یہ ہے فساد۔ یہ ذہنیت کہ وہ اس قسم کی تدبیریں کرتے رہتے ہیں اس قسم کی پلاننگ کرتے رہتے ہیں کہ وہ جو سارا کچھ ہے سمیٹتے چلے جاتے ہیں اور جب ان سے کہیے تو کہتے ہیں کہ صاحب! وہ تو ہمارے حسنِ تدبیر کا نتیجہ ہے جو کچھ یہ ہم اکٹھا کر رہے ہیں اس لیے اس میں کسی دوسرے کا کیا حصہ ہے۔

آپ دیکھتے ہیں کہ جتنی بھی یہ Capitalistic Economy (سرمایہ دارانہ معیشت) ہے اس کے اندر وہ جو اوپر بیٹھا ہوا ہوتا ہے بظاہر وہ کچھ نہیں کر رہا ایک کرسی میز چند کاغذ دو تین اس کے پاس ٹیلی فون ہیں اور سارا کچھ وہاں بیٹھے ہوئے یہ ہو رہا ہے اور کہتا یہ ہے کہ یہ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِيْ ہے میری کاریگری میری ہنرمندی میرے Tact میری تدابیر میری اسکیمیں ہیں یہ بساطِ سیاست پہ میں نے جو مہرے رکھے ہوئے ہیں یہ سب اس کی وجہ سے مجھے مل رہا ہے اس میں کسی دوسرے کا حصہ نہیں ہو سکتا۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ سب سے بڑا فساد ہے جو دنیا میں پیدا کیا جاتا ہے۔

دیکھ رہے ہیں آپ فساد! اور پھر فساد کے لیے تو قرآن نے ایک جامع Term (اصطلاح) استعمال کر دی کہ فساد کیا ہوتا ہے اور اصلاح کیا ہوتی ہے۔ یہ ہماری Definition (تعریف) نہیں بلکہ قرآن کی Definition (تعریف) ہے۔ اس کے مطابق خدا کہہ رہا ہے۔ اس پوری کائنات میں جنہیں اختیار و ارادہ نہیں دیا گیا دیکھیے کہ یہ سب کچھ خدا کے قوانین کے تابع چل رہا ہے اور کس حسنِ نظم و ضبط سے چل رہا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ یہ کیوں چل رہا ہے؟ اس لیے کہ وہاں صرف ایک کا قانون چل رہا ہے۔ اگر ان میں سے ہر شے اپنے لیے خود قانون وضع کرنا شروع کر دے یا کوئی ایک سے زیادہ Authorities (حکام) یہاں ہوں ان کے بیک وقت قانون چل رہے ہوں تو پھر اس کا کیا نتیجہ ہوگا؟ جی نہیں چاہتا کہ پہلی آیت چھوڑ دوں یہ بڑی اہم ہے۔

خدا کو ماننے والوں نے خدا کو دو حصوں میں تقسیم کر رکھا ہے یعنی مسجد کا خدا اور کاروبار کا خدا اور

برادرانِ عزیز! کہا ہے کہ یہ لوگ جو مانتے ہیں کہ خدا ہے اور کہتے ہیں کہ ہم بالکل مانتے ہیں لیکن اس کو انہوں نے آسمانوں پہ بٹھا رکھا ہے۔ اَمِ اتَّخَذُوْٓا اٰلِهَةً مِّنَ الْاَرْضِ هُمْ يُنْشِرُوْنَ (21:21) یہ اپنی ارض کی زندگی کے اندر کوئی اور خدا تجویز کر رہے ہیں اور ان کے زور پہ یہ آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ آپ نے دیکھا کہ یہ دو خدا کیا ہوتے ہیں۔ انہوں نے ایک خدا کو اوپر کی دنیا کا یعنی آسمانوں کا خدا سمجھ رکھا ہے اور اپنی ارض کی زندگی کے اندر ایک اور خدا تجویز کر رکھا ہے اور یہ جو زندگی ہے یہ اس کے سہاروں کے اوپر ہے یہ اس زندگی کے اندر پھیلتے ہیں۔ کہا ہے کہ لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ (21:22) یاد رکھو! یہ خارجی کائنات جو اس حسن و خوبی اور نظم و ضبط سے چل رہی ہے اگر اس میں ایک خدا کی بجائے ایک سے زیادہ خداؤں کے قوانین چلتے تو کیا ہوتا؟ کہا ہے کہ لَفَسَدَتَا

(21:22) وہی فساد ہوتا۔ سوچو کہ یہ کیا ہوتا۔ وہاں کا فساد تو وہ یوں نظر آجائے گا کہ وہ محسوسات کی شکل میں تمہارے سامنے آئے گا۔ تم بعینہٖ یہ چیز اپنی زندگی کے اندر پیدا کر رہے ہو کہ یہاں ایک کا نظام نہیں چل رہا۔

زندگی کے کچھ حصے کے اندر مثلاً نماز' روزہ' حج' زکوٰۃ میں خدا کے احکام ہیں اور تمہاری معاشی زندگی' سیاسی زندگی' معاشرتی زندگی میں یہ تمہارا اپنا نظام ہے۔ وہاں نماز' روزہ' حج' زکوٰۃ وغیرہ کے متعلق اگر ذرا سا بھی فرق آجائے کہ صاحب! ہاتھ یہاں نہیں' یہاں باندھنے چاہئیں' اس کے لیے یہ نہیں ہوتا کہ صاحب! یہ جو نمازی یہاں بیٹھے ہوئے ہیں ان کی Majority (اکثریت) کیا کہتی ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ وہاں شریعت کا فیصلہ کیا ہے۔ سارے نمازی' مثلاً ایک لاکھ بھی جامع مسجد میں جمع ہو کر اگر یہ طے کریں کہ نہیں صاحب! ہمیں ہاتھ یہاں باندھنے چاہئیں اور مولوی صاحب وہاں یہ کہیں کہ نہیں صاحب! شریعت کا فیصلہ یہ ہے کہ ہاتھ یہاں باندھنے چاہئیں تو آپ کے ہاں کی یہ ساری Majority (اکثریت) سو فیصد بھی یہ کہہ رہی ہو کہ ہم وہاں کوئی ہاتھ نہیں باندھتے تو وہاں فیصلہ مولوی صاحب کا چلے گا لیکن وہاں سے باہر نکلنے کے بعد بہترین نظام جو اپنے لیے آپ تجویز کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ جب کوئی معاملہ سامنے آئے تو وہ جو معززین بیٹھے ہوئے ہیں ان سے پوچھیں گے کہ آپ کیا فرماتے ہیں۔ وہ کہیں گے کہ آپ میں سے اکیاون فیصد کیا فرماتے ہیں اور جو وہ کہہ دیں وہ آپ کے لیے قانون ہے۔

یہ دو قسم کے اصول آپ نے کیوں وضع کیے ہیں؟ نماز میں ہاتھ کہاں باندھنے چاہئیں' میں کچھ زیادہ بنیادی مسئلہ نہیں لے رہا کہ سمجھ میں نہ آئے' ابھی تک اس میں یہ کیفیت ہے کہ صاحب! شریعت کا فیصلہ کیا ہے۔ وہاں آپ یہ نہیں کہتے کہ یہ جو نمازی جمع ہیں' ان کی Majority (اکثریت) کا فیصلہ کیا ہے۔ وہاں کے فیصلے کے لیے آپ کے پاس اور اصول ہیں۔ اور جب آپ نے اپنی اس معاشی سیاسی معاشرتی زندگی کے متعلق فیصلہ لینا ہو تو وہ جو جمع ہیں ان کے متعلق پوچھا جاتا ہے کہ صاحب! ان کی اکثریت کیا کہتی ہے۔ اور اس فیصلے کو آپ کے ہاں بہترین نظام مانا جاتا ہے۔ یہ کیا آپ نے دو الٰہ نہیں قائم کر لیے؟ الٰہ کے معنی آخری فیصلہ دینے والا ہیں' الٰہ کے معنی قانون بنانے والا ہیں' الٰہ کے معنی جس کے حکم کی تعمیل کی جائے ہیں' بتاؤ کیا یہ دو الٰہ ہیں یا نہیں؟ نماز کے لیے آپ کے ہاں اور الٰہ ہے' ملک کے قانون کے لیے دوسرا الٰہ آپ نے بنایا ہوا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ ذرا باہر کی کائنات میں اس قسم کے دو اصول وضع کر دیجیے اور ان چیزوں کو اجازت دے دیجیے کہ وہ اس کے مطابق فیصلے کیا کریں ''فیر سویرے اٹھ کے چاء پکا لینا تسی[1]!'' اگر کسی دن صبح اٹھ کر پانچ سات گھروں کے چولہے مل جل کر کثرتِ رائے سے بلکہ متفقہ رائے سے یہ فیصلہ کر لیں کہ آج ہم نے حرارت نہیں دینی تو یہ لفسدتا ہے پھر کسی کے ہاں چائے نہ پکے۔ وہاں یہ ہوتا ہی نہیں۔ یا اگر وہاں دو خدا ہوں' ایک خدا یہ کہہ دے کہ یہ حرارت دے گی' دوسرا خدا کہے کہ نہیں

---

[1] پھر صبح اٹھ کر چائے بھی نہیں بن سکے گی۔

صاحب! ٹھنڈک پہنچائے گی۔''اگ دی شامت جیہڑی اونی اے‘ او تے اونی اے‘ گھر والیاں دی جیہڑی کچھ آئے گی او سمجھ لئی ناتسی ؟ تسے تے بیٹھے ہو باہر‘ جس ویلے آواز دیو گے تے ادھے گھنٹے دے بعد ناشتہ آئے گا[1] ''۔ یہ ہے لَفَسَدَتَا (21:22) ۔

آج پوری انسانیت نے اپنی سوچ کو دو حصوں میں تقسیم کر رکھا ہے

عزیزانِ من! فساد کی بنیاد یہ ہے کہ زندگی کے حصے کر دیئے جائیں‘ ثنویت Duality آجائے‘ ایک گوشے کے لیے یہ الٰہ ہو اور دوسرے گوشے کے لیے دوسرا الٰہ ہو تو یہ ہوا لَفَسَدَتَا (21:22) ۔اور پھر سماء کا الٰہ تمہارے ہاں الگ اور ارض کا الگ۔آپ دیکھتے ہیں کہ یہ خود قرآن نے دو حصے بتا کر کتنی اہم چیز کی طرف ہماری توجہ مبذول کرائی ہے۔ہم سب اِلٰـهُ السَّمَـآءِ پہ ایمان رکھنے والے ہیں‘ برادرانِ عزیز!''ایس واسطے پئی ایہدے نال بگڑدا کجھ نئیں[2] ''۔ٹھیک ہے آسمان پہ وہ بیٹھا ہے‘ عرش اس کا ہے‘ اس کے بعد اس کا حکم چلتا ہے‘ اس کے ماننے والے فرشتے اسے مان رہے ہیں۔ ہمارے لیے جو کچھ حصہ ہے‘ وہ اتنا ہی ہے کہ وہ نماز‘ روزہ‘ حج‘ زکوٰۃ کے جو مسائل ہیں وہ ان سے متعلق ہیں۔غلط صحیح کچھ بھی ہو‘ بہر حال اب بھی ہم یہ مانتے ہیں کہ صاحب! ان نماز‘ روزہ‘ حج‘ زکوٰۃ میں خدا کا حکم کیا ہے۔اور وہاں سے باہر نکلے‘ ہم دکان پہ آئے‘ دفتر میں آئے‘ ہل چلاتے ہیں‘ فیکٹری میں ہیں‘ وہاں نظام کچھ اور ہے۔ یا ہماری انفرادی زندگی میں وہ نظام کچھ اور ہے۔اس سے آگے عملی زندگی میں حکومتی سطح پر بڑھے تو بہترین نظام وہ ہے جس کے فیصلے اکیاون فی صد ووٹ کے ہیں۔

عزیزانِ من! یہ دو الٰہ ہیں جو اس طرح مانے جا رہے ہیں۔قرآن نے کہا کہ یاد رکھو! اگر الٰہ کہیں ایک سے زیادہ ہو جائیں تو یہ ہے لَفَسَدَتَا (21:22) ۔کہا یہ تھا قرآن نے کہ جب ان سے یہ کہا جاتا ہے کہ فساد مت پیدا کرو تو یہ کہتے ہیں کہ نہیں صاحب! ہم فساد پیدا کرنے والے نہیں ہیں۔ ہم تو مصلحون ہیں۔ یہ ہمارے ہاں جو بڑی بڑی فیکٹریاں لگانے والے ہیں‘ بڑی بڑی ملز کے مالکان ہیں‘ Industrialists (صنعت کار) ہیں جب بھی کہیں گفتگو کیجیے تو یہ کہیں گے کہ صاحب! ہم ملک کی ترقی کے لیے کتنے کوشاں ہیں۔آپ دیکھ رہے ہیں کہ آپ ایک چیتھڑے کپڑے تک کے لیے دوسروں کے محتاج ہو جاتے اگر ہم یہ ٹیکسٹائل ملز نہ لگاتے۔ٹھیک ہے جی! آپ کا بڑا احسان۔کہتے ہیں کہ کیا تم اس کا نام فساد رکھ رہے ہو؟ کیا یہ اصلاح نہیں ہے؟ اور قرآن کہتا ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ نَحۡنُ مُصۡلِحُوۡنَ (2:11)۔دیکھا مصلحون کی کیسے شکلیں بدلتی چلی جاتی ہیں!

---

[1] آگ کی جو شامت آنی ہے وہ تو آئے گی ہی‘ گھر والوں کی بھی شامت آجائے گی۔کیا آپ سمجھ گئے ہیں؟ اب! آپ تو باہر بیٹھے ہو جس وقت آواز دو گے تو آدھے گھنٹے بعد ناشتہ آئے گا۔

[2] یہ اس لیے کہ اس سے کچھ نہیں بگڑتا۔

بدل کے بھیس زمانے میں پھر سے آتے ہیں
اگرچہ پیر ہے آدم جواں ہیں لات ومنات

محسوس شکل اختیار کیے بغیر مفسدون کا طریق کار

کہا ہے کہ نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ .اَلَآ (2:11.12)۔قرآن کریم کے بیان کا انداز ہے عزیزانِ من! کہ اتنے زور سے یہ اعلان کیا کرتا ہے، جس کے معنی ہوتے ہیں کہ غلط کہہ رہے ہیں۔سن رکھو سننے والو! جھوٹ کہہ رہے ہیں جو کچھ کہہ رہے ہیں۔حقیقت یہ ہے کہ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ (2:12)۔یہ عربی جاننے والے دیکھیں گے کہ یہ زورِ بیان کیا ہوتا ہے۔کہا ہے کہ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ (2:12)یاد رکھو! فساد پیدا کرنے والے یہی ہیں، بالیقین یہی ہیں، کوئی اور نہیں ہے۔اور آگے ہے کہ وَ لٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ (2:12) کہتے یہ ہیں کہ بتائیے تو صاحب! مزدور کا خون کہاں سے نکلا؟ کہاں ہم نے فساد کیا؟ ہم نے اس کو کوئی بھی لٹھ نہیں ماری، ہم مالک ہیں، نہایت اطمینان اور امن سے فیکٹری کے اندر آتے ہیں، اس کے بعد ان کے ساتھ جو Wages (اجرتیں) وغیرہ مقرر کیے ہوتے ہیں ان کے مطابق دیا جاتا ہے۔وہ چاہتے یہ ہیں کہ یہ چیز محسوس شکل میں پتہ نہ چلے کہ ہم نے فساد برپا کیا ہے۔انہیں اس کا شعور تک نہیں ہے۔بات تو شاعری کی تھی لیکن کہہ گیا ہے ٹھیک کہ

کسے بتائے کوئی خونِ آرزو کیا ہے
انہیں یہ ضد ہے کہ دیکھیں گے رنگ و بو کیا ہے

مفسدین کے مطالبہ پر خدا کا جواب

جو خونِ آرزو کا رنگ و بو دیکھ کر کہے کہ ہم مانتے ہیں کہ واقعی خون ہوا ہے، اسے کوئی بتائے کہ خونِ آرزو کیا ہے۔یہ ہے وَ لٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ (2:12) یہ اپنے اس فساد کا رنگ و بو دیکھنا چاہتے ہیں۔کہتے ہیں کہ یہ یوں دکھائیے، محسوس طور پر دکھائیے کہ ہم نے کہاں لٹھ ماردی۔قرآن کہتا ہے کہ یہ فساد وہ ہے جو یوں محسوس طور پر رنگ و بو سے نہیں دکھایا جا سکتا۔

آگے میں یہ عرض کرونگا کہ کتنی باریکی میں قرآن چلا گیا ہے کہ یہ ماتھے کی آنکھوں سے دیکھی جانے والی چیز نہیں ہے، یہ دل کی آنکھوں سے دیکھے جانے والے فساد ہوتے ہیں۔اور یہ کہتے ہیں کہ ہمیں ان آنکھوں سے دکھاؤ کہ ہم نے کیا فساد مچادیا ہے۔

آگے ایک اور بات کہی کہ وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ(2:13)جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جس طرح یہ جماعتِ مومنین اس نظام کی صداقت پر ایمان لائی ہے، پھر جس طرح اپنے اعمال سے انہوں نے اپنے

ایمان کی تصدیق کی ہے' تم بھی اس طرح سے کرو تو آگے قرآن نے بات بڑی عجیب کہی۔ آج کے معاشرے میں کسی سے جب یہ کہا جائے کہ صاحب! دیانتداری سے کام لو' ایمانداری سے تجارت کرو' اس کے اندر یہ اس قسم کا دھوکا فریب' کم تولنا نہیں ہے' یہ آمیزشیں نہ کرو' دیکھو تو سہی! کہ فلاں آدمی اس طرح سے چلتا ہے تو فوراً یہ جواب ہوتا ہے کہ صاحب! چار دن کے بعد اسے پتہ چل جائے گا کہ اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے' وہ تو اپنا نفع نقصان بھی نہیں جانتا' بڑے آئے ایمانداری سے کام کرنے والے۔ آپ کے ہاں اگر محکموں کے اندر کوئی شخص یا Worker (مزدور) دیانتداری سے' محنت سے' ایمانداری سے' کام کرے تو باقی سارے اس کو بے وقوف کہتے ہیں۔ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ صاحب! اس طرح سے ایمان لاؤ' اس روش پہ چلو جس روش پہ یہ چلتے ہیں' تو یہ کہتے ہیں کہ یہ تو بے وقوفوں کی ایک جماعت ہے جن کو اپنے نفع نقصان کا بھی پتہ نہیں۔ یہ اس اصول کے مطابق سارا دن فیکٹری لگا کر بیٹھے ہوئے ہیں' سال کے بعد دیکھنا کہ اس میں سے ان کو بچتا کیا ہے' اگر انہیں کچھ بچا تو ہم اسی طرح سے چلنے لگ جائیں' ہم ایسے بے وقوف نہیں ہیں۔ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ ان کی طرح سے ایمان لاؤ تو وہ کہتے ہیں کہ اَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ (2:13) ان بے وقوفوں کی جماعت کی طرح ہمیں بھی کہتے ہو کہ ہم بھی ان کی طرح تباہ ہو جائیں۔ سُفَهَآءُ عجیب لفظ ہے۔ سفاہت عقل وفکر سے کام نہ لینے والے کو کہتے ہیں۔

اب دیکھیے! انہوں نے کہا ہے کہ یہ جماعت جو اتنی محنت کرتی ہے اور پھر اپنی ضرورت سے زائد دوسروں کی احتیاج کو پورا کرنے کے لیے دے دیتی ہے' کچھ لینا نہیں چاہتی' کہیں جائیدادیں نہیں کھڑی کرتی' کہیں ان کے بینک بیلنس نہیں ہوتے' بعض اوقات اپنی ضرورت کو بھی روک لیتی ہے دوسروں کی ضرورت کو پورا کرتی ہے' یہ بے وقوفوں کی ایک جماعت ہے' ہمیں کہتے ہیں کہ تم بھی ایسا ہی کرو صاحب! یہ ہے سُفَهَآءُ یعنی عقل وفکر سے کام نہ لینا۔ آپ کو معلوم ہے کہ یہ جو ہمارے ہاں کے بڑے بڑے ہوتے ہیں ان کے نزدیک بے وقوف کون ہوتا ہے۔ یہ تو قرآن کی بات ہے' قرآن کی بات سے پہلے تو ایک یہ چیز ہمارے ہاں روز کہتے ہیں' پھر وہی بات پنجابی کی ہے' معاف رکھیے گا اسی زبان کے محاورے زیادہ آتے ہیں۔ وہ بات ہے ''جیہدی کوٹھی اچ دانے اوہدے کملے وی سیانے'' یعنی جن کے گھر میں رزق کی فراوانی ہوتی ہے ان کے ہاں کا بے وقوف بھی عقل مند ہوتا ہے۔ اور بڑے سے بڑا عقل مند بھی اگر رات کا بھوکا ہے تو دوسروں کی نگاہوں میں اس سے زیادہ بے وقوف کوئی نہیں ہے۔

دولت مندوں کی محفل میں کسی غریب کی شخصیت کو مجروح کرنے کا فرعونی طریق

اسی مجلس کے اندر جہاں اس قسم کی کوئی چیز ہو کہ کچھ دولت مند' امیر' یہ بڑے بڑے لوگ بیٹھے ہوں' کچھ وہ بھی ہوں جن کی حالت سے' جن کے کپڑوں سے' جن کی ہیئت کذائی سے' معلوم ہو رہا ہو کہ یہ مل اونر نہیں ہیں' پانچ سات اِدھر کرسیاں رکھی ہیں باقی اُدھر بیٹھے ہیں'

اس قسم کے مجمع کے اندر اگر گفتگو ہو رہی ہو تو یہ جو بظاہر ہیئت کذائی سے نظر آتا ہے کہ یہ بڑا امیر آدمی نہیں ہے‘ وہ اگر بیچ میں ایک بات کہنا چاہے تو آپ دیکھیں گے کہ ادھر سے متفقہ طور پر ایک بوچھاڑ آجائے گی کہ میاں! خاموش رہو‘ تمہیں ان معاملوں کے متعلق کیا پتہ‘ تم مت دخل دو۔ یعنی یہ ساری جتنی بھی عقل و شعور‘ فہم تدبر‘ یہ سارا ہے‘ وہ تو سمٹ کر دولت کے ساتھ ہی ان کے جہیز میں آ چکا ہوتا ہے جب دولت کو بیاہ کر لائے تھے۔ ان کا تو اصول یہ ہے کہ عقل دنیا میں دو حصوں میں بٹتی ہے: ایک تو اس کو مل جاتی ہے جو دولت مند‘ فیکٹری والا ہے اور باقی پھر آدھی دنیا میں بٹتی ہے۔

چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی کا‘ یہ قصہ حضرت نوح علیہ السلام کے وقت سے جاری ہے

یہ آج کی بات نہیں ہے‘ عزیزانِ من! بہت پرانی چیز ہے۔ بات ہو رہی ہے حضرتِ نوحؑ کی‘ وہ ان کو دعوت دے رہے ہیں۔ **فَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ** (11:27)۔ قرآن کا لفظ **مَلَا الَّذِیْنَ** ہے‘ ملا کے معنی ہوتے ہیں ”اوجناں دے بھانڈے بھرے ہوئے ہون“‘ یعنی وہ جن کے برتن (رزق سے) بھرے ہوئے ہوں۔ اور اسی اعتبار سے یہ لفظ بعد میں سردار کے معنی میں استعمال ہونے لگ گیا‘ اس لیے کہ اس دور کے اندر معیار ہی سرداری کا یہ تھا کہ جس کے برتن (رزق سے) بھرے ہوئے ہیں۔ اس دور کا کیا‘ آج بھی آپ کے ہاں یہی چلا آ رہا ہے۔ دیکھتے ہیں کہ قرآن کیا لفظ چن کر لاتا ہے۔ انہوں نے جب یہ دعوت دی تو وہ جن کے یہ برتن رزق سے بھرے ہوئے تھے‘ نے کہا کہ **مَا نَرٰکَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا** (11:27) کیا تم کہہ رہے ہو! ہم تو دیکھتے ہیں کہ ہماری طرح کے تم بھی ایک انسان ہو۔ چلیے! یہاں تک بھی خیر ہے‘ اپنے طور پر انسان تو ان سے کہہ دیا‘ اس لیے کہ یہ انبیاؑ عام طور پہ بڑے گھرانے کے ہوا کرتے تھے۔ یہ بات آگے آتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اے ھودؑ! اگر تمہارے گھرانے کا ہمیں پاس نہ ہوتا تو پھر دیکھتے کہ تم کیسے اس قسم کی باتیں کرتے۔

معاشرے میں دولت مندوں کے نزدیک محنت کشوں کا مقام

خیر نبی کو تو یہ کہا۔ آگے بات ہے کہ **وَ مَا نَرٰکَ اتَّبَعَکَ اِلَّا الَّذِیْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِیَ الرَّاْیِ** (11:27) او! یہ جو تمہارے ساتھ یہ جماعت ہے‘ جو تم یہ کہتے ہو کہ یہ ایمانداروں کی جماعت ہے‘ یہ وہ لوگ ہیں جو بڑے چھوٹے سے کام کرتے ہیں: کوئی کنجڑے ہیں‘ کوئی دکاندار سے ہیں‘ کوئی موچی ہے‘ کوئی جولاہا ہے۔ یہ اس قسم کے لوگ ہیں۔ یہ **اَرَاذِلُنَا** (11:27) ہیں یعنی یہ ہمارے معاشرے کے کمّی ہیں۔ پتہ ہے آپ کے ہاں بھی‘ ہمارے ہاں بھی کمّی کہتے ہیں۔ یہ کمّی کہاں سے ہے؟ یہ کمی کیا ہے؟ یہ کام کرنے والا ہے جو کمّی کمین ہو جاتا ہے۔ گاؤں میں یہ جتنے کام کرنے والے ہوتے ہیں‘ ان کو کمّی کہا جاتا ہے۔ کہا ہے کہ یہ جو تمہارے ساتھ لگ گئے ہیں‘

یہ تو ہمارے معاشرے کے کمّی تھے۔ یہ تو بَادِیَ الرَّاْیِ (11:27) ہے' ان کی طرف دیکھ کر یہ نظر آتا ہے کہ ان کے اندر عقل و فکر ہے ہی نہیں' ضرورت ہی نہیں ہے کچھ تحقیق کرنے کی' کچھ پوچھنے کی' کچھ دیکھنے کی کہ واقعی ان کے بھیجے میں کچھ ہے یا نہیں۔ نظر آ رہا ہے صاحب! یہ عقل و فہم والے نہیں ہیں۔ دیکھا آپ نے ان کے نزدیک فقہا کون ہوتے ہیں' عقل و فکر ساری سمٹ کر دولت کے ساتھ آ جاتی ہے۔ جب ان سے کہا کہ ان کی طرح ایمان لاؤ تو کہا کہ اِن لوگوں کی طرح ایمان لائیں' جن کی ہیئت کذائی بتا رہی ہے کہ ان میں کوئی عقل و فکر نہیں ہے۔

صراطِ مستقیم سے سب سے زیادہ ہٹا ہوا وہ شخص ہے جو اپنے آپ کو فریب میں رکھتا ہے

قرآنِ کریم نے' برادرانِ عزیز! یہی لفظ ایک اور جگہ استعمال کیا ہے۔ وہاں یہی سفہ کا لفظ ہے۔ قربان جاؤں اس قرآن کے! یہ تو وہ تھے جو دوسروں کے متعلق فیصلے کر رہے تھے' وہاں کہا ہے کہ وَ مَنْ یَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ (2:130) یہ تو ہم ملتِ ابراہیمؑ کا بیان کرتے چلے آ رہے ہیں' یہ سیدھا صاف راستہ ہے جس میں کسی قسم کی قطعاً آمیزش ملاوٹ نہیں ہے۔ جو اس راستے سے ہٹتا ہے وہ کون ہے؟ کہا ہے کہ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ (2:130) دوسروں کے متعلق عقل و فکر سے کام نہ لینا تو کیا بات ہوئی؟ یہ تو وہ ہے جو اپنی ذات کے متعلق عقل و فکر سے نہیں سوچتا۔ جو اپنے متعلق عقل و فکر سے کام نہیں لیتا یہ وہ ہے جو صحیح راستے سے ہٹتا ہے۔ اگر یہ خود یہ سمجھتے کہ انسانی ذات کیا ہے؟ میں کیا ہوں؟ اس انسانی ذات کی قیمت کیا ہے؟ کن چیزوں سے یہ سنورتی ہے؟ کن چیزوں سے یہ بگڑتی ہے؟ اس کا نقصان کتنا بڑا نقصان ہے کہ جس کی تلافی نہیں ہو سکتی؟ تو پھر یہ صحیح راستے سے کبھی نہ ہٹتے۔ اگر یہ اپنے نفس کے متعلق عقل و فکر سے کام لیتے تو تم دیکھتے کہ پھر یہ اس ملت سے کبھی نہ ہٹتے۔ اس ملت سے وہ ہٹتا ہے' یہ نہیں کہا کہ جو دوسروں کو بے وقوف سمجھتا ہے' بلکہ کہا کہ جو خود اپنے آپ کو فریب دیتا ہے' اپنے متعلق عقل و فکر سے کام نہیں لیتا۔ یہ ہے سَفِهَ نَفْسَهٗ (2:130)۔ یہ جو دوسروں کو کہنے والے ہیں کہ یہ خود سُفَهَآءُ ہیں' کہا ہے کہ یہ دوسروں کو کیا کہیں گے' یہ جسے ہم Self Deception کہتے ہیں' یعنی یہ خود فریبِ نفس ہے اگر یہ خود اپنے ہی متعلق بیٹھ کر کبھی عقل و فکر سے سوچنے لگ جاتے اور اس قسم کی مفاد پرستیوں کے جذبات ان پر چھا نہ جاتے تو ان کو پتہ چلتا کہ ان کے نفس کے حق میں یہ بات ہے کہ اس صحیح راستے کو اختیار کیا جائے۔

میں کہہ یہ رہا تھا کہ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ ان لوگوں کی طرح ایمان لاؤ تو یہ کہتے ہیں کہ کیا ہم ان کی طرح ایمان لائیں جو عقل و فکر سے کام نہیں لیتے۔

دوسروں کو دھوکا دینے والا خود ایک نا قابل تلافی نقصان کا شکار ہو کر رہ جاتا ہے

قرآن نے کہا ہے کہ اَلَآ اِنَّهُمۡ هُمُ السُّفَهَآءُ (2:13)۔ سفہآء عقل وفکر سے کام نہ لینے والے ہیں وہ تو خود یہ سفہآء ہیں جنہوں نے اپنے آپ کو دھوکا دے رکھا ہے۔ آپ نے دیکھا کہ فِیۡ قُلُوۡبِهِمۡ مَّرَضٌ (2:10) کی تشریح کیسے ہوتی چلی جا رہی ہے۔ دوسرے کو دھوکا دینے والا سمجھتا یہ ہے کہ میں اسے دھوکا دے رہا ہوں۔ قرآن نے ہر مقام پہ یہ کہا ہے کہ نہیں! یہ اپنے آپ کو دھوکا دے رہا ہے مگر اسے پتہ نہیں ہے کہ دوسرے کو دھوکا دے کر جو کچھ اس نے لیا ہے وہ تو اس کی کل متاع ہے' کوئی اضافی چیز ہے۔ اس دھوکا دینے سے اس نے جو اپنا نقصان کیا ہے' وہ اس متاع کے مقابلے میں اتنا بڑا نقصان ہے کہ اس کی تلافی نہیں ہو سکتی۔ اس لیے وہ ہر اس فریب کو جو دوسرے کو دیا جاتا ہے' انسان کے اپنے فریبِ نفس سے اس کو تعبیر کرتا ہے۔ کہا ہے کہ اَلَآ اِنَّهُمۡ هُمُ الۡمُفۡسِدُوۡنَ وَ لٰـكِنۡ لَّا يَشۡعُرُوۡنَ (2:13) یہ بات علم و بصیرت سے سمجھ میں آسکتی تھی اور یہ جذبات میں ڈوبے ہوئے ہیں اس واسطے یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آسکتی۔ ان کی روش یہ ہے کہ وَ اِذَا لَقُوا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا (2:14) جب یہ آ کر جماعتِ مومنین سے ملتے ہیں تو ان سے کہتے ہیں کہ قالوا امنا (2:14) ہم تم میں سے ہیں' تمہارے ساتھ ہیں' تمہاری طرح ہم بھی صداقتوں کے اوپر ایمان لائے ہوئے ہیں۔

سیاسی انتشار کے سلسلہ میں سیاسی پارٹیوں کا باہمی کردار

عزیزانِ من! زیادہ دور جانے کی ضرورت نہیں۔ یہ جو Political Parties (سیاسی جماعتیں) ہیں' ان کے جو اندرونِ ورکرز (کارکن) ہیں ان کی حالت کا کسی کو پتہ نہیں ہوتا' کبھی کسی نے جھانک کر دیکھا ہو تو ان کے ہاں یہ روش دیکھیے۔ مثلاً صبح یہ بل پیش ہونا ہے بھئی! یہ سارا کچھ کرنا ہے' وہ کہے گا کہ ہاں بالکل! ہم نے تو آپ سے کہا تھا کہ اس بل کے اندر یہ کیجیے' ٹھیک ہے' یہ بالکل تمہارے ساتھ ہیں۔ اس کے بعد پھر دنیا کے اندر شیاطین کی جو ترکیبیں ہیں' اُن میں ایک بیلٹ ہوتا ہے' اسے بکس کے اندر ڈالنا ہوتا ہے۔ ہاتھ اٹھانے سے تو پتہ چل جاتا ہے کہ کس کے ساتھ ہے اس لیے بکس میں پرچی ڈال دی تاکہ اصلیت کا پتہ نہ چلے۔ دوسری ترکیب دیکھیں کہ الیکشن کے ووٹوں کے اندر قرآن اٹھایا ہوا ہے صاحب! آپ کو یہ مثالیں ملیں گی کہ قرآن پہ ہاتھ رکھا ہوا ہے' یہ سب کچھ ہے مگر وَ اِذَا لَقُوا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا قَالُوۡۤا اٰمَنَّا ۖۚ وَ اِذَا خَلَوۡا اِلٰى شَيٰطِيۡنِهِمۡ (2:14) پھر وہ اپنے شیاطین کی طرف پرچی ڈالنے کے لیے اندر جاتے ہیں۔ شیطان کا یہ لفظ آگے قصۂ آدم میں ہے' وہاں چونکہ شیطان و ابلیس دونوں الفاظ آتے ہیں تو اس کی تشریح میں وہاں کرونگا۔ یہاں تو یہ بات نظر آگئی کہ یہ اپنے اس قسم کے سرغنوں کی طرف جاتے ہیں' شیاطین کی طرف جاتے ہیں۔ شیطان کے معنی ہوتے ہیں "نظامِ قوانینِ خداوندی سے سرکشی برتنے والے"۔ شطن کے معنی ہوتے ہیں "طغیانیوں میں آئے ہوئے' سیلاب میں آئے ہوئے" جب یہ ساحلوں کے بند توڑ کر شیطان بن جاتا ہے' جب یہ ان سرغنوں کی طرف آتے ہیں تو ان کے پاس جا کر کہتے ہیں کہ قَالُوۡۤا اِنَّا مَعَكُمۡ (2:14) او!

ہم بالکل تمہارے ساتھ ہیں۔ انہوں نے کہا کہ صاحب! ہمیں تو یہ پتہ چلا ہے کہ آپ اُن سے بھی وعدہ کر آئے ہیں کہا کہ او بھولے بادشاہو! اِنَّمَا نَحۡنُ مُسۡتَهۡزِءُ وۡنَ (2:14) ہم تو ان کو الو بنا رہے تھے' آپ نے سچ ہی سمجھ لیا' حد ہو گئی' او بھولے بادشاہو! ہم مذاق کر رہے تھے۔ آپ نے دیکھ لیا ہو گا۔ اس سے پیشتر قرآن کہتا چلا آ رہا ہے کہ دوسرے کو فریب دینے والا اپنے آپ کو فریب دیتا ہے۔ اور یہاں یہ چیز کہی کہ یہ جو کہتے ہیں کہ ان کا مذاق اڑا رہے تھے تو سنو! اَللّٰهُ يَسۡتَهۡزِئُ بِهِمۡ (2:15) یہ قانونِ خداوندی کی رو سے اپنے آپ کا مذاق اڑا رہے ہیں' یہ دوسروں کا کیا مذاق اڑائیں گے۔

قوانین خداوندی کا مذاق اڑانے والوں کا خدا 'مذاق اڑاتا ہے' کا قرآنی مفہوم

عام طور پہ یہاں بھی اعتراض کیا جاتا ہے کہ صاحب! وہ مذاق اڑاتے ہیں تو کہا ہے کہ صاحب! اللہ ان کا مذاق اڑاتا ہے تو اس لیے دونوں میں کیا فرق ہوا کہ بھئی! یہ ان کا مذاق اڑا رہے ہیں' اللہ ان کا مذاق اڑا رہا ہے۔ محاورے میں یہ چیز یوں نہیں ہوتی۔ جو مذاق اڑانا ہوتا ہے' اس کے معنی کچھ گہرے ہوتے ہیں۔ عربوں کے ہاں بھی کہتے ہیں کہ جب کوئی بڑا لق ودق میدان ہو' جنگل ہو' جس کے اندر جا کر انسان راستہ کھو جائے' سرگرداں ہو' تو وہاں کہتے ہیں کہ مَفَازَةٌ هَازِئَةٌ بِالرَّكۡبِ یعنی ایسا لق ودق میدان جنگل جو سواروں کی ہنسی اڑا رہا ہو۔ ہمارے ہاں بھی اقبالؒ (1877-1938ء) کی ایک چیز ہے: 'ہلالِ عید ہماری ہنسی اڑاتا ❶ ہے۔ آپ نے دیکھا ہنسی اڑاتا ہے کہ معنی کیا ہوتے ہیں۔ ''مذاق کرتا ہے'' معنی نہیں ہوتے' ہنسی اڑاتا ہے کے معنی کچھ اور ہوتے ہیں۔ وہ یہ ہوتے ہیں جو دوسرے الفاظ میں آ نہیں سکتے' صرف بات سمجھی جا سکتی ہے کہ 'ہلالِ عید ہماری ہنسی اڑاتا ہے'۔ وہ یہی ہے کہ جب' ہمیں یہ پیغامِ نشاط دیتا ہے تو ہماری اس قوم کی حالت یہ ہے کہ ہمیں کھانے کے لیے روٹی نہیں' پہننے کے لیے کپڑا نہیں' بچوں کو دینے کے لیے ایک پیسہ نہیں' اور اس کے بعد پھر یہ آ جاتا ہے: نویدِ عید لے کر' عید کے جشن کی خوشخبری لے کر۔ یہ ہے وہ پوری نظم جو چلی آتی ہے۔ اور اس کے بعد آخر میں یہ کہا ہے کہ اس سے زیادہ کیا کہا جائے کہ ہلالِ عید ہماری ہنسی اڑاتا ہے' پیغامِ نشاط اور نویدِ مسرت یہ لے کر آیا ہے ہمارے لیے' یہ ہماری ہنسی اڑاتا ہے۔ یہ ہے وہ معنی کہ یہ تو ان سے کہتے ہیں کہ ہم ان کو بے وقوف بناتے ہیں' ہم ان کا مذاق کرتے ہیں' ان کی ہنسی اڑاتے ہیں' فی الحقیقت یہ اپنی آپ ہنسی اڑاتے ہیں' خدا کا قانون ان کی ہنسی اڑاتا ہے کہ یہ کسے فریب دے رہے ہیں' خود فریب خوردہ ہیں اور سمجھتے یہ ہیں کہ دوسروں کو فریب دے رہے ہیں۔

اب جو میں نے کہا ہے' اس کی تشریح اگلے چار الفاظ کر دیں گے۔ کہا تھا کہ وہ جنگل جس میں سوار راستے کھو جائیں ان کے متعلق وہ اپنے محاورے میں کہا کرتے ہیں کہ یہ جنگل' یہ دشت' یہ صحرا' یہ راستے' سواروں کے مذاق اڑاتے ہیں۔ کیوں؟ اس لیے کہ راستہ کھوئے

---

❶ پیامِ عیش ومسرت ہمیں سناتا ہے ہلالِ عید ہماری ہنسی اڑاتا ہے (اقبالؒ: بانگِ درا: عید پر شعر لکھنے کی فرمائش کے جواب میں)

ہوئے ہیں' پتہ چلتا نہیں ہے' یہ سمجھ کر چلے جا رہے ہیں کہ صحیح راستے پہ جا رہے ہیں۔ یوں ہے جو ان کا مذاق اڑتا ہے۔ آگے کہا ہے کہ **وَيَمُدُّهُمْ فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُونَ** (2:15) کیسے ان کا مذاق اڑتا ہے یا خدا کا قانون کیسے ان کا مذاق اڑاتا ہے؟ وہ کہتا ہے کہ یہ راستہ کھوئے ہوئے ہیں' غلط راستے پر جتنا کوئی آدمی آگے بڑھتا جائے گا' عزیزانِ من! اتنا ہی زیادہ وہ غلط تر ہوتا چلا جائے گا۔

منزل کے لیے راستے کا غلط چناؤ انسان کو منزل سے اور دور لے جاتا ہے

یہ عجیب چیز ہے کہ صحیح راستے پہ جتنا چلتا چلا جائے گا' وہ منزل کے قریب ہوتا چلا جائے گا غلط راستے پہ جتنا آگے بڑھتا چلا جائے گا' منزل سے اتنا ہی دور ہٹتا چلا جائے گا۔ تو کہا جائے گا کہ ایسے مسافر کی منزل' ایسے مسافر کی ہنسی اڑاتی ہے' راستہ ایسے راہرو کی ہنسی اڑاتا ہے۔ یہ ہوا ترجمہ جو کیا گیا' یہ ہوا محاورہ جو استعمال کیا گیا۔ کہا ہے کہ ہوتا یہ ہے کہ **طُغْيَانِهِمْ** یعنی ان کی سرکشی' غلط راستے کے اوپر چلنا' سیلاب کی طرح بہے چلے جانا ہے۔ جوں جوں یہ قدم آگے بڑھتے ہیں' ان کی سرکشیاں' ان کی غلط راہرویاں اور بڑھتی چلی جاتی ہیں۔ آگے لفظ ہے **يَعْمَهُونَ** (2:15) اس کا مادہ (Root) ''ع م ی'' بھی اور ''ع م ھ'' بھی ہے۔ اگرچہ یہ ایک دوسرے کے معنوں میں استعمال ہو جاتا ہے لیکن بنیادی طور پہ جو ''ع م ی'' ہے' وہ ہوتا ہے ''آنکھوں کا اندھا'' اور جو ''ع م ھ'' ہے' وہ ہوتا ہے ''بصیرت کا اندھا''۔ کہتا ہے کہ یہ راستے' منزلیں' ان کی ہنسی اڑا رہی ہیں' اس لیے کہ یہ بصیرت کے اندھے غلط راستے پہ چلتے ہیں' صحیح سمجھ رہے ہیں اور اس راستے کے اوپر چلے جا رہے ہیں۔ اگر کوئی روکتا ہے تو اس کا مذاق اڑاتے ہیں' ٹوکتا ہے تو یہ کہتے ہیں کہ تم بے وقوف ہو' ہم کچھ ایسے تمہاری طرح سے بے وقوف نہیں ہیں۔

غلط سوچ کی بنا پر اٹھنے والا ہر قدم دوسروں کے لیے ہنسی کا باعث بن جاتا ہے

یہ ہے **اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ** (2:15)۔ یہ نہیں ہے کہ یہ مذاق کرتے ہیں' خدا (معاذ اللہ) مذاق کرتا ہے۔ یہ اپنی ان طغیانیوں میں' سرکشیوں میں' غلط روش کے اندر' جو غلط راستہ اختیار کیا ہے' اس پہ بڑھتے چلے جاتے ہیں' بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ یہ **يَعْمَهُونَ** (2:15) ہے یعنی کہیں عقل و بصیرت سے بالکل کام نہیں لیتے' بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ کہا ہے کہ یہ ہے چیز' راستے ان کی ہنسی اڑاتے ہیں' منزلیں ان کی ہنسی اڑاتی ہیں' عقل و بصیرت ان کی ہنسی اڑاتی ہے۔ اس کے معنی ہیں کہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم دوسروں کی ہنسی اڑا رہے ہیں' درحقیقت ان کی بے بصری دیکھ نہیں رہی کہ دنیا ان کی ہنسی اڑاتی ہے' ہر صحیح العقل ان کی ہنسی اڑاتا ہے' صحیح راستے پہ چلنے والا مسافر ان کی ہنسی اڑاتا ہے اور راستے بھی ان کی ہنسی اڑاتے ہیں۔ جسے یہ اپنا نفع سمجھ رہے ہیں یہ ان کا یکسر نقصان ہے:

دیارِ مغرب کے رہنے والو! خدا کی بستی دُکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو' وہ اب زرِ کم عیار ہوگا

1907ء میں اس شخص ❶ کی بصیرت نے یہ کہا تھا کہ

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا' ناپائیدار ہوگا
دیارِ مغرب کے رہنے والو! خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو' وہ اب زرِ کم عیار ہوگا

ان سے کہو کہ آج جن چیزوں کو یہ اپنے لیے منفعت انگیزیاں سمجھ رہے ہیں' منافع سوچ رہے ہیں اور اس میں خوش ہو رہے ہیں اور دیانت اور امانت سے کام کرنے والوں کا مذاق اڑا رہے ہیں' ہنسی اڑا رہے ہیں' سُفَھَآءُ کہہ رہے ہیں' بےوقوف کہہ رہے ہیں' ان سے کہو کہ ان کی یہ تجارت خود ان کا مذاق اڑاتی ہے۔ **اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ اشۡتَرَوُا الضَّلٰلَۃَ بِالۡھُدٰی** (2:16) یہ وہ لوگ ہیں جن کے کاروبار وہ ہیں کہ صحیح راستے کے عوض غلط راستہ خرید رہے ہیں' صحیح جنس دے کر کھوٹے پیسے لے رہے ہیں۔ کہو کہ **فَمَا رَبِحَتۡ تِّجَارَتُھُمۡ** (2:16) ان کی یہ تجارت کبھی بھی نفع کا سودا نہیں ہو سکتی ہے۔ دیانت اور امانت سے کام کرنے والے کی ہنسی اڑانے والو! اور یہ کہنے والو کہ سراسر اپنا نقصان کر رہے ہیں' اے کاش! تمہیں یہ پتہ ہوتا کہ یہ جتنا کچھ تم جمع کر رہے ہو' ''اے تے سارے ہزاری نوٹ ہیگے نیں ❷''۔ لوگوں نے روپیہ بہت بڑا کر لیا تھا اور اس زمانے میں ہزار ہزار کے بھی نوٹ ہوا کرتے تھے۔ تو یہ کچھ کر لیا تھا اور کہا یہ تھا کہ جو اس کا روپیہ لینا چاہیے' وہ بنک سے لے جائے۔ اور وہ دولت تھی ان کے پاس بلیک کی' تو اس ڈر کے مارے باہر لاتے نہیں تھے۔ جب وہ تاریخ آگے چلی گئی' جب وہ سکہ رواں نہ رہا تو لوگوں کے پاس یہ بہت نوٹ تھے۔ اس زمانے میں یہ ہمارے ہاں محاورہ ہو گیا تھا ''اے ہزاری نوٹ ہیگے نیں ❷''، یعنی دیکھنے میں تو دیکھیے یہ بہت کچھ نظر آتا ہے' قیمت اس کی ایک پیسہ بھی نہیں ہے۔ کہا ہے کہ یہ ہے جو کچھ تم نے کیا ہے: **فَمَا رَبِحَتۡ تِّجَارَتُھُمۡ** (2:16) ان کی تجارت ان کو نفع نہیں دے سکتی۔ اس لیے کہ **وَ مَا کَانُوۡا مُھۡتَدِیۡنَ** (2:16) غلط روش پر چل کر ضد کرنے والا کہ میں اسی روش پہ چلتا جاؤں گا اور منزل پہ پہنچ جاؤں گا' کبھی منزل پر پہنچ نہیں سکتا۔

---

❶ یہ اشارہ ڈاکٹر علامہ محمد اقبالؒ (1877-1938) کی طرف ہے۔ (حوالہ ہے: بانگِ درا: مارچ 1907ء)

❷ یہ تمام ہزار' ہزار کے نوٹ ہیں۔

جوقوم بھی اپنے معاشرتی نظام کوقرآن کے غیرمتبدل اصولوں کی بنیاد پراستوارنہیں کرے گی اس کا یہی حال ہوگا

برادرانِ عزیز! یہ ہے وہ مرض جو دلوں کے اندر ہے۔اسے **فِیۡ قُلُوۡبِهِمۡ مَّرَضٌ** (1:10) کہا تھا۔اور جوں جوں یہ غلط روش میں آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں یہ مرض اور زیادہ ہوتا چلا جاتا ہے۔اس لیے کہ یہ دین کی تکذیب کرتے ہیں' زبان سے اس کا اعتراف کرتے ہیں' اپنے معاشرے کا نظام خدا کے قانون کے مطابق متشکل نہیں کرتے' اس کا اعتراف صرف زبان سے کرتے ہیں۔اس لیے یہ سمجھتے ہیں کہ بڑی ترقیاں ہو رہی ہیں' بڑے صحیح راستے پہ چل رہے ہیں' منزل قریب آتی چلی جا رہی ہے لیکن ان کا ہر قدم ان کو منزل سے دور لیے جا رہا ہے۔ان کی یہ تجارت کبھی نفع نہیں دے گی' یہ کبھی منزل پر نہیں پہنچ سکیں گے۔

ہم سورۃ البقرۃ کی آیت 16 تک آ گئے' برادرانِ عزیز! اور اس کے بعد اِن لوگوں کی مزید وضاحت وصراحت' قرآن نے' مثال کے ذریعے دی ہے جو اپنے جذبات کی اندھیریوں میں یوں بہے چلے جاتے ہیں اور سمجھتے یہ ہیں کہ ہم صحیح راستے پہ چل رہے ہیں۔کہا ہے کہ ان کی مثال اس قسم کی ہے' اسے ہم آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ

❀......❀......❀

نواں باب: **سورۃ البقرۃ**(1)'(آیات 17 تا 20)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

مَثَلُهُمۡ كَمَثَلِ الَّذِى اسۡتَوۡقَدَ نَارًا ۚ فَلَمَّاۤ اَضَآءَتۡ مَا حَوۡلَهٗ ذَهَبَ اللّٰهُ
بِنُوۡرِهِمۡ وَتَرَكَهُمۡ فِىۡ ظُلُمٰتٍ لَّا يُبۡصِرُوۡنَ﴿۱۷﴾صُمٌّۢ بُكۡمٌ عُمۡىٌ فَهُمۡ لَا
يَرۡجِعُوۡنَ﴿۱۸﴾اَوۡ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ فِيۡهِ ظُلُمٰتٌ وَّرَعۡدٌ وَّبَرۡقٌ ۚ يَجۡعَلُوۡنَ
اَصَابِعَهُمۡ فِىۡۤ اٰذَانِهِمۡ مِّنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الۡمَوۡتِ ؕ وَاللّٰهُ مُحِيۡطٌۢ
بِالۡكٰفِرِيۡنَ﴿۱۹﴾يَكَادُ الۡبَرۡقُ يَخۡطَفُ اَبۡصَارَهُمۡ ؕ كُلَّمَاۤ اَضَآءَ لَهُمۡ مَّشَوۡا
فِيۡهِ ۙ وَاِذَاۤ اَظۡلَمَ عَلَيۡهِمۡ قَامُوۡا ؕ وَلَوۡ شَآءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ بِسَمۡعِهِمۡ
وَاَبۡصَارِهِمۡ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ﴿۲۰﴾

عزیزانِ من! آج جولائی 1968ء کی 28 تاریخ ہے' ہم اپنے درسِ قرآن کریم کے سلسلۂ نو میں سورۃ البقرۃ کی ابتدائی آیات میں ہیں۔ آج کا درس سورۃ البقرۃ کی 17 ویں آیت سے شروع ہوگا: (2:17)۔

اقدار کے لحاظ سے قرآن حکیم نے انسانوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے

اس سورۃ کے شروع ہونے کے بعد اس وقت تک قرآنِ کریم نے تین گروہوں کا ذکر کیا ہے: ایک گروہ وہ ہے جو دل کے پورے خلوص سے قوانینِ خداوندی کی صداقت پر یقین رکھتا اور اس کے مطابق اپنی زندگیوں کو ڈھالتا ہے۔ یہ متقین کا گروہ ہے۔ دوسرا گروہ وہ ہے جو یا تو ان قوانین کی صداقت کا دل سے یقین نہیں رکھتا اور اپنی بعض مفاد پرستیوں اور مصلحت بینیوں کے پیشِ نظر صرف زبان سے اقرار کرتا ہے یا اگر ان کی صداقت پر یقین رکھتا ہے مگر عمل ان کے مطابق نہیں کرتا' عملاً ان کی تکذیب کرتا ہے۔ یہ دوسرا گروہ ہے۔ تیسرا گروہ وہ ہے جو کھلے بندوں تردید کرتا ہے' انکار کرتا ہے' اور جب ان سے انکار کرتا ہے تو اس کے مطابق عمل کرنے کا ان کے لیے سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یوں تو یہ تین گروہ ہیں لیکن اگر ہم ذرا غور سے دیکھیں تو درحقیقت یہ دو ہی گروہ رہ جاتے ہیں: ایک گروہ وہ ہے جو قوانینِ

خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرتا ہے' اور دوسرا وہ گروہ ہے جو ان کے خلاف زندگی بسر کرتا ہے۔ اسی لیے قرآنِ کریم نے دیگر مقامات میں بھی انسانوں کو دو ہی گروہوں میں تقسیم کیا ہے۔ کہا ہے کہ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّ مَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ (18:29) ایک گروہ ان قوانینِ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنے والا اور دوسرا گروہ ان کے خلاف چلنے والا۔

طبعی قوانین کی کارفرمائی

اب ذرا یہ سمجھ لینا چاہیے کہ ان اقدار کے مطابق زندگی بسر کرنا کیا ہے؟ اور ان کے خلاف جانا کیا ہے؟ اس لیے کہ اسی کے مطابق اب قرآن کی ساری تعلیم آگے چلے گی۔ دو ہی گروہ ہونگے اور ان دو گروہوں کو پہلے سامنے رکھ لینا چاہیے کہ یہ بات ہے کیا۔ اس کائنات میں ایک تو خدا کے طبعی قوانین کارفرما ہیں اور ان کے مطابق یہ سارا سلسلۂ کائنات چل رہا ہے۔ آگ حرارت دیتی ہے' پانی پیاس بجھاتا ہے۔ ان قوانین کی اطاعت بھی نہایت ضروری ہے لیکن ان کی اطاعت یا ان کی مخالفت کا تعلق انسان کی طبعی زندگی سے ہی ہے۔ پیاس لگنے پہ پانی پینا ہے' جو شخص پانی پیتا ہے اس کی پیاس بجھتی ہے' زندہ رہتا ہے' جو شخص پانی نہیں پیتا' پانی کی جگہ تیزاب پی لیتا ہے' وہ ہلاک ہو جاتا ہے۔ ان قوانین کی اطاعت بھی اس طرح ہوتی ہے اور ان کے نتائج بھی طبعی طور پر سامنے آتے ہیں۔ ان قوانین میں مومن اور کافر کا کوئی فرق نہیں ہے۔ آگ عبداللہ کے پانی کو بھی اسی طرح گرم کرتی ہے جس طرح رام داس کے پانی کو گرم کر دیتی ہے۔ وہ کبھی اس میں فرق نہیں کرتی کہ آگ جلا کر اوپر دیگچی رکھنے والا کون ہے۔ سنکھیا خدا کے مقرب ترین بندوں کو بھی اسی طرح ہلاک کر دیتا ہے جیسا ان کے کہنے کے مطابق اس کی بدترین مخلوق فاسقین اور گنہگاروں کو ہلاک کرتا ہے۔ وہ اس میں کوئی فرق نہیں کرتا حتیٰ کہ حضراتِ انبیائے کرامؑ تک بھی خود قرآن کی تصریح کے مطابق اسی طرح سے طبعی موت مر جاتے ہیں جس طرح دوسرے انسان۔ وہ بھی بیمار ہوتے تھے' وہ بھی تندرست ہوتے تھے' کھاتے پیتے تھے' طبعی قوانین کے تابع وہ بھی زندگی بسر کرتے تھے۔ جہاں تک قوانینِ طبعی کی اطاعت کا تعلق ہے' اس میں مومن اور کافر کا کوئی فرق نہیں ہے۔ یہ جہانِ سعی و عمل ہے۔ اس میں جو کوشش اور محنت کرے گا طبعی قوانین کے مطابق اس کے نتائج مرتب ہونگے' اس کی محنتوں کا ماحصل اسے مل جائے گا۔ جو بھی زمین میں ان قاعدوں کے مطابق ہل چلائے گا' اسے سنوارے گا' کھاد ڈالے گا' اچھا بیج ڈالے گا' اس کی سیرابی کرے گا' رکھوالی کرے گا' اس کی فصل پک جائے گی' جو اس کی خلاف ورزی کرے گا' اس کی کوششیں ناکام رہ جائیں گی۔ وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم' گنہگار ہو یا متقی پرہیزگار ہو' ان میں یہ قانون کوئی فرق نہیں کرے گا۔ یہاں تک تو یہ بات بالکل برابر آئی۔

انسانی زندگی کے طبعی قوانین اور انسانیت کی اقدار میں بنیادی فرق کی نشاندہی

اب اس سے آگے اصل چیز شروع ہوتی ہے جہاں انسان کی انسانی زندگی شروع ہوتی ہے۔ یہ طبعی زندگی تھی' اور سمجھانے کی خاطر ان چیزوں کو الگ کرنا پڑتا ہے۔ اس لیے کہ اب جو زندگی شروع ہوتی ہے' وہ ہمارے ہاں انسان کی انسانیت کی زندگی ہے۔ یہاں آ کر بہت بڑا فرق پڑتا ہے۔ یہاں طبعی قوانین نہیں' ان کے علاوہ کچھ اور قوانین ہیں' جن کے مطابق یہ زندگی آگے چلتی ہے۔ مثلاً گھی انسان کو تقویت دیتا ہے' توانائی دیتا ہے۔ آپ بازار سے خرید کر لائیے' چوری کر کے لائیے' انسان کی طبعی زندگی کے اوپر گھی کا اثر ایک ہی جیسا ہوگا لیکن انسان کی انسانی زندگی پر اس کا اثر مختلف ہوگا۔ دیانتداری سے جو رزقِ حلال ہوگا طبعی طور پر تو اس کا وہی اثر ہوگا جو انسانیت کی زندگی ہے اس پہ اس کا اثر اور ہوگا اور رزقِ حرام کا اثر اور ہوگا۔ ٹھیک ہے کہ آج جو یہ چیزیں ہیں انہیں نہ سمجھانے والا سمجھا سکتا ہے' نہ سمجھنے والے کی سمجھ میں بات آتی ہے اس لیے کہ یہ فرق محسوس اور مشہود طور پر کہیں نظر ہی نہیں آتا بلکہ رزقِ حرام والے تو اس انداز سے پنپتے ہیں اور یہ رزقِ حلال والے کی زندگی تو ساری عمر روتے ہی گزر جاتی ہے۔ یہ ٹھیک ہے۔ یہ بات تو آگے چل کر آئے گی کہ دونوں کا فرق کیا ہے' وہ کیسے محسوس طور پر سامنے آ سکتا ہے۔

انسانیت کی حسین عمارت وحی کی طرف سے عطا کردہ قانونِ مکافاتِ عمل کی بنیاد پر استوار ہوتی ہے

میں اس وقت صرف یہ کہہ رہا تھا کہ جہاں تک طبعی زندگی کا تعلق ہے ان میں کوئی فرق نہیں ہوتا لیکن فرق ہوتا ہے انسان کی انسانیت کی زندگی میں اور یہ وہ مقام ہے جہاں سے دین' وحی' مستقل اقدار' ایمان' خدا کا قانونِ مکافاتِ عمل شروع ہوتا ہے' اس کی ضرورت یہاں آ کر پڑتی ہے' اس سے پہلے نہیں۔ رزقِ حلال اور رزقِ حرام سے ایک فرد کی زندگی پر کیا اثر پڑتا ہے؟ یہ چیزیں آگے چل کر ہمارے سامنے آئیں گی۔ جہاں تک انسانی نظام کا تعلق ہے' قرآنِ کریم اس کے متعلق یہ بتاتا ہے کہ قومیں طبعی زندگی کے مطابق فطرت کی قوتوں کو مسخر کر لیں تو ان کے نتائج ان کے سامنے آئیں گے' انہیں کامیابیاں حاصل ہونگی' وہ ترقی کریں گے۔ جو قوم ایسا نہیں کرے گی' انہیں یہ چیزیں حاصل نہیں ہونگی لیکن اب تیسرا گروہ آتا ہے جو فطرت کی قوتوں کو مسخر کرتا ہے' ان تمام چیزوں کو حاصل کرتا ہے جن سے یہ ساری دنیا ترقی پاتی ہے اور اس کے ساتھ ہی وہ ان قوتوں کے ماحصل کو خدا کی دی ہوئی مستقل اقدار کے مطابق صرف کرتا ہے۔

قرآنِ حکیم کی اقدار کا ماحصل ہمیشہ سدا بہار اور ثمر بار ہوتا ہے

قرآن کہتا ہے کہ یہاں آ کر فرق پڑے گا۔ ان دونوں قوموں' ان دونوں گروہوں میں ایک امتیازی خط ہوگا۔ اور وہ یہ ہے کہ وہ قوم جو دنیاوی مفادات کو حاصل کرتی ہے اور اپنی منشا کے مطابق خرچ کرتی ہے' اس سے انسانی نظامِ تمدن میں فساد پیدا ہوتا ہے۔ ان کی

ترقیاں، ان کی شوکت وثروت، عارضی ہوتی ہے، شعلۂ مستعجل ہوتی ہے، جلدی سے بھڑک اٹھتی ہے، یہ چیز جلدی سے ختم ہو جانے والی ہوتی ہے لیکن اگر انہیں مستقل اقدارِ خداوندی کے مطابق صرف کیا جائے تو پھر یہ پائندہ اور درخشندہ ہوتی ہے، جوں جوں یہ آگے بڑھتی ہے اس کی روشنی تیز تر ہوتی چلی جاتی ہے، اس کی بنیادیں مضبوط ہوتی چلی جاتی ہیں۔ کہا ہے کہ **كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّ فَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ** (14:24) اس شجرِ طیّب کی طرح جس کی جڑیں پاتال میں ہوں اور جس کی شاخیں فضا کی پہنائیوں کو چھو رہی ہوں۔ **اُكُلُهَا دَآئِمٌ** (13:35) وہ بہار ہو کہ خزاں، لا الہ الا اللہ۔ وہ ہر موسم میں اپنا پھل دینے والا نظریۂ زندگی ہے۔ اس کے متعلق قرآن نے یہ بتایا کہ قوموں کے عروج وزوال اور حیات وممات کا ایک راز اس کے اندر پنہاں ہے۔ ان اقدار کے مطابق زندگی بسر کرنے سے، فطرت کی قوتوں کو صرف میں لانے سے، ان کی کیفیت یہ ہوتی ہے۔

انسانیت کی زندگی کے استحکام کا دارومدار قرآنی خطوط پر فطرت کی قوتوں کو مسخر کرنے اور صرف کرنے پر ہے

میں یہاں پھر اسے دہرا دوں کہ جو قوم فطرت کی قوتوں کو مسخر ہی نہیں کرتی، اس کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ وہ ان کو ان اقدار کے مطابق خرچ کرتی ہے یا نہیں کرتی، اس کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ وہ کفر کی یا دین کی زندگی بسر کرتی ہے۔ جس طرح ایک انسان اگر جنگل میں کہیں غار میں جا کر بستا ہے تو اس کے لیے سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ہے کہ وہ دین دار ہے یا گنہگار ہے۔ وہاں گناہ وثواب کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ وہ تو پیدا ہوتا ہے جب انسان کا معاملہ دوسرے انسان سے پڑتا ہے۔ اسی طرح سے جو قوم فطرت کی قوتوں کو مسخر ہی نہیں کرتی اس کے لیے یہ آگے سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ اس کی زندگی دین کے مطابق ہے یا دین کے خلاف جاتی ہے۔ اسے پھر سن لیجیے کہ دین کے مطابق زندگی کے معنی ہیں ''فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے ان کے ماحصل کو اقدارِ خداوندی کے مطابق صرف کرنا''۔ وہ جو انہیں مسخر ہی نہیں کرتا اس کے پاس اس کا ماحصل ہی نہیں ہے تو اس کے بعد انہیں ان کے مطابق صرف کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا: ''ننگی کیا نہائے گی کیا نچوڑے گی''۔ سوال تو ان کے لیے پیدا ہوگا جو ان چیزوں کو حاصل کرے گا، حاصل کرنے کے بعد دیکھے گا کہ ان کا طریقِ استعمال کیا ہے۔

کفر اور ایمان کے امتیاز کا بنیادی فرق کائناتی قوتوں کے ماحصل کو صرف کرنے کے طریق پر موقوف ہے

فطرت کی قوتوں کے طریقِ استعمال پر یاد رکھیے گا، کفر اور ایمان کی زندگی کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ آپ نے غور فرمایا کہ یہ قرآن کی بڑی بنیادی شق ہے۔ یہاں سے یہ سوال پیدا ہوا کہ فطرت کی قوتوں کو مسخر کرنے کے بعد ایک قوم انہیں اپنی مفاد پرستیوں کے لیے صرف کرتی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ ٹھیک ہے ان کا یہ نظام بھی ان کو پھل دیدیگا کیونکہ طبعی طور پر انہوں نے مسخر کیا ہے، طبعی طور پر ان کو استعمال کر

رہے ہیں لیکن یہ شعلۂ مستعجل ہوگا' اس میں دوام و قیام نہیں ہوگا۔ جو دوسری قوم ہے وہ ان قوتوں کو مسخر کرتی ہے اور اس کے ماحصل کو مستقل اقدارِ خداوندی کے مطابق' نوعِ انسانی کی بہبود کے لیے صرف کرتی ہے۔ وہ پہلی قوم صرف کرتی ہے اپنی ذات کے لیے' اپنے گروہ کے لیے' اپنی پارٹی کے لیے' اپنی قوم کے لیے۔ یہ دوسری جماعت اسے صرف کرتی ہے نوعِ انسانی کی بہبود کے لیے۔ یہ فرق پڑا اقدارِ خداوندی کے مطابق صرف کرنے میں اور ان کے خلاف صرف کرنے میں۔ یہ جو نظام ہے' جو ان اقدار کو اس طرح سے صرف کرتا ہے' یہ نظام ہے جو انسانیت میں فساد کی جگہ اصلاح پیدا کرتا ہے' پوری نوعِ انسانی کی بہبود اس کے پیشِ نظر ہوتی ہے۔ خود زندگی کا معیار بلند ہوتا چلا جاتا ہے' انسانیت کا شرف بڑھتا چلا جاتا ہے اور اس طرح سے یہ کاروانِ انسانیت من حیث الکل ترقی کرتا ہوا آگے بڑھتا' اوپر چڑھتا چلا جاتا ہے۔ یہ ہے کفر اور ایمان کا بنیادی فرق' یہ ہے مومن اور کافر کی جماعت کی زندگی کا فرق۔ یہی دو گروہ سمجھ لیجیے یہاں ہمارے سامنے آئے۔

میں نے عرض کیا ہے کہ ویسے تو تین گروہ ہیں لیکن ان کو سمٹائیے تو دو بن جاتے ہیں۔ ایک گروہ اقدارِ خداوندی کے مطابق اس ماحصل کو صرف کرنے والا ہے' دوسرا اس کے خلاف جانے والا ہے۔ بالکل آسان زبان میں یہ دو گروہ ہمارے سامنے آتے ہیں۔ اور ان کے متعلق قرآن اب یہ بتاتا ہے کہ یاد رکھیے! ایک کی ترقی نظر تو آئے گی' نگاہوں میں خیرگی پیدا کرے گی لیکن وہ جھوٹے نگوں کی مینا کاری ہوگی۔ دوسرا گروہ ہے' ہوسکتا ہے کہ ان کے مقابلے میں ابتدائی مراحل کے اندر اس کو بڑی محنتیں کرنا پڑیں' ہوسکتا ہے کہ ان کی ترقی کی رفتار بھی ذرا سست ہو لیکن استحکام اور قیام اور پائیداری اور پائندگی ان کے حصے میں آئے گی۔ اور اس کا دوسرا فرق یہ ہوگا کہ وہاں کوئی ایک گروہ یا ایک قوم زیادہ سے زیادہ پنپے گی' یہاں انسانیت بلند ہوتی چلی جائے گی۔

اب ان دونوں گروہوں کے متعلق قرآن مثال سے بات سمجھاتا ہے۔ قرآن کا انداز یہ ہے کہ جہاں Abstract Truths آتے ہیں' بسیط حقیقتیں آتی ہیں جو محسوس طور پر سامنے نہیں ہوتیں' وہ ان کو محسوس مثالوں کے ذریعے سمجھاتا ہے۔ اور اس کی یہ مثالیں اس کے دوسرے کلام کی طرح بڑی ہی برجستہ ہوتی ہیں اور بات نہایت عمدگی سے محسوس طریقے پہ سمجھ میں آجاتی ہے۔ گروہ تھا وہ' جس کی کیفیت یہ تھی کہ **اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ اشۡتَرَوُا الضَّلٰلَۃَ بِالۡہُدٰی** (2:16) جس نے صحیح راستے کو بیچ دیا' غلط راستہ خرید لیا۔ یوں ہوا اس کا لفظی ترجمہ۔ کہا ہے کہ **فَمَا رَبِحَتۡ تِّجَارَتُہُمۡ** (2:16) یہ جو کاروبار تھا' شروع شروع میں تو اس نے بڑا ہی نفع سکھایا لیکن In the long run (آخر الامر) جا کر یہ دیکھا گیا کہ اس سودے میں ان کو بڑا گھاٹا رہا۔ غلط راستے پر چلنے والا کبھی منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ سکتا۔

میکیاوَلی سیاست کا تصور زندگی

ضمناً میں عرض کر دوں کہ یہ جو ایک میکیاوَلی سیاست کا مقولہ چلا آتا ہے کہ Means are justified by the ends achieved کہ کوئی بھی طریقہ تم اختیار کر لو اگر تمہارا مقصد حاصل ہو جاتا ہے تو وہ طریقہ جائز قرار پاتا ہے۔قرآن کی رو سے بنیادی طور پر یہ چیز غلط ہے' غلط غلط ہی ہے۔اور یوں سمجھ لیجیے کہ کس قدر بالبداہت یہ بات غلط ہے' غلط راستہ صحیح منزل پہ پہنچا ہی نہیں سکتا۔اس لیے یہاں مقصد بھی صحیح ہونا چاہیے' مقصد کے حصول کے ذرائع بھی صحیح ہونے چاہئیں۔اگر آپ غلط ذرائع استعمال کرتے ہیں تو آپ کبھی بھی صحیح مقصد تک نہیں پہنچ سکتے۔اس لیے اس نے یہ کہا ہے کہ فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ (2:16) آخرالامر انہوں نے دیکھ لیا کہ ان کی منزل بھی غلط' وہاں تک پہنچنے کے راستے بھی غلط' اس لیے آخرالامر ان کی تجارت نے انہیں کوئی فائدہ نہ دیا۔ابتداً کچھ بڑی درخشندگی حاصل ہوئی' آخرالامر یہ کیفیت نہ رہی۔

عقلِ انسانی کی بنیاد پر استوار ہونے والے نظامِ حیات کی کیفیت

اب وہ اس مجرد حقیقت کو' اس Abstract Truth کو محسوس مثال سے سمجھاتا ہے۔کہا ہے کہ مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِى اسْتَوْقَدَ نَارًا ۚ فَلَمَّآ اَضَآءَتْ مَا حَوْلَهٗ ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ وَ تَرَكَهُمْ فِىْ ظُلُمٰتٍ لَّا يُبْصِرُوْنَ (2:17) جنگل کی تنہائی' بڑی تاریک رات' دور دور کہیں روشنی کا نشان نہیں' تنہا جانے والا مسافر' صحیح راستے کا بھی کچھ پتہ نہیں' وہاں وہ تھوڑی سی خس و خاشاک اکٹھی کرتا ہے' آگ جلاتا ہے۔چند قدم تک تو راستہ روشن ہو جائے گا' اسے روشنی ملتی ہے۔وہ کہتا ہے کہ اس کے بعد خس و خاشاک کی آگ کی عمر کیا ہوتی ہے!! وہ آگ بجھ جاتی ہے اور اس کے بعد جب آگ بجھتی ہے تو آپ کو پتہ ہے کہ جتنا اندھیرا اس سے پہلے تھا اس روشنی کے بعد اندھیرے کی ایک اور تہہ چڑھ جاتی ہے۔روشنی میں بیٹھے ہوئے اگر اندھیرا ہو جائے تو آپ دیکھتے ہیں کہ وہ بڑا ہی گھپ اندھیرا ہوتا ہے۔کہہ رہا ہے کہ جب یہ ذرا روشنی ہوئی تھی تو ہر ایک کو یہ نظر آتا تھا کہ یہ ٹھیک ہے' اب اس کا راستہ روشن ہو گیا ہے' دنیا اس فریب میں آجاتی ہے کہ راستہ روشن ہو گیا لیکن اس دنیا کو چاہیے کہ تھوڑا سا انتظار کر کے دیکھے کہ یہ روشنی کتنے دنوں تک رہتی ہے۔جونہی وہ روشنی بجھی' وہ تاریکی کے اندر رہ گیا۔

ظلمت کی جمع تو ظلمات ہے جبکہ نور کے لیے قرآنِ کریم میں جمع کا صیغہ استعمال ہی نہیں کیا

قرآن تاریکی کے لیے لفظ ظلمٰت استعمال کرتا ہے اور اس میں بھی ایک بڑی باریکی ہے۔ظلمات' ظلمت کی جمع ہے یعنی یہ اس کے لیے جمع کا صیغہ استعمال کرتا ہے۔پہلے میں عرض کر دوں کہ ظُلُمٰتٍ تاریکی کو کہتے ہیں لیکن ہر تاریکی کو نہیں کہتے۔یہ تو عربی زبان ہے'

یہ تو قرآنِ مبین اس زبان میں آیا ہے' زبان کی جامعیت کا تو آپ کو پتہ ہی ہے۔ ظُلُمٰتٍ کہتے ہیں ''وہ جگہ جہاں روشنی ہونی چاہیے لیکن روشنی نہ ہو''۔ جہاں روشنی ہونی ہی نہیں چاہیے وہاں روشنی نہیں ہے تو اس کو یہ ظُلُمٰتٍ نہیں کہیں گے۔ یہ عجیب چیز ہے۔ وہ کہتا ہے کہ پھر اس کی کیفیت یہ ہے کہ اسے ظُلُمٰتٍ میں چھوڑ دیتا ہے۔ میں نے کہا ہے کہ قرآن میں ہر جگہ یہ جمع کا صیغہ استعمال کیا ہے اور بات بڑی صاف ہے۔ اس کے مقابلے میں روشنی کے لیے نور یاضیاء کا جو لفظ قرآن لایا ہے' وہ کہیں جمع کے صیغے میں لایا ہی نہیں ہے۔ تاریکیاں مختلف قسم کی ہوسکتی ہیں' روشنی کی ایک ہی قسم ہوتی ہے۔ غلط جواب سینکڑوں ہوسکتے ہیں' صحیح جواب ایک ہی ہوتا ہے۔ تیر کا نشانہ جہاں صحیح لگتا ہے وہ ایک ہی نقطہ ہوتا ہے اور اگر وہ غلط جگہ جاتا ہے تو سینکڑوں غلط جگہیں ہوتی ہیں جہاں جا کر وہ تیر لگ جاتا ہے۔

غلط نظامِ زندگی اختیار کرنے والے ہمیشہ ظلمات میں الجھے رہتے ہیں

عزیزانِ من! Truth یا صداقت ایک ہوتی ہے' باطل کی ہزاروں قسمیں ہوتی ہیں۔ وہ باطل کو تاریکی سے تعبیر کرتا ہے اور چونکہ اس کی سینکڑوں قسمیں ہوسکتی ہیں اس لیے ہمیشہ اس کو جمع کے صیغے میں استعمال کرتا ہے۔ اور صحیح جواب کے لیے جسے وہ روشنی کہتا ہے' ہمیشہ واحد کا صیغہ لاتا ہے۔ اور یہیں سے یہ نظر آیا کہ یہ توحید اور شرک کیا چیز ہے۔ صحیح جواب توحید ہوتی ہے۔ یہی وہ چیز ہے جسے آپ ''ایک کا'' ماننا کہتے ہیں اور اس ایک صحیح جواب کو نہ مانا جائے' پھر سینکڑوں غلط جواب ہیں' جنہیں آپ کو ماننا پڑتا ہے۔ اس لیے قرآنِ کریم ہمیشہ الظُّلُمٰتُ کی جگہ ظُلُمٰتٍ لاتا ہے۔ وہ پھر تاریکیوں کے اندر رہ جاتا ہے۔ یہ کون لوگ ہیں؟ یہ وہ لوگ ہیں جو غلط طریقوں سے اپنے لیے ایک نظام وضع کرتے ہیں' اس نظام کی فریب کاریوں کے نتائج بڑے ہی چکا چوند پیدا کرنے والے سامنے آتے ہیں' بڑے خوش ہوتے ہیں' خود بھی فریب کھاتے ہیں اور دوسری دنیا بھی فریب میں آجاتی ہے۔ جذبات کی رو میں بہے چلے جاتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ عقل اور فکر سے کام نہیں لیتے۔ یہ جس قدر غلط راستے پہ چل کر ترقیاں حاصل کرتے ہیں' مفاد حاصل کرتے ہیں' یہ ٹھیک ہے بکارِ خویش تو وہ ہشیار ہوتے ہیں یعنی اپنے سامنے جو انہوں نے ایک اسکیم رکھی ہوئی ہوتی ہے' اس کے لیے تو وہ بہت سوچتے ہیں کہ کیا کرنا ہے کیا نہیں کرنا لیکن جو شخص ذرا Objectively (معروضی طور پر) دیکھتا ہے' دور ہٹ کر دیکھتا ہے' اسے نظر آرہا ہوتا ہے کہ یہ شخص بالکل پاگل ہو رہا ہے' دیوانہ ہو رہا ہے۔ ان مقاصد کے لیے جو کچھ وہ کر رہا ہوتا ہے' دنیا اس پہ ہنس رہی ہوتی ہے۔ سمجھانے والے اسے سمجھاتے ہیں کہ تم غلط راستے پہ چل رہے ہو۔ نہ وہ کسی کی سنتا ہے' نہ صحیح راستہ دیکھتا ہے۔

سوچنے سمجھنے کی صلاحیتوں کا سلب ہو جانا

قرآن کہتا ہے کہ جس کی کیفیت یہ ہو جائے کہ وہ یوں اپنی تدبیروں کی آگ سلگائے' وہ تھوڑے سے وقت کے لیے اس کو منفعت

بخشیاں بھی دے، منافع بھی دے، آگ بجھ جائے تو اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ اس میں سمجھنے سوچنے اور دیکھنے بھالنے کی قوت ہی باقی نہیں رہتی، ان کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ **صُمٌّ بُكْمٌ عُمْىٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْن** (2:18) صم بہرے، بکم گونگے، عمی اندھے، گونگا بہرہ اندھا ہے **لَا يَرْجِعُوْنَ** ان کے متعلق کوئی توقع ہی نہیں کی جاسکتی کہ یہ صحیح راستے پر آجائیں گے۔ یہ گونگا بہرہ اندھا کیا ہے؟ بہرہ ہے، سننے کی قوت نہیں رہی، اندھا ہے، دیکھنے کی قوت نہیں رہی، گونگا ہے، بولنے کی قوت نہیں رہی۔ یہ ان صلاحیتوں کے نہ رہنے کا نام ہے۔ اب ایک تو یہ ہے کہ یہ صلاحیتیں کسی Physical Cause (طبعی سبب) کی وجہ سے سلب ہوتی ہیں، کوئی طبعی سبب ہے، جس کی وجہ سے یہ ہوتا ہے۔

قرآن حکیم کے نزدیک بدترین مخلوق وہ ہے جو عقل وفکر سے کام نہیں لیتی

لیکن قرآن ان چیزوں کا تو ذکر ہی نہیں کرتا، وہ تو ان طریقوں سے ان چیزوں کے سلب ہونے کا ذکر کرتا ہے جن میں انسان جذبات کی رو میں بہا چلا جاتا ہے۔ طبعی طور پہ وہ بالکل صحیح ہوتا ہے۔ اس کے کان بھی ٹھیک ہوتے ہیں، اس کی آنکھیں بھی درست ہوتی ہیں، زبان بھی ٹھیک ہوتی ہے، سمجھنے سوچنے کی صلاحیتیں ویسے موجود ہوتی ہیں، کسی ڈاکٹر سے Examine (معائنہ) کرالیجئے، وہ بڑی صحیح رپورٹ دے گا۔

عزیزانِ من! ایسے شخص کو آپ دیکھیے۔ ہم بھی روز کہتے ہیں کہ اندھا ہو رہا ہے صاحب! وہ کسی کی سنتا ہی نہیں ہے، اس کو اچھائی برائی نظر ہی نہیں آتی ہے۔ بعینہٖ یہ چیز ہے جس کے لیے یہ الفاظ قرآن لایا۔ اور ان کی تشریح قرآن نے خود ہی دوسرے مقامات میں کردی۔ کہا ہے کہ **لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا** (7:179) سینے میں دل تو رکھتے ہیں، اس سے سمجھنے کا کام نہیں لیتے۔ **وَ لَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا** (7:179) آنکھیں رکھتے ہیں، ان سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے۔ **وَ لَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا** (7:179) کان رکھتے ہیں ان سے سننے کا کام نہیں لیتے۔ **اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ** (7:179) شکل وشباہت میں انسان نظر آتے ہیں، درحقیقت انسانیت سے محروم ہو چکے ہوئے حیوان ہوتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ **بَلْ هُمْ اَضَلُّ** (7:179) نہیں! حیوان تو پھر بھی اپنی جبلت کے اوپر چلا جاتا ہے، ان کی خلاف ورزی نہیں کرتا، یہ اس میں تو وہ تمیز بھی باقی نہیں رہتی، ان سے بھی زیادہ راہ گم کردہ ہوتے ہیں۔ اور انہیں قرآن نے یہاں کہا ہے کہ وہ انعام سے بھی زیادہ راہ گم کردہ ہیں۔ دوسری جگہ کہا ہے کہ **اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ** (8:22) ساری مخلوقِ خداوندی میں سب سے زیادہ، یہاں قرآن نے شر کہا ہے، تخریب پیدا کرنے والے کہا۔ یہ وہ انسانوں کی مخلوق ہے جو اپنے جذبات کی رو میں بہے چلے جاتے ہیں، سمجھنے سوچنے سے کام نہیں لیتے: **لَا يَعْقِلُوْنَ** یعنی عقل وفکر سے کام نہیں لیتے۔ آپ نے دیکھا ہے کہ یہ عقل وفکر سے کام لینا قرآن کی رو سے کتنی بڑی چیز ہے۔ یہی تو شرفِ انسانیت ہے مگر ایسا نہ کرنے والے یہ شر

الدو آب ہیں یعنی شر الانس بھی نہیں کہ انسانوں میں سے بدترین مخلوق ہو۔ دآبۃ تو ہر چلنے والی ہر حرکت کرنے والی مخلوق کو کہا جاتا ہے۔ اس میں تو یہ کیڑے مکوڑے تک بھی آ جاتے ہیں۔ ان میں سے وہ انسان بدترین مخلوق ہیں جو آنکھ کان اور دل رکھنے کے باوجود ان سے سمجھنے سوچنے کا کام نہیں لیتے: لَا یَعۡقِلُوۡنَ (8:22) یعنی عقل وفکر سے کام نہیں لیتے۔ یہ ہیں وہ لوگ! آپ نے دیکھا ہوگا کہ جذبات کے اندر اندھا ہوا انسان، بالکل عقل وہوش کھو رہا ہوتا ہے۔ کہتا ہے کہ ایک تو ان کی یہ مثال ہے۔

خیر اور شر کی مخلوط انسانی معاشرت میں عقل وبصیرت کی رہنمائی

برادران عزیزان! ان کی ایک دوسری مثال بھی ہے۔ کہا ہے کہ اَوۡ کَصَیِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ فِیۡهِ ظُلُمٰتٌ وَّ رَعۡدٌ وَّ بَرۡقٌ (2:19) یہ دنیا میں جتنے بھی آپ کے ہاں کے اسباب ہیں، وسائل ہیں، ان میں تم دیکھو گے کہ تخریب اور تعمیر کی چیزیں کچھ ملی جلی ہوئی ہوتی ہیں۔ صحیح عقل وفکر کا کام یہ ہے کہ ان میں سے تخریبی اجزا کو الگ کردے، ان سے حفاظت کا سامان لے اور تعمیری اجزا کو چن کر اپنے قریب کرلے، ان کے مطابق کام کرے، ان کو استعمال میں لائے۔ یہ ہے صحیح روشِ زندگی۔ اس دنیا کے اندر ملی جلی ہوئی یہ چیزیں آئیں گی۔ یہ عجیب چیز ہے۔ حیوانات کی زندگی تک، برادرانِ عزیز! آپ دیکھیں گے کہ یہ التباس اور اختلاط نہیں ہوگا۔ شیروں کا کوئی گروہ دور سے آپ دیکھ لیں گے، آپ کو نظر آ جائے گا کہ یہ درندہ ہے، چیر پھاڑ کھائے گا۔ بکری کہیں بھی ہو، آپ کو یہ معلوم ہے کہ یہ پتے کھائے گی، مجھے کچھ نہیں کہے گی۔ سانپ کسی جگہ بھی آپ کو نظر آ جائے، آپ کو معلوم ہے کہ یہ ڈسے گا، اس میں زہر ہوگی۔ وہاں یہ چیزیں مخلوط نہیں ہوتیں لیکن یہ حضرتِ انسان ہے، کسی گروہ میں آپ کو معلوم ہی نہیں ہوسکتا کہ ان میں شیر اور بھیڑیئے کونسے ہیں اور بکریاں کونسی ہیں۔ یہی وہ وجہ ہے جس کی بنا پہ انسان فریب کھا جاتا ہے۔ اور یہی شرفِ انسانیت ہے کہ وہ خود اپنی بصیرت سے، پھر یہ سمجھے کہ مجھے کس سے بچنا ہے اور کس کے ساتھ رہنا ہے۔ یہ بکری کی کوئی خوبی نہیں ہے کہ وہ شیر کو پہچان لیتی ہے۔ انسان اگر انسان بھیڑیئے، کو پہچان لیتا ہے تو یہ اس کی خوبی ہے۔ اور قرآن یہی نگاہیں پیدا کرتا ہے جس سے وہ انسان کے پیکروں کے اندر بھیڑیوں کو پہچان لیتا ہے۔

معاشرتی امور میں انتظامی صلاحیتوں کی اہمیت

انسانی دنیا کے اندر یہ جو چیزیں ہیں، مخلوط آتی ہیں۔ کہتا ہے جیسے ایک گھٹا اٹھی، اس میں گرج بھی ہے، کڑک بھی ہے، بجلی کی چمک بھی ہے اور کھیتیوں کو سیراب کرنے والا مینہ بھی ہے، بارش بھی ہے۔ بارش یکسر منفعت بخش ہے، بجلی تباہ کردینے والی ہے تو یہ چیزیں ملی جلی ہوئی آتی ہیں۔ اب چاہیے تو یہ ایسا نظام کہ جس میں عمارتوں کے اوپر وہ ایک سلاخ (Conductor) لگا لیتے ہیں جس پہ بجلی پڑے تو وہ تخریب نہ پیدا کرے یعنی اس کا صحیح نظام ہو۔ احتیاطی تدبیریں کی جائیں، ان سے محفوظ رہنے کا انتظام کیا جائے۔ وہ کہتا ہے کہ ان کی کیفیت یہ

ھوتی ہے کہ یہ جو تدبیریں ہیں' یہ ان سے جو محفوظ رہنے کا نظام ہے یہ تو صحیح نظامِ خداوندی میں ہوتا ہے کہ وہ شر کی ساری قوتوں سے محفوظ رکھتا ہے' خیر کی برکات سے نفع اندوز ہونے دیتا ہے۔ یہ تو نظامِ خداوندی ہے۔ غلط نظام کے اندر ان کی کیفیت یہ ہے کہ فریب دیتے ہیں' دھوکا دیتے ہیں' غلط کاریوں سے یہ تمام چیزیں حاصل کرتے ہیں۔ نظر آتا ہے کہ اس کے اندر ایک تباہی بھی ہے۔ کونسا ڈاکو ہے جس کو پتہ نہیں ہوتا کہ اس کے انجام میں کچھ تباہی بھی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس سے بچنے کے لیے وہ کرتے کیا ہیں؟ بس یوں سمجھ لیجیے کہ جیسے بجلی کی کڑک سے بچنے کے لیے انسان کانوں میں انگلیاں دے لے۔ ان سے پوچھو کہ کیا کانوں میں انگلیاں دینے سے تم بجلی کی کڑک سے بچ جاؤ گے؟ کہتا ہے کہ یہ ہوسکتا ہے کہ کڑک کی آواز تو تمہارے کانوں میں نہ آئے' اس کے ساتھ یہ بھی تو ممکن ہے کہ بجلی کی چمک تمہاری بینائی کو ہی اچک کر لے جائے۔

سرمایہ داری کے غلط نظام میں پوشیدہ ہلاکتوں کا علاج عقل کی فسوں کاری سے ممکن ہی نہیں

غلط نظام میں ہلاکتیں پوشیدہ ہوتی ہیں' اس قسم کی مصنوعی تدابیر سے حفاظت کا سامان میسر آنہیں سکتا' سنو!

تدبر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا
جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہے

(اقبالؒ: بانگِ درا)

ٹھیک ہے کہ اس کی تخریبی قوتوں کے لیے کچھ نہ کچھ تم عارضی طور پہ' سطحی طور پہ' انتظام کرلو گے۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ انتظامات ایسے ہی ہیں جیسے بجلی سے بچنے کے لیے جنگل میں کھڑا ہوا انسان' کانوں میں انگلی ڈال لے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ یہ کس قدر خود فریبی ہے۔ کہتا ہے کہ یہ طریقہ نہیں ہے۔ غلط نظام کی تباہ کاریوں سے بچنے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ اس کی جگہ صحیح نظام قائم کیا جائے۔ فِيۡهِ ظُلُمٰتٌ وَّ رَعۡدٌ وَّبَرۡقٌ ۚ يَجۡعَلُوۡنَ اَصَابِعَهُمۡ فِىۡۤ اٰذَانِهِمۡ مِّنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الۡمَوۡتِ (2:19) بجلی کی کڑک سے ڈرتے ہیں کہ ابھی موت واقع ہوجائے گی۔ اس سے بچنے کی تدبیر یہ سوچتے ہیں کہ کانوں میں انگلیاں لے لی جائیں۔ قرآنِ کریم نے اور مقامات میں بھی برق کو خوف اور طمع دونوں کا مجموعہ قرار دیا ہے اس لیے کہ یہ گھٹا کے ساتھ آتی ہے۔ کہتا ہے کہ وَ مِنۡ اٰيٰتِهٖ يُرِيۡكُمُ الۡبَرۡقَ خَوۡفًا وَّ طَمَعًا وَّ يُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَيُحۡىٖ بِهِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِهَا ؕ اِنَّ فِىۡ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوۡمٍ يَّعۡقِلُوۡنَ (30:24) یہ جو برق ہے' اس میں بڑی شادابیاں سیرابیاں بھی پوشیدہ ہیں' یہ بڑی تخریب کا حامل بھی ہوسکتی ہے۔ اس لیے کہ اسی کے ساتھ وہ گھٹا آتی ہے جو زمینِ مردہ کو حیاتِ نو سے نوازتی ہے۔ یہی وہ چیز ہے کہ اگر حفاظت کا سامان نہ کیا جائے تو بجلی گرتی ہے تو خس و خاشاک کی طرح جلا دیتی ہے۔

صحیح نظام میں خیر اور شر آشکارا ہوتے ہیں

عزیزانِ من! اب اگلا جو ٹکڑا ہے کہ ہم نے جو بات کہی ہے' اس میں عقل وفکر سے کام لینے والوں کے لیے حقیقت تک پہنچنے کی بڑی بڑی نشانیاں ہیں' یہ جو چیز ہے کہ گھٹا سے' پانی سے' کھیت سیراب ہوتا ہے' بجلی اسے جلا دیتی ہے' اس کے لیے تو کوئی خاص عقل وفکر کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ جو کہا ہے کہ اس میں عقل وفکر والوں کے لیے حقیقت تک پہنچنے کی بڑی نشانی ہے' بات وہ یہ کہتا ہے کہ یہ تو ایک نظام کی مثال ہے۔ انسانی زندگی کے اندر اس قسم کی چیزیں ملی جلی ہوئی آئیں گی' صحیح نظام وہ ہے جو تخریب کو الگ کر کے رکھ دے' تعمیر کو چھانٹ کر الگ رکھ دے۔ قرآن کہتا ہے کہ **وَامْتَازُوا الْيَوْمَ أَيُّهَا الْمُجْرِمُونَ** (36:59) صحیح نظام کے اندر پھر یہ انسان اس طرح سے مخلوط نہیں پھریں گے کہ آپ کو پتہ ہی نہیں چلے کہ جو میرے ساتھ بیٹھا ہوا ہے گرہ کٹ ہے یا میرا رفیق ہے۔ اس نظام کے اندر ان کو چھانٹ کر الگ الگ کر دیا جائے گا حتیٰ کہ **يُعْرَفُ الْمُجْرِمُونَ بِسِيمَاهُمْ** (55:41) مجرم اپنی پیشانیوں سے دُور سے پہچانا جائے گا۔ اس لیے کہ وہاں مجرم کو پناہ دینے والے آپ کے ہاں کے بڑے بڑے نام نہاد باعزت مقام لوگ نہیں ہونگے۔ اس نے کہا ہے کہ یہ چیز جو انسانوں کی مخلوط زندگی کی پیدا ہوتی ہے اس میں یہ تباہ کاریاں اور منفعت بخشیاں' ایک دوسرے سے ملی ہوئی' ایک دوسرے سے ملبوس ہوئی آگے آتی ہیں۔ یہ اس کا عارضی طور پر یہ انتظام سوچتے ہیں کہ کانوں میں انگلیاں لے لیجیے' تو رعد سے بچ گئے۔ کہتا ہے کہ **وَاللّٰهُ مُحِيطٌ بِالْكَافِرِينَ** (2:19) انہیں پتہ نہیں ہے کہ خدا کا نظام ایک راستے سے نہیں آیا کرتا' وہ تو اس طرح سے ان کو گھیرے ہوئے ہوتا ہے جیسے یہ ہوا کا نظام انسان کو ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے' یہ **مُحِيطٌ بِالْكَافِرِينَ** (2:19) ہے۔ اسی لیے اس نے دوسری جگہ کہا ہے کہ **وَالَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا** (7:182) جو لوگ ہمارے ان قوانین کی' ان اقدار کی تکذیب کرتے ہیں' وہ کہتے ہیں کہ نہیں! جو کچھ یہ کہتے ہیں غلط ہے کہ اس قسم کی فریب کاریوں کا آخر نتیجہ تباہ کن ہوتا ہے' اور دیانتداری کی زندگی آخر الامر خوشگواریوں کی ضامن ہوتی ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ چیز غلط ہے۔

عمل اور اس کے نتائج کے درمیان مہلت کا ایک وقفہ ہوتا ہے

عزیزانِ من! یہ جو تکذیب آیات وغیرہ کے الفاظ قرآن میں آئے ہیں' ان کا مفہوم یہ ہے کہ وہ لوگ جو اس قسم کی باتیں کرتے ہیں ان کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ فوراً نہیں پکڑے جاتے۔ وہ اس لیے کہ جیسا میں نے شروع میں کہا ہے کہ طبعی زندگی کے متعلق' طبعی قوانین کے مطابق' اگر آپ کچھ محنت کریں گے' اس کے طبعی نتائج تو آپ کے سامنے آجائیں گے۔ اس لیے یہ معلوم نہیں ہوتا ہے کہ غلط نظام میں جو طبعی طریق کے مطابق ہم زندگی بسر کر رہے ہیں' یہ ہمارے لیے تباہ کن ہے۔ اسی کو قرآن مہلت کا وقفہ کہتا ہے اور یہ مہلت کا قانون ہے

کہ ہر عمل اپنے محسوس نتائج کو سامنے لانے کے لیے درمیان میں ایک وقفہ چاہتا ہے' ہر بیج کھیتی بننے کے لیے ایک مہلت چاہتا ہے۔ یہ درمیانی مہلت کا وقفہ ہے جس سے انسان فریب میں آ جاتا ہے۔قرآن کہتا ہے کہ وَ الَّذِیۡنَ کَذَّبُوۡا بِاٰیٰتِنَا (7:182) جو لوگ ہمارے ان صحیح قوانین کے متعلق کہتے ہیں کہ نہیں صاحب! یہ سب باتیں ہی باتیں ہیں' یہ اَسَاطِیۡرُ الۡاَوَّلِیۡنَ ہیں' پرانے لوگوں کے قصے ہیں' ان سے کیا ہوتا ہے۔ کہتا ہے کہ ہم کرتے یہ ہیں کہ سَنَسۡتَدۡرِجُهُمۡ مِّنۡ حَيۡثُ لَا يَعۡلَمُوۡنَ (7:182)۔ سَنَسۡتَدۡرِجُهُمۡ کہا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر اس لفظ کو آپ زبان سے ادا کریں تو اس کے معنی سمجھ میں آ جائیں گے۔ آپ ایک دم اس لفظ کو بول نہیں سکتے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ یہ Step by Step (قدم بہ قدم) بولا جاتا ہے۔ قرآن کا عجیب اعجاز ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ سَنَسۡتَدۡرِجُهُمۡ ہم Step by Step (قدم بہ قدم)' درجہ بہ درجہ' منزل بہ منزل' ان کو اس تباہی کی طرف لیے جا رہے ہوتے ہیں لیکن وہ طریق مِّنۡ حَيۡثُ لَا يَعۡلَمُوۡنَ (7:182) ہوتا ہے یعنی وہ طریق ان کی عقل وفکر میں بھی اس وقت نہیں ہوتا۔

غلط نظام کے نتائج ایک ایسی کید (تدبیر) کی مانند ہوتے ہیں جو نظر نہیں آتے

کہا ہے کہ وَ اُمۡلِیۡ لَهُمۡ (7:183) یہ مہلت کا جو وقفہ ہے' ٹھیک ہے' یہ ہر ایک کو ملتا ہے' انہیں بھی ملا ہوا ہے' انہیں اس میں رہنے دو۔ اِنَّ کَیۡدِیۡ مَتِیۡنٌ (7:183) یہ نہ سمجھ لو کہ اس پر کسی کی گرفت ہی نہیں ہے کہ نہیں صاحب! ظلم کرنے والے' غصب کرنے والے سب پنپتے ہیں' یہ ہماری آنکھوں کے سامنے' ہم دیکھ رہے ہیں کہ صاحب! ان کا بال بیکا نہیں ہوتا۔ کہتا ہے کہ یہ بات نہیں ہے۔ اِنَّ کَیۡدِیۡ مَتِیۡنٌ (7:183) خود کید کا لفظ قرآن نے استعمال کیا ہے۔ یوں تو یہ تدبیر کے لیے ہوتا ہے لیکن یہ ایسی تدبیر کے لیے بولا جاتا ہے جو بڑی Imperceptible سی ہو یعنی محسوس نظروں سے دکھائی نہ دے۔ یہ اس تدبیر کے لیے بولا جاتا ہے۔ کہا ہے کہ ہماری تدبیریں جس سے کہ ہم غلط نظامِ زندگی کے ہلاکت آفریں نتائج کو سامنے لاتے ہیں' بڑی غیر محسوس سی ہوتی ہیں' ان کو پتہ ہی نہیں چلتا کہ کن کن راستوں سے وہ تباہیاں آ رہی ہیں تا آنکہ وہ تباہی محسوس شکل میں ان کے سامنے آ کر کھڑی ہو جاتی ہے۔

مکافاتِ عمل کے قانون سے غافل لوگوں کی سوچ آخرت کے لیے تباہ کن نتائج پیدا کرتی ہے

ہمارے ہاں ایک تو وہ گروہ ہے جس کا کبھی دھیان ہی اس طرف نہیں جاتا کہ خدا کی کوئی تدبیر بھی ہے' جسے اس کا قانونِ مکافاتِ عمل کہتے ہیں کہ انسان کا ہر عمل نتیجہ پیدا کر کے رہتا ہے۔ ایک گروہ تو اب وہ پیدا ہو گیا ہے جو ان چیزوں کی طرف سے Indifferent (لاتعلق سا) ہو گیا ہے' ادھر توجہ ہی نہیں دیتا۔ ہمارے ہاں جو خدا ترسوں کے گروہ کہے جاتے ہیں' ان کی بھی کیفیت یہ ہے کہ انہوں نے اس کو قیامت پہ اٹھا رکھا ہے کہ یہ سب کچھ وہاں جا کر ہوتا ہے۔ جہنم بھی وہیں' جنت بھی وہیں' حساب کتاب بھی وہیں ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ

یہ بات نہیں ہے۔ آگے چل کر جہاں جنت اور جہنم آئے گی، وہاں میں عرض کرونگا کہ قرآن کی رو سے جنت اور جہنم ہے کیا، اور وہ کس طرح سے اسی زندگی سے شروع ہو جاتی ہے۔ زندگی کے تو ٹکڑے کیے ہی نہیں جا سکتے، یہ تو مسلسل آگے بڑھنے والی ہے۔ یہاں صرف اتنا کہہ کر آگے گزر جاؤں گا۔ یہاں قرآن نے کہا تھا کہ وَ اللّٰهُ مُحِيطٌ ۢ بِالْكٰفِرِيْنَ (2:19) خدا کا قانونِ مکافات ان لوگوں کو گھیرے ہوئے ہے جو اس سے انکار کرتے ہیں۔

زندگی کا ایک ایک سانس، ایک ایک عمل، مکافاتِ عمل کے ترازو میں ساتھ کے ساتھ تلتا رہتا ہے

دوسری جگہ کہا ہے کہ وَ اِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيطَةٌ بِالْكٰفِرِيْنَ (29:54) جہنم تو اس وقت بھی ان لوگوں کو اپنے گھیرے میں لیے ہوئے ہے۔ یہ مرنے کے بعد کا انتظار کر رہے ہیں کہ وہاں جا کر یہ حساب کتاب ہوگا۔ انسان کا حساب کتاب ہر سانس میں ہوتا ہے، وہ میزان اس کے سینے میں کھڑی کی گئی ہے، ایک ایک ذرے کا عمل ساتھ کے ساتھ تلتا چلا جاتا ہے۔ خدا نے تو اپنے آپ کو وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ (2:202) کہا ہے، ہم تو بہت جلد حساب کرنے والے ہیں۔ کیا جلد حساب کرنے والے کی یہ کیفیت ہوگی کہ ہم اس کو قیامت تک اٹھا رکھیں، کروڑوں سال کے بعد کہیں جا کر کریں؟ نہیں، زندگی کا تو محاسبہ ہر سانس میں ہوتا رہتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ جہنم ان کفار کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔ اور اس کے بعد ایک اور مقام پہ بڑی لطیف بات کہی۔ اسے دل کی آنکھوں سے دیکھنا ہوگا، یہ چیز بصارت سے نظر نہیں آئے گی، بصیرت سے نظر آئے گی۔ کہا ہے کہ تم اس جہنم کی نگاہوں سے اب بھی پوشیدہ نہیں ہو۔ تم باہر کی دنیا میں کہیں بھڑکتی ہوئی آگ دیکھنا چاہتے ہو اور وہ کہتا ہے کہ نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ ۙ الَّتِيْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْئِدَةِ (104:6.7) جہنم کے شعلے تو انسان کے دل کو اپنے گھیرے میں لیتے ہیں، یہ تو دلوں کو گھیرنے والی آگ ہوتی ہے۔ برادرانِ عزیز! کہتا ہے کہ غلط نظامِ زندگی والے سمجھتے یہ ہیں کہ کچھ نہیں ہو رہا۔ انہیں معلوم نہیں کہ وَ اللّٰهُ مُحِيطٌ بِالْكٰفِرِيْنَ (2:19) خدا کا قانونِ مکافات انہیں ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔

غلط نظامِ زندگی کے خوفناک نتائج کا سیلاب کئی اَن دیکھے راستوں سے معاشرے کو گھیر لیتا ہے

کہا ہے کہ يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ اَبْصَارَهُمْ (2:20)۔ میں نے ابھی کہا تھا کہ اس نے مثال دے کر کہا تھا کہ کڑک کی آواز تو کان میں جلدی سے آ گئی۔ کہتا ہے کہ اس سے بچنے کے لیے تم نے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں۔ اگر اتنے میں وہ بجلی کی چمک نگاہوں کو اچک کر لے جائے تو کیا کرلو گے؟ کہنے کی بات یہ ہے کہ اس کی تباہیاں کسی ایک راستے سے نہیں آیا کرتیں کہ اس رخنے کو تم نے بند کر لیا، تو اس کے بعد تم نے اپنے آپ کو محفوظ سمجھ لیا کہ کوئی بات نہیں، اب کچھ نہیں ہوتا۔ کہتا ہے کہ وہ تو ہزار راستے ہوتے ہیں جن سے تباہیاں آتی

ہیں اور یہ راستے غلط نظام میں بند ہو ہی نہیں سکتے' یہ تو غلط نظام کے بدلنے سے' صحیح نظام لانے سے' یہ چیز ہوتی ہے۔

غلط نظام کا علاج انسانی سوچ کی پیوند کاری سے ممکن ہی نہیں

عزیزانِ من! یہ عجیب چیز ہے کہ غلط نظام میں اگر آپ پیوند کاری سے چاہیں کہ معاشرے کی اصلاح ہو جائے' تو یہ ہو نہیں سکتی۔ غلط نظام میں خرابی' اصل (جڑ) میں ہوتی ہے۔ آپ کی یہ جتنی اصلاحی کوششیں ہوتی ہیں' ان کے لیے تو میں مثال دیا کرتا ہوں کہ یہ تو چیچک کے پھپھولوں پر مرہم لگانے کی بات ہے کہ ایک چھالا ابھرا' اس کے اوپر آپ نے مرہم لگائی' ابھی وہ پھاہا اس کے اوپر سے نہیں اٹھایا تھا کہ ایک اور نکل آیا' اب اس طرف ہوئے ہیں کہ تیسری طرف سے نکل آیا:

سینہ ہمہ داغ داغ پنبہ کجا کجا نہم

چیچک کے اس مریض کے ان چھالوں کے اوپر کہاں کہاں مرہم رکھتے پھرو گے۔ اور ہر چھالے پہ مرہم بھی رکھ دو گے تو اس سے آرام نہیں ہوگا۔ فساد تو اس خون کے اندر ہے جس کے یہ چھالے محسوس مظاہر ہیں' تمہیں نظر آتے ہیں۔ غلط نظام کے اندر جتنی خرابیاں آپ کے سامنے ہوتی ہیں' اصل میں وہ خرابیاں ہی نہیں ہوتیں بلکہ وہ غلط نظام کے مختلف مظاہر ہوتے ہیں۔ مظاہر کا تو علاج آپ ڈھونڈتے پھرتے ہیں' اصل (جڑ) کے مسائل اسی طرح سے رہتے ہیں' اسی طرح سے اسے تقویت دیتے چلے جاتے ہیں۔ سانپ کو دودھ پلاتے چلے جانا' جہاں وہ ڈسے وہاں منتریوں کو بلانا' سوچیے تو سہی کہ کیا کبھی اس سے اصلاح ہو سکتی ہے؟ نہیں' قطعاً نہیں۔ اس کا مشاہدہ ہی نہیں بلکہ ہم تو خود ہی کر رہے ہیں معاشرے کے اندر واویلا مچا ہوا ہے' کوئی شخص جو آپ کو ملے' آپ دیکھیے گا کہ وہ یکسر مرثیہ خواں ہوتا ہے' کوئی زندگی کا شعبہ نہیں ہے جس میں اسے کوئی نہ کوئی تکلیف یا شکایت نہیں ہوتی' چیخ و پکار ہو رہی ہے۔ ٹھیک ہے بعض گوشوں کے اندر اس کی اصلاح کے لیے دیانتدارانہ کوششیں بھی ہو رہی ہیں لیکن بنتا کچھ نہیں ہے۔ پھر معاشرہ مایوس ہو جاتا ہے۔ پھر ان کو ایک اور افیون پلائی جاتی ہے کہ انسان کی فطرت ہی کچھ بد واقع ہوئی ہے۔

انسانی فطرت کے غلط تصور نے انسان کو نفسیاتی لحاظ سے مایوسی کی انتہا تک پہنچا دیا ہے

چل بھئی! برادران عزیز! یہ سوچتے نہیں ہیں کہ انسان کے متعلق ہم یہ کہہ رہے ہیں۔ جس نے انسان کو اس قسم کا پیدا کیا ہے اس کے متعلق آپ کا کیا تصور ہوا۔ جب آپ کہتے ہیں کہ صاحب! وہ فلاں فیکٹری کا پنکھا نہ لیجیے گا' وہ کبھی صحیح بناتے ہی نہیں ہیں' آپ اس پنکھے کو کچھ نہیں کہہ رہے ہوتے' پنکھے بنانے والے کو کہہ رہے ہوتے ہیں۔ بات کو یہاں تک پہنچا دینا مایوسی کی انتہا ہے کہ انسان یہاں پہنچ جائے کہ انسان کی فطرت ہی بد ہے۔ جب فطرت ہی بد ہے تو سوال ہی نہیں کہ اس کی اصلاح ہو جائے۔ یہ تصور غلط ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ ہم غلط

نظام کے پیدا کردہ نتائج کی پیوندکاریوں سے اصلاح کرنا چاہتے ہیں۔ اس کی جگہ تو آپ صحیح نظام قائم کریں گے تو پھر ہی وہ خرابیاں دور ہوسکیں گی۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ کرتے یہ ہیں' عجیب مثال ہے!! کہ تباہیوں سے بچنے کے لیے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیجیے یا آنکھیں بند کرلیجیے۔ محیط قرآن کا عجیب لفظ ہے! او! وہ تو تمہیں چاروں طرف سے ہی گھیرے ہوئے ہے' تم تو گیس چیمبر کے اندر بیٹھے ہوئے ہو' تمہاری سانس کے ساتھ ہلاکت تمہارے اندر جارہی ہے' کہاں کہاں سے اس کو روکو گے۔ یہ نہیں رک سکتی۔

وحی کی راہنمائی کے بغیر عملِ انسانی کی پیدا کردہ مشکلات

قرآنِ کریم ایک بڑی عجیب مثال سے بتاتا ہے کہ **یَکَادُ الْبَرْقُ یَخْطَفُ اَبْصَارَھُمْ کُلَّمَآ اَضَآءَ لَھُمْ مَّشَوْا فِیْهِ** (2:20)۔ پھر وہی جنگل کی تاریکیاں ہیں' پھر وہی تنہا مسافر ہے' پھر دور دور کہیں روشنی کا نشان نہیں' پھر وہ گھٹا آئی' پھر اس میں وہ بجلی کہتا ہے کہ جب وہ بجلی چمکتی ہے تو یہ اس میں چار قدم چل لیتا ہے۔ **وَ اِذَآ اَظْلَمَ عَلَیْھِمْ قَامُوْا** (2:20) پھر بجلی گم ہوئی' پھر ٹھٹک کر رہ گیا' پھر کھڑا ہو گیا۔ عزیزانِ من! انسانیت کی ساری تاریخ اس مثال کی زندہ داستان ہے۔ انسانوں نے جب بھی تنہا عقل کی روشنی میں زندگی کی مسافت طے کرنے کی کوشش کی' ہوا یہ کہ بجلی کی چمک سے چار قدموں تک کا راستہ روشن ہوا' وہاں تک وہ چلے' اس کے بعد پھر تاریکی اور تاریکی پہلے سے بھی زیادہ۔ پھر یہ کارواں یا تو کھڑا ہو گیا یا غلط راستوں پر چل نکلا۔ قرآن نے اپنی کتاب کو اسی لیے نور اور نور مبین کہا ہے۔ یہاں سے تمہیں روشنی ملے گی۔ تنہا عقل کے زور پہ جو تم نظام قائم کرو گے' اس کی کیفیت یہ ہوگی کہ بجلی کی چمک سے چار قدم تک راستہ روشن ہوا' اس کے بعد پھر وہ بجھ گئی' بادلوں میں چھپ گئی اور اس کے بعد پھر تم تاریکیوں میں کھڑے رہ گئے۔ یوں چلا آرہا ہے یہ آپ کا کارواں۔ پوچھیے نہیں کہ یہ کارواں جب آگے بڑھے گا تو اس کی کیفیت کیا ہوگی۔ اس راستے کے اندر وقت' توانائیاں' دولت' جانیں کتنی تلف ہونگی۔ اور متقین کا تو آپ کو معلوم ہے کہ ترجمہ ہی یہ تھا ''جو راستے کی دشوار گزار گھاٹیوں سے بچ کر چلنا چاہیں''۔

قدرت طبعی قوانین کے دروازے مومن اور کافر کا فرق کیے بغیر ہر کسی پر کھلے رکھتی ہے

اب آگے بات آتی ہے جو میں نے شروع میں کہی تھی۔ ہمارے ذہن میں یہ آتا ہے اور اکثر کہا بھی جاتا ہے کہ صاحب! یہ جو اتنی ظلم اور زیادتی کرتے ہیں' اگر کہیں خدا ہے تو ان کی کلائی کیوں نہیں مروڑ دیتا' ان کا ٹینٹوا کیوں نہیں دبا دیتا۔ ہم تو دیکھتے ہیں کہ یہاں کسی کی پکڑ ہی نہیں ہوتی' وہ مزے کرتے ہوئے جیتے ہیں' اسی طرح سے مرتے ہیں' کوئی گرفت کرنے والا ہی نہیں ہے' خدا ان کو پکڑ کیوں نہیں لیتا؟ یہ سوال ہر روز ہوتا ہے۔ میں پھر عرض کردوں جو میں نے پہلے کہا تھا کہ اس میں جو کچھ حاصل ہوتا ہے' یہ طبعی قوانین کے مطابق جو محنت کی جاتی ہے' یہ اس کا نتیجہ ہوتا ہے۔ طبعی قوانین کے مطابق زمین کو سنوارنے والا' اچھا بیج ڈالنے والا' سیراب کرنے والا' حفاظت کرنے والا' وہ

کتنا ہی بڑا گنہگار کیوں نہ ہو، اس کی کھیتی اُگنے سے پہلے یہ کہہ کر اسے جواب نہیں دیدے گی کہ نہیں بھائی! ''پہلاں جا کے وضو کر کے آ، فیر اگاں گی ❶'' یہ نہیں ہوتا۔ طبعی قوانین میں یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہم جو کہتے ہیں کہ گرفت کیوں نہیں ہوتی، ہم چاہتے یہ ہیں کہ ان طبعی قوانین کے دروازے اس کے اوپر بند کر دیئے جائیں۔ یہ بڑی غور طلب چیز ہے، برادرانِ عزیز! ان آیتوں کے اندر قرآن جو یہ باتیں یوں اشارتاً کہہ جاتا ہے۔ کہا ہے کہ **وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَ اَبْصَارِهِمْ** (2:20) ٹھیک ہے ہمارے اختیار میں یہ ضرور ہے کہ ہم طبعی قوانین کے راستے بھی بند کر دیں لیکن اس نے کہا ہے کہ یہ پھر Fair Play (تعمیری کام) نہ ہوا، یہ کچھ بات نہ ہوئی۔ یہ تو وہ کرتا ہے جسے کسی کی حرکت کے اوپر غصہ آتا ہے، وہ اس سے انتقام لیتا ہے۔ کہتا ہے کہ یہاں سزا اور جزا کا فلسفہ ہے ہی نہیں، یہاں تو جو کرنے والا ہے اس کے عمل کا نتیجہ اس کی ذات پر مرتب ہوتا ہے۔ جتنا حصہ طبعی قوانین کا ہے اس طبعی قوانین کے متعلق ہمارا نظام یہ ہے۔

زندگی کے ہر دو گوشوں کا تقابل اور ان کے نتائج کا ماحصل

اب سنیئے، عزیزانِ من! یہاں وہ بات آئی۔ بات یہ تھی کہ **وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَ اَبْصَارِهِمْ** (2:20)۔ عام طور پر ان آیتوں کے اس مفہوم کی بات نہیں سمجھ آیا کرتی کہ قرآن نے کہا کیا ہے کہ اگر ہم چاہتے تو ان کے ہاں کی یہ بصیرتیں اور بصارتیں سلب کر کے لے جاتے لیکن اس نے کہا ہے کہ ہمارا نظام یہ ہے۔ دیکھیے طبعی قوانین کے متعلق اس کا نظام کیا ہے۔ غور سے سنیئے گا، برادرانِ عزیز! دو روش ہائے زندگی کا تقابل ہو رہا ہے۔ وہی مفادِ عاجلہ چاہنے والے، خالص طبعی قوانین کے تابع ہیں، اور وہ مستقبل کی درخشندگیاں بھی ساتھ چاہنے والے ہیں۔ ان دونوں کا تقابل ہے۔ کہا ہے کہ **مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ** (17:18) قوانینِ طبعی کے مطابق مفادِ عاجلہ چاہتا ہے ہم اس کے راستے میں روک نہیں بنتے، اس کو اس کے نتائج ملتے چلے جاتے ہیں۔ وہ کہتا ہے یہ ٹھیک ہے مفادِ عاجلہ حاصل ہو جاتے ہیں طبعی قوانین کے تابع لیکن اس کے بعد انجام یہ ہوتا ہے کہ **ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ جَهَنَّمَ** (17:18) ان کی سعی و عمل کی کھیتیاں بالآخر جھلس کر رہ جاتی ہیں۔ **يَصْلٰهَا مَذْمُوْمًا مَّدْحُوْرًا** (17:18)۔ یہ جہنم کیا ہوتا ہے؟ وہ جو نہایت مایوس، افسردہ، پژمردہ، ہتھیلی پہ ماتھا رکھ کر یوں بیٹھا ہوا ہو کہ اس کا کوئی پرسانِ حال نہیں، ان کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے۔ یہ ہے جہنم اس کے مقابلے میں **وَ مَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَ سَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَ هُوَ مُؤْمِنٌ** (17:19) وہ جو ان قوانین کی صداقت پر یقین رکھتا ہے اور پھر اس کے لیے مفادِ عاجلہ کو بھی سامنے رکھ کر اور مستقبل کو بھی سامنے رکھ کر پوری پوری کوشش کرتا ہے۔ اور جو مستقبل کو سامنے رکھتا ہے اس کی جھولی میں مفادِ عاجلہ تو خود بخود آ جاتے ہیں۔ یہ جو کچھ کرتا ہے اس کے لیے کہا ہے کہ **فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا** (17:19) یہ ہیں جن کی کوششیں بھرپور نتائج دیتی ہیں۔ اب یہ دو گروہ ہو گئے۔

---

❶ جاؤ! پہلے وضو کر کے آؤ، میں پھر اُگوں گی۔

ذاتِ خداوندی طبعی طور پر عطا کردہ نعمتوں میں سے کسی پر پابندی نہیں لگاتی

آگے ہے وہ بات جو میں کہہ رہا تھا۔ کہا ہے کہ کُلًّا نُّمِدُّ ھٰٓؤُلَآءِ وَ ھٰٓؤُلَآءِ (17:20) جہاں تک طبعی قوانین کا تعلق ہے ان دونوں گروہوں کو یکساں طور پر ہم مواقع باہم پہنچاتے ہیں کہ جاؤ، بڑھو، جس کا جی چاہے بڑھتا چلا جائے۔ کُلًّا نُّمِدُّ ھٰٓؤُلَآءِ یعنی اسے بھی اور اُسے بھی۔ آگے یہ ہے کہ وَ مَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا (17:20) طبعی قوانین کے تابع جو ہم نے انسانوں کے لیے یہ بخشش دی ہوئی ہے ہم اس میں کسی کے راستے میں پھاٹک نہیں لگا دیتے' می نہ سزد خدائے را'' اسی رعی نئیں کردے کسے دے واسطے' نہ کسے دے رستے اچ کنڈے بکھیر دیندے ہیگے آں ❶''۔ یہ جہانِ سعی وعمل ہے' جو کوشش کرے گا اس کے نتیجے ملیں گے۔ جس نے آگے بڑھنا ہے' آگے بڑھ جائے' جس نے پیچھے رہ جانا ہے پیچھے رہ جائے۔ عزیزانِ من! یہ ٹکڑا غور کیجیے: وَ مَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا (17:20) خدا کی ان طبعی بخشائشوں کے راستے میں بند نہیں لگائے جاسکتے۔ اس لیے یہ چیز تو نہیں ہوسکتی جو تم چاہتے ہو کہ طبعی طور پر ان کی گرفت ہو جائے' ظالم کا ہاتھ اٹھے تو وہاں پتھر کا بن جائے۔ یہ بات نہیں۔ غیر مسلم کھیتیاں کرے تو وہ اگر گیہوں بوتا ہے تو اس میں سے جو اُگے' انگور کی بیل لگاتا ہے تو اس میں سے ببول کے کانٹے لگیں۔ کہتا ہے کہ ہم یہ چیز نہیں کرتے: وَ مَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا (17:21)۔ کہتا ہے کہ اُنْظُرْ كَيْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ (17:21) تم دیکھو کہ جہانِ سعی وعمل میں' طبعی دنیا کے اندر' ایک قوم کس طرح سے دوسری قوم سے آگے بڑھتی ہوئی چلی جاتی ہے' کسی کے راستے میں ہم روک بن کر نہیں کھڑے ہوتے لیکن وَ لَلْاٰخِرَةُ اَكْبَرُ دَرَجٰتٍ وَّ اَكْبَرُ تَفْضِيْلًا (17:21) جن کے سامنے مستقبل کی درخشندگی اور کامیابیاں ہوتی ہیں' انہیں تم دیکھو گے کہ زندگی میں ان کے مدارج بہت بلند ہو جاتے ہیں۔

خارجی کائنات کی طرح انسانی زندگی میں وحی کی مستقل اقدار کو تسلیم نہ کرنا دو خدا بنانا ہے

لہٰذا کہا ہے کہ لَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ (17:22) قوانینِ خداوندی کو دو حصوں میں تقسیم نہ کرو کہ طبعی زندگی تو خدا کے قوانین کے مطابق چلے اور تمہاری انسانی زندگی تمہارے اپنی مصلحت کوشیوں کے ماتحت چلے۔ یہ خدا کے ساتھ دوسرا خدا بنا دینا ہے۔ کہا ہے کہ یہ نہ کرو ایسا کرو گے تو فَتَقْعُدَ مَذْمُوْمًا مَّخْذُوْلًا (17:22) یاد رکھو! اس کا انجام یہ ہوگا کہ مایوس ہو کر چاروں طرف سے پژمردہ اور افسردہ ہو کر بیٹھ جاؤ گے۔ ایسا نہ کرو' نہ ہی اس کی توقع کرو کہ ہم اس طرح سے طبعی قوانین کے ماتحت جو زندگی کی ترقیاں اور شادابیاں حاصل کرنا چاہتے ہیں' ہم ان کے راستے میں روک بن کر کھڑے ہو جائیں گے اور تم چونکہ ہمارے حبیب ﷺ کی محبوب امت ہو' اس لیے تم اگر

---

❶ ہم کسی کے لیے بھی رو رعایت نہیں برتتے' نہ ہی ہم کسی کے راستے میں کانٹے بکھیرتے ہیں۔

گھروں میں سوئے بھی رہو گے تو تمہاری کھیتیاں خود لہلہا اٹھیں گی' ایسی توقع ہم سے نہ کرو' یہ جذبات پرستی ہے اور خدا اسے کہتے ہیں جو جذبات سے بلند ہوتا ہے۔ یہی چیزیں ہیں' عزیزانِ من! قرآن نے مختلف مقامات میں ان دونوں گروہوں کا اور دونوں نظریاتِ حیات کا تقابل کر کے دکھا دیا۔

خداپرستی کے بجائے جذبات پرستی کا ماحصل مادی فراوانیوں کے سوا کچھ نہیں ہوتا

کہا ہے کہ وَ مَا لَهٗ فِی الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ (2:200) ایک گروہ ان کا بھی ہے جن کے سامنے مقصدِ حیات ہی یہ ہوتا ہے کہ یہ جتنے دنیاوی طبعی زندگی کے مفادات ہیں' انہیں زیادہ سے زیادہ حاصل کرتے چلے جائیں۔ ان کا زیادہ سے زیادہ حاصل کرنا کوئی معیوب نہیں ہے بلکہ جائز و ناجائز ہر طریق سے حاصل کرتے چلے جائیں' اس کے یہ معنی ہوتے ہیں لیکن وَ مَا لَهٗ فِی الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ (2:200) یہ وہ لوگ ہیں کہ پھر ان کا مستقبل میں کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ یہی چیز دوسرے مقام پہ بھی قرآن نے دہرائی ہے کہ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَ زِيْنَتَهَا نُوَفِّ اِلَيْهِمْ اَعْمَالَهُمْ فِيْهَا وَ هُمْ فِيْهَا لَا يُبْخَسُوْنَ (11:15) جو صرف طبعی قوانین کے تابع ان مفادات کو حاصل کرنا چاہتا ہے اور اس کے مطابق وہ کوشش کرتا ہے' ہم اس کو اس کے اعمال کا پورا پورا بدلا دیتے ہیں' اس میں ہم کسی قسم کی کمی نہیں کرتے لیکن اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَيْسَ لَهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ (11:16) مستقبل میں ان کے لیے سوائے اس کے کہ سعی و عمل کو جھلسا دینے والا جہنم ہوتا ہے' کچھ اور انہیں نہیں مل سکتا۔ وَ حَبِطَ مَا صَنَعُوْا فِيْهَا وَ بٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (11:16) یہ جو انہوں نے مصنوعی طور پر اپنے لیے کچھ نظام بنا رکھے تھے' یہ جھوٹے نگوں کی جسے اقبالؒ مینا کاری کہتا ہے' وہ کہتا ہے کہ پھر جب ایک تاؤ دیا جاتا ہے تو پھر اس کا منہ فق ہو جاتا ہے' پھر اس سے ملمع اتر جاتا ہے' پیتل کا پیتل باقی رہ جاتا ہے' آگے چل کر ان کے لیے کچھ نہیں مل سکتا۔ اسی طرح سے (42:20) میں بھی یہ چیز کہی۔ قرآن کے بیشتر مقامات میں اس تقابل میں قرآن نے یہ کہا ہے اور میں یہ اس لیے عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ بار بار ہمارے ذہن میں یہ سوال اٹھا کرتا ہے کہ یہ جو ظلم کرنے والے' غلط راستے پہ چلنے والے' مظلوموں کو ستانے والے موجود ہیں' اگر خدا ہے تو خدا ان کا ٹینٹوا کیوں نہیں دبا دیتا۔ یہ چیزیں اس کا جواب ہے جو قرآن کہتا ہے کہ طبعی زندگی کے اندر ہم یہ نہیں کیا کرتے۔ وہ کہتا ہے کہ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَةِ نَزِدْ لَهٗ فِیْ حَرْثِهٖ (42:20) جو مستقبل کی کھیتیاں چاہتا ہے' اس کی کھیتیوں میں بھی ہم اپنے قانون کے مطابق اضافہ کرتے چلے جاتے ہیں۔ وَمَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا (42:20) اور جو صرف مفادِ عاجلہ ہی چاہتا ہے' اس کو بھی اس کی کوششوں کا نتیجہ یہاں ملتا جاتا ہے لیکن وَمَا لَهٗ فِی الْاٰخِرَةِ مِنْ نَّصِيْبٍ (42:20) پھر مستقبل میں اس کا کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ ہر جگہ یہ قانون دہرایا ہے۔

مفادِ عاجلہ کے مقابلے میں مستقل اقدار کے تابع زندگی بسر کرنے والے گروہ کی کیفیت

برادرانِ عزیز! قرآن نے' ان آیات کے مقابلے میں ایک گروہ بتایا ہے' جس کی روشِ زندگی' جس کا منتہائے نگاہ' جن کی آرزوئیں ان الفاظ میں بیان کی گئی ہیں کہ وَ مِنۡهُمۡ مَّنۡ يَّقُوۡلُ رَبَّنَاۤ اٰتِنَا فِى الدُّنۡيَا حَسَنَةً وَّ فِى الۡاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّ قِنَا عَذَابَ النَّارِ (2:201) یہ گروہ وہ ہے جو چاہتا یہ ہے' جن کی آرزوئیں' جن کی کوششیں' یہ ہوتی ہیں کہ ان کی اس دنیا کی زندگی بھی سرفرازیوں اور سربلندیوں کی زندگی ہو اور ان کا مستقبل بھی خوشگوار اور شاداب ہو۔ کہا ہے کہ یہ ہیں وہ صحیح لوگ جو طبعی قوانین کے ماتحت فطرت کی قوتوں کو مسخر کرتے ہیں اور اس کے ماحصل کو ہماری بتائی ہوئی مستقل اقدار کے مطابق انسانیت کی منفعت کاریوں کے لیے صرف کرتے ہیں۔ یہ ہے وہ گروہ جس کا حال بھی درخشندہ ہوتا ہے' جس کا مستقبل بھی روشن اور تابناک ہوتا ہے۔ اس گروہ کو مومنین اور متقین کا گروہ کہا جاتا ہے۔ دوسرا گروہ وہ ہے جو محض طبعی قوانین کے ماتحت جائز اور ناجائز' ہر طریقے سے' یہ چیزیں حاصل کرتا ہے' طبعی قوانین کے نتائج ان کے سامنے بھی آتے چلے جاتے ہیں' اس میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی' اسے مفادِ عاجلہ حاصل ہو جاتے ہیں' ان میں پائندگی نہیں ہوتی اگرچہ ان کی چمک بہت زیادہ ہوتی ہے۔

دو گروہوں کے علاوہ ایک تیسرے گروہ کی حالت

یہ دو گروہ ہیں۔ ایک تیسرا گروہ ہے' برادرانِ عزیز! جو فطرت کی ان قوتوں کو نہ صرف یہ کہ مسخر نہیں کرتا بلکہ ہمیشہ لٹھ لیے ہوئے ان کے پیچھے پھرتا ہے کہ دنیا قابلِ نفرت ہے' دنیا جیل خانہ ہے' یہ ایک لاش ہے اس کے چاہنے والے کتے ہیں' جتنا دور ان سے ہٹے' اتنا ہی خدا کا مقرب ہوتا ہے۔ میں پھر عرض کر دوں کہ دین تو یہاں سے شروع ہوتا تھا کہ فطرت کی قوتوں کو مسخر کرنے کے بعد اس کے ماحصل کا صرف کیسے کیا جائے۔ دین کی ابتدا یہاں سے ہوتی ہے۔ اور جس نے ان قوتوں کو مسخر ہی نہیں کیا' طبعی قوانین کے تابع یہ چیزیں اکٹھی ہی نہیں کیں' اس کے لیے یہ سوال ہی کیوں پیدا ہوگا کہ وہ ان کو صرف کیسے کرتا ہے۔ تیسرا گروہ یہ ہے جن کی دنیا بھی تاریک ہوتی ہے' جن کی آخرت بھی تاریک ہوتی ہے۔ اس لیے کہ وَ مَنۡ كَانَ فِىۡ هٰذِهٖۤ اَعۡمٰى فَهُوَ فِى الۡاٰخِرَةِ اَعۡمٰى (17:72) جس کا آج روشن نہیں ہے' اس کا کل بھی تاریک ہی ہوگا۔ یہ قرآن کہتا ہے۔ یہ اب ہوئے ہمارے سامنے تین گروہ۔

سورۃ البقرۃ کی انہی آیات میں انہی تین گروہوں کا ذکر ہے

یہ تھے' عزیزانِ من! وہ تین گروہ جن کا ذکر قرآنِ کریم نے سورۃ البقرۃ کی ابتدائی بیس آیات میں کیا ہے۔ ان بیس آیات کو ہم نے' میرا خیال ہے' کہ تین مہینے سے بھی زائد عرصے میں لیا ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ جب تک دین کے یہ بنیادی اصول سمجھ میں نہ آئیں'

آگے بڑھنے سے کچھ فائدہ نہیں ہے۔ آپ نے یہ چیزیں بنیادی طور پہ سمجھ لی ہیں تو آپ دیکھیں گے کہ آپ کے اگلے راستے بڑے آسان ہو جائیں گے۔ اور پھر آپ کو یہ بھی معلوم ہوگا کہ قرآن کس طرح سے الحمد سے والناس تک ایک مربوط کتاب چلا آتا ہے۔ یہ نہیں ہے کہ کبھی اس نے کچھ کہہ دیا اور کبھی کچھ۔ جیسے ہر محراب و منبر سے آپ سنتے چلے آتے ہیں کہ جی! کبھی یہ آدم کا قصہ لے بیٹھتا ہے، کبھی جنت کی بات آگئی، بنی اسرائیل آگیا، اب کھیتی کا ذکر، اب آسمان کا ذکر ہے۔ یہ بات نہیں ہے۔ ان تینوں گروہوں کے بعد اب وہ یہ بتائے گا کہ غلط نظامِ کی تباہ کاریاں کیا ہوتی ہیں اور جب ان کی جگہ صحیح نظامِ زندگی آتا ہے تو وہ نظام کیا ہوتا ہے، اس کے نتائج کیا ہوتے ہیں۔ اس کی ابتدا اس سے ہوتی ہے کہ **یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ** (2:21)۔ یہ سورۃ البقرۃ کی 21ویں آیت ہے۔

عزیزانِ من! اب وقت ہوگیا ہے، اسے ہم آئندہ اتوار پہ اٹھا رکھتے ہیں۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ط اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ

❀......❀......❀

دسواں باب: سورۃ البقرۃ (1)' (آیات 21 تا 23)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ
تَتَّقُوْنَ ﴿۲۱﴾ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً ۖ وَّاَنْزَلَ مِنَ
السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا
وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۲﴾ وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ
مِّثْلِهٖ ۖ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۲۳﴾

عزیزانِ من! آج اگست 1968ء کی 4 تاریخ ہے اور ہم درسِ قرآنِ کریم کے اس نئے سلسلے میں سورۃ البقرۃ کی بیسیویں آیت تک سابقہ درس میں پہنچ گئے تھے۔ آج 21ویں آیت ہمارے سامنے ہے: (20:21)۔

قرآنِ حکیم کی پوری تعلیم نظام ربوبیتِ عالمینی کی وضاحت اور تشکیل پر مبنی ہے

مختصراً دہرا دوں کہ قرآنِ کریم کی ابتدا اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ((1:1 سے ہوتی ہے اور اس کی ساری تعلیم اسی نظریۂ ربوبیت کے گرد گھومتی ہے۔ اگر آپ پورے قرآن کا یہ چاہیں کہ عمود کیا ہے' بنیادی نکتہ کیا ہے' وہ محور کیا ہے' تو اسے ایک لفظ میں کہا جا سکتا ہے اور وہ ہے' ربوبیتِ عالمینی۔ اسی لیے آپ پورے قرآن میں دیکھیں گے کہ جس تکرار و اصرار سے رب کا تصور دہرایا گیا ہے' کوئی دوسرا تصور ایسا نہیں دیا گیا۔ باقی تصورات اس کے گرد گھومتے ہیں۔ عمود یا محور جسے کہتے ہیں' وہ ربوبیت کا تصور ہے۔ ربوبیت کے معنی ہوتے ہیں'' کسی شے میں جو کچھ بن جانے کے امکانات ہوں' اسے آہستہ آہستہ نشو و نما دے کر' وہ کچھ بنا دینا''۔ آم کی گٹھلی کی ربوبیت یہ ہے کہ اسے آہستہ آہستہ نشو و نما دے کر اس آم کے پیڑ تک لے جایا جائے جس میں پھر ویسے ہی آم لگ جائیں۔ مرغی کے چوزے کی ربوبیت یہ ہے کہ اس کی پرورش کر کے اسے ایسی مرغی بنا دیا جائے جو پھر اس قسم کے چوزے پیدا کرنے کے قابل ہو جائے۔ انسان کی ربوبیت' جہاں تک اس کی طبعی زندگی کا تعلق ہے' وہ بھی اسی حیوانی سطح تک ہے۔

حیوانی سطح تک انسان اور حیوان کی ربوبیت میں کوئی فرق نہیں

آپ نے یہ دیکھا ہوگا کہ میں نے ابھی بتایا کہ آم کی گٹھلی کی ربوبیت یہ ہے کہ یہ سارا Cyclic Order (دَوری نظم) پورا کیا جائے تاکہ اس جیسا آم پھر پیدا ہو جائے۔ یہ ایک دائری حرکت ہے۔ مرغی کے چوزے کی ربوبیت یہ ہے کہ وہ اسی قسم کی مرغی بن کر اسی قسم کا انڈہ دے‘ جس سے اسی قسم کا چوزہ پیدا ہو جائے‘ دیکھا! پھر یہ Cyclic Order (دَوری نظم) ہے‘ یہ چیز دائرے میں گھومتی ہے۔ اس ربوبیت کا ایک منتہا ہے‘ اس سے آگے وہ نہیں جاسکتی۔ وہاں اگر ربوبیت ناقصہ ہے تو وہاں جا کر وہ رک جائے گی‘ ٹھٹھر جائے گی‘ منجمد ہو جائے گی۔ اور اگر اس کے اندر یہ سلسلہ جاری ہے تو پھر اس کے اندر وہ دائری حرکت پیدا ہو جائے گی‘ اسی قسم کی چیز جسے آپ Reproduction (توالدِ نو) کہتے ہیں پیدا ہوگی۔ یہ چیز جو حیوانی سطح تک ہے اسی طرح سے اس کی ربوبیت ہوتی ہے۔ آپ اس کو اس سے آگے نہیں لے جا سکتے۔ جیسا میں نے کہا ہے‘ وہ وہیں ٹھٹھر جائے گی‘ یا پھر وہاں لوٹ کر اس دائرے کے اندر آ جائے گی۔ انسانی جسم کی جو ربوبیت ہے اس کا تو یہی طریق ہے۔ ہر انسانی بچے کی طرح اس کی نشوونما آپ کیے جائیں‘ یہ بڑھتا چلا جائے گا۔ اس Growth یا اس بڑھنے کا ایک آخری مقام آ جائے گا‘ اس کے بعد یہ Growth (بالیدگی) باقی نہیں رہے گی‘ باقی پھر اس کی Maintenance (پرداخت و خبرگیری) رہ جائے گی یعنی جیسا وہ ہے کسی طرح سے اس کو ویسا ہی رکھا جائے۔ اس کے بعد اس کا منتہا کیا ہوگا؟ یہ کہ پھر یہ اسی قسم کے بچے پیدا کرے جیسا یہ بچہ پہلے خود تھا۔ یہ وہی Cyclic Order (دائری حرکت) ہے۔

انسانی جسم کی طبعی ربوبیت کا بنیادی مقصد جوہرِ انسانیت کی نشوونما کرنا ہے

عزیزانِ من! انسان کی زندگی تو صرف حیوانی سطح کی زندگی نہیں ہے‘ یہ تو اس کی زندگی کا ایک حصہ ہے‘ اسے پاؤں کا حصہ کہیے۔ اس کا اوپر کا حصہ تو وہ ہے جسے آپ انسانی زندگی کہتے ہیں۔ انسانی زندگی کی بھی ربوبیت نہایت ضروری ہے بلکہ یوں کہیے کہ طبعی زندگی کی ربوبیت ایک ذریعہ ہے اس کی انسانی زندگی کی ربوبیت کا۔ مقصود اس کی انسانی زندگی کی ربوبیت ہے لیکن قرآن تو ایک جامع تعلیم دیتا ہے۔ وہ اس کی طبعی زندگی کی ربوبیت کو نظر انداز نہیں کرتا۔ اس لیے کہ اگر ذریعہ ہی باقی نہ رہے تو منزل تک آپ کیسے پہنچ جائیں گے۔ کوئی سامانِ (ذریعہ) سفر آپ کے پاس نہ ہو تو آپ پشاور کیسے چلے جائیں گے۔ سامانِ سفر‘ ذرائع سفر‘ وسائل و اسبابِ نشوونما‘ نہایت ضروری ہیں۔ جسم کا Healthy (صحت مند) ہونا‘ توانا ہونا‘ جتنا کچھ یہ بن سکتا ہے‘ اس کا یہ پورے کا پورا نشوونما پانا‘ انسان کی انسانیت کی ربوبیت کے لیے نہایت ضروری ہے لیکن یہ مقصود بالذات نہیں ہے‘ یہ انسانیت کی ربوبیت کے لیے وسیلہ‘ سبب یا ذریعہ ہے۔ اور جہاں تک انسانیت کی ربوبیت کا تعلق ہے‘ اس کی کوئی حد اور انتہا نہیں ہے۔ طبعی ربوبیت میں ایک مقام‘ جیسا میں نے ابھی عرض کیا ہے‘ آتا

ہے جس کو آپ اس کی Destination (منزل) کہیں گے' جہاں جا کر یا وہ رک جائے گا یا پھر لوٹ آئے گا' دائری حرکت شروع ہو جائے گی۔ انسانیت کی نشوونما Limitless (بے حدود و قیود) ہے' اس کی کوئی حد نہیں ہے۔ اور اس زندگی کی سطح (Level) پر تو اس کی نشوونما کی یوں کہیے' جیسے ابتدا ہوتی ہے' یہ بڑھنے کے قابل ہوتا ہے۔ یہ جو انسان کی طبعی زندگی کی اور انسانی زندگی کی نشوونما ہے' یہ ہے اس کی ربوبیت۔

انسانی ربوبیت کی نشوونما حدود نا آشنا واقع ہوئی ہے

قرآن صرف انفرادی ربوبیت تک نہیں رہتا' وہ رب العالمین ہے' ربوبیتِ عالمینی چاہتا ہے۔ ایک فرد کی اپنی ربوبیت نہیں' اس کی اپنی پارٹی کی ربوبیت نہیں' اپنی قوم کی ربوبیت نہیں' پوری عالمگیر انسانیت کی ربوبیت چاہتا ہے۔ اب ہمارے سامنے قرآن کا منتہا آ گیا۔ ربوبیتِ عالمینی یہ ہے کہ پوری نوعِ انسانی کی ربوبیت' ایسی ربوبیت کہ ہر فردِ انسانیہ طبعی جسم کے اعتبار سے وہ کچھ ہو جائے جتنا انسان ایک انسانی جسم میں نشوونما کا ہے اور اس کے بعد اس کی انسانیت کی نشوونما ہو جائے اور یہ وہ نشوونما ہے جو کسی مقام پر رک نہیں سکتی۔ قرآن نے کہا ہے کہ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ (2:132) یاد رکھو! مرتے دم تک تم نے اسی انداز سے مسلم کی زندگی بسر کرنا ہے۔ یہ نہیں ہے کہ کوئی ایک مقام آ جاتا ہے جہاں پہنچنے کے بعد یہ کہہ دیا کہ ہاں صاحب! اب تو بس ٹھیک ہو گیا' جہاں ہم نے پہنچنا تھا پہنچ گئے۔ یہ یا تو طبعی زندگی ہے اور یا پھر رہبانیت کی زندگی ہے جس میں وہ سمجھ لیتے ہیں۔ پتہ ہے آپ کو کہ پہنچا ہوا ایک لفظ ہوتا ہے' وہ جو پہنچا ہوا ہوتا ہے' بس اس کے بعد تو پھر وہ پہنچ گیا۔ یہاں ''پہنچے ہوئے'' کا سوال ہی نہیں ہے۔ یہ تو زندگی جوئے رواں ہے اور اس سطح کے اوپر جو پہنچنا ہے' پہنچنے کا یہ تصور ہی غلط ہے۔ یہ آگے بڑھنا ہے' بڑھتے چلے جانا ہے' مسلسل حرکت ہے' پیہم سعی و عمل ہے' متواتر جدوجہد ہے اور اسی کا نام زندگی ہے۔ کسی مقام پہ جا کر کھڑے ہو جانا' موت ہے' اس کے بعد یہ زندگی اسلام کی نہیں رہتی۔ اس نے کہا تھا کہ مرنے کے آخری سانس تک مسلم رہنا ہے' جمود میں کھڑے ہو کر مسلم نہیں رہا جا سکتا۔

ربوبیت عالمینی کے عظیم پروگرام کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کا طریق کار

یہ ہے قرآن کی بنیادی تعلیم اور سارا قرآن اسی محور کے گرد گھومتا ہے' نظری اعتبار سے بتاتا ہے' دلائل لاتا ہے' شواہد لاتا ہے' اسی کے لیے Practical Porgram (عملی پروگرام) دیتا ہے کہ یہ ربوبیتِ عالمینی کیسے ہو سکتی ہے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (1:1) سے بات شروع کی اور اس کے بعد سورۃ البقرۃ شروع کی پہلی بیس آیات میں جیسا ہم نے سابقہ دروس میں دیکھا تھا کہ موٹی تقسیم کے اعتبار سے' دو گروہ ہمارے سامنے آئے۔ ایک وہ جو صرف اپنی نشوونما کی فکر کرتے ہیں' جو صرف اپنی ربوبیت کی فکر کرتے ہیں۔ اس میں ایک گروہ تو ان لوگوں کا ہو جائے گا جو صرف طبعی نشوونما چاہتے ہیں' Materialistic Concept of Life (زندگی کا مادی

تصورِ حیات) رکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ زندگی یہی طبعی زندگی ہے اسی کی نشوونما مقصود ہے' وہ طبعی زندگی کی نشوونما پہ لگے ہوئے ہوتے ہیں۔ یہ پھر بھی کوئی ایسی چیز ہوتی ہے جو ایک ٹھوس ہے' حیوانی سطح ہی سہی مگر ایک ٹھوس چیز تو ہے۔ دوسری طرف ایک اور گروہ ہوتا ہے جو یکسر فریب میں مبتلا ہوتا ہے اور وہ کہتا ہے کہ یہ طبعی نشوونما' جسم کی نشوونما' اس دنیا کے اندر کی زندگی' یہ کوئی شے نہیں ہے' اصل شے روحانیت کی زندگی ہے۔ اور وہ شے یہ ہے کہ ہر ایک شخص کی روحانیت' اس کی اپنی ذہنیت کے مطابق' اس کے اپنے تصور میں ڈھلی ہوئی ہوتی ہے' خارج میں اس کا وجود ہی کوئی نہیں ہوتا۔ یہ ایک فریب ہے جتنا جی چاہے خود کھا لیجئے' جتنا جی چاہے دوسروں کو دیتے چلے جایئے۔ وہ سب سے گئی گزری زندگی ہوتی ہے لیکن ایک زندگی ہے جسے وہ مومن کی زندگی کہتا ہے کہ اٰتِنَا فِی الدُّنۡیَا حَسَنَۃً وَّ فِی الۡاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً (2:201)۔ میں یہ آیت سابقہ درس کے آخر میں آپ کے سامنے لے کر آیا تھا۔ بتایا تھا کہ جسم کی طبعی زندگی بھی وہ ہو جو پوری ربوبیت یافتہ ہو اور انسان کی انسانیت کی زندگی جس نے اس سے آگے چلنا ہے' وہ بھی پوری نشوونما یافتہ ہو۔ یہ ہوا اسلام' وہ ہوا اس کا پروگرام اور اب ہم اس کے تابع آگے چلتے ہیں۔

رہبانیت اور حیوانی سطح زندگی کا انجام؟

موٹے موٹے دو گروہ ہمارے سامنے آ گئے۔ ایک وہ جو صرف اپنی ذات کی نشوونما کرتا ہے اور اس میں' میں نے بتا دیا تھا کہ ایک وہ ہے جو صرف طبعی زندگی کی نشوونما چاہتا ہے اور آگے نہیں بڑھتا۔ دوسرا وہ ہے جو محض خوابوں کی دنیا کے اندر رہتا ہے اور اپنے آپ کو فریب دے لیتا ہے کہ میری روحانیت کی نشوونما ہو رہی ہے۔ سارے قرآن میں ایک جگہ اس نے ان کا ذکر کیا کہ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے رہبانیت اختیار کر لی' ہم نے نہیں کہا تھا' انہوں نے اسے خود وضع کیا اور اس کے بعد پھر اسے نباہ بھی نہ سکے۔ قصہ ختم ہوا۔ آپ قرآن کے اندر دیکھیں گے کہ ان دو گروہوں کا سارا ٹکراؤ آتا ہے۔ وہ صرف اپنی نشوونما چاہتے ہیں اور وہ بھی صرف Material (مادی) نشوونما۔ اپنی سے اس کی مراد حیوانی سطح کی نشوونما ہے' اس میں فیملی آ جاتی ہے' بچے آ جاتے ہیں۔ حیوان یہاں تک تو پہنچا ہوا ہے کہ وہ اپنی اور اپنے بچوں کی صرف طبعی نشوونما کرتا ہے۔ یہ ایک گروہ ہو گیا۔ یہ ہے کفر کا گروہ۔ کفر کے متعلق اس نے کہا ہی یہ ہے کہ وَالَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا یَتَمَتَّعُوۡنَ وَیَاۡکُلُوۡنَ کَمَا تَاۡکُلُ الۡاَنۡعَامُ (47:12) یہ وہ لوگ ہیں جو مادی مفادات سے فائدہ حاصل کرتے ہیں' کھاتے پیتے ہیں' مر جاتے ہیں' حیوانوں کی طرح محض طبعی زندگی بسر کرتے ہیں۔

قرآنی نظامِ حیات کا تقابل کس سے؟

اب یہی ٹکراؤ ہے جو باقی سارے قرآن میں آتا ہے۔ یہی ہے کفر اور اسلام' یہی ہے حق اور باطل۔ قرآنِ کریم میں انہی دو کا ٹکراؤ

ہے۔ وہ زندگی جو میں نے کہی ہے کہ جو ان چیزوں کو قابلِ نفرت سمجھ کر غاروں میں چلے جاتے ہیں یا ویسے ہی اپنے اندر کے غار میں گم ہو جاتے ہیں' ان کو تو وہ مرفوع القلم سمجھتا ہے یعنی اس قابل ہی نہیں سمجھتا کہ اسے سامنے لائے۔ اسی لیے قرآن نے اپنے آپ کو مذہب کا حریف نہیں کہا' مذہب کی دنیا کو وہ گفتگو کے قابل ہی نہیں سمجھتا۔ وہ کہتا ہے کہ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ (9:33) دنیا کے جو زندگی کے نظام ہیں ان کے ساتھ اس کا تقابل ہوگا' اس سے اس کا موازنہ کرو اور یہ ان تمام نظام ہائے حیات کے اوپر غالب آکر رہے گا۔ وہ نظام زندگی نہیں ہے جس کو آپ روحانیت کا فریب کہتے ہیں۔ نظامِ زندگی تو وہ ہے جو زندہ رہنا چاہتا ہے اور زندگی کے اندر چلتا ہے۔ اب ہمارے سامنے یہ دو گروہ آگئے۔ اس پس منظر میں آپ نے دیکھا کہ ہم یہاں بیسویں آیت تک پہنچے تھے۔

برادرانِ عزیز! اس نظری تمہید کے بعد اب وہ اس چیز کو عملاً سامنے لاتا ہے کہ یہ دو گروہ ہیں۔ وہ کیا کرتے ہیں اور ان کی روشِ زندگی کیا ہوتی ہے؟ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ (2:21) یہ دیکھیے کہ خدائے رب العالمین' الناس کو مخاطب کرتا ہے۔ یہاں مومن اور کافر کی تفریق بھی ابھی نہیں ہوئی' پوری انسانیت مخاطب ہے' کہا ہے کہ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ (2:21) اے نوعِ انسانی! جو عبادت کا لفظ ہے اس کے معنی آپ کے سامنے آچکے ہوئے ہیں۔ واضح رہے کہ چونکہ اب یہ درس نئے سرے سے مسلسل چل رہا ہے اور میں دیکھ رہا ہوں' سامعین بھی بہر حال مسلسل ہی اب سامنے آرہے ہیں' اس لیے جو چیزیں پہلے کہی جا چکی ہیں' میں ان کی تفصیل میں نہیں جایا کرونگا کیونکہ اس طرح سے تو ہم آگے قدم بڑھا ہی نہیں سکیں گے' اس کی طرف اشارہ کرتا ہوا آگے بڑھ جایا کرونگا۔ عبادت کے معنی آپ کے سامنے آچکے ہوئے ہیں: ''قوانینِ خداوندی کے تابع اپنے آپ کو رکھنا' اپنی تمام صلاحیتوں کو اس چینل کے اندر ڈھال لینا کہ جو اس نے اپنے قوانین کی رو سے وضع کیا ہے''۔ کہا ہے کہ اے نوعِ انسانی! اپنے آپ کو تم اس قالب کے اندر ڈھال لو' ان قوانین کے تابع زندگی بسر کرو۔ یہ ضابطۂ حیات ہے' اس ضابطۂ حیات کی کامیابی کے لیے اپنی صلاحیتوں کو صرف کرو۔

رب ہونے کے لیے یہ لازم ہے کہ وہ مخلوق کے لیے سامان نشوونما بھی پیدا کرے

یہ ضابطۂ حیات کس کا دیا ہوا ہے؟ کس کے قوانین کے تابع وہ کہتا ہے؟ کہا ہے کہ رَبَّكُمُ (2:21) غور فرمایا آپ نے! وہی بات رب کی آگئی۔ کونسا رب ہے؟ دیکھیے اب کمال! خَلَقَكُمْ (2:21) پہلی چیز تخلیق کی ہے' پیدائش کی ہے۔ آپ دیکھیے کہ اس پیدائش کے ساتھ ہی اس نے کہا یہ ہے کہ جو خالق ہے' اس کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ رب ہو۔ اور اسی لیے اس نے اپنے آپ کو احسن الخالقین کہا ہے' وہ The only خالق نہیں ہے' خالقین اور بھی وہ Accept (تسلیم) کرتا ہے۔ اور یہ الگ بات ہے کہ خود اس کی جو تخلیق ہے وہ حسن کے کامل معیار پر پوری اترتی ہے' وہ احسن ہے' اوروں میں کہیں نہ کہیں' کچھ کمی رہ جائے گی لیکن خالقین تو وہ ہیں اور جو خالق ہے اس کے لیے

وہ کہتا ہے کہ اس کا رب ہونا ضروری ہے۔ یہ پیدا کرنے والے کی ذمہ داری ہو جاتی ہے' یہ جبلی طور پر حیوانات کے اندر ہمارے سامنے آتی ہے اور انسانوں کے اندر بھی کسی حد تک آتی ہے۔

انسان احسن الخالقین کے نزدیک حیوانوں سے بدتر کیوں ہے؟

انسان تو عجیب قسم کا حیوان واقع ہوا ہے' جسے قرآن نے کہا ہے کہ یہ حیوانوں سے بھی گیا گزرا ہے۔ وہ جو چیزیں جبلی طور پہ کرتے ہیں' یہ کم بخت اتنا بھی تو نہیں کرتا۔ حیوانوں میں کوئی مثال ایسی نہیں ملے گی کہ اس نے بچہ پیدا کیا ہو اور وہ اس کی نشو و نما نہ کرے۔ انسان کی کیفیت یہ ہے کہ یہ پیدا کرتا ہے لیکن نشو و نما نہیں کرتا بَلۡ هُمۡ اَضَلُّ (7:179) قرآن جو ان انسانوں کو حیوانوں سے بدتر سمجھتا ہو' جو اپنے آپ کو احسن الخالقین کہہ رہا ہے' اگر وہ رب نہ بنے تو وہ کیا ٹھہرا۔ خَلَقَكُمۡ وَ الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِكُمۡ (2:21)۔ آپ غور کیجیے کہ اس کے ساتھ یہ کہنا کہ تم سے پہلے جو گزر چکے ہیں' اسے بھی اس نے پیدا کیا تھا۔ اب ہمیں اس سے کیا غرض!! ہمارے ساتھ تو ہماری بات کیجیے لیکن یہ جو چیز قرآن کہہ گیا ہے' یہ بڑی عظیم چیز ہے۔ یہ جو ہماری موجودہ نسل ہے' یہ تو تسلسل میں آ رہی ہے پہلے جو گروپ انسانوں کا ہوا تھا اس سے مسلسل چلی آ رہی ہے' درمیان میں اگر اس نسلِ انسانی میں Gap (خلا) آ جاتا تو کہاں ہوتے ہم۔ حیوانی زندگی کے اندر بہت سی Species (انواع) ایسی گزری ہیں کہ ان کے ہاں درمیان میں انقطاع (Interruption) ہو گیا۔ Interruption (انقطاع) ہوا تو پھر وہ دوبارہ وجود میں نہیں آئیں۔ وہ جو تسلسل ہے یہ تخلیق کا ہے جس کی وجہ سے ایک Species (نوع) جو ہے وہ قائم رہتی ہے۔ اور بجائے خویش جو اس کا تسلسل ہے' یہ بھی تو اس کی ربوبیت کی بہت بڑی نشانی ہے۔ اگر وہ کہیں تخلیق کے بعد ربوبیت چھوڑ دے تو وہ ختم ہو جائے' آگے سلسلہ نہیں چل سکتا۔ ہمارا وجود اس پہ شاہد ہے کہ وہ مسلسل انسانیت کی ربوبیت کرتا چلا آ رہا ہے۔

اہل تصوف کے نزدیک یہ ہے کہ تمام روحوں کو ایک ہی مرتبہ پیدا کرتے ہوئے ان سے رب ہونے کا اقرار کروالیا گیا

یہاں سے ایک بات یاد آ گئی اور وہ بات بڑی اہم ہے' بڑی دلچسپ بھی ہے۔ آپ نے یہ جو روحانیت کی دنیا میں تصوف والے لوگ ہیں' ان کے ہاں 'مست الست' سنا ہو گا پھر 'روزِ الست' بھی ہے۔ پھر اس کے بعد ایک لفظ 'قالوا بلیٰ' سنا ہو گا۔ اگر شاعری سے مس ہے تو اس میں تو آپ کو معلوم ہو گا کہ اس کے اوپر ایسی ایسی مضامین آفرینی ہوتی ہے' مثلاً یہ کہ شرابِ الست میں کہیں مست چلے آ رہے ہیں' کہیں وہ قالوا بلیٰ کے اندر عجیب و غریب قسم کے لطائف تمہارے سامنے آتے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ یہ جتنی خواب آور چیزیں ہیں' وہ شیخ علی حزیں کے الفاظ میں ''تصوف برائے شعر گفتن خوب است'' ہیں۔ شاعری کے لیے تصوف بڑی عجیب چیز ہے۔ مثلاً مست الست' روزِ الست۔ یہ

کیا کچھ کہا جاتا ہے؟ یہ کہ ساری روحیں خدا نے پیدا کر دیں اور پھر ان کو بٹھا کر کہا کہ کہو! اَلَسۡتُ بِرَبِّکُمۡ (7:172)۔ عربی زبان میں اس کے معنی ہوتے ہیں ''کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں''۔ یہ جو فقرہ ہے اس میں ''لیس'' سے ''الست'' ہے۔ یہ ہے وہ الست۔ اس نے پوچھا کہ ''کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟'' کہا کہ قالوابلیٰ' انہوں نے کہا کہ ہاں جی' تم ہمارے رب ہو۔ بس یہ کہتے ہیں کہ صاحب! یہ تھا وہ عہد و پیمان جو وہاں ہو گیا ''ساہڈا تے نکاح عرشاں تے پڑھیا گیا' قالوابلیٰ جے ہو گیا[1]''۔ اے کاش! کہیں میری طرح آپ بھی ان منزلوں میں رہے ہوتے تو پھر اس قالوابلیٰ کا ''لطف'' لیتے۔

تصوف کے سلسلہ عشق نے' ہر انسان کو فطرت کے قید خانے میں مقید کر رکھا ہے

یہ اقرار وہاں ہوتا ہے۔ پھر کیا ہوا جی؟ کہ جی وہ ہر انسانی بچہ جو پیدا ہوتا ہے' وہ پہلے اقرار کر کے آیا ہوا ہوتا ہے۔ اب یہ آگے چلا۔ ایک اینٹ ٹیڑھی رکھیے تو ''تا ثریا می رود دیوار کج'' وہ دیوار پھر ٹیڑھی ہی چلتی ہے۔ اس سے یہ ہوا کہ ہر بچہ فطرت پہ پیدا ہوتا ہے۔ کیا معنی جی اس کے؟ کہا کہ خدا کا اقرار لیے ہوئے پیدا ہوتا ہے۔ کہ جی وہ جو ہمارے ہاں ساری دنیا اسے گالیاں دیتی پھرتی ہے وہ کیا ہے۔ کہ جی یہ فطرت بدلتی ہے۔ یعنی فطرت ایسی چیز ہے جو بدل جاتی ہے!!۔ او کم بخت! فطرت تو کہتے ہی اسے ہیں جو بدلتی نہیں ہے۔ آگ کی فطرت ہے کہ وہ حرارت دیتی ہے' پانی کی فطرت ہے کہ نشیب کی طرف جاتا ہے۔ جونہی اس کی وہ فطرت بدلی وہ آگ ہی نہیں رہتی۔ فطرت تو بدل ہی نہیں سکتی۔ کہا کہ جی! اس کی فطرت بدلتی ہے!! کیونکہ اس نے اقرار کیا تھا۔ وہ کہتا ہے کہ صاحب! ہمیں تو کچھ پتہ ہی نہیں کہ ہم نے اقرار کیا تھا۔ کہتا ہے کہ ٹھیک ہے' تمہیں نہ پتہ ہو مگر اقرار کیا تو تھا یومِ الست۔ اب مانتے نہیں ہو! تم نے قَالُوۡا بَلٰی (7:172) کہا تھا۔ اچھا جی۔ یہ سارا سلسلہ اس الست اور قالوابلیٰ کا قرآن کی ایک آیت پہ چلتا ہے۔

قرآن حکیم کی روشنی میں یوم الست اور قالوابلیٰ کا مفہوم نوع انسانی کی ربوبیت کا ہی ثبوت ہے

اس پس منظر کو سامنے لے آئیے جو میں نے ابھی دہرایا ہے۔ اس وقت کی موجودہ نوعِ انسانی اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ جس نے نسلِ انسانی کو پیدا کیا ہے وہ اس کی ربوبیت اور اس کی حفاظت کرتا ہوا چلا آ رہا ہے اسی لیے ہم آج انسان یہاں دنیا میں موجود ہیں۔ اگر یہ اس کی ربوبیت اس انداز سے نہ رہتی تو ہم باقی نہ رہتے۔ کہا ہے کہ وَ اِذۡ اَخَذَ رَبُّکَ مِنۡۢ بَنِیۡۤ اٰدَمَ مِنۡ ظُہُوۡرِہِمۡ ذُرِّیَّتَہُمۡ (7:172)۔ خدا نے انسانوں کی نوع یا Species (انواع) کو ان کی پشت[2] سے پیدا کرنا شروع کیا۔ یہ عربی زبان کا ایک محاورہ ہے۔

---

[1] ہمارے ہاں تو یہ ہے کہ نکاح ''عرش'' پہ پڑھا گیا۔ یہ قالوابلیٰ جو ہو گیا۔

[2] یعنی بنی آدم کی نسل کا سلسلہ پشتہا پشت سے جاری ہے۔

آپ بھی تو صلبی رشتہ کہتے ہیں، اس کے معنی پشت کا ہوتا ہے۔ یہ نسلی طور پر جو بات آگے چلتی ہے اسے پشت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جب نوعِ انسانی کو بنی آدم کو انسانوں کے بیٹوں کو ان کی پشتوں سے آگے چلایا۔ یہ مِنۡ ظُهُوۡرِهِمۡ ذُرِّيَّتَهُمۡ (7:172) خود بتا رہا ہے کہ انسانوں کی نسل کو اس طرح پشت سے آگے بڑھایا۔ وَ اَشۡهَدَهُمۡ عَلٰٓى اَنۡفُسِهِمۡ (7:172) غور طلب ہے، عزیزانِ من! اور ان کے آج کے وجود کو ان کے اوپر ہم نے دلیل ٹھہرایا۔ کس بات کی دلیل ٹھہرایا؟ اس کی کہ اَلَسۡتُ بِرَبِّكُمۡ (7:172) کہو ہم نے تمہیں پیدا کیا تھا تو ہم نے ربوبیت کی ہے یا نہیں۔

نظامِ ربوبیت کے تحت نوعِ انسانی کے وجود کو بیان کرنے میں قرآن حکیم کا حسین انداز

عزیزانِ من! اسے کہا کہ وَ اَشۡهَدَهُمۡ عَلٰٓى اَنۡفُسِهِمۡ (7:172)۔ تمہارا وجود اس کی زندہ شہادت ہے تم اس سے کیسے انکار کر سکتے ہو۔ وہ Species (انواع) جو درمیان میں ختم ہو گئی ہیں ان سے تو آج ہم پوچھیں گے ہی نہیں، پوچھیں کس سے؟ وہ تو ہیں ہی نہیں۔ جو جہاں ختم ہوئی تھیں، ان سے پوچھیں گے تو وہ کہیں گے کہ وہاں تک تو ٹھیک تھا، آگے تم رب نہیں رہے تھے۔ وہ کہے گا کہ پھر آگے میں نے تمہیں پیدا بھی نہیں کیا تھا۔ یہ جنہیں آج وہ پیدا کر رہا ہے، ان سے پوچھ رہا ہے اور پوچھ رہا ہے اپنے حسین انداز میں۔ کیا انداز ہے یہ بات کہنے کا! یہ نہیں ہے کہ تم سے پوچھ کر، تم سے اقرار لے رہا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تم انکار کرتے ہو تو کرتے جاؤ، تمہارا تو وجود اس کی شہادت دیتا ہے، نوعِ انسانی کا اس سے مسلسل وجود اس کی شہادت دے رہا ہے۔ اَلَسۡتُ بِرَبِّكُمۡ (7:172) کہا ہے۔ تم زبانِ حال سے نہ کہو، تمہاری موجودگی کہہ رہی ہے قَالُوۡا بَلٰى (7:172) کہا کہ ہم نے اس لیے یہ بات تم سے کہی ہے کہ یہی سارا پیدا کرنے والا، ربوبیت کا ذمہ دار محور ہے۔ ہم نے پیدا کیا، ہم ربوبیت کے ذمہ دار ہیں، تمہارا وجود اس کی شہادت دیتا ہے کہ ہم خالق بھی ہیں، ہم رب بھی ہیں۔

انسان کی جواب طلبی اس پر ہوگی کہ اس نے اپنے ہاں نظامِ ربوبیت کیوں قائم نہیں کیا

یہ بات ہے قَالُوۡا بَلٰى ۚ شَهِدۡنَا (7:172) تمہارا وجود یہ کہہ رہا ہے کہ ہم شہادت دیتے ہیں۔ کہا ہے کہ شَهِدۡنَا ۚ اَنۡ تَقُوۡلُوۡا يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنۡ هٰذَا غٰفِلِيۡنَ (7:172) یہ ہم اس لیے تم کو بار بار بتا رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ جب تمہاری غلط روش کے خلاف وہ عظیم انقلاب آئے اور تم سے یہ کہا جائے کہ تم نے ربوبیتِ عالمینی کا کیوں انتظام نہیں کیا تھا، تو تم یہ نہ کہہ سکو کہ ہمیں پتہ نہیں چلا تھا کہ تیرا پروگرام ربوبیت چاہتا ہے یا تباہی چاہتا ہے۔ ہمیں معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ تیرا پروگرام تعمیر چاہتا ہے یا تخریب چاہتا ہے۔ یہ ہلاکت چاہتا ہے یا تعمیر چاہتا ہے، یہ اس لیے ہے۔ انداز ہے قرآن کا۔ نوعِ انسانی کی موجودگی اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ وہ

رب ہے۔اب آپ کی بات سمجھ میں آئی کہ خَلَقَکُمْ وَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ (2:21) اس چیز کے کیا معنی ہیں' یہ کتنی گہری چیز ہے جو ساتھ کہہ گیا ہے۔کاہے کے لیے یہ فَاعْبُدُوْا ہے؟ تاکہ اس کے نظام کے تابع اپنے آپ کو رکھو۔کیوں رکھو؟ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ (2:21) تاکہ تم راستے کے خطرات سے محفوظ رہ سکو۔

کتاب وحکمت کا قرآنی مفہوم اوراس کی اہمیت

قرآن میں آپ نے یہ دیکھا ہوگا کہ کتاب اور حکمت ہم نے نازل کی تھی۔قرآن یہ کہتا ہے۔کتاب کے کیا معنی ہیں؟ حکمت کے کیا معنی ہیں؟ کتاب Law (قانون) کو' اور حکمت The why of it (اس کی لِم) کو کہتے ہیں۔یہ ایسا کیوں ہے؟ کیوں کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ یہ جو قانون ہے' اگر اس کے اوپر عمل کرو گے تو وہ یہ نتیجہ پیدا کرے گا۔ایسا کرو تاکہ ایسا ہو جائے' آگ جلاؤ' چولہے پہ دیگچی رکھو تاکہ پانی گرم ہو جائے۔اس میں یہ ''جو آگ جلاؤ' دیگچی رکھو ہے'' اسے کتاب کہتے ہیں۔یہ حکم ہے۔یہ حکم کیوں ہے؟ تاکہ پانی گرم ہو جائے۔یہ اس آگ جلانے اور دیگچی رکھنے کی ''حکمت'' ہے۔قرآن کا اعجاز ہے کہ اس نے جہاں قانون دیا ہے' جہاں حکم دیا ہے' اس کے ساتھ بتا دیا ہے تاکہ ''یہ ہو''۔یہ 'کیوں' بتا دیا ہے۔اگر یہ نہ بتا دیا جائے تو پھر تو ہم اپنے ہی دل میں فیصلہ کرلیں کہ ہو رہا ہے۔اس نے جو کہا ہے کہ ہمارے قوانین کے تابع زندگی بسر کرو تاکہ تمہاری دنیا کی زندگی خوشگوار ہو جائے یہ سارا کچھ ہو جائے۔اگر یہ 'تاکہ' نہ دیتا تو ہم جو اس پہ عمل جس طرح سے جی چاہے کرتے' یہ ٹیسٹ کرنے کا کوئی معیار تھا کہ اس کے مطابق عمل ہو رہا ہے یا نہیں۔امی نے کہا: او بیٹی! آگ جلاؤ' دیگچی اس کے اوپر رکھ دو۔ہاں امی! میں نے کرلیا ہے' دیگچی رکھ دی ہے۔وہ پانچ منٹ کے بعد آئی' اس نے آکر ڈھکنا اٹھا کر دیکھا تو پانی ٹھنڈا تھا۔''او تینوں میں کہیا سی کڑیے! آگ جلا' دیگچی اتے رکھ دے۔امی! میں تے جلا کے آئی سی [1]''۔یعنی امی نے چولہا نہیں دیکھا ہے۔کس بات سے اس نے دیکھ لیا کہ اس نے آگ نہیں جلائی یا جلائی تھی تو بجھ گئی ہے؟ اس نے دیکھا کہ پانی گرم نہیں ہوا۔وہ کہتی ہے کہ میں نے جلائی ہے۔وہ یقین سے کہتی ہے کہ جلائی ہے۔پھر پانی کیوں گرم نہیں ہوا؟ وہ جو لَعَلَّکُمْ تھا' اس نے بتا دیا کہ نہیں جلائی۔لَعَلَّکُمْ اس لیے دیا ہے کہ فریبِ نفس میں نہ رہو' اپنے ذہن میں مطمئن ہو جاؤ۔اطمینان کا تو لفظ ہی نہیں بولنا چاہیے' فریب ہی کا لفظ ہے۔اپنے آپ کو فریب نہ دے کہ تعمیل ہو رہی ہے۔اس کے قوانین کی تعمیل کے لیے پرکھنے کا ذریعہ یہ ہے کہ جو اس نے لَعَلَّکُمْ کہا ہے' تاکہ یہ ہو جائے' یہ دیکھو کہ وہ ہو رہا ہے یا نہیں۔ہو رہا ہے تو اس کے مطابق عمل ہو رہا ہے' یہ نتیجہ نہیں نکل رہا تو اس کے مطابق عمل نہیں ہو رہا خواہ تمہاری رسومات' تمہاری Form (ہیئت)' تمہارے یہ جو کچھ مظاہر کرتے ہو' اس کے مطابق ہی کیوں نہ ہو۔'' آگڈی گڈے

---

[1] اے لڑکی! میں نے تجھے کہا تھا کہ آگ جلاؤ اور اس پر دیگچی رکھ دو۔امی جان! میں تو آگ جلا کر آئی تھی۔

دادی تے ویاہ ہوندا ہوندا اے' او سارا ای کچھ او کر دیندیاں کڑیاں جو کچھ ویاہ اچ دیکھ کے اوندیاں نیں ❶'' اگر یہ لَعَلَّکُمْ نہیں ہوتا' تو پھر شادی نہیں ہوتی۔ آپ نے غور فرمایا کہ کتاب کے ساتھ حکمت دینے کی کیا ضرورت ہے!! ایسا کرو کہ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ (2:21) تا کہ تم زندگی کی خطرناک گھاٹیوں سے بچ کر چلو۔ آپ نے دیکھا ہے وہ جو اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ (7:172) کی ربوبیت کی شہادت دلوائی تھی اگر انسانیت میں یہ تتقون نہ ہوتا' خطرناک گھاٹیوں سے نہ بچایا جاتا' تو آج یہ نوع باقی نہ ہوتی۔

ہمارے ہاں عبادت کی جگہ پرستش نے لے لی ہے

کہا ہے کہ اب جو تم باقی ہو تو اس کے لیے یہ کرو جو ہم کہتے ہیں۔ بہت اچھا جی! ہم آپ کی عبادت کر لیا کریں گے' پہلے بھی تو ہم کر ہی رہے ہیں۔ کیا کر رہے ہو؟ پرستش کر رہے ہیں۔ اگر قرآن یہیں چھوڑ دیتا تو ہر ایک کو اپنے اپنے ہاں اطمینان ہو جاتا کہ پرستش کر رہے ہیں۔ پہلے رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ (2:21) تھا کہ جس نے تمہیں پیدا کیا۔ اس کے ساتھ آیت ختم نہیں ہوتی اسکے بعد فل سٹاپ نہیں ہے' یہ الذی سے آگے چلتا ہے اس کو پڑھتے ہیں تا کہ بات وہاں نہ ختم ہو جائے۔ کہا ہے الَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّ السَّمَآءَ بِنَآءً وَّ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّکُمْ (2:22) خالق کی ربوبیت یہ تھی۔ تمہیں پیدا کیا بلکہ اچھی مائیں تو بچے کے پیدا ہونے سے پہلے ہی اس کی ربوبیت کا سامان تیار کر لیتی ہیں۔ تمہاری پیدائش سے پہلے سارا سامان ہم نے مہیا کر دیا۔ یہ زمین دونوں ہی کام دے رہی ہے: رہائش کے لیے نہایت عمدہ فرش' پرورش کے لیے تمہاری غذا کے خزانے جس کے اندر دبے ہوئے ہیں۔ آسمان سقفِ محفوظ ہے۔ یہ بات زیادہ وقت لے لے گی' اس کی تشریح وہاں چل کر کرونگا جہاں یہ لفظ آئے گا۔ یہاں اتنا ہی کہہ دوں۔

نظام ربوبیت کے سلسلہ میں خلا کے اندر پروٹیکشن (حفاظت) کا حیرت انگیز طریق کار

کسی سائنٹسٹ سے پوچھ لیجیے گا کہ ہم جو یہاں اس سطحِ ارض کے اوپر زندہ ہیں' وہ صرف اس Atmosphere (فضا) کی وجہ سے ہیں جو قریباً دس میل کا ہمارے اوپر' سر پہ' ہے ورنہ اس سے اوپر جو اجرام فلکی ہیں ان سے ہر سیکنڈ میں لاکھوں کروڑوں کی تعداد میں اتنے اتنے بڑے پہاڑ گرتے رہتے ہیں۔ اگر ایک آدھ نیچے آ گرے ساری صفحۂ ارض کا کچومر نکال دے۔ یہ جو آپ کے ہاں کی اوپر Protection (حفاظت) ہے اس کے اوپر ایک گردش کی تیزی ہے۔ وہ اس گردش میں اتنے اتنے بڑے پہاڑوں کو پیس کر راکھ کا ڈھیر بنا دیتی ہے۔ آپ کو پتہ ہے یہ تیز گردش سے راکھ کا ڈھیر کیسے بنتا ہے؟ یہ آج کل شیک (Shake) کرنے والی مشینیں' مثلاً ملک شیک

---

❶ یہ گڈے گڑیا کی بھی تو شادی رچاتے ہیں۔ لڑکیاں وہ سب کچھ کرتی ہیں جو شادی بیاہ پر وہ دیکھ کر آتی ہیں۔

(Milk Shake) آئی ہوئی ہیں' اس کے اندر Solid (ٹھوس) چیزیں ڈال دیجیے' بٹن دبائیے۔ پیسنے کے لیے کچھ مشینری نہیں اس کے اندر' نہ سِل' نہ بٹا' نہ پیسنے کی چکی' کچھ نہیں۔ ایک اتنی سی لوہے کی ڈنڈی ہے وہ اتنی تیز گردش کرتی ہے' یہ نمک' یہ مرچیں' یہ مسالے دو سیکنڈ میں پیس کر راکھ کر دیتی ہے۔ حرکت کی تیزی میں آپ کو کیا پتہ ہے کہ یہ کیا توانائی اس کے اندر ہوتی ہے۔ یہ آپ کے ہاں کی جو گردش ہے' یہ اس کو اور ان چیزوں کو اس طرح سے راکھ کر دیتی ہے۔

کائنات کا ذرہ ذرہ انسانی جسم کی نشوونما کے لیے مصروف کار ہے

یہ جو آپ کے ہاں روشنی پہنچتی ہے' براہِ راست تو روشنی خلا میں سے پہنچ ہی نہیں سکتی' یہ وہ سورج سے چمکتے ہوئے راکھ کے ذرے ہیں جو منتور ہو کر' مستنیر ہو کر' اس روشنی سے' آپ تک پہنچتے ہیں۔ وہی چیز جس نے آپ کی ارض کو تباہ کر دینا تھا آپ کے لیے روشنی بن کر آپ کی آنکھوں کے لیے نور بن گئی ہے۔ کہا ہے کہ وَّ السَّمَآءَ بِنَآءً (2:22) جو بظاہر تمہیں اوپر نظر آتا ہے' درحقیقت تمہاری زندگی کی بنیاد اس کے اوپر ہے۔ کیا بات ہے قرآن کی! اور پھر اسی آسمان سے انتظام یہ ہے کہ پانی نشوونما کے لیے نہایت ضروری تھا۔ اسی آسمان سے مقطر' کشید کیا ہوا پانی' گھر گھر پہنچتا ہے۔ جو فالتو ہے اسے پہاڑوں کی چوٹیوں پہ ریزروائر میں' ہم منجمد کر دیتے ہیں کہ گرمی کے دنوں میں جب یہ بارش نہ ہو' تو وہ سورج کی حرارت سے پگھل کر تمہارے گھروں کے آگے پہنچتا چلا جائے۔ یہ واٹر سپلائی کا سسٹم ہے فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا (2:22) صرف تمہاری پیاس بجھانے کے لیے' زمین سے تمہارے لیے خوراک پیدا کرنے کے لیے' یہ سارے سامان کیے۔ زمین زرخیز' اس کے اندر یہ صلاحیت' پانی اس کے ساتھ' حرارت اس کے ساتھ' روشنی اس کے ساتھ ہے۔

ماں کے پیٹ میں بچے کی پرورش کا انتظام

میں پوچھتا ہوں کہ کوئی بچہ پیدائش کے وقت اپنے ساتھ ان میں سے کوئی چیز لے کر آتا ہے؟ ساتھ لے کر آنا تو الگ رہا' اس سے پہلے جہاں اس کی پرورش ہو رہی ہوتی ہے' وہاں ان میں سے کوئی شے بھی موجود نہیں ہوتی۔ ایک حرارت تو ہوتی ہے' وہ ماں کے جسم کی ہوتی ہے' سورج کی نہیں ہوتی۔ وہ ساتھ کیا لے کر آئے گا۔ ماں نے تو اس کے لیے پیدا ہونے سے پیشتر کچھ چھوٹے چھوٹے سے ''پٹولے جے ای بنائے سن ❶'' اس کائنات کے عظیم خالق نے اس کے لیے یہ سامان مہیا کر کے رکھ دیا۔ کہا ہے کہ یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا (2:21)۔ اب آپ نے سوچا ہے کہ الناس کیوں کہا گیا؟ کافر کے بچے کے لیے بھی سامان یہی ہے' مومن کے بچے کے لیے بھی یہی سامان ہے۔

---

❶ ماں نے تو یہ چھوٹے چھوٹے سے کپڑوں کے کھلونے سے ہی بنائے تھے۔

سامان نشو ونما کو باہمی طور پر قوانین خداوندی کے اصولوں کے مطابق صرف کرنا ہوتا ہے

یہ سارا سامان دیکھ لیا۔ اور اس کے بعد کہا ہے' یہ بڑے غور سے سننے کی بات ہے' عزیزانِ من! کہ یہ ہمارا نظام ہے **فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ** (2:22) یاد رکھو! یہ اس کے لفظی معنی ہو جائیں گے کہ خدا کے ساتھ تم اور انداد نہ بناؤ۔ لفظ ند ہے جس کی جمع انداد ہے۔ اس کے معنی تو کسی کے برابر کوئی اور شخص ہوتے ہیں لیکن یہ تو زبان عربی ہے۔ یہ اس قسم کا ''برابر کا'' ہے کہ وہ ایک طرف کو کھینچے' یہ دوسری طرف کو اسے کھینچے کہ یہ نہ کرو۔ یہ بات کیا ہوئی؟ کہا ہے کہ یہ سارا سامانِ نشو ونما اس لیے دیا ہے کہ رب العالمینی ہو جائے۔ جس بچے کو ہم نے پیدا کیا ہے اس بچے کا سامانِ پرورش اور سامانِ نشو ونما ہے جو ہم نے دیا ہے۔ یہ ہے ہماری ربوبیت' یہ ہیں ہم رب۔ اور اگر تم نے کوئی اس قسم کا نظام' کوئی اس قسم کا ذریعہ' پیدا کر لیا ہے کہ ہم تو اس بچے کو اس پرورش کی طرف کھینچ رہے ہیں اور تم اس رزق کو کھینچ کر کسی اور طرف کو لے جاؤ۔ تم نے خدا کے شریک بنا دیا۔ کیا آسان تھا ہمارے لیے جو ہم نے دین کو بنا دیا۔ بتوں کی پوجا نہ کرو۔ او! کیا ہو جائے گا' ان کی پوجا کرنے سے؟ اس کا کیا بن جائے گا؟ بتوں کی پوجا کرنے سے اس کا کیا بگڑ جائے گا؟ وہ ''انداد'' کہتا ہے۔ کہتا ہے کہ کوئی ایسی چیز نہ کرو کہ جدھر ہم اس سامانِ ربوبیت کو کھینچ کر لے جا رہے ہیں اس کے برعکس تم اسے کسی دوسری طرف کھینچ کر لے جاؤ۔ یہ ہے شرک۔

نظامِ ربوبیت کو عملی شکل دینے کے سلسلہ میں ہیرے کی طرح چمکتی ہوئی ایک حدیث

برادرانِ عزیز! وہ جو رسول اللہ ﷺ کی حدیث ایک چمکتا ہوا ہیرا ہے کہ ''جس بستی میں رات کو کوئی ایک شخص بھوکا سو گیا' اس بستی سے خدا اپنی حفاظت کی ذمہ داری کھینچ لیتا ہے''۔ دیکھا **لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ** (2:21) کے معنی کیا ہو گئے! تا کہ تم محفوظ رہو' تم سے حفاظت کی ذمہ داری نہ کھینچ جائے۔ اس بستی والوں نے کیا کیا تھا؟ اس کو رب نہیں رہنے دیا' وہ رزق جو اس کے پاس جانا چاہیے تھا اس کو کوئی اور لے گیا ہے۔

رزق کے سرچشموں کو ذاتی ملکیت سمجھ لینا شرک ہے

برادرانِ عزیز! یہ لوگ جتنا کچھ سمیٹ لیتے ہیں' یہ کونسا وہ رزق ہے جس کو وہ سمیٹ لیتے ہیں؟ یہی ہے جو کسی کے حصے میں آنا تھا۔ اگر اتنا فالتو پڑا ہوا ہو تو وہ سمیٹتے چلے جائیے' اس پہ تو یہ بات ہی نہیں ہے لیکن اگر صورت یہ ہو مثلاً یہ کہ دس سال پہلے کی جو رپورٹ تھی' اس کی رو سے دنیا کی پچاس فیصد آبادی رات کو بھوکی سوتی تھی۔ اب جو ان کی رپورٹ آئی ہے تو اس کے اندر 75 فیصد ہے۔ یہ ان کے حصے کا رزق اپنی طرف کون کھینچ رہا ہے؟ یہ **اَنْدَادً** ہیں جو **مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا** (2:165) ہیں اور **وَّ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ** (2:22) یہ نہیں ہے

کہ تم کہیں غفلت میں، بے خبری میں یہ کچھ کرتے ہو، تم یہ چیز جانتے ہو کہ اپنی نشو و نما کے لیے جتنا مجھے ضرورت تھی، وہ مل گیا ہے، اب یہ جو میں لے رہا ہوں، یہ کسی دوسرے کی نشو و نما کے لیے تھا، اس کو رب نے دیا تھا۔ میں نے کہا ہے کہ اسے قرآنِ کریم نے شرک قرار دیا ہے۔ رزق کے سرچشموں کو ذاتی ملکیت سمجھ لینا قرآن کی رو سے، کفر اور شرک دونوں ہیں۔ یہاں میں نے صرف یہ کہا ہے کہ یہ شرک ہے۔ قُلْ اَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِیْ (41:9) کہو! تم ہو وہ لوگ؟ کیا انداز ہے بات کرنے کا! تم ہو وہ۔ کون ہو تم؟ خدا کا کفر کرتے ہو۔ وہ خدا الَّذِیْ خَلَقَ الْاَرْضَ فِیْ یَوْمَیْنِ (41:9) جس نے پہلے اس زمین کو دو Periods (ادوار) میں ایسے پیدا کیا کہ پہلا پیریڈ ایسا تھا جس کے اندر اس پہ کوئی ذی حیات رہ نہیں سکتا تھا، اس کی حرارت اتنی زیادہ تیز تھی۔ پھر اس کے بعد اس کو Cool down (ٹھنڈا) کیا، پھر یہ دوسرا پیریڈ شروع ہوا جس میں تم اس میں بسنے کے قابل ہو گئے۔ پہلی چیز تو اس نے یہ کی۔ تم اس خدا سے انکار کرتے ہو!! وَتَجْعَلُوْنَ لَهٗۤ اَنْدَادًا (41:9) یعنی اس کے "ند" بنتے ہو۔ ذٰلِكَ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ (41:9) وہ تو رب العالمین ہے۔ تم یہ کیا کرتے ہو؟ یہ کھینچ کھینچ کر اپنی طرف لیے چلے جا رہے ہو۔ یہ کفر ہے، شرک ہے۔ وَجَعَلَ فِیْهَا رَوَاسِیَ مِنْ فَوْقِهَا وَبٰرَكَ فِیْهَا (41:10) اتنے اتنے بڑے پہاڑ کھڑے کیے۔ کبھی اس پہ آؤں گا تو عرض کروں گا کہ یہ جو پہاڑ ہیں، یہ ہماری نشو و نما میں زمین کے اندر کیا کچھ کرتے ہیں۔ بٰرَكَ فِیْهَا (41:10) یہ جو برسات میں اس قسم کا گھنا سیاہی مائل سبزہ پیدا ہوتا ہے، اسے برکت کہتے ہیں۔ ہم نے اس کے اندر سامانِ برکت دیدیا۔ وَقَدَّرَ فِیْهَاۤ اَقْوَاتَهَا فِیْۤ اَرْبَعَةِ اَیَّامٍ (41:10) چار فصلوں میں موسموں کی تبدیلیاں ہم نے پیدا کیں تاکہ اس کے اندر سے غذا پیدا ہوتی چلی جائے۔ کیا تم اس خدا کا انکار کرتے ہو؟ اس کے ساتھ شریک مقرر کرتے ہو، جس ربوبیت عالمینی کے لیے اس نے پیدا کیا ہے، تم دوسری طرف اس کو کھینچتے ہو۔ سنیے، عزیزانِ من! بات اس نے کیسے صاف کی؟ ہم نے یہ سارا سلسلہ پیدا کیا، کاہے کے لیے پیدا کیا؟ سَوَآءً لِّلسَّآئِلِیْنَ (41:10) تاکہ ہر ضرورت مند کے لیے یکساں کھلا رہے۔ کسی ضرورت مند کے لیے اس چشمے کا رک جانا، برادرانِ عزیز! کفر ہے، شرک ہے۔

نبی اکرمؐ کا ارشاد ہے کہ خدا کی زمین خدا کے بندوں کے لیے کھلی رکھو

نبی اکرم ﷺ کی ایک اور اسی قسم کی تابندہ حدیث اسی آیت کا مفہوم لیے ہوئے ہمیں ملتی ہے۔ وہ چار الفاظ ہیں! فرمایا ہے کہ اللہ کی زمین اللہ کے بندوں کے لیے ہے۔

حضرت صالحؑ کے عہد میں میری اور تیری کے تصور کے تحت جاگیردارانہ ذہنیت کا خاتمہ

قومِ ثمود کا ذکر آ رہا ہے۔ حضرتِ صالحؑ ان کی طرف مبعوث ہوئے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ابھی انسانوں کا دارومدار مویشی پالنے پہ

گیارھواں باب: سورۃ البقرۃ (1)' (آیات 23 (مسلسل) تا 25)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

وَاِنۡ كُنۡتُمۡ فِىۡ رَيۡبٍ مِّمَّا نَزَّلۡنَا عَلٰى عَبۡدِنَا فَاۡتُوۡا بِسُوۡرَةٍ مِّنۡ مِّثۡلِهٖ وَادۡعُوۡا شُهَدَآءَكُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ ۞ فَاِنۡ لَّمۡ تَفۡعَلُوۡا وَلَنۡ تَفۡعَلُوۡا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِىۡ وَقُوۡدُهَا النَّاسُ وَالۡحِجَارَةُ ۖۚ اُعِدَّتۡ لِلۡكٰفِرِيۡنَ ۞ وَبَشِّرِ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمۡ جَنّٰتٍ تَجۡرِىۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ ؕ كُلَّمَا رُزِقُوۡا مِنۡهَا مِنۡ ثَمَرَةٍ رِّزۡقًا ۙ قَالُوۡا هٰذَا الَّذِىۡ رُزِقۡنَا مِنۡ قَبۡلُ ۙ وَاُتُوۡا بِهٖ مُتَشَابِهًا ؕ وَلَهُمۡ فِيۡهَآ اَزۡوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۙ وَّهُمۡ فِيۡهَا خٰلِدُوۡنَ ۞

عزیزانِ من! آج اگست 1968ء کی 11 تاریخ ہے اور ہم قرآنِ کریم کے درسِ نو کے سلسلے میں سورۃ البقرۃ کی آیت 23 تک گزشتہ اتوار کو پہنچے تھے' وہیں سے سلسلۂ کلام آگے چلتا ہے: (2:23)۔

قدرت نے نوعِ انسانی کے لیے ہر قسم کا سامانِ زیست پوری کائنات میں بکھیر رکھا ہے

وہاں بات یہ ہوئی تھی کہ یٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اعۡبُدُوۡا رَبَّكُمُ الَّذِىۡ خَلَقَكُمۡ وَالَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِكُمۡ لَعَلَّكُمۡ تَتَّقُوۡنَ (2:21) تم قوانینِ خداوندی کی محکومیت اختیار کرو۔ اور اس کے بعد کہا یہ تھا کہ الَّذِىۡ جَعَلَ لَكُمُ الۡاَرۡضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً وَّاَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخۡرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزۡقًا لَّكُمۡ (2:22)۔ یہ تھا اس کے اندر نقطۂ ماسکہ کہ خدا نے تمہاری تخلیق کے بعد ربوبیت کا ذمہ لیا اور اس ذمہ داری کو پورا کرنے کے لیے اس نے زمین کے دسترخوان پر اتنا سامانِ زیست بکھیر دیا۔ اس کا مقصد یہ: رِزۡقًا لَّكُمۡ تھا اور یٰۤاَيُّهَا النَّاسُ سے تخاطب ہے۔ کسی خاص گروہ سے نہیں' جماعت سے نہیں' مومنین سے نہیں' الناس سے ہے' یہاں پوری نوعِ انسانی کو مخاطب کیا گیا ہے اور رِزۡقًا لَّكُمۡ کہا گیا ہے۔ گویا خود قرآن نے یہ تخصیص سے بتا دیا کہ یہ جو سامانِ زیست یعنی رزق دیا گیا ہے' وہ لَكُمۡ ہے' پوری الناس کے لیے ہے۔ اور کہا یہ گیا کہ وَلِلّٰهِ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الۡاَرۡضِ (53:31) یہ خدا کی ملکیت ہے' مگر اس میں جو سامانِ زیست ہے وہ لَكُمۡ ہے یعنی تمہارے فائدے کے لیے دیا گیا ہے' الناس کے فائدے کے لیے

دیا گیا ہے۔ یہ ہے اس سے مقصد۔ اس پر خدا کے علاوہ کسی اور کی ملکیت کا تصور نہیں ہے اس لیے فَلَا تَجۡعَلُوۡا لِلّٰہِ اَنۡدَادًا وَّ اَنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ (2:22) جب تم یہ جانتے ہو کہ یہ تمہاری ملکیت نہیں ہے، نہ ہوسکتی ہے، تو پھر اس ملکیت میں کسی اور کو شریک کرنا خدا کا شریک اور ہمسر بنانا ہے۔ ایسا نہ کرنا۔ یہ تھا سابقہ درس میں موضوعِ سخن۔

برادرانِ عزیز! اس کے بعد میں نے اگلی آیت کو چھوا تھا کہ وَ اِنۡ كُنۡتُمۡ فِیۡ رَیۡبٍ مِّمَّا نَزَّلۡنَا عَلٰی عَبۡدِنَا (2:23) اگر تمہارے دل میں اس سے ایک اضطرابی کیفیت پیدا ہو کہ یہ شروع سے ایک مسلمہ اصول چلا آ رہا تھا کہ یہ تمام چیزیں ذاتی ملکیت میں ہوتی ہیں اور اس کے بعد یہ ایک نئی، اتنی ہی بڑی عظیم انقلابی چیز کہی جا رہی ہے اور اس کے متعلق دعویٰ یہ ہے، یہ میں نہیں کہہ رہا، یہ وہ خدا کہہ رہا ہے جس کی ملکیت میں یہ چیز ہے، مالک خود اس کے متعلق کہہ رہا ہے کہ میں اپنی اس ملکیت میں کسی اور کو شریک نہیں کرتا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ واقعی مالک کہہ رہا ہے یا یونہی یہ انسان از خود اپنی طرف سے ایک نیا قانون دے رہا ہے کہ پہلے قوانین بھی انسانوں کے بنائے ہوئے تھے اور ان قوانین کے اوپر ایک انسان ہی ایک دوسرا قانون دیتا ہے جو ان تمام قوانین کی تردید کر رہا ہے، تو صورت کہیں یہ تو نہیں ہے؟

کوئی ہے جو اس قندیلِ آسمانی کی طرح اس کی مثل ایک بات بھی پیش کرے!

کہا ہے کہ اگر تمہارے دل میں یہ خیال پیدا ہو تو یہاں سے آگے وہ بات آتی ہے۔ قرآن کا یہ جو دعویٰ ہے کہ فَاۡتُوۡا بِسُوۡرَۃٍ مِّنۡ مِّثۡلِہٖ (2:23) پھر تم اس کی مثل بنا کر لاؤ۔ یہ ایک جگہ نہیں، کئی ایک مقامات پر قرآن نے اس تحدی کو دہرایا ہے۔ ایک جگہ کہا ہے کہ قرآن کے مقابلے میں دوسرا قرآن لاؤ۔ قُلۡ لَّئِنِ اجۡتَمَعَتِ الۡاِنۡسُ وَ الۡجِنُّ عَلٰۤی اَنۡ یَّاۡتُوۡا بِمِثۡلِ ھٰذَا الۡقُرۡاٰنِ لَا یَاۡتُوۡنَ بِمِثۡلِہٖ وَ لَوۡ کَانَ بَعۡضُہُمۡ لِبَعۡضٍ ظَہِیۡرًا (17:88) جن وانس تمام کے تمام بھی اگر مل جائیں اور اجتماعی طور پر ایک دوسرے کی مدد کرتے ہوئے کوشش کریں کہ اس قرآن کی مثل کوئی قرآن لے آئیں تو وہ نہیں لاسکیں گے۔ یعنی قرآن نے اتنا ہی نہیں کہا ہے کہ تم لاؤ بلکہ اس کے ساتھ یہ چیز کہہ دی کہ تم ایسا نہیں کرسکو گے۔ یہاں پورے قرآن کے متعلق ہے۔ دوسرے مقام میں اس چیلنج کو یوں کہیے، کہ ذرا سا اس کو نرما دیا گیا اور جھکا دیا گیا اور کہا گیا کہ قُلۡ فَاۡتُوۡا بِعَشۡرِ سُوَرٍ مِّثۡلِہٖ مُفۡتَرَیٰتٍ (11:13) اس کی دس سورتوں کے برابر کی مثل تم لے آؤ۔ وَّ ادۡعُوۡا مَنِ اسۡتَطَعۡتُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ (11:13)۔ یہاں بھی پھر وہی چیز کہی کہ ٹھیک ہے جس جس کو جی چاہے تم اپنے ساتھ ملا لو، دنیا بھر کے مفکرین، واضعینِ قوانین و دساتیر، ادیب، Reformers (مصلحین مذاہب)، جن کو جی چاہے، مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ خدا کو نکال کر بلا لیجیے، اس کے بعد یہ کہا ہے کہ تم یہ نہیں کرسکو گے۔ یہاں دس سورتوں کے متعلق کہا ہے۔ ایک مقام پہ اس کے متعلق کہا ہے کہ تم ایک بات ہی اس جیسی کر کے بتا دو: فَلۡیَاۡتُوۡا بِحَدِیۡثٍ مِّثۡلِہٖۤ اِنۡ کَانُوۡا صٰدِقِیۡنَ (52:34)۔

قرآنِ حکیم کا یہ دعویٰ زمان ومکاں کی حدود سے بھی بالاتر ہے

یہ جو ابھی میں نے آیت تلاوت کی ہے' اس میں کہا ہے کہ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ (11:13) اس کی مثل تم ایک سورۃ لا کر بتا دو۔ گویا قرآن خود ہی جو دعویٰ ہے' وہ کرتا ہوا چلا جاتا ہے اور اس کو سمٹاتا جاتا بھی ہے۔ اس میں اتنی بڑی تحدی ہے کہ اس کی ایک سورۃ کی مثل بھی تم نہیں لا سکتے۔ قرآن کا یہ چیلنج' قرآن کی یہ تحدی' چودہ سو سال سے چلی آ رہی ہے اور یہ بہت بڑی چیز ہے' اس لیے کہ یہ اسی زمانے کے انسانوں کے لیے نہیں تھا' قرآنِ کریم تو قیامت تک کے لیے تمام انسانوں کے سامنے ہے۔ اور اس کا جو بھی دعویٰ ہے' وہ وقتی نہیں تھا' کسی محدود طبقے کے لیے نہیں تھا' پوری انسانیت کے سامنے تھا' زمان اور مکان کی حدود سے ماورا قیامت تک کے لیے' ہر دور کے انسان کے لیے' ہر ملک کے انسان کے لیے ہے۔ گویا بہت بڑا چیلنج ہے اور بڑے لمبے زمانے سے چلا آ رہا ہے۔

قرآنِ حکیم کی بلاغت اور عظمت کے سلسلہ میں لفظ سورۃ کے لغوی معنی کی وضاحت

پہلے یہ جو سُوْرَةٍ کہا ہے' لغوی اعتبار سے اس کے معنی ''بلند دیوار'' کے بھی ہوتے ہیں' محض ''بلندی'' کے بھی ہوتے ہیں اور ''کسی مکان کی ایک منزل کے بھی ہوتے ہیں''۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ جو مفہوم ''کسی مکان کی ایک منزل کا ہونا ہے'' یہ زیادہ اقرب ہے' قریب ہے' جو کچھ قرآن کہنا چاہتا ہے۔ قرآن زندگی کے مختلف گوشوں' مختلف پہلوؤں' کے متعلق رہنمائی دیتا ہے اور ان تمام گوشوں کو جمع کرنے سے As a whole (مجموعی طور پر) پوری انسان کی زندگی کے اوپر حاوی ہو جاتا ہے۔ اس کی ایک مکان کی' ایک عمارت کی مثال' بڑی واضح اور ٹھوس ہوتی ہے' کنکریٹ ہوتی ہے کہ اس کی مختلف منزلیں ہوتی ہیں اور پھر وہ مختلف منزلوں سے مل کر ایک عمارت بنتی ہے تو قرآنِ کریم ایک کُلی ضابطہ بنتا ہے' مکمل ہدایت بنتا ہے لیکن اس کے مختلف شعبے ہیں' عائلی زندگی ہے' معاشرتی زندگی ہے' معاشی زندگی ہے' سیاسی زندگی ہے' ایک دائرے کے اندر بسنے والی ایک جماعت کی زندگی ہے' بین الاقوامی زندگی ہے' عالمگیر انسانیت کی زندگی ہے' اس دنیا کی زندگی ہے' آنے والی دنیا کی زندگی ہے۔ گویا آپ دیکھیں گے کہ اس میں یوں کہیے کہ جیسے ایک بڑی عظیم الشان عمارت کی مختلف Stories (منزلیں) ہیں۔ قرآن نے وہاں تو ایک جگہ یہ کہا ہے کہ پوری کی پوری اس عمارت کے مطابق دوسری عمارت بنا دو لیکن سمٹا کر یہ بھی کہا ہے کہ اس کی کسی ایک منزل کے مطابق ہی تم بنا کر دکھا دو۔ یعنی زندگی Man as a whole (زندگی بتمامہٖ) کے متعلق ضابطۂ حیات نہ سہی' زندگی کا کوئی ایک گوشہ اور جن میں سے متعدد گوشے میں نے ابھی ابھی گنائے ہیں' ان میں سے کوئی ایک گوشہ لے لو اور اس کے لیے ہی تم اس کے مطابق کوئی یہ بنا دو۔ یہ چیز کہ قرآن کا یہ جو دعویٰ ہے جسے قرآن کا معجزہ کہا جاتا ہے' اعجاز کے معنی ہوتے ہیں کہ اگلا شخص ایسا کرنے سے عاجز آ جائے' تو یہ جو دعویٰ ہے کہ تم ایسا بنا نہیں سکتے' اس کا مفہوم کیا ہے یعنی کس اعتبار سے نہیں بنا سکتے؟ اس پہ

ہمارے ہاں بڑی لمبی چوڑی بحثیں ہوئی ہیں۔

دنیائے عرب میں اہمیتِ زبان‘ قرآن حکیم کے اسلوبِ بیان وکلام کا ایک کھلا چیلنج

اس زمانے میں چونکہ عربوں کے ہاں زبان کو بڑی اہمیت دی جاتی تھی‘ عرب اپنی زبان کے سب سے زیادہ فصیح اور بلیغ ہونے کے مدعی تھے‘ اس پہ ان کو بڑا فخر تھا‘ ناز تھا‘ زعم تھا۔ وہ اپنے آپ کو عرب کہتے تھے۔ عرب کے معنی ہی ہوتے ہیں ’’بڑا فصیح‘ واضح زبان رکھنے والا‘‘ اور باقی ساری دنیا کو وہ عجم کہتے تھے اور عجم کے معنی تو ’’گونگے‘‘ کے ہیں۔ گویا زبان کے اعتبار سے ان کا دعویٰ یہ تھا کہ ہم ہی منہ میں زبان رکھتے ہیں‘ باقی ساری دنیا گونگی ہے۔ میں اپنے اس موضوع سے الگ ہو جاؤں گا اگر یہ کہوں کہ یہ ان کی تحدی‘ ان کا ادعاء محض پندارِ نفس نہیں تھا‘ یہ ایک واقعاتی حقیقت تھی‘ جو انہوں نے بیان کی تھی۔ عربی زبان اتنے ہزار سال سے منجھ منجھا کر واقعی ایسی جامع‘ گہری اور وسیع ہو چکی تھی۔ اور پھر انہوں نے خاص طور پہ اس میں بڑا ہی کمال حاصل کیا تھا‘ اگر وہ ایسا دعویٰ کریں تو ان کو اس کا حق پہنچتا تھا‘ چونکہ ان کا یہ دعویٰ زبان کے اعتبار سے تھا اور پھر قرآن تو عربی زبان میں بھی سب سے زیادہ بلیغ اور فصیح کتاب گنی جاتی ہے‘ محض Language (لسان) کے اعتبار سے میں یہ بات کہہ رہا ہوں۔ صرف زبان کے اعتبار بھی اس کی کیفیت یہ تھی کہ خود عربوں کے ہاں بھی‘ زبان اتنی تکمیل تک پہنچی ہوئی تھی۔

اس قوم کی یہ عجیب بات نظر آتی ہے کہ تحریر کے اعتبار سے اتنا فقدان تھا کہ یہ قرآن عربی زبان کی نثر کی پہلی کتاب ہے‘ خود عربوں نے اسے پہلی کتاب تسلیم کیا۔ یہ سارے عرب مسلمان ہی تو نہیں تھے‘ غیر مسلم بھی تو تھے۔ اور پھر اس تیئس سال کے عرصے میں جب یہ تحدی اور چیلنج دیا جا رہا تھا‘ اس میں تو برابر کے وہیں کے رہنے والے غیر مسلم جو تھے‘ اسی مکے کے رہنے والے‘ وہیں عرب کے رہنے والے ان کو بھی تو یہ تحدی دی جا رہی تھی‘ ان کو بھی تو یہ چیلنج دیا جا رہا تھا۔ کہ اس کی مثل کوئی ایک آیت ہی لاؤ۔ آپ سوچیے! ان لوگوں نے‘ ان مخالفین نے‘ اسلام کی مخالفت میں‘ جانیں تک دیدیں‘ مسلسل لڑائیاں اور جنگیں لڑیں‘ کشمکشِ پیہم رہی‘ حرب و ضرب رہی۔ اگر یہ ممکن ہوتا اور ان کے لیے تو سب سے زیادہ آسان تھا کہ جو زبان کے مدعی تھے اگر زبان کے اعتبار سے ہی اس کی مثل لانا ممکن ہوتا‘ تو انہیں ضرورت ہی نہیں تھی کہ میدانِ جنگ میں جاتے‘ جانیں دیتے اور حرب و ضرب میں پہنچتے۔ یہ مسئلہ تو ایک محفل کے اندر طے ہو سکتا تھا۔ جو تحدی اور چیلنج تھا‘ اس کو قبول کر کے اس کی ایک نشست میں اس کا فیصلہ ہو سکتا تھا۔

یہ چیز قابلِ غور ہے کہ وہ سارے جن کو اپنے فصیح و بلیغ ہونے کا اتنا دعویٰ تھا‘ اپنی زبان دانی کا اتنا ناز تھا‘ تیئس سال تک اس چیلنج کو سنتے رہے‘ مخالفت میں اتنا کچھ کیا کہ انہوں نے اپنی جانیں تک دیدیں لیکن اس طرف انہوں نے کبھی اس چیلنج کے متعلق یہ بھی نہیں کہا کہ

ہاں! ہم قبول کرتے ہیں آؤ ہمارے سامنے! ہوسکتا تھا کہ وہ قبول کر لیتے' کوئی محفل اس قسم کی جماتے اور اس میں ان کو شکست ہو جاتی لیکن بہرحال اتنی ہمت تو کرتے کہ مقابلے میں آ کر کہتے کہ ہاں! ہم بناتے ہیں اس کے لیے آیات۔ تاریخ اس کی گواہ ہے کہ ایسا بھی نہیں ہوا۔ اور اس کے بعد تو آج تک چودہ سو سال میں کسی نے بھی یہ جرأت نہیں کی۔ پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ محض زبان کا ہی مسئلہ تھا۔ اور ہمارے ہاں بھی جو کچھ اس پہ لکھا گیا ہے' جو کچھ میری نظروں سے گزرا ہے' زیادہ زور اسی پہ دیا گیا ہے کہ فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے یہ ایسا ہے کہ اس کی مثل نہیں لایا جا سکتا۔

میں نے جیسا عرض کیا ہے' اس میں کوئی کلام نہیں ہے کہ فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے بھی یہ بے مثل و بے نظیر ہے لیکن اس سوال کا جواب تو خود قرآن نے دیدیا ہے کہ اس دعوے سے اس کا مقصد کیا ہے۔ اور جب یہ چیز خود قرآن کہہ دے کہ یہ ہے مقصد اس کے بے نظیر و بے مثل ہونے کا' تو پھر اس کے بعد تو کسی اور بات کہنے کی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی ہے۔ قرآن نے کہا یہ ہے' کہ اس سے زیادہ اس کی مثل یا اس سے بہتر کوئی نہیں ہوسکتا۔ (28:49) میں پہلے تورات کا ذکر آیا' وہ تورات جو انبیائے بنی اسرائیل کو اور یجنل ملی تھی' وہ نہیں کہ جو موجود ہے یا موجود تھی۔ خدا کی طرف سے دی ہوئی جو کتاب تھی' اس کا ذکر آیا' اس کے بعد قرآنِ کریم کا ذکر آیا' اور اس میں قرآن نے یہ کہا۔

قرآنِ حکیم کی طرف سے پیش کردہ نظامِ حیات کی بلاغت وفصاحت کا ثبوت خود قرآن کریم کے آئینے میں

عزیزانِ من! میرا پوائنٹ یہ ہے کہ قرآن نے خود واضح کیا ہے کہ قرآن کس اعتبار سے بے مثل و بے نظیر ہے۔ کہا ہے کہ **فَاْتُوْا بِكِتٰبٍ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ هُوَ اَهْدٰى مِنْهُمَآ** (28:49)۔ تورات کو چھوڑ دیجیے' وہ پرانی بات ہوگئی' تم کوئی کتاب ایسی لے آؤ' ایسا ضابطۂ قانون لے آؤ جو اس سے زیادہ ہدایت دینے والا ہو' اس سے بہتر ہدایت دینے والا ہو' وہ اس سے بہتر گائیڈ ہو' اس کے اندر اس سے بہتر Guidance (راہ نمائی) ہو۔ اھدیٰ میں تو خود آپ کو معلوم ہے' کہ Superlative Degree (تفضیل کلی کے درجے پر) کہہ کر اس نے بتا دیا کہ سب سے بہتر ہدایت دینے والا یہ ہے' رہنمائی دینے والا یہ ہے۔ اس لیے خود قرآن کی اس تصریح کے مطابق یہ جو اس نے تحدی اور چیلنج دیا ہے کہ اس کی مثل لاؤ یا اس سے بہتر لاؤ تو اس کے معنی یہ ہیں کہ جو انسانیت کی راہنمائی کے لیے اس سے بہتر نہیں تو اس جیسی ہی کتاب لے آؤ۔ پورا ضابطۂ ہدایت نہیں' اس ضابطۂ ہدایت کا کوئی ایک گوشہ لے لو' زندگی کے کسی ایک میدان کے اندر نوعِ انسانی کے لیے مستقل طور پر زمانے کے تقاضوں سے بلند و بالا ہو کر یہ جو اس قسم کی راہنمائی دیتا ہے' اس قسم کی سی زندگی کے کسی ایک گوشے کے اندر راہنمائی دینے والا ضابطۂ ہدایت لاؤ۔ تو اب قرآن کے ماننے والوں کے ذمے یہ بات آجائے گی کہ وہ انسانی زندگی کے مختلف

گوشوں کو لیں اور پھر اس میں دنیا کو یہ ثابت کریں کہ قرآن اس بات میں یہ راہنمائی دیتا ہے۔تم اپنے نظام ہائے زندگی جو انسانوں نے وضع کیے ہوئے ہیں' کسی ایک انسان نے نہیں' وہ لے آؤ۔قرآن نے یہ کہا ہے کہ وَ ادْعُوْا شُهَدَآءَ كُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (2:23) جاؤ' خدا کو چھوڑ کر جتنے بھی اور تم اپنے ساتھ ملا سکتے ہو' ان کو ملا کر لے آؤ۔

نبی اکرم ﷺ اور صحابہ کبار رضی اللہ عنہم نے تو قرآنی نظام حیات کو عملی طور پر بطور مثال پیش کر دیا تھا مگر آج تباہی کیوں؟

حضورِ نبی اکرم ﷺ نے اپنے دور میں' اور ان کے بعد صحابہؓ کبارؓ نے' قرآن کی اس تحدی کو دنیا کے سامنے پیش ہی اس طرح سے کیا تھا کہ انہوں نے زندگی کا ایک ایک گوشہ لیا' اس گوشے میں قرآن کی تعلیم کے مطابق اس قسم کا عملی نظام متشکل کیا اور پھر دنیا کو چیلنج دے کر کہا کہ بتاؤ! کیا کوئی انسانی ذہن اس قسم کا نظام وضع کر سکا ہے؟ یہ بات تو الگ ہے کہ اس کے بعد کے انسان یہیں سے یہ نظام لے کر' اسے اپنے ہاں Introduce (شروع) کر دیں یا اس کے مطابق کچھ ترمیم و تنسیخ کر کے اسے اپنے ہاں نافذ کر لیں۔سوال یہ ہے کہ جس قسم کا زندگی کا نظام' نوع انسان زندگی بہ تمامہ (Man as a whole) کو درکار ہے' یہ اسے کیوں نہیں لے کر آ سکے؟ ضمناً یہ عرض کر دوں کہ دنیا میں جو سب سے بڑی جہنمی زندگی ہے' انسانیت پہ جو سب سے بڑی پریشانیاں' مشکلات و مصائب آ رہے ہیں' وہ اس لیے آ رہے ہیں کہ انسان Fragmentary Life Lead (جزوی زندگی بسر) کرتا ہے۔

اب ایک تو وہ ہیں جو حیوانی سطح پر زندگی بسر کرتے ہیں۔ان کے لیے تو سوال ہی نہیں ہے کہ وہ کس قسم کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ دوسرے وہ ہیں جنہیں شعورِ خویش (Self Consciousness) حاصل ہے' ان کے ہاں بھی کیفیت یہ ہے کہ وہ جزوی زندگی بسر کرتے ہیں' ان کا ایک پہلو تو نہایت اچھا پہلو ہے مگر زندگی کے دوسرے گوشوں میں جا کر دیکھیے تو وہاں ان میں تاریک ترین قسم کا پہلو نظر آتا ہے۔ان کے ہاں کے نظام کے ایک گوشے (Aspect) کو دیکھیے تو نظر آتا ہے کہ صاحب! کیا خوب ہے' انہوں نے کہاں تک انسان کو پہنچا دیا ہے! اسی اسٹیٹ کے اندر' اسی سوسائٹی کے اندر' انہی کے ہاں کے جو دوسرے گوشہ ہائے (Aspects) زندگی ہیں' ان کے اوپر جا کر جب غور کیجیے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ اتنے اتنے بڑے سمجھدار لوگ' جو زندگی کے ایک گوشے کے اندر یہ کچھ کر کے دکھا سکتے ہیں' ان کے ہاں زندگی کا جو دوسرا گوشہ ہے' اس کے اندر ان کو کیا ہو گیا ہے۔

آج دنیا بھر کی قوموں نے زندگی کو جزوی طور پر دو حصوں میں تقسیم کر دیا

برادرانِ عزیز! میں کہہ یہ رہا تھا کہ آج آپ دیکھیے' دنیا کی بڑی بڑی مملکتیں ہیں' زندگی کے بڑے بڑے نظام ہیں۔ایک گوشے میں

انہیں دیکھیے تو وہ قابلِ رشک نظر آتا ہے اور دوسرے میں تاریک ترین۔ مثال کے طور پہ سویڈن (دارالخلافہ اسٹاک ہوم) اور ناروے (دارالخلافہ اوسلو) لیجیے۔ انہوں نے اپنے ہاں Welfare States (فلاحی ریاستیں) قائم کی ہیں۔ ان Welfare States (فلاحی ریاستوں) کی کیفیت یہ ہے کہ دنیا کی کوئی اسٹیٹ ان کا مقابلہ نہیں کر رہی' ان میں کوئی فرد زندگی کی کسی ضرورت سے' کسی وقت بھی' محتاج نہیں رہتا' محروم نہیں رہتا۔ زندگی کے نظام میں یہ گوشہ ایک بڑی چیز ہے لیکن آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ دنیا میں سب سے زیادہ خودکشی کی جو وارداتیں ہیں' وہ انہی States (ریاستوں) کے اندر ہوتی ہیں۔ یہ کیوں ہوا؟ اس لیے ہے کہ انہوں نے زندگی کا ایک گوشہ لیا اور اسی گوشے کے اندر وہ Lopsided (غیر متوازن) ترقی کرتے ہوئے آگے بڑھتے چلے گئے۔ انہوں نے جب یہ اتنا کچھ کر لیا' جو ضروریاتِ زندگی ہیں' وہ پوری دیدیں' تو اس سے سمجھ لیا کہ انسانیت کا مسئلہ حل ہو گیا ہے۔ انسانیت کا یہ مسئلہ اتنا آسان نہیں ہے کہ یہ اتنے سے حل ہو جائے۔ ہم تو کچھ نہیں کہتے آپ ان سے پوچھیے کہ کیا ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی کہ یہ سارا کچھ کر دینے کے بعد پھر یہ کیا چیز ہے جس کی وجہ سے وہ خودکشی کرتے ہیں؟ اور دنیا میں سب سے زیادہ خودکشی کی واردات وہاں ہو رہی ہیں؟ میں نے یہ صرف ایک مثال دی ہے۔ اگر اس قسم کا تقابلی مطالعہ زندگی کے مختلف نظام لے کر کیا جائے تو پتہ چلے کہ ان میں کس طرح سے کسی ایک گوشے کے اندر اتنی ترقی ہوتی ہے اور زندگی کے جو دوسرے گوشے ہیں' وہاں یہی نہیں کہ وہ صرف اعتدال پہ نہیں ہوتے' بلکہ وہ اتنی پستی کی سطح پہ گئے ہوتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے کہ یہ لوگ جو ایک طرف اتنا آگے اور اونچا جا رہے ہیں' زندگی کے دوسرے گوشوں کے اندر انہیں اتنی سی بات کی سمجھ بھی نہیں آتی کہ یہ کیوں ہوا ہے؟ اصل یہ ہے کہ قرآن زندگی کو تماماً و کمالاً لیتا ہے' وہ Man as a Whole (کلی انسان) کو لیتا ہے اور اس کی زندگی کے ہر گوشے اور شعبے کے لیے ایسی راہنمائی دیتا ہے جس کے متعلق اس کا دعویٰ یہ ہے کہ انسانوں کا وضع کردہ کوئی نظام' کوئی قانون' اس جیسی راہنمائی نہیں دے سکتا۔ یہ ہے قرآن کا دعویٰ' یہ ہے اس کا چیلنج۔

قرآن حکیم جیسے مکمل ضابطہ حیات کی حامل قوم کا فریضہ اور اس کی اپنی حالت زار

برادرانِ عزیز! اس چیلنج کو ایسا نظامِ زندگی' جو انسانی ذہن' کسی ایک فرد کا نہیں' بلکہ سب کے سب مل کر بھی وضع کر لیں تو بھی اسے Meet (پورا) نہ کر سکیں۔ اِس کے متعلق میں نے یہ کہا ہے کہ یہ قرآنِ حکیم کی حامل قوم کا فریضہ ہے کہ وہ دنیا کے سامنے اس حیثیت سے اسے پیش کریں لیکن ان کی اپنی جو کیفیت ہے' وہ ہمارے سامنے ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ آج دنیا میں پست ترین نظامِ زندگی' اگر جن قوموں کے اندر ہے' تو وہ مسلمانوں کی وہ قومیں ہیں جو اپنی نسبت اس کتابِ عظیم کی طرف کرتی ہیں۔ ان کے اپنے ہاں پست ترین نظامِ زندگی ہے اور اگر کبھی ان کی نگاہ اٹھتی بھی ہے تو دوسروں کے ہاں انسانیت کے وضع کردہ جو نظام ہیں' ان کی طرف اٹھتی ہے کہ وہاں سے

ان کے جو چبائے ہوئے نوالے ہیں' ان کو نگل لیا جائے۔

ملتِ اسلامیہ کی زبوں حالی اور پسپائی کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اس نے اسلام کے پیش کردہ نظامِ زندگی سے اپنے آپ کو یکسر الگ کر دیا ہے

سوال نسبت کرنے کا نہیں تھا' میرے عزیزو! کہ قرآن کی طرف ہم اپنی نسبت کر لیں۔ عبداللہ نام رکھنے سے تو انسان خدا کا غلام اور محکوم نہیں بن سکتا۔ قرآن کی تحدی کے متعلق ہم آج بھی اپنے محراب و منبر سے اور دیگر Stages (قیام گاہوں) سے اٹھ کر یہی کہتے ہیں کہ قرآنِ کریم کا دعویٰ ہے' جو چودہ سو سال سے چلا آتا ہے کہ اس کے مثل اور نظیر تم پیدا نہیں کر سکتے۔ اور اس کے بعد ہم بالکل مطمئن ہو جاتے ہیں کہ ہم نے اسلام کی افضلیّت اور اس کا احسن ہونا ساری دنیا کے سامنے ثابت کر دیا۔ ہمارے ان دعووں پر دنیا ہی نہیں' خود آسمان کے فرشتے بھی ہنستے ہیں کہ ان کے ہاں زندگی کے اپنے نظام کی کیفیت یہ ہے کہ وہ پست ترین درجے پر ہیں اور دنیا کے سامنے اٹھ کر یہ دعویٰ کر رہے ہیں کہ تم اس جیسا نظام تو بنا کر نہیں لا سکتے۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ ہم نے اسلام کو زندگی کے نظام سے یکسر الگ کر دیا اور قرآن کے متعلق صرف اتنا ہی سمجھ لیا کہ یہ اس کے الفاظ کا اعجاز ہے' جن کے متعلق یہ دعویٰ ہے حالانکہ یہ الفاظ نہ تو ہمارے بنائے ہوئے ہیں اور نہ ان کو Maintain (برقرار) کرنے کے لیے ہمیں کچھ کوشش کرنا پڑتی ہے' وہ تو پہلے سے چلے آ رہے ہیں' خدا نے اس کی حفاظت کا خود ذمہ لیا۔ یہ جو اس کے اوپر ہم اتنا فخر اور ناز کر رہے ہیں کہ گویا ہم دنیا کو کوئی ایسا چیلنج دے رہے ہیں جو دنیا Meet (پورا) نہیں کر رہی۔ کیا یہ ہے' بڑی قابلِ فخر بات صاحب؟ قرآن نے اپنی صداقت کی دلیل یہ ٹھہرائی ہے کہ **وَ ادۡعُوۡا شُهَدَآءَ كُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ** (2:23) تم اس جیسا نظامِ زندگی نہیں پیدا کر سکتے' اس کی مثل نہیں پیدا کر سکتے' ایسا چیلنج کرنے کے لیے کسی ایک شخص پر ذمہ داری ڈالنے کی ضرورت نہیں۔ جتنے ادیب اور مفکر اور تمدنی اور سیاسی مقنن تمہارے معاشرے میں پائے جاتے ہوں ان سب کی ایک کمیٹی بنا لو' بس ایک اللہ کی وحی کو الگ چھوڑ دو اور ان سے کہو کہ ایسا کر کے دکھائیں۔ اگر تم واقعی اپنے اس دعوے میں سچے ہو کہ تم اس کا فیصلہ نہیں کر پاتے کہ یہ ضابطۂ حیات خدا کی طرف سے ہے یا نہیں' اور محض اپنی مفاد پرستیوں سے چمٹے رہنے کی خاطر شکوک و شبہات کا ساز نہیں بجا رہے تو تمہیں اس چیلنج کو ضرور قبول کر لینا چاہیے۔ آپ نے دیکھا کہ یہ تو عملی چیز تھی۔

قرآن حکیم کے بے مثل ہونے کے عقیدے کے ساتھ ساتھ مثلہٗ معہ پر ایمان کا تصور

ہمارے ہاں تو عقیدے کے اندر' عزیزانِ من! یہ چیز داخل ہے کہ قرآن کو یوں بے مثل کہنے والے بھی ''مثلہ معہ'' پر ایمان رکھتے ہیں۔ آپ کے ہاں یہ عقیدہ ہے کہ قرآن کے ساتھ مثلہ معہٗ ہے یعنی قرآن کے ساتھ قرآن کی مثل' ایک غیر قرآنی چیز اور بھی ہے۔ سوچیے تو

سہی! ساری دنیا کو تو چیلنج دے رہے ہیں کہ اس کی مثل لاؤ' اور پھر کہتے یہ ہیں کہ تم نہیں لا سکتے مگر اپنے ہاں یہ عقیدہ رکھا ہوا ہے کہ قرآن کی مثل قرآن کے ساتھ ہمارے پاس ہے۔ آپ نے یہ غور فرمایا کہ انہوں نے وحی کی دو قسمیں بنا دیں: ایک وحی نے یہ قرآن دیا' دوسری وحی نے اس کے مثل اس کے ساتھ اور بھی کچھ دیا۔ یہ جو میں نے آپ کو ابھی آیت پیش کی' اس کا دعویٰ ہے کہ اس کی مثل قرآن لاؤ' اس قرآن کی مثل لاؤ' اس نے کہا کہ ہاں صاحب! مثلہ معہ موجود ہے۔

قرآن حکیم کی مثل نہ لا سکنے پر پرویزؒ پر ایک ہزار علمائے کرام کی طرف سے کفر کا فتویٰ

آپ' عزیزانِ من! غور فرما رہے ہیں کہ جو اتنی سی جرأت کر کے کہہ دے کہ صاحب! یہ جو مثلہٗ معہٗ کا عقیدہ ہے' یہ قرآن کے اس دعوے کے خلاف جاتا ہے تو کہہ دیا کہ یہ منکرِ حدیث ہے' منکرِ سنت ہے' مرتد ہے' ملحد ہے۔ اس کے پیچھے ہزار علمائے کرام اکٹھے ہو جائیں' اس کو پھانسی دیدو کیونکہ یہ کہتا ہے کہ قرآن کی مثل کچھ نہیں ہو سکتا۔ کہا کہ ''سرکار! اکیلے کو نہ پھانسی دیجیے۔ کہا تو یہ کسی اور نے تھا' میں تو صرف دہرا رہا ہوں۔ وہ چونکہ ہاتھ نہیں آتا' اس لیے پرویز صاحب کو پھانسی دیدو۔ ارے! مدعی تو وہ ہے' میں نے تو بات ہی پیش کی ہے۔ بہرحال! کوئی بات نہیں۔

انسان اور پتھر' جہنم کا ایندھن ہونے کا قرآنی مفہوم

برادرانِ عزیز! اس قسم کے دعوے کرنے والوں کے متعلق قرآن کہتا ہے کہ **فَاِنۡ لَّمۡ تَفۡعَلُوۡا وَ لَنۡ تَفۡعَلُوۡا** (2:24)۔ یہ ہے زبان! عربی جاننے والے جانیں گے کہ یہ **لم** اور **لن** جو دو الفاظ قرآن لے آیا ہے بلکہ حرف لے آیا ہے' انہوں نے بات کہاں سے کہاں پہنچا دی۔ کہا ہے کہ تم اس کے مطابق نہیں بنا سکو گے۔ اس لیے کہ **فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیۡ وَقُوۡدُهَا النَّاسُ وَ الۡحِجَارَةُ ۚۖ اُعِدَّتۡ لِلۡكٰفِرِیۡنَ** (2:24) بچو پھر اس آگ سے۔ اس کا عام ترجمہ یہی ہے کہ جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں' جو کافرین کے لیے تیار کی گئی۔ کیا بات ہے یہ النار جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں! یہ چیز بھی ہمارے ہاں ایک مشکل کا باعث بنتی چلی آ رہی ہے کہ ٹھیک ہے انسان کو اس کے اندر جھونک دیا کہ انہوں نے یہ جرائم کیے۔ یہ جو پتھر ہیں' ان کو اس جہنم کے اندر ڈالنے سے فائدہ کیا؟ یہ عجیب بات ہے۔ اب چونکہ انہوں نے قرآن پہ غور نہیں کیا حالانکہ ایک لفظ آگے بڑھنے سے بات صاف ہو جاتی ہے۔ کہا ہے کہ **اُعِدَّتۡ لِلۡكٰفِرِیۡنَ** (2:24) کافرین کے لیے ہے۔ پتھر کافر اور مومن تو ہوتا ہی نہیں۔ کہنے لگے کہ نہیں جی! وہ جو بت تراش لیتے ہیں' اس سے وہ مراد ہے۔ صاحب! ایک اتنا بڑا پتھر لے کر تراشا تو اس سنگ تراش نے' اس کو اس شکل میں بنا دیا' ایک سنگ تراش نے' تراشا تو حجرِ اسود بنا دیا' اسی چٹان سے دوسرے نے تراشا تو اس نے کرشن کی مورتی بنا دی۔ یہ جو مورتی بنا ہوا' پتھر ہے' اس کو جہنم میں پھینک دو اور اُس (حجرِ اسود) کو جنت کے

اعلیٰ مقام کے اندر لے جاؤ' ان پتھروں کا کیا قصور صاحب! اِس میں اُس نے کیا نیکی کی؟ بالبداہت بات نظر آتی تھی کہ جو **اُعِــــدَّتۡ لِـلۡكٰفِرِيۡنَ** (2:24) ہے یہ کفر کا نتیجہ ہے۔ اور جن کے متعلق کہا ہے' بہرحال ان کے اوپر کفر کا اطلاق ہوگا۔ کفر کا وہ اطلاق تو ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ **فَـمَـنۡ شَآءَ فَلۡيُؤۡمِنۡ وَّ مَنۡ شَآءَ فَلۡيَكۡفُرۡ** (18:29) جس کا جی چاہے اپنے اختیار وارادے سے' اس کا اقرار کرے اور جس کا جی چاہے اختیار وارادے سے اس کا انکار کرے۔ تو جو بھی یہاں ہیں' وہ اختیار وارادے والے ہونے چاہئیں' پتھر تو ہو نہیں سکتا۔ اگر یہ جہنم کی آگ ہے تو یہ پتھر نہیں ہے۔ عزیزو! عربی زبان کے اعتبار سے ''الناس'' عوام کو کہا جاتا ہے اور یہ جو حجر کا لفظ ہے' اس کے معنی ہوتا ہے ''عقل و ہوش والے لوگ' چالاک لوگ' بہت زیادہ ذہین لوگ''۔ یہ **ذی حجر** قرآن کے اندر خود آیا ہے [1]۔

جہنم میں عوام اور انکے لیڈروں کی باہمی الزام تراشی

آپ دیکھیں گے کہ قرآنِ کریم میں مختلف مقامات پر جہنم کے اندر دو گروہوں' عوام اور ان کے لیڈران کے مکالمے پیش کیے گئے ہیں۔ جب ہم آگے آئیں گے تو آپ دیکھیں گے کہ یہ بڑے ہی عبرت انگیز' سبق آموز' مکالمے ہیں۔ جہنم کے یہ مکالمے ہمارے ہی اس معاشرے کی باتیں ہیں۔ وہ تو ہمارا فریبِ نفس ہے جو ہم انتظار میں بیٹھے ہوئے ہیں کہ جہنم اس کے بعد کہیں جا کر وہاں آخرت میں آئے گا۔ وہ تو آئے گا مگر آج کا جہنم ہماری نظروں سے اوجھل ہے۔ وہ مکالمے ایسے عجیب ہیں کہ جب قوم کی تباہیاں آتی ہیں تو کس طرح سے عوام اور لیڈر ایک دوسرے کو مطعون کرتے ہیں۔ آج بھی یہ چیز ہو رہی ہے کہ صاحب! یہ لیڈر اتنے خراب ہیں کہ صاحب! جیسا دودھ ہوتا ہے' ویسی اوپر بالائی آتی ہے۔ اب یہ ایک محاورہ بول دیا اور یہ سمجھ لیا کہ بس مسئلہ طے ہوگیا کہ اس قوم کے لیڈر ایسے ہی ہوا کرتے ہیں۔ عوام کی یہ کیفیت ہے کہ صاحب! جب بڑے بڑوں میں یہ خرابیاں پیدا ہو جائیں گی تو بہرحال وہ خرابیاں نیچے بھی آئیں گی۔ یعنی عوام اپنے آپ کو معذور قرار دے رہے ہیں' خواص اپنے آپ کو معذور قرار دے رہے ہیں۔ قرآن میں یہی مکالمے لکھے ہوئے ہیں۔ عوام ان لیڈران کو مطعون قرار دیتے ہیں کہ ہمیں انہوں نے تباہ کیا' وہ لیڈران یہ چیز کہتے ہیں کہ صاحب! ہم کونسا تمہیں کوئی مجبور کر رہے تھے۔ عوام یہ کہہ رہے ہیں کہ صاحب! دن رات تم اس قسم کی سازشیں کیا کرتے تھے' مکروفریب کے جال بنایا کرتے تھے' اس قسم کے پلان کیا کرتے تھے' ہمارے بس میں ہی نہیں تھا کہ ہم ان سے نکل جاتے۔ اور وہاں یہ دونوں جو پھر عدالت میں پیش ہوتے ہیں تو ایک دوسرے سے کہتے ہیں کہ صاحب! ان کو دوہرا عذاب دیجیے تو وہاں سے جو فیصلہ ہوتا ہے' عزیزانِ من! اس سے تو ہم بھی چھوٹ نہیں سکتے۔ وہ کہتا ہے کہ ہاں! دوہرا عذاب' دونوں کو دوہرا دوہرا عذاب ہے۔ بڑوں (لیڈران) کو اس لیے دوہرا عذاب کہ وہ گمراہ ہوئے' یقیناً انہوں نے یہ کچھ کیا اور ان کے پیچھے چل کر یہ بھی اس طرح سے ہوئے۔ اور انہیں (عوام کو) یہ کہہ کر گیا کہ سوچو تو سہی کہ یہ چار پانچ مٹھی بھر لوگ تھے' ان

---

[1] هَلۡ فِيۡ ذٰلِكَ قَسَمٌ لِّذِيۡ حِجۡرٍ (89:5)

کے پاس وہ قوت کونسی تھی جس کی بنا پر یہ سارا کچھ کرتے تھے؟ قوت تو ان کی تم تھے۔

تجھے تو' ''تو'' کے سوا کوئی کچھ نہ کہتا تھا

''جناب'' ہم نے بنایا' ''حضور'' ہم نے کیا

یہ تھے کیا؟ ان کی قوت کا راز تو تم تھے۔ اور اگر تم ذرا کھڑے ہو کر اس بات کو سوچ لیتے تو ان کی جرأت ہی کیا تھی۔ تمہیں تو کچھ کہنا ایک طرف رہا' یہ خود اپنے پاؤں پہ کھڑے نہ ہو سکتے۔ یہ برف کے تودے ہیں' جنہیں ذرا سی حرارت لگے تو پگھلتے چلے جائیں۔

ایں صنم تا سجدہ اش کردی خداست

یہ وہ خدا نہیں ہے جو دوسروں کے سجدوں کا بنا ہوا ہے' جو کسی کی عبودیت کا محتاج نہیں ہوتا۔ یہ تو وہ خدا ہیں کہ تم نے ان کے سامنے سجدے کیے یہ خدا بن گئے۔

چوں یکے اندر قیام آئی فناست

ارے! تم ان کے سامنے کھڑے ہو جاؤ تو ان کی خدائی ختم ہو جاتی ہے اور آج تم یہ کہہ رہے ہو کہ صاحب! انہیں دوگنا عذاب دیجیے' ہمیں کچھ نہ کہیے!!!

جنت اور دوزخ کی سیر کی کہانی اقبالؒ کی زبانی

عزیزانِ من! خدا بول رہا ہے کہ وَقُوْدُھَا النَّاسُ وَ الْحِجَارَۃُ (2:24) عوام بھی اور خواص بھی' لیڈرز بھی اور Followers (متبعین) بھی' متبوعین بھی' اس کا ایندھن ہیں۔ پہلے بھی ایک دفعہ یاد پڑتا ہے کہ یہ بات آئی تھی۔ بڑے دلچسپ انداز میں اقبالؒ (1877-1938) بات سمجھا گیا ہے۔ اس نے کہا یہ ہے کہ میں فلک الافلاک پہ سیر کرنے کے لیے ادھر اُدھر گیا' جنت دیکھی' حوریں دیکھیں' جبریل دیکھے' فرشتے دیکھے۔ واپس آنے لگا تو خیال آیا کہ یہاں ایک جہنم کے متعلق بھی کچھ سن رکھا ہے' وہ بھی دیکھ کر جانا چاہیے۔ اپنے گائیڈ سے کہا کہ بھئی! جاتے جاتے ذرا ایک جھلک اس جہنم کی بھی ہو جائے' اُس نے کہا: ہاں آیئے۔ وہ لے گیا۔ وہاں جا کر ایک گڑھے کے سرہانے کھڑا کیا۔ وہاں میں نے دیکھا کہ اس کے اندر یخ بستہ سردی ہے' ٹھٹھر رہے ہیں۔ او! میں نے کہا: ہم نے تو سنا تھا کہ اس میں اتنے اتنے شعلے ہیں' اتنا گرم ہے' اتنی آگ ہے' یہ تو بڑا ٹھنڈا ہے' ابھی اس میں آدمی تو کوئی نہیں تھے' وہ تو قیامت میں جانے ہیں لیکن ٹھنڈا اتنا تھا۔ میں نے اس گائیڈ سے پوچھا کہ یہ کیا بات ہے؟ ایک مصرعے میں اس نے یہ بات کہی تھی کہ یہ تو بڑا ٹھنڈا ہے' آنے والے اپنا اپنا ایندھن خود اٹھا کر لاتے ہیں۔ یہ شخص ❶ کس خوب انداز سے بات کہہ جاتا ہے: ''خود اپنا ایندھن لے کر جاتے ہیں جہنم اس

---

❶ یہ اشارہ علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ (1877-1938) کی طرف ہے۔

ایندھن سے تپتا ہے' وہ خود تو گرم نہیں ہوتا'':

اہلِ دنیا یہاں جو آتے ہیں

اپنے انگار ساتھ لاتے ہیں

نہ بہشت میں اپنے باغات اُگے ہوئے ہیں' نہ جہنم کے اندر اس کے اپنے شعلے ہیں۔

برادرانِ عزیز! جنت کے چشموں کے متعلق بھی یہ کہا ہے کہ **یُفَجِّرُوْنَهَا تَفْجِيْرًا** (76:6) یہ متقی ان جنت کے چشموں کو اپنے قلوب سے نکال کر لائیں گے۔ جہنم کی آگ کا ایندھن بھی ہم ہی اپنی کمر کے اوپر اٹھا کر وہاں لے جائیں گے۔ **وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَ الْحِجَارَةُ ج صلے اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ** (2:24) جو بھی اس نظامِ خداوندی سے انکار کرے گا' نام خواہ عبداللہ ہی کیوں نہ رکھا ہوا ہو' اس کا نتیجہ جہنم ہوگا۔ بات اس نے کافرین کی کہی ہے کہ جو اس نظامِ خداوندی جس کی مثل اور نظیر نہیں ہے' سے انکار کرے گا۔ انسانوں کے خود ساختہ نظام اپنے ہاں وضع کرے گا' اس کا نتیجہ جہنم ہوگا اور یہ وہ جہنم ہوگا جس کے اندر Follwers (تبعین) اور Leaders (متبوعین) دونوں کے دونوں چیخ رہے ہونگے۔ **وَ مَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنَ النَّارِ** (2:167) اس جہنم سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ انسانوں کا ذہن یہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں پاتا۔

رُست از یک بندتا افتاد در بندے دگرٗ

یہاں تو اس جہنم کی کیفیت یہ ہے کہ ایک رسی کھولتے ہیں' تین رسیاں اور پاؤں کے اندر پڑ جاتی ہے۔ انسان نہیں نکل سکتا۔

خود ساختہ نظام کے قید خانے کی کیفیت اور پھر وہاں سے نکلنے کا طریق کار

قرآن نے یہ کہا ہے کہ **وَ مَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنَ النَّارِ** (2:167) یعنی اگر تم اپنے ہی وضع کردہ نظاموں کی رو سے اس جہنم سے نکلنے کی کوشش کرو تو نہیں نکل سکو گے۔ یہاں سے پتہ چلا کہ یہ جو قرآن نے یہاں **مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ** کہا ہے' اس کے معنی کیا ہیں۔ نکلنے کا راستہ ہے۔ اب بات سمجھ میں آئی کہ یہ جو **مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ** کا استثنا ہے' یہ کیوں کیا تھا ورنہ مطلق مایوسی ہو جاتی۔ کوئی بات نہیں' **مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ** (2:23) کی استثنا نے امید کے دروازے قیامت تک کے لیے کھلے رکھے ہوئے ہیں کیونکہ قیامت تک کے لیے یہ خدا کی کتاب محفوظ ہے۔ تمہارا جب جی چاہے اس جہنم سے نکل سکتے ہو۔ اپنے ہاں جو جی میں آئے کرلو' جنی ٹل لانی اے لالوتسی [1]'' **وَ مَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنَ النَّارِ** (2:167)۔ دوسری جگہ ہے کہ جب کبھی وہ اس چیز کا ارادہ کریں گے کہ **كُلَّمَآ اَرَادُوْٓا اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا مِنْ غَمٍّ اُعِيْدُوْا فِيْهَا ق** (22:20) اس میں سے نکل جائیں' ان کے غلط نظام کی خود وہ جو ان کے ہاں کی تلاطم انگیز موجیں ہیں' دھکے دے کر ان

---

[1] جو طاقت آزمائی تم کر سکتے ہو' کر دیکھو۔

کو پھر اس کے اندر ڈال دیں گی۔ First World War (1914-18) (پہلی جنگِ عظیم) کے بعد اس جہنم سے نکلنے کے لیے تم نے جتنی کوششیں کیں' انہوں نے دھکے دے کر تمہیں Second World War(1939-45) (دوسری جنگِ عظیم) کے اندر پھینک دیا۔ اس جہنم سے نکلنے کے لیے چیخ رہے ہو' ساری دنیا کے انسانوں کی جماعتوں کے تمہارے نمائندے جو پہلے لیگ آف نیشنز (46 -1920) کے اندر جمع تھے' اب UNO میں جمع ہو' آپ دیکھتے ہیں کہ دنیا میں کتنی چیخ و پکار ہو رہی ہے۔ نکلنے کا کیا راستہ تلاش کیا جا رہا ہے' انسانوں کا ذہن کیا تلاش کر رہا ہے؟ کہ تم ایسے نیوکلیئر ہتھیار بناؤ کہ پہلے تو اس میں کروڑوں ہی مرتے تھے' یہاں پھر اس کے بعد ہاتھی مع اس کا ہودا غائب ہو۔ یہ اس کا علاج ڈھونڈ رہے ہیں۔ من دون اللہ کہا تھا: نہیں علاج اس کا ڈھونڈا جا سکتا صاحب! صرف خدا کا بتایا ہوا نظام ہے' جو انسانیت کو اس جہنم سے نکال سکتا ہے۔ کہا ہے کہ وَقُوْدُھَا النَّاسُ وَ الْحِجَارَۃُ ج صلے اُعِدَّتْ لِلْکٰفِرِیْنَ (2:24) اور اگر اس کو چھوٹے معنوں میں لیا جائے یعنی قریبی طور پہ' جن کو وہ چیلنج دیا تھا' صرف انہی تک کے لیے لیا جائے تو عربوں کے ہاں النار جہنم کو کہتے تھے' جنگ کو کہتے تھے۔ لڑائی کی آگ کو تو ہمارے ہاں بھی یہ نار کہتے ہیں۔ اور اس میں ان کے ہاں جو لڑنے کا طریق تھا ایک تو آپس میں انسان میدان میں لڑا کرتے تھے' دوسرا انہوں نے پہاڑوں کے اوپر بڑے بڑے پتھر کے بولڈرز رکھے ہوئے ہوتے تھے۔ آپ نے سینما کے اندر دیکھا ہوگا جب دشمن نیچے آتا تھا تو وہاں سے وہ اس کی رسی کاٹ دیتے تھے تو پتھرا تنے زور سے نیچے آتا تھا کہ نیچے کی سطح پر وہ کچل دیا کرتا تھا۔ وہ یہ معنی لیتے ہیں۔ میں نے اس لیے واضح کیا۔ میں اس کے وہی معنی صحیح سمجھتا ہوں جو میں نے پہلے عرض کیا تھا۔ وہ ہمارے والے اس لیے یہ معنی نہیں لیتے تھے کہ ان کے ہاں جہنم وہیں جا کر ہے۔

جنت اور جہنم کا دار و مدار انسانوں کے اس نظام سے وابستہ ہے جو وہ خود قائم کرتے ہیں

میری قرآنی بصیرت کے مطابق تو قرآن نے جو تصریحات کی ہیں ان کے مطابق جنت اور جہنم کی ابتدا یہاں ہی ہو جاتی ہے۔ اس لیے یہ وہ جہنم ہے جو غلط نظامِ زندگی کا نتیجہ ہے' جس کے اندر Followers & Leaders (متبعین اور متبوعین) سب شامل ہوتے ہیں۔ اور کافرین' اس نظام سے انکار کرنے والوں' کے لیے وہ جہنم ہوتا ہے اور اس کے مقابلے میں وَ بَشِّرِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَھُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ (2:25) ہے۔ آپ نے دیکھا کہ کس طرح سے قرآن مقابل میں دوسری چیز لے آتا ہے۔ یونہی کافرین کا جو جہنم ہے اس کے مقابلے میں وہ لوگ ہیں جو اس نظام کو یہاں قائم کریں گے' اس کی صداقتوں پر یقین لائیں گے یعنی اٰمنوا۔ اتنی سی بات ہی نہیں ہے بلکہ یہ بھی ہے کہ وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (2:25)۔ اس کے مطابق اعمالِ صالحہ سے یہ نظام قائم کریں گے۔ اس کے لیے یہ کہا ہے کہ اَنَّ لَھُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ (2:25)۔ جنت قرآن کی غور طلب اصطلاح ہے' اس سے سارا قرآن بھرا پڑا ہے جنّٰت جمع کا صیغہ ہے۔

قصہ آدم آدمی ہی کی اپنی داستان ہے جہاں ہر رزق فراواں ہے

قرآن نے خود ہی یہ بتایا کہ ایک جنت ہے جس سے اس نے قصہ آدم کی' آدمی کی' داستان کی ابتدا کی ہے۔ میں نے قبل از وقت یہ اصطلاح کہہ دی۔ چار ہی آیتوں کے بعد قصہ آدم شروع ہو جائے گا۔ وہاں جا کر اس کی تفصیل سامنے آئے گی۔ آدمی کی داستان کی ابتدا اس نے کی ہے کہ اس کی ابتدائی زندگی جب ابھی اس نے تمدن اور مدنیت کی یہ زندگی شروع نہیں کی تھی' جنتی زندگی تھی۔ یوں سمجھو کہ گویا یہ جنتی زندگی کے اندر تھا۔ اور اس جنتی زندگی کے متعلق یہ کہا تھا کہ وَ كُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا (2:35) جہاں سے کسی کا جی چاہے' جب بھوک لگے' وہاں سے سیر ہو کر کھاؤ۔ اس کو رزق ملتا ہے۔ اس جنت کے متعلق دوسرے مقام پر ہے کہ اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَ لَا تَعْرٰى - وَ اَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَ لَا تَضْحٰى (20:118;119) اس زندگی کے اندر تمہیں بھوک کا خوف نہیں ہوگا' پیاس کا خوف نہیں ہوگا' لباس کی محتاجی نہیں ہوگی' موسم کی سردی گرمی تمہیں نہیں ستائے گی۔ تو یہی بنیادی ضروریاتِ زندگی گنی جاتی ہیں۔

رزق پر ذاتی ملکیت کے تصور سے پہلے کی تمدنی زندگی کو قرآن نے جنتی زندگی سے تعبیر کیا ہے

یہ اس کی ابتدائی زندگی تھی جب ابھی مستبد انسانوں نے رزق کے سرچشموں کے اوپر ذاتی ملکیت کے دعوے نہیں کیے تھے' اس زمین کے اوپر میری اور تیری کی لکیریں نہیں کھینچی تھیں۔ اس وقت صورت یہ تھی کہ خدا کی یہ زمین' خدا کے بندوں کے لیے کھلی تھی' اس میں رزق کی فراوانیاں تھیں اور ان کی تقسیم کا یہ عالم تھا کہ کسی کو بنیادی ضروریاتِ زندگی سے محرومی اور محتاجی نہیں ہوتی تھی۔ جب یہ قصہ آدم آئے گا تو پھر میں عرض کرونگا کہ یہ زندگی انسان سے کیسے چھنی۔ بہر حال قرآن نے خود بتایا ہے کہ یہ اسی ارض کی زندگی ہے کیونکہ اِنِّىْ جَاعِلٌ فِى الْاَرْضِ خَلِيْفَةً (2:30) تھا۔ اسی ارض کی زندگی ہے۔ یہ زندگی ایک غلط نظام کی وجہ سے چھنی' اگر صحیح نظام کو لے آئیں گے تو پھر وہی جنت قائم ہو جائے گی۔ قرآن نے وہاں یہی کہا ہے کہ آدم نے اس کے بعد جب یہ کہا کہ کیا اب ہمیشہ کے لیے مجھ سے یہ زندگی چھن گئی؟ تو کہا کہ نہیں' فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّىْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَاىَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (2:38) کوئی بات نہیں' میری طرف سے تمہیں نظام زندگی ملے گا' تمہیں ہدایتیں ملیں گی' اس کے مطابق پھر جو زندگی کا نقشہ بنا لے گا' یہ جنت اس کے لیے مل جائے گی۔ گویا یہ جو آدم کا فردوسِ گم گشتہ ہے' وہ پھر سے اسی ارض کے اوپر بازیافت ہو سکتا ہے۔

دنیائے تصوف کے نزدیک اس طبعی زندگی کا خلاصہ اور اس کا ماحصل

پہلی جنت یہ ہے۔ اسی ارض کے اوپر یہ جنت ہے۔ اور چونکہ زندگی یہیں ختم نہیں ہو جاتی' یہاں سے آگے چلتی ہے اس لیے اس کے بعد کی جو زندگی ہے' اس کے اندر جنت ہے۔ اس اعتبار سے دیکھیے تو بنیادی طور پر دو ہی جنتیں رہتی ہیں: اس الارض کی جنت اور اس کے

بعد اخروی زندگی کی جنت۔اور یہی چیز ہے جو قرآنِ کریم نے بتائی ہے کہ وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ (55:46) جس کو اس کا خیال ہے کہ خدا کے سامنے کھڑے ہونا ہے اس کے نزدیک اس کا مقام کیا ہے اس کے لیے دو جنتیں ہیں۔مگر دنیائے تصوف والے کہتے ہیں کہ یہ زندگی قیدی کی زندگی ہوتی ہے' وہاں جو سب سے زیادہ عذاب ہوتا ہے' وہ یہ ہے کہ Variety (تنوع) نہیں ہوتی۔اور زندگی کے تقاضے یہ ہیں' اس کی Development (نشوونما) اس طرح سے ہوتی ہے۔ جب اس کے مختلف شعبے ہیں تو اس کی Development (نشوونما) تنوع چاہتی ہے' مختلف تقاضوں کی تسکین کے لیے یہاں مختلف قسم کے سازو یراق کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لیے یہ کہا ہے کہ وہ جَنَّتٰنِ (55:46) اور ذَوَاتَآ اَفْنَانٍ (55:48) اور اس کے بعد ہے کہ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ (55:49) ''ایس رب نوں تے چِھکی پون نوں جی چاہنداا ے❶'':

کبھی اے حقیقت منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں

کہا ہے کہ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ (2:25)۔آپ نے غور فرمایا' برادرانِ عزیز! لیکن یہ یہاں کی جو جنت ہے اس کے لیے ایک تصور تو وہ ہے کہ دنیا سے کٹ جاؤ' خلوت گاہوں میں چلے جاؤ' تصوف کی تجرد گاہوں میں' غاروں میں' جنگلوں میں' چلے جاؤ ''اوتھوں ڈراوندا ہووے تے اپنے ہی حجرے اچ❷'' جرأت اتنی بھی نہیں ہوتی۔تنہائی میں جتنا زیادہ سمٹتا چلا جائے اتنا زیادہ مقرب ہوتا چلا جائے' یہ Meditation (مراقبے) کی ساری چیزیں' خلوت میں ہیں۔

جنتی معاشرے میں گروہ بندی کے سلسلہ میں زوج کا قرآنی مفہوم

قرآن کہتا ہے کہ اگر تم یہ جنت چاہتے ہو تو آؤ! ہم تمہیں بتائیں کہ اس کا طریقہ کیا ہے۔کہا کہ فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ. وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ (89:29.30) اس قسم کے رفیقوں کے ساتھ ملو' كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ (9:119) یہاں فرد کو جنت نہیں مل سکتی' یہ فریبِ نفس ہے' رہبانیت کا جو ایک فرد اپنی روحانیت کے ارتقا میں سمجھتا ہے کہ جنت میں داخل ہو گیا' کہتا ہے کہ یہ غلط ہے۔یہ تو انسانوں نے مل کر اسکی تعمیر کرنی ہے' اس کے علاوہ دوسرا طریقہ ہی نہیں ہے۔اس لیے فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ - وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ (89:29.30)۔یہاں فِيْ عِبٰدِيْ (89:29) آیا ہے صاحب! آپ کو پتہ ہے کہ داخل کن میں ہونا ہے؟ ''جوٹھاں نال نہ مل جانا❸'' یہاں فِيْ عِبٰدِيْ (89:29) ہے آؤ دیکھو پہلے! کون

---

❶ اس رب کو تو عقیدت واحترام اور رفاقت کے جذبات سے لبریز ہو کر گلے ملنے کو جی چاہتا ہے۔

❷ وہاں خوف آتا ہو تو اپنے ہی حجرے میں چلے جاؤ۔

❸ غلط کار لوگوں سے نہ مل جانا۔

ہے عبد ہمارا؟ اور جو ہمارے عبد ہیں ان کی جمع ہے عباذ اور یہ دیکھو کہ یہ گروپ ہوگا۔ اور یہ جو گروپ ہوگا اس میں شامل ہونا۔ میں ابھی بتاتا ہوں کہ داخل ہونے کے لیے شرط کیا ہے؟ شرط یہ ہے کہ وَ لَهُمْ فِيهَآ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ (2:25) ۔ ہمارے ہاں تو وہ جو تصوف چلا آرہا ہے اس کے مطابق وہاں کی جنت ہے اور ''اوتھوں دیاں حوراں ❹ '' وہاں ان کے ہاں ازواج کے معنی بیویاں اور زوجہ بیوی ہوتی ہے لیکن یہ تو پنجابی کی زوجہ ہے' عربوں کے ہاں کی نہیں' قرآن کی تو نہیں۔ وہاں تو اگر ان معنوں میں بھی لیا جائے تو قرآن کے اندر یہ لفظ موجود ہے کہ بیوی کو بھی زوج کہا جاتا ہے اور خاوند کو بھی زوج کہا جاتا ہے لیکن اس کے معنی زوجہ کے ہیں ہی نہیں۔ اس کے معنی ہوتے ہیں ''ایسے رفیق جن کے ساتھ ملے بغیر' اس کی اپنی تکمیل نہ ہو' وہ Complimentary to each other ہوں''۔ ان کے ہاں بولتے ہیں کہ گاڑی کے دو پہیوں میں سے ہر پہیہ دوسرے کا زوج ہوتا ہے۔ یہ کیوں کہا ہے کہ میرے بندوں میں شامل ہو جاؤ؟

انفرادی زندگی میں انسانی ذات کی برومندی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا

Individually (انفرادی طور پہ) ایک فرد کی Development (نشوونما) ہو ہی نہیں سکتی۔ آپ Development (نشوونما) کہتے ہیں' میں کہتا ہوں کہ آپ جنگل کے غاروں میں چلے جائیں۔ وہاں نہ عذاب کا' نہ ثواب کا' نہ نیکی کا' نہ برائی کا' سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ تو سوال اٹھتے ہیں جب کوئی دوسرا انسان وہاں ہوتا ہے اور اس طرح سے تکمیل ہوتی ہے۔ وہ ازواج ہونگے۔ ''اس قسم کا ساتھی کہ ایک دوسرے سے مل کر ان کی Development (نشوونما) ہو''۔ اور اسی لیے یہاں یہ کہہ دیا کہ ساتھی تو ایک کسی کا ہو سکتا ہے۔ یہ نشہ پینے والے' آپ کو معلوم ہے کہ اس قسم کا ساتھی ڈھونڈتے ہیں۔ بھنگ بھی نشہ ہے' شراب بھی نشہ ہے' بھنگی کبھی شرابی کو نہیں تلاش کرتا' وہ بھنگی بھنگ پینے والے کو ہی تلاش کرتا ہے۔ جیسے صوفی اور مجاہد اکٹھا ہو ہی نہیں سکتا۔ شرابی شرابی کو تلاش کرتا ہے۔ اور ایک تو یہ ایسے زوج بنے اور اس میں پھر یہ ہو سکتا ہے کہ یہ بھنگیوں کے بھی زوج بن جائیں اور شرابیوں کے بھی بن جائیں۔ قرآن نے اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ (2:23) کہا ہے۔ یہ ساتھی یہ ہیں' عزیزانِ من! وہ ساتھی یہ ہیں۔ وہ عبــــادِی جن کے ساتھ ملنے سے یہ جنت بنی ہے۔ اور چونکہ وہ چھوٹے سے پیمانے سے اس کی ابتدا گھر کی زندگی سے کرتا ہے اس اعتبار سے یہ جو دو فرد اس گھر کے اندر ہوتے ہیں' جو ابتدا کرتے ہیں' Nucleus (مرکزہ) بنتے ہیں' پہلا FirstCrystal (پہلی کرن) بنتے ہیں' آپ کے معاشرے کا' اس کے لیے بھی اس نے شرط قرار دیدی کہ وہ ازواج ہونے چاہئیں اور مطہر ہونے چاہئیں۔ اگر یہ چیز نہیں ہے تو اس نے کہا ہے کہ اَلْخَبِيْثٰتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ وَ الْخَبِيْثُوْنَ لِلْخَبِيْثٰتِ (24:26) ٹھیک ہے یوں بھی جوڑتے ہوتے ہیں: خبیثات خبیثوں کے لیے' طیبات طیبوں کے لیے۔ اور یہاں جو بتایا ہے اَزْوَاجٌ

---

❹ وہاں کی حوریں ہیں۔

مُّطَهَّرَةٌ یہ ہوگی وہ جماعت' یہ ہونگے رفقا' مطہرین کی یہ جماعت' یہ ہونگے وہ عباد جن کے اندر داخل ہونے سے یہ جو جنت ہے' اس کی تشکیل ہوگی۔خصوصیت یہ بتائی ہے کہ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ (2:25)۔

جنتی معاشرے میں افسردگی و پژمردگی کا نشان تک نہیں ہوتا

یہ عربوں کے ہاں ایک محاورہ ہے ''سرسبز و شاداب رہنے والے جتنے باغات ہیں' جتنی کھیتیاں سیراب ہوتی ہیں'' ان کے لیے یہ لفظ بولا جاتا ہے۔اور جو میں نے دو الفاظ' شاداب اور سیراب بول دیئے ہیں ان میں عربوں کی کیا خصوصیت؟ شاداب [1] میں تو ''پانی'' خود ہے' سیراب دوسرا لفظ ہے۔اس میں پھر ''آب'' کا لفظ ہے۔آب کے تصور کے بغیر شادابی' شگفتگی' سیرابی ہو ہی نہیں سکتی۔کسی زبان میں ہی آپ لے لیجیے' پانی کے بغیر شادابی کیا۔اس لیے قرآن میں عربی زبان کا وہ محاورہ ''انہار'' ہے' ہمارے ہاں تو نہر بڑی ساری کینال کو ہی کہتے ہیں' کوئی ذرا سی بھی ''آڈ جنوں اسی کہنے آں [2]'' کسی میں سے جو پانی بہہ رہا ہو' بہتا پانی جا رہا ہو' اس کو عرب اپنے ہاں نہر بولتے ہیں۔اور ویسے عربوں کو صحراؤں کے اندر وہ ذرا ''اوایناں کو جیناں کوئی سوا جیا وی لبھ جاندا ہووے گا [3]'' وہ بحر کہتے ہیں۔یعنی وہ ''بحر'' سمندر کو ہی نہیں کہتے' دریا کو بھی وہ بحر کہتے ہیں۔تو ''انہار'' ہوتا ہے' پانی کی وہ نالیاں جو باغوں کے اندر پھرتی رہتی ہیں۔قرآن نے ہر جگہ اس کے لیے کہا ہے کہ وہ ہمیشہ سرسبز و شاداب رہیں گے۔دوسرے مقام پہ قرآن نے کہا ہے کہ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ ؕ اُكُلُهَا دَآئِمٌ وَّ ظِلُّهَا (13:35) یہ اس کی تشریح ہوگئی یعنی یہ کہ جن کے پھلوں اور جن کے سایوں میں دوام ہوگا' یہ ہمیشہ رہیں گے:

یہ نغمہ فصلِ گل و لالہ کا نہیں پابند
بہار ہو کہ خزاں لا الہ الا اللہ

[اقبالؒ: ضربِ کلیم]

یہ باہر کے موسموں سے متاثر نہیں ہوگا۔یہ ہے اُكُلُهَا دَآئِمٌ وَّظِلُّهَا (13:35)۔

فکرِ قرآنی سے پیدا کردہ جوئے شیر انسانی قلب و نگاہ کو کبھی پژمردہ نہیں ہونے دیتی

ایک اور مقام پہ یہ بات بھی سامنے آ گئی ہے۔کہا ہے کہ تُؤۡتِیۡۤ اُكُلَهَا كُلَّ حِيۡنٍۢ بِاِذۡنِ رَبِّهَا (14:25) خدا کے قانون کے مطابق وہ ہر موسم میں اپنا پھل دیتا چلا جاتا ہے۔اب اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ایک دفعہ آپ نے یہ لگا دیا اور اس کے بعد پھر یہ پھل دیتا

---

1. شاداب: شاد+آب اور سیراب: سیر+آب
2. جسے ہم ''نالی سی'' کہتے ہیں۔
3. ان کو پانی کا چھوٹا سا نالہ بھی مل جاتا ہوگا۔

چلا جاتا ہے یعنی ایک دفعہ آپ کے بڑوں نے وہ نظام قائم کر دیا' اب اس کے بعد آپ کو ضرورت ہی نہیں' وہ دیئے ہی چلا جائے گا۔ یہ بات نہیں ہے۔ وہ تو جب تک اس کے نیچے یہ چشمے رواں رہیں گے' اس وقت تک دیئے جائے گا۔ اور ان چشموں کے متعلق تو یہ کہا ہے کہ مومن اپنے قلوب سے یہ چشمے نکال کر وہاں بہاتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ (2:74) جب تمہارے دل پتھر ہو گئے پھر تمہارے یہ باغات کہاں رہیں گے۔ سب جل جائیں گے۔ اسی لیے یہ کہا ہے کہ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (2:82) جو اپنی اس شرط کو قائم رکھیں گے' ان کے ہاں کی یہ کیفیت ہوگی۔

ایک تو یہ ہوتا ہے کہ اس درخت یا اس فصل کے اندر یہ چیز موجود ہو کہ اس نے ایک ہی وقت کے لیے پھل دینا ہے' پھر اس کے بعد دوبارہ دینا ہی نہیں ہے۔ کیلے کو ایک فصل دینے کے بعد جتنا جی چاہے پانی دیتے چلے جایئے' وہ دوبارہ پھل نہیں دیتا' وہ ایک فصل ہوتی ہے۔ یہ جتنا وہ نظام تھا جس کے متعلق کہا تھا کہ بجلی کی چمک ہوتی ہے كُلَّمَآ اَضَآءَ لَهُمْ مَّشَوْا فِيْهِ وَ اِذَآ اَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوْا (2:20) تنہا عقل کی رو سے جو آپ نظام بناتے ہیں' اس میں یہ تو ہو جاتا ہے کہ کسی ایک موسم کے اندر وہ پھل دیدے' یہ صورت اس کی نہیں ہوتی کہ وہ ہر موسم کے اندر پھل دیتا چلا جائے۔ یہ جو دوام ہوتا ہے' وہ اسی نظام کو ہوگا' یاد رکھیے! جو خدا کی مستقل اقدار کے مطابق قائم کیا جائے گا۔ اس کے مطابق قائم کیا' قائم کرنے کے بعد یہ نہیں ہے کہ اسے چھوڑ دیا۔ یہ ایک عملِ مسلسل ہے۔ کہا ہے کہ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ (2:132) مرتے دم تک مسلم رہنا ہے' یاد رکھو۔ یعنی اس سے پہلے جہاں بھی اب تم نے مسلم ہونا چھوڑ دیا' وہیں اس نے پھل دینا چھوڑ دیا۔ یہ چیزیں نہیں ہیں کہ ''اک واری کاٹھ ماری ہوئی ہیگی اے تے چلو لکھاں پتی ہو گئے' او سرمایہ پتر تیکر پوتیاں تیکر کھاندا تریا چلا جائے ❶''۔ یہاں تو مسلسل محنت' سعی و عمل' جدوجہد' اس کا نام ہوگا۔ بڑی عجیب چیز آئی ہے۔

کائنات کی ہر شے کے مقابلے میں انسانی ذات ایک غیر متبدل شے ہے

برادرانِ عزیز! پھر اس جنت کی خصوصیت آئی ہے آپ پھر یہ کہیں گے کہ لیجیے صاحب! یہ پھر روٹی پہ آ گیا۔ کیا کروں بھئی! آپ بھی تو صبح کے کھانے کے بعد شام کو پھر روٹی کی طرف آ جاتے ہیں۔ پھر آ گئی وہ بات۔ کہا ہے کہ كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا (2:25) جب بھی ان کو یہ سامانِ زیست دیا جائے گا' بڑی غور طلب چیز' برادرانِ عزیز! آئی ہے' جس پہ سے ہم یونہی آگے گزر جاتے ہیں۔ کیا کرتے!!! تیرا پتہ نہ پائیں تو لاچار کیا کریں' یہ گزر نہ جاتے تو کیا کرتے۔ کہا کہ اس کے لیے صورت یہ ہوگی کہ جب بھی ان کو یہ سامانِ زیست دیا جائے تو زمانے کے بدلتے تقاضوں کا کیا ہوگا؟ آپ کو معلوم ہے کہ یہ زمانہ تو مسلسل چلا جا رہا ہے' اس چودہ سو سال میں دیکھیے

---

❶ یہ نہیں ہے کہ ایک دفعہ جانفشانی کی تو لاکھ پتی ہو گئے۔ وہ سرمایہ آل اولاد تک' پوتے پوتیوں تک' اب کھاتے چلو۔

ہر آن یہ چیز ہے زمانے کے تقاضے بدلتے ہیں ایک فرد کی پوری ایک زندگی کے اندر اس کے تقاضے عمر کے ساتھ بدلتے ہیں حالات کے ساتھ بدلتے ہیں قوم کے تقاضے بدلتے ہیں مرورِ وقت سے جوں جوں Passage of time (وقت کا دھارا) آگے ہوتا ہے اس کے ساتھ ساتھ یہ بدلتے چلے جاتے ہیں۔ ایک چیز تو ہے کہ وہ ان کے ساتھ ساتھ بدلتی چلی جاتی ہے لیکن اس کے باوجود ایک چیز وہ بھی ہے جو غیر متبدل ہے۔ وہ ہے انسان خود جسے یہ ''میں'' کہتا ہے جسے یہ Self (ذات) کہتا ہے یہ وہی ہوتا ہے۔ آج بھی آپ کو آج سے بیس سال پہلے کا کوئی ایک واقعہ یاد ہو جس نے اس وقت آپ کا جگر شق کیا تھا اس کی یاد آتی ہے تو اندر سے اس قسم کی ٹیس برآمد ہوتی ہے حالانکہ یہ جو جسم (Physical Body) کے متعلق آپ کا علم ہے اس بیس سال کے اندر ڈاکٹروں کی ریسرچ کرنے والوں کی تحقیق کے مطابق وہ کم از کم تین دفعہ پورے کا پورا بدل چکا ہے۔ اب نہ وہ جگر ہے نہ وہ قلب ہے نہ وہ دماغ ہے لیکن اندر کچھ ہے جو آج بھی اس واقع کا اثر اسی قسم کا لے رہا ہے جس قسم کا بیس سال پہلے تھا۔ تقاضے بدلتے ہیں مگر ایک چیز اندر ہے جو نہیں بدلے گی۔ سن لیا آپ نے! اگر اس میں تنوع نہ ہو بدلنے والے تقاضوں کے مطابق یہ سامانِ زیست نہ ملے تو آپ دیکھیں گے کہ پھر بھی وہ Regimentation (گروہ بندی) ہوگئی Monopoly (اجارہ داری) ہوگئی اس میں Development (نشوونما) نہیں ہو سکتی۔

جسمانی ضروریات کا بدلتے ہوئے تقاضوں کے مطابق سامان نشوونما کا ملتے چلے جانا رحمانیت کا خاصہ ہے

زمانے کے تقاضوں کے مطابق یہ کچھ ملنا چاہیے۔ بچے کو ڈیڑھ دو سال تک کے لیے صرف دودھ ہی دودھ ملنا چاہیے اس کے بعد خالی دودھ پہ گزارہ نہیں ہو سکتا۔ سنیے! وہ کہتا ہے کہ كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا (2:25) جس دور کے اندر بھی ان کو سامانِ زیست دیا جائے گا قَالُوْا هٰذَا الَّذِيْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ (2:25) وہ کہیں گے کہ ٹھیک ہے اسی طرح سے ہمارے پہلے جو کچھ تھے ان کو بھی ملتا چلا جا رہا تھا۔ ان سے کہا جائے گا کہ نہیں! وَ اُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا (2:25) یہ زمانے کے تقاضوں سے ملتا جلتا ہوا رزق ہے جو تمہیں دیئے چلے جا رہے ہیں۔ تشابہ کے معنی ہوتا ہے ''ملتا جلتا''۔ رزق بہر حال ایک ہی چیز ہے Maintenance (نان نفقہ) کا ذریعہ ہے نشوونما کا ذریعہ ہے۔ رزق یاد رکھیے! Physical (طبعی) نشوونما کے لیے ہی نہیں عربی زبان میں بولا جاتا یہ انسانی صلاحیتوں کی نشوونما کے لیے بھی بولا جاتا ہے۔ رزق کے معنوں کے اندر دو شرطیں ہوتی ہیں: پورے انسان کی من حیث الکل نشوونما ہو اور دوسری شرط یہ ہے کہ وہ ضرورت کے وقت ملے یعنی بروقت ملے۔ دیکھتے ہیں آپ یہ شرطیں کیا ہیں ان کے ہاں کی؟ ضرورت کے اعتبار سے یہ ملتا چلا جائے۔ اور ملے کس طرح سے؟ کہ بظاہر تو یہی کہا جائے کہ ٹھیک ہے صاحب! ایک قوم ہے اس کو آپ دیکھیے چار سو سال سے حکومت کر رہی ہے ہر قسم کا سامانِ زیست اس کے ہاں فراوانی سے ہے۔ اسی قوم کی سو سال پہلے کی تصویریں آپ دیکھیے جو لٹکی ہوئی

ہوں گی' آج دیکھیے' ان کے معاشرے میں سامانِ زیست تو ملتا جائے گا لیکن وہ کتنا بدلا ہوا ہوگا۔ وہ ملتا جلتا ہوا' زمانے کے تقاضوں کے مطابق دیئے چلے جائیں گے۔ جنت وہ ہے۔

جسمِ انسانی کی نشوونما کے ساتھ ساتھ انسانیت کی نشوونما کے تقاضے بھی پورے کرنا ضروری ہیں

عزیزانِ من! جوذوا تا افنان (55:48) ہو' Variety (تنوع) ہو' سامانِ زیست ہو' جسم کی پرورش کے لیے ہو' انسانی صلاحیتوں کی پرورش کے لیے ہو' ضرورت کے وقت ملے' ہر ایک کو ملے' دائماً ملے اور اس کے ساتھ زمانے کے تقاضوں سے اس کی صورتیں بدلتی چلی جائیں لیکن جو چیز اس میں غیر متبدل ہے اس کے اعتبار سے وہ اپنا نتیجہ غیر متبدل پیدا کرے گی۔ اس کی جو انسانیت ہے' زمانے کے تقاضوں کے مطابق اس کی نشوونما ہوتی چلی جائے متشابھا تشابہ کے ساتھ ساتھ ملتا چلا جائے۔ کہا ہے کہ انکار کرنے والوں کی کیفیت یہ ہے کہ وَقُودُهَا النَّاسُ وَ الْحِجَارَةُ (2:24) اس کے برعکس اقرار کرنے والوں اور اس کے بعد اس کے مطابق نظام قائم کرنے والوں کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کو یہاں زندگی کی وہ جنت ملے گی جس میں سامانِ زیست کی فراوانیاں اور شادابیاں' دوام ہیں' انسانی صلاحیتوں کی Development (نشوونما) تنہائی میں نہیں ہوتی بلکہ جماعت کے اندر رہتے ہوئے ہوتی ہے' جماعت اس قسم کی جوازواج پر مشتمل ہے' رفیقوں پر مشتمل ہے' رفقا وہ ہیں جو مطہرین ہیں' یہ مطہرین کی جماعت ہے۔ ان کے اندر داخل ہو جانے سے جنت کے اندر داخل ہو جانا ہے اور جنت وہ ہے جس میں زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے مطابق آپ کو یہ سارا سامان ملتا چلا جاتا ہے۔ کہا ہے کہ یہ دوسری جماعت ہے۔ پہلی وہ وَقُودُهَا النَّاسُ وَ الْحِجَارَةُ (2:24) بھی تھی' دوسری یہ آئی۔ پھر اس آیت کو لے لیجیے کہ اگر تم نے اَنْدَادًا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ کھڑے کر دیئے' تم نے انسانوں کو بھی یہاں کی' اس رزق کی ملکیت میں' شریک کر دیا تو اس کا نتیجہ وہ جہنم ہوگا جس کے اندر ان سرچشموں کے اوپر قبضہ کرنے والے خواص اجارہ دار بھی اور وہ عوام بھی (النَّاسُ وَ الْحِجَارَةُ) ان سے محتاج و محروم ہوں گے۔ یہ دونوں کے دونوں جہنم کے اندر ہونگے۔

جسم انسانی کی طرح نظام زندگی کو ٹکڑوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا

یاد رکھیے جو ابھی میں یہ کہہ رہا ہوں' یہ نظام کا ایک گوشہ ہے' جسے آپ محض روٹی کا کہتے ہیں۔ یہ کلی تو نہیں ہے' یہ تو قرآن کی ایک سورۃ ہے' ایک عمارت اس کی ایک منزل ہے۔ جو کلی انسان کی نشوونما ہے اس کے لیے ایمان' اعمالِ صالحہ' تمام اقدارِ خداوندی کے اوپر ایمان ہے۔ جیسے زندگی کی Regimentation (حصے بخرے) نہیں ہو سکتے' حصے نہیں ہو سکتے' یہ Indivisible whole (نا قابل تجزی کل) ہے' یہ ایک Unity (وحدت) ہے' یہ نا قابلِ تقسیم وحدت ہے۔ جب آپ کہتے ہیں کہ اس کی صحت بڑی اچھی ہے تو یہ معنی نہیں

ہوتے کہ اس کا جگر بڑا اچھا ہے' اس کا دل بڑا اچھا ہے' انسان کی صحت کے متعلق آپ یہ کہہ رہے ہوتے ہیں۔ یہ Indivisible whole (نا قابل تجزی کل) ہے' یہ اچھا انسان ہے۔ اور یاد رکھیے! جو شخص کسی ایک گوشے کے اندر اچھا ہے' وہ دوسرے گوشے کے اندر اچھا نہیں ہے۔ وہ انسان اچھا نہیں ہے۔ اس کے متعلق آپ اتنی سی بات کہیے گا کہ اس میں یہ ایک چیز اتنی سی اچھی ہے۔ انسان کے اچھا ہونے کے لیے' من حیث الکل' اس کی انسانیت کا اچھا ہونا بڑا ضروری ہے۔ جس طرح آپ انسان کے حصے بخرے نہیں کر سکتے' اسی طرح اس نظام کے بھی ٹکڑے نہیں کر سکتے جو انسانیت کو سنوارتا ہے۔ نظامِ کلی سے آپ کے ہاں کلی نشو ونما ہوتی ہے۔ اس کلی نظام کا نام القرآن ہے' جس کے مختلف گوشے ہیں' ان کو Facets (شئون) کہتے ہیں۔ یہ نہیں ہوتا کہ یہ الگ الگ پڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ یہ ایک ہی ہیرے کے مختلف ترشے ہوئے حصے ہیں' وہ اس کے Facets (شئون) کہلاتے ہیں۔ یہ انسانی سیرتوں کے مختلف پہلو ہیں' جو ہمارے سامنے آتے ہیں مثلاً باپ کی حیثیت' خاوند کی حیثیت' کارندے کی حیثیت' دوست کی حیثیت' مملکت کے کارپرداز کی حیثیت' یہ تمام مختلف حیثیتیں ہیں۔ انسان وہی ''ایک وحدت'' رہتا ہے' یہ نہیں ہوتا کہ ایک گوشے کے اندر وہ چمک رہا ہے' دوسرے کے اندر تاریک ہے:

گھر میں آبِ گہر کے سوا کچھ اور نہیں

قدرت نے نوعِ انسانی کی تمام نفسیاتی بیماریوں کا علاج قرآن میں محفوظ کر رکھا ہے

یہ ہیں وہ مطہر رفقا' جن کی جماعت کا نام قرآن نے جماعتِ مسلمین رکھا ہے' جن کے اندر شامل ہونے سے جنت ملتی ہے' ان کے باہمی تعاون کے ساتھ جنت ملتی ہے۔ اس میں تسالم ہوتا ہے' یہ مسلم ہوتے ہیں۔ زبان پہ لفظِ تسالم آ گیا تو میں عرض کر دوں کہ یہ مسلمین کی جماعت صحیح چیز ہے جس کو تسالم کہا گیا ہے۔ یہ کہیں تو ایک ایک گھوڑا چلاتے ہیں' کہیں آپ نے دیکھا ہوگا کہ ایک بگھی کے اندر چار چار گھوڑے جتے ہوئے ہوتے ہیں۔ یہ اتنے گھوڑے اسی صورت میں اس گاڑی کو نہایت عمدگی سے کھینچ سکتے ہیں جب ان کا پاؤں ایک جیسا اٹھے' ایک جیسا پڑے۔ گھوڑوں کا وہ گروپ جن کے پاؤں ایک جیسے اٹھیں' ایک جیسے پڑیں' ان کو تسالم کہتے ہیں۔ ان میں سے یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ کوئی سرکشی سے آگے بڑھ جائے' اسے عدوان کہتے ہیں' اسے اثیام کہتے ہیں' یہ بھی گناہ ہے' یہ جماعت سے سرکشی برتنا بھی جرم ہے۔ دوسرا لفظ قرآن نے اثم استعمال کیا ہے جس کا ترجمہ ہم گناہ کرتے ہیں۔ اثم کے معنی ہوتا ''تھک کر اپنی جماعت سے پیچھے رہ جانا''۔ وہ ناقة اثمة کہتے ہی اس اونٹنی کو ہیں ''جو تھک کر جماعت سے پیچھے رہ جائے'': انسانیت کی صفوں میں چلنے والوں کے ساتھ نہ چل سکنے والا' تھک کر' مضمحل ہو کر' افسردہ ہونے والا' جس کی صلاحیتیں مضمحل ہو جائیں' وہ تو غیر قرآنی زندگی بسر کرے گا جس کے اندر کی صلاحیتیں افسردہ ہو جائیں' افسردگی سے پیچھے رہ جانے والا۔

تصوف کی دنیا افسردگی اور اضمحلال کی ایک کٹھن اور طویل کیفیت اپنے اندر لیے ہوئے ہے

آپ کے ہاں کا یہ سارا تصوف' افسردگی اور اضمحلال سے بھرا پڑا ہے۔ اس میں دباؤ ہے' یہ صلاحیتوں کو Suppress (کچلتا) کرتا ہے تا کہ انسان مرنے سے بھی پہلے مرجائے۔ یہ افسردگی اور اضمحلال کی انتہا ہے۔ اس کے مقابلے میں سرکشی کوئی قاعدہ نہیں' کوئی ضابطہ نہیں' اندر بڑی قوتیں ہیں' یہ چیز سیلاب ہے' یہ طغیانیاں ہیں۔ اگر نہر کا پانی خشک ہوگیا تو وہ نہر نہیں رہی' پانی نے بند توڑ دیا تو وہ نہر نہیں رہتی' سیلاب ہوجاتا ہے۔ یہ ان ساحلوں کے اندر بہتا ہوا پانی ہے جس کا نام نہر ہوتا ہے۔ یہ ہیں وہ انہار جو اس باغ کے اندر سے چلنی چاہئیں تا کہ ان کی شادابیاں حدود فراموش اور قیود ناآشنا ہوجائیں۔

عزیزانِ من! آج ہم نے پچیسویں آیت لے لی اور یہاں یہ بات کہی گئی تھی کہ یہ مُتَشَابِهًا ہے اور یہ چیز مثال دے کر ہم نے بیان کی۔ اس کے متعلق ہم آئندہ لیں گے۔ یہاں یہ کہا ہے کہ تمہارے ذہن میں یہ بات پیدا ہوگئی ہوگی کہ دیکھو صاحب! یہ مثالیں دے کر یہ باتیں بیان کرتا ہے۔ قرآن سمجھائے گا کہ یہ مثالیں دے کر باتیں کیوں بتائی جاتی ہیں اور ان کا نتیجہ کیا ہوا کرتا ہے؟ اسے ہم آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ

❀......❀......❀

بارھواں باب: سورۃ البقرۃ (1)' (آیات 26 تا 29)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖۤ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا ؕ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
فَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ وَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَيَقُوْلُوْنَ مَاذَاۤ اَرَادَ اللّٰهُ
بِهٰذَا مَثَلًا ۘ يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا ۙ وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا ؕ وَمَا يُضِلُّ بِهٖۤ اِلَّا
الْفٰسِقِيْنَ ﴿٢٦﴾ الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ ۠ وَيَقْطَعُوْنَ مَاۤ اَمَرَ
اللّٰهُ بِهٖۤ اَنْ يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ فِى الْاَرْضِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿٢٧﴾ كَيْفَ
تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ۚ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ
تُرْجَعُوْنَ ﴿٢٨﴾ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِى الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۚ ثُمَّ اسْتَوٰۤى اِلَى
السَّمَآءِ فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ ؕ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿٢٩﴾

عزیزانِ من! آج اگست 1968ء کی 18 تاریخ ہے اور ہم اپنے درسِ قرآنِ مجید کے سلسلۂ نو میں سورۃ البقرۃ کی پچیسویں آیت تک سابقہ درس میں پہنچے تھے۔ اس میں، میں نے یہ عرض کیا تھا کہ قرآنِ کریم نے یہ بتایا ہے کہ جو لوگ خدا کے عطا کردہ نظامِ ربوبیت کو متشکل کریں گے' انہیں دو جنتیں عطا ہونگی: اس دنیا کے اندر بھی جنت اور اخروی زندگی کے اندر بھی جنت۔

طبعی زندگی کی ضروریات کے سلسلہ میں قرآن حکیم کے نزدیک جنت کا تمثیلی بیان

جنت کی نعما کی تفاصیل قرآنِ کریم میں بے شمار مقامات میں دی گئی ہیں۔ بہ ہیئت مجموعی ان پہ غور کیجیے تو نظر آتا ہے کہ انسان کی طبعی زندگی کے لیے جس قدر بھی آسائشوں کی' آرائشوں کی ضرورت ہے' وہ سب اس میں آجاتی ہیں لیکن جن چیزوں کا نام لے کر اس میں ذکر آیا ہے' اس میں ایک چیز کو سامنے رکھنا چاہیے اور وہ یہ ہے کہ قرآن کی اوّلیں مخاطب عرب قوم تھی۔ جو چیزیں ان کی نگاہوں میں زندگی کی خوشگواریاں' سرفرازیاں' شادابیاں' سیرابیاں تھیں' نمایاں طور پہ ان کا ذکر کیا گیا ہے۔ مثلاً ٹھنڈے صاف شفاف پانی کے چشمے' باغات پھلوں سے لدے ہوئے درخت' وہ پھل ایسے کہ جو ہر ایک کی جھولی میں آجائیں' پرندوں کے گوشت' آبِ رواں کے کنارے صوفے

بچھے ہوئے' قالین' حریرو اطلس کے پردے' چاندی سونے کے ظروف۔ یہ تمام چیزیں ایسی ہیں جو عام طور پر زندگی کی آسائشیں گنی جاتی ہیں اور خاص طور پر جو اوّلیں مخاطب قوم تھی' ان کے نزدیک تو یہ زندگی کی آسائشوں کا گویا معراج تھیں۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ بعینہٖ بالکل یہی چیزیں' جن کا ذکر یوں الفاظ میں آیا ہے' یہی دیئے جانے کی بات ہے۔ وہ بات تو ایک لفظ میں قرآن نے بیان کر کے رکھ دی کہ وَ اُتُوۡا بِہٖ مُتَشَابِہًا (2:25) ہر دور میں ملتی جلتی ہوئی جو چیزیں ہیں' ہر زمانے کے تقاضے کے مطابق' وہ دی جائیں گی۔ یہ بنیادی طور پر تو آسائشیں اور آرائشیں آئیں تفصیلی طور پر یہ نہ سمجھیے گا کہ یہ کوئی متعین چیزیں ہیں جو وہاں کہی گئی ہیں اور وہی ہیں جن کا کہا گیا ہے کہ وہ ملتی چلی جائیں گی۔ ہر زمانے کے تقاضے جس قسم کے ہونگے اس کے مطابق آرائشیں اور آسائشیں ملتی چلی جائیں گی۔ اس زمانے میں اگر آج کی آسائشوں کا ذکر کیا جاتا' تو ان کی سمجھ میں ہی بات نہ آتی کہ کیا کہہ رہے ہیں کہ آپ کو ریفریجریٹر بھی ملے۔ بہر حال یہ اس دنیا کی آسائشوں کے متعلق تھا۔

میں عرض یہ کر رہا تھا کہ قرآنِ کریم نے یہ کہا ہے کہ ضابطۂ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس دنیا میں بھی جنت ملے گی اور اخروی زندگی میں بھی جنت ملے گی۔ یہ جنّٰتن ہیں جو قرآن نے کہا ہے۔ یہاں کی جنت کے متعلق اس نے خود تفاصیل دی ہیں' آسائشوں اور آرائشوں کے نام لیے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی یہ کہہ دیا ہے کہ کہیں یہ نہ سمجھ لینا کہ بالکل یہی چیزیں ہونگی جو ملیں گی۔ کہا ہے کہ وَ اُتُوۡا بِہٖ مُتَشَابِہًا (2:25) ہر دور کے تقاضوں کے مطابق ملتی جلتی ہوئی چیزیں ملتی جائیں گی۔

جہانِ فردا کی نعما کو کوئی فرد زندگی کی موجودہ سطح میں سمجھ ہی نہیں سکتا

بہر حال یہ زندگی طبعی زندگی ہے' اس کے اندر طبعی آسائشوں کے متعلق کہا گیا ہے اور انہی آسائشوں کو جب اقدارِ خداوندی کے تابع رکھا جائے تو انسان کی ذات کی نشو و نما ہوتی جاتی ہے لیکن ان کا تعلق بہر حال اس دنیا کی زندگی سے ہے۔ اس کے بعد کی زندگی میں جو جنت ملے گی' اس کے متعلق عام طور پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ یہ ان کی جنت عجیب ہے جس میں پانی' پھل' یہ صوفے' یہ پردے حتیٰ کہ ان کے تصور کے مطابق یہ حوریں یعنی یہ جتنی چیزیں ہیں وہ ان کے متعلق کہتے ہیں کہ بعینہٖ یہی چیزیں اسی طرح کی جیسے یہ طبعی زندگی میں ہوتی ہیں' یہ چیزیں اسی انداز کی وہاں ملیں گی۔ ذرا سا بھی قرآنِ کریم کے اوپر غور کر لیا جاتا تو بات سمجھ میں آجاتی کہ قرآن نے اس جنت کے متعلق جو کچھ کہا ہے' وہ کیا ہے۔ مَثَلُ الۡجَنَّۃِ الَّتِیۡ وُعِدَ الۡمُتَّقُوۡنَ (13:35) یہ جنت جس کا وعدہ متقیوں سے کیا جاتا ہے اس کی مثال یوں سمجھیے اور اس کے آگے ہے کہ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِہَا الۡاَنۡہٰرُ ؕ اُکُلُہَا دَآئِمٌ وَّ ظِلُّہَا (13:35) ۔ یہ تمثیلی بیان ہے' مثال دے کر بات سمجھائی گئی ہے۔ دوسری جگہ بھی یہی کہا ہے کہ مَثَلُ الۡجَنَّۃِ الَّتِیۡ وُعِدَ الۡمُتَّقُوۡنَ ؕ فِیۡہَاۤ اَنۡہٰرٌ مِّنۡ مَّآءٍ غَیۡرِ اٰسِنٍ

وَّاَنۡهٰرٌ مِّنۡ لَّبَنٍ لَّمۡ يَتَغَيَّرۡ طَعۡمُهٗ ۚ وَاَنۡهٰرٌ مِّنۡ خَمۡرٍ لَّذَّةٍ لِّلشّٰرِبِيۡنَ (47:15) یعنی یہ تمام چیزیں جو گنائی ہیں' ان سے پہلے یہ کہا ہے کہ اس کی مثال یوں سمجھو جیسے......اور پھر ان سب سے زیادہ تو واضح طور پر یہ بات کہہ دی کہ فَلَا تَعۡلَمُ نَفۡسٌ مَّاۤ اُخۡفِیَ لَهُمۡ مِّنۡ قُرَّةِ اَعۡيُنٍ (32:17) کوئی شخص زندگی کی موجودہ شعور کی موجودہ سطح پہ جان ہی نہیں سکتا کہ اس کی آنکھوں کی ٹھنڈک کا سامان کیا پوشیدہ رکھا ہوا ہے۔ اتنی صاف چیز ہے۔ یہ جتنی چیزیں کہی گئی ہیں' اگر یہ طبعی طور پر Concrete (محسوس) شکل میں بعینہٖ یہ سمجھی جائیں کہ اس جنت کے اندر بھی ملیں گی تو یہ تو روزمرہ کی ہماری چیزیں ہیں یا یہ کہ ہم جان نہیں سکتے۔ ہم جان کیوں نہیں سکتے؟

مابعدالطبیعات کے حقائق زندگی کی نوعیت کو مثال کے انداز میں ہی سمجھایا جاسکتا ہے

قرآن حکیم کہتا ہے کہ کوئی نفس' کوئی جان' اس کو جان ہی نہیں سکتی کہ ہم نے اس کی آنکھوں کی ٹھنڈک کا کیا سامان پوشیدہ رکھا ہوا ہے۔ یہ سامان کا ہے کا ہے؟ کہا ہے کہ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ (32:17) یہ ان کے اپنے اعمال کا ہی نتیجہ ہے۔ یہ آنکھوں کی ٹھنڈک کا سامان ہے جسے اس موجودہ شعور کی سطح پہ کوئی جان نہیں سکتا کہ وہ کیا ہے۔ بات ہے بھی یہی' برادرانِ عزیز! یہ آخرت کی زندگی ان امور میں سے ہے جنہیں مابعدالطبیعات (Meta-physical) کہا جاتا ہے' Abstract Truths (بسیط حقیقتیں) کہا جاتا ہے۔ یہ چیزیں مثال ہی میں سمجھائی جاسکتی ہیں' ویسے سمجھ میں ہی نہیں آسکتیں کہ یہ ہیں کیا۔ ہم یہی نہیں سمجھ سکتے کہ اس زندگی کی نوعیت کیا ہوگی' ہم یہ کیا سمجھیں گے کہ وہاں کے یہ کوائف کس قسم کے ہونگے۔ قرآن انسانوں کی زبان میں نازل ہوا' اس لیے ان چیزوں کو انسانوں کی زبان میں' تشبیہات اور استعارات' سے ہی سمجھایا جاسکتا تھا۔ وہ تو وہاں کی بات ہے' یہاں کے متعلق بھی اچھے اچھے قادرالبیان اپنے عجز کا اظہار اس طرح سے کرتے ہیں کہ

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

[مرزا اسداللہ خاں غالب]

یہاں نہیں بنتی بادہ و ساغر کہے بغیر' تو وہاں کی زندگی کے متعلق جس کے لیے کہا ہے کہ کوئی شخص جان نہیں سکتا کہ اس کی آنکھوں کی ٹھنڈک کا کیا سامان ہم نے پوشیدہ رکھا ہے' تشبیہات کے انداز ہی میں بیان کیا جاسکتا تھا۔ یہی چیز ہے کہ جنت کے متعلق جہاں وہ اس دنیا کی جنت ہے' اس میں تو وہ جو اشیاء کہی گئی ہیں' وہ بہرحال اسی دنیا کی اشیاء ہیں' اسی شکل کے اندر وہ سامنے آئیں گی یا بعینہٖ وہی ہیں جو زمانے کے تقاضوں سے ملتی جلتی ہوئی ملی ہیں لیکن جہاں تک اخروی زندگی کا تعلق ہے' وہاں کی جنت' وہاں کی جہنم' وہاں کا عذاب' وہاں کا ثواب'

ان کی نوعیت و کیفیات' ان کا وہ کیف وکوائف' محسوسات میں بیان نہیں کیے جاتے' تشبیہات ہی میں بیان کیے جاسکتے ہیں۔ یہ جو چیز تھی' اس کو نظر انداز کرنے کا نتیجہ ہے کہ وہ اس قسم کے لایعنی اعتراضات کرتے ہیں اور قصور کچھ ان کا بھی نہیں ہے۔ ہمارے ہاں کی جو قدیم تفاسیر چلی آتی ہیں' آپ ان کو دیکھیے۔ آپ کو معلوم ہے کہ حوضِ کوثر کی لمبائی چوڑائی بھی لکھی ہوئی ہے' جنت کے آب خوروں کے پیمانوں کی پیمائش کی گئی ہے' وہاں کے انگور کے دانے کے متعلق کہا گیا ہے کہ ایک کوا پانچ سو سال تک چکر لگاتا رہے گا تو اس کا دور ختم نہیں ہوگا۔ اور اس سے آگے بڑھوں تو بسوز دیرم مردوں کی شریف محفلوں میں ہی ذکر نہیں کیا جاسکتا چہ جائیکہ میری بچیاں بیٹیاں بہنیں بھی بیٹھی ہیں۔ وہ جو اعتراضات پڑتے ہیں وہ ان چیزوں کے اوپر پڑتے ہیں' ورنہ قرآن ہی کے اوپر اگر رہا جاتا تو جو بھی اعتراض ہوتا اس کے متعلق یہ چیز تھی کہ قرآن کی دو آیتیں سامنے کر دی جاتیں کہ یہ مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِیْ ہے' یہ مثال ہے جنت کی تو پھر بات صاف ہو جاتی۔ قرآن کو دیکھیے کہ اس نے تشبیہات سے یہ بات بیان کی' انہی تشبیہات کی وجہ سے' اس قسم کے خیالات ابھرے' پھر خود ہماری غلط نگہی کی وجہ سے' ہم نے ان کی پیمائشیں کیں' جو چیزیں تشبیہات کے انداز میں دی گئی تھیں ان کو ہم نے محسوسات کے پیکروں میں ڈھال لیا۔ یہی مثالیں قرآن نے دی ہیں۔

اگلی آیت میں قرآن کہتا ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَسْتَحْیٖۤ اَنْ یَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا (2:26) یہ تو پھر بھی ہم نے جنت کی اشیا کی چیزوں کی مثالیں دی ہیں' وہ بہر حال بڑی نکھری اجلی نازک لطیف دی ہیں۔ کسی اس قسم کی غیر محسوس حقیقت کو سمجھانے کے لیے اگر ضرورت پڑے تو خدا کے لیے تو یہ چیز بھی کوئی ایسی شرمندگی کا باعث نہیں ہے کہ وہ ایک مچھر جیسی ناچیز کی مثال دے کر ہی سمجھا دے کہ کیا بات ہے۔ بات تو مثال دینے کی ہے' اس سے بھی کمتر درجے کی مثال دے' مثال تو مثال ہوتی ہے۔ اس لیے مثال دینے سے یہ کہہ دینا کہ صاحب! خدا جیسی بلند و بالا ہستی ہو اور وہ دیکھیے بات سمجھانے کے لیے' یہ آب خوروں کا ذکر کر رہا ہے' آفتابوں کا ذکر کر رہا ہے' سونے کے کنگن کا ذکر کر رہا ہے' یہ تھیں وہ چیزیں جو یہ کچھ کہا گیا ہے۔ اس دور کے لوگوں نے بھی کہا' آج کے مستشرق بھی کہتے ہیں' ہم نے بھی ہزار برس تک ان کے متعلق یہی سمجھا۔ اس نے کہا کہ یہ بات کوئی ایسی باعثِ ندامت نہیں ہے' جھجکو نہیں' یہ بات دھڑلے سے پیش کرو کہ تمثیلات کے رنگ میں قرآن نے یہ باتیں بیان کی ہیں' خدا نے بیان کی ہیں لیکن دیکھیے کہ کس انداز سے چودہ سو سال پہلے' اس چیز کو وہ خود ہی محسوس کرتا ہے' بیان کرتا ہے کہ فَاَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا فَیَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ (2:26) جو ان بنیادی صداقتوں پہ یقین رکھتے ہیں' وہ جانتے ہیں کہ یہ جو کہا گیا ہے' یہ الحق ہے' The Truth ہے' یہ ایک حقیقتِ ثابتہ ہے اور اس حقیقت کو محسوسات کی تمثیلات میں سمجھایا گیا ہے' بات ان پہ صاف ہو جاتی ہے' واضح ہو جاتی ہے۔ وَ اَمَّا الَّذِیْنَ كَفَرُوْا فَیَقُوْلُوْنَ مَاذَاۤ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا (2:26) بات اصل میں بنیادی حقیقتوں کے اوپر یقین اور ان کے انکار پہ ہے۔ جب ان سے انکار کیا جائے تو جو

انکار کرنے والے ہیں' ان کی کیفیت یہ ہے کہ وہ ہر بات پہ اعتراض کریں گے' انہیں ہر جگہ نقص نظر آئے گا۔ ان کی تو کیفیت یہ ہوگی کہ سر سے پاؤں تک وہ نگاہ دوڑائیں گے' مکھی کی طرح جہاں کہیں ذرا سی غلاظت ہوگی' وہیں آ کر بیٹھیں گے۔ وہ نگاہ ہی ایسی ہے کہ وہ چن چن کر برائیاں کمزوریاں' جہاں کہیں نظر پڑے' صرف ان چیزوں کو چنتی ہے۔ وہ اس لیے کہ وہ جو بنیادی صداقتیں ہیں' انہوں نے ان سے انکار کیا ہوا ہوتا ہے' اس سے زاویہ نگاہ بدل جاتا ہے:

قیمتِ　ہر　شے　زاندازِ　نگاہ

اگر بنیادی حقائق کو بھی تسلیم نہ کیا جائے تو پھر انسان کی ذہنیت زنگ آلود ہو جاتی ہے

قرآن حکیم یہ کہتا ہے کہ جو لوگ ان بنیادی صداقتوں سے انکار کریں گے' ان کی کیفیت یہ ہوگی کہ اور باتیں تو ایک طرف' وہ اس پہ ہی اعتراض جڑ دیں گے کہ صاحب! یہ کس قسم کی مثالیں دی ہیں کہ صاحب! شہد کی نہریں بہہ رہی ہونگی' کیا مثال دی ہے۔ کہتا ہے کہ بات یہ ہے کہ يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّ يَهْدِىْ بِهٖ كَثِيْرًا (2:26) بات ایک ہی ہوتی ہے' زاویہ نگاہ کے فرق سے اس کا تاثر پیدا ہوتا ہے۔ ''جس ساس دی نونخ نال نئیں بندی ہیگی اوا ندی ای شکایت لاندی اے پئی اے دیکھنا کی لیاندی ہیگی اے آٹا گندی دا سر ہلد اہیگا[1]''۔ زوایہ نگاہ کی تبدیلی سے اشیا کی ماہیت بدل جاتی ہے۔ یہ چیز ہے جسے ایمان کہتے ہیں۔ ایمان انسان کی نگاہ کا زاویہ درست کر دیتا ہے اور جب نگاہ کا زاویہ درست ہو جاتا ہے تو ہر شے اپنی اصلی حقیقت میں نظر آتی ہے: غلط شے غلط نظر آتی ہے' صحیح شے صحیح نظر آتی ہے۔ پھر جہاں تمثیلات واستعارات آتے ہیں وہاں وہ سمجھ لیتا ہے کہ یہ بات سمجھانے کے لیے بادہ وساغر کہا گیا ہے' مراد اس سے شراب نہیں ہے اور جب نگاہ کا زاویہ بدلا ہوا ہو' اس نے ہر چیز کے اندر کوئی نہ کوئی نقص نکالنا ہو' تو پھر تو یہ چیز ہے کہ صاف حقیقتیں بھی سامنے لائی جائیں تو ان میں بھی ان کو برائیاں نظر آئیں گی۔ سچ کہا تھا قرآن نے کہ يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّ يَهْدِىْ بِهٖ كَثِيْرًا (2:26) کیا بات ہے! اس بہ میں آپ دیکھتے ہیں کہ چیز ایک ہی ہے' اسی سے انسان اپنی اپنی نگاہ کے مطابق تاثر لیے جا رہا ہے۔

قرآن جس چیز پہ زور دیتا ہے' وہ یہ ہے کہ بنیادی طور پر آپ کی نگاہ کا زاویہ درست ہونا چاہیے' پھر آپ حقیقت کو حقیقت کے رنگ میں دیکھ سکتے ہیں ورنہ یہ نہیں ہوگا' اسی سے آپ گمراہ ہو جاتے ہیں۔ اب یہاں یہ بات رہی وہی بات جو میں نے پہلے کہی تھی کہ يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّ يَهْدِىْ بِهٖ كَثِيْرًا (2:26) پھر اس میں فاعل خدا کی طرف آ جاتا ہے' وہی خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ (2:6) جہاں ہم نے کہا تھا کہ یہ چیزیوں کی

---

[1] جس ساس کی اپنی بہو سے نہیں بنتی' وہ آتے ہی شکایت کرتی ہے کہ ذرا دیکھنا تو! یہ کیا ''تحفہ'' لائے ہو' اس کا تو آٹا گوندھتے بھی سر ہلتا ہے۔

گئی۔خدا کے قانون کے مطابق ہوتا یہ ہے کہ انسان کی نگاہ کا زاویہ بدلتا ہے تو اس بدلے ہوئے زاویۂ نگاہ کے مطابق وہ تاثر لے لیتا ہے۔ Human Psychology (انسانی نفسیات) ایسی ہے کہ جس نگاہ سے کسی کو دیکھتا ہے اس قسم کا تاثر لے لیتا ہے۔

اب سوال یہ رہا کہ جن کے اندر یہ غلط نگہی پیدا ہوگئی ہے تو کیا یہ غلط نگہی خدا کی پیدا کردہ ہے' کیا اسی نے ان کی نگاہ کے زاویے کو بدل دیا ہے کہ یہ یوں دیکھتا ہے اور وہ ووں دیکھتا ہے؟ عقیدۂ جبر کے ماننے والے اور ہمارے ہاں تو بدقسمتی سے کچھ اس قسم کی یہ چیز Traditional (روایتاً) چلی آرہی ہے کہ جبر ہی جبر انسان کی زندگی میں بتایا جارہا ہے' تو یہی کہیں گے کہ ہاں صاحب! یہ چیزیں خدا ہی کی طرف سے کی گئی ہیں۔اگرچہ جب آگے کہا جائے گا کہ پھر اس کے اوپر یہ عذاب وثواب کیسا؟ تو جواب ہوتا ہے کہ وہ قادرِ مطلق ہے لیکن قرآن کو جاننے والوں' اس پر نگاہ رکھنے والوں کے سامنے' جب آگے دو الفاظ آتے ہیں تو بات صاف ہو جاتی ہے۔کہا ہے کہ یہ نہ سمجھ لینا کہ خدا ہے جو ان کو گمراہ کرتا ہے: وَ مَا یُضِلُّ بِہٖۤ اِلَّا الْفٰسِقِیْنَ ۔لا الَّذِیْنَ یَنْقُضُوْنَ (2:26-27) گمراہ فاسق ہوتا ہے۔یہاں لفظ فاسق پہلی دفعہ آیا ہے۔

عربی زبان کے ہر دو مرادف کے اندر ہلکے شیڈ کا فرق ضرور ہوتا ہے

ہمارے ہاں تو فسق وفجور بس الفاظ ہیں' زبان پہ چڑھے ہوئے' ہم بول دیتے ہیں۔ہمارے ہاں گناہ ایک لفظ ہے' وہ ہر چیز کے اوپر جڑ دیا جاتا ہے۔عربی زبان میں بھی یاد رکھیے! Equivalents نہیں ہوتے' جنہیں ہم مرادف کہتے ہیں۔بالکل ایک معنی کے اندر دو لفظ زبان کا نقص ہوتا ہے۔یہ عربی زبان کا نقص نہیں ہوتا۔شاعری کے لیے تو اس کی ضرورت پڑتی ہے کہ اگر ایک لفظ کے لانے سے شعر کا وزن ٹوٹتا ہے تو اس کی جگہ کوئی دوسرا لفظ لے آیا جائے' معنی بالکل وہی ہوں مثلاً شہد اور انگبیں ایک ہی معنی کے اندر استعمال ہوتا ہے۔عربی زبان میں یہ کیفیت نہیں ہے' وہ بڑی وسیع اور جامع زبان ہے۔اس میں کوئی بھی دو مرادف آپ لے لیں گے تو ان کے معنی میں Shades کا فرق ضرور ہوگا۔اس لیے قرآن کے یہ جو الفاظ آئیں گے' ان میں سے ہر ایک کا ترجمہ گناہ کرتے چلے جانے سے بات سامنے نہیں آتی۔

لفظ فسق کا تفصیلی مفہوم

یہ فسق کیا ہوتا ہے؟ سنیے! یہ پھل مثلاً آم کا پھل یا جو بھی پھل ہے' اس کے اوپر ایک Cover (چھلکا) ہوتا ہے' اس کی جلد ہوتی ہے' اس کے اندر رہتے ہوئے اس پھل کی نشوونما ہوتی ہے' وہ اگر صحیح سالم ہے اور وہ اندر کا پھل اس کے اندر رہتا ہے' تو وہ پکتا ہے' بڑا ہوتا ہے۔بعض اوقات آپ نے دیکھا ہوگا کہ وہ پھل درخت پہ ہی کچا ہی اندر سے باہر کے چھلکے کو چیر کر ایک طرف کو نکل جاتا ہے اور آپ کو پتہ ہے کہ وہ سڑ جاتا ہے' اس کی نشوونما نہیں ہوسکتی۔عربی زبان میں اس چیز کو جس میں پھل اپنے چھلکے سے نکل کر بے راہرو ہو جاتا ہے فسق

کہتے ہیں۔اسی درخت سے لگا ہوا ہوتا ہے تو وہی سامانِ نشوونما اس کو برابر پہنچ رہا ہوتا ہے' اسی سورج کی تمازت اور روشنی کو وہ جذب کر رہا ہوتا ہے' ابھی اس کا اپنے درخت سے سلسلہ منقطع نہیں ہوا ہوتا' یاد رکھیے! وہ پھل اسی سے لگا ہوا ہوتا ہے' پک نہیں سکتا۔کیا ہوا؟ یہ کہ وہ اس پیٹرن (قالب) کے اندر نہیں رہا جس پیٹرن (قالب) کے اندر اس کی نشوونما ہونی ہے۔یہ پیٹرن (قالب) ہے جس کو آپ اسلامی نظام کہتے ہیں۔یوں تو وہ جو چھلکا ہے' وہ ایسی ناکارہ سی چیز ہوتی ہے کہ پھل کو کھانے لگیں تو اسے چھیل کر پھینک دیتے ہیں' آم کو چوسیں تو اس چھلکے کو ہم پھینک دیتے ہیں لیکن یوں تو اگر آپ بعد میں دیکھیں تو اس کی یہ کیفیت ہوتی ہے۔اہمیت اس کی یہ ہے کہ اگر اس کو پھاڑ کر ایک طرف کو پھل نکل جاتا ہے' تو وہ پھل پکتا نہیں ہے' اس کی صلاحیتیں تکمیل تک نہیں پہنچ سکتیں' یہ چھلکا اتنی اہم چیز ہے۔

آمریت کے بجائے اسلامی نظام وہ پیٹرن مہیا کرتا ہے جس کے اندر رہ کر انسان کی انسانیت نشوونما پاتی ہے

یہ نظام' یہ پیٹرن' معاشرے کی یہ پابندیاں' اس کے لیے نہایت ضروری ہوتی ہیں۔کہا ہے کہ فاسق وہ ہیں جو اس پیٹرن (قالب) کے اندر نہیں رہتے' اپنے طور پہ اپنے لیے ایک دوسرا راستہ تجویز کر لیتے ہیں۔آپ نے یضل کا لفظ دیکھا کہ فاسق کے ساتھ آیا ہے۔فاسق ہوتا ہی وہ ہے جو اس پیٹرن (قالب) کے راستے کو چھوڑ کر ایک دوسرا راستہ اپنے لیے اختیار کر لیتا ہے۔کہا ہے کہ یہ ہیں وہ۔یہ ایک ہی چیز ہے جو قرآن نے ان سے کہی ہے۔یہ جو اس پیٹرن (قالب) کے اندر رہنے والے ہیں' وہ جانتے ہیں کہ یہ کیوں کہا گیا ہے۔اور جو اس پیٹرن (قالب) کو چھوڑ دیتا ہے پھر اس کے لیے یہی جو چیزیں ہیں' مذاق کا موجب بن جاتی ہیں۔

کون ہیں یہ فاسق؟ یہاں صرف ایک لفظ کہا ہے۔قرآن کے متعدد مقامات میں آپ دیکھیں گے کہ فاسق کا لفظ مختلف مقامات پہ آیا ہے۔یہاں بھی جو قرآن پہلی دفعہ اس لفظ کو لایا ہے تو یہیں اس نے یہ بات کہہ دی کہ الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ وَ يَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَ يُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ (2:27)۔آپ دیکھیے کہ کس قدر تشریح ہو رہی ہے۔پہلی چیز تو یہ لیجیے کہ ان مثالوں یا تشبیہات کے ذریعے سے یہ بات سمجھائی ہوئی ہے کہ اس میں سے فتنہ پیدا کرنا ہے' اس میں سے دوسروں کو ورغلانا' بے راہرو کرنا ہے۔

قرآنی تشبیہات کو اگر تشبیہات کے انداز میں نہ سمجھا جائے تو فتنہ پیدا ہوتا ہے

یہاں بات ذہن میں آئی ہے' اس کو اشارتاً میں بیان کر دوں۔قرآنِ کریم نے آگے چل کر سورۃ آلِ عمران میں بتایا ہے کہ قرآنِ کریم میں ہم نے کچھ تو قوانین دیئے ہیں هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ (3:7) جو بنیادی ضابطہ ہے: قوانین' اصول' اقدار' ان کو ہم نے محکم انداز میں دیا ہے' بالکل ٹھوس انداز میں' متعین مفہوم کو لیے ہوئے دیا ہے۔ وَ اُخَرُ

مُتَشٰبِهٰتٌ (3:7) اور وہ چیزیں جن کا بسیط حقائق سے تعلق ہے ان کو ہم نے تشبیہات کے رنگ میں بیان کیا ہے۔ یہ وہی بات ہے جو یہاں پہلے آ چکی ہے۔ آگے کہا ہے کہ فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَ ابْتِغَآءَ تَاْوِيْلِهٖ (3:7) جن کے دلوں کے اندر شرارت بھری ہوئی ہوتی ہے جو فتنہ ہی پیدا کرنا چاہتے ہیں جن کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح سے کچھ اس قسم کی شرارتیں پیدا ہوں ان کی کیفیت یہ ہے کہ یہ جن چیزوں سے تشبیہ دی جاتی ہے ان کو مقصود بالذات سمجھ کر پہلے تو یہ کر لیتے ہیں کہ ہاں صاحب! یہ ٹھیک ہے وہاں شہد کی نہریں چلیں گی صاحب! اب اس کے اوپر پھر اعتراضات شروع کر دیتے ہیں۔ کہا ہے کہ بات تو یہ تھی کہ مثال کو مثال سمجھو تشبیہ کو تشبیہ سمجھو وہ جس چیز کی تشبیہ دی گئی ہے اس کو پھر سمجھو کہ تشبیہاً اس کا یہ بیان کیا گیا ہے اس سے مفہوم کیا ہو سکتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس سے تو بات صاف ہو جائے گی لیکن اگر اس شے کو بالکل آپ وہی کچھ سمجھ لیتے ہیں جس سے تشبیہ دی گئی ہے پھر اس سے فتنہ پیدا ہو جاتا ہے۔ آپ دیکھیے عزیزانِ من! لٹریچر کے اندر جتنے فتنے پھیلتے ہیں اس کی بنیادی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ جو مشبہ بہ ہوتا ہے جس کی مثال یا تشبیہ کے ذریعے تشریح کی جاتی ہے اس کو بسیط حقیقت نہیں سمجھا جاتا اس کے متعلق سمجھا جاتا ہے کہ بعینہٖ وہی چیز ہے جو یہ کہی گئی ہے۔ پتہ نہیں لٹریچر میں پہلے پہل کسی نے شراب کی سی کیفیت کے معنی میں ساقی استعمال کیا ہوگا اب جو اس کے بعد چلا ہے صرف آپ سمجھیے کہ وہ ساقی ہے پیمانے ہیں محفل ہے شراب ہے نشہ ہے گر رہے ہیں وہ سنبھال رہے ہیں یعنی سارا کچھ وہ ہو گیا جو حقیقت میں شراب کا ہوتا ہے۔ یہ ایک بڑی تفصیلی سی بحث ہے کہ لٹریچر کو بھی کس طرح سے سمجھنا چاہیے۔

ہمارے ہاں ہزار سال سے شائع ہونے والے اسلامی لٹریچر کی کیفیت اور ہماری حالت زار

قرآن نے یہاں یہ چیز کہی ہے کہ جو فتنہ پھیلانا چاہتے ہیں ان کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ ان کو تشبیہات کے انداز میں نہیں لیتے بلکہ ان کو اصل چیز میں لیتے ہیں۔ اور ہمارے ہاں تو آپ اگر اسلامی لٹریچر کو پڑھیں گے ہزار سال میں جو بحثیں آپ کے ہاں چلی ہیں وہ بحثیں ہی یہ چلی ہوئی ہیں کہ خدا نے جو کہا ہے ''میں نے اپنے ہاتھ سے بنایا'' تو خدا کے ہاتھ کی پانچ انگلیاں ہیں یا زیادہ ہونگی کتابوں پہ کتابیں لکھی ہوئی ہیں۔ ''وہ جو عرش کے اوپر بیٹھا ہے'' تو عرش کی پیمائش کیا ہے وہ بیٹھنے کا انداز کیا ہے۔ یعنی یہ کیا ہوا۔ تشبیہ سے ایک بات سمجھائی اس کو حقیقت پہ معمول کر لیا اور کہتے ہیں کہ پھر اس کے پیچھے چلے ہوئے ہیں: وَ ابْتِغَآءَ تَاْوِيْلِهٖ (3:7)۔ اور آپ کو معلوم نہیں کہ آپ کی امت میں انہی اختلافات کی بنا پر کتنے فتنے پھیلے ہوئے ہیں صاحب! جبریئے اور تجسیمیے اور پتہ نہیں کیا کیا۔ بات اتنی ہے برادرانِ عزیز! بسیط حقائق کو تشبیہات میں سمجھایا جا سکتا ہے تشبیہ کو تشبیہ سمجھنا چاہیے۔

اب انسان کے فکر کی بات ہے غور کی بات ہے کہ وہ تشبیہ سے حقیقت کے متعلق کتنی چیز اخذ کر سکتا ہے۔ جتنا غور و فکر آپ زیادہ

کریں گے' تشبیہ سے مشبہ بہ کی جو بات ہے' اچھی اور زیادہ واضح ہوتی چلی جائے گی۔ اسے کہتے ہیں قرآنی غور وفکر۔ کہا ہے کہ فاسقین یہ نہیں کرتے۔ یہ ہوتے کون ہیں؟ یعنی یہی نہیں کہ جو وہ تشبیہات کو اصلی چیز میں لے لیتے ہیں' وہ کہتے ہیں کہ زاویۂ نگاہ بدلا ہوا ہوتا ہے۔ ہوتے یہ ہیں! الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ (2:27) ۔ میں نے کہا تھا کہ درخت کے ساتھ وہ لگے ہوئے ہوتے ہیں' چھوڑ کر الگ نہیں ہوتے۔ ایک میثاق خداوندی ہے۔ میثاق تو وہی ہوگا جو پہلے آ کر عہد کرے گا۔ آ کر عہد کرتے ہیں اور اس کے بعد عملاً اس کو توڑ دیتے ہیں۔

میثاقِ خداوندی کا مفہوم اور اس کو توڑنے والوں کا ذکر

میثاقِ خداوندی کے یہ الفاظ دو مقامات پہ اور بھی آئے ہیں۔ الَّذِيْنَ يُوْفُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَ لَا يَنْقُضُوْنَ الْمِيْثَاقَ (13:20) اور اگلے لفظ جو اس آیت میں ہیں وہ ہیں وَ الَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ (13:21)۔ یہ مومنین کی صفت ہے کہ جو خدا سے عہد باندھا ہے' وہ اس کو نبھاتے ہیں' آخر تک لے جاتے ہیں۔ اور اس کے مقابلے میں فاسق وہ ہیں جو الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ وَ يَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَ يُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ (2:27) ۔ یہ دیکھیے سارے وہی الفاظ ہیں جو وہاں آئے ہیں۔ میں اس وقت صرف میثاق خداوندی کو توڑنے کی بات کر رہا ہوں وہ جو اگلی چیز ہے کہ جس کو ملانے کا حکم خدا نے دیا ہے' اس کو کاٹتے ہیں' وہ میں بعد میں لونگا۔ کہا ہے کہ میثاقِ خداوندی کو توڑتے ہیں۔ یہ میثاقِ خداوندی ہے کیا؟ پھر سمجھ میں بات آجائے گی کہ اس کو توڑنے والے کونسے ہیں؟

ہمارے ہاں کی مست الست دنیا میں تو آپ کو معلوم ہے کہ کیا ہے۔ میں نے شاید ایک درس[1] میں بتایا تھا۔ یہ وہی یومِ الست والی بات ہے جو وہ میثاقِ خداوندی لیتے ہیں۔ یومِ الست میں جو کہا ہے' جس پہ اس نے کہا کہ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰى (7:172) وہاں عہد باندھا تھا جس کا ہمیں یاد ہی نہیں ہے کہ باندھا تھا۔ وہ تو وہاں بات ہوگئی۔ قرآن ایک عہد بتاتا ہے۔ آج تو مسلمان ہونے کے لیے اتنا ہی کافی سمجھا جاتا ہے کہ اس نے پہلے کلمہ پڑھایا' پہلے چھ پڑھاتے تھے اب اس میں تخفیف ہوگئی ہے' ایک ہی کافی سمجھا جاتا ہے اور پھر اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ مَلٰٓئِكَتِهٖ وَ كُتُبِهٖ وَ رُسُلِهٖ دہرا دیا' اس کے بعد وہ مسلمان ہوجاتا ہے۔

خدا کے ساتھ کیے گئے معاہدے کی نوعیت اور اہمیت

برادرانِ عزیز! مومن ہونے کے لیے ایک معاہدہ ہے جو خدا سے کیا جاتا ہے' ایک میثاق ہے جو باندھا جاتا ہے' اس معاہدے پہ دستخط کیے جاتے ہیں۔ اور معاہدہ تو فریقین میں ہوتا ہے' ایک طرف کا ہوتا نہیں ہے' اس میں دو فریق ہوتے ہیں۔ پتہ ہے فریقِ مقابل

---

[1] اس کے لیے دیکھیے اس کتاب کا دسواں باب۔

کونسا ہوتا ہے معاہدے میں؟ خود خدا ہوتا ہے۔سوچیے تو سہی ایسا معاہدہ کہ جس میں ایک طرف انسان دستخط کر رہا ہو اور دوسری طرف خود خدا مقابلے میں دستخط کر رہا ہو۔معاہدہ کیا ہوتا ہے؟ **اِنَّ اللّٰـهَ اشْتَـرٰی مِـنَ الْـمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ** (9:111) ۔دونوں چیزیں آ گئیں Buyer (مشتری) بھی آ گیا' جنس بھی آ گئی' قیمت بھی آ گئی۔معاہدے کے اندر ساری چیزیں Specify (متعین) ہونی چاہئیں۔خدا خریدار ہے' مومن بیچنے والا ہے۔یہ کیا جنس لایا ہے بیچنے کے لیے؟ سوچیے کہ عزیز ترین جنس کیا ہوسکتی ہے: مال یا اس سے بھی آگے جان۔

میدان بدر میں میثاق کے مفہوم کا عملی ثبوت اور اس کی نوعیت

آپ کو معلوم ہے کہ بات اس چیز سے چلی آ رہی تھی کہ کائنات میں ملکیت خدا کے سوا کسی اور کی نہیں' رزق کے ذرائع اور سرچشموں کے اوپر بتا دیا گیا تھا کہ کسی ملک کی نہیں ہوسکتی' اس کا تصور خدا کے ساتھ شریک کرنے کا ہے۔یہ تو وہ چیزیں تھیں جو باہر بکھری ہوئی تھیں۔دو چیزیں تو ایسی کہی جاتی ہیں کہ انسان اپنی محنت سے جو کچھ کماتا ہے' وہ اس کا مال ہوتا ہے اور پھر جان تو اس کی جان ہوتی ہے۔یہ وہ دو چیزیں تھیں جن کے متعلق ذہن میں آ سکتا تھا کہ یہ تو ہماری ہیں۔کہا ہے کہ ٹھیک ہے' یہ تمہاری سہی' مومن ہونا چاہتے ہو تو یہ ایک اقرار نامہ ہے' اس کی رو سے یہ دونوں چیزیں تمہیں بیچنی پڑیں گی۔کہا کہ صاحب! قیمت کیا دیں گے آپ؟ کہا: **الـجنة** اس دنیا کے اندر بھی جنت' مرنے کے بعد بھی جنت۔درمیان کی بات تو بعد میں کہونگا۔پہلی بات تو کہی کہ یاد رکھو! یہ نہ سمجھ لینا کہ صاحب! یونہی ایک سادے کاغذ پہ ہمارا انگوٹھا لگا دیا' کہا تو ہے کہ جنت دیں گے' پتہ نہیں بعد میں کہیں مکر ہی نہ جائیں۔اس لیے کہ یہ دو چیزیں تو محسوس (Concrete) ہیں کہ جن کو اسی وقت دینا پڑتا ہے اور وہ شے وہ ہے' جس کے لیے اس دنیا میں بھی ہوسکتا ہے کہ بدر کی جنگ میں جان دینے والوں کو ابھی جنت یہاں نہیں مل سکی تھی۔جس زمانے میں ابھی یہ نظام یا جو جنت ہے متشکل ہو رہی ہوتی ہے' جو اس زمانے کے اندر یہاں سے گزر جاتے ہیں' ان کی قسمت کے اندر تو دینا ہی دینا ہوتا ہے: مال بھی دیا' جان بھی دی۔یہاں تو جنت ملی نہیں ہے۔کہا ہے کہ یہ نہ سمجھ لینا کہ یونہی ہم نے کہہ دیا **وَمَـنْ اَوْفٰی بِـعَهْـدِهٖ مِنَ اللّٰهِ** (9:111) خدا سے زیادہ اپنے وعدہ کو پورا کرنے والا اور کون ہوسکتا ہے' اس یقین کے ساتھ چلو۔میں نے یہ کہا تھا کہ یہ سودا ہو گیا' اس سودے کے اوپر خود خدا یہ کہتا' خریدار عام طور پہ خوش ہو جاتا ہے کہ میں نے اس میں کچھ کمایا' ہوتا ہی یہ ہے کہ میں نے کچھ کمایا۔یہاں وہ کہتا ہے کہ **فَـاسْتَبْشِـرُوْا بِبَیْـعِکُـمُ الَّذِیْ بَایَعْتُمْ بِهٖ** (9:111) او بیچنے والو! خوش ہو جاؤ' کیا کچھ تم نے بیچا ہے اور اس کے بدلے میں کیا لیا ہے۔**فَـاسْتَبْشِرُوْا** کہا ہے۔ان کو بشارتیں دو' ان کو مبارک باد دو' ''اولٹ لیاندا اے توں تے اے کچھ ❶ ''۔یہ مبارکباد ہم کیا جانیں' برادرانِ عزیز! نہ جنس بیچی' نہ کچھ اس کی قیمت وصول کی' جانتے ہی نہیں ہیں کہ

---

❶ آپ تو اس سودے میں لوٹ کے لائے ہو یہ کچھ۔

یہ قیمتیں کیا ہوتی ہیں؟ مولانا (نورالدین بن عبدالرحمٰن) جامی نے یوسف زلیخا کا قصہ لکھا ہے۔ مقام وہ ہے کہ جہاں زلیخا اتنے عرصے تک خوابوں میں دیکھے ہوئے ایک محبوب کے انتظار میں بیٹھی، وہ سامنے برسرِ بازار آ گیا، بک رہا ہے۔ اس بکنے کے اوپر تو مولانا جامی کی بات بعد میں کہونگا، اپنے ہی ہاں کے مولانا غلام رسول کی بات کیوں نہ کہہ دوں۔ اسی مقام کے اوپر وہ نقشہ سامنے لاکر کس پیارے انداز میں بات کہہ گیا ہے کہ یہ وہ جو ساری عمر تڑپ رہی تھی، وہ محبوب بازار میں بک رہا ہے، یہ خریدنے والی ہے، زلیخا ایک بہت بڑے امیر کی بیوی، ایک افسر کی بیوی، سب کچھ رکھتی ہے۔ مولانا غلام رسول کہہ رہے ہیں کہ

جس نوں یار وکیندا لبھے، تے قیمت ہووے پلّے
اس دے جیڈ نہ طالع کوئی اس دے بھاگ سوّلے

چند سکوں کے عوض (اور وہ بھی اس کے دیئے ہوئے) ایک جنت کا مل جانا، اتنا سستا سودا خدا کے سوا اور کون کرے گا

عزیزانِ من! یہاں بک رہا ہے یہ یوسف (الجنت) بیچنے والا (معاذ اللہ) کوئی چار سو بیسی نہیں کر رہا، ملاوٹ نہیں کرے گا، اسمگلنگ کا مال نہیں ہوگا۔ دے گا، وہ یقیناً دے گا۔ وہ کہتا ہے کہ قیمت موجود ہے، جان تو بہرحال موجود ہے۔ مال کے متعلق اس نے کہا ہی نہیں ہے کہ کتنا ہے، ٹھیک ہے جو بھی ہے اس نے کہا ہی نہیں ہے کہ اتنے پیسے لونگا۔ یہ دونوں چیزیں پلے ہوتی ہیں، یا بکتا ہوا مل رہا ہے، جو اس پہ بھی نہ خریدے گا اس سوختہ بخت کا کیا کہنا۔ زلیخا وہاں اسے خرید لیتی ہے۔ پوچھنے والیاں اس سے پوچھتی ہیں کہ تم نے کیا دیا، کیا خریدا۔ ایک فقرے میں (مولانا نورالدین عبدالرحمٰن) جامی کہتے ہیں کہ

جمادے چند دادی - جاں خریدی!
تعالیٰ اللہ! عجب ارزاں خریدی!!

چند سکے دھات کے دیئے اور جان خرید کر لے آئی ہوں، خدا کی قسم کتنا سستا سودا ہے جس کو خرید کر لائی ہوں۔ اور ہمارے ہاں کا غزل گو شاعر تو پھر اور انداز میں بات کرتا ہے کہ

اے کہ می پرسی چرا جامے بجانِ مے خرید

اے وہ جو تُو مجھ سے پوچھتا ہے کہ تُو نے ایک جان کے بدلے میں یہ ایک پیالہ کیوں خریدا۔ کہتا ہے

ایں سوال از آن ساقی پرس چہ ارزاں کردہ است

یہ بات اس ساقی سے پوچھو کہ اس نے اتنا سستا بیچا کیوں ہے۔ یہ بیچنے والا خدا الجنت بیچ رہا ہے لے کیا رہا ہے؟ جو ہے۔ اور پھر جان کے متعلق تو وہ کہتا ہے کہ جان دی دی ہوئی اسی کی تھی ''یعنی اے پلے اوں دتا کچھ نئیں ❶'' اور جو باقی ہے وہ کہتا ہے کہ **قُلِ الْعَفْوَ** (2:219) پہلے اپنی ضروریات پوری کرلو پھر اس سے جو فاضلہ ہو وہ لے آؤ۔ اور جو کہے کہ صاحب! ہمارے پاس تو بچا ہی کچھ نہیں اس نے کہا: کوئی بات نہیں۔ **فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَیْعِكُمُ الَّذِیْ بَایَعْتُمْ بِهٖ وَ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ** (9:111)

تعالیٰ　　اللہ!　　عجب　　ارزاں　　خریدی

''اوئے کیا سستا سودا مار یا اے تسی ❷!'' میثاقِ خداوندی ہے کہ **اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ** (9:111)۔

ہمارے ہاں عہد نامے پر عمل کرنے کا طریق

پھر اس کے بعد بتایا کہ یہ کرتے کیا ہیں۔ ہم بھی بیچتے ہیں ٹھیک ہے جی! یہ عہد نامہ لکھ دیا جان بھی بیچ دی جی! مال بھی ہم نے بیچ دیا۔ اب اس کے بعد سوال صرف یہ ہے کہ وہ لینے والا تو آتا ہی کبھی نہیں ہے۔ یہ مال رہا بھی ہمارے پاس بڑی موج ہے۔ یہ بیچا بھی ہمارے پاس اور وہ ہے عہد کا پکا جنت ہم جا کر لے لیں گے۔ وہ کہے گا کہ دیا کیوں نہیں؟ کہا کہ جی! آپ لینے کے لیے آئے نہیں۔ آپ نے یہ دیکھا ہو گا کہ بڑے بڑے مکانوں کے باہر لکھا ہوا ہوتا ہے: ایں امانت چند روزہ نزد ما است درحقیقت مالک ہر شے خدا است یعنی یہ اس کی امانت ہے میرے پاس۔ پھر اس امانت کو کرائے پہ دیتا ہے پھر اس کو بیچتا ہے پھر مرنے کے بعد بھی اولاد میں منتقل کر کے جاتا ہے۔ مالک خدا ہی ہے جی! ایک ہم ہیں جو اس طرح سے یہ سودے کرتے ہیں۔ یہ تو وہیں کی وہیں دھری ہوئی رکھی ہوئی ہے:

ترى چشمِ مست کے سامنے مے ناب یونہی دھری رہی
نہ کسی نے لی نہ کسی نے دی جو بھری تھی خم میں بھری رہی

وہ ہماری چشم میں بھری رہتی ہے ''جنت مفت اچ مار کے لے جانے آں ❸''۔ نہ بھائی! وہ خریدار بڑا اڈا اڈا ہے اس نے بات کہیں اٹھا ہی نہیں رکھی۔ **یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ فَیَقْتُلُوْنَ وَ یُقْتَلُوْنَ** (9:111) یہ جو معاہدہ ہے اس کی صداقت اس طرح سے ہوتی ہے کہ

---

❶ یہ ملا مگر اپنے ہاں سے دیا کچھ نہیں۔

❷ اے جانِ من! کیا ہی سستا سودا مارا!

❸ جنت مفت میں مار لیتے ہیں۔

جب مظلوم انسانوں کی مدد کے لیے آواز پڑتی ہے کہ جان و مال لے کر آجاؤ تو مال تو بہت پہلے کی چیز ہے، سب کچھ دے جاتے ہیں اور جانیں ہتھیلی پہ لے کر کفن بدوش میدانِ جنگ میں نکل آتے ہیں۔ پھر کیفیت یہ ہوتی ہے کہ یا تو فاتح اور منصور واپس لوٹتے ہیں اور یا وہیں جان دیدیتے ہیں۔ اور یہ ہیں وہ جان دینے والے، جن کے متعلق اس نے کہا کہ دیکھنا! کہیں ان کی اس طبعی زندگی کو خاک وخوں میں لپٹے ہوئے ہیں، یہ نہ سمجھ لینا کہ یہ مر گئے ہیں۔ بـل احیـاء یہی تمہاری زندگی میں ابھی زندہ ہیں، شبہ کیا ہی نہیں جاسکتا، یہی زندہ ہیں۔ اس معاہدے کی تصدیق ہوتی ہے: یُقَاتِلُوْنَ فِی سَبِیْلِ اللّٰهِ فَیَقْتُلُوْنَ وَ یُقْتَلُوْنَ (9:111)۔

میثاق کے سلسلہ میں ایک ضروری وضاحت

بات یہاں سے یہ آئے گی کہ یہ تو ایسا نظر آتا ہے کہ یہ جو مومنین نبی اکرم ﷺ کے زمانے کے تھے، یہ ان سے متعلق ہیں یا بہرحال ان کے بعد ہے کیونکہ یہ جو میثاق ہے یہ تو پہلی دفعہ یہاں ذکر آیا ہے اور وہاں یہ ہے کہ یہ میثاقِ خداوندی کو توڑتے ہیں۔ تو کیا یہ انہی سے متعلق ہے یعنی کیا یہ امتِ محمدیہ ﷺ سے متعلق ہے، رسول اللہ ﷺ کے سامنے والی قوم یا ان کے نام لیوا، بعد میں آنے والی قوم کے متعلق ہے؟ قرآن کہتا ہے کہ بات یہ نہیں ہے، یہ کوئی نیا میثاق نہیں ہے۔ یہ میثاق، یہ عہد نامہ چلا آرہا ہے۔ دیکھیے، عزیزانِ من! قرآن کا اعجاز حالانکہ بظاہر اس کی یہاں ضرورت نہیں تھی لیکن یہ بتانے کے لیے کہ یہ کوئی نئی بات تمہارے ساتھ نہیں کر رہے، یہی وہ عہد ہے جو چلا آرہا ہے۔ وَعْدًا عَلَیْهِ حَقًّا فِی التَّوْرٰةِ وَ الْاِنْجِیْلِ (9:111) یہ معاہدے امم سابقہ کے ساتھ بھی ہوا کرتے تھے، یہ ابھی کوئی نئی بات نہیں ہے جو ہم نے کہی ہے یا Introduce (متعارف) کی ہے۔ تورات وانجیل میں بھی یہی چیزیں تھیں، وہ تورات وانجیل جو انبیائے کرام پر نازل ہوئی تھیں، وہ نہیں جو آج ہمارے پاس ہیں یا ان لوگوں کے پاس ہیں جو اپنی نسبت ان انبیاؑ کی طرف کرتے ہیں اور ان کو تورات وانجیل کہہ کر پکارتے ہیں۔ یہ وہ نہیں ہیں، وہ محرف ہو چکی ہیں۔ کہا ہے کہ ان کے اندر یہ چیز تھی لہٰذا میثاق خداوندی، عزیزانِ من! ہمارے سامنے آگیا۔ الذین یعنی فاسق وہ ہیں جو یَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِیْثَاقِهٖ (2:27) جو خدا کے ساتھ عہد کرنے کے بعد اسے توڑ ڈالتے ہیں۔

مقامِ مومن تو میثاق کے بغیر ممکن ہی نہیں

عزیزانِ من! مومن کی Definition (تعریف) آپ نے دیکھ لی، اس کے معاہدے کو آپ نے دیکھ لیا، باز با خویشتم نگر، پھر ہمیں اپنی طرف دیکھنا چاہیے۔ یہ ٹھیک ہے آپ کہیں گے کہ Exclusively (امتیازی طور پر) ہم نے تو اس معاہدے پہ دستخط نہیں کیے۔ قرآنِ کریم تو یہ کہتا ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ۔ وہ دیکھتے ہیں آپ کتنا شدت کے ساتھ ''ان'' وہاں آیا ہوا ہے کہ یہ چیز جو تم سمجھنا چاہو کہ مومن کون

ہے' یقینی طور پر تو وہ ہے جو یہ عہد نامہ کرتا ہے۔ ٹھیک ہے آپ کہیں گے اچھے بچے'' نہ نیتی نہ قضا کیتی' نہ عہد نامہ اے کیتا' نہ اسی اوہنوں توڑیا[1]''۔ ٹھیک ہے کہ نہیں کیا' تو اپنے لیے دوسری Categories (شقیں) تجویز کیجیے' پھر مومن تو نہ کہلائیے۔ اور اگر آپ یہ کہتے ہیں کہ خیر! Employees (ملازمین) ہی سہی' ہم نے عہد نامہ کیا ہے تو یَـنۡـقُضُوۡنَ عَهۡدَ اللّٰهِ مِنۡ ۢ بَـعۡدِ مِيۡثَاقِهٖ (2:27) کے بعد پھر فاسقین کے اندر آ جائیے۔ ایک چیز یہ ہے کہ یہ فاسقین ہوئے۔ اور وَ يَـقۡطَعُوۡنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖۤ اَنۡ يُّوۡصَلَ (2:27) جن چیزوں کو ملانے کا خدا نے کہا تھا' ان کو یہ کاٹتے ہیں' ان کے ٹکڑے ٹکڑے کرتے ہیں' ان کو الگ الگ کرتے ہیں۔ خدا نے کچھ چیزیں دیں ہیں جن کو ملانے کے لیے کہا تھا اور بنیاد ہے دین کی' برادرانِ عزیز! یہی چیز۔ کیا چیز ہے جس کو ملانے کے لیے خدا نے کہا تھا؟

دین کا بنیادی نکتہ نوعِ انسانی کے لیے ایک ضابطہ حیات کے تحت نظامِ خداوندی کا قیام ہے

دین کا بنیادی نکتہ ہے وحدتِ خالق اور وحدتِ انسانیت۔ ایک خدا کے معنی عملاً یہ ہوتے ہیں: ایک ضابطۂ قانون تمام انسانوں کے لیے۔ اور نیچے پھر وحدتِ انسانیت ہوگی تو وحدتِ ضابطہ کچھ کام دے گا۔ تمام انسان ایک برادری کے افراد ہیں' ایک ہی درخت کی شاخیں ہیں اور ان کے اوپر ایک ہی ضابطۂ قانون ہے' عزیزانِ من! ایک درخت کے اوپر ایک ہی قانون نافذ ہوتا ہے۔ کبھی بھی نہیں ہوتا کہ اس کی ایک دائیں جانب جو شاخ ہے' اس پہ کوئی اور قانون ہو' بائیں جانب پہ کوئی اور قانون ہو' پتوں پہ اور قانون چلے' پھل پہ اور قانون چلے۔ وہ تو جڑ سے لے کر آخری شگوفے تک کے اندر ایک وحدت ہوتی ہے۔

پوری کائنات کے وجود کی کامیابی کا راز ایک وحدت ہونے کی بنا پر ہے

وحدت تو اتنی بنیادی چیز ہے' وحی کو تو الگ رکھیے' آج کی آپ کی سائنس کے دارومدار کے لیے دو بنیادی قانون ہیں' سائنس کے کلیے ہیں' انہی پر ساری سائنس کا دارومدار ہے۔ ایک Law of cause & effect (علت اور معلول کا قانون) ہے جسے قرآن قانونِ مکافات کہتا ہے کہ ہر عمل ایک نتیجہ پیدا کرتا ہے۔ اور دوسری بنیادی چیز The law of uniformity of nature (فطرت میں یکساں وحدت کا قانون) ہے۔ یہ قانون یہ ہے کہ اگر ایسا کرو گے تو ایسا ہوگا اور ہمیشہ ایسا ہوگا۔ وحدتِ فطرت کے معنی یہ ہیں کہ جہاں بھی وہ حالات پیدا ہوئے ہونگے' وہاں یہ قانون یہی نتیجہ پیدا کرے گا۔ چاند پہ جا کر بھی آپ دیکھتے ہیں' اس کے اندر جو جڑے ہوئے آلات ہوتے ہیں کس طرح وہی کچھ کر رہے ہوتے ہیں جو کنٹرول ان کا اس کمرے میں بیٹھے ہوئے کنٹرول روم والا کر رہا ہوتا ہے۔ پوری کائنات کے اندر وحدت ہے:

---

[1] نہ نماز کی نیت کی' نہ نماز توڑی۔ نہ یہ عہد نامہ کیا' نہ اسے ہم نے توڑا۔

لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرے کا دل چیریں

وحی کی منشا کے برعکس انسانوں کے باہمی اختلافات کی نوعیت اور اس کا علاج

برادرانِ عزیز! اسے تو آپ چھوڑ دیجئے انسانوں کے متعلق قرآنِ کریم نے یہ کہا ہے کہ **وَ مَا کَانَ النَّاسُ اِلَّآ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً** (10:19) پوری نوعِ انسانی ایک امت ہے' ایک برادری ہے۔ امتِ واحدہ پوری انسانیت ایک برادری ہے۔ **فَاخۡتَلَفُوۡا** (10:19) انسانوں نے اس کے اندر اختلاف پیدا کر دیئے۔ منشائے خداوندی تو وحدتِ انسانیت ہے' انہوں نے اختلاف پیدا کیے: خاندانوں کے اختلاف' قبائل کے اختلاف' پھر آج اقوام کے اختلاف' نسلوں کے اختلاف' رنگ کے اختلاف' زبان کے اختلاف' مذاہب کے اختلاف اور آگے چلوں تو ایک دین کے ماننے والوں کے اندر فرقوں کے اختلاف جسے قرآن نے شرک قرار دیا ہے۔ یہ ہے **یَقۡطَعُوۡنَ مَآ اَمَرَ اللّٰہُ بِہٖۤ اَنۡ یُّوۡصَلَ** (2:27) جنہیں اللہ نے ملانے کا حکم دیا تھا' یہ ان کو کاٹ کر رکھ دیتے ہیں۔ کہا ہے کہ انسانوں نے اختلاف کیا' اس اختلاف کو مٹانے کے لیے خدا نے ایک پروگرام بنایا۔ **کَانَ النَّاسُ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً** (2:213) نوعِ انسانی شروع میں بھی ایک ہی جماعت تھی' وہاں **فَاخۡتَلَفُوۡا** آ گیا' لوگوں نے اس کے اندر اختلاف پیدا کیا' تو اس کے بعد ہم نے اختلاف مٹانے کے لیے کیا کیا؟ **فَبَعَثَ اللّٰہُ النَّبِیّٖنَ مُبَشِّرِیۡنَ وَ مُنۡذِرِیۡنَ ۪ وَ اَنۡزَلَ مَعَہُمُ الۡکِتٰبَ بِالۡحَقِّ لِیَحۡکُمَ بَیۡنَ النَّاسِ فِیۡمَا اخۡتَلَفُوۡا فِیۡہِ ؕ** (2:213) انہوں نے اختلاف پیدا کیا اور اس وحدت کے ٹکڑے ٹکڑے کیے' ہم نے انبیاؑ کو بھیجنا شروع کیا۔ انبیاؑ نے آ کر ان میں کیسے وحدت پیدا کی؟ ہم نے کتاب دی' اس کے ساتھ ایک ضابطۂ قانون دیا اور ان سے کہا کہ انہیں اس ضابطہ کے تابع چلاؤ۔ **لِیَحۡکُمَ بَیۡنَ النَّاسِ فِیۡمَا اخۡتَلَفُوۡا فِیۡہِ** (2:213) جتنے اختلافی معاملات ہوں' ان کا فیصلہ اس کتاب کے مطابق کرو۔ کہا کہ وحدت پیدا ہو جائے گی۔ دیکھا آپ نے کہ وحدت پیدا کرنے کا خدائی پروگرام کیا ہے۔ نبی کتاب کے ساتھ بھیجا جاتا ہے' اس لیے کتاب دی جاتی ہے کہ جو اختلافی معاملہ ہو اس کی طرف رجوع کر کے وہاں سے فیصلہ لو' وحدت پیدا ہو جائے گی۔ اور عزیزانِ من! اوروں کو چھوڑ دیئے۔ آپ نے دیکھا کہ ہم نے کس طرح اس خدا کے پروگرام کو بھی ناکام بنا کر رکھ دیا ہوا ہے۔ نبی بھیجا ہے تو نبیؐ خاتم النبین ﷺ ' اتنا عظیم نبی ﷺ ' کتاب بھیجی تو قیامت تک کے لیے مکمل' محفوظ' ایسی کہ جس کے متعلق کہا جائے کہ تو را کشید و او دست از قلم کشید [1] ' تجھے لکھنے کے بعد اس مصنف نے قلم رکھ دیا پھر اور کچھ نہیں لکھا! یہ ایسی کتاب! یہ ہم میں اختلاف مٹانے کے لیے پروگرام تھا' ایک طریق تھا جو یوں ہم نے کیا۔ یہ اس شکل میں مکمل ترین آخری شکل میں دیا تا کہ اختلافات مٹیں۔

---

[1] تیری تصویر کھینچی تو اس مصور نے قلم رکھ دیا کہ اس کے بعد کوئی اور تصویر نہیں کھینچوں گا۔

قرآنِ حکیم کی واضح تعلیم کے باوجود ہمارا طرزِ عمل اور اس کا نتیجہ

ہم وہ کتاب رکھتے ہیں' اس نبی پہ ایمان رکھتے ہیں اور اس کے بعد ہمارے اختلافات کو آپ نے دیکھا ہے کہ ان کی کیا کیفیت ہے۔ ابھی تک تو ہم یونہی چلے ہی آ رہے تھے' کبھی کبھی یہ چیز ایک اطمینان سا دلا دیتی تھی کہ بہرحال اس امت کو کبھی تو احساس پیدا ہو گا کہ یہ چیز خدا کی منشا کے خلاف' اس کی مشیت کے خلاف' قرآن کے احکام کے خلاف ہے۔ اس نے دین میں فرقہ بندی کو شرک قرار دیا ہے' کبھی تو اس قوم کو یہ بات سمجھ میں آئے گی' کبھی یہ ہوتا تھا لیکن آج ہمارے اس دور کے اندر' اب یہ چیزیں مسلمہ طور پہ کہی جا رہی ہیں کہ صاحب! یہ جو فرقے پیدا ہو گئے ہیں' یہ تو پیدا ہو چکے' اب یہ تو مٹ نہیں سکتے' تم اس Assumption (مسلمے) پہ Proceed (چلو) کرو کہ فرقے رہنے ہیں' پھر بتایئے اسلام کیسے آگے چلے۔ کیا بات کہی صاحب!!! 'بت تو کعبے میں رکھے گئے' یہ تو رہیں گے وہاں صاحب! اب تم یہ کہو کہ یہ ان کے رکھنے کے باوجود خدا کا یہ گھر کیسے بن سکتا ہے۔ ٹھیک ہے یہ بات!!! شرک تو ہم کریں گے کیونکہ یہ تو ہو رہا ہے' تم یہ بتاؤ کہ اس شرک کے کرتے ہوئے' ہم توحید پرست کیسے ہو سکتے ہیں۔ کوئی ان کو بتائے کہ اس قسم کے فریب کا علاج کیا ہے۔ آپ نے غور فرمایا' عزیزانِ من! کہ اختلاف مٹانے کے لیے خدا نے کیا پروگرام دیا تھا' اس پروگرام کو ہمارے لیے آخری شکل کیا دی تھی اور ہم نے اس کے اندر کیا کیا؟ یہ چیز آپ نے دیکھ لی۔ وحدتِ انسانیت کے متعلق قرآن نے یہ کہا تھا اور اس کے لیے اس نے کہا تھا کہ خدا **رب العالمین** (1:2) ہے' اس کا رسول **رحمت للعالمین** (21:107) ہے' اس کی کتاب **ذکر للعالمین** (38:87) ہے' تمام نوعِ انسانی کے اختلافات کو مٹانے والی ہے اور عملاً ہماری کیفیت یہ ہے کہ وہ قوم جو اس پر ایمان رکھتی ہے' وہ اتنے فرقوں کے اندر بٹی ہوئی ہے اور اتنے اختلافات اس کے اندر ہیں' سچ ہے جو خدا نے کہا تھا کہ **وَ یَقۡطَعُوۡنَ مَاۤ اَمَرَ اللّٰہُ بِہٖۤ اَنۡ یُّوۡصَلَ** (2:27)۔ غور فرما لیا آپ نے کہ کون ہے وہ جو قرآن کے ساتھ نسبت رکھتے ہوئے اسی قرآن سے غلط راستوں پر پڑ جاتے ہیں۔ 'اسی قرآن' کے معنی آپ نے سمجھ لیے جو کہا گیا ہے۔

قرآن کی رو سے فساد کا مفہوم: انسانوں کے مابین قدم قدم پر لکیریں کھینچ دی جائیں

آگے تیسری چیز اور ہے۔ کہا ہے کہ **وَ یُفۡسِدُوۡنَ فِی الۡاَرۡضِ** (2:27)۔ یہ پہلے آ چکا ہے۔ میں نے یہ عرض کیا تھا کہ ہمارے ہاں تو فساد کے معنی یہ ''لڑائی جھگڑا دنگا'' ہوتا ہے۔ یہی کہتے ہیں کہ وہاں فساد ہو گیا۔ قرآن کی رو سے تو فساد کے یہ معنی نہیں ہیں۔ عربی زبان کی رو سے تو اصلاح کے مقابل میں یہ لفظ آتا ہے۔ صلح کے معنی ہمواریاں پیدا کرنا ہوتا ہے' فساد کے معنی ناہمواریاں پیدا کرنا ہوتا ہے۔ کہا ہے کہ **وَ یُفۡسِدُوۡنَ فِی الۡاَرۡضِ** (2:27) ناہمواریاں پیدا کرتے ہیں۔ پہلی چیز تو یہ تھی کہ اختلافات پیدا کرتے ہیں:

جغرافیے کی لائنیں' پہاڑ کے اس پار بسنے والی اور ادھر بسنے والی قوم' دریا کے ادھر بسنے والے لوگ' اُدھر بسنے والے لوگ۔ اور پھر یہ ساری دنیا جو جہنم بن رہی ہے' انہی انسانوں کی کھینچی ہوئی لکیروں کی وجہ سے بن رہی ہے۔ یہ ہے جن چیزوں کو مٹانے کا حکم خدا نے دیا تھا مگر انہوں نے ان کو کاٹا۔ پھر ان Boundary Lines (حدود کی لکیروں) کے اندر رہنے والے جو ہیں' ان کے اندر **یُفۡسِدُوۡنَ فِی الۡاَرۡضِ** (2:27) ہے یعنی ان میں باہمی طبقاتی تقسیم ہے۔ آپ قرآن کا اعجاز دیکھیے کہ پہلے ان گروہوں میں جو بانٹ ہے' وہ بتاتا ہے اور پھر ایک گروہ کے اندر جو یہ اس قسم کا باطل کا نظام پیدا ہو رہا ہے' جن میں ناہمواریاں پیدا ہوتی ہیں' کلاسز پیدا ہوتی ہیں' طبقات پیدا ہوتے ہیں ان کو گنایا ہے۔ اور عزیزانِ من! اگر وہ جو میثاق ہے' اس پہ پابندی رہے تو ان میں سے کوئی چیز بھی پیدا نہیں ہو سکتی ہے۔ یہ سارا کچھ اس لیے ہو رہا ہے کہ ایک فرد اپنی ذاتی ملکیت رکھتا ہے' پھر ایک قبیلہ' پھر ایک قوم' دوسرے کو اس میں شریک نہیں کرتی۔

قرآن حکیم کا معاشی نظام انسانیت کے مابین طبقات پیدا ہی نہیں ہونے دیتا

قرآن کا نظام پوری نوعِ انسانی کے لیے ہے' یہ جو الارض ہے' یہ للناس ہے' یہ نظام پوری نوعِ انسانی کی ضروریات پورا کرنے کے لیے ہے۔ اور اس لیے ہے کہ جس قدر انسان سعی و عمل سے کچھ کماتا ہے' جو کچھ حاصل کرتا ہے' اس میں اس کا حصہ اپنی ضروریات کے مطابق ہے' اس سے جو کچھ فاضل ہے وہ دوسروں کی ضروریات کے لیے ہے کہ جو اتنا نہیں کما سکتے' محنت نہیں کر سکتے اور پوری انسانیت کے اوپر' یہ جو پورا ضابطۂ حیات ہے' اس کا اطلاق ہو۔ پوچھیے کہ الجنۃ ملتی ہے یا نہیں ملتی لیکن فاسقین تو الجنۃ کے اندر جا نہیں سکتے۔ کہا ہے کہ یہ ہیں فاسقین' وہ پھر ان چھوٹی چھوٹی چیزوں کو حجت بنا کر ان پہ اعتراضات شروع کر دیتے ہیں' پھر ان کی تاویلیں شروع ہو جاتی ہیں اور پھر وہ سب کچھ ہوتا ہے جو ہمارے ہاں ہوتا ہے۔

جان سب سے بڑی چیز تھی' جس کے متعلق کہا گیا تھا۔ جو مال آپ کماتے ہیں' وہ جان کی موجودگی میں کما سکتے ہیں' اگر یہ نہ رہے تو پھر تو مال کے کمانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہاں اتنی سی بات کہہ کر اگلی ہی آیت میں یہ کہہ دیا کہ بتاؤ تو سہی' یہ جو کچھ کہا جا رہا ہے' تم اس سے کیسے انکار کر سکتے ہو کہ صحیح نہجِ زندگی یہ ہے۔ جان ہی کی بات سب سے بڑی تھی **کَیۡفَ تَکۡفُرُوۡنَ بِاللّٰہِ وَ کُنۡتُمۡ اَمۡوَاتًا** (2:28) تم از خود تو زندہ نہیں ہو گئے تھے تم تو اموات میں تھے۔

انسانی زندگی کے ابتدائی مراحل کی کیفیت

اس زندگی سے پیشتر کی جو زندگی ہے' یہاں اسے عدمِ حیات سے تعبیر کیا گیا ہے۔ موت کے معنی ہیں ''جب زندگی نہ ہو''۔ بات دور نکل جائے گی ورنہ Scientifically (سائنسی لحاظ سے) یہ بڑی عمدہ چیز ہے۔ ایک تو وہ مقام ہوتا ہے جس کے اندر قرآن نے یہ کہا ہے کہ **هَلۡ اَتٰی عَلَی الۡاِنۡسَانِ حِیۡنٌ مِّنَ الدَّهۡرِ لَمۡ یَکُنۡ شَیۡـًٔا مَّذۡکُوۡرًا** (76:1) کیا انسان کے اوپر ٹائم کا ایک ایسا نقطہ نہیں

گزر چکا کہ جس میں یہ کوئی قابلِ ذکر شے نہیں تھا۔اس کے بعد نظر آتا ہے کہ یہ شے مذکور میں تو آیا' ہنوز انسانی پیکر میں نہ آیا' یہ تھی وہ Inanimate (جمودکی) زندگی جس میں ابھی لائف (زندگی) بھی نہیں تھی۔کہا ہے کہ تمہاری کیفیت یہ تھی' تمہارے پاس زندگی نہیں تھی' یہ جان کس نے تم میں دی؟ فَاَحۡيَاكُمۡ (2:28) اس نے تمہیں زندگی عطا کی ہے۔تو اس اعتبار سے بھی دیکھ لیجیے کہ جس کو آپ میری جان' میری زندگی' کہتے ہیں' وہ بھی تو میری نہیں رہتی۔اور ہماری فیاضیاں دیکھیے کہ ہم نے ہی دی اور اس کے بعد پھر ہم تمہیں قیمت دے کر خریدتے ہیں۔ كَيۡفَ تَكۡفُرُوۡنَ (2:28) ''اوا یہو جئے رب کولوں انکار کرن ڈیے ہو❶''۔ وہ ٹھیک کہا اقبالؒ(1877.1938) نے کہ

جانے کہ بخشند دیگر نگیرند
آدم بمیرد از بے یقینی ❷

[زبورِ عجم(1948)'ص۔164]

انسانی زندگی کوئی ایسی چیز نہیں کہ خدا اسے دے کر پھر اس سے واپس لے لے

اور وہ تو لیتا نہیں ہے' یہ بھی عجیب چیز ہے۔وہ جو اس نے جان دی ہے' اس نے واپس لینے کے لیے تمہیں نہیں دی تھی' انسان اپنی بے یقینی کے ہاتھوں خود مر جاتا ہے' وہ جان واپس نہیں لیتا۔اور سنیے عزیزانِ من! ایک نکتے میں بات کہ یہ جو چیز فَاَحۡيَاكُمۡ (2:28) تھی پھر طبعی طور پہ ثُمَّ يُمِيۡتُكُمۡ (2:28) کی کیفیت ہوتی ہے تو اگر ہم نے ہی جو جان تمہیں دی تھی واپس لے لی ہوتی تو پھر تو سوال ہی نہیں تھا کہ تمہیں ملتی ثُمَّ يُمِيۡتُكُمۡ (2:28) تمہاری تھی یہ جان' یہ لو بھئی! ہم نے دی ہوئی تھی جب ہمارے قانون کے مطابق یہ نہیں رہتی تو تم کچھ نہیں کر سکتے۔ارے! اس وقت جو تم نے' بے چارہ ہو کر' مجبور ہو کر' اس کو دینا ہے' ہم یہ چاہتے ہیں کہ اپنے اختیار و ارادے سے اس کو دیدو' اور لے کر ہم واپس دیدیں گے' رکھ نہیں لیں گے۔یہ ہے ثُمَّ يُمِيۡتُكُمۡ (2:28)۔اتنی سی چیز ہے۔ لِيَبۡلُوَكُمۡ اَيُّكُمۡ اَحۡسَنُ عَمَلًا (11:7) موت اور زیست سے تمہیں اس بات کے مواقع بہم پہنچائے جاتے ہیں کہ ''کِڈا کو دل ہیگا اے تہاڈا؟'' اسی تے لے کے نئیں رکھ دے' اسی کی کرنی ہیگی اے❸''۔

خدا کے ساتھ فروخت کردہ زندگی موت سے کبھی آشنا ہو ہی نہیں سکتی

غور فرمایئے! تمہاری بے بسی کہ كُنۡتُمۡ اَمۡوَاتًا (2:28) از خود زندہ ہو کر بتاتے تو ذرا۔فَاَحۡيَاكُمۡ (2:28) اس نے زندگی عطا

---

❶ اے! تم اس جیسے رب سے انکار کر رہے ہو!!!
❷ اللہ تعالیٰ جو زندگی کہ آدمی کو عطا کر دیتے ہیں واپس نہیں لیتے۔آدمی اگر مر جاتا ہے تو بے یقینی کی وجہ سے مرتا ہے۔
❸ تمہارا دل کتنا بڑا ہے۔ہم یہ لے کر نہیں رکھتے۔ہمیں لے کر یہ کیا کرنی ہے!

کی۔ پھر بے بسی تمہارے ہاں کی کہ جب موت آتی ہے تو دنیا بھر کے جتن کر لیتے ہوئے نہیں رہتی، پھر ہماری فیاضیاں یہ ہیں کہ ثُمَّ یُحۡیِیۡکُمۡ (2:28)۔ اور ان کے متعلق تو یہ کہا ہے کہ وَ لَا تَحۡسَبَنَّ الَّذِیۡنَ قُتِلُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ اَمۡوَاتًا (3:169) جو اس عہد نامے کے ماتحت آ کر ہمیں جان دیدیں، ان کو یہ جو درمیان والا یُمِیۡتُکُمۡ مرحلہ ہے یہ ان پہ نہیں آتا۔ جو مجبوری سے جان دیتا ہے، وہ تو مر جاتا ہے اور جواز خود اسے پیش کر دیتا ہے کہ میں نے بیچ دی ہوئی تھی اس پہ یہ موت کا درمیانی عرصہ جو کہا جاتا ہے، یہ آتا ہی نہیں ہے۔ کیا بات ہے!

زندگی اور موت کے متعلق تصوف کا پیدا کردہ ایک ابہام: آتما، پرم آتما کا جزو ہے

عزیزانِ من! اب پھر یہ چیز ہے کہ صاحب! ہم جو جی میں آئے کرتے رہیں، اس کی گرفت سے تو ہم باہر ہیں اس کے لیے کہا ہے کہ ثُمَّ اِلَیۡہِ تُرۡجَعُوۡنَ (2:28)۔ یہ لفظ تشریح طلب آ گیا۔ ایک تو اس میں جو ثم [1] ہے، اس نے ذرا سا، تھوڑا سا ذہنوں میں نہ سمجھنے کی وجہ سے ابہام پیدا کیا ہے جبکہ قرآن میں ابہام نہیں ہے۔ اور پھر ہمارے ہاں جو ایک تصوف کی رو سے غلط تصور چلا آیا، اس نے آ کر مہرِ تصدیق ثبت کر دی۔ معنی لیے جاتے ہیں کہ خدا سے ہم چلے تھے، یہاں آ گئے، پھر اس کے بعد مر کر خدا کے پاس چلے جائیں گے۔ اور وہ تو کہتا ہے کہ وَھُوَ مَعَکُمۡ اَیۡنَ مَا کُنۡتُمۡ (57:4) تم آج بھی جہاں ہو، ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ تو جو آج ہمارے ساتھ ہے، اس کے پاس مرنے کے بعد جانے کی کیا بات ہوئی اور جو میں نے کہا تھا کہ تصوف کے غلط عقیدے نے یہ مہرِ تصدیق ثبت کر دی، وہ ویدانت کی طرف سے ہندوؤں کے ہاں سے آیا کہ یہ جو انسانی روح ہے، یہ آتما ہے، یہ اس کی پرم کا ایک جزو ہے، پرم آتما روحِ خداوندی ہے۔ انسانی روح، روحِ خداوندی کا ایک جزو ہے، یہ اپنے اصل سے الگ ہو کر اس دنیا کے اندر آ گئی۔ اور آ کر اب رو رہی ہے، مادے کے دلدل میں پھنس گئی ہے، اب یہاں سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے طریقہ یہ ہے کہ جتنی دلدل لگتی ہے، دھوتے چلے جائیے، دھوتے چلے جائیے۔ یعنی دنیا کو چھوڑتے چلے جائیے، ترک کرتے چلے جائیے دور بھاگتے چلے جائیے۔ یہ سارا کچھ کیوں کرتے چلے جائیے، اتنی مشقتیں، اتنی محنتیں، اتنی ریاضتیں کیوں؟ تاکہ یہ جو وہاں سے روح الگ ہوئی تھی، یہ پھر جا کر اپنی اصل میں مل جائے۔ ارے! نہ ہم وہاں سے، اپنی مرضی سے الگ ہوئے، وہ پتہ نہیں خود ہی ایک جھرجھری لی اور اس میں سے ہم ادھر اُدھر چنگاریوں کی طرح گر پڑے۔ گر گئے تو وہاں مٹی میں جا لگے،

---

[1] ثم حرف ہے اور عام طور پر اس مقام پر آتا ہے جہاں کوئی ترتیب بیان کرنا مقصود ہو، جیسے ہم کہتے ہیں کہ پہلے اس نے کھانا کھایا پھر پانی پیا لیکن ضروری نہیں ہے کہ یہ ہر جگہ ترتیب (پھر) کے معنوں میں ہی استعمال ہو۔ یہ "اور" کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے ثُمَّ اِلَیۡہِ تُرۡجَعُوۡنَ (2:28) کے معنی ہیں "اور اس کی طرف رجوع کرو گے" (پرویز: مطالب الفرقان جلد اول، طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)، لاہور، 1987ء، ص ص۔ 346 تا 353)۔

اب کہا جاتا ہے کہ ''بیٹھوا یتھے' دھوؤ بچو! کروصاف [1] ''۔اتنی مشقتوں میں بھری ہوئی زندگی ہے' یہ سارا کچھ برداشت کروتا کہ ہماری روح اسی طرح سے پھر ہم میں آ کر مل جائے' می نہ سز دخدائے را۔

روح کے متعلق ہندوؤں کی سوچ اور ہمارے ہاں کے عرس

نہیں' برادرانِ عزیز! یہ ساری بنیاد غلط ہے۔ یہ سوال ہی نہیں ہے۔ یہ ہے وہ جو تصوف میں رجعت الی اللہ کے معنی سمجھے جاتے ہیں یعنی پھر روحوں کا خدا کی طرف چلے جانا۔ اور اسی لیے وہ جو بزرگانِ کرام ایسے پہنچے ہوئے ہوتے ہیں' جن کی روحیں' وہ سمجھتے ہیں' کہ جا کر ملتی ہیں' ان کی موت کو موت نہیں کہتے' وصال کہتے ہیں کہ وہ وہاں مل گئے۔ اور یہ مل جانے کی خوشی ایسی ہوتی ہے جیسے شادی ہوتی ہے۔ آپ کو پتہ ہے ان کا عرس کیا جاتا ہے۔ عرس کے معنی ہی شادی ہوتے ہیں' عروس کہتے ہی دلہن کو ہیں۔ ہر سال پھر Marriage Anniversary (شادی کی سالگرہ) منائی جاتی ہے۔ یہ پتہ ہے' یہ جو God`s pulses ہیں' یہ تصور کہاں سے آیا؟ عیسائیت میں یہ جتنی Nuns ہوتی ہیں ان کو خدا کی دلہنیں کہتے ہیں۔ اور یہاں لاہور میں تو ہم نے دیکھا نہیں ہے' دلی میں ہمارے ہاں یہ جو وارثیے ہوتے ہیں یہ زعفرانی کفنی پہنے ہوئے ہوتے ہیں' عورتوں کی طرح بال رکھتے ہیں' چوڑیاں پہنی ہوئی ہوتی ہیں' ان کو کہتے ہی دلہن ہیں۔

قرآن حکیم کی روشنی میں ''اِنَا اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ'' کا مفہوم اور ہماری سوچ کا نتیجہ

دیکھیے' عزیزانِ من! کہاں کہاں سے تصور آتے ہیں! قرآن کا اِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ آتا ہے۔ یہ اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ جو راجعون ہے' اسم فاعل ہے' اس کے معنی ہوتے ہیں ''ہر وقت اُدھر قدم اٹھانے والا' اس کی طرف رجوع کرنے والا''۔ ارے ''رجوع'' کا لفظ تو ہم صحیح بولتے ہیں' وہیں جب وہ رٰجِعُوْنَ آتا ہے ''تے اوتھے پتہ نئیں کی موت پے جاندی اے [2] ''۔ کہاں آیا ہے یہ؟ کہا ہے کہ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَ الْاَنْفُسِ وَ الثَّمَرٰتِ (2:155) ہاں ایسے مواقع آئیں گے جہاں یہ چیز ہوگی: بڑے بڑے خطرات ہونگے' مال کے خطرے' جان کے خطرے' فصلوں کے خطرے' ہر قسم کا نقصان ہوگا' ایسے لوگ پھر ہونگے کہ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِیْنَ . لا الَّذِیْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِیْبَةٌ (2:155-56) جب اس قسم کے تمام صبر آزما مرحلے آئیں گے تو وہاں وہ استقامت سے ڈٹ کر ان کا مقابلہ کریں گے' ان کا قدم آگے بڑھتا ہوا چلا جائے گا۔ جوں جوں سختیاں آئیں گی' مصیبتیں آئیں گی' جوں جوں مقابلہ سخت ہوتا چلا جائے گا' ان کی زبان سے بے اختیار نکلے گا کہ اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ (2:156) ہم اس کے ہیں'

---

[1] یہاں بیٹھو' بچو! اسے دھوؤ' اسے صاف کرو۔

[2] وہاں معلوم نہیں کہ کیا موت پڑ جاتی ہے۔

ہمارا ہر قدم اس کی طرف اٹھے گا' یہ موانع ہمیں راستے میں روک ہی نہیں سکتے۔ کیا رٰجِعُوْنَ آیا ہے! بڑی عظیم چیز ہے' برادرانِ عزیز! کن مواقع پہ یہ لوگ کہتے ہیں کہ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِیْنَ . الَّذِیْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِیْبَةٌ (2:156) بشارت دو ان کو کہ ایسے مواقع کے اوپر یہ سخت سے سخت مرحلہ آتا ہے' بھاگ نہیں جاتے' وہاں سے پیٹھ نہیں دکھا دیتے' بیٹھ نہیں جاتے ہیں' ان کا ہر قدم آگے بڑھتا ہے اور کس قدر بے اختیارانہ زبان سے یہ بات آتی ہے کہ کیا مذاق ہے! تم سمجھ رہے ہو کہ یہ مصیبتیں' یہ مشقتیں' یہ پہاڑ' ہمارے سامنے لا کر گویا ہم ان سے رک جائیں گے۔ اس لیے کہ ہم تو اپنے ہیں ہی نہیں' ہم نے تو وقف کر رکھا ہے اپنے آپ کو اس کے پروگرام کی تکمیل کے لیے' ہمارا ہر قدم اس کی طرف اٹھے گا۔ کہا ہے کہ عَلَیْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ (2:157) خدا ان کے اوپر تبریک و تہنیت کے پھول نچھاور کر رہا ہے۔ یہ ہے برادرانِ عزیز! اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ (2:156)۔

اور آج سب سے بڑی مصیبت میں جب بیچارگی کا عالم ہوا تو کہا کہ اچھا بھئی! اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ (2:156)۔ سچ کہا تھا قرآن نے کہ یُضِلُّ بِهٖ كَثِیْرًا وَّ یَهْدِیْ بِهٖ كَثِیْرًا (2:26)۔ وہ انا للہ جو دوڑانے کے لیے' رگ و پے میں عزم و استقامت کی درخشندہ بجلیاں پیدا کر دیتا تھا' آج آپ کو راکھ کا ڈھیر بنا دیتا ہے' جہاں انتہائی درجے کی مایوسی ہوتی ہے' وہاں آپ اِنَّا لِلّٰهِ کہتے ہیں' جب کبھی بے ساختہ کوئی ایسی خبر سنائی جائے جو بڑی صدمے کی ہو' بے ساختہ زبان سے اِنَّا لِلّٰهِ نکلتا ہے۔ سمجھتے ہی نہیں ہیں کہ یہ کیا ہے حالانکہ یہ اِنَّا لِلّٰهِ والے وہ ہیں جن پہ عَلَیْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ (2:157) ہوگا۔ ''جیہو جئی امت اے نا ایناں دا کوئی رب ای ہور ہیگا[1]''۔ اس اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ (2:156) کے معنی یہ نہیں ہیں' برادرانِ عزیز! کہ خدا کہیں ہے' اس کی طرف یہ پھر چلے جائیں گے۔ یہ بات نہیں ہے۔ اس کے معنی کے لیے یہ مثال سمجھیے کہ بھاگے ہوئے ملزم کا معلوم ہے کہ وہ مفرور اشتہاری ملزم ہوتا ہے۔ اس سے دور بھاگتے ہیں' پھر کوشش یہ ہوتی ہے کہ سرحد پار کر جائیں وہ اس لیے کہ ان کی Jurisdiction (حد) سے باہر چلے جائیں' بچ جائیں۔ قرآن یہ کہتا ہے' کیا عجیب انداز ہے!

خدا کا قانون انسان کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہوتا ہے اور انسان کا ہر قدم اسی کی طرف اٹھ رہا ہوتا ہے

برادرانِ عزیز! آپ کو معلوم ہے کہ یہ جو ہمارے ہاں کے آخری معرکۃ الآرا کارنامے محترم ایس ایس پی[2] کے انتظام میں ہوئے ہیں'

---

[1] جیسی یہ امت ہے' ان کا رب ہی کوئی اور ہے۔

[2] یہ اشارہ اس دور کے ایس ایس پی' محترم حبیب الرحمٰن صاحب کی طرف ہے۔

یہ جتنے بڑے بڑے بدمعاش اورغنڈے مرے ہیں' ان کی بابت ہم نے کسی طرح ان سے پوچھا کہ یہ ہوتا کیسے ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ جو لوگ ہیں' ہم مہینوں ان کے پیچھے رہتے ہیں' مگر وہ گرفت میں نہیں آتے' اس لیے کہ جہاں ہم ہوتے ہیں' وہ وہاں سے دور بھاگتے ہیں۔ پھر ایک دن ایسا ہوتا ہے کہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہاں کوئی نہیں ہے' وہ خود رجوع کر کے اس طرف آجاتے ہیں' جہاں ہم بیٹھے ہوئے ہوتے ہیں۔ یہ ہے **اِلَیۡهِ رٰجِعُوۡنَ** (2:156) اور وہاں دبوچ جاتے ہیں۔ یہ پیچھے بھاگ کر پکڑنے کی تو شاید ہی کبھی کوئی واردات ہوتی ہوگی' انہوں نے بھی اپنے بچاؤ کی شکلیں اختیار کی ہوتی ہیں۔ ہوتا وہاں یہ ہے کہ وہ خود اس کی طرف آتے ہیں۔ کیا بات کہہ گیا ہے قرآن! وہ کہتا ہے کہ یہ کچھ کرنے کے بعد وہ کچھ **فساد فی الارض** کرتے ہیں' وحدتِ انسانیت کے ٹکڑے ٹکڑے کرتے ہیں' میثاقِ خداوندی کے پرزے پرزے کرتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ تم نے وحدتِ انسانیت کے ٹکڑے ٹکڑے اڑا دیئے ہیں' اس کے بعد سمجھتے ہو کہ ہم Immune (مامون ومحفوظ) ہیں' ہمیں کون پکڑ سکتا ہے' ہماری کوئی گرفت نہیں ہے' یہاں تو خدا کی بادشاہی چلتی نہیں ہے' ہم دوڑے ہوئے ہیں' ہم اس کی سرحد سے پار چلے گئے ہوئے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ او نادان جگا! تو تو خود اپنے پاؤں چل کر اس کی گرفت کے گھیرے کے اندر آرہا ہے' **اِلَیۡهِ رٰجِعُوۡنَ** (2:156) ہے' تیرا ہر قدم اس کی طرف اٹھ رہا ہے۔ یہ خدا کا قانونِ مکافاتِ عمل ہے جس کی طرف اٹھ رہا ہے۔ **وَ اللّٰهُ مُحِیۡطٌۢ بِالۡكٰفِرِیۡنَ** (2:19)۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ جو ان کے ہاں کا Cordon (کور) ہے' یہی اس کا صحیح ترجمہ ہوگا۔ **مُحِیۡطٌۢ بِالۡكٰفِرِیۡنَ** (2:19) ہم چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہیں۔ اس لیے **كَیۡفَ تَكۡفُرُوۡنَ بِاللّٰهِ** (2:28) اس سے کیسے انکار کر سکتے ہو جس کی کیفیت یہ ہے کہ یہ جو تمہاری ساری چیزیں دی ہوئیں ہیں' یہ ہماری اتنی بڑی محکم گرفت میں ہیں' ان سے انکار کرنے کے بعد کیا تمہارے ذہنوں کے اندر یہ ہے کہ صاحب! کوئی پوچھنے والا ہی نہیں ہے' جس قسم کا جی چاہے ہم وہ نظام قائم کرلیں' یہ کوئی بات ہی نہیں ہے؟ یہ سب غلط ہے۔ تمہارا ہر قدم ہمارے قانونِ مکافات کی گرفت کے اندر جا رہا ہے۔ اس لیے کہا کہ **كَیۡفَ تَكۡفُرُوۡنَ بِاللّٰهِ** (2:28) تم قوانین خداوندی کا انکار کس دلیل سے کر سکتے ہو۔ ایک طرف بخشندہ ایسا کہ یوں اتنی بڑی چیزیں بطور عطیے دیئے چلا جا رہا ہے' واپس نہیں مانگتا' دوسری طرف گرفت اتنی بڑی محکم کہ **اِنَّ بَطۡشَ رَبِّكَ لَشَدِیۡدٌ** (85:12) یہ وہ ہتھکڑیاں نہیں ہیں' جن سے ہاتھ نکال کر بعض اوقات مجرم بھاگ جایا کرتے ہیں۔ کہا ہے کہ نہیں' یہ **بَطۡشَ رَبِّكَ لَشَدِیۡدٌ** (85:12) بڑی محکم گرفت ہے۔ اور تمہاری کیفیت یہ ہے کہ ہر مجرم لاشعوری طور پر ہی سہی' ہمارے Cordon (کور) کی طرف خود بخود کھنچے چلا آرہا ہے۔ اس لیے **كَیۡفَ تَكۡفُرُوۡنَ بِاللّٰهِ** (2:28) اس خدا سے کیسے انکار کر سکتے ہو؟

عزیزانِ من! بات وہاں سے شروع کی تھی کہ **یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اعۡبُدُوۡا رَبَّكُمُ الَّذِیۡ خَلَقَكُمۡ وَ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِكُمۡ** (2:21) یہ تمام سامانِ زیست تمہارے لیے پیدا کیا' یہ آسمان سے تمہارے لیے اس قسم کی بارشیں برسائیں' رزق پیدا کیا **فَلَا تَجۡعَلُوۡا لِلّٰهِ اَنۡدَادًا**

وَّ اَنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ (2:22) تم اس کی اس ملکیت میں دوسروں کو شریک نہ کرو' یہی کفر ہے' یہی شرک ہے' یہی فسادِ فی الارض ہے' یہی انسانوں کی وحدت کو ٹکڑے ٹکڑے کرنا ہے۔ جذبۂ محرکہ اتنا ہے' برادرانِ عزیز! مگر یہ سب چیزیں اس ذاتی ملکیت سے پیدا ہوتی ہیں۔ بات وہاں سے شروع کی اور یہیں پہ آکر ختم کردی کہ هُوَ الَّذِیۡ خَلَقَ لَکُمۡ مَّا فِی الۡاَرۡضِ جَمِیۡعًا (2:29) وہ ہے جس نے خلق لَکُمۡ ' پھر وہی حرف ''ل'' نافع آ گیا' یہ تم سب کے فائدے کے لیے' جَمِیۡعًا کیا ہے۔ جو کچھ زمین کے اندر ہے' اس ارض پہ ہے' یہ سب تمہارے فائدے کے لیے ہے۔ آگے کہا کہ ثُمَّ اسۡتَوٰۤی اِلَی السَّمَآءِ (2:29)۔ اس کا ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ پھر وہ آسمانوں کے اوپر جا بیٹھا۔ یہ بالکل غلط ترجمہ ہوتا ہے۔

قرآن حکیم کی دو بنیادی اصطلاحات ارض وسما کا مفہوم

برادرانِ عزیز! سمآ اور ارض قرآن کی دو بڑی بنیادی اصطلاحیں ہیں' یوں تو ان کے معنی پستیاں اور بلندیاں ہی ہیں لیکن طبعی طور پہ دیکھا جائے تو ایک کرہ ہمارا ہے اور اس کے اوپر یہ اتنے کرّے ہیں اس سے پھر یہ نہ سمجھ لیجیے گا کہ قرآن نے تو جو اوپر ہی کرّے کہے ہیں وہی ہیں' نیچے بھی تو کرّے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ نیچے کے کروں کا ذکر کہیں کیوں نہیں آیا؟ میں کہہ رہا تھا کہ اِلَی السَّمَآءِ (2:29) کے معنی پہلے تو یہ نہ لے لیجیے گا کہ یہ صرف اوپر کے ہی کرّے ہیں۔ قرآن نے سما کہا ہے اور اکثر جگہ سماوات [1] کہا ہے' پھر سبع سماوات کہا ہے۔ اوپر کے اجرام کے متعلق تو کہا ہے' یہ ارض تو نیچے ہے اور یہ ہوسکتا ہے کہ ارض سے نیچے بھی اجرام ہوں۔ برادرانِ عزیز! یہ قرآن ہے' یہ سما اور ارض کو اُن معنوں میں لیتا ہے' جہاں آج کا سائنٹسٹ پہنچ سکا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ تو Terms (اصطلاحات) ہی Relative (اضافی) ہیں۔ تین چیزوں میں سے درمیان کی جو چیز ہوتی ہے' وہ اوپر کی چیز سے نیچے ہوتی ہے اور نیچے کی چیز سے اوپر ہوتی ہے' وہ چیز نیچے والے کا سمآء ہوتی ہے اور اوپر والے کا ارض ہوتی ہے۔ غور فرمایا آپ نے! اس ارض وسما کے لفظی معنی نیچے اور اوپر کے ہیں۔ یہ زمین کے معنی تو ہم نے نیچے کے لے لیے اور سما کے معنی اوپر کے۔ اس لیے ارض وسما کے معنی نیچے اور اوپر کے ہیں۔

یہ قرآن کا اعجاز ہے کہ ایک مقام کے اوپر ہے کہ جتنے بھی سما ہیں ان میں ہر سما کے مثل اس کی ایک ارض ہے' اس طرح ہر سما کی ایک ارض ہے یعنی ہر چیز اپنے سے نچلی چیز کی نسبت سے سماء ہے اور اپنے سے اوپر کی چیز کی نسبت سے ارض۔ کیا بات اس کتاب کی کہی جائے برادرانِ عزیز! اس میں شبہ نہیں کہ ہماری اس زمین کو بھی' جس پر ہم رہتے ہیں' ارض کہتے ہیں لیکن چونکہ ہر بلندی کو' اس کی بلندی کی نسبت سے' سما اور ہر پستی کو' اس کی بلندی کی نسبت سے' ارض کہتے ہیں' اس لیے ارض و سما کے معنی کائنات کی پستیاں اور بلندیاں ہونگے اور جب ارض کو سما کے مقابل میں لایا جائے گا تو سما کا مفہوم کائناتی زندگی اور اس کا نظام ہوگا اور

---

[1] قرآنِ کریم میں السماء کا لفظ 120 بار آیا ہے اور السمٰوٰت 190 بار۔

ارض سے مراد انسان کی معاشرتی معاشی اور تمدنی زندگی۔ نیز سما یا سمٰوٰت سے مراد محض اجرام فلکی ہی نہیں ہونگے بلکہ فضا کی بلندیوں میں پھیلی ہوئی تمام توانائیاں مثل ایتھر اور ایٹم وغیرہ بھی ہونگے یعنی فضا مع اپنے مشمولات کے ❶۔

برادرانِ عزیز! اب ارض و سما کے معنی صاف ہو گئے۔ لہٰذا جب یہ چیز کہی جائے گی کہ ارض میں یہ چیز کہی' پھر ثُمَّ اسۡتَوٰۤی اِلَی السَّمَآءِ (2:29) تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ یہ نیچے کی چیز تھی' پھر وہ کہیں بلندیوں کے اوپر چلا گیا اور پھر استویٰ کے معنی تو کہتے ہیں کہ جم کر بیٹھ گئے۔ یہ بات نہیں ہے۔ ارض اور سما یعنی جو کچھ بھی اس کائنات کے اندر ہے' وہ بات تو اس لیے کہی کہ جہاں تم نے بسنا ہے' اس میں ہم نے تمہارے لیے سامانِ زیست رکھ دیا۔ یہ سامانِ زیست جو رکھ دیا تو یہ نہیں ہے کہ ہم نے اس کو کھود کر اندر بوریاں بھر کر رکھ دیا اور بس ہم چلے گئے۔ یہ بات نہیں ہے۔ یہ سارا سلسلہ ایسا ہے کہ یہ سب کچھ اس کے اندر اس پورے نظم و نسق کے ماتحت پیدا ہوتا ہے' اس کے لیے ضروری ہے کہ ارض میں اگر یہ چیزیں بطور امکانات رکھی ہیں تو باقی چیزیں جو کائنات کے اندر ہیں' ان پہ بھی ہمارا کنٹرول ہونا چاہیے۔ اسۡتَوٰۤی کے معنی ''مرکزی کنٹرول'' ہوتا ہے جسے Throne (تخت) کہتے ہیں جسے آپ حکومت کہتے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ وہ کوئی لکڑی کا یا جواہرات کا بنا ہوا تختہ نہیں ہوتا۔ Throne (تخت و تاج) کے معنی آپ سمجھتے ہیں کیا ہوتا ہے' تاج کے معنی کیا ہوتا ہے؟ عرش کے معنی عربی زبان میں یہ ہوتے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ سارا سلسلۂ کائنات ہم نے بنایا اور اس کا مرکزی کنٹرول اپنے ہاتھ میں رکھا ہوا ہے۔ یہ کہا کہ یہ جو ارض ہے' اس کو آپ Independent Unit (آزاد وحدت) نہ سمجھ لیجیے کہ اس کا باقی اجرام سے یا کائنات کی باقی چیزوں سے تعلق نہیں ہے' یہ ہم نے ایک خود کفیل کرہ بنا دیا کہ اس کے اندر سب کچھ از خود جا رہا ہے۔ یہ نہیں ہے۔ یہ تو ان کے آپس کے اندر اس قدر ربطِ باہمی ہے' ان کے اندر اس قدر نظم و ضبط ہے۔ جیسا میں نے ابھی کہا تھا کہ

لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرے کا دل چیریں

انسان کی انگلی کا ایک ہلکا سا اشارہ پوری کائنات میں ارتعاش پیدا کر دیتا ہے

یہ جیمز جینز (James Jeans) نے ہی غالباً لکھا ہے۔ وہ ہمارے دور کا بہت بڑا علم الافلاک کا ماہر ہے۔ یہ چیز اس کی کتاب "The Mysterious Universe" (پراسرار کائنات) میں ہے۔ اس میں وہ بتا رہا ہے کہ ان فضاؤں کے ساتھ انسان کا تعلق کتنا ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ یہ ایک انگلی' جو ایک مقرر ہلاتا ہے' اس کو پتہ نہیں ہے کہ تمہارے الفاظ میں' اس کی جنبش عرش تک جا کر پہنچتی ہے۔ ایک حرکت جو فضا کے اندر تمہاری انگلی پیدا کرتی ہے' تمہیں پتہ نہیں ہے غیر محسوس Atomic (ایٹمی) انرجی' یہ نیوکلیر' شعاعیں اس حرکت کو کہاں

---

❶ پرویزؒ: لغات القرآن (جلد دوم)' ادارہ طلوعِ اسلام' لاہور' 1960' ص ص۔ 903 اور 904۔

کہاں لے جاتی ہیں اور وہاں اس کا کیا کیا اثر ہوتا ہے۔ اس لیے یہاں سما اور ارض الگ الگ کرّے نہیں ہیں جس کا ایک دوسرے کے ساتھ تعلق نہ ہو۔ یہاں تو اس طرح ان میں ربطِ باہمی ہے۔

عرش کا مفہوم ''مرکزی کنٹرول'' کا ہے نیز ارض وسما کی مزید وضاحت

اس ربطِ باہمی کو قائم رکھنے کے لیے ایک مرکزی کنٹرول کی ضرورت ہے۔ وہ کنٹرول ہے جس کو عرش کی تشبیہ سے، تمثیل سے، قرآن نے بیان کیا ہے۔ کہا ہے کہ اس کا مرکزی کنٹرول ہم نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہوا ہے۔ یہ جو **فَسَوّٰهُنَّ سَبۡعَ سَمٰوٰتٍ** (2:29) ہے، اس میں **سَبۡعَ سَمٰوٰتٍ** بھی ہمارے ہاں بڑی غلط فہمی پیدا کرتا ہے۔ اس کے معنی ہمارے ہاں ''سات آسمان'' لیے جاتے ہیں۔ عربی زبان میں یہ ٹھیک ہے کہ **سَبۡعَ** سات کے لیے بھی آتا ہے لیکن اس عربی زبان کی ایک خصوصیت ہے کہ وہاں ایک عدد کو عددِ کامل (Perfect Number) عدد تامہ کہتے ہیں یا کامل کہتے ہیں، جیسے ہمارے محاورے میں کہتے ہیں کہ ''میں وہاں بیسیوں دفعہ گیا، سینکڑوں بار تمہیں سمجھایا ہے، ہزار بار کہا ہے''۔ آپ جانتے ہیں کہ اس کے معنی یہ سات کا عدد نہیں ہوتا، یہ گنتی نہیں ہوتی۔ کم از کم میں، جہاں ہم لیتے ہیں، وہاں اس کے معنی Several ہوتے ہیں، متعدد ہوتے ہیں، یہ متعین نہیں ہوتے۔ عربوں کے ہاں، یہ جو چیز ہم نے کہا ہے بیسیوں، سینکڑوں، ہزاروں، یہ ہمارے ہاں لیتے ہیں، ان کے ہاں سبع سے سات، سترہ، ستر ہزار لیتے ہیں۔ اور آپ نے بھی وعظوں کے اندر یہ ستر ہزار مرتبہ اور ستر ہزار گرز، ستر ہزار زنجیریں سنا ہوگا، وہ یہ ستر ہزار یوں نہیں ہوتا۔ اس سے مراد کوئی معین عدد نہیں ہوتا تاوقتیکہ وہ گنتی کے اندر نہ کوئی چیز لے کر آئیں، اس کے معنی متعدد ہے۔ یہ بلندیاں، یہ پستیاں متعدد (Several) ہیں۔

پہلی چیز تو اس میں کہی ہے کہ **خَلَقَ لَكُمۡ مَّا فِى الۡاَرۡضِ** (2:29) یہ تو آ گئی وہ چیز جو نظامِ ربوبیت کے بارے میں اس نے شروع کی تھی۔ اور اسی کے سلسلے میں یہ سارا کچھ کہتا چلا آ رہا ہے کہ جو کچھ اس نے پیدا کر دیا، اس کی ملکیت ہے، وہ کسی اور کی ملکیت نہیں ہو سکتا۔ یہ وحدتِ انسانیت کس طرح سے پوری ہوگی! **لَكُمۡ** کہا، دوسری جگہ سورۃ الرحمٰن میں کہا ہے **وَالۡاَرۡضَ وَضَعَهَا لِلۡاَنَامِ** (55:10) ارض کو ہم نے **انعام** کے لیے پیدا کیا، تمام مخلوق کے لیے پیدا کیا۔ وحدتِ انسانیت میں وحدتِ رزق پہلی چیز آ گئی لیکن یہاں ایک اور چیز بھی تھی، برادرانِ عزیز! اور وہ بڑی اہم ہے۔ یہ ہے **ثُمَّ اِلَيۡهِ تُرۡجَعُوۡنَ** (2:28) یہ قانونِ مکافاتِ عمل کی ہمہ گیری ہے۔ اس سلسلے میں جو ارض وسما ہے، اس کے کیا معنی ہیں، یہ قرآن کا بڑا اہم مقام ہے۔

محیر العقول سلسلہ کائنات کی تخلیق کا مقصد، مدعا، وسعت وعظمت اور انسانی شعور کی محدودیت

اکثر پوچھا جاتا ہے کہ صاحب! اس کائنات کی تخلیق کا مقصد کیا ہے؟ What is the purpose behind it? ۔ خدا کا ایک

تو پوری کائنات Overall (کُلی) پروگرام ہے اس کے لیے اس Creator (خالق) کا کوئی عظیم Purpose (مقصد) ہے۔ جہاں تک ہمارا تعلق ہے اس نے ایک Purpose (مقصد) ہمیں سمجھایا ہے اور ہمارے لیے اتنا ہی ہونا چاہیے تھا۔ وہ جو بڑی اسکیم ہے اس کے متعلق، وہ بات تو ہمارے Finite (محدود) ذہن کے اندر کوئی لامحدود (Infinite) چیز آ ہی نہیں سکتی۔ ہم تو اس لامحدود کائنات کا تصور نہیں کر سکتے، ہم تو وقت کا لامحدود تصور نہیں کر سکتے، ہمیں کہیں سے وقت شروع کرنا پڑتا ہے، کہیں جا کر ختم کرنا پڑتا ہے۔ لامحدود (Infinite)، محدود (Finite) کے اندر نہیں آ سکتا، اس کا جو Purpose (مقصد) ہے، وہ ہم Overall (مجموعی طور پر) نہیں سمجھ سکتے۔ ہمارا تعلق کس چیز سے ہے، وہ اس نے سمجھا دیا ہے۔ سنیے! وہ کیا بتاتا ہے اس کائنات کی تخلیق کا Purpose (مقصد)؟

کائنات کو پیدا کرنے کا مقصد یہ ہے کہ کسی انسان کا کوئی عمل نتیجہ پیدا کیے بغیر نہ رہ جائے

جہاں تک ہمارا تعلق ہے، اس نے کہا ہے کہ وَخَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ (45:22)۔ پہلی چیز تو یہ تھی کہ یہ خواب نہیں، سراب نہیں، کھیل نہیں، یہ ہم نے As a reality پیدا کیا ہے، بالحق پیدا کیا ہے، یہ ایک حقیقت ہے۔ جب یہاں آؤنگا تو میں عرض کرونگا کہ تخلیقِ کائنات کے متعلق، کتنے بڑے بڑے جو باطل نظریئے تھے، قرآن ان سب کو، بالحق کہہ کر تردید کر گیا، اس وقت میرا مقصد اگلا ہے۔ اس کائنات کو As a reality (پیدا) کیا۔ کیوں پیدا کیا؟ وَلِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ (45:22) تا کہ ہر فرد کو اس کے کیے کا پورا پورا بدلہ مل سکے اور کسی پہ زیادتی نہ ہو۔ غور فرمائیے! کائنات کی یہ عظیم القدر مشینری، یہ محیر العقول کارگہ کائنات کس لیے سرگرمِ عمل ہے؟ جہاں تک ہمارا تعلق ہے وہ یہ ہے کہ انسان کا کوئی عمل نتیجہ پیدا کیے بغیر نہ رہ سکے۔ آپ کو معلوم ہے کہ قرآن نے عمل میں صرف وہی اعمال شامل نہیں کیے جو محسوس طور پر ہم سے سرزد ہوں۔ دنیا کی عدالتوں کا تعلق صرف ان اعمال سے ہوتا ہے جو محسوس طور پر کسی سے سرزد ہوتے ہیں۔ وہ تو یہ کہتا ہے کہ ہم تمہاری نگاہ کی خیانتوں کو اور دل کی چوریوں کو بھی جانتے ہیں۔ اب دیکھیے کہ عمل کی Definition (تعریف) کا دائرہ کتنا ہمہ گیر ہوا اور تخلیقِ کائنات کا مقصد یہ ہوا کہ تمہارا کوئی عمل بلا نتیجہ نہ رہنے پائے۔

عزیزانِ من! کیا آپ کو معلوم ہے کہ اس کائنات کے اندر، یہ جو کچھ ہو رہا ہے اور اس کی وہ قوتیں جو ہمیں نظر نہیں آتیں، جن کا ہم احاطہ بھی نہیں کر پاتے، وہ سب کی سب کیا کر رہی ہیں؟ یہ کہ میرے دل میں گزرنے والا کوئی خیال بھی بغیر نتیجہ نکالے نہ رہ جائے۔ یہ اتنی عظیم مشینری اس لیے تخلیق کی ہے کہ تمہارا کوئی کام بلا نتیجہ نہ رہ جائے۔ ہر عمل کے اندر غلط عملی ہی نہیں، حسنِ عمل بھی شامل ہوتا ہے، یہ

سارے اعمال شامل ہوتے ہیں۔ یہ کتنی بڑی چیز ہے کہ یہ کتنا عظیم' ایک کارگہ کائنات کو پیدا کیا کہ اگر کوئی اچھا خیال بھی میرے دل میں گزرتا ہے تو وہ بھی میرے لیے ایک حسین پھول پیدا کیے بغیر نہ رہ سکے۔ یہ ہے کائنات کی تخلیق کا مقصد۔ کہا ہے کہ وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ (53:31) کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ بھی ہے' خدا کے متعین کردہ قوانین کے لیے سرگرمِ عمل ہے' یہ اسی کی ملکیت میں' اسی کے کنٹرول میں' اسی کے مقرر کردہ پروگرام کی تکمیل کے لیے ہے۔ ''ل'' کے دونوں معنی لے لیجیے' یہ دونوں یہاں ٹھیک آجاتے ہیں۔ بات آگے کہی ہے کہ لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اَسَآءُوْا بِمَا عَمِلُوْا وَيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا بِالْحُسْنٰى (53:31) تاکہ جس سے کوئی ناہمواری کی بات سرزد ہو جاتی ہے وہ بھی نتیجہ خیز ہو' جو حسن کائنات میں کچھ اضافہ کرتا ہے' Contribute (حصہ شراکت ادا) کرتا ہے' وہ بھی نتیجہ لائے [1]۔

(تم مکافاتِ عمل کے قانون کی گرفت سے باہر جا ہی نہیں سکتے۔ تم اس سے ہزار بھاگنے کی کوشش کرو تمہیں آخر الامر اس کی طرف لوٹ کر آنا ہوگا بلکہ یوں سمجھو کہ اب بھی تمہارا قدم اسی کی طرف اُٹھ رہا ہے۔ یہ قانون اس خدا کا متعین کردہ ہے جس نے تمہیں اس زمین میں پیدا کیا' ساتھ ہی سامانِ نشو ونما مہیا کر دیا اور دیکھو کہ کائنات میں متعدد اجرام فلکی کس توازن واعتدال کے ساتھ اپنے فرائض کی انجام دہی میں سرگرم عمل ہیں۔ یہ بھی خدا ہی کے قانون کے مطابق ہو رہا ہے جس کے بارے میں قرآن بتاتا ہے کہ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ (2:29) یہ اس خدا کے قانون کے مطابق ہے جو ہر شے کی مضمر قوتوں اور تقاضوں سے اچھی طرح باخبر ہے۔

برادرانِ عزیز! ارض وسما کا یہ کائناتی نظام اس لیے سرگرم عمل ہے کہ انسانوں کے اعمال کے ٹھیک ٹھیک نتائج مرتب ہوں۔ اس حقیقت کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے انسانی خصوصیات اور کائنات کے مقام کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے۔ اسے قصہ آدم کے تمثیلی انداز میں بیان کیا گیا ہے جو درحقیقت خود انسان ہی کی سرگزشت ہے)۔

اب درس کا وقت پورا ہوا۔ اسے ہم آئندہ درس میں لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ۭ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ

❀......❀......❀

---

[1] اب یہاں ریکارڈنگ یہیں تک ہے۔

تیرھواں باب: سورۃ البقرۃ (1)' (آیات 30 تا 34)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَاِذۡ قَالَ رَبُّكَ لِلۡمَلٰٓئِكَةِ اِنِّىۡ جَاعِلٌ فِى الۡاَرۡضِ خَلِيۡفَةً ؕ قَالُوۡٓا اَتَجۡعَلُ فِيۡهَا مَنۡ
يُّفۡسِدُ فِيۡهَا وَيَسۡفِكُ الدِّمَآءَ ۚ وَنَحۡنُ نُسَبِّحُ بِحَمۡدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ؕ قَالَ اِنِّىۡٓ
اَعۡلَمُ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۳۰﴾ وَعَلَّمَ اٰدَمَ الۡاَسۡمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمۡ عَلَى الۡمَلٰٓئِكَةِ ۙ
فَقَالَ اَنۡۢبِـُٔوۡنِىۡ بِاَسۡمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ ﴿۳۱﴾ قَالُوۡا سُبۡحٰنَكَ لَا عِلۡمَ لَنَآ اِلَّا
مَا عَلَّمۡتَنَا ؕ اِنَّكَ اَنۡتَ الۡعَلِيۡمُ الۡحَكِيۡمُ ﴿۳۲﴾ قَالَ يٰٓـاٰدَمُ اَنۡۢبِئۡهُمۡ بِاَسۡمَآئِهِمۡ ۚ فَلَمَّآ
اَنۡۢبَاَهُمۡ بِاَسۡمَآئِهِمۡ ۙ قَالَ اَلَمۡ اَقُلۡ لَّكُمۡ اِنِّىۡٓ اَعۡلَمُ غَيۡبَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ۙ
وَاَعۡلَمُ مَا تُبۡدُوۡنَ وَمَا كُنۡتُمۡ تَكۡتُمُوۡنَ ﴿۳۳﴾ وَاِذۡ قُلۡنَا لِلۡمَلٰٓئِكَةِ اسۡجُدُوۡا لِاٰدَمَ
فَسَجَدُوۡٓا اِلَّآ اِبۡلِيۡسَ ؕ اَبٰى وَاسۡتَكۡبَرَ ۫ وَكَانَ مِنَ الۡكٰفِرِيۡنَ ﴿۳۴﴾

عزیزانِ من! آج اگست 1968ء کی 25 تاریخ ہے اور ہم اپنے درسِ قرآنِ کریم کے سلسلۂ نو میں سورۃ البقرۃ کی 29 ویں آیت تک پہنچے تھے' آج 30 ویں آیت سے آغاز کلام ہوتا ہے: (2:30)۔

قصہ آدم کی پیدائش کا

بات پیچھے سے یہ چلی آتی تھی کہ خدا نے تمہارے لیے' تمام مخلوق کے لیے' پیدائش سے بھی پہلے' یکساں سامانِ زیست مہیا کر دیا۔ اسی کو اس کی ربوبیتِ عالمینی کہتے ہیں جس سے قرآنِ کریم کا آغاز ہوتا ہے کہ اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ (1:1)۔ اور یہ کہا گیا تھا کہ ایسا نظام جس میں ان ذرائع رزق اور وسائلِ پیداوار کو ذاتی ملکیت میں لے لیا جائے اور اس طرح سے مخلوق کو ان کے فائدے سے محروم کر دیا جائے' یہ خدا کا ہمسر بنا دینا ہے' خدا کے ساتھ دوسرے خدا تجویز کر دینا ہے' تم یہ نظام نہ پیدا کر دینا۔ اور یہی وہ چیز تھی کہ آخری آیت میں بھی پھر اس کو دہرایا گیا کہ هُوَ الَّذِىۡ خَلَقَ لَكُمۡ مَّا فِى الۡاَرۡضِ جَمِيۡعًا (2:29)۔ اب یہی چیز ہے جو ابھی تک نظری

حیثیت سے سامنے آ رہی تھی۔ قرآنِ کریم انسانوں کی اپنی زندگی سے اس کی وضاحت کرتا ہے اور یہ چیز اس تمثیلی انداز میں' جسے قصۂ آدم کہا جاتا ہے' بیان کرتا ہے۔

بات اب بڑی اہم شروع ہو رہی ہے۔ آج دنیا میں انسانی بچے کی پیدائش ایک ایسا معمول ہو چکی ہے جس کے لیے نہ کسی کو کوئی تعجب ہوتا ہے' نہ حیرت ہوتی ہے' نہ اس کا سمجھنا کسی کے لیے دشوار ہے حتیٰ کہ بچے تک بھی ان چیزوں کو سمجھ لیتے ہیں لیکن یہ چیز کہ سب سے پہلا بچہ کیسے پیدا ہو گیا یا سب سے پہلا انسان کیسے وجود میں آ گیا' یہ بہت مشکل مسئلہ تھا۔ وہی مسئلہ ہے جسے آج بھی یوں کہا جاتا ہے کہ مرغی پہلے تھی یا انڈہ پہلے تھا۔ انسانی ذہن کم از کم اس سے پہلے جب کہ سائنس کے انکشافات اس کے سامنے نہیں آئے تھے' سمجھ نہیں پاتا تھا کہ اس سلسلے کا آغاز کس طرح سے کیا جائے۔ ایک جوڑے کی ضرورت تھی' اس کے بغیر بات آگے چلتی ہی نہیں تھی۔ اس کے لیے' اب تیرا پتہ نہ پائیں تو لاچار کیا کریں' ایک جوڑا تراشنا پڑا۔ ذہنِ انسانی نے اپنے الجھاؤ کو دور کرنے کے لیے اسے تراشا۔ اس لیے کہ اس کا ثبوت تو ان کے پاس نہیں ہو سکتا تھا کہ فی الواقعہ اسی طرح سے یہ تراشا گیا لیکن اس سے ان کے ذہن کا خلجان دور ہو جاتا تھا کہ چلو' یہ تو دو ہو گئے' اب چلا یہ سلسلہ آگے پھر سوچنے کی کوئی بات باقی نہ رہی۔ یہ ہے وہ چیز' جہاں سے ہمارے ہاں آدم کا وہ تصور پیدا ہوتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح مٹی کا ایک پتلا بناؤ اور خدا کی قدرتِ کاملہ سے اس کے اندر جان پیدا کرو' یہ تو مشکل نہیں ہے۔

مرد کے پتلے کے بعد پتلی (یعنی عورت) کی پیدائش کا قصہ اور مقصد؟

وہ پتلا بنا دیا گیا تو پھر سوال یہ تھا کہ اس کے بعد پتلی کیسے بنے' اس کے بغیر کام نہیں چلتا تھا۔ اب یہاں چونکہ یہ افسانہ مردوں نے تراشا تھا اس لیے اس میں اپنی جو برتری تھی اس کو قائم رکھنا ضروری تھا۔ اگر اسی قسم کا برابر کا ایک اور پتلا تراش دیا جاتا اور اسے عورت کہا جاتا تو وہ تو دونوں کا حصہ برابر ہو جاتا۔ اس کے لیے کہا یہ گیا کہ مقصود بالذات تو اصل میں مرد کا ہی پیدا کرنا تھا اس لیے آدم کو پیدا کیا۔ یہ قصہ ہے تورات کا اور تورات وہ نہیں جو خدا کی طرف سے دی گئی تھی بلکہ یہ وہ ہے جو تحریف شدہ ہے' جسے انسانوں نے وضع کیا تھا۔ یہ ذہنِ انسانی کی تراشیدہ داستانیں ہیں' نہ خدا کی طرف سے آئی ہیں' نہ کسی رسول نے دی ہیں۔ انہوں نے یہ کہا کہ اصل میں مقصود بالذات تو یہی مرد کا بنانا تھا اور چونکہ تھوڑے ہی دنوں کے بعد مرد نے تنہائی محسوس کی' اداس اداس رہنے لگا' تو اس کی اداسی کو دور کرنے کے لیے ضرورت پیش آئی جیسے وہ بچے کو اکیلا چھوڑ جاتے ہیں تو کھلونا دے دیتے ہیں کہ دل بہلا رہے۔ اس کی اداسی کو دور کرنے کے لیے ضرورت محسوس ہوئی تو وہ اسی کی پسلی کو چیر کر اس میں اس کے لیے جوڑا تراش دیا' عورت پیدا کر دی۔

مرد کے لیے عورت کو ایک کھلونے کی حیثیت سے جانا گیا

ابتدا ہی میں یہ جو چیز چلی آ رہی ہے کہ فطرت کا مقصود بالذات مرد ہے، عورت مرد کی اداسیاں دور کرنے کے لیے ایک کھلونا ہے، یہاں سے یہ بات کی۔ ایک تو ذہنی الجھاؤ دور ہو گیا کہ جوڑا ضروری چاہیے تھا، اس سے یہ سلسلہ آگے چل پڑا اور دوسرا یہ کہ وہ جو خود مرد کا اپنا Ego (انا) ہے، اس کی Satisfaction (تسکین) بھی بڑی عمدگی سے ہو گئی کہ ہاں مقصود بالذات ہم ہی تھے، یہ ہماری اداسیاں دور کرنے کے لیے بعد میں پیدا کی گئی۔ اور یہ پیدائش بھی اس کی اپنی ذات میں نہیں ہے بلکہ ہمارے ہی ہاں سے (یعنی مرد کے ہاں سے) اس کی یہ پیدائش ہوئی ہے، اگر ہم اپنی پسلی میں سے اس کو جگہ نہ دیتے تو یہ پیدا ہی نہ ہو سکتی۔ گویا دونوں کام کرنے کے لیے اس نے ایک نشانے سے دو شکار مارے، اس نے شروع میں ہی یہ چیز کہہ کر کی۔ میں نے جیسا عرض کیا ہے یہ انسانی پیدائش کا بڑا الجھاؤ تھا کہ ابتدا کیسے کی جائے۔

مرد کے مقابلے میں عورت مقصود بالذات نہ رہی: قرآن حکیم کی تردید

یہ تھا قصہ آدم کی پیدائش کا جس سے ہمارے ہاں یہ داستان چلی۔ قرآن نے یہ چیز نہیں کہی۔ یوں نام آدم کا بھی اس میں آتا ہے، حوا کا تو نہیں آتا، آدم کا ہی آتا ہے لیکن قرآن کی بات ہی کچھ اور ہے۔ جو کچھ یہ کہہ رہا ہے، وہ یہ قصہ چونکہ پہلے سے ہمارے ہاں ذہنوں کے اندر متوارث چلا آ رہا ہے اس لیے ہم نے بھی اس کے بعد، وہی جو قصے ان کے ہاں تھے، اپنے ہاں مستعار لیے اور وہی داستانیں ہمارے ہاں بھی رائج ہو گئیں۔ چنانچہ میں نے اتنا کچھ جو پہلے کہا ہے، میں بہت سی پیشانیوں کو پڑھ رہا ہوں جو یہ چیز کہہ رہی ہیں کہ یہ شخص کیا کہہ رہا ہے۔ یہی چیز تو ہم مانتے ہیں۔ اسے یہ کہتا ہے کہ ذہنِ انسانی کا تراشیدہ ایک قصہ ہے لیکن جو میں نے عرض کیا ہے، برادرانِ عزیز! مجھے کیا حق پہنچتا ہے کہ میں اپنی طرف سے کچھ کہوں۔ قرآن نے ایسا ہی کہا ہے۔

قرآن حکیم کے نزدیک زندگی کی ابتدا کا طریقِ کار

قرآنِ کریم نے انسان کی پیدائش کے متعلق جو کہا، وہ چودہ سو سال پیشتر دنیا کے ذہن، تصور، خیال میں بھی نہیں آ سکتا تھا اور دنیا میں بھی دنیائے عرب جس میں اس زمانے تک کوئی لکھی ہوئی کتاب بھی موجود نہیں تھی چہ جائیکہ وہاں سائنس کے انکشافات ہوتے۔ دور تو وہ تھا کہ جو ملک علمی طور پہ بہت آگے تھے، وہ بھی ابھی یہاں تک نہیں پہنچے تھے۔ اس دور میں قرآن نے زندگی کی ابتدا، پہلے انسان کی ابتدا نہیں کہتا، کے متعلق ایک Process (طریقِ کار) بتایا کہ کس طرح سے بے جان مادہ، جامد مٹی، میں پانی کا امتزاج ہوا اور اس کے اندر سے زندگی کا پہلا جرثومہ نمود میں آیا۔ اس چیز کو میں ذرا تفصیل میں نہیں بیان کرونگا کہ یہ میرا موضوع نہیں ہے۔ اگر آپ اس کی تفصیل جاننا

چاہتے ہیں تو میری کتاب ''ابلیس و آدم'' ہے' اس میں پہلا عنوان ''انسان'' ہے اور دوسرا عنوان ''آدم'' ہے' وہ دیکھ لیجیے۔ یہ جو Evolution (ارتقا) کی تھیوری ہے جسے سلسلۂ ارتقا کہا جاتا ہے' اس میں میں نے قرآنِ کریم کی روشنی میں اسے Discuss (بیان) کیا ہے' بتایا ہے کہ کہاں تک سائنس قرآن کے حقائق کے ساتھ چلتی ہے' کہاں جا کر ان میں افتراق پیدا ہوتا ہے۔ اور اس افتراق کے مقام سے قرآن انسان کو کتنی بلندیوں پر لے جاتا ہے اور مغرب کا مادی ذہن اسے کس طرح حیوان کے درجے پر چھوڑ دیتا ہے۔ یہ تفصیل وہاں ملے گی اور چونکہ یہ بجائے خویش ایک موضوع ہے' اس لیے میں ضمناً درس میں اسے نہیں بیان کر سکتا۔

برادرانِ عزیز! یہاں میں اتنا ہی عرض کرونگا کہ قرآنِ کریم نے بتایا ہے کہ زندگی کا جو اولیں جرثومہ (Life Cell) تھا' وہ کس طرح سے آگے بڑھا۔ وہی لائف سیل جس کے اندر ابھی نر و مادہ کی تمیز نہیں تھی' وہ جوشِ نمو سے دو حصوں کے اندر پھٹا اور اس کے Sister Cells بنے۔ اس میں سے ایک کے اندر وہ Properties '(خصوصیات) جو Male یا نر کی ہوتی ہیں' دوسرے کے اندر وہ خصوصیات جو Female (مادہ) کی ہوتی ہیں' پیدا ہوئیں۔ اور اس کے بعد پھر یہ سلسلہ آگے بڑھا' زندگی اپنے مختلف ارتقائی منازل طے کرتے کرتے حیوانات کے درجے میں پہنچی' وہاں سے پھر ارتقائی منازل طے کیں تو پیکرِ انسانی میں آئیں۔ پیکرِ انسانی میں ابتداً اس کی زندگی کا نوے فیصد حصہ قریباً حیوانی تھا' پھر انسان نے آہستہ آہستہ ارتقائی منزلیں طے کیں اور یہ اس دور میں پہنچا جہاں اس نے مل جل کر متمدن زندگی بسر کرنا تھی۔ انسان کی جو تمدنی زندگی ہے' اس کا جو آغاز ہوتا ہے' وہ ہے جسے داستانِ آدم کہا جاتا ہے۔ یہ آدم نہیں' درحقیقت آدمی کی داستان ہے۔ اور آغاز ہوتا ہے وہاں سے جہاں سے انسان نے مل جل کر تمدنی زندگی بسر کرنا شروع کی' اس سے پہلے اس کی زندگی بالکل غاروں میں رہنے کی' درختوں کے ساتھ رہنے کی' انفرادی زندگی' حیوانات کی سی تھی' مل جل کر رہنے کی متمدن زندگی یہاں سے شروع ہوئی اور آدم کا لفظ اس پہ دلالت کرتا ہے۔ وہ تو قرآن ہے' بات سمجھا جاتا ہے۔ ''اُدْمَۃٌ'' کے معنی ہوتے ہیں ''مل جل کر رہنا''۔ آدم کے معنی ہیں ''مل جل کر رہنے والا''۔ بشر کا ذکر قرآنِ کریم میں Man کی حیثیت سے آئے گا' انسان کا ذکر Human Being (نوعِ انسان) کی حیثیت سے آئے گا' آدم کا لفظ آئے گا جہاں ان انسانوں نے مل جل کر متمدن زندگی بسر کرنا ہو' اس لفظ کے اندر تمدن ہے۔

اس داستان کا آغازِ کلام یہاں اس دور سے ہوتا ہے' جہاں سے کہ انسانوں نے تمدنی زندگی بسر کرنا تھی۔ انسان سے پہلے اس سطحِ ارض کے اوپر کوئی اور لائف تھی' کوئی اور نوع تھی' کوئی اور جنس تھی' یہ قرآن نے کہا ہے۔ اس زمانے میں زمین کی سطح بہت زیادہ گرم تھی۔ اس سطحِ ارض کے اوپر انسان جیسی Constitution (ساخت) کا جانور زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔ اس سے پہلے کوئی نوع تھی جس میں یہ صلاحیت تھی کہ وہ اس سے زیادہ گرم ٹمپریچر کے اندر بھی زندہ رہتی تھی' وہ ہے جسے آتشیں مخلوق کہا جاتا ہے۔ وہ جو آج بھی ہمارے ذہنوں میں ''جن'' بن کر چمٹے ہوئے ہیں' وہ مخلوق تو ناپید ہوگئی' یہ قرآن نے کہا ہے۔ اور اس کے بعد پھر انسان نے اس کی جگہ لی اور انسان نے مل

چل کر جب تمدنی زندگی کا آغاز کیا تو وہ ہے جہاں سے قصۂ آدم کا آغاز ہوتا ہے۔

قرآن حکیم کے نزدیک ملائکہ کائناتی قوتیں ہیں

بات شروع ہوتی ہے کہ وَ اِذۡ قَالَ رَبُّکَ لِلۡمَلٰٓئِکَۃِ اِنِّیۡ جَاعِلٌ فِی الۡاَرۡضِ خَلِیۡفَۃً (2:30)۔ یہاں ملائکہ کا پہلی دفعہ لفظ آیا ہے۔ اس کا مادہ بعض کے نزدیک ''ا ل ک'' ہے اس کے معنی پیغام رسانی کے ہوتے ہیں لہٰذا انہوں نے یہ کہا کہ ملائکہ پیغام رساں ہی ہیں لیکن قرآنِ کریم میں جب ہم آگے چلتے ہیں' دیکھتے ہیں تو ملائکہ کا ایک فریضہ تو وہاں پیغام رسانی ہے مگر وہ صرف پیغام رسانی نہیں ہے' پیغام رسانی تو ان کا بڑا چھوٹا سا فریضہ ہے' وہ مدبراتِ امورِ الٰہیہ ہیں یعنی خدا کی جتنی Schemes (اسکیمیں) کائنات میں چلتی ہیں جن قوتوں کی رو سے خدا ان کو بروئے کار لاتا ہے انہیں ملائکہ کہا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے اس لفظ کا دوسرا مادہ (Root) ''م ل ک'' ہے۔ ''م ل ک'' میں تو آپ نے اب دیکھ لیا کہ مِلک بھی یہی ہے' مُلک بھی یہی ہے' ملک بھی یہی ہے' ملوکیت بھی یہیں سے ہے۔ اس کے معنی ہی قوت کے ہوتے ہیں۔ تو ملائکہ قوتیں ہیں' جو خدا کی اسکیموں کو بروئے کار لانے کے لیے خدا نے پیدا کی ہیں اور ان کا کام یہ ہے کہ وہ جو کچھ ان سے کہا جاتا ہے' اس کے مطابق وہ سرگرمِ عمل رہتی ہیں۔

ملائکہ کے متعلق آگے چل کر قرآن کی جب آیتیں سامنے آئیں گی تو میں پیش کرتا چلا جاؤں گا۔ ہماری طبعی کائنات (Physical World) کے اندر جن کو آپ Forces of Nature (فطرت کی قوتیں) کہتے ہیں' قرآن نے انہیں بھی ملائکہ کہہ کر پکارا ہے۔ یہ قوتیں خدا کے بنائے ہوئے قوانین کے تابع سرگرمِ عمل ہیں اور ان کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اختیار و ارادہ نہیں رکھتیں' وہ ان قوانین کے تابع کام کرنے کے لیے مجبور پیدا ہوئی ہیں۔ اسے ذہن میں رکھیے کہ یہ اس میں بڑا اہم نکتہ ہے مثلاً قرآنِ کریم میں ہے کہ وَ لِلّٰہِ یَسۡجُدُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الۡاَرۡضِ مِنۡ دَآبَّۃٍ وَّ الۡمَلٰٓئِکَۃُ (16:49) کائنات کے اندر جتنے ذی حیات ہیں' انسان کو چھوڑ کر' اور ملائکہ ہیں' یہ قوانینِ خداوندی کے سامنے سربسجود رہتے ہیں' ان کی اطاعت کرتے ہیں۔ وَ ہُمۡ لَا یَسۡتَکۡبِرُوۡنَ (16:49) ان میں اس کی صلاحیت ہی نہیں ہے کہ وہ ان قوانین کی اطاعت سے سرتابی برت سکیں' وہ سرتابی نہیں برت سکتیں اور اس کے بعد آگے یہ کہہ دیا کہ یَخَافُوۡنَ رَبَّہُمۡ مِّنۡ فَوۡقِہِمۡ وَ یَفۡعَلُوۡنَ مَا یُؤۡمَرُوۡنَ (16:50) ان کے اوپر جو خدا کا کنٹرول ہے' وہ کنٹرول ایسا ہے کہ اس کی بنا پر وہ جیسے یوں کہا جاتا ہے کہ سرتابی سے خائف ہوتے ہیں۔ اور بات یہ ہے جو میں کہہ رہا تھا کہ وَ یَفۡعَلُوۡنَ مَا یُؤۡمَرُوۡنَ (16:50) جو ان کو حکم دیا گیا ہے اس کے مطابق وہ کام کرتے چلے جاتے ہیں۔ میں نے عرض کیا تھا کہ ایک تو قوانینِ فطرت ہیں' ان کے تابع فطرت کی قوتیں سرگرمِ عمل رہتی ہیں' ان کو خود اختیار و ارادہ نہیں ہے' ان کو بھی قرآن نے ملائکہ کہا ہے۔

انسان کی اپنی نفسیاتی قوتوں کی کیفیت اور قوانینِ خداوندی کے ساتھ ان کا تعلق

انسانی زندگی میں ایک اور دائرہ بھی ہے' جسے انسان کی نفسیاتی قوتیں کہتے ہیں۔ انسان کے اپنے اندر کی Psychological Tendencies (نفسیاتی تراغیب) بھی ہوتی ہیں' نفسیاتی قوتیں بھی ہوتی ہیں' ان کو آپ Will Powers (ارادی قوتیں) بھی کہتے ہیں۔ باہر کی طبعی زندگی سے ان کا تعلق نہیں ہوتا' انسان کی اپنے اندر کی زندگی سے ان کا تعلق ہوتا ہے۔ یہ قوتیں کیا ہیں؟ ہمارے اس دور میں اس کے اوپر کچھ ریسرچ ابھی شروع ہوئی ہے۔ یہ ہے جسے آپ Psychology (علمِ نفسیات) کہتے ہیں۔ اس کی رو سے یہ Unconscious Mind (نفسِ غیر شعوریہ) کی قوتیں ہیں جنہیں ابھی تک یہی کہہ کر پکارا گیا ہے۔ ابھی ان کی ماہیت کے متعلق کچھ معلوم نہیں ہوسکا' اسی لیے ابھی تک جو Psychology (علمِ نفسیات) ہے' وہ سائنس نہیں [1] بن سکی' ابھی وہ ریسرچ کی منزل کے اندر ہے لیکن یہ چیز کہ انسان کے اندر یہ قوتیں موجود ہیں' کچھ صلاحیتیں موجود ہیں' اس کو نفسیاتی یا Psyche کہتے ہیں۔ اس پہ سب کا اتفاق ہے۔

قرآن حکیم نے انسان کی نفسیاتی قوتوں کو بھی ملائکہ کہا ہے

قرآنِ کریم کی بعض آیات سے ایسا بھی مترشح ہوتا ہے کہ ان قوتوں کو بھی اس نے ملائکہ کہا ہے مثلاً **اِنَّ الَّذِیۡنَ قَالُوۡا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسۡتَقَامُوۡا تَتَنَزَّلُ عَلَیۡہِمُ الۡمَلٰٓئِکَۃُ اَلَّا تَخَافُوۡا وَ لَا تَحۡزَنُوۡا وَ اَبۡشِرُوۡا بِالۡجَنَّۃِ الَّتِیۡ کُنۡتُمۡ تُوۡعَدُوۡنَ** (41:30) جو لوگ علیٰ وجہ البصیرت اس صداقت پر یقین لے آئیں کہ ہمارا نشو ونما دینے والا صرف خدا ہے' دنیا کا کوئی اور اَن داتا نہیں ہے جس کے سامنے اس لیے جھکا جائے کہ رزق کی احتیاج اس کے ساتھ وابستہ ہے۔ جو یقینِ محکم سے اس نتیجے پہ پہنچ کر اسے اپنا ایمان بنا لیتے ہیں اور **ثُمَّ اسۡتَقَامُوۡا** پھر اس پر جم کر کھڑے ہو جاتے ہیں تو کہا ہے کہ ان کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ ان کے اندر خوف اور حزن باقی نہیں رہتا' Fear Complex (خوف کا الجھاؤ) نکل جاتا ہے ان کو کوئی Terrorise (دہشت زدہ) نہیں کرسکتا۔

قرآن حکیم کے نزدیک انسانی زندگی کے لوازمات کی فراوانی کی کیفیت

کیا بات ہے قرآن کے ان دو لفظوں خوف اور حزن کی! ایک طرف Negative Aspect (منفی پہلو) یہ ہوا کہ خوف اور حزن باقی نہیں رہتا۔ اتنی سی چیز تو کافی نہیں ہے' یہ تو انہوں نے زیادہ سے زیادہ Neutralize (تعدیل) کیا' وہ جو پہلے اس قسم کے Complexes (الجھاؤ) تھے ان کو دور کیا۔ اس کی Positive Side (مثبت سائیڈ) یہ ہے کہ **وَ اَبۡشِرُوۡا بِالۡجَنَّۃِ الَّتِیۡ کُنۡتُمۡ تُوۡعَدُوۡنَ** (41:30) ان کے اندر ایک جنتی کیفیت پیدا کردی۔ اور صرف جنت کے متعلق یہی نہیں کہا کہ یہ رہبانیت کا فریب ہے' بلکہ یہ

---

[1] یاد رہے کہ بات اگست 1968ء کی 25 تاریخ کو کہی گئی تھی۔

کہا کہ پھر اس کی نشانی‘ علامت یہ ہے۔ اُنہوں نے کہا ہے کہ نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ (41:31) ہم وہ قوتیں ہیں جو اس دنیاوی زندگی میں بھی تمہارے دوست اور مددگار ہیں اور بعد کی زندگی میں بھی ہماری کیفیت یہ ہوگی۔ آپ یہ چیز دیکھیے کہ یہ پھر Abstract (غیر محسوس‘ بسیط) ہے‘ یونہی ذہنی سی ہے‘ نظری (Theoretical) ہے۔ قرآن تو ایسے نہیں چھوڑتا‘ اس کی نشانی یہ بتائی کہ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْٓ اَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَدَّعُوْنَ (41:31) اس دنیا کی زندگی میں بھی اور اس کے بعد کی زندگی میں تو تم جا کر دیکھو گے‘ اس دنیا کی زندگی میں بھی جو کچھ تمہارے نفس‘ تمہاری ذات‘ تمہارے اپنے آج کے لیے ضروری ہوگا‘ جو یہ چاہے گا اس کے لیے وہ اسے ملے گا‘ جو مانگے گا اس کے سامنے آئے گا ورنہ ہوتا تو یہ ہے کہ اگر یہ آپ کی اپنی قوتیں آپ کا ساتھ نہ دیں‘ تو اس کے بعد یہ ہوتا ہے کہ

بے نیازی سے تری ناز اٹھائے کیا کیا
جو نہ چاہا وہ ہوا اور جو چاہا نہ ہوا
میدءِ فیض سے بس اتنا گلہ ہے مجھ کو
جو نہ مانگا وہ ملا اور جو مانگا نہ ملا

اور جنت یہ ہے کہ لَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْٓ اَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَدَّعُوْنَ (41:31)۔ آپ دیکھتے ہیں کہ وہاں صرف شاعری کی‘ چاہا اور مانگا اس نے کہا ہے‘ مگر یہ قرآن کے دو لفظوں کا ترجمہ ہے: جو چاہو گے ہوگا‘ جو مانگو گے ملے گا۔ یہ ہے جنت کی زندگی: خوف اور حزن ہوگا نہیں‘ جو چاہو گے ہوگا‘ جو مانگو گے ملے گا۔ اور آخرت کے متعلق کہا ہے کہ ہمارے پاس اس سے بھی کچھ زیادہ ہے۔ کیا بات ہے! سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ صاحب! جب یہ کہا کہ جو چاہو گے ملے گا‘ جو مانگو گے آئے گا‘ تو پھر اس سے زیادہ کیا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ تمہارا اس سطحِ زندگی کے اندر جو چاہنا ہے‘ جو مانگنا ہے‘ وہ بڑا محدود ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسا بچہ کھلونا مانگتا ہے۔ ابھی ایک اور آگے آنے والی زندگی ہے‘ ان بچوں نے جوان ہونا ہے‘ آج تم سمجھ بھی نہیں سکتے کہ اس جوانی کے عالم میں بڑے ہونے کے بعد تم کیا کیا چاہو گے اور کیا کیا مانگو گے‘ یہ ہم جانتے ہیں۔ اس لیے یہاں تو تم جو چاہو گے ہوگا‘ جو مانگو گے‘ ملے گا اور وہاں جب آگے جاؤ گے تو زندگی جوان ہو چکی ہوگی‘ ہمارے پاس اس سے بھی زیادہ ہے جو آج تم مانگتے اور چاہتے ہو۔

جنت کا کیا عرض کروں‘ برادرانِ عزیز! قرآن کی بات سامنے آتی ہے تو پھر جی نہیں چاہتا کہ متعلقہ چیزوں کو چھوڑ کر آگے بڑھ جاؤں۔ یہ چیزیں پیدا ہوئیں قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا (41:30) ایک یقینِ محکم ہے اور اس کے بعد استقامت ہے اس کے بعد کہا ہے کہ نزولِ ملائکہ ہوتا ہے۔

ملائکہ انسانی زندگی پر کس طرح اثر انداز ہوتے ہیں؟

یہ ملائکہ کرتے کیا ہیں؟ نزولِ ملائکہ سے ہوتا کیا ہے؟ یہاں تو صرف یہ بات ہوگی کہ خوف نہیں رہتا' حزن نہیں ہوتا۔ یاد رکھیے' برادرانِ عزیز! انسان' دنیا کے اندر' خود اپنے اندر کی جو کمزوریاں ہوتی ہیں' ان سے مرتا ہے' یہ Complexes (نفسیاتی الجھاؤ) کے ہاتھوں مرتا ہے۔ باہر کسی کی حفاظت کا ہزار انتظام کر دیجیے' اگر اس کے دل کے اندر ایک خوف بیٹھا ہوا ہے' آپ دیکھیں گے کہ اس کے باوجود وہ سو نہیں سکے گا۔ یہ اندر کیا چیزیں ہیں؟ وہ غلط قوتیں جنہیں ابلیسی وساوس کہا جاتا ہے' وہ بھی Complexes (نفسیاتی الجھاؤ) ہیں۔ ملائکہ کی قوتیں ان تمام Complexes (نفسیاتی الجھاؤ) کو دور کرنے کے بعد' آپ کو ایک Balanced Personality (متوازن شخصیت) دیتی ہیں۔ اس کو قرآن میں نفسیاتی قوت کہا گیا ہے۔ یہ کرتی کیا ہیں؟ میں نے ابھی عرض کیا تھا کہ میں بتاتا ہوں۔ میدانِ جنگ ہے' میدان بھی وہی دورِ اول کا ہے' صحابہ کبارؓ جیسے سپاہی ہیں' خود ذاتِ گرامی ﷺ جیسا سپہ سالار ہے۔ آپ یہ سوچیے کہ ان کی نفسیاتی کیفیت کیا ہوگی۔ میدانِ جنگ میں' ٹھیک ہے' ساز و یراق اور اسلحہ بڑی چیز ہے لیکن ان سب سے زیادہ جو چیز Count (معاونت) کرتی ہے' جس پہ مدار ہوتا ہے' وہ سپاہی کا میدانِ جنگ میں ثبات قدم رہنا ہوتا ہے' یہ جم کر کھڑے ہونے کی ایک چیز ہے۔ یہ بات' عزیزانِ من! نہ کوئی اسلحہ کر سکتا ہے' نہ کوئی توپ کر سکتی ہے۔ یہ انسان کے اندر ایک داخلی تغیر ہے' اندر کی ایک قوت ہے' یہ صرف وہ کر سکتی ہے کہ وہاں اس کے پاؤں جم کر رہیں۔

برادرانِ عزیز! دیکھیے! بدر کے میدان کے اندر' ان صحابہؓ کے متعلق یہ کہا جا رہا ہے کہ **اِذْ يُوْحِیْ رَبُّکَ اِلَی الْمَلٰٓئِکَةِ اَنِّیْ مَعَکُمْ** (8:12) جب تمہارے رب نے ملائکہ کی طرف وحی کی' کہا کہ **اَنِّیْ مَعَکُمْ** (8:12) تم چلو' ایک کام تمہارے سپرد کرتے ہیں' بہت بڑا کام ہے' گھبراؤ نہیں' ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ جب تم ہمارے مشیت و منشا و قانون کے مطابق یہ کچھ کرتے ہو تو ہمارا فرض ہے۔ کرو کیا؟ یہ تھا جو میں کہہ رہا تھا کہ **فَثَبِّتُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا** (8:12) یہ جو جماعتِ مومنین' مجاہدین کی جماعت ہے' جا کر ان کے پاؤں میں ثبات پیدا کرو۔ آپ نے دیکھا' عزیزانِ من! ملائکہ کرتے کیا ہیں؟ ادھر یہ ثبات پیدا کرو۔ جب ان کے ہاں اس قدر ثبات پیدا ہوگا تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ **سَاُلْقِیْ فِیْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ کَفَرُوا الرُّعْبَ** (8:12) وہ جو مخالفین کی جماعت ہے' ان کے دل کے اندر' ان کا ایسا رعب چھا جائے گا کہ یہ میدان چھوڑ کر بھاگ جائیں گے۔

کیا ملائکہ نظر بھی آتے ہیں؟ یہ ملائکہ ہیں کیا اور کیا کرتے ہیں؟

میں ضمناً عرض کیے جا رہا ہوں کہ جو ملائکہ ہیں' وہ کیا کرتے ہیں۔ یہی چیز سورۃ توبہ میں ہے۔ ان ملائکہ کے نزول سے کیا ہوا؟ کہا کہ

وَ اَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا (9:26) ہم نے ایسے لشکر نازل کیے جن کو تو دیکھ نہیں سکتا تھا۔ ان لشکروں نے آ کر کیا کیا؟ کیا ان کے ہاتھوں سے تلواریں لے لیں؟ کیا توپوں کے گولے خود ڈالنے شروع کر دیئے؟ کیا یہ خود تیر چلانے لگ گئے؟ کہا کہ نہیں! یہ کچھ تو تم خود بھی کر سکتے تھے۔ ایک اور بات کی کہ اَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ (9:26) ان فرشتوں نے تمہارے دلوں کے اندر سکون پیدا کر دیا۔ دلوں کے اندر یہ چیز اسلحہ نہیں کر سکتا' یہ چیز قانون نہیں کر سکتا۔ اس سے ایک کیفیت پیدا ہوتی ہے جس سے سکون وطمانیت کی یہ چیز پیدا ہوتی ہے۔ اور یہی چیز اصل چیز ہے' برادرانِ عزیز! شکست وفتح کا راز ہی اس میں ہے۔ فرد کی زندگی ہو' اجتماعی زندگی ہو' دنیاوی کاروبار کی بات ہو' وہ میدانِ جنگ ہو' جسے یہ جمعیت خاطر ہوگا' یہ سکونِ قلب حاصل ہوگا' جس کے اندر ملائکہ کی جو قوتیں ہیں' بیدار ہونگی' جس کی ذات کے اندر توازن قائم ہوا ہوگا' یاد رکھیے! وہی ہے جس کا دماغ بھی وہاں قائم رہے گا' وہی ہے جس کے پاؤں بھی جمے ہوئے ہونگے' وہی ہے جو اس کے بعد کامیاب بھی ہوگا۔

1965ء میں پاک وہند کی جنگ کے دوران پاک فوج کے مجاہدین کی لازوال قربانیوں کو افسانوں میں بدلنے کی گہری سازش

برادران عزیز! پھر وہی بات یاد آ گئی کہ آگے نہیں جا سکتا' حالانکہ ضمناً بات ملائکہ کی آئی ہے۔ 1965ء کی جنگ میں ہمارے ان مایۂ ناز' قابلِ فخر مجاہدین میں اس ملک کی جان' مال' عزت' عصمت کی حفاظت کا دارومدار اس چیز کی ثبات اور قوت پہ تھا۔ اس طرح سے انہوں نے ثباتِ قدم سے' سکونِ قلب سے' ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح سے' وہاں معجزے اور کرامتیں دکھائیں' وہ محیر العقول تھیں لیکن ہم افسانوں میں الجھی ہوئی قوم' بجائے اس کے کہ ہم ان کا پورا کریڈٹ ان مجاہدوں کو دیتے جنہوں نے اپنے قطراتِ خون کی قربانی سے ہمارے ماتھے کی رنگینیوں کا سامان پیدا کیا' ہم نے ان کو منسوب کر دیا کہ وہاں سبز پیراہنوں والے دیکھے گئے' وہاں سفید گھوڑیوں والے کھڑے تھے۔ میں اس کی تفصیل میں نہیں جاتا' صرف ایک بات کہنا چاہتا ہوں کہ وہ کہتے ہیں کہ وہ آسمانی لشکر اترے' فرشتے آئے ہم نے انہیں دیکھا' جبھی تو ان کو سبز پیراہن' سفید گھوڑیاں نظر آئیں۔ یہ تو ہمارا قیاس ہے کہ فرشتے اترے اور اس کے بعد یہ چیز مشہور ہوئی' وہ دیکھے گئے۔ یہ فرشتوں کے اترنے کی ایک یقینی چیز ہے' خدا کہنے والا ہے کہ یہ رسول اللہ ﷺ اور جماعتِ مومنین ہیں جن کے اوپر ملائکہ نازل ہو رہے ہیں۔ اب ان کے اوپر نازل ہونے میں تو کوئی شبہ نہیں رہا' یہ قیاسی بات نہیں' یقین ہوگئی۔ یہ نگاہیں ہیں رسول ﷺ کی' یہ نگاہیں ہیں صحابۂ کبارؓ کی' کہ ان پہ یہ نازل ہو رہے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ لَّمْ تَرَوْهَا (9:26) تم انہیں دیکھ نہیں سکتے۔ اور ادھر ہمارے دعوے یہ ہیں کہ صاحب! ہم نے راوی کے پل پہ خود دیکھا ہے۔ میں خود یہاں ضمناً اتنا ہی کہوں گا کہ اس کی شہادت تو ہم مانیں' خدا کہنے

والا ہے' اس کا رسول ﷺ اور صحابہؓ موجود ہیں جن پہ نازل ہوتے ہیں اور خدا خود کہتا ہے کہ لَّمْ تَرَوْهَا (9:26) انہیں دیکھا نہیں جا سکتا۔ نفسیاتی قوتوں کو کوئی نہیں دیکھ سکتا۔

ہم نے مجاہدین کی قربانیوں کا کریڈٹ افسانوں کی نذر کرتے ہوئے اُسے روحانیت کے پردوں میں گم کر دیا

برادرانِ عزیز! ان کے تو جو اثرات مرتب ہوتے ہیں' انہیں محسوس کیا جاتا ہے۔ قرآن نے اثرات کا بتا دیا ہے کہ اَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ (9:26) یہ جو سکونِ قلب حاصل ہوتا ہے' اس کو تو محسوس کیا جا سکتا ہے مگر لَّمْ تَرَوْهَا (9:26)۔ قرآن کا اعجاز ہے' عزیزانِ من! ضمناً پھر میں یہ عرض کر دوں کہ دنیا میں ساری بڑائیاں اور ساری جتنی بھی بزرگیاں اور تقدس ہیں' یہ سارے کے سارے' ہم نے محراب و منبر اور مقامِ طریقت اور شریعت کے اندر سمٹا کر رکھ دیئے تھے' وہ اس کے واحد مدعی تھے اور سارے کے سارے Monopolize (اجارہ داری قائم) کر کے بیٹھے ہوئے تھے' ان کی اجارہ داریاں تھیں یہ چیز کسی اور کے حصے میں نہیں آتی تھی۔ ہماری تقدیر کی عجیب کشاد ہوئی کہ جن کے لیے صحیح عزتیں آنی چاہئیں' جن کی موت پہ خدا نے کہا ہے کہ ان کی موت کو مردہ مت کہو' ایک میدان آیا جس کے اندر ہم نے دیکھا کہ یہ لوگ کس طرح عزتوں کے مستحق ہیں' یہ لوگ جن کو توفیق نہیں ہوئی تھی کہ اس پہ جا کر ان کو شاباش بھی دیتے' یہ اس پہ گھبرا گئے کہ ہیں قوم کی ساری عزتوں کے مرکز یہ بن گئے!! جن کو ہم کل تک یہ Buddies (لونڈے)' کہا کرتے تھے کہ لونڈے یہ کیا کریں گے' یہ سپاہی یہ فوجی ساری قوم کی عزتوں کا مرکز بن بیٹھے ہیں۔ دیکھیے اس کے اندر یہ کتنی بڑی سازش ابھرتی ہے! کہا گیا کہ یہ تو بے چارے یونہی کاٹھ کے پتلے تھے' یہ سارا جو کچھ یہاں ہوا ہے' یہ سارا کچھ کرنے والے وہ تھے جی! جو پیراہنوں والے' گھوڑیوں والے آئے تھے انہوں نے کیا تھا۔ آپ نے دیکھا کہ ایک اتنی سی بات پہ بظاہر کتنا سا ایک مقدس جذبہ نظر آتا ہے کہ صاحب! فرشتے آئے' ہماری مدد کے لیے اترے' گھوڑیوں والے آئے۔ اس میں سارا جذبہ یہ کارفرما تھا کہ ہماری جگہ عزت و تکریم کا مرکز جو میدانِ جنگ میں جان دینے والے بن رہے ہیں' یہ نہ بن جائیں' اور توجہات پھر وہیں مرکوز ہو جائیں کہ یہ کام تو یہ جو روحانیت والے ہیں' انہی کا ہی ہوا کرتا ہے۔

مجاہدین اسلام کے خلاف ہونے والی گہری سازش

عزیزانِ من! یہ سازش آج کی نہیں ہے' بہت پرانی چلی آتی ہے۔ پیر گھوڑے شاہ اور چنگڑ شاہ کے عرس بھی آپ کو پتہ ہے کہ کہاں ہوتے ہیں' ان کے مزارات کے اوپر بھی آپ نے جھنڈے لہراتے دیکھے ہیں' چادریں بھی چڑھتی ہیں' ڈھول بھی بجتے ہیں' مہینہ مہینہ پہلے سے پتہ ہوتا ہے کہ یہ کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ شاید ہی مسلمانوں میں کوئی ایسا ہو جسے پتہ ہو کہ خالد بن ولیدؓ کی شہادت کب ہوئی۔ ذہن پر

زور دے کر شاید کسی کو یہ پتہ چلے کہ سعد ابن وقاصؓ کا مزار کہاں ہے۔ ذرا سوال کر کے دیکھیے' آپ سی ایس پی [1] کے Candidate (امیدوار) سے بھی پوچھ کر دیکھیے۔ اب آپ نے دیکھا کہ یہ بات کیا ہے۔ یہ کہ صاحب! اسلام ان کی وجہ سے پھیلا' جھنڈے ان کے گڑے ہوئے ہیں' مجاہدین کا کہیں کوئی نام نہیں آتا۔ دیکھا قوم کی توجہ کو کس طرح بدل کر رکھ دیا۔ بات میں یہ کہہ رہا تھا کہ کہا گیا کہ صاحب! ہم نے یہ کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا تو یہ آنکھیں رسول ﷺ کی آنکھوں سے بھی بڑی زیادہ تیز نگاہ رکھنے والی تھیں' یہ آنکھیں جماعتِ صحابہؓ سے بھی زیادہ دور بین واقع ہوئی تھیں۔ ان کے متعلق خدا کہتا ہے کہ **لَمْ تَرَوْهَا** (9:26) تم انہیں دیکھ نہیں سکتے۔ وہ کہتے تھے' ٹھیک ہے ''اوہدوں ہجے عینکاں نئیں سی ایجاد ہویاں' ہن تے عینکاں لگیاں ہویاں نیں' اسی تے دور بیناں نال دیکھ لینے آں [2]''۔

ملائکہ تو قدرت کی وہ کائناتی قوتیں ہیں جو عالمِ امر اور عالمِ خلق میں خدا کے پروگرام کو سرانجام دیتی ہیں

ملائکہ کے متعلق بات ہو رہی تھی' برادرانِ عزیز! کہ ملائکہ فطرت کی قوتوں کو بھی کہا جاتا ہے' ملائکہ انسان کے اپنے اندر کی نفسیاتی قوتوں کو بھی کہا جاتا ہے جو اس کے اندر اعتدال و سکون پیدا کرتی ہیں۔ اضطراب و تکلیف اور خوف اور حزن پیدا کرنے والی قوتیں ہوتی ہیں۔ اور اس کے بعد ملائکہ کائنات کا وہ حصہ ہے جو ہماری اس محسوس کائنات سے ماوراء ہے جس کے متعلق ہم کچھ نہیں جانتے' جہاں خدا کا امر' خدا کی اسکیمیں بنتی ہیں' آگے چلتی ہیں' ابھی محسوسات کے عالم میں نہیں آتیں' وہاں بھی یہ ملائکہ خدا کے امور کو سرانجام دینے والے ہوتے ہیں۔ یہ ملائکہ کا تیسرا دائرہ ہے جس کے متعلق ہم کچھ نہیں جان سکتے۔ ملائکہ پر ایمان لانا ایمان کا جز ہے۔ ایمان لانے کے کیا معنی ہوتے ہیں؟ ویسے تو آپ دیکھیے کہ قریب قریب دنیا کی ہر قوم اور مذہب پرست جماعتیں تو یقیناً' ان کو مانتی ہیں' ان کا کچھ بھی نام رکھ لیں لیکن مانتی ہیں۔ پھر ایمان کے کیا معنی ہوئے؟ اس کو سمجھنے کے لیے اور پیچھے ہٹیے۔ ملائکہ کے متعلق تو شاید شبہ ہو سکتا ہے کہ شاید کوئی نہ مانے' خدا پر ایمان تو تمام دنیا کے مذہب پرستوں کو سوائے چند دہریوں کے' سب کو ہے' خدا پہ تو سب ایمان رکھتے ہیں۔

قرآن حکیم کے نزدیک ایمان کی تعریف اور ملائکہ کا حقیقی تصور

آپ کو معلوم ہے کہ قرآنِ کریم نے سارے انسانوں کو اور ان میں بھی آپ دیکھیے کم از کم اہلِ کتاب کے متعلق تو ہمارا یقین ہے کہ وہ خدا پہ ہی ایمان نہیں رکھتے' کتابوں پہ بھی رکھتے ہیں' انبیاؑ پہ بھی ایمان رکھتے ہیں۔ اہلِ کتاب کو خاص طور پہ مخاطب کر کے کہا گیا ہے کہ ایمان لاؤ خدا پہ۔ اور پچھلے درسوں میں تو آپ نے پھر یہ سن لیا ہوگا کہ اہلِ کتاب ہی کو نہیں کہا' مسلمانوں سے بھی کہا ہے کہ **يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا**

---

[1] آج یہ سی ایس ایس (CSS) کہلاتا ہے۔

[2] اس وقت تک ابھی عینکیں ایجاد نہیں ہوئی تھیں' اب تو عینکیں لگی ہوئی ہیں' ہم تو دوربینوں کے ساتھ دیکھ لیتے ہیں۔

اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ (4:136)اے اس بات کے مدعیو! کہ ہم تو مسلمان ہیں' ایمان لاؤ۔ تو گویا یہ ایک ایسی چیز ہے کہ جسے یونہی Assume (فرض) نہیں کیا جا سکتا' یہ ایک مثبت دعوت ہے' کچھ کرنے کی بات ہے۔ تو کیا معنی ہیں ایمان لانے کے؟ خدا کو تو ساری دنیا مانتی ہے۔ لوگوں کو یہ کہنا کہ اللہ پہ یمان لاؤ' وہ تو ایمان لائے ہوئے ہیں۔ اس کے کیا معنی ہوئے؟ قرآن نے خود بتا دیا کہ ایمان کے یہ معنی نہیں کہ جس تصور کا آپ کا جی چاہے' آپ اس کو مان لیں تو ایمان ہو گیا۔ وہ کہتا ہے کہ فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا (2:137) جس انداز کا ایمان قرآن کی رو سے تم لائے ہو' ایسا ایمان جو لائے گا اسے ایمان کہا جائے گا۔ تو ایمان کے معنی ہوئے ''کسی حقیقت کو' اس تصور کے مطابق ماننا جو تصور قرآن نے دیا ہے' یعنی خدا نے دیا ہے''۔ ذہن میں یہ بات آ گئی کہ ایمان کے معنی کیا ہونگے۔ اب جب کہا ہے کہ ملائکہ پہ ایمان لاؤ' تو بات یہ ہے کہ اس دنیا کے مختلف اہلِ مذاہب' بلکہ ان کے بعد کے لوگ بھی' ملائکہ کو کسی نہ کسی شکل میں مانتے تھے لیکن جس شکل میں مانتے تھے ان کی کیفیت یہ تھی کہ ساری دنیا کے لوگ ملائکہ کے سامنے جھکتے تھے' دیوی دیوتا ملائکہ وہ ان سب کی پرستش کرتے ہیں' ان کے سامنے جھکتے ہیں' ان سے ڈرتے ہیں' ان سے منتیں مانگتے ہیں' خوف کھاتے ہیں۔ قرآن میں یہاں ملائکہ کے متعلق کہا کہ ملائکہ آدم کے سامنے جھکتے ہیں۔

قرآن حکیم نے اپنی تعلیم کے ذریعے کائنات میں انسان کا مقام متعین کیا ہے

اب آپ نے سمجھ لیا کہ جب انہیں یہ کہا ہے کہ تم ملائکہ پہ ایمان لاؤ' تو اس کے معنی کیا ہوئے۔ کہا ہے کہ اس سے پیشتر تم ساجد بنتے تھے' وہ تمہارے نزدیک (مسجود) تھے۔ تم نے اپنا مقام ان سے بہت پست رکھا تھا' ان کو بہت بڑی قوتوں کا مالک بنا رکھا تھا' تم یہ ایمان رکھتے ہو۔ کہا ہے کہ ایمان والو! اس ایمان کی بجائے یہ ایمان رکھو کہ وہ ساجد ہیں' ہم مسجود ہیں۔ عزیزانِ من! قرآن کی رو سے' کبھی پھر آگے چل کر' جہاں انسان کی بات آئے گی' آؤنگا تو بتاؤں گا کہ جتنے ایمانیات قرآن میں گنائے گئے ہیں' یہ درحقیقت' اس کائنات کے اندر انسان کا اپنا مقام متعین کرنے کے لیے ہیں۔ اور یہی چیز ہے جو اس سے پیشتر ہو رہی تھی' اس قرآن نے آ کر سب سے پہلے انسان کو اس کے مقام سے آشنا کرایا۔

ارض پر انسان کے لیے خدا کا خلیفہ ہونے کا تصور قرآنی تعلیم کے مطابق درست نہیں

کہا ہے کہ وَ اِذْ قَالَ رَبُّکَ لِلْمَلٰٓئِکَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً (2:30) ملائکہ سے کہا۔ میں نے کہا ہے کہ یہ قرآن کا بات سمجھانے کا تمثیلی انداز ہے۔ یہ نہیں ہے کہ سچ مچ کی ایک محفل ہوئی' یہاں ملائکہ کھڑے تھے' اللہ میاں نے ان سے یہ بات کہی کہ میں لگا ہوں کچھ کرنے کے لیے۔ ہمارے ہاں ایک اور تصور ہے کہ انسان خلیفۃ اللہ فی الارض ہے یعنی دنیا میں خدا کا خلیفہ ہے۔

آپ دیکھیے یہ جسے بر خود غلط ہونا کہتے ہے' یہ اس سے کم تر مقام کے اوپر راضی ہی نہیں ہو رہا' کہتا ہے کہ یہ دنیا میں خدا کا خلیفہ ہے۔ خلیفہ کا مادہ ''ح ل ف'' ہے۔ بات بڑی صاف سی ہے۔ خلف کے معنیٰ ''کسی کے پیچھے آنا'' کے ہیں۔ خلیفہ کے معنی ہوتا ہے' کسی کا جانشین (Successor)' کسی کی جگہ لینے والا۔ ذرا اس معنی کے اعتبار سے دیکھیے تو سہی خلیفۃ اللہ کے معنی کیا بنتے ہیں؟ یہ کہ خدا کا جانشین (Successor)' اس کی جگہ لینے والا۔ یا اللہ! یہ خلیفۃ اللہ فی الارض قرآن میں کہیں نہیں آیا۔ تاریخ میں ایک جگہ آتا ہے کہ ہمارے ہاں رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد کسی نے حضرت ابوبکرؓ (634-573ء) سے یہ یا خلیفۃ اللہ کہا' کسی کے ذہن میں وہ پرانا ہوگا۔ وہ تو مردِ مومنؓ تھے' انہوںؓ نے فوراً اسے ٹوک دیا کہ کوئی انسان خلیفۃ اللہ نہیں ہوتا' میں خلیفۃ الرسول ﷺ ہوں' میں رسول کا جانشین ہوں۔ خدا کا خلیفہ کوئی نہیں ہوسکتا۔ یہ سوال ہے ہی نہیں کہ یہ خدا کا خلیفہ ہے۔

برادرانِ عزیز! یہ اِنِّیۡ جَاعِلٌ فِی الۡاَرۡضِ خَلِیۡفَۃً (2:30) ایک جانشینی ہے۔ یہ کس کا Successor (جانشین) ہے؟ میں نے ابھی ابھی عرض کیا ہے کہ انسان پہلی نوع نہیں ہے جو اس زمین کے اوپر آکر بسی ہو' اس سے پیشتر بھی یہاں مخلوق تھی۔ اور اب تو وہ جو درمیان کی ایک کڑی Missing Link (گم شدہ کڑی) ہے' جو ابھی سائنسدانوں کو مل نہیں رہی' اس کی تلاش ہو رہی ہے کہ اس سے پیشتر درمیان میں ایک کڑی تھی۔ وہ جو Missing Link (گم شدہ کڑی) ہے' دیکھیے قرآن کس طرح سے بات ایک لفظ میں صاف کر جاتا ہے۔ کہا ہے کہ وَ اِذۡ قَالَ رَبُّکَ لِلۡمَلٰٓئِکَۃِ اِنِّیۡ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنۡ صَلۡصَالٍ (15:28) زندگی کی ابتدا' جو پیکرِ انسانی میں آکر نمودار ہوئی' اس کی ابتدا یہاں سے ہوئی تھی۔ یہ مٹی اور پانی کے امتزاج سے ہوتا ہے۔ یہ میں نے ابھی عرض کی' یہاں بات کچھ اور کہہ رہا ہوں۔ یہاں انسان کی پیدائش کا ذکر آیا ہے۔ پہلے ہے کہ وَ الۡجَآنَّ خَلَقۡنٰہُ مِنۡ قَبۡلُ مِنۡ نَّارِ السَّمُوۡمِ (15:27) اس نوع کی پیدائش سے پہلے یہاں ایک مخلوق تھی۔ اور ''جن'' کے تو معنی ہی ہوتا ہے جو نگاہوں سے غائب ہو چکی ہو' جو اب نظر نہ آتی ہو۔ تو وہ ایک مخلوق تھی جو اب تمہیں نظر نہیں آتی' وہ مِنۡ قَبۡلُ تھی یعنی انسان سے پہلے یہاں تھی' اب وہ نہیں ہے۔ پہلے انسان کی پیدائش کا ذکر ہے' درمیان میں یہ چیز ہے کہ اس سے پہلے ایک نوع تھی۔ اس کے بعد ہے کہ وَ اِذۡ قَالَ رَبُّکَ لِلۡمَلٰٓئِکَۃِ اِنِّیۡ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنۡ صَلۡصَالٍ (15:28)۔ پھر وہ بات ہے کہ اس مقام کے اوپر خدا نے انسانوں سے یہ کہا کہ میں یہاں بشر پیدا کر رہا ہوں۔ وہاں (2:30) میں جَاعِلٌ فِی الۡاَرۡضِ خَلِیۡفَۃً (2:30) ہے' یہاں بشر ہے۔ تو گویا بشر یعنی انسان اس زمین پر اپنی کسی پہلے نوع کا جانشین ہے' اس نے اس کو Succeed کیا ہے' وہ مفقود ہو گئی' نہیں رہی' اس کی جگہ اس نے لے لی' بات اتنی سی تھی لیکن اس کے اندر جانشینی کے لیے بہر حال قوت کی ضرورت ہوتی ہے' اس کے بغیر تو کسی کا جانشین نہیں ہوسکتا۔ اس لیے مجازی طور پر پہلے معنی ہیں ''کسی کے بعد آنا' کسی کا جانشین ہو جانا''۔ اس کے اگلے معنی ہوتے ہیں ''قوت کے ساتھ کسی کا جانشین ہو جانا''۔ اسی لیے خلافت کے جو معنی ہیں' وہ ہیں ''کسی کا

جانشین ہونا ایک قوت کو ساتھ لیے ہوئے'' ورنہ اگر یہ چیز اس کے ساتھ نہ ہو ''تے فیر تہانوں پتہ اے خلیفہ ساڈے کنوں کیندے ہیگے نیں۔ جس طراں دا مہتر ہوندا اے نا تہاڈا اوس طراں دا ای خلیفہ ہوندا اے ❶''۔

کسی انسان کے لیے خدا کا جانشین ہونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا

کہا ہے کہ اِنِّیۡ جَاعِلٌ فِی الۡاَرۡضِ خَلِیۡفَۃً (2:30)۔ میں نے عرض کیا ہے کہ جب خلافت کا لفظ یا استخلاف فی الارض قرآن میں آئے گا' اس کے معنی ہونگے ''کسی پہلی قوم کی جانشینی کرنی' قوت کو مملکت کو حکومت کو ساتھ لیے ہوئے''۔ اور اگر یہ نہ ہو تو پھر میں کہتا ہوں اس کی تو جانشینی ہوتی نہیں ہے۔ دو چیزیں آ گئیں کہ میں یہاں پہلی نوع کا ایک جانشین پیدا کرنے والا ہوں' صاحبِ قوت ہوگا۔ اب آگے بات آتی ہے' بڑی عجیب چیز ہے۔ اس وقت تک جتنی مخلوق پیدا ہو چکی تھی' اوپر ملائکہ ہوں یا اس زمین کے اوپر حیوانات تک ہوں' ان میں سے کوئی مخلوق صاحبِ اختیار اور ارادہ نہیں تھی' کوئی اپنی مرضی سے کچھ نہیں کر سکتا تھا' جن قوانین کے تابع چلنے کے لیے انہیں پیدا کیا گیا تھا وہ سر جھکائے ان کے مطابق چلتے چلے جاتے تھے۔ نتیجہ اس کا یہ تھا کہ یہاں کوئی زندگی میں اضطراب نہیں تھا' خلفشار نہیں تھا' کوئی فساد نہیں تھا' ناہمواریاں نہیں تھیں۔ قرآن نے یہ بات کہی ہے۔

انسانی پیدائش کے سلسلہ میں خدا کے حضور فرشتوں کے خدشات کو بیان کرنے کا ایک محاکاتی انداز

کس حسین انداز میں وہ بات کر جاتا ہے! گویا فرشتوں کی نگاہوں میں اس نئے ہیولیٰ آب و گل کے اندر کچھ آگ کی چنگاریاں' کچھ خون کے چھینٹے ڈھانپے۔ آپ نے دیکھا کہ بات کرنے کا کیا ڈرامائی انداز ہے! وہ انہیں ایک نئی نئی سی مخلوق نظر آئی۔ یہ فساد انگیزیاں اور خوں ریزیاں قوانینِ خداوندی سے سرکشی کے بعد پیدا ہوتی ہیں۔ قانون کی اطاعت کیے چلے جایئے تو یہ چیزیں پیدا نہیں ہوتیں۔ قرآن دیکھیے کس انداز سے یہ بات کر گیا ہے کہ یہ کوئی ایسی مخلوق پیدا کی جا رہی ہے جو فرشتوں کی طرح' باقی جمادات و نباتات وحیوانات کی طرح' قانونِ خداوندی کے سامنے سر جھکائے ہوئے نہیں چلیں گے' اس میں سرتابی کی بھی ایک صلاحیت ہے۔ فرشتے کی معصوم نگاہوں نے یہ بھانپا' کہنے کا انداز ہے' برادرانِ عزیز! مقصد یہی ہے کہ انسان کے اندر اس چیز کا بھی امکان تھا۔ جب انہوں نے یہ بھانپا تو کہا کہ اَتَجۡعَلُ فِیۡہَا مَنۡ یُّفۡسِدُ فِیۡہَا وَ یَسۡفِکُ الدِّمَآءَ (2:30) بارِالٰہا! یہ کس قسم کی ایک جانشین نوع پیدا کی جا رہی ہے ہم تو جب اس کی امکانی قوتوں پہ نگاہ ڈالتے ہیں تو نظر ایسا آتا ہے کہ یہ تو تھرتھلی مچا دے گا' فساد انگیزیاں ہونگی۔ تقابل دیکھیے کہ کیا ہے! ایک نئی مخلوق کی کیا ضرورت پیش آئی ہے' غالبِ خستہ کے بغیر کونسے کام بند ہیں' تیرے سارے کام سنورتے چلے جاتے ہیں' یہ خدام کی جماعت ہے' کہتی ہے

---

❶ پھر آپ کو معلوم ہے کہ ہمارے ہاں خلیفہ کسے کہتے ہیں جس طرح کا تمہارے ہاں مہتر ہوتا ہے' اُسی طرح کا یہ خلیفہ ہوتا ہے۔

کہ وَنَحۡنُ نُسَبِّحُ بِحَمۡدِکَ وَ نُقَدِّسُ لَکَ (2:30) یہ آپ کی اس قسم کے تابع فرمان مخلوق ہے۔ یہاں دو الفاظ آ گئے: نُسَبِّحُ بِحَمۡدِکَ ۔تسبیح کرتے ہیں ترجمے میں یہی بات آپ کو ملے گی۔ تراجم میں تو آپ دیکھیں گے کہ ان میں کیا کیا چیزیں آپ کو ملتی ہیں۔ ترجموں میں یہ چیز ملے گی کہ ہم تیری تسبیح کرتے ہیں' ہم تیری پاکی بیان کرتے ہیں۔

تسبیح کا قرآنی مفہوم: قوانین خداوندی کی پیروی کرنا ہے

عزیزانِ من! آپ کے ذہن کے اوپر کوئی چیز آئی یا اس بات کا قلب کے اوپر کچھ اثر ہوا کہ ہم تیری تسبیح کرتے ہیں' ہم تیری پاکی بیان کرتے ہیں۔ یعنی (معاذ اللہ) گویا خدا نے ایسی مخلوق پیدا کر رکھی ہے جو اس کے اردگرد ہر وقت اس کے قصیدے کہتی رہتی ہیں: حضور بڑے جناب بڑے' ماشاء اللہ' با ادب باملاحظہ ہوشیار' می نہ سزد خدائے را'۔ کسی مخلوق کو اپنی Verification (تصدیق) کے لیے پیدا کرنا 'می نہ سزد خدائے را'۔ برادران عزیز! وہ ان چیزوں سے بلند ہے کہ کوئی اس کی تعریف کرے گا' اس کو ان چیزوں کی ضرورت نہیں ہے۔ نَحۡنُ نُسَبِّحُ بِحَمۡدِکَ (2:30) میں ''س ب ح'' سبح ہے جہاں سے تسبیح ہے۔ سبح کے معنی ہوتا ہے'' گھوڑے کی وہ چال جس میں وہ چاروں پاؤں پوری قوت کے ساتھ چلتا ہے جس سے اس کی تیز تر رفتار ہوتی ہے''۔ یہ جو رفتار ہے اس کو سبح کہتے ہیں۔ ''وہ تیراکی کا انداز جس میں پورا ہاتھ مار کر تیرا جاتا ہے'' اس کو سبح کہتے ہیں۔ حضرت یونسؑ کے قصے میں آتا ہے کہ اگر وہ مُسَبِّحِیۡنَ (37:143) میں سے نہ ہوتے تو پھر ساری عمر وہاں دریا میں ہی رہتے' اس کے معنی ہی یہ تھے' یہ نہیں ہے کہ انہوں نے تسبیح بیان کی تھی۔ یہ اس کے بنیادی معنی ہوتے ہیں۔ عرب اس کو استعمال کرتے ہیں کہ کسی کام کے حصول کے لیے پوری پوری قوتیں صرف کر کے سرگرداں رہنا۔ کہا ہے کہ نَحۡنُ نُسَبِّحُ بِحَمۡدِکَ (2:30) ہم یہ مخلوق موجود ہیں' تیرے ان پروگراموں کو وجہ ٔ حمد و ستائش بنانے کے لیے ہم ہر وقت سرگرداں رہتے ہیں' مصروفِ سعی و عمل رہتے ہیں' اس کے لیے جتنی قوتیں تم نے ہمیں دے رکھی ہیں' ساری کی ساری ہم اس پہ صرف کرتے رہتے ہیں۔ اور اس کے لیے نُقَدِّسُ لَکَ آیا ہے۔ قدس کے معنی ہمارے ہاں تو پاکی بیان کرنا کیا جاتا ہے۔ اس کا مادہ ''ق د س'' ہے' اس کے معنی ہوتا ہے ''دور دور نکل جانا''۔ اس کے بعد پاکیزگی کے معنی آتے ہیں اس کے معنی ہوتے ہیں '' آلائشوں سے دور ہونا'' بنیادی معنی اس کے ہوتے ہیں '' دور ہونے کے' دور دور چلے جانے کے''۔ کہا ہے کہ ہم اپنی ساری قوتوں کو' پوری استطاعت کے ساتھ' تیرے پروگرام کو وجہ ٔ حمد و ستائش بنانے کے لیے' صرف کرتے ہیں اور اس باب میں جہاں تک ہم جا سکتے ہیں' جاتے ہیں' دور دور نکل جاتے ہیں۔ جبھی ان کو پروں والے فرشتے کہا جاتا ہے۔

انسانی دنیا کو وجود میں لانے پر فرشتوں کی خدا سے فریاد

اس کے بعد کہا ہے کہ آپ فرمایئے تو سہی حضور! یہ کہیے کہ کونسی کوتاہی باقی رہ گئی جو یہ خدام پورا نہیں کر سکتے' یہ تو ہمارے خلاف کچھ تھوڑا اہم پہ' ہماری خدمت گزاری پہ' حرف آتا ہے جو ہماری موجودگی میں آپ کو کسی اور کی ضرورت پڑ رہی ہے۔ کیا انداز ہے' عزیزانِ من! قرآن کا یہ بڑا پیارا انداز ہے۔ فرشتوں کا یہ شکوہ بجا نظر آتا ہے۔ نہایت اچھے فرماں بردار خادم کو جو آپ کا سارا کام کرتا ہو' آپ یہ کہیں کہ بھئی! میں ایک اور آدمی لانے والا ہوں' اس کا ری ایکشن یہ ہوگا کہ کیوں سرکار! کچھ کوتاہی ہوگئی مجھ سے' کوئی خدمت میں کمی رہ گئی ہے جو آپ کو دوسرے کی ضرورت پڑی۔ نَحۡنُ نُسَبِّحُ بِحَمۡدِكَ وَ نُقَدِّسُ لَكَ (2:30)۔

فرشتوں کی خدمت گزاری اور ان کے خدشات کے جواب میں خالقِ کائنات کا جواب

جواب دیا جاتا ہے کہ اِنِّیۡۤ اَعۡلَمُ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ (2:30) بھئی! تم سے کچھ قصور نہیں ہوا' بات یہ نہیں ہے' بات یہ ہے کہ تمہارا علم وہیں تک محدود ہے جہاں تک ہم نے تمہارا احاطہ کار رکھا ہوا ہے۔ ہمارے پروگرام اس سے کچھ آگے جاتے ہیں اور وہ جو آگے کی دنیا ہے وہ ابھی تمہارے سامنے نہیں ہے۔ اس لیے تم سچے ہو جو یہ کہتے ہو۔ یہاں تک کی جو بات تھی کہ جو تمہارا احیطۂ کار ہے اس کے اندر ہم بالکل مطمئن ہیں' نہایت عمدگی سے تم کام کرتے ہو۔ آگے ایک اور میدان آتا ہے جو تمہارا میدان نہیں ہے' تم ابھی اس کا علم نہیں رکھتے کہ یہ ابھی وجود میں نہیں لایا' یہ اس کے لیے ہے جو کچھ ہم کرتے ہیں۔ عام طور پہ ہمارے ہاں یہ کہا جاتا ہے کہ وہ جو کہا ہے کہ اِنِّیۡۤ اَعۡلَمُ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ (2:30) ''ایہدے معنی نے' چپ کراوئے' پتہ نئیں تینوں ہیگا ایویں بک بک کردا رہنا ایں' وچوں جس گل دا پتہ نہ ہووے وچ دخل نہ دیے' میں کوئی ایویں آں بیٹھا ہویا چپ کر مینوں پتہ ہے تینوں نئیں پتہ❶'' یہ بات نہیں۔ برادرانِ عزیز! کیا بات ہے مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ کی!! بات عدمِ علم کی ہے' ہم جانتے ہیں کہ تم بہت دور تک چلے جاتے ہو۔ تمہارا بہت دور کا جو جانا ہے وہ ہماری نگاہ میں بہت قریب تک رہ جاتا ہے' ہماری نگاہ ذرا اس سے بہت دور جاتی ہے' تمہاری نگاہ ابھی وہاں جا نہیں سکتی' بات صرف اتنی ہے عزیزانِ من! نہ بھئی! تمہاری خدمت گزاری میں ہمیں کسی قسم کا کوئی گلہ نہیں۔ کیا بات ہے۔ خدا آقا دے' تو اس قسم کا آقا دے۔ اتنا کہنے کے بعد ڈکٹیٹر کی طرح پھر بیٹھ نہیں گیا' ٹھیک ہے کہ جیسے آپ کہتے ہیں ہم آگے سے بول ہی نہیں سکتے۔

آدم کو تمام نام بتا دینے کے متعلق ہمارے ہاں کی تفسیروں کا ذکر

وَ عَلَّمَ اٰدَمَ الۡاَسۡمَآءَ كُلَّهَا (2:31)۔ وہ خصوصیتِ کبریٰ اب سامنے آتی ہے۔ اس کا ترجمہ ہوتا ہے کہ آدم کو ہر شے کے نام بتا

---

❶ اس کے معنی ہیں کہ اے! خاموش رہو' تمہیں اس کا علم نہیں خواہ مخواہ بک بک کر رہے ہو۔ جس بات کا علم نہ ہو' اس میں مت دخل دو۔ کیا میں کوئی ایسے ہی بیٹھا ہوا ہوں! خاموش رہو' مجھے معلوم ہے' تمہیں معلوم نہیں ہے۔

دیئے۔ ہماری تفسیروں کے اندر پھر ناموں کی فہرستیں دی ہوئی ہیں، جس مفسر کو جتنے بھی نام یاد تھے مثلاً تیتر بٹیرا لگھی لیکن ان کی نگاہ تو مَا لَا تَعْلَمُوْنَ تک تھی، نہ ہوائی جہاز کا ذکر ہے، نہ کہیں ایٹم بم کا ذکر ہے اس لیے کہ وہ تو ان کی حدِ نگاہ سے آگے تھے۔ یہ آدم کو کہنے لگا کہ ''سارے ناں یاد کرادتے'' ❷۔ اسمآء کے برادران عزیز! معنی ہوتے ہیں ''کوئی ایک قسم کی علامت جس سے اس کی اصل و ماہیت پہچانی جائے۔'' جسے ہم نام بھی کہتے ہیں، اس کا مصرف اتنا ہی ہوتا ہے کہ بولو کون آیا تھا؟ عبدالرزاق آیا تھا جی! آپ دیکھتے ہیں کہ اس کے لغوی معنی آپ کے ذہن میں نہیں آرہے بلکہ وہ جس شخص کا نام عبدالرزاق تھا، آپ کے ذہن میں آگیا۔ اس لیے جہاں کہیں اسم کہا جاتا ہے، اس سے مفہوم مسمّٰی ہوتا ہے۔ جس چیز کو اس سے پہچانا جاتا ہے، درحقیقت وہ اس کا علم ہوتا ہے۔ کیا آپ کو عبدالرزاق کا پتہ ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اوئے مجھے پتہ ہے عبدالرزاق کا۔ آپ دیکھیے وہ عبدالرزاق یہ نہیں ہے کہ عبد کے معنی غلام، رزاق کے معنی بہت رزق دینے والا بلکہ یہ ہے کہ میں اس کے متعلق جانتا ہوں، مجھے تعارف ہے، میں اس کو جانتا ہوں، اچھی طرح پہچانتا ہوں۔

ایک لفظ اسم سے مسمّٰی کے متعلق یہ معلوم ہو گیا۔ کہا ہے کہ یہ ہے کُلَّھَا۔ کائنات میں اس سے پیشتر جو کچھ پیدا کیا گیا تھا، ان کی ماہیتوں کو، نوعیتوں کو، خاصیتوں کو، معلوم کرنے کا علم آدم کے اندر ودیعت کر کے رکھ دیا۔ ان سے کہا ہے کہ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (2:30) تمہاری جو حدِ علم ہے وہ بہت کم ہے۔

کائنات کے علم کے تحت مادیت کو زیادہ سے زیادہ مسخر کرنا ہی مقامِ آدم ہے

آپ دیکھیے کہ علم کی ہی بات کی ہے۔ کہا ہے کہ عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا (2:31) انسان کی علم کی وسعتیں بتائی ہیں، یہ ہے وجۂ شرفِ انسانیت۔ یہاں كُلَّهَا کتنی بڑی چیز ہے۔ کسی ایک دور میں بھی، عزیزانِ من! بڑے سے بڑا Scientist (سائنسدان) بھی نہیں کہہ سکتا کہ ہم نے کُلَّھَا دریافت کر لیا ہے۔ یہ کائنات تو اتنی ناپیدا کنار وسعتوں کی حامل ہے کہ نیوٹن (1642-1727) جیسا Scientist (سائنسدان) بھی یہ کہتا ہے کہ ہمارے متعلق تو یوں سمجھو کہ علم کے سمندر کے کنارے پہ بچے یہ گھونگھے اور سیپیاں چن رہے ہیں۔ Aticon جیسا علم الافلاک کا ماہر یہ کہتا ہے کہ ہم نے یوں بہت کچھ معلوم کیا لیکن سائنس کی دنیا میں آخری لفظ دنیا کے آخری انسان کے لیے چھوڑ دینا چاہیے۔ اور یہاں کہا ہے کہ وَ عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا (2:31)۔ یہ ظاہر ہے کہ یہ علم بے معنی رہ جائے اگر اس علم کے صرف کرنے کے لیے یہاں مواقع نہ ہوں۔ اس لیے نظر آتا ہے کہ آدم کے لیے تو ابھی بڑے وسیع میدان اور آنے والے ہیں، برادرانِ عزیز! جب تک اس کے متعلق كُلَّهَا نہیں کر لے گا، یہ آدم کا سلسلہ ختم نہیں ہوگا، ورنہ خدا کی یہ پیدائش عبث ہو جائے گی، بیکار

---

❷ سارے نام یاد کرا دیئے۔

ہوجائے گی: عَلَّمَ اٰدَمَ الۡاَسۡمَآءَ كُلَّهَا (2:31) . سب سے پہلے مقامِ آدم سے برادرانِ عزیز! روشناس کرایا جارہا ہے۔ آپ دیکھتے ہیں مقامِ آدم کیا ہے!! اب جس قدر ان اشیائے فطرت کا علم حاصل کرتا چلا جائے گا اور علم کے دو معنی ہیں: یہ ہے کیا' کس قانون کے تابع یہ کام کررہی ہے اور جوں جوں آپ اس قانون کو دریافت کرتے چلے جائیں گے' ہر قوت آپ کے سامنے مسخر ہوتی چلی جائے گی ۔ یہ قوتیں آپ کے سامنے جو آپ کی مسجود بنی ہوئی ہوتی ہیں یعنی جن کے سامنے آپ جھک رہے ہوتے ہیں' وہ ہوتا ہے' جن کے متعلق آپ کو علم نہیں ہوتا' ابھی جہالت ہوتی ہے۔ جس قوت کے متعلق انسان کو علم ہوجاتا ہے' وہ قوت اس کے سامنے جھک جاتی ہے۔

آدمیّت کے مقام کے بعد مقامِ مومن تک رسائی حاصل کرنے کا نسخۂ کیمیا

اب مقامِ آدم کا تعین یہ ہوا کہ یہ دیکھنے کے لیے کہ کسی کو کس قدر قامتِ آدمیّت نصیب ہوئی ہے Human Strature (قامتِ آدمیت) کتنا نصیب ہوا ہے' دیکھنا یہ چاہیے کہ اسے فطرت کے قوانین کا علم کس قدر حاصل ہوا ہے۔ جس حد تک عَلَّمَ الۡاَسۡمَآءَ والی یہ جو چیز ہے' اس کی اس میں سے جس حد تک نمود ہوتی چلی جائے گی' اتنے حد تک یہ ''آدمی دا پتر بندا جائے گا''۔ اور ابھی تو مقامِ آدم ہے برادرانِ عزیز! مقامِ مومن تو بہت آگے جاکر آتا ہے۔ ہر آدم مومن نہیں ہے۔ مقامِ آدم تو فقط ان قوتوں کا اتنا علم حاصل کرلینا ہے اور ان کو مسخر کرلینا' مقامِ مومن یہ ہے کہ ان کو مسخر کرنے کے بعد' ان قوتوں کو خدا کی بتائی ہوئی مستقل اقدار کے مطابق صرف کرنا لیکن یہ تو سوچ لیجیے کہ جو ان قوتوں کو مسخر ہی نہیں کرتا' اس نے ان کو صرف کیا کرنا ہے۔ مومن ہو نہیں سکتا جب تک کہ پہلے آدم نہ ہو۔ آدمی مومن ہوسکتا ہے جسے مقامِ آدم نصیب نہیں وہ مقامِ مومن تک پہنچ نہیں سکتا۔ یہی چیز ہے جسے علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ (1938-1877ء) نے کہہ دیا کہ

بآدمے نہ رسیدی' خدا چہ می جوئی

(جاوید نامہ' ص۔220)

''توں تے بندے دا پتر نئیں ہجے بنیاں تے رب لبھدا پھرنا ایں''۔ ❶

کیا بات ہے یہ جو کہہ گیا ہے! یہ وہ چیز ہے یعنی مومن ہونے کے لیے یہ چیز مقدم ہے' بنیاد ہے یہ چیز اس کی کہ آدم ہو۔ مقامِ آدم کے اوپر جو قوم نہیں پہنچتی' جو فرد نہیں پہنچتا' مقامِ مومن پہ تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ وہ پہنچے۔ اب ہمارے سامنے تین Categories (شقیں) آ گئیں' عزیزانِ من! ایک مومن کی کیٹگری (شق) کہ آدم کا مقام حاصل کیا ہوا ہو' فطرت کی قوتوں کا علم پورے کا پورا اپنے دور کی علمی سطح تک حاصل ہو' اس سے آگے تو یہ جا نہیں سکتا' یہ تو کھلا ہے۔ یہاں تو

---

❶ تم تو ابھی مقامِ آدم ہی نہیں حاصل کرسکے اور رب کو ڈھونڈتے پھر رہے ہو۔ (اور لگے ہو مقامِ مومن کی تلاش میں)۔

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں

پتہ نہیں ابھی اس کی آخری حد کونسی آنی ہے۔ اپنے دور تک کا جو علمِ انسانی ہے' اس تک پہنچ کر فطرت کی قوتوں کو مسخر کرنا' مقامِ آدم ہے اور اس کے بعد ان قوتوں کو نوعِ انسانی کی عالمگیر ربوبیت کے لیے' خدا کی بتائی ہوئی اقدار کے مطابق صرف کرنا' یہ مقامِ مومن ہے' یہ ایک گروہ ہے۔ دوسرا وہ گروہ ہے' جو ابھی صرف مقامِ آدم تک پہنچا ہے ' فطرت کی قوتوں کو مسخر کیا ہے اور اپنے مفاد' اپنی منفعتوں کے لیے ان کو صرف کر رہا ہے بہرحال مومن نہیں ہوا' آدم کے مقام پہ تو آیا ہے۔ اور تیسرا گروہ یہ ہے' جس نے ''نہ نیتی نہ قضا کیتی'' فطرت کی قوتوں کو مسخر ہی نہیں کیا' مقامِ آدم ہی حاصل نہیں ہے' عزیزانِ من! وہ مقامِ مومن کہاں حاصل ہوگا۔ جسے آپ روحانیت' جسے آپ قربِ خداوندی' جسے آپ خدا کا ملنا کہہ رہے ہیں' میں کہتا ہوں' جس کے نصیب میں مقامِ آدم نہیں ہے' مقامِ مومن اس کے تصور میں بھی نہیں آ سکتا۔ یہ تیسری کیٹگری (شق) ہے' اس میں ہم ہیں۔

آدم کے تفصیلی تعارف کے سلسلہ میں خدا تعالیٰ کی مزید وضاحت اور ملائکہ کا اعتراف

برادرانِ عزیز! آدم کا تعارف یہ کہہ کر کرایا گیا ہے کہ عَلَّمَ اٰدَمَ الۡاَسۡمَآءَ كُلَّهَا (2:31)۔ اور یہ وہ چیز ہے کہ تم نے یہ کہا تھا کہ ہم اس منصب کے حقدار ہیں' جس کے لیے یہ نئی مخلوق وجود میں لائی جا رہی ہے تو کہا ہے کہ ثُمَّ عَرَضَهُمۡ عَلَى الۡمَلٰٓئِكَةِ فَقَالَ اَنۡۢبِئُوۡنِىۡ بِاَسۡمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ (2:31) دیکھو بھئی! اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو' یہ سیدھی سی بات ہے اس میں' یہ خصوصیتیں ہیں' اگر تم میں بھی یہ خصوصیتیں ہیں' تو تم بتا دو' اس کے لیے ثبوت لے آؤ' شہادت لے آؤ ٹھیک ہے' ہم اسے پیدا نہیں کریں گے' تمہیں یہ منصب دیدیں گے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ خدا ڈکیٹٹر نہیں بن رہا۔ یہ کسی منصب کی Appointment (تقرری) کے لیے' اس کی Promotion (ترقی) کے لیے' معیار کیا مقرر کیا جا رہا ہے' میرٹ یعنی خصوصیتِ ذاتی کیا متعین کی جا رہی ہیں۔ اگر تم اپنے اس دعوے میں سچے ہو کہ ہم اس کے حقدار ہیں تو ہم اس طرح سے ڈکیٹٹر نہیں ہیں کہ ہم یہ کہہ دیں کہ جس کو ہماری مرضی ہے ہم بنا دیں۔

قرآن حکیم کی سبحان اللہ جیسی جامع اصطلاح کو ہم نے پامال کر رکھا ہے' فرسودہ بنا رکھا ہے

آپ دیکھ رہے ہیں' عزیزانِ من! کہ اتنی بڑی لامحدود قوتوں کا مالک ہوتے ہوئے' کس قدر ایک قانون اور معیار کے مطابق باتیں کرتا چلا جاتا ہے' کہا ہے کہ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ . قَالُوۡا سُبۡحٰنَكَ (2:31-32) ہمیں اعتراف ہے۔ تیرے پروگرام بہت دور کے ہوتے ہیں۔ سُبۡحٰنَكَ یہاں آیا ہے' اب ہمارے ہاں تو سبحان اللہ ہے اور آپ کو پتہ ہی ہے کہ سبحان اللہ ہے۔ یہ بھی معلوم ہے کہ یہ اصطلاحیں ہمارے ہاں کس قدر پامال اور فرسودہ ہو چکی ہیں۔ اقبالؒ (1877-1938) نے صحیح کہا ہے کہ جو قومیں اپنے زندہ

تصورات کو فرسودہ کر دیتی ہیں' وہ فرسودہ تصورات پھر ان کو زندہ نہیں کر سکتے۔

(The Reconstruction of Religious Thought in Islam, 1986, P.120.)

اسی لیے میں یہ کہا کرتا ہوں کہ جب تک مذہب کے دائرے کے اندر کوئی قوم رہتی ہے' وہ انسانیت کی زندگی سے لطف اندوز ہی نہیں ہو سکتی کیونکہ مذہب نام ہوتا ہے دین کے زندہ تصورات کو مردہ اور فرسودہ بنا دینے کا۔ فرسودہ تصورات کسی قوم کو زندگی نہیں عطا کر سکتے۔

سُبۡحٰنَکَ میں وہی سچ آیا ہے' وہی دوری ہے۔ کہا ہے کہ ہمیں اپنی کم نگہی کا اعتراف ہے' ہمیں اس کا اعتراف ہے کہ جہاں تک تیری نگاہ پہنچتی ہے' ہماری نہیں پہنچتی' ہماری نگاہ اس سے بہت دور ہے۔ دیکھا آپ نے کیا بات کہی! وہاں دعویٰ تھا کہ **نَحۡنُ نُسَبِّحُ بِحَمۡدِکَ** (2:30) یہاں کہہ رہا ہے کہ نہیں! ہمیں اعتراف ہے کہ **سُبۡحٰنَکَ** جس دوری تک تیری نگاہ پہنچتی ہے' ہماری نگاہ نہیں پہنچ سکتی۔ اس لیے کہ **لَا عِلۡمَ لَنَاۤ اِلَّا مَا عَلَّمۡتَنَا** (2:32) ہمارا علم حاصل کرنے کا کوئی اور ذریعہ ہی نہیں ہے' جتنا تو نے ہم کو سکھا دیا' جتنا علم تو نے ہم کو دیدیا' ہمارا علم اتنا ہی ہے۔ اب اس مقام پہ آ گئے۔ کہا ہے کہ ہمارا علم اتنا ہی ہے جتنا ہمیں تو نے دیدیا اور تو **اِنَّکَ اَنۡتَ الۡعَلِیۡمُ الۡحَکِیۡمُ** (2:32) ہے۔

اس کرّہ ارض پر قرآن حکیم سے زیادہ لذت آفرین کوئی کتاب نہیں

برادرانِ عزیز! بڑی کیف آور کتاب ہے۔ خدا توفیق اور سعادت دے تو قرآن کو غور و تدبر سے پڑھا کیجیے۔ خدا شاہد ہے' اس سے زیادہ لذت آفریں اور کتاب کوئی نہیں ہے۔ میں صرف ایک کتاب کی حیثیت سے ہی آپ کو کہہ رہا ہوں' عقیدت تو اور چیز ہوتی ہے۔

قرآنِ حکیم کی طرف سے آدم کے بالمقابل ملائکہ کو ان کے محدود علم کا احساس دلانے کا طریق

کہا ہے کہ **اِنَّکَ اَنۡتَ الۡعَلِیۡمُ الۡحَکِیۡمُ** (2:32)۔ ابھی اس کے متعلق بات نہیں تھی' ابھی ان کی نفی کے متعلق ہے۔ تمہیں معلوم ہو گیا کہ تمہارا علم محدود تھا' معلوم ہو گیا کہ ہماری نگاہ اور آگے جاتی ہے!۔ ابھی اشیا ہی پیش کی تھیں کہ ان کے متعلق بتاؤ تو سہی' ابھی آدم سامنے نہیں آیا۔ **قَالَ یٰۤاٰدَمُ اَنۡۢبِئۡهُمۡ بِاَسۡمَآئِهِمۡ** (2:33) آدم سے کہا کہ ہاں بھئی! تم بتاؤ۔ دیکھا کلاس کے اندر کس طرح سے جیسے دو بچوں کا امتحان لیا جاتا ہے کہ تمہیں ایسے ہی نہیں ہم نے فیل کر دیا' اس کو ایسے ہی نہیں ہم نے تمغہ دیدیا۔ ہاں بیٹا! کہو تو **فَلَمَّاۤ اَنۡۢبَاَهُمۡ بِاَسۡمَآئِهِمۡ** (2:33) اس نے کر کے بتا دیا۔ یہ بتا دینے والی بات جو ہے' عزیزانِ من! اس میں کسی کی رعایت والی بات نہیں ہے' بات وہ چلی آ رہی ہے کہ وہ علم محدود ہے' اس کا جو علم ہے اس سے زیادہ ہم نے دیدیا ہوا ہے' علم کا ثبوت پیش کر دیا ہے ورنہ ایک امتحان تو وہ ہوا کرتا ہے' پرائمری اسکول ہونداسی پنڈ دا' اوتھے اونداسی اک انسپکٹر' امتحان لے کے فیل کردا ہونداسی' کہن لگا: دس اوئے

اخے نھو! مکھی دیاں کنی لتاں ہوندیاں ہیگیاں نیں؟ تیسری جماعت دا منڈا تے او پوچھ رہیا اے پئی مکھی دیاں کنیاں لتاں ہوندیاں نیں۔ کہن لگا: مینوں دیکھیا نا مینوں اگے پتہ ہیگا سی اے تیلی دا پتر نھوں آ' اوہنوں اونا کی ہیگا۔ کہن لگا: پیارے لال! آنڈے دا رنگ کی ہوندا ہیگا؟ کہن لگا: چٹا۔ کہن لگا: دیکھیا کس طراں بولدا ہے''۔ ❶

وہی اَسْمَآء ہیں جو اس کے سامنے پیش کیے جاتے ہیں' وہی اس کے سامنے ہیں' وہاں مکھی اور یہاں انڈہ نہیں پیش کیا جاتا۔ کہا ہے کہ **فَلَمَّآ اَنْبَاَ هُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ** (2:33)۔ اب یہاں یہ کہا کہ کیوں بھئی! میں نے تم سے نہیں کہا تھا۔ یہاں بھی آپ دیکھیے وہ ڈانٹ والی بات نہیں ہے کہ خوامخواہ کے لیے تم نے دخل در معقولات دے دیا تھا' دیکھ لیا' وہی بات جو ہم کہتے تھے۔ یہ بات نہیں ہے۔ میں نے تمہیں کہا تھا کہ **اِنِّیْٓ اَعْلَمُ غَیْبَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ** (2:33)۔ تم صرف ان چیزوں کا علم رکھتے ہو جو مشہود ہو کر تمہارے سامنے آ جاتی ہیں' ہم ان کا بھی علم رکھتے ہیں جو ابھی تک غیر محسوس طور پر تمہاری نگاہوں سے پوشیدہ ہوتی ہیں۔ تو گویا بات اتنی ہی تھی۔

ملائکہ کو دیئے گئے علم کی حدود کا تعین اور ہمارے ہاں کے تراجم کا پیدا کردہ خلجان

آپ دیکھیے ان کے خلاف کوئی جرم نہیں عائد کیا گیا' نقص نہیں نکالا گیا' کوئی شکایت نہیں کی گئی۔ کہا اتنا ہی گیا ہے کہ ٹھیک ہے ہم جانتے تھے' تیسری جماعت کا لڑکا یہ نہیں بتا سکتا تھا اور ہم **غَیْبَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ** (2:33) کو بھی جانتے ہیں۔ برادرانِ عزیز! بات آگے آتی ہے۔ کیا بات ہے!! **وَ اَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَ مَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ** (2:33) ہم بہتر طور پر جانتے ہیں۔ اب آپ ترجموں میں جا کر دیکھیے اور پھر دیکھیے اس سے جو خلجان واقع ہوتا ہے۔ یہ اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے ''ہم جانتے ہیں جو کچھ ظاہر کرتے ہو' جو کچھ تم چھپاتے ہو''۔ اچھا! کہ وہ کچھ انہوں نے اپنے دل کے اندر پہلے چھپایا تھا اور اس نے بھانپ لیا **غَیْبَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ** جان کر ''بچو جی! ساہڈے کولوں چھپان ڈئے ہوئے ہیگے او''❷ دیکھا! ہم نے کیسے جان لیا! آپ دیکھیے یہ ترجمہ کرنے کے بعد بات کہاں چلی جاتی ہے کہ یہ فرشتے کر کیا رہے تھے اور کس طرح سے اس کے بعد چوری پکڑی گئی۔ سنیے! یہ بات نہیں ہے۔

---

❶ گاؤں کا پرائمری اسکول ہوتا تھا۔ وہاں ایک انسپکٹر امتحان لینے آیا کرتا تھا۔ کہنے لگا: اے نھو! مکھی کی کتنی ٹانگیں ہوتی ہیں؟ وہ تیسری جماعت کا لڑکا ہے اور پوچھ رہا ہے کہ مکھی کی کتنی ٹانگیں ہوتی ہیں۔ کہنے لگا کہ مجھے دیکھو! مجھے پہلے ہی معلوم تھا کہ تیلی کا بیٹا ہے' اسے آنا کیا ہے۔ کہنے لگا: اے پیارے لال! ذرا بتانا تو انڈے کا رنگ کیا ہوتا ہے؟ کہنے لگا: سفید۔ کہنے لگا: دیکھا! کیسے فرفر بول رہا ہے۔

❷ بچّو جی! ہم سے چھپا رہے ہو!

فطرت کی قوتوں کی نوعیت اور ماہیت

عزیزانِ من! فطرت کی قوتیں ایک تو وہ قوتیں ہیں جو از خود کائنات کے اندر یوں کارفرما ہو رہی ہیں۔ ان کے متعلق عام طور پہ اتنا ہی پتہ ہوتا ہے جتنی چیزیں وہ خود کر رہی ہیں۔ پانی کے متعلق ہمیں اتنا ہی پتہ ہوتا ہے کہ یہ پیاس بجھاتا ہے' نشیب کی طرف بہتا ہے' نہایا جاتا ہے۔ وہ چیز کہ پانی کے ایٹم کو پھاڑ کر فلک پیا قوتیں پیدا کی جا سکتی ہیں' یہ پانی کے اندر چھپی ہوئی چیز ہے' ابھی یہ باہر مشہود ہو کر نہیں آئی تھی۔ کہا ہے کہ تمہاری قوتوں کا جو حصہ اس وقت تک مشہود ہوا ہے' وہ ہے کہ جو آدم کے ہاتھ کے بغیر ابھی تک باہر آیا ہے تمہاری بے شمار صلاحیتیں جو ہیں وہ اس کے دست و بازو سے مشہود ہونے والی ہیں' ہم یہ جانتے ہیں۔ ہم جانتے ہیں تبدون تمہاری خاصیتیں' تمہاری قوتوں کی جو کچھ نمود ہوئی ہے۔ تم نے یہ اپنے ذہن میں سمجھ لیا تھا کہ ہماری نمود پوری ہو چکی ہوئی ہے' ہم یہی کچھ ہیں' تمہیں اپنے متعلق ابھی علم نہیں ہے۔ اور اسے کیوں پیدا کیا جاتا ہے؟ کہ وہ اس کے دست و بازو کے بغیر تمہاری مضمر قوتوں کی نمود نہیں ہو سکے گی' اسے تمہارے لیے پیدا کیا جا رہا ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ یہ کیا پیدا کیا جا رہا ہے؟ وَ اِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِکَۃِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا (2:34)۔ مقامِ آدم نکھر کر سامنے آ گیا' بلا ساختہ فطرت کی قوتیں اس کے سامنے سجدہ ریز ہو گئیں کہ ہاں! تجھے اس کا حق پہنچتا ہے' جو تو کہے گا اس کے مطابق کرتے چلے جائیں گے اس لیے کہ اب تیرے فرمان کی تعمیل میں ہماری مضمر قوتوں کی نمود ہوتی چلی جائے گی۔

قوانینِ خداوندی کے سامنے سجدہ ریز ہونے کا مفہوم اور نتیجہ

عزیزانِ من! آپ دیکھتے ہیں کہ سجدے سے ہوتا کیا ہے۔ ملائکہ آدم کے سامنے سجدہ کرتے ہیں تو ان کی مضمر قوتوں کی نمود ہوتی چلی جاتی ہے۔ خدا فراموش آدم نے سمجھ لیا کہ آدم نے کسی کے سامنے سجدہ نہیں کرنا۔ اس نے کہا کہ نہ کرے' سجدہ نہ کرنے سے تمہیں پتہ ہے کہ کُنْتُمْ تَکْتُمُوْنَ (2:33) جو ہے' وہ نمود میں نہیں آیا کرتا' نہیں کرتے ہو تو اپنا ہی کچھ گھٹتا ہے۔ ملائکہ نے آدم کے سامنے سجدہ کیا تو ملائکہ کی مضمر قوتیں نمود میں آ گئیں۔ آدم اپنے سے اونچی ہستی جسے خدا کہتے ہیں' کے سامنے سجدہ کرے گا' اس کی مضمر قوتیں بھی نمود میں آ جائیں گی ورنہ یہ مضمر کی مضمر رہیں گی۔ اس سجدے کے معنی' برادرانِ عزیز! کمتر ہو جانا نہیں ہے' پستی نہیں ہے' ذلت نہیں ہے' اس سجدے کے معنی ہیں کہ ''اپنی جتنی مضمر قوتیں ہیں' ان کی نمود ہو کر پہلے سے بھی اونچا مقام ہو جائے''۔ میں نے ہی ایک جگہ لکھا ہوا ہے کہ جس سجدہ کرنے والے کی صورت یہ نہ ہو کہ سجدے سے پہلے جو اس کا مقام ہے' سجدے سے اٹھنے کے بعد جو قیام ہوا ہے' پہلے مقام سے وہ اونچا نہیں ہو گیا' اس کا سجدہ سجدہ نہیں ہوا۔ سجدے کے بعد کے قیام میں اور سجدے کے پہلے کے مقام میں' برادرانِ عزیز! فرق ہونا چاہیے۔ اور سجدے کے بغیر مقام کی نمود ہو نہیں سکتی۔ یاد رکھیے! مقام کی بلندی ہو نہیں سکتی۔

برادرانِ عزیز! ہم Laws of Nature (قوانین فطرت) کو Obey (تابعداری) کرتے ہیں۔ کاہے کے لیے؟ We Obey to conquer them' ان کے مطابق ہم عمل کرتے ہیں تو وہ Conquer (مسخر) ہو جاتے ہیں۔ Laws of Nature (قوانینِ فطرت) ہی نہیں' کائنات کے اندر' آگے چل کر اب بات آئے گی' اسی قصہ آدم میں آ رہی ہے۔ خود انسان کی اپنی جو اندرونی زندگی ہے' اس کے لیے بھی اس نے قوانین دیئے ہوئے ہیں۔ ان قوانین کے سامنے جھکنے کے معنی ہیں خدا کو سجدہ کرنا۔ جیسے ملائکہ کے سجدے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ سچ مچ کے کوئی پروں والی مخلوق بیٹھی ہوئی تھی' پھر آدم کا پتلا سامنے رکھا ہوا تھا' جب خدا نے یہ حکم دیا' تو تمام نے زمین کے اوپر سر رکھ دیا' یہ بات نہیں ہو رہی۔ سجدے کے معنی کیا ہیں؟ یہ کہ اس کے قوانین کی اطاعت' اس کی منشا کے مطابق' اپنے آپ کو ڈھال لینا۔ خدا کے سامنے سجدہ کرنے کے معنی یہ ہیں ''قوانینِ خداوندی کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دینا''۔ ان قوانین کے سامنے سرِ تسلیم خم کرو' تمہاری جو ما تبدون ہے' وہ تو یہ معلوم ہے جو کچھ ہے' اور جو مَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ (2:33) ہے' اس کی بھی نمود ہو جائے اور وہ باہر آ جائے۔

خدا کے ہاں ابلیس کا مقدمہ اور ہزار برس سے ہمارے ہاں کی تفسیریں

کہا ہے کہ فَسَجَدُوْٓا (2:34) سب جھک گئے۔ اِلَّآ اِبْلِيْسَ (2:34)۔ اب یہاں سے ایک دوسرا مقام شروع ہوتا ہے' صحیح انسان کی زندگی اب شروع ہو رہی ہے۔ دو الفاظ ہیں' برادرانِ عزیز! ان کو میں ختم ہی کرنا چاہوں گا' درس کا وقت تو پورا ہوا چاہتا ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ پانچ دس منٹ اور چاہئیں ورنہ جو موضوع ہے' وہ تشنہ رہ جائے گا' بات منقطع ہو جائے گی۔ کہا ہے کہ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ (2:34)۔ آپ نے یہ سمجھ لیا۔ اِلَّآ اِبْلِيْسَ کے معنی میں آپ کے ہاں مشہور ہے کہ ابلیس بھی ملائکہ میں سے تھا' یہ ایک فرشتہ تھا' باقی فرشتوں نے سجدہ کر دیا' فرشتوں میں سے ایک نے سجدہ نہ کیا' تو وہ جو تھا ابلیس ہو گیا' کافر ہو گیا' شیطان ہو گیا بلکہ اس کے بعد یہ کہتے ہیں کہ وہ معلم الملکوت تھا' فرشتوں کا استاد تھا۔ فرشتوں کے شاگردوں نے تو سجدہ کر لیا' اس نے نہ کیا۔ عزیزانِ من! ابھی ابھی ہم قرآن کی یہ آیت اپنے سامنے لے آ رہے ہیں کہ پورے کے پورے ملائکہ سے متعلق کہا ہے کہ هُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ (16:49) وہ مجالِ سرتابی ہی نہیں رکھتے' وَ يَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ (16:50) ان سے جو کہا جاتا ہے' وہ کرتے ہیں۔ اگر یہ ملائکہ میں سے ایک ہو تو خدا ان سے کہے کہ سجدہ کرو اور وہ سرتابی برت رہے ہیں' قرآن کا یہ دعویٰ باطل ہو جاتا ہے لیکن ہزار برس سے ہمارے ہاں تفسیر چلی آ رہی ہے کہ ملائکہ میں سے تھا' اس نے سرتابی برتی۔ یہ بات نہیں تھی۔

انسان کے اپنے اندر اختیار و ارادہ کی قوت کی اہمیت اور اس کے استعمال کی نوعیت

اِلَّا کے یہ معنی نہیں ہیں۔عربی جاننے والے حضرات جانتے ہیں کہ یہ دوسری قسم کا اِلَّا ہوا کرتا ہے یعنی اس پوری مخلوق نے تو یہ کر دیا' ایک اور مخلوق تھی وہ نہ جھکی۔ یہ کیا چیز ہے؟ یہ وہ چیز ہے جو انسان کا اپنے اندر کا اختیار و ارادہ ہے۔ یہاں سے انسان صاحبِ اختیار و ارادہ ہوا ہے۔تعارف ہی انسان کا یہ کہہ کر کرایا گیا کہ اس کے اندر اس کے سامنے جھکنے کی بھی صلاحیت ہے اور سرتابی کی بھی صلاحیت ہے۔اب جو دو Possibilities (امکانات) کسی کے سامنے آئیں گی' برادرانِ عزیز! اسے ہی صاحبِ اختیار کہا جائے گا۔اگر کسی کے سامنے اس کام کا کوئی دوسرا Alternative (متبادل) نہ ہو تو اسے آپ تعمیلِ ارشاد نہیں کہہ سکتے' اسے سجدہ نہیں کہہ سکتے۔اسے آپ صاحبِ اختیار نہیں کہہ سکتے جس کے سامنے دوسرا Alternative (متبادل) نہ ہو۔مقامِ آدم کے معنی یہ ہیں کہ اس کو اس چیز کا اختیار و ارادہ دیا' کہا یہ ہے کہ وَ قُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ (18:29) ہم نے یہ حقائق تمہارے سامنے پیش کر دیئے فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّ مَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ (18:29) ۔فرشتوں کے متعلق تو یہ نہیں کہا تھا' ان سے کہا تھا کہ جو ہم کہتے ہیں وہ ان کو کرنا ہوتا ہے۔اس کے متعلق کہا ہے کہ ہم نے تمہیں راہنمائی دیدی ہے Two Alternatives (دو متبادل)' Two Posibilities (دو امکانی) چیزیں موجود ہیں' دوراہے پہ تم کھڑے ہو' دوراستے ہیں۔اگر اس کے لیے ایک ہی راستہ ہوتا تو وہ انسان نہیں ہو سکتا تھا۔ایک ہی راستہ ہوتا تو وہ چلتا ہی اس کے اوپر' یہ اس کے لیے باعث شرف نہیں تھا۔باعثِ شرف یہ ہے کہ دوراستے سامنے ہوں' ایک راستے کے متعلق معلوم ہو کہ اس کے قوانین کے تابع اس راستے کے اوپر چلنا ہے۔

اختیار و ارادہ کے تحت امکانی خصوصیات کی نوعیت

دوسرا راستہ یہ ہے کہ اپنی جو منفعت کوشیاں اور مفاد پرستیاں ہیں' اپنی جو ترغیبات اور تاثیرات ہیں' اپنے Ego (ایغو) کی جو Demand (طلب و ترغیب) ہے' وہ اس راستے کو اختیار کرنا چاہتی ہے' اسے اجازت ہے کہ یہ اختیار کر لے' اپنا اختیار برت لے' یہاں تک تو یہ صاحبِ اختیار ہے کہ سنکھیے کی پڑیا سامنے ہو' اس کے اوپر لکھا ہوا ہو کہ سنکھیا ہلاکت آفریں Poison (زہر) ہے' صرف اس حد تک اس کی راہنمائی ہوتی ہے' اس کے بعد اس کو اختیار ہے' جی چاہے اس پڑیا کو پھینک دے' زندہ رہے اور جی چاہے پھانک لے' موت آ جائے گی۔ پھینک دینا یا پھانک لینا یہاں تک اس کے سامنے یہ چیز تھی۔ پھانک لینے کے بعد یہ بات کہ سنکھیا اپنا اثر نہ کرے' یہ اس کے بس کی بات نہیں رہتی' یہاں پھر وہ جو ملک الموت ہے' وہ آ جاتا ہے۔آپ دیکھیے جونہی اس نے قانونِ خداوندی کی سرکشی کی ہے' وہ فرشتے جو اس کے سامنے جھکے ہوئے تھے' وہ اس کے اوپر غالب آ جاتے ہیں۔

خیر وشر کا بنیادی مسئلہ شیطان اور ابلیس کے قرآنی مفہوم سے واضح طور پر حل ہو جاتا ہے

ابلیس انسان کے اپنے اندر کی وہ قوتیں ہیں، جو قوانینِ خداوندی سے سرتابی برتیں۔ یہ ہر قوت نہیں، ہر جذبہ نہیں جسے ابلیس کہیں، یہ صرف قوانین خداوندی سے سرتابی برتنے والی قوتیں ہیں۔ اب یہاں سے خیر وشر کا مسئلہ نہایت عمدگی سے طے ہو جاتا ہے، یہ جسے Good & Evil (خیر اور شر) کا Question (مسئلہ) کہا گیا ہے کہ یہ جو Evil (شر) ہے یہ Eternity تک Resist (مزاحمت) کرتا ہے، اسی طرح سے، ایک وہ عقیدے کی بات آگے آئے گی جب میں ثنویت یا Dualism پہ آؤں گا تو بتاؤنگا کہ یہ چیز نہیں ہے۔ انسان کے اندر کچھ استعداد، صلاحیتیں, Potentialities اور امکانات (Possibilities) رکھی ہوئی ہیں کہ جس طرح سے یہ جی چاہے، ان کو استعمال کر سکتا ہے۔ قانونِ خداوندی کے مطابق استعمال کرے گا تو خیر ہی خیر ہے، ان کے خلاف استعمال کرے گا تو Evil (شر) ہے۔ نتائج دونوں کے غیر متبدل ہیں، ان کو بدلنے کا اسے اختیار نہیں ہے۔ وہاں تک یہ صاحبِ اختیار ہے۔ اس سے آگے یہ مجبور ہے۔ ابلیس اس کی وہ قوتیں ہیں جو اس کو قوانینِ خداوندی کے خلاف اپنی مفادِ عاجلہ، اپنی منفعت کوشیوں، اپنی حیوانی سطح کے اوپر کے جذبات، خواہشات کی طرف لے جائے۔ ان حیوانی سطح کے جذبات وخواہشات کی طرف لے جانے والی جو قوتیں ہیں، ان کو شیطانی کہتے ہیں، ابلیس بھی کہتے ہیں اور یہ قرآن کی بڑی عجیب چیز ہے کہ یہ دو الگ الگ چیزیں نہیں ہیں، یہ ایک ہی سکہ ہے جس کے دو رخ ہیں۔ شـطـن کے معنی ہوتا ہے "سرکشی برتنا"۔ اور آپ کسی قانون کے خلاف سرکشی برتیے، قانون کی خلاف ورزی کیجیے، سنکھیا کھا لیجیے، اس کے بعد کیا کیفیت ہوتی ہے؟ اب آپ مجبور ہو گئے، جب وہ اپنا عمل کر رہا ہے، آپ پہ زندگی کی طرف سے مایوسی طاری ہو گئی۔ ابـلـس کے معنی ہی "مایوس ہو جانا" ہیں، ابلیس کہتے ہی اس کو ہیں جو مایوس ہو جاتا ہے۔ ہر Aggression (جارحیت) کا نتیجہ Frustration (مایوسی) ہے۔ جہاں آپ قانونِ خداوندی کے کسی قانون سے خلاف ورزی برتتے ہیں، اس وقت تو جوش کے اندر آپ یہ کر جاتے ہیں، اس کے بعد جب اس کے Consequences (نتائج، اثرات) آپ کے سامنے آتے ہیں، آپ کو خود اس چیز کے اوپر ایک مایوسی (Frustration) ہوتی ہے۔

آخر آج دنیا میں ویلفیئر اسٹیٹس (فلاحی مملکتوں) کی اخلاقی حالت اس قدر ناگفتہ بہ کیوں ہے؟

آپ دیکھتے ہیں کہ آج دنیا کے اندر دونوں چیزیں موجود ہیں۔ سویڈن ناروے جیسی سلطنتیں ہیں، جنہوں نے ویلفیئر اسٹیٹ (فلاحی مملکتوں) میں دنیا کے اندر معیار قائم کیا ہے۔ جہاں کسی فرد کی کوئی ضرورتِ زندگی پوری ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ یہ اتنی بڑی فلاحی مملکت ہے لیکن انہوں نے انسانی زندگی کے متعلق جو اقدارِ خداوندی ہیں انہیں نظر انداز کیا ہے۔ ان اقدار کو نظر انداز کرنے کا نتیجہ کیا ہے؟ یہ کہ

ایک طرف ان کے ہاں جا کر دیکھیے' اخلاقیات کا تصور ہی نہیں ملے گا' خالص حیوانی سطح کے اوپر زندگی بسر ہو رہی ہے۔

چلیے' آپ کہتے ہیں کہ سرکشی ہے تو کرو۔ برادران عزیز! ابلیسیت مایوسی کہاں آتی ہے' وہاں مایوسی ہے۔ آج دنیا میں جتنی خودکشی کی وارداتیں ان سویڈن' ناروے جیسی فلاحی مملکتوں میں ہو رہی ہیں دنیا میں کسی حصے کے اندر نہیں ہوتی ہیں۔ خودکشی مایوسی کی انتہا ہے' برادرانِ عزیز! شیطان اور ابلیس ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔ آغاز شیطنت سے ہوتا ہے' انجام ابلیسیت پہ جا کر ہوتا ہے۔

یورپ کے ابلیسی نظام نے پوری انسانیت کو مایوسی کے سمندر میں غرق کر دیا ہے

آج آپ کی ساری دنیا مایوس ہوگئی ہے' وہ شیطنت کا نتیجہ ہے جو گزشتہ دو سو سال سے ہے۔ یہ یورپ کے ابلیسی نظام یا شیطنت کے نظام نے پیدا کیا تھا۔ دنیا آج ابلیسیت کے مقام کے اوپر پہنچ گئی ہے' وہاں سے انسان کا کوئی قانون اور نظام اسے نہیں نکال سکتا۔ میں آگے چل کر بات کروں گا' برادرانِ عزیز! کیا یہاں بحث ہونے کے بعد جب انسان مایوس ہو جاتا ہے' تو پھر سوائے موت کے کوئی اس کا چارہ کار نہیں ہوتا؟ قرآن کہتا ہے کہ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ (39:53)۔ تیرے اندر اور قوتیں ابھی موجود ہیں' اب بھی تو اس سے نکل سکتا ہے۔ کیا یقین ہے کہ تو نکل سکتا ہے؟ آگے ابلیس آئے گا' بڑے دلچسپ مکالمے ہیں' برادرانِ عزیز! ابلیس اور خدا کے' ابلیس اور آدم کے۔

خدا کے حضور ابلیس کی ایک درخواست جو قبول کر لی گئی

ابلیس نے جب یہ کہا تھا کہ مجھے اتنی قوتیں دی ہیں' تو مجھے قیامت تک کے لیے مہلت بھی دے' یہ نہ ہو کہ میں اس کی شہ رگ کے اوپر ہاتھ رکھوں تو تُو میرا ٹینٹوا دبا دے۔ اس نے کہا کہ ٹھیک ہے' ہم بڑے منکسر المزاج ہیں' آدم بھی جب تک رہے گا' تجھے بھی اس وقت تک چھٹی ہے۔ اس نے کہا تھا کہ پھر تُو دیکھ کہ یہ تمہاری چہیتی اولاد جو تم نے بنائی ہے' میں اس کا کیا حال کرتا ہوں۔ قرآن کا ایک تقاضا وہاں آئے گا' تو یہ عرض کروں گا۔ اس نے کہا تھا کہ میں اس طرح انہیں کھُبّھی دے کر نچاؤں گا۔ کھُبّھی پتہ اے ناں کی ہوندی اے[1]؟ ایک تو لگام دی جاتی ہے' لگام میں پھر بھی جانور کی تھوڑی سی عزت باقی رکھی جاتی ہے۔ یہ وہی جومنجھ دی رسی تیری بوتھی نال بن دیندے نیں[2] کیا اسے کبھی آپ نے دیکھا ہے کہ وہ گاؤں کے لڑکے اسے کھینچتے ہیں۔ کھینچنا تو لگام سے بھی ہوتا ہے' کھینچنا اس سے بھی ہوتا ہے' اس لیے کہ یہ وہ چیز ہوتی ہے جو قرآن نے کہی ہے۔

---

[1] کیا آپ کو معلوم ہے کہ کھُبّھی کیا ہوتی ہے؟

[2] وہی جومنجھ کی رسی ہوتی ہے اس سے منہ باندھ دیتے ہیں۔

قرآن حکیم کی طرف سے عطا کردہ صراطِ مستقیم انسان کو گمراہ ہونے ہی نہیں دے گا

ابلیس نے کہا کہ بہت اچھا جی' اب ٹھیک ہے' مزا آیا۔ اب تُو دیکھ کہ تیری اس مخلوق کو میں کس طرح سے کھبّی (لگام) ڈال کر نچاتا پھرتا ہوں۔ جواب وہاں سے یہ ملتا ہے کہ ٹھیک ہے لیکن ہمارے مخلص بندوں کے اوپر تیرا کوئی اختیار نہیں چل سکتا' یہ مومنین کے ہاتھوں سے Evil (شر) کے (اوپر) غالب آنے والی قوتیں ہیں' لہٰذا یہاں کسی نظام میں تیری اس دنیا کے اندر ابلیسیت کی انتہا ہو جائے' اس میں سے انسان اپنی کاریگری سے نہیں نکل سکتا۔ یہاں وہ خدا کی جو رہنمائی ملے گی' یہ اس سے اس کے اوپر غالب آئے گا۔ جب یہ آئے گا تو یہ خدا کا عبد بنے گا' جب اسے آپ نے عبد بنا دیا ہے' اس کے اوپر ابلیس سوار ہوا ہے۔ فرشتے خواہ جھکے ہوئے کیوں نہ ہوں' جب یہ خدا کا عبد بن جائے گا' اس وقت کہا کہ یاد رکھو! ابلیس تمہارے اوپر غالب نہیں آ سکے گا۔ یہ تھا وہ جو کہا تھا کہ **اِلَّآ اِبۡلِیۡسَ اَبٰی وَ اسۡتَکۡبَرَ وَ کَانَ مِنَ الۡکٰفِرِیۡنَ** (2:34)۔ اسے مزید ہم آئندہ درس میں لیں گے۔ اب درس کا وقت ختم ہوا۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ

❀......❀......❀

چودھواں باب: سورۃ البقرۃ (1)' (آیات 35 تا 39)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَقُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا ۠ وَلَا
تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝٣٥ فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا
مِمَّا كَانَا فِيْهِ ۠ وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ
وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ۝٣٦ فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ۭ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ
الرَّحِيْمُ ۝٣٧ قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّىْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ
فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝٣٨ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰۗىِٕكَ
اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝٣٩

عزیزانِ من! آج ستمبر 1968ء کی یکم تاریخ ہے اور ہم قرآنِ کریم کے درس کے سلسلۂ نو میں سورۃ البقرۃ کی ابتدائی آیات پہ ہیں۔

سابقہ درس کی بازگشت

پچھلے درس میں بات قصہ آدم سے شروع ہوئی تھی اور میں نے عرض کیا تھا کہ یہ آدم کا قصہ کسی ایک فرد یا ایک جوڑے کا قصہ نہیں ہے' یہ درحقیقت خود آدمی کی داستان ہے' جسے قرآن نے اپنے مخصوص تمثیلی انداز میں بیان کیا ہے۔ اس نئی نوع کی خصوصیات کیا ہیں' اسے کیوں دنیا میں بسایا گیا' انسان کی Potentialities (صلاحیتیں) کیا ہیں' اس کے مضمر ممکنات کیا ہیں' انسان کا اور کائنات کا تعلق کیا ہے؟ یہ سارا کچھ تاریخ کے اس دور سے بیان کیا' جہاں انسانوں نے مل جل کر تمدنی زندگی بسر کرنا تھی' خود لفظ آدم کے اندر یہ چیز موجود ہے: ''مل جل کر رہنے والا تمدنی زندگی بسر کرنے والا''۔ پہلے حصے میں یہ کہا گیا تھا کہ انسان کو قوانینِ فطرت کا علم دیا گیا تاکہ وہ فطرت کی قوتوں کو مسخر کر سکے لیکن اس کے ساتھ ہی ایک اور چیز بھی اس کے اندر رکھ دی گئی اور وہ تھی اختیار اور ارادے کی قوت۔ یہی وہ قوت ہے جس سے انسان اس ساری کائنات سے الگ ایک امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ اختیار و ارادہ یا تو اوپر خدا کو حاصل ہے اور اس

نیچے صرف انسان کو حاصل ہے، خدا کی مخلوقات میں کسی اور کو اختیار و ارادہ حاصل نہیں ہے۔ اور آدم کا جو تعارف کرایا گیا ہے، آپ ابھی دیکھیں گے کہ اسی اختیار اور ارادے کو سامنے رکھ کر کرایا گیا ہے۔

کائنات کی ہر شے اس قانون کے مطابق زندگی بسر کرنے کے لیے مجبور ہوتی ہے، جس کے مطابق زندگی بسر کرنے کے لیے اس کو پیدا کیا گیا ہے۔ وہ اس سے سرتابی نہیں برتتی، سرکشی نہیں اختیار کر سکتی، اس کے سامنے Two Possibilities (دو ممکنات) ہوتے ہی نہیں ہیں، ایک ہی شے ہوتی ہے اور وہ اس پہ چلنے کے لیے مجبور ہوتی ہے۔ انسان کے سامنے زندگی کا دوراہا ہوتا ہے اور اسے اختیار دیا جاتا ہے کہ وہ چاہے تو اس راستے کو اختیار کرے جو اسے شرفِ انسانیت کی منزل تک پہنچا دے اور جی چاہے تو اس کی خلاف ورزی کرے اور اس کے بعد پھر اپنی تباہیاں مول لے۔ یہ جو جی چاہے والی بات ہے جو کہا گیا ہے کہ اِعۡمَلُوۡا مَا شِئۡتُمۡ (41:40) ہمارے دائرے میں ہماری مشیت چلتی ہے، اپنے دائرے میں جیسا تمہارا جی چاہے تم کر سکتے ہو، یہ چیز صرف انسان کو حاصل ہے۔

برادرانِ عزیز! یہاں سے اب یہ بات ہوگی کہ فطرت کی قوتیں، قوانینِ فطرت کا علم ہونے کی بنا، پر انسان کے سامنے جھکتی ہیں لیکن اس کے اپنے اندر خود جو اپنے کچھ جذبات ہیں، ان جذبات کو یہ جس طرح سے استعمال کرتا ہے، اس کے مطابق اس کی زندگی ہو جاتی ہے۔ اگر انہیں قوانینِ خداوندی کے مطابق استعمال کرتا ہے تو یہ انسانی سطحِ زندگی کے اوپر آ جاتا ہے۔ اور اگر یہ ان کی خلاف ورزی کرتا ہے تو حیوانی سطح ہی نہیں بَلۡ هُمۡ اَضَلُّ (7:179) ان سے بھی یہ پست چلا جاتا ہے۔ یہ جو اس کے اپنے اندر کی قوت ہے کہ جو قوانینِ خداوندی کی خلاف ورزی کرتی ہے، اسے شیطان کہہ کر پکارا گیا اور اس کا نتیجہ جو Frustration (ناامیدی) کے اندر ظاہر ہوتا ہے، اسے ابلیس کہا گیا، ابلیس کے معنی ہی "ناامید" کے ہیں۔

انسانی زندگی کی ابتدائی روئداد، جنتِ ارضی کی وہ زندگی، جس میں مرد و زن شامل ہوتے ہیں

اس تمہیدی تعارف کے بعد اب اس دور کا ذکر آتا ہے جس میں انسان کی ابتدائی زندگی تھی۔ ابتدائی زندگی کی کیفیت یہ تھی کہ اس زمین پر رزق کی فراوانیاں تھیں اور ابھی میری اور تیری کا سوال سامنے نہیں آیا تھا۔ یہ ہے وہ چیز جسے قرآن بیان کرنا چاہتا ہے اور اس زمین پر اسے جنت کی زندگی کہا گیا ہے، جس میں رزق کی فراوانیاں ہوں اور وسائلِ رزق پر میری اور تیری کا سوال نہ ہو۔ یہ کسی کی ذاتی ملکیت کے اندر نہ ہوں بلکہ یہ تمام انسانوں کی ضروریاتِ زندگی پورا کرنے کے لیے کھلی رکھی جائیں۔ یہ ہے جسے قرآن نے جنت کی زندگی کہہ کر پکارا ہے۔

دیکھیے! اس جنت کا تعارف کن الفاظ میں کرایا گیا ہے۔ اسے کہا گیا ہے کہ وَ قُلۡنَا یٰۤاٰدَمُ اسۡکُنۡ اَنۡتَ وَ زَوۡجُکَ الۡجَنَّۃَ

(2:35)۔ اس میں دونوں صنف آ جاتی ہیں' مرد بھی اور عورت بھی۔ جب الانسان کہا جائے گا تو اس میں صرف مرد شامل نہیں ہونگے' عورت انسان ہے اور اسی قسم کی انسان ہے جیسا کہ مرد انسان ہے' ان دونوں میں انسان ہونے کی جہت سے کوئی تفریق و تمیز نہیں ہے۔ یہ جتنی بھی تفریقات ہیں' یہ مردوں نے پیدا کی ہیں کہ عورت کو اپنے سے پست قرار دیا ہے۔ یہ بہرحال دوسرا موضوع ہے' آگے چل کر میں اس کی تشریح کسی دوسرے مقام پہ کرونگا۔ یہاں یہی چیز کہی کہ دونوں کا ذکر آیا تا کہ یہ بتا دیا جائے کہ دونوں کو یکساں طور پر اس جنت کے اندر رہنے کا حق حاصل ہے۔ اور دونوں کی امتیازی خصوصیات وہی ہیں جو مرد کی ہیں' وہی عورت کی ہیں۔ اس لیے ان سے کہا کہ تم الجنت کے اندر رہو۔

جنت ارضی کی بنیادی خصوصیات

کیا تھی خصوصیت اس الجنت کی؟ کہا ہے کہ **وَ كُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا** (2:35) جہاں بھی تمہیں بھوک لگے' پیٹ بھر کر وہاں سے کھا سکتے ہو۔ قرآن چار لفظوں کے اندر ایک بات کہہ گیا۔ **حَيْثُ شِئْتُمَا** کے اندر آپ دیکھیے کہ کتنا اس کا اپنا اختیار و ارادہ ہے کہ جہاں سے جی چاہے **رَغَدًا** پیٹ بھر کر کھا سکتے ہو' اکٹھا نہیں کر سکتے' **وَ كُلَا** تم بھوکے نہیں رہو گے' کھا سکتے ہو۔ اپنی ضرورت کے مطابق جہاں سے جی چاہے لو۔ اختیار دیکھیے کتنا بڑا ہے! اس لیے کہ جب یہ پورے کا پورا مائدۂ ارض' دسترخوان انسانوں کی ضروریات پورا کرنے کے لیے کھلا رکھا ہے تو اس کے اوپر بند نہیں لگائے جا سکتے تھے۔ جہاں سے جی چاہے' اپنی ضرورت کے مطابق صرف کھا سکتے ہو' پیٹ بھر کر کھا سکتے ہو' تم اس سے زیادہ نہیں اکٹھا کر سکتے۔ یہ ہے جنت کی خصوصیت جسے قرآن نے ان الفاظ میں بیان کیا' اسی کی تشریح قرآنِ کریم دیگر مقامات میں کرتا چلا جاتا ہے۔ وہاں بھی آدم کی اس جنت کا یہی ذکر آیا ہے۔ **وَ اِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ** (20:116) یہ کچھ کہا۔ کہا یہ کہ اس جنت میں **اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَ لَا تَعْرٰى ۔ وَ اَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَ لَا تَضْحٰى** (20:118-119)۔ دیکھیے! بنیادی ضروریاتِ زندگی انسان کی نشوونما کے لیے کیا ہیں: کھانا پینا' لباس' مکان جس سے موسم کی سردی گرمی سے بچا جا سکے' انہی کو بنیادی ضروریاتِ زندگی کہا گیا ہے۔ کہا کہ آدم دیکھو! اس جنت کی زندگی میں تمہیں یہ چیزیں حاصل ہیں' تجھے یہاں بھوک کا کوئی خوف نہیں ہے' پیاس کا ڈر نہیں ہے' موسم کی شدت سے بچنے کا سامان موجود ہے' تمہارے پاس لباس موجود ہے۔ یہ بنیادی ضروریات موجود ہیں۔ **حَيْثُ شِئْتُمَا** (2:35) ہر جگہ یہ تمہارے پاس موجود ہیں۔ یہ زندگی کس قسم کی تھی جس میں ہر فرد کو یہ اشیا میسر اور مہیا ہوتی تھیں' کوئی ان سے محروم نہیں رہ سکتا تھا۔ اور جب محروم نہیں رہ سکتا تھا تو کسی دوسرے انسان کا کوئی انسان محتاج نہیں ہوتا تھا۔ اور جب محرومی اور محتاجی نہیں ہے تو کوئی انسان کسی دوسرے انسان پہ حکومت نہیں کر سکتا تھا' کوئی انسان کسی

انسان کا اختیار اور ارادہ چھین نہیں سکتا تھا۔

دینِ خداوندی کی دوسری بنیادی خصوصیت: کوئی انسان کسی کا نہ محکوم ہو اور نہ ہی محتاج

دین کی بنیادی خصوصیت' عزیزانِ من! یاد رکھیے! دین یہ چاہتا ہے کہ کسی انسان کا اختیار و ارادہ چھینا نہ جائے۔ اور انسانوں کی خود ساختہ زندگی یہ ہے کہ وہ کسی نوع کا کوئی بھی ہو' کسی بھی قسم کی قوت رکھتا ہو' وہ چاہتا یہ ہے کہ دوسرے کا اختیار چھن جائے اور وہ اس کے اختیار کے تابع ہو جائے۔ بس دو لفظوں کے اندر یہ سارا دین اور کفر آ جاتا ہے۔ عزیزانِ من! جہاں بھی آپ کسی کا اختیار و ارادہ چھینتے ہیں' آپ اسے انسانیت کی سطح سے نیچے لے آتے ہیں' حیوانات کی سطح پہ لے آتے ہیں' اشیائے فطرت کی سطح پہ لے آتے ہیں۔ اشیائے فطرت میں تو پھر احساس نہیں ہوتا اس لیے جب وہ مجبور ہوتی ہیں تو ان کو اس سے کچھ Pains (درد) نہیں ہوتا' کچھ قلق اور درد نہیں ہوتا' ان کا جگر نہیں پھٹتا لیکن انسان کہ جسے یہ معلوم ہے کہ میری انسانیت اس میں ہے کہ میرا اختیار و ارادہ میرے پاس رہے' جب اس کا اختیار و ارادہ کسی طرح سے سلب کیا جاتا ہے تو وہ یوں تو انسانیت کی سطح سے نیچے آ جاتا ہے لیکن اپنے احساسات کے اعتبار سے وہ ہنوز انسان ہوتا ہے۔ یہ ہے وہ چیز جو اس کی زندگی کو انسان بنا دیتی ہے۔ اسی لیے یہاں یہ کہا تھا کہ **فَقُلۡنَا یٰۤاٰدَمُ اِنَّ ہٰذَا عَدُوٌّ لَّکَ وَ لِزَوۡجِکَ فَلَا یُخۡرِجَنَّکُمَا مِنَ الۡجَنَّۃِ فَتَشۡقٰی** (20:117).

انسان کی انسانی زندگی اس وقت جہنم بنتی ہے جب اس کا اختیار سلب کر لیا جائے

یہ جو دوسرا نہجِ زندگی ہے' جس میں انسانوں کی مفاد پرستیاں دوسرے انسانوں کے اختیار کو چھینتی ہیں اگر تم اس کے فریب میں کہیں آ گئے تو فَتَشۡقٰی۔ قرآن کا یہ عجیب لفظ ہے۔ اس کے معنی ہوتے ہیں کسی کو ''محروم کر دینا'' اور اس کے بعد ہے کہ ''جگر پاش مشقتوں کے اندر کسی کو مبتلا کر دینا''۔ ایک ہی لفظ میں محرومی اور محرومی کے جو Consequences (نتائج) ہیں دونوں اس کے اندر موجود ہیں۔ کہا ہے کہ یاد رکھو! اس سے محروم ہو جاؤ گے اور پھر تمہیں اپنی انہی بنیادی ضروریاتِ زندگی کے لیے جگر پاش مشقتوں میں سے گزرنا پڑے گا۔ یہ نہ ہونے دینا۔

انسانی برادری کے پارہ پارہ ہو جانے کی بنیادی وجہ: خدا کی زمین کا خدا کے بندوں کے لیے کھلی نہ رکھنا ہے

یہ زندگی کس نہج کی تھی؟ اس کے لیے کہا ہے کہ **وَ مَا کَانَ النَّاسُ اِلَّاۤ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً** (10:19) سارے انسان ایک برادری کی حیثیت سے رہتے تھے۔ دو لفظوں میں قرآن ساری بات کہہ گیا! ایک برادری کے افراد تھے' ان میں اس وقت کسی قسم کا کوئی اختلاف نہیں تھا۔ اور اختلاف کی تو پہلی بنیاد ہی یہی بنتی ہے کہ جب آپ زمین پہ لکیریں کھینچ کر میری اور تیری کا فرق پیدا کریں گے' اختلاف پیدا

ہوجائے گا۔ پہلی زندگی یہ تھی کہ وَ مَا كَانَ النَّاسُ اِلَّآ اُمَّةً وَّاحِدَةً (10:19) اور آگے ہے فَاخْتَلَفُوْا (10:19) اس کے بعد پھر اگلا ایک دور شروع ہوا جس میں پھر ان میں باہمی اختلافات پیدا ہوئے' اختلاف کا نتیجہ ایک دوسرے کی مخالفت ہوئی اور یہی وہ چیز ہے جس سے کہتا ہے کہ ہم نے تمثیلی انداز میں آدم کو Warn (آگاہ) کر دیا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہونے دینا۔ اب یہ جو چیز ہے کہ یہ امتِ واحدہ کی حیثیت سے رہتے تھے' یہاں یہ کہا ہے کہ فَاخْتَلَفُوْا (10:19) ان میں پھر اختلاف پیدا ہو گیا' یہ امت امتِ واحدہ نہ رہی' یہ ایک برادری نہ رہی۔ آپ نے دیکھ لیا کہ یہی چیز قرآن نے دوسرے مقامات پہ بھی کہی ہے۔

قصہ آدم کے سلسلہ میں لفظ شجر کے متعلق ہماری تفسیری روایات کے افسانے اور تورات کے قصے

اب یہاں جو پہلے آیت آئی ہے' وہی سورۃ البقرۃ کی (2:35) ہے' جہاں سے آج کا درس شروع ہوا ہے۔ اس میں کہا یہ گیا ہے کہ وَ قُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَ زَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَ كُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا (2:35)۔ ٹھیک ہو گئی بات! جہاں سے جی چاہے کھاؤ پیؤ' ایک برادری کے افراد جو ہوئے' فرق کا سوال نہیں ہے۔ آگے ہے کہ وَ لَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ (2:35)۔ اب یہاں سے عام طور پہ ہمارے ہاں جو بات ہوتی ہے' اس نے کہا کہ صاحب! اس درخت کے پاس نہ جانا اور پھر اس درخت کی تفسیر کے اندر آپ پوچھیے نہیں کہ کیا کچھ ہوتا ہے۔ کہیں تو یہ شجرۂ علم تورات کے اندر آ گیا کہ یہ علم کا درخت تھا' کہا تھا کہ اس کے پاس نہ جانا۔ اور نیچے اترے تو سیدھی بات کہی کہ صاحب! یہ گیہوں کا درخت تھا۔ لکھنے والوں کے ہاں گیہوں ہوتا ہی نہیں ہوگا جو گیہوں کا درخت کہا!!! بہرحال ہمارے ہاں اگر اس کی کوئی توجیہہ کی گئی ہے تو وہ تورات کی رو سے ہے: علم کا درخت ہے جس کے قریب نہ جانا۔ یعنی خدا نے آدم سے پہلے یہ کہا کہ عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا (2:31)۔

میں بتا یہ رہا ہوں کہ قرآن نے یہ چیز نہیں کہی' یہ چیز تورات نے کہی۔ قرآن کہاں لے جا رہا ہے! اور وہ ہیں کہ کہہ رہے ہیں کہ علم کے درخت کے پاس نہ جانا۔ یہاں ابتدا اس سے ہوتی ہے کہ آدم کو خدا نے تمام اشیائے فطرت کا علم دیدیا اور اسی علم کی بنا پہ پھر ملائکہ کے سامنے کہا کہ تم بتاؤ اگر تمہیں علم ہے۔ وہ نہیں بتاتے' تو وجۂ شرفِ انسانیت علم ہے۔ اور وہ کتاب جو شروع میں واقعی انبیائے کرامؑ پہ نازل ہوئی تھی' آج جس شکل میں موجود ہے' اس میں پہلی چیز یہ آئی ہے کہ آدم کو منع کر دیا گیا کہ علم کے درخت کے پاس نہ جانا۔ قرآن نے یہ نہیں کہا لیکن ہمارے ہاں جو تفسیریں لکھی گئیں' وہ انہی اسرائیلیات پر مبنی تھیں۔ جو چیزیں اس سے پیشتر یہ یہود و نصاریٰ مانتے چلے آ رہے تھے' جو کچھ ان کی کتابوں میں لکھا ہوا تھا' انہی کے مطابق ہمارے ہاں تفسیریں کی گئیں۔ اگر تفسیر کے لیے قرآن نے جو طریقہ بتایا تھا کہ قرآن کی تفسیر قرآن سے کرو' تو ہم کبھی اس قسم کی خرافات میں نہ پڑتے۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ الفاظ تو قرآن کے رہے اور مفہوم اور معانی ان

کتابوں کے لیے گئے جو محرف ہو چکی تھیں اور جن کے بعد قرآن کے آنے کی ضرورت پیش آئی تھی۔ اس نے یہ ضرورت کیا پوری کی؟ الفاظ تو اس کے لیے اور مفہوم اور معانی وہاں کا لیا جن کی تحریف کی بنا پر قرآن کے نازل کرنے کی ضرورت پیش آئی تھی۔ کہا گیا کہ یہ درخت تھا۔ کیا وہ درخت تھا؟ قرآن سے پوچھ لیتے۔ اس نے تو دوسری جگہ خود فَـاخْتَـلَفَ (19:37) کہا ہے' یہ بات ہی اختلاف کی ہے۔ تو دو طریقے ہیں۔

قرآن حکیم کو قرآن کے آئینہ میں سمجھیے تو شجر کا مفہوم واضح ہو جائے گا

عزیزانِ من! قرآن نے یہ کہا ہے کہ یہ عربی زبان میں ہے' عربی مبین کے اندر ہے یعنی واضح عربی میں۔ اور عربی مبین تو قریش کی عربی زبان کو کہتے تھے' اس زبان میں قرآن ہے۔ جب وہ خود کہتا ہے کہ فلاں زبان ہے' تو پہلے تو زبان سے پوچھیے کہ یہ جو لفظ آیا ہے' زبان کے اعتبار سے اس کے معنی کیا ہیں۔ پھر اس کے بعد وہ کہتا ہے کہ ہم نے قرآن کے ایک مقام کو دوسرے مقام سے خود واضح کیا ہے' یہ اس کا دعویٰ ہے اور یہ اگرچہ چھوٹا منہ بڑی بات ہے لیکن چونکہ میں نے اس میں ایک عمر بسر کی ہے' بطور تحدیثِ نعمت عرض کرتا ہوں کہ قرآن پہ غور کرنے سے قرآن کا کوئی ایسا مقام نہیں ہے' جس کی وضاحت قرآن میں دوسرے مقام پہ نہیں کی گئی۔ ہم نے یہ دیکھا کہ یہاں قرآن نے بات اختلاف کی کہی تھی' اور اسی کے آگے دو لفظ آ گئے ہیں جو خود سمجھا رہا ہے کہ الشـجـرۃ کے معنی کیا ہیں عربی زبان میں۔

برادرانِ عزیز! یہ ٹھیک ہے کہ شجر کے معنی تو درخت کے کہتے ہیں مگر ابتدائی لغوی معنی تو اس اعتبار سے کچھ اور ہیں۔ اس کے استعمال کے اعتبار سے معنی ہوتے ہیں ایسی کیفیت' ایسی چیز کہ جس میں Origin (اصل) کے اعتبار سے نیچے دیکھتے ہیں' درخت کا تنا ہوتا ہے کہ نیچے Origin (اصل) کے اعتبار سے تو وہ شے ایک ہے اور آگے چل کر اس کے اندر شاخیں پھٹ چکی ہوں' وہ مختلف ہو چکی ہوں' اور آپس میں وہ گتھم گتھا ہو چکی ہوں آپ کو معلوم ہے اور ذرا بلند اردو جاننے والے جانتے ہونگے' آج بھی ہم مشاجرت کا لفظ عداوت کے معنوں میں' اختلاف کے معنی میں' Dispute (جھگڑے) کے معنی میں' استعمال کرتے ہیں۔ مشاجرت کا یہ لفظ اردو میں استعمال ہوتا ہے لیکن ذرا Higher (اعلیٰ) قسم کی اردو ہوتی ہے۔ اور عربی زبان میں تو مشاجرت شجر سے عام استعمال ہوتا ہے' اس کے معنی یہ ہوتے ہیں: ''پھٹ جانا' الگ الگ ہو جانا''۔ اور پھر قرآن کا اعجاز ہے کہ ایک تو وہ شے ہوئی جو بنیادی طور پہ ہی الگ الگ ہو' اس کے لیے بھی الفاظ تھے' یہ شجر کا لفظ کیوں آیا ہے؟ وہ بولتے ہی ایسے مقام پہ ہیں کہ کَـانَ الـنَّـاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً (2:213) وہ اصل (Origin) کے اعتبار سے تو ایک ہوں' وہ Trunk of the tree (درخت کا نیچے کا تنا) ہوں۔ کَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً (2:213) کے بعد ہے

فَاخۡتَلَفُوۡا (10:19) ذرا آگے چل کر ان کے اندر الگ الگ ان کی Branches (شاخیں) ہوئیں۔ایسی نوعیت جس میں ابتداءً اصل کے اعتبار سے کوئی شے ایک ہو اور پھر اس کے بعد اختلاف پیدا ہوں' اسے عرب مشاجرت سے تعبیر کیا کرتے ہیں اور یہاں سے وہ مشتق ہوا ہے' وہ شجر ہے۔''ش ج ر'' ان کے ہاں آتا ہی ایسے معنوں کے اندر ہے کہ جس میں اختلاف پیدا ہوں۔ کہا یہ کہ تمہیں ایک امتِ واحدہ کی شکل میں رہنا ہے۔ دیکھنا ایسی صورت نہ پیدا کر دینا کہ ذرا آگے چل کر اس میں تم اختلافات پیدا کر لو۔ اگر ایسا ہوا تو فَتَكُوۡنَا مِنَ الظّٰلِمِيۡنَ (2:35) ہوگا۔ اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ ویسے تو یہ الفاظ ہیں کہ ''تم ظالم ہو جاو گے''۔

شجر یعنی مشاجرت کے بعد ظلم کا مفہوم

اس (شجر) کے بنیادی معنی کی رو سے لیجیے تو ایک اور بات سامنے آتی ہے' پھر آگے پتہ چلتا ہے کہ یہ ظلم ہوتا کیا ہے۔''ظ ل م'' کے بنیادی معنی ہوتے ہیں'' جس شے کو جس مقام پہ ہونا چاہیے' وہ اس مقام پہ نہ رہے' جسے جیسا ہونا چاہیے' ایسے ویسا نہ رہنے دیا جائے''۔ ذرائع رزق وسائلِ پیداوار کے لیے کہا گیا تھا کہ یہ سَوَآءً لِّلسَّآئِلِيۡنَ (41:10) ہیں۔ قرآن نے کہا ہے کہ تمام ضرورت مندوں کے لیے یکساں طور پر یہ کھلا ہونا چاہیے۔ جب یہ چیز اس مقام پہ نہیں رہے گی تو ظلم ہو جائے گا۔ ظالم کہتے ہی اسے ہیں کہ ''کوئی شے جس مقام پہ' جس کے پاس جس حیثیت سے ہونی چاہیے' وہ وہاں ویسے نہ رہنے دے''۔ اب یہاں سے ایک دوسرے کے خلاف ظلم شروع ہوا ' جس نے ذرا سی قوت سنبھال لی' اس نے جو شے جس کے پاس ہونی چاہیے تھی' اس کے پاس نہ رہنے دی' اپنے پاس رکھ لی۔ اور اسی اعتبار سے اس کے معنی تاریکی کے ہوتے ہیں' ظلمات کا لفظ اس کے لیے آتا ہے۔ ہمیشہ یاد رکھیے! عربی زبان میں ظلمات اس تاریکی کو کہتے ہیں' جہاں عام طور پہ روشنی ہونی چاہیے لیکن روشنی نہ ہو' تاریکی ہو' یہ خصوصیت اس تاریکی کے لیے ہے۔ جہاں جو ہونا چاہیے وہ وہاں نہ ہو۔ کہا ہے کہ یاد رکھو! اس زندگی میں تمہاری کیفیت یہ ہے کہ جہاں سے کسی کا جی چاہے اپنی بھوک کو' ضروریات کو' پورا کرنے کے لیے سیر ہو کر رغدًا کھالے' سمیٹ کر نہیں رکھ سکتا۔ حَيۡثُ شِئۡتُمَا (2:35) میری اور تیری کا سوال ہی نہیں ہے۔ جب سب کے لیے کھلا ہے تو جس کو بھوک لگے' جہاں سے بھوک لگے پیٹ بھر کر' کھائے' صرف کھائے' سمیٹ نہیں سکتا۔ یہ ہے ایک برادری کی کیفیت۔

قرآن حکیم کی معاشرتی زندگی کا انداز ایک گھر کی طرز پر ہوتا ہے

برادری کا چھوٹا سا ایک نقشہ ہمارا گھر ہوتا ہے۔ گھر میں آپ دیکھتے ہیں کیفیت کیا ہوتی ہے؟ جو کچھ گھر کے اندر ہوتا ہے' اس میں سے ہر ایک کی ضرورت پوری ہوتی ہے' جس کی ضرورت زیادہ شدید ہوتی ہے وہ سب سے پہلے پوری ہوتی ہے۔ نو مولود بچہ ہے' اسے دودھ کی ضرورت ہے' اگر اتنا ہی ہے کہ جس میں وہ دودھ آتا ہے تو جو بڑے ہیں' وہ فاقہ کر لیتے ہیں اپنی ضرورت کو سمٹا لیتے ہیں' اس کی جو

ضرورت ہے اسے پہلے پورا کرتے ہیں۔ بیمار ہے اس کی ضرورت پہلے پوری ہوتی ہے' بوڑھا ہے اس کی ضرورت پہلے پوری ہوتی ہے۔ میں نے یہ تینوں وہ گنائے ہیں' جو کما کر کچھ نہیں لاتے۔ شریف گھرانہ وہ ہوتا ہے' جس کے اندر کمانے والا سب سے آخر میں اور گھر میں پکا کر برتانے والی بھی آخر میں لیتے ہیں اور سب سے پہلے ان کی ضروریات پوری کرتے ہیں جو ابھی اس قابل ہی نہیں ہیں کہ اپنی ضروریات پوری کر سکیں۔ انہیں آپ بطور خیرات نہیں دیتے۔ حَقٌّ مَّعۡلُوۡمٌ . لِّلسَّآئِلِ وَالۡمَحۡرُوۡمِ (70:25) یہ as of right (بطورِ حق) ان کو ملتا ہے۔ یہ ہے الجنة کی زندگی' عزیزانِ من! یہ ہے گھر کا ایک نقشہ' یہ ہے جو قرآن انسانوں کو تصور دیتا ہے کہ زندگی یہ ہے تمہاری۔

گھر اور معاشرہ کیا ہے؟ جیسا میں کہا کرتا ہوں' شام کو جس طرح پرندے گھونسلوں میں آ جاتے ہیں' آپ گھروں میں آ جاتے ہیں' گھر ہو جاتا ہے' صبح کو جب آپ باہر نکل جاتے ہیں تو معاشرہ بن جاتا ہے۔ گھر اور انسانی برادری کیا ہے؟ ہم نے دیواریں کھڑی کر لیں' یہ ایک میرا گھر ہو گیا' نکال دیجیے بیچ میں سے دیواروں کو' یہ انسانی برادری بن گئی۔ یہ جو دیواریں کھڑی کرنا ہے' یہ ایک دوسرے کے اندر امتیاز پیدا کرتا ہے۔ اور قرآن نے یہ کہا تھا کہ مَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحۡظُوۡرًا (17:20) یاد رکھو! جو چیزیں خدا نے بطور عطیہ پوری نوعِ انسانی کے لیے دی ہیں' ان کے درمیان دیواریں نہ کھڑی کر دینا' پابندیاں نہ لگا دینا۔ وَيَمۡنَعُوۡنَ الۡمَاعُوۡنَ (107:7) کہا ہے۔ ان نمازیوں کو جن کی نمازیں منہ پہ ماری جاتی ہیں' پھر سمجھتے یہ ہیں کہ جو کچھ محسوس طریقے پہ سامنے آتا ہے' یہ صلوٰۃ ہے وَيَمۡنَعُوۡنَ الۡمَاعُوۡنَ (107:7) رزق کے ان سرچشموں کو جنہیں بہتے پانی کی طرح رہنا چاہیے تھا' بند لگا کر روک لیتے ہیں۔

قرآنی خطوط پر معاشرتی زندگی کو نظر انداز کرنے کا نتیجہ

آپ دیکھتے ہیں کہ ابتداً مشاجرت کیسے شروع ہوتی ہے' یہ ظلم ہوتا ہے۔ کہا ہے کہ یہ کیفیت نہ پیدا کر لینا۔ کیسے پیدا ہوگی؟ اگر تمہارے انفرادی مفاد پرستی کے جذبات غالب آ گئے تو اس وقت پھر یہ کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اگلے ہی لفظ میں اس کی تشریح کر دی اور میں (20:117) میں بتا چکا ہوں کہ اس کے بعد پھر کہا ہے کہ فَتَشۡقٰى (20:117)۔ تم ضروریاتِ زندگی سے محروم ہو جاؤ گے۔ پھر جگر پاش مشقتوں میں الجھ جاؤ گے' انہی کے حاصل کرنے کے لیے اگر تم نے یہ مشاجرت اختیار کر لی تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ اگلی آیت میں بات صاف کر دی کہ فَاَزَلَّهُمَا الشَّيۡطٰنُ عَنۡهَا (2:36) یہ جو قانونِ خداوندی کے خلاف جانے کے' کلی مفاد پرستی کو چھوڑ کر انفرادی مفاد پرستی کے اوپر آنے کے ان کے اپنے جذبات تھے انہوں نے انہیں ڈگمگا دیا۔

تورات کے بیان کے مطابق اماں حوا شیطان کے چکر میں آ کر بابا آدم کو جنت سے نکلوانے کا سبب بنی

ضمناً یہ عرض کر دوں کہ تورات میں یہ ہے کہ اماں حوا شیطان کے فریب میں آئی اور اس نے پھر بابا آدم کو فریب دیا۔ آپ دیکھتے ہیں کہ وہ سازش جو اس عورت بیچاری کے خلاف چلی ہوئی ہے' کس طرح سے اس کو مذہب کی سند دی جا رہی ہے۔ یہ انسانوں کی خود بنائی ہوئی تورات ہے' خدا کی نہیں ہے' ابھی میں عرض کرونگا۔ کہا یہ گیا کہ پہلی چیز تو یہ ہے کہ خود عورت اتنی کمزور ہوتی ہے' یہ پہلے شیطان کے فریب میں خود آتی ہے اور اس کے بعد یہ' بیٹیاں اور بہنیں معاف رکھیں' میں تورات کی بات کر رہا ہوں' چالاک اور مکار ایسی ہوتی ہے کہ یہ بیچارے بھولے بھالے معصوم سے مرد کو بھی ورغلا دیتی ہے۔ کیا بات ہے ان معصوموں کی !!! یعنی دونوں جرم اس کے سر پہ! یہ شیطان کا دھوکا کھاتی بھی ہے اور مرد کو ورغلاتی بھی ہے۔ یہ میاں زیادہ سے زیادہ کہ صاحب! صنفِ نازک ہے' اس کے جذبات کی رعایت سے ہم نے دھوکا کھا لیا۔ اور پھر جب اس کے اوپر شاعری ہوتی ہے تو پھر پوچھیے ہی نہیں۔

ڈگمگانے کے جذبات تو عورت اور مرد دونوں کے اندر پائے جاتے ہیں

عزیزانِ من! یہ سب اسرائیلیات کی خرافات ہیں۔ قرآن کا اعجاز ہے' بات یوں نہیں لیتا کہ دیکھو تورات میں یہ لکھا ہے اور یہ سارا کچھ کہا ہے۔ کہا ہے کہ **فَأَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا** (2:36) عورت اور مرد دونوں یکساں اس کے اندر ڈگمگا جاتے ہیں' ڈگمگانے کی دونوں کے اندر صلاحیت ہے۔ یہ ہے قرآن! قرآن کو سمجھنے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اس سے پیشتر جو تاریخِ انسانیت ہے' اس پہ بھی نگاہ ہو' جتنے دوسرے مذاہب ہیں ان مذاہب کی تعلیم پر بھی نگاہ ہو۔ قرآن یوں نہیں بات کرتا کہ دیکھیے صاحب! تورات میں یہ لکھا تھا اور پھر بعد میں انسانوں نے یہ کہہ دیا۔ اصل بات یہ تھی وہ ایک لفظ کہہ جاتا ہے' ساری بات اس میں طے ہو جاتی ہے۔ کہا ہے کہ **فَأَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا** (2:36). وہی دونوں' یہ تثنیہ کا صیغہ ہے۔ دونوں ایک لیول (سطح) کے اوپر آ گئے۔ اگر عورت میں یہ کمزوری ہے کہ وہ جذبات سے مغلوب ہو جاتی ہے تو آدم بھی اس کے اندر ہے' یہ چیز دونوں میں یکساں ہے۔ **فَأَخْرَجَهُمَا** (2:36)۔ پھر وہی چیز آ گئی کہ جنت کی زندگی چھنتی ہے تو اس کی ذمہ دار صرف عورت نہیں ہوتی' دونوں میں یہ چیز موجود ہے۔ **مِمَّا كَانَا فِيْهِ** (2:36) اس زندگی سے ان کو نکال دیا گیا۔ وہ مشاجرت آئی: انفرادی جذبات پرستیاں آئیں اور اس زندگی سے یہ نکل گئے' وہ زندگی ان سے چھن گئی۔ **وَ قُلْنَا اهْبِطُوْا** (2:36) دیکھیے یہ چیز' یہاں ایک اور بات آ گئی۔ جیسا کہ میں کہا کرتا ہوں قرآن کا کوئی لفظ بھی ایسا نہیں' برادرانِ عزیز! جس پہ آپ اس طرح سے Skip over (نظر انداز) کر جائیں اور آگے گزر جائیں۔ بات تو ہو رہی تھی مثلاً ایک جوڑے کی' یہی شروع ہوا جیسے آدم اور حوا' جیسے یہ کہا جائے کہ آدم اور اس کی بیوی' یہاں جو صیغہ ہے' وہی تثنیہ کا آ رہا ہے' دو کے لیے آ رہا ہے۔

یہ سارے کا سارا قصۂ آدم تمثیلی انداز میں اپنے اندر نوعِ انسانی کی ترجمانی کا انداز اختیار کیے ہوئے ہے

میں نے عرض کیا تھا کہ یہ ساری داستان تمثیلی ہے' یہ نوعِ انسانی کی ہے' آدمی کی ہے۔ یہ دو کا ذکر تو آیا ہے کہ اس ناول کے' اس تمثیل کے' دو کیریکٹر سامنے ہیں لیکن بات یہ کہنی تھی کہ یہ نہ سمجھ لینا کہ یہ کسی دو کی بات ہو رہی ہے۔ کہا ہے کہ **وَ قُلْنَا اهْبِطُوْا** (2:36)۔ یہاں جمع کا صیغہ آ گیا۔ ہم نے کہا کہ اب پوری انسانیت اس زندگی سے نکل گئی جو روش تم نے اختیار کی ہے۔ اب جمع کا صیغہ آ گیا ہے' دو کی بات نہیں رہی۔ پھر سارے جمع کے صیغے آئے ہیں مثلاً **بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ** (2:36)' دیکھیے **وَ لَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ** (2:35) کی تفسیر دوسری ہی آیت میں ہوگئی۔ اس کا نتیجہ کیا نکلا؟ **بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ** (2:36)۔ جمع کا صیغہ ہے۔ یہ سب کے سب پھر اس کے بعد ایک دوسرے کے عدو ہوگئے۔ عدو کا ترجمہ تو دشمن کیا جاتا ہے۔ یہ بات اتنی نہیں ہے۔ ان مقامات سے پتہ چلتا ہے کہ قرآن کے لیے عربی زبان کیوں اختیار کی گئی تھی۔ یہ ایک لکڑی ہوتی ہے اگر تم نے اس کو پھاڑنا ہو تو اس کے لیے پہلی چیز ہوتی ہے کہ اس کے اندر آ گے تھوڑا' کسی طرح سے رخنہ ڈال کر' تھوڑا سا اس کو چیر کر' اس کے اندر ایک Wedge (فانہ) دیتے ہیں'' پنجابی اچ اوہنوں پھانہ کیندے [1] نیں'' وہ اس میں دیتے ہیں' اسے کہتے ہیں عدو۔ کیا عجیب چیز ہے کہ یہ اصل میں اسے الگ کرنے کے لیے ایک ہی چیز تھی یعنی یہ ابھی از خود نہیں الگ ہو رہیں' کوئی ایک تیسری چیز اس کے اندر دی جا رہی ہے' وہ جڑنے کے لیے بے تاب ہوتی ہیں' یہ اس کے اندر چیز دے دی جاتی ہے' یہ ان کو جڑنے نہ دے۔ یہ اگر بیچ میں سے Wedge (فانہ) نکال دی جائے تو آپ دیکھتے ہیں کتنے زور سے لکڑی آپس میں ملتی ہے۔ Christianity (عیسائیت) کا ایک جو اور غلط مفروضہ تھا' اس کی تردید ہوگئی' انہوں نے کہا یہ ہے کہ انسان اپنی فطرت کے اعتبار سے بد واقعہ ہوا ہے۔ یہاں کہا کہ یہ بات نہیں ہے' یہ چیزیں ہیں جو اس کے درمیان آ جاتی ہیں اور ان کو الگ الگ کر دیتی ہیں' ان کو بیچ میں سے نکال دیجیے تو وہ پھر ملنے کے لیے تیار ہوتے ہیں۔

انسانوں کے مابین نفرت پیدا کرنے والے جذبات کو قرآن حکیم نے شیطان سے تعبیر کیا ہے

یہ آپ کو معلوم ہے' ذرا پہلے جو چیز کہی تھی کہ **وَ مَا يُضِلُّ بِهٖۤ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ . الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ وَ يَقْطَعُوْنَ مَاۤ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖۤ اَنْ يُّوْصَلَ** (2:26-27) امرِ الٰہی کے مطابق جن چیزوں کو مل کر رہنے کے لیے بنایا گیا تھا' یہ ان میں آپس میں فصل ڈالتے ہیں' ان میں جدائی پیدا کرتے ہیں' ان کو علیحدہ علیحدہ کرتے ہیں۔ یہ کیا چیز علیحدہ علیحدہ کر رہی ہے؟ یہی مفاد انگیزیوں کے جذبات جسے شیطان سے تعبیر کیا گیا ہے' یہ وہی Wedges (پچریں) ہیں' جو انسان اور انسان کے درمیان حائل ہو جاتی ہیں' ملنے نہیں دیتیں'

---

[1] پنجابی زبان میں اسے پھانہ کہتے ہیں۔

ایک برادری نہیں بننے دیتیں۔ ابتداً تو یہاں سے پہلی تفریق پیدا ہوئی' وہ خون کی بناپر' رشتے کی بناپر' خاندان کی بناپر تھی۔ قرآن آگے چلتا ہے۔ سورۃ الاعراف میں یہ ساری چیزیں آئیں گی کہ شیطان نے کیا کہہ کر ورغلایا تھا۔ یہیں میں ضمناً عرض کردوں وہ جسے کہا کرتے ہیں کہ وہ ان کا ستر ننگا ہوگیا' وہاں آؤنگا تو میں ان الفاظ کو سامنے لاؤنگا۔

باہمی نفرت پیدا کرنے کے لیے ابلیس کا پہلا حربہ اپنے اپنے بچوں کی فکر کا جذبہ پیدا کرنا تھا

شیطان نے کان میں یہ سحر پھونکا تھا کہ میاں! اپنی اور اپنی اولاد کی فکر کرو' یہ دوسروں کی تمہیں کیا پڑی ہے۔ دوسروں سے الگ ہوکر پہلا گروپ وجود میں آ گیا' یہ ہے جس سے ابتدائی خاندان' جسے کہتے ہیں' وہ بنا۔ سب الگ الگ ہوگئے: مجھے میرے بچوں کی فکر ہے' دوسرے کی ذمہ داری نہیں ہے۔ مجھے اب انسان کے بچے کی فکر نہ رہی۔ اب ہر فرد کے اپنے اپنے بچے ہوگئے۔ بچوں کا کوئی قصور نہیں ہے کہ وہ جھونپڑی میں پیدا ہوئے ہیں یا محل میں' یہ چیز اس کے کسی Virtue (نیکی) اور Credit (بھرم' آبرو) کی نہیں ہے کہ وہ اس جھونپڑی کے سامنے محل میں پیدا ہوا ہے لیکن اس نسبت سے کہ وہ مزدور کا بیٹا ہے اور یہ مل اونر کا بیٹا ہے' یہ اس کا بیٹا ہوگیا' وہ اس کا بیٹا ہوگیا' انسان کے بچے نہیں رہے' یہ اب بنی آدم نہیں رہے' پیدائش کے اعتبار سے عدو ہوگئے' دونوں الگ الگ ہوگئے۔ قرآن کہتا ہے کہ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ (17:70) آدمی کے بچے جو ہیں وہ سب یکساں واجب التکریم ہیں۔ یہ پہلی چیز سحر ہے' جو ابلیس نے کان میں پھونکا ہے۔ سورۃ الاعراف میں' برادرانِ عزیز! یہ چیزیں آئیں گی۔ وہ یہ چیز ہے کہ جنسیات کی طرف ذرا سا اشارہ کرکے' قرآن اس قسم کی' جو باتیں ہیں' نہایت لطیف اشارے میں کرتا ہے اور ویسے تو وحی کے معنی ہی لطیف اشارہ ہوتے ہیں' وہ اس لطیف اشارے سے ساری بات سمجھا جاتا ہے۔ یہاں سے ابتدا ہوئی' پھر جو کچھ خاندان تھے' جو قریب قریب کے خون والے تھے مثلاً باپ اور چچا حالانکہ دونوں بنی آدم تھے' کچھ ماموں کے' یہ صورتیں شروع ہوئیں' ان سے ایک قبیلہ بنا۔ اب قبائل کی جنگ شروع ہوئی۔ پہلی History (تاریخ) جو آپ کے ہاں مشاجرت کی ہے' اس میں قبائل (Tribes) کی جنگ ہوتی ہے۔ اس کے بعد Races (نسلیں) بنیں' آبادی بڑھی' کوئی یہاں آباد ہوگیا' کوئی وہاں آباد ہوگیا' نسل مختلف ہورہی ہے۔

انسانی عمل کا انجام ایک فرد سے خاندان' خاندان سے قبیلہ اور قبیلے سے قوم اور پھر باہمی عداوت

اب ایک اور تفریق بڑھی' بڑھتی چلی گئی تا آنکہ آج کے اس دورِ تہذیب میں اس کا نام Nation (قوم) رکھ دیا گیا۔ ایک وطن کی چار دیواری کے اندر بسنے والے بنی آدم' دوسری چار دیواری کے اندر بسنے والے بنی آدم میں کوئی وجہ اشتراک نہیں ہے' دونوں الگ الگ قومیں' ایک دوسرے کے خون کی پیاسی' ہر قوم کی یہ کوشش کہ دوسری قوم کو تباہ کردے۔ یہ کس چیز سے ہوا؟ وہ انفرادی' مفاد پرستی کے

جذبات' اب یہ جو انفرادی ہیں' سمٹ کر ایک نیشن (قوم) کے اندر آ گئے My country right or wrong ہوا' چل بھئی: بَعۡضُکُمۡ لِبَعۡضٍ عَدُوٌّ (2:36) یاد رکھو! ایک دوسرے کے دشمن ہیں۔ یہ دشمن لفظ ہمارے ہاں آتا ہے لیکن بات وہی ہے جو میں نے آپ کو بتادی' اس کا Concept (تصور) یہی ہے۔

مستقر کی شکل میں یہاں اٹھنے والا ہر قدم زندگی کا ارتقا ہے

اب آگے قرآن یہ کہتا ہے کہ یہ بات اگر عارضی سا حادثہ ہوتا تو ٹھیک ہے' وہی نپٹتے جنہوں نے ابتداً یہ کچھ کیا تھا۔ کہا ہے کہ یہاں تو مشکل یہ ہے کہ وَ لَکُمۡ فِی الۡاَرۡضِ مُسۡتَقَرٌّ وَّ مَتَاعٌ اِلٰی حِیۡنٍ (2:36) یہ ایک دن کی بات تو ہے نہیں' اس زمین پہ تو تم نے کافی عرصہ رہنا ہے۔ یہ لفظ مُسۡتَقَرٌّ عجیب چیز ہے۔ کوئی متحرک شے جو حرکت سے آگے بڑھتی جائے' وہ کسی مقام کے اوپر کچھ تھوڑے سے وقت کے لیے اگر ٹھہر جائے تو اس کے اس ٹھہرنے کو ''قرار'' کہتے ہیں' جامد شے کو نہیں کہتے۔ جس میں حرکت نہ ہو' وہ اگر کسی ایک مقام کے اوپر ہے' اس کے لیے یہ لفظ نہیں آتا۔ متحرک شے کسی وقت اگر کہیں ساکن ہوئی ہے' تو اس کو ''استقرار'' کہا جاتا ہے۔ قرآن کیا باتیں کہہ جاتا ہے! زندگی ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی چلی آ رہی ہے۔ اس نے آگے چلے جانا ہے لیکن ہر منزل کے اندر یہ کچھ وقت ستانے کے لیے ٹھہر جاتی ہے کہ اس نے آئندہ منزل کے لیے اپنے آپ کو فٹ کرنا ہے۔ ہر اگلی منزل اس پچھلی منزل سے ذرا مختلف اور اونچی ہوتی ہے' اس کے تقاضے مختلف ہوتے ہیں۔ یہ ٹھہرنا اس لیے ہوتا ہے کہ یہ اگلے تقاضوں کے اوپر فٹ آنے کے لیے' اس کے مطابق بننے کے لیے' یہاں اپنے آپ کو Adapt (موزوں) کرلے' اپنے اندر وہ صلاحیتیں پیدا کرلے' جن سے یہ اگلی منزل میں جانے کے قابل ہو جائے۔ یہ ہے ''قرار'' جو اس ارض کے اوپر ہے۔

زندگی کی مصروفیت کا انداز اور اس کے ماحصل کا تعین: نبی اکرمؐ کے الفاظ میں

اس نے بات تو یہی کہنی تھی اگرچہ انداز دوسرا ہے' لیکن بات یہی ہے۔ موت اک زندگی کا وقفہ ہے یعنی آگے چلیں گے دم لے کر۔ صرف دم لے کر نہیں' دم لینے کے تو معنی ہوتے ہیں: تھک گیا' کچھ تھوڑا سا ستالیا۔۔ یہ نہیں ہے! یہاں تو جو کھڑا ہونا ہے' وہ چلنے سے زیادہ مشقت طلب ہے' یہاں اس اگلی منزل کے لیے اپنی تیاری کرنی ہے۔ اس مومن کی مسلم کی' انسان کی' وہ زندگی ہے' جس کے متعلق حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا۔ کیسے حسین الفاظ ہوتے ہیں جو صحیح حدیث سامنے آتی ہے! پوچھا گیا کہ مومن کی زندگی کیا ہے؟ نبی ﷺ نے فرمایا کہ جب جہاد ہو رہا ہو تو اس میں شریک ہو' نہ ہو رہا ہو تو اس کی تیاری میں مصروف ہو۔ آپ نے دیکھا کہ یہاں ''قرار'' کیا ہے' کاہے کے لیے یہ ''قرار'' ہے۔ جس زمانے میں جنگ نہیں ہو رہی ہوتی تو جو کچھ فوجیں کر رہی ہوتی ہیں' وہ ''قرار'' ہوتا ہے۔ ہم تو یہ

سمجھتے ہیں' جیسا سمجھتے چلے آ رہے تھے کہ صاحب! ویلھے مشٹنڈے بیٹھے ہوئے ہیں!''سارے وطن دا جو کچھ چنگا چوکھا ہوندا اے کھا جاندے نیں' ایں چُٹ مُٹ بنے ہوئے ہوندے نیں''❶ - یعنی وہ سمجھ رہے تھے کہ ''اوسارے کلو پہلوان بیٹھے ہوئے ہیگے''❷ - اگر واقعی کسی ملک کی وہ فوج' فوج کہلانے کی مستحق ہے' اگر کسی ملک کی پولیس' پولیس کہلانے کی مستحق ہے تو جس زمانے میں عام نگاہیں یہ دیکھ رہی ہیں کہ کچھ نہیں کر رہے' وہ اس زمانے میں اس سے کہیں زیادہ کچھ کر رہے ہوتے ہیں' جو کل انہوں نے کرنا ہے۔ برادرانِ عزیز! یہ جو زندگی کا تھوڑا سا وقفہ ہے' یہاں ''قرار'' کا بڑا سخت مرحلہ ہے۔ زندگی تو مسلسل جدوجہد کا نام ہے۔ لہٰذا میں عرض یہ کر رہا تھا کہ قرآن کے الفاظ پر سے یونہی نہیں گزر جانا چاہیے' وہ ایک ایک لفظ اپنے اندر پتہ نہیں معانی کے کتنے کتنے دریا رکھتا ہے! کہا ہے کہ **وَ لَكُمْ فِی الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ** (2:36)۔ دوسری جگہ **مُسْتَقَرٌّ** کے ساتھ **مُسْتَوْدَعٌ** کا لفظ آیا ہے۔ بڑا حسین لفظ ہے۔ وہ تمہارے **مُسْتَقَرٌّ** کو اور تمہارے **مُسْتَوْدَعٌ** کو جانتا ہے تو ''مستقر'' جو میں نے کہا ہے' وہ مقام ہے' جس میں یہ ذرا سے وقت کے لیے ٹھہر کر آگے جانے کے لیے ہوتا ہے۔ **مُسْتَوْدَعٌ** ودیعت کے معنی میں ہوتا ہے' جہاں ایک شخص ایک امانت کو دوسرے کے سپرد کر دے۔ یہ مقام جس میں یہ اپنی تیاری کر لیتا ہے' یہ اسے اگلی منزل کے سپرد کر دیتی ہے کہ لو بھئی! اپنی امانت سنبھال لیجیے' میں پیچھے ہٹ گیا۔ **وَ مَتَاعٌ اِلٰی حِیْنٍ** (2:36) اس میں تمہیں سامانِ زیست کی ضرورت ہے۔

کرہ ارض کی زندگی کی حقیقت اور اس پر رہنے کا طریق کار

یہاں **اِلٰی حِیْنٍ** کہہ کر ایک اور چیز واضح کر دی کہ یہ ارض مستقل رہائش کی جگہ نہیں ہے' Physical Concept of Life (زندگی کے طبعی تصور) کے اندر' زندگی یہی طبعی زندگی ہے' موت کے ساتھ اس کا خاتمہ ہو جاتا ہے' یہ معاملہ ختم ہو جاتا ہے۔ کہا ہے کہ یہ بات نہیں ہے۔ یہ ایک معین مدت کے لیے ہے' معین کے معنی یہ Predetermined (پہلے سے تعین شدہ) نہیں کہ پہلے سے یہ طے ہوا ہوتا ہے کہ اس نے چار سال جینا ہے' اس نے دس سال جینا ہے۔ اس کے معنی ایک ''عرصہ'' جسے آپ کہتے ہیں کہ یہاں ایک ''عرصے'' کے لیے تم نے رہنا ہے اس لیے یہ جو تم نے اپنی کیفیت پیدا کر لی کہ انفرادی مفاد پرستیوں کی عداوتیں تیار کر کے بھائی سے بھائی جدا ہو گیا' انسان سے انسان الگ ہو گیا' بنی آدم بنی آدم نہ رہے۔ یہ جو چیز ہے یہ ایک دن کی بات نہیں' یہاں تم نے رہنا ہے' اور رہنا ہے تو جنت کی زندگی بسر کرو' یہاں رہتے ہوئے کیوں جہنم کی زندگی بسر کرتے ہو۔

---

❶ سارے ملک کا اچھا اچھا مال ہڑپ کر جاتے ہیں' ہاتھی بنے ہوتے ہیں۔

❷ وہ تمام بشکل کلو پہلوان براجمان ہیں۔

تنہا عقل انسانی کی بنا پر انسان کے سرکش جذبات سے پیدا ہونے والی مایوسی کا علاج ''فتاب علیہ'' کے قرآنی مفہوم میں ہے

اب یہاں یہ بات پیدا ہوئی کہ صاحب! مفاد پرستی کے جذبات نے یہ کیفیت پیدا کر دی۔ اگر پیدا کر بھی دے گا تو کیا انسان کے اوپر ابدی مایوسی آ گئی' کیا اس کا کوئی علاج نہیں ہے؟ کہا ہے کہ نہیں' ابدی طور پہ مایوس ہونے کی بات نہیں ہے' اس کا علاج ہے۔ اب اگر یہ علاج انسانوں کے اپنے ہی تجویز کرنے کا ہوتا تو یہ بیچ میں پھر اللہ میاں کے آنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ خود تم نے اپنے ہاتھوں سے گرہیں دی ہیں' خواہ دانتوں سے کھولو' خود کھولو۔ کہا ہے کہ نہیں' تمہارے اپنے جذبات کی دی ہوئی گرہیں تمہارے بس کی بات نہیں ہوگی کہ خود ان کو کھول سکو۔ جونہی کھولنا چاہو گے یہ جذبات تو بڑے غیر محسوس اور غیر شعوری طور پر دخل انداز ہوتے ہیں' جونہی کھولنا چاہو گے یہ غیر شعوری طور پر آ گے آ جائیں گے۔ یہ جو ابلیس کو کہا ہے کہ کَانَ مِنَ الْجِنِّ (18:50) وہ تو بات ہی یہ ہے کہ یہ نظر آنے والی چیز نہیں ہوتی' یہ Imperceptible (ادراک ناپذیر) ہوتی ہے' یہ چپکے سے آتی ہے۔ اس لیے یہ تمہارے اپنے بس کی بات نہیں رہے گی' تم خود اس کا حل تجویز نہیں کر سکتے۔

اس میں شبہ نہیں کہ انسان کو عقل دی گئی ہے' فکر کی صلاحیت دی گئی ہے' یہ بہت بڑی چیز ہے' یہ انسان کے لیے بڑی امتیازی چیز ہے' لیکن اگر عقل کو تنہا چھوڑ دیا جائے تو یہ انسان کے جذبات کا آلۂ کار بن جاتی ہے' جو کچھ وہ چاہتے ہیں یہ اس کو پورا کرتی ہے۔ جذباتی طور پہ چوری کرنے کے لیے چور کا جی چاہتا ہے کہ کسی کی چیز لے آؤں' اب وہ عقلِ حیلہ کار پھر بجھاتی ہے کہ اس کے لیے کیا کرنا چاہیے۔ دوسرے کی چیز کو لے لینا آسان بات تو نہیں ہے۔ چوری کو تو چھوڑ دیجیے کہ وہ دوسرے کی چیز سوتے میں جا کر لے لیتا ہے' یہ جاگتے کی جو چوری ہوتی ہے' یہ کیا ہوتی ہے؟ یہ Battle of Wits (عقول کی جنگ) ہے' عقلیں لڑتی ہیں۔ جس کی عقل زیادہ تیز طرار ہوتی ہے' وہ دوسرے کو مات دے جاتا ہے۔ افراد کی عقلیں لڑتی ہیں' اقوام کی عقلیں لڑتی ہیں' چوہا اپنی گھات میں ہے' بلی اپنی گھات میں ہے۔ انسان کی ساری تاریخ یہی ہے' اگر تنہا اس پہ چھوڑ دیا جائے تو یہی کچھ ہوتا ہے۔ یہ نہ کہیے گا کہ میں عقل کو Condemn (تنقیص) کر رہا' عقل تو مابہ الامتیاز ہے' شرفِ انسانیت ہے لیکن عقل کی حیثیت وہی ہے جو انسان کی آنکھ کی حیثیت ہے۔ اگر باہر سورج کی یہ روشنی نہ ہو تو آنکھ بے کار ہو جاتی ہے۔ جس طرح سے آنکھ کے لیے سورج کی روشنی کی ضرورت ہے' اسی طرح انسانی عقل کے لیے وحی کی روشنی کی ضرورت ہوگی۔ جب یہ وحی کی روشنی میں چلتی ہے تو صحیح راستے پہ چلتی ہے' اس کو خطرہ نہیں ہوتا۔ جب باہر کی یہ روشنی نہیں ہوتی تو ٹامک ٹوئیاں مارتی ہے' اسے پتہ ہی نہیں ہوتا کہ یہ رسی ہے یا سانپ ہے' راستے میں گڑھا آ گیا یا کھڈا آ گئی' اندھیرا ہوتا ہے۔ یہ وحی وہ چیز ہے

جسے خدا کی طرف سے راہنمائی کہا گیا ہے' یہ عقلِ انسانی کی اپنی پیدا کردہ نہیں' جس کی روشنی میں عقل نے چلنا ہے۔ اسے تنہا چھوڑا تھا تو یہ جذبات کی روشنی کے اندر جا رہی تھی یا جذبات کے پورا کرنے کا آلہ کار بن رہی تھی۔ اور جب یہ عقل وحی کی روشنی میں چلے گی تو اس کے راستے روشن ہوتے چلے جائیں گے۔ یہ ہوئی وہ چیز۔

برادرانِ عزیز! آپ نے یہ مقام سمجھ لیا کہ یہاں تک تم نے اپنے آپ کو پہنچا لیا ہے' کہ مفاد پرستی کے جذبات ایک کو دوسرے سے الگ کر رہے ہیں۔ یہاں تم نے اکٹھے بھی رہنا ہے الگ الگ نہیں رہنا' پھر کریں کیا؟ کہا ہے کہ **فَتَلَقّٰۤى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ** (2:37) خدا کی طرف سے کچھ سیکھ آیئے۔ یہ ہے وہ چیز جسے وحی کہا جاتا ہے۔ اگلی آیت میں اس کی تشریح آ جائے گی۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے کہ قرآن خود تشریح کرتا چلا جاتا ہے۔ یہ چیز کہ یہ خدا کی طرف سے وحی ہے' یہ ابھی اگلی آیت میں آ جائے گی۔ کہا ہے کہ **فَتَلَقّٰۤى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ** (2:37) خدا کی طرف سے اس نے کچھ قوانین سیکھے' کچھ ہدایت پائی' پھر ہے **فَتَابَ عَلَيْهِ** (2:37) ۔ یہ بڑی خوبصورت چیز ہے۔ تاب کے معنی ہوتا ہے ''زندگی کے راستے پہ چلے جا رہے ہیں وہاں دوراہا آ گیا' آپ کا قدم غلط راستے کی طرف اٹھ گیا' آپ چلے گئے' تھوڑی دور جانے کے بعد آپ کو محسوس ہوا یا کسی سے پوچھا تو پتہ چلا کہ یہ راستہ صحیح نہیں ہے' آپ صحیح راستے پر آنا چاہتے ہیں تو آپ کو کیا کرنا ہوگا؟ پہلے یہ احساس ہونا چاہیے کہ راستہ غلط ہے' پھر صحیح راستے پر آنے کے لیے اس مقام سے جہاں سے آپ غلط راستے پہ مڑے تھے واپس آنا چاہیے۔ یہ جو اس مقام سے پیچھے آنا ہے' اسے عربی زبان میں تاب کہتے ہیں' یعنی پلٹ کر وہیں آنا''۔ وہاں آ گئے' وہاں آنے کے بعد' پھر کھڑے ہو گئے تو کیا ہو گئی توبہ قبول؟ کہا کہ نہیں صاحب! وہ تو جو آپ نے غلطی کی تھی' اس کو صرف Undo (ختم) کیا ہے' یہ تو صرف اس نقصان کی تلافی ہوئی ہے' کیا ہے؟ ابھی صحیح راستے پہ نہیں آئے۔ اس کے بعد **وَاَصْلَحَ** ہے' پھر اس کے بعد وہ صحیح راستے کی طرف مڑ کر چلا' پھر آگے اس نے اپنی اصلاح کی تو پھر یہ صحیح راستے پر چل کر منزل پہ پہنچے گا۔

تاب کے لیے یہ تین چیزیں ضروری ہو گئیں: (i) اس کا احساس کہ راستہ غلط ہے' (ii) وہاں سے پھر واپس لوٹنا' اس مقام تک پہنچنا' جہاں سے قدم غلط اٹھا تھا اور (iii) اس کے بعد صحیح راستے کے اوپر چلنا۔ یہی چیز ہے جسے قرآن نے دوسرے مقام پہ کہا ہے کہ **اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ** (11:114) یہ جو تم نے برائیاں اور ناہمواریاں پیدا کی ہیں' ان کے دور کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ تم ہمواریاں اور حسن کارانہ انداز کے کام اتنے زیادہ کرو کہ وہ اس چیز کو out-weigh (ختم) کر جائیں' جو تمہاری ناہمواری سے پیدا ہوئی ہے۔ اس نقصان کو بھی پورا کر جائیں اور پھر Positively' تعمیری طور پر' مثبت طور پر' تمہارے بنک بیلنس کے اندر کریڈٹ سائیڈ میں کچھ آ جائے۔ یہ جو اس طرح سے یہاں آئے ہیں' جب آپ یہاں سے جا رہے تھے تو منزل آپ سے ہر قدم پر دور ہوتی چلی جا

رہی تھی، ہٹتی چلی جارہی تھی اور اب جو آپ پلٹے ہیں تو ہر قدم پہ منزل قریب آتی چلی جارہی ہے۔

زندگی کے حقائق کو بیان کرنے کا قرآنی انداز بلیغ و عمیق بھی ہوتا ہے اور روح پرور بھی

کیا حسین انداز ہے، بات کہنے کا! یہ جو چیز ہے کہ آپ منزل کی طرف جارہے ہیں، اور منزل آپ کی طرف بڑھ رہی ہے۔ یہ ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ گاڑی میں بیٹھے ہوئے ہم یہ کہتے ہیں کہ بھئی! گوجرانوالہ آ گیا، گوجرانوالہ تو نہیں آتا، آپ گوجرانوالے گئے ہوئے ہوتے ہیں لیکن انداز یہی اچھا ہے کہ گوجرانوالہ آ گیا۔ کیا پیارا انداز ہے قرآن کا! تم نے یہ **فَتَابَ عَلَيْهِ** (2:37) کیا۔ خدا تمہارے پاس، پلٹ کر آ گیا، منزل نے بڑھ کر تمہارے قدم چوم لیے۔ کیا انداز ہے اس کتاب کا! میں کہہ رہا ہوں کہ ایسے نظر آتا ہے کہ وہ ٹھوس خشک سے مضامین کی کتاب ہے، مگر اندازِ بیان اتنا پیارا ہے، عزیزانِ من! بڑی سے بڑی فصاحت ہی نہیں اس کے اندر شعریت آتی ہے۔ تم پلٹے تمہارا ایک قدم جو ادھر آیا، کہا کہ تمہارا ایک قدم منزل کی طرف آ گیا **فَتَابَ عَلَيْهِ** (2:37) تم کیا پلٹے، منزل نے بڑھ کر تمہارے قدم لے لیے۔ اور قدم اس طرح سے لیے کہ انسان کے لیے تو قرآنِ کریم میں تائب کا لفظ ہی آیا ہے، ایک قدم اٹھانے والا، اپنے لیے اس نے تواب کا لفظ کہا ہے: تم ایک قدم پلٹو، ہم دو قدم لے کر جاتے ہیں، پلٹ کر تو دیکھو، ہماری طرف آ کر تو کبھی دیکھو:

شعاعِ مہر خود بے تاب ہے جذبِ تمنا سے
حقیقت ورنہ سب معلوم ہے پروازِ شبنم کی

لفظ توّاب کا تجزیہ

عزیزانِ من! وہ توّاب ہوتا ہے اور یوں بھی اگر آپ Analyze (تجزیہ) کریں گے تو بات بڑی سچی نکلے گی۔ جب آپ غلط جارہے ہوتے ہیں تو جو ایک قدم اٹھاتے ہیں تو آپ منزل سے ایک قدم دور ہو جاتے ہیں، آپ یہاں سے اگر نو گز کے فاصلے پہ پہنچ گئے ہیں اگلا قدم آپ اٹھائیں گے تو دس گز منزل سے دور ہو جائیں گے اور اگر پیچھے قدم آئے گا تو پھر صحیح منزل سے آٹھ قدم یا آٹھ گز دور رہ جائیں گے، دو گز کا فاصلہ ہوا وہاں دس ہو جانا تھا، ایک قدم کے بعد یہاں آٹھ رہ گیا۔ یہ ہے توّاب۔ دیکھا آپ نے کہ دہرے قدم اٹھا کر منزل کیسے آپ کی طرف آتی ہے۔ کہا ہے کہ **فَتَابَ عَلَيْهِ اِنَّهُ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ** (2:37)۔ دیکھا یہ توّاب کہاں آیا ہے۔ یہاں اس کے ساتھ! رحیم آیا ہے۔ کیا ہوا تھا غلط قدم اٹھانے سے؟ یہ کہ صلاحیتوں کی جو نشوونما ہو رہی تھی، اس میں کمی واقع ہو گئی۔ رحیم کا لفظ یہاں آیا ہے صاحب! اس کے معنی آپ شروع میں ہی سن چکے ہوئے ہیں: نہایت لطافت سے مسلسل سامانِ نشوونما بہم پہنچاتے چلے جانے والا، کچھ نہیں بگڑا۔

تصوف کی دنیا میں علم لدنی کے غلط تصور کے برعکس وحی کی راہنمائی کا طریق کار

فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ (2:37) کے الفاظ سے یہ تصور کچھ خانقاہوں کی طرف' حجروں کی طرف' چلا جاتا تھا یعنی انسان ایک فرد براہِ راست خدا سے سیکھ رہا ہے۔ یہی ہے ہمارے ہاں یہ علم لدنی کا تصور ہے یہ جنہیں کشف اور الہام کہتے ہیں' اس میں ایک فرد اپنے طور پر بیٹھا ہوا کچھ کر رہا ہے۔ قرآن ہے' عزیزانِ من! کہا ہے کہ قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِیْعًا (2:38) جب ہم نے ان سے کہا کہ اس زندگی سے تم نکل گئے' اس فردوسِ گم گشتہ کی بازیابی کی فتلقی والی شکل بتائی۔ کہا کہ کہیں تمہارے ذہن میں یہ نہ آ جائے کہ ایک فرد اپنے طور پر یہ حاصل کر لیتا ہے۔ اس کے لیے کہا ہے کہ فَاِمَّا یَاْتِیَنَّكُمْ مِّنِّیْ هُدًى (2:38) تم سب کی طرف ہمارے طرف سے جو ہدایت آئے گی' یہ ساری ہدایت خدا کی طرف سے اجتماعی طور پہ آ رہی ہے اور قرآنِ کریم نے متعدد مقامات پر یہ بتایا ہے کہ یہ ہدایت خدا کی طرف سے حضراتِ انبیائے کرامؑ کی وساطت سے آتی ہے' کسی فرد کو براہِ راست خدا کی طرف سے نہیں ملتی' بجز نبی کے۔ نبی کو خدا کی طرف سے براہِ راست ملتی ہے اور اس میں کوئی دوسرا شریک ہی نہیں ہو سکتا۔ یہ وحی نبی کو کس طرح سے ملتی ہے' اس کی کنہ اور ماہیت سے غیر از نبی قطعاً واقف نہیں ہو سکتا۔

وحی کی ماہیت کو' اور اسے خدا سے پانے کی کیفیت کو' سوائے نبی کے کوئی نہیں جان سکتا

لہٰذا یہ جو آپ کے ہاں بحثیں چل نکلتی ہیں کہ وحی کیسے ملتی تھی' اس کی ماہیت کیسی تھی' الفاظ کیسے Convey (مرسل) ہوتے تھے' کان میں آتے تھے یا دل پہ کیسے ہوتے تھے' وہاں سے ہمارے سامنے کیسے آتے تھے' یہ بحثیں چلی ہوئی ہیں' عزیزانِ من! جب بنیاد یہ ہے کہ وحی میں غیر از نبی شریک ہی نہیں ہو سکتا تو غیر از نبی کیسے سمجھ سکتا ہے کہ یہ علم نبی کو ملتا کیسے تھا۔ نبی کو کیسے علم ملتا تھا' اس پہ بحث وہ کر رہا ہے جو اس کے اندر شریک ہی نہیں ہے' جسے اس طرح سے کچھ مل ہی نہیں سکتا اور پھر اس سے آگے جو چیزیں نکلتی ہیں' ان کے اوپر تو ہر قسم کے جتنے بھی آپ کے ہاں ذہنی خلفشار ہیں اور پریشانی ہے' وہ اس لیے ہوتے ہیں' کہ جس مقام پہ آپ نہیں ہیں' اس مقام کی گفتگو کر رہے ہیں اور اس پہ آپ کی فلسفیانہ بحثیں ہو رہی ہیں اور کسی کا اس مقام کے اوپر اس موضوع کے اوپر یہ گفتگو کرنا کہ میں بتاتا ہوں کہ وحی کی ماہیت کیا ہے' خود نبوت کا دعویٰ ہے یا وہ اس چیز کا مدعی ہے۔ جب تک وہ خود نہیں جانتا' خدا کیسے وحی بھیجتا ہے' اسے پتہ کیسے ہے کہ اس کی ماہیت کیسے ہوتی ہے۔ اور اگر وہ یہ دعویٰ نہیں کرتا ہے' اور اس کے علی الرغم یہ کہنا شروع کرتا ہے کہ میں بتاتا ہوں' یہ کیا ہے تو جھوٹ بولتا ہے۔ یعنی اندھا اگر یہ بحث شروع کر دے کہ صاحب! سرخ رنگ میں اور سبز رنگ میں فرق کیا ہوتا ہے۔ میاں! یہ وہ بات کہہ سکتا ہے۔ جو ان رنگوں کو دیکھتا ہے۔ خدا کی طرف سے براہِ راست علم ملنے کی ماہیت اور کیفیت کیا ہوتی ہے' کیسے ملتا ہے' صرف وہ جان سکتا ہے جس کو خدا

کی طرف سے علم ملتا ہے۔ اسے وحی کہتے ہیں۔

وحی کا سلسلہ نبی اکرم ﷺ کی ذات اقدس پر ختم ہونے کے بعد کشف والہام کا عقیدہ بہت بڑی سازش ہے

وحی نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ اقدس پہ ختم ہوگئی' حضور ﷺ کے بعد کوئی انسان بتا ہی نہیں سکتا کہ وحی کیسے ملتی تھی اور اس کی کیا کیفیت ہوتی تھی۔ بات صاف ہوگئی۔ اور جو یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اس کے باوجود مجھے خدا کی طرف سے اسی طرح سے یہ علم ملتا ہے' اس کا نام الہام رکھ لیجیے' اس کا نام کشف رکھ لیجیے' کچھ بھی ہے' یہ صرف لفظوں کا فرق ہے' نوعیت کے اعتبار سے یہ وہی چیز ہے جو وحی ہے۔ یہ وحی کا دعویٰ ہے' فریب دہی کے لیے اس کے دوسرے نام رکھ دیئے گئے تھے۔ ختمِ نبوت ﷺ کے خلاف' یہ الہام اور کشف کا عقیدہ جو آپ کے ہاں آیا ہے' بہت بڑی سازش تھی۔ خدا نے یہ دروازہ بند کیا تھا' انہوں نے دروازے کو اس طرح سے توڑا ہے کہ کھڑکیاں ہی نہیں' پھاٹک کھول دیئے۔ بہرحال! بات میں یہ کہہ رہا تھا کہ **فَاِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ مِّنِّیْ ھُدًی** (2:38) ہماری طرف سے تم سب کی طرف ہدایت آئے گی۔ اور قرآن نے دوسرے مقام پہ واضح الفاظ میں کہا ہے کہ یہ ہدایت صرف نبیوں کی وساطت سے آئے گی۔ وہ جب تم تک پہنچائیں گے تو اسے رسول کہا جائے گا۔ نبی اور رسول' برادرانِ عزیز! ایک ہی سکے کے دو رخ ہوتے ہیں' خدا کی طرف سے ہدایت پانے کی جہت سے جو کچھ ہوتا ہے' اسے نبوت کہتے ہیں' اس ہدایت کو آگے پہنچانے کا جو سلسلہ ہوتا ہے' وہ رسالت کہلاتی ہے۔ کہہ یہ رہے تھے کہ خدا نے یہ کہا کہ ہماری طرف سے تم سب کی طرف ہدایت آئے گی۔ **فَمَنْ تَبِعَ ھُدَایَ** (2:38) جو اس ہدایت کے پیچھے پیچھے چلے گا تو **فَلَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَ لَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ** (2:38) اسے خوف بھی نہیں رہے گا اور حزن بھی نہیں۔

جب عقل انسانی نے وحی کی اہمیت کو نظر انداز کیا تو انسان خوف وحزن میں مبتلا ہو کر رہ گیا

اب آپ دیکھیے وہ عقل جو اس سے پیشتر جذبات کے پیچھے چل رہی تھی اب خدا کی طرف سے دی ہوئی راہنمائی کے پیچھے چلے گی تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ کہا ہے کہ **فَلَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَ لَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ** (2:38) خوف بھی نہیں رہے گا' اس قوم پہ حزن بھی نہیں رہے گا۔ خوف (Fear) خارج سے آنے والے خطرات کے لیے ہوتا ہے' حزن (Worry, Anxiety) دل کے اندر پیدا ہونے والی دل گرفتگی جو ہوتی ہے' اسے کہا جاتا ہے۔ حزن کا لفظ عربوں کے ہاں اس دل گرفتگی کے لیے استعمال ہوتا تھا' سنیے! ایک مزدور صبح مزدوری کے لیے نکلتا ہے' کوشش سے بھی مزدوری حاصل نہیں کرسکتا' گھر میں کھانے کے لیے کچھ نہیں تھا' دن بھر مزدوری ڈھونڈتا رہا' نہیں ملی' شام کو جب یہ بیوی بچوں کی طرف گھر لوٹتا ہے تو اس وقت اس کے اندر جو کیفیت ہوتی ہے اسے وہ ''حزن'' کہا کرتے تھے۔ یہ ایک نوعیت ہے' ورنہ حزن تو خوف کا لازمی نتیجہ ہوتا ہے مثلاً کسی کو Terrorise (دہشت زدہ) کرنا' کسی کے دل کے اندر خوف پیدا کرتے چلے جانا۔

کہا ہے کہ لَا خَوۡفٌ عَلَیۡهِمۡ وَ لَا هُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ (2:38) خوف نہیں ہوگا' حزن نہیں ہوگا۔ یہاں تو یہی چیز کہی۔ دوسرے مقام پہ (20:117) میں کہا تھا کہ یہ ابلیس تمہیں جنت سے نکال دے گا تو کیفیت فَتَشۡقٰی ہوگی' میں نے کہا تھا کہ ان چیزوں سے محروم ہو جاؤ گے اور جگر پاش مشقتوں میں الجھ جاؤ گے۔ اسی میں آگے چل کر کہا ہے کہ قَالَ اهۡبِطَا مِنۡهَا جَمِیۡعًۢا بَعۡضُکُمۡ لِبَعۡضٍ عَدُوٌّ ۚ فَاِمَّا یَاۡتِیَنَّکُمۡ مِّنِّیۡ هُدًی ۬ فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَایَ فَلَا یَضِلُّ وَ لَا یَشۡقٰی (20:123)۔ دیکھا وہی لفظ یَشۡقٰی آ گیا۔ نہ تو تمہاری محنت رائیگاں جائے گی اور نہ ہی تم پھر ان چیزوں سے محروم رہو گے اور محروم نہیں رہو گے تو جگر پاش مشقتیں نہیں ہونگی۔ حزن رہے گا ہی نہیں صاحب! یہاں اب اس کا یہ نتیجہ بتایا۔ اب قرآن نے دونوں راستے واضح کر دیئے۔ ہماری راہنمائی کے پیچھے چلو گے تو وہی جنت کی زندگی ہے کہ وَ کُلَا مِنۡهَا رَغَدًا حَیۡثُ شِئۡتُمَا (2:35) جہاں بھی کسی کا جی چاہے گا اس کو ضرورت محسوس ہوگی' ضرورت کی چیزیں اس کو مل جائیں گی۔ اور اگر اس سے اعراض برتو گے تو پھر کیا ہوگا؟

قرآنِ حکیم کا تو خاصہ ہی یہ ہے کہ وہ اپنی کسی بات کو بھی بغیر وضاحت کے نہیں چھوڑتا

عزیزانِ من! جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے قرآن کسی چیز کو غیر واضح انداز میں نہیں چھوڑتا۔ یہی چیز ہو سکتی تھی کہ صاحب! وہ روحانیت تمہیں نصیب نہیں ہوگی' جو روحانی مدارج ہیں' وہ طے نہیں ہونگے۔ قرآن سے پوچھیے وہ کہتا ہے کہ وَ مَنۡ اَعۡرَضَ عَنۡ ذِکۡرِیۡ (20:124) اور جو ہمارے ان قوانین سے اعراض برتے گا' پہلوتہی کرے گا' تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ فَاِنَّ لَهٗ مَعِیۡشَةً ضَنۡکًا (20:124) اس کی روزی تنگ ہو جائے گی۔ معیشت کا تو آپ کو پتہ ہی ہے کہ یہ ہمارے ہاں اکنامکس کا' معاشیات ترجمہ ہے۔ معیشت اکنامکس کو ہی کہتے ہیں۔ کہا ہے کہ وَ مَنۡ اَعۡرَضَ عَنۡ ذِکۡرِیۡ فَاِنَّ لَهٗ مَعِیۡشَةً ضَنۡکًا (20:124)۔ اچھا جی! یہاں روٹی تنگ ہو جائے گی Quoted (انہی الفاظ میں) کہہ رہا ہے' اللہ کے مقرب بندوں کی نشانیاں ہی یہ ہیں کہ وہ بھوکے مرتے ہیں' پہننے کو کپڑا نہیں ہوتا' رہنے کو مکان نہیں ہوتا۔ ہے ہی یہ چیز! لیکن دنیا چند روزہ ہے اس میں یہ چیزیں تو بھگت لینی چاہئیں' پھر اس کے بعد عاقبت کی جو جنت ہے' وہ انہی کے لیے مخصوص کر دی گئی ہے جن کی یہاں یہ زندگی ہوگی۔ سن لیا! قرآن کی آیت ختم نہیں ہوئی' وہاں Comma (وقفہ) ہی ہے' ابھی فل اسٹاپ (مکمل وقفہ) نہیں آیا۔ کہا ہے کہ وَ مَنۡ اَعۡرَضَ عَنۡ ذِکۡرِیۡ فَاِنَّ لَهٗ مَعِیۡشَةً ضَنۡکًا (20:124) جو ہمارے قوانین سے اعراض برتے گا یہاں اس کی روزی تنگ ہو جائے گی' وَّ نَحۡشُرُهٗ یَوۡمَ الۡقِیٰمَةِ اَعۡمٰی (20:124) قیامت کے دن بھی وہ اندھا ہوگا:

وہ قوم نہیں لائقِ ہنگامۂ فردا
جس قوم کی تقدیر میں امروز نہیں ہے

جس کا آج درخشندہ نہیں ہے‘ اس کا کل درخشندہ نہیں ہوسکتا۔

کہا ہے کہ وَّ نَحۡشُرُہٗ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ اَعۡمٰی (20:124)۔ یہاں آ ونگا تو اگلی آیات پڑھوں گا‘ یہ بڑی عجیب آیات ہیں۔

ز فرق تابہ قدم ہر کجا کہ می نگرم

کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست

یہ تو راستے چلتے ہوئے‘ جیسے گلاب کا پھول کھینچ لیتا ہے‘ قرآن کی آیتیں یوں کھینچتی ہیں۔ جی نہیں چاہتا کہ ان کو چھوڑ کر جاؤں لیکن وقت کا کیا کروں۔

آپ نے‘ عزیزانِ من! تقابل دیکھ لیا۔ خدا کی راہنمائی کے پیچھے پیچھے چلنے سے‘ یہ ساری چیزیں نصیب ہو جائیں گی جن کے متعلق کہا ہے کہ یہ جو تمہاری مفاد پرستیاں تھیں‘ انہوں نے محروم کر دیا‘ ایک دوسرے کے دشمن ہو گئے‘ پھر انسان انسانی برادری میں متشکل ہو جائے گا‘ پھر یہ ساری جنت کی کیفیت مل جائے گی۔ اور اگر یہ صورت نہ ہوئی تو یاد رکھو! معیشت تنگ ہو جائے گی۔

محکوم قوموں کی معاشی حالت کے ساتھ ساتھ ترقی پذیر قوموں میں طبقاتی تقسیم کا عذاب

یہ معیشت محکوم قوموں کی ہی تنگ نہیں ہے‘ جن کے متعلق ہمارے ذہن میں ہے کہ دوسروں کو اتنا کچھ دیتے ہیں‘ ان کے ہاں جا کر دیکھیے‘ وہاں بھی اوپر کا ہی ایک طبقہ ہے جس کو سب کچھ مل رہا ہے‘ نیچے وہاں بھی ان کی معیشت تنگ ہوئی ہے۔ رزق کی کمی نہیں ستاتی‘ اس کی Distribution (تقسیم) کی جو غلطی ہے‘ تقسیم کے اندر جو اس کے ہاں بنیادی نقص ہے‘ وہاں یہ ہوتا ہے۔ ایک فیملی ہے‘ ایک ایک روٹی بھی ان کے حصے میں آتی ہے تو گزارہ ہو جاتا ہے لیکن جو باپ کما کر لانے کے بعد بازار میں بالائی کھانے لگ جائے‘ پھر اس میں گھر کا جو حشر ہوتا ہے‘ وہ آپ کو معلوم ہے۔ یہ ہے غلط تقسیم۔ کہا ہے کہ وَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا وَ کَذَّبُوۡا بِاٰیٰتِنَاۤ (2:39) جو اس کا اتباع کرے گا ان کی کیفیت یہ ہو جائے گی‘ جو ہمارے قوانین سے انکار کرے گا اور تکذیب کرے گا۔ تو سنو! اُولٰٓئِکَ اَصۡحٰبُ النَّارِ ۚ ہُمۡ فِیۡہَا خٰلِدُوۡنَ (2:39) وہ جہنم کی زندگی بسر کریں گے۔

تمثیلی انداز میں قوانین خداوندی کے تحت دو قوموں کا تقابلی جائزہ

یہ جہنم کی زندگی کیا ہے؟ کہا ہے کہ وَ ضَرَبَ اللّٰہُ مَثَلًا قَرۡیَۃً کَانَتۡ اٰمِنَۃً مُّطۡمَئِنَّۃً (16:112) خدا مثال کے طور پہ بات سمجھاتا ہے کہ ایک تھی بستی‘ وہاں امن تھا۔ دیکھا خوف کے مقابلے میں امن میں تھی‘ حزن کے مقابلے میں مُطۡمَئِنَّۃً (اطمینان) بھی میسر تھا‘ خوف سے بھی مامون تھی‘ اب اور چاہتے کیا ہو کہ پیغمبری مل جائے؟ کیا بات تھی جس سے ان کو یہ دونوں چیزیں میسر تھیں! کہتا ہے بات

بڑی آسان تھی کہ یَاْتِیْھَا رِزْقُھَا رَغَدًا مِّنْ کُلِّ مَکَانٍ (16:112) ہر طرف سے رزق فراوانی سے لگا چلا آ رہا تھا ''گڈیاں دے گڈے بھرے ہوئے ریلاں دیاں ریلاں بھریاں ہویاں''۔ ❶ آپ دیکھ رہے ہیں انعاماتِ خداوندی کی تفصیل کیسے بیان ہو رہی ہے! رَغَدًا مِّنْ کُلِّ مَکَانٍ (16:112) تھا۔ پھر کیا ہوا؟ کہا ہے کہ فَکَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰہِ (16:112) اس کو قرآن نے انعاماتِ خداوندی گنایا ہے۔ انہوں نے اس سے کفران کیا۔ پھر تفصیل کفر کی پہلے آ بھی چکی ہے' پھر آگے بھی آئے گی۔ کفر کے معنی ہوتا ہے ''ڈھانپ کر رکھنا' کسی چیز کو چھپا لینا''۔ ''اے جیہڑی روٹی لکا کے رکھ لیندے ہیگے نیں ❷ '' کیا معلوم ہے آپ کو کہ ان کی یہ ذہنیت کیا ہوتی ہے؟

برادرانِ عزیز! یہ کفر ہوتا ہے۔ اور کَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰہِ (16:112) انعاماتِ خداوندی سے کفر برتا۔ تو کیا ہوا نتیجہ؟ کہا ہے کہ فَاَذَاقَھَا اللّٰہُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَ الْخَوْفِ بِمَا کَانُوْا یَصْنَعُوْنَ (16:112) ان کے اوپر خدا کا عذاب طاری ہو گیا۔ کس شکل میں؟ کہا کہ بھوک کی شکل میں' خوف کی شکل میں۔ یہ کیوں طاری ہو گیا؟ کیا یہ سارے احمق تھے' حماقت سے کچھ کر بیٹھے تھے' بدھو تھے؟ کہنے لگے کہ نہیں؟ بِمَا کَانُوْا یَصْنَعُوْنَ (16:112) بڑی صنعت کاری سے اپنے ہاں اپنا نظام بنا رہے تھے۔ یَصْنَعُوْنَ کے معنی ہیں ''انسان کا خود ساختہ'' جسے آپ مصنوعی کہتے ہیں' صنعت تو آپ دیکھتے ہیں کہ کیا ہوتی ہے۔ آپ کہہ نہ دیں کہ دور افکار بات کر گیا ہے' کہیں صنعت کے معنی Industry تو نہیں ہیں!!۔ معاشیات کا اسٹوڈنٹ اس کو سمجھے گا کہ Industrialization (صنعت کاری) کے ذریعے آپ کے دور میں جو انقلاب آیا ہے' اس نے کر کیا دیا ہے۔ بہر حال قرآن کا لفظ جامع ہے' اس کے معنی ہوتے ہیں ''ہر وہ شے جو انسان بناتا ہے''۔ نماز کے لیے بھی یہ لفظ آیا ہے۔ یہ جو ہم کچھ بناتے ہیں' کہا ہے کہ ہم جانتے ہیں جو کچھ تم مصنوعی طور پہ کرتے ہو' جو صنعت کاریاں کرتے ہو۔ فَاَذَاقَھَا اللّٰہُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَ الْخَوْفِ بِمَا کَانُوْا یَصْنَعُوْنَ (16:112)۔ جامع لفظ ہے' معنی اس کے پھیلاتے چلے جایئے' لانا ہے لے آیئے' یہ Industrialization (صنعت کاری) کے اوپر' یہ خدا کے قوانین کے تابع جو نہ رہے گی۔ انہوں نے یہ چیز کر دی۔ وَ لَقَدْ جَآءَھُمْ رَسُوْلٌ مِّنْھُمْ فَکَذَّبُوْہُ فَاَخَذَھُمُ الْعَذَابُ وَ ھُمْ ظٰلِمُوْنَ (16:113) خدا کے پیغام دینے والے ان کے پاس آئے' ان سے کہا کہ بابا! خدا کا نام مانو' جس قرآن کی طرف تم نسبت کر رہے ہو' اس کو تو دیکھو' وہ کیا کہتا ہے۔ فَکَذَّبُوْہُ (16:113) جاؤ جاؤ! ٹھیک ہے' ہمیں طریقہ بتایا ہوا ہے' بے حد و نہایت ذاتی ملکیت' سائلِ رزق کے اوپر جائز ہے' بشرطیکہ اس میں سے تم یہ اڑھائی پرسنٹ ہمیں دیدیا کرو' باقی شیرِ مادر کی طرح حلال و طیب ہے۔

---

❶ رزق کی خوب ریل پیل ہے' چاروں طرف سے کھچے چلا آ رہا ہے۔

❷ یہ روٹی (رزق) چھپا کر رکھ لیتے ہیں۔

تکذیب دین کون کرتے ہیں اوران کی پہچان کیا ہے؟

عزیزانِ من! فَكَذَّبُوْهُ (16:113) قرآن کا لفظ ہے' یہاں یہ نہیں کہا کہ انہوں نے کفر برتا' یہ نہیں کہا کہ ہم اسے نہیں مانتے' کہا کہ فَكَذَّبُوْهُ (16:113) تکذیب کی' جھٹلایا اس کو زبان سے' اقرار عمل سے تکذیب کی۔ وہی اَرَءَیْتَ الَّذِیْ یُكَذِّبُ بِالدِّیْنِ (107:1) جہاں آیا ہے تم نے اس کو بھی دیکھا جو دین کی تکذیب کرتا ہے۔ پتہ ہے یہ کون کرتا ہے؟ کہا ہے کہ فَوَیْلٌ لِّلْمُصَلِّیْنَo الَّذِیْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ o الَّذِیْنَ هُمْ یُرَآءُوْنَ o وَیَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَo (107:4,5:6,7) یہ وہ نمازی ہیں جو یہ کچھ تو کر آتے ہیں جو لوگ دیکھتے ہیں نماز پڑھتا ہے وَیَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ. (107:7) رزق کے سرچشموں کے اوپر بند لگا کر بیٹھ جاتا ہے' یہ ہے تکذیبِ دین۔ فَكَذَّبُوْهُ فَاَخَذَهُمُ الْعَذَابُ وَ هُمْ ظٰلِمُوْنَ (16:113)۔ دیکھا ''ظالموں'' کہاں آیا ہے۔ کہا تھا کہ ایسا نہ کرنا' ظالمین میں سے ہو جاؤ گے۔ کہا کہ کیا کریں؟ کیا بات ہے قرآن کی! فَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ (16:114) یہ سارا سامانِ زیست رزق کا سامان جو خدا نے تمہیں دیا ہے' اسے کھاؤ۔ لفظ آیا ہے حَلٰلًا طَیِّبًا (16:114) جو کچھ بھی رزق دیا ہے یعنی یہ وہ حلال اور حرام کی بات تو نہیں' وہ حرام چیزیں تو قرآن نے الگ گنا دیں۔

لفظ حلٰلاً طَیِّبًا اور فاوعیٰ کا قرآنی مفہوم

یہ جتنا کچھ رزق زمین سے نکلتا ہے' اس میں تو وہ حرام کی بات نہیں' نہ یہ مردہ ہوتا ہے' نہ یہ بہتا ہوا لہو ہوتا ہے' نہ یہ خنزیر ہوتا ہے۔ اس سارے رزق کو حلٰلاً اپنے بنیادی معنی میں آیا ہے۔ حلال کے معنی ہوتا ہے ''گرہ کھول دینا''۔ وہاں دوسرے مقام پہ کہا تھا کہ وَجَمَعَ فَاَوْعٰی (70:18) یہ دیکھو اس کے کرتوت! کرتا کیا ہے؟ یہ جو پھیلانے کے لیے کچھ دیا تھا' اس کو جمع کرتا ہے۔ فَاَوْعٰی کے معنی ہوتا ہے ''تھیلی میں ڈال دیتا ہے اور گرہ باندھ دیتا ہے''۔ حَلٰلًا کے معنی ہیں رسیاں کھول دو' گرہ کھول دو۔ گرہ کھول دی' کسی پہ کوئی بند نہیں' کسی پہ کوئی رکاوٹ نہیں۔ پھر کیا؟ ایک روٹی ملتی ہے جیل خانے میں' ایک ملتی ہے مزدوری سے' تو وہ بہتر ہوتا ہے جو مزدوری کرتا ہے' روٹی تو دونوں کو یقینی طور پہ ملتی ہے۔ اس روٹی میں کیا چیز ہوتی ہے جو تکلیف دیتی ہے آپ کو؟ طَیِّبًا نہیں ہوتی' تمہارے ذوق کے مطابق نہیں ہوتی کہ جسے تم پسند کرو' اس میں سے وہ لو' جسے تم ناپسند کرو' وہ نہ لو۔ کھول دو رسیاں کہ یہ سب کے لیے کھلا ہے۔ طَیِّبًا کے معنی ہیں ''وہ خوشگوار جو تمہیں انفرادی طور پہ نظر آئے' وہ کھاؤ۔ اس میں Regimentation (گروہ بندی) ختم ہوگئی' جو کمیونزم کے اندر ہوتی ہے۔

شکر کا قرآنی مفہوم اوراس کو عملی شکل دینے کا طریق کار اوراس کا ماحصل

قرآن ہے' عزیزانِ من! کہا ہے کہ حَلٰلًا طَیِّبًا (16:114)۔ وہاں کہا تھا کہ نعمت اللہ سے کفران نہ کرنا' کہا ہے کہ وَّ

اشْکُرُوْا نِعْمَتَ (16:114)۔ یوں خدا کی دی ہوئی نعمتوں کا لفظ یہی ہے وَّ اشْکُرُوْا شکر یہ ادا کرو۔ معنی اس کے اور ہوتے ہیں۔ اس کے معنی ہوتے ہیں بکری کو اس قسم کا چارا دو' اتنی اس کی پرورش کرو کہ اس کے تھن یوں دودھ سے بھرے ہوئے ہوں کہ چلے جا رہی ہے اور اس میں سے دودھ ٹپکتا جا رہا ہے' اسے عربی زبان میں شکر کہتے ہیں' او! یہ کرو اور پھر تم اپنی اکنامکس کو دیکھو کیسے تھن بھرتے ہیں دودھ سے! یہ کرو جو کچھ خدا نے رَزَقَکُمُ اللّٰـهُ (16:114) ہے جو کچھ تمہیں اس نے رزق دیا ہے' اس کی گرہیں کھول' دو پھر انفرادی ذوق اور Taste (انداز) کے مطابق ہر شخص کو اجازت ہو کہ اس میں سے اس طرح کھائے بجز ان کے جن پہ قرآن نے پابندی عائد کی ہے کہ حرام ہیں۔ اپنے انتخاب کے مطابق یہ کرو۔ یوں تمہارے معاشرے کی کیفیت یہ ہو جائے گی کہ یہ بھرے ہوئے تھن ہونگے تمہارے ہاں کے ہر چیز کے۔

یہ کرو اور آگے' عزیزانِ من! جو لفظ ہے' اس کے لیے پہلے میں یہ عرض کر دوں کہ بات چلی کہاں سے تھی؟ یہی سورۃ البقرۃ کی بات جو چلی تھی' کہا تھا کہ الَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّ السَّمَآءَ بِنَآءً ص وَّ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ (2:22) یہ سارا رزق کا سامان جو تمہیں دیا تھا' یہ سب کچھ دینے کے بعد کہا تھا فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (2:22) خدا کا ہمسر نہ بناؤ' ملکیتوں میں دوسروں کو شریک نہ کرو' تم جانتے ہو یہ کچھ کیفیت۔ اور سورۃ الفاتحہ میں یہ کہا تھا کہ اِیَّاکَ نَعْبُدُ (1:3) ہم تیرے ہی احکام کی تعمیل کرتے ہیں' عبودیت اختیار کرتے ہیں۔ یہاں کہا کہ یوں حلال اور طیّب طریق سے کھاؤ اِنْ کُنْتُمْ اِیَّاهُ تَعْبُدُوْنَ (2:172) یہ جو تم نے ابھی دعویٰ کیا ہے اِیَّاکَ نَعْبُدُ (1:4) کا۔ اس اِیَّاکَ نَعْبُدُ (1:4) کی عملی تفسیر یہ ہے تو پھر سمجھا جائے گا کہ تم صرف اس کی عبادت کرتے ہو' صرف اس کی محکومیت اختیار کرتے ہو۔ یہ نہ کرو گے تو مِنْ دُوْنِ اللّٰـهِ اَنْدَادًا (2:165) اس کے ساتھ آ جائیں گے۔

عزیزانِ من! سورۃ البقرۃ کی آیت 35 سے ہم نے شروع کیا' 39 تک آ گئے' اور اس تمثیلی بیان کے بعد پھر وہ تاریخِ انسانیت سے آپ کے سامنے واقعات لائے گا کہ جن قوموں نے اس کے مطابق کیا کیسی جنت کی زندگی بسر کی' جنھوں نے اس کی خلاف ورزی کی وہ کیسی جہنم کی زندگی میں آئے۔ اور اس تاریخ کے لیے وہ قومِ بنی اسرائیل کو منتخب کرتا ہے۔ آگے داستانِ بنی اسرائیل شروع ہو جاتی ہے جسے ہم آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ط اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ

❀......❀......❀

پندھرواں باب: **سورۃ البقرۃ** (1)‘ (آیات 40 تا 45)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

يٰبَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِىَ الَّتِىْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَوْفُوْا بِعَهْدِىْٓ اُوْفِ
بِعَهْدِكُمْ ۚ وَاِيَّاىَ فَارْھَبُوْنِ ﴿۴۰﴾ وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُوْنُوْٓا
اَوَّلَ كَافِرٍۢ بِهٖ ۠ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِىْ ثَـمَنًا قَلِيْلًا ۡ وَاِيَّاىَ فَاتَّقُوْنِ ﴿۴۱﴾ وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ
بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۴۲﴾ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ
وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ﴿۴۳﴾ اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ
تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۴۴﴾ وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ۭ وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ
اِلَّا عَلَي الْخٰشِعِيْنَ ﴿۴۵﴾

عزیزانِ من! آج ستمبر 1968ء کی 8 تاریخ ہے اور ہم درسِ قرآنِ کریم کے سلسلۂ نو میں سورۃ البقرۃ کی آیت 40 سے آج کے درس کا آغاز کر رہے ہیں: (2:40)۔

قرآن حکیم کی تعلیم کا ماحصل حق کو حق ثابت کرنے کا محسوس طریق اور حکمت

سابقہ درس میں سلسلۂ کلام یہاں تک پہنچا تھا کہ قصۂ آدم کے تمثیلی انداز میں قرآن نے آخر میں دو قوانین دیئے یا ایک قانون کی دو شقیں بیان کیں جو بڑی اہم تھیں اور میں کہونگا کہ دین کا ماحصل تھیں۔ اور وہ یہ ہے کہ فَاِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ مِّنِّیْ ھُدًی فَمَنْ تَبِعَ ھُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ (2:38) جو قوم خدائی راہنمائی کے مطابق زندگی بسر کرے گی‘ اس پر کوئی خوف اور حزن نہیں ہوگا ۔ وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَکَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَآ اُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ ھُمْ فِیْھَا خٰلِدُوْنَ (2:39) اور جو قوم ان قوانینِ خداوندی کی خلاف ورزی کرے گی تو اس کی امیدوں کی کھیتی جھلس جائے گی‘ وہ تباہی کے عذاب میں محصور ہوگی اور یہ عذاب اس وقت تک

مسلط رہے گا' جب تک وہ قوانینِ خداوندی کے تابع اپنے آپ کو نہیں لے آتی۔ یہ دو اٹل قانون بتائے اور یہی ہیں وہ محور جن کے گرد دین کے سارے نظریات گردش کرتے ہیں۔ایک اتباعِ قوانینِ خداوندی کا نتیجہ اس زندگی کی خوشحالیاں اور اگلی زندگی کی شادابیاں اور سیرابیاں اور دوسرا ان قوانین کی خلاف ورزی سے تباہی اور بربادی کا عذاب۔ یہ ہوئے دو اصول۔قرآن کا انداز یہ ہے کہ وہ جب کوئی مسلمہ بیان کرتا ہے' کوئی اصول پیش کرتا ہے' کوئی غیر متبدل قانون دیتا ہے' تو اس کی صداقت کے لیے تاریخی شواہد پیش کرتا ہے۔اور سب سے زیادہ قابلِ اعتماد محسوس شکل میں کسی اصول یا مسلمہ کی صداقت کے لیے تاریخی شواہد سے زیادہ بہتر قابلِ اعتماد شہادت کوئی اور ہو نہیں سکتی۔

عام طور پر تاریخ کے متعلق تو یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ واقعات کی تحریر ہوتی ہے یا Chronicles (تاریخ اور واقعات) کا ریکارڈ ہوتا ہے کہ فلاں سال میں یہ ہوا' فلاں زمانے میں فلاں بادشاہ تخت پہ بیٹھا' اس کی فلاں فوج سے لڑائی ہوئی' اس کو شکست ہوگئی' اس کو فتح ہوگئی' اس سلطنت نے اتنی صدیوں تک حکومت کی پھر دوسری قوم آ گئی' اس نے یہ کیا۔ یہ تو اخبارات ہیں' خبریں ہیں' واقعات ہیں' سوانح ہیں' حادثات ہیں' جن کو مرتب کر دیا جاتا ہے۔تاریخ کو یہی کچھ سمجھا جاتا تھا۔قرآن نے تاریخ کوئی حیثیت دی اور اس نے کہا کہ یہ واقعات تو ٹھیک ہیں' جو رونما ہوتے ہیں' سوال یہ ہے کہ یہ ایسا ہوتا کیوں ہے۔ یہ کیوں ہے کہ ایک قوم آتی ہے اور دوسری قوم پر غالب آ کر اپنی حکومت قائم کرتی ہے' پھر یہ کیوں ہے کہ اتنا غلبہ اور استحکام پیدا کرنے والی قوم تھوڑے ہی عرصے کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ پھر وہ کمزوریوں کا شکار ہو جاتی ہے۔ یہ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ تاریخ تمہیں صرف یہ بتاتی ہے کہ یہ قوم غالب آ گئی' دوسری قوم مغلوب ہوگئی' تاریخ تمہیں یہ نہیں بتاتی ہے کہ ایسا کیوں ہوا۔

قرآن حکیم کے تمام اصول اسباب وعلل کی بنیاد پر دلالت کرتے ہیں

قرآنِ کریم نے آ کر کہا کہ تاریخ کا کام یہ ہے کہ وہ ان اسباب وعلل' ان Causes (اسباب) کے متعلق بیان کرے کہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔اس نے تاریخ کو قوموں کے عروج وزوال کا ایک فلسفہ بنا کر پیش کیا' The Philosophy of History (تاریخ کا فلسفہ) دنیا میں سب سے پہلے قرآن نے دی ہے۔ برادرانِ عزیز! ہمارے ہاں تو یہ Term (اصطلاح) ہی' میں سمجھتا ہوں کہ ہیگل (1770-1831ء) سے پہلے شاید کسی نے استعمال ہی نہیں کی تھی۔ ہسٹری آف فلاسفی (فلسفے کی تاریخ) تو دنیا نے لکھی' جو فلاسفی آف ہسٹری (تاریخ کا فلسفہ) تھی' اس کا تصور سب سے پہلے قرآن نے دنیا میں پیش کیا۔ اس نے کہا کہ یہ چیزیں یونہی اتفاقاً (By Chance) رونما نہیں ہو جاتیں کہ ایک قوم ابھرتی ہے' دوسری قوم قہرِ تنزل میں جا گرتی ہے۔اس نے کہا کہ یہ چیزیں قوموں کے عروج وزوال کے خاص قوانین ہیں' ان کے تابع یہ کچھ ہوتا ہے۔ یہ جتنے واقعات ہوتے ہیں یہ اس قانونِ عروج وزوالِ امم کی

صداقتوں کی شہادت ہوتے ہیں۔ تاریخ کو یہ بتانا چاہیے کہ ایسا کیوں ہوا تھا اور قرآن یہی کرتا ہے۔ وہ ایک قانون یا ایک مسلمہ دیتا ہے اور اس کے بعد تاریخی نوشتوں سے اس کی صداقت کی شہادت بہم پہنچاتا ہے۔ قرآنِ کریم میں حضراتِ انبیائے سابقہؑ اور اقوامِ گزشتہ کی جتنی سرگزشتیں آئی ہیں وہ محض تاریخ کی وقائع نگاری نہیں ہے بلکہ وہ تاریخ کا فلسفہ پیش کرتی ہیں۔ اور جہاں بھی آپ دیکھیں گے کہ کوئی تاریخی واقعہ آئے گا قرآن اس کے ساتھ یہ بتائے گا کہ یہ اس لیے ہوا کہ اس قوم نے فلاں قانون کی خلاف ورزی کی تھی۔ اور اس قوم کو جو اس قدر انعامات ملے ہیں، یہ یونہی نہیں تھا کہ چھپر پھاڑ کر مل جاتے ہیں، اس قوم کے اندر یہ جوہر اور یہ خصوصیات پیدا ہوگئی تھیں، ان کا لازمی فطری نتیجہ یہی ہونا چاہیے تھا جو ہو کر رہا۔ قرآن نے کہا ہے کہ وَ لَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا (33:62) قوموں کی سرگزشتیں بیان کرنے کے بعد وہ یہ کہتا ہے کہ ''ان قوانینِ خداوندی میں تم کبھی تبدیلی نہیں پاؤ گے''۔ اور مقصد یہی ہوتا ہے۔

اس وقت تو تاریخ سے ہمارے ہاں مقصد اتنا ہی ہے کہ امتحان میں سوال آجاتا ہے کہ اکبر کتنے سال میں تخت نشین ہوا، کتنے سال میں اس نے فلاں معرکہ فتح کیا، کتنے سال میں مر گیا، بس اتنی واقعات کی معلومات جو ہیں، اس کا نام ہمارے ہاں History (تاریخ) ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ History (تاریخ) سے مقصد یہ ہے کہ تم یہ بات سامنے رکھو کہ فلاں قوم نے اس قسم کی طرزِ زندگی اختیار کی، تو اس کا اس قسم کا لازمی نتیجہ نکلا۔ اگر تم بھی اس قسم کی زندگی اختیار کرو گے، تو تمہارے ہاں بھی یہی کچھ ہو کر رہے گا، اس لیے کہ وَ لَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا (33:62) ان قوانینِ خداوندی میں کسی قسم کی تم تبدیلی نہیں پاؤ گے۔ قرآن کا یہ انداز آپ شروع سے آخر تک دیکھیں گے کہ وہ ایک قانون، نظریہ، مسلمہ پیش کرے گا اور اس کے بعد پھر تاریخی نوشتوں سے اس کی شہادت بہم پہنچائے گا۔

یہاں اس نے یہ اصول پیش کیا کہ جو قوم ان غیر متبدل اقدارِ خداوندی کا اتباع کرے گی، اس کو اس دنیا کے اندر نعمائے خداوندی ملیں گی، سرفرازیاں اور عزت کی زندگی ملے گی، اور جو قوم اس کی خلاف ورزی کرے گی وہ تباہی اور بربادی کے عذاب میں مبتلا ہو جائے گی۔ یہ کہنے کے بعد آپ دیکھیے فوراً اگلی آیت میں اس نے تاریخ کو اپنی شہادت میں پیش کیا۔ کہا ہے کہ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ (2:40)۔ آپ دیکھتے ہیں کہ قرآن کے اندر کس قدر گہرا ربط ہوتا ہے۔

قوموں کی موت وحیات کے اصولوں کے سلسلہ میں قرآن حکیم ایک واضح اور مربوط کتاب ہے

بظاہر یوں نظر آتا ہے کہ قصۂ آدم شروع ہوا، وہاں جنت میں سے نکالے گئے۔ یہ بات چلی آرہی تھی، اس کے بعد صاحب! بنی اسرائیل کی بات شروع ہوگئی۔ آپ دیکھتے ہیں کہ ان چیزوں کے اندر کس قدر گہرا ربط ہے اور قرآن کے ربط کی تو کیفیت یہ ہے۔ اب آپ نے تو ایک دفعہ قرآن کا درس ختم کر لیا ہے، آپ نے دیکھا تھا کہ الحمد سے والناس تک کس طرح یہ کتاب ایک مربوط سلسلے کے ساتھ

چلی آ رہی ہے' اس میں کہیں کسی قسم کا بھی انقطاع نہیں ہے۔ یہ ہے ربطِ باہمی۔

بنی اسرائیل کی کہانی قرآن حکیم کی زبانی

قرآن اب تاریخ کے نوشتوں کی شہادت پیش کر رہا ہے ۔شہادت میں بنی اسرائیل کی قوم کو وہ سب سے نمایاں طور پر سامنے لایا ہے۔ ایک تو اس لیے بھی کہ قرآن کی جو اولیں مخاطب قوم تھی' وہ بنی اسرائیل کی تھی' وہ اس تاریخ سے خود بھی واقف تھی' یہ انہی میں سے تھے۔ یہ جو سامی النسل قومیں تھیں' یہ عرب ہوں یا یہ بنی اسرائیل کے یہودی ہوں' یہ سارے ایک ہی Stock (مورثِ اعلیٰ) کو Belong (تعلق) کرتے تھے' پھر یہ رہنے والے بھی قریباً ایک ہی علاقے کے تھے' ان کا آنا جانا آپس میں ملنا جلنا تھا۔ قرآن اگر عربوں کے سامنے چین کی کسی Dynasty (شاہی سلسلہ) کی وہاں تاریخ پیش کر دیتا تو بات ہی ان کی سمجھ میں نہ آتی کہ یہ کیا کہہ رہا ہے۔ پہلے ان کو چین کی ساری کہانی سنانی پڑتی اور پھر بھی سنے ہوئے واقعات سے تو وہ باتیں ذہن میں اس طرح نہیں آتیں' جیسے قرآن نے یہ کہا ہے کہ جا کر دیکھو تم قومِ لوط کی بستیوں کو' تم صبح شام ان کے کھنڈرات سے گزرتے ہو' اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہو کہ ان کے اتنے اتنے بڑے محلات اور قلعے کس طرح سے اینٹ اور پتھر کا ڈھیر بن کر رہ گئے' صبح شام تم ان بستیوں سے گزرتے ہو' تو اسے شہادت میں پیش ہی ان چیزوں کو کرنا چاہیے تھا۔ یہ وجہ ہے کہ قرآن کے اندر جتنی تاریخی شہادتیں پیش ہوئی ہیں' وہ انہی علاقوں سے متعلق تھیں' انہی اقوام سے متعلق تھیں' انہی انبیاؑ سے متعلق تھیں جن سے عرب کی اولیں مخاطب قوم اچھی طرح سے واقف اور آشنا تھی۔ ان میں بنی اسرائیل کا قومی حیثیت سے مقام بہت اونچا تھا' اس لیے کہ ایک تو اس قوم کی تاریخ مسلسل چلی آ رہی تھی۔

برادرانِ عزیز! بنی اسرائیل کی یہ نسبت حضرتِ یعقوبؑ سے شروع ہوتی ہے' درحقیقت یہ سارا Stock (مورثِ اعلیٰ) حضرتِ ابراہیمؑ سے چلتا ہے لیکن بنی اسرائیل میں' اسرائیل کا جو نام تھا' یہ حضرتِ یعقوبؑ کا لقب تھا' ان کی اولاد سے آگے یہ سلسلہ چلا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ حضرتِ یوسفؑ اپنے والدین کو اور بھائیوں کو مصر لے گئے تھے کہ وہاں وہ عزت کی آبرومندانہ زندگی بسر کریں۔ یہ قوم' وہیں Settle (رہائش پذیر) ہو گئی تھی' صرف یہ جو حصہ تھا' پوری کی پوری قوم نہیں' بلکہ ان کا یہ خاندان وہاں Settle (رہائش پذیر) ہو گیا' ایک عرصہ کے بعد وہاں یہ ایک قوم بن گئے' آزادی کی زندگی بسر کی۔ پھر یہ وہاں کے بادشاہوں کے' وہاں کی قوم کے' وہاں کے فراعنہ کے' محکوم ہو گئے۔ یہ ان کی محکومی کی ذلت کا انتہائی زمانہ تھا جب ان میں صاحبِ ضربِ کلیمؑ' حضرتِ موسیٰؑ' پیدا ہوئے' فرعون کی غلامی سے ان کو نجات دلائی' فلسطین کے میدانوں میں لے جا کر ان کو آزادی کی فضائے بسیط میں سانس لینے کے مواقع بہم پہنچائے۔ وہاں ان کی حکومت قائم ہوئی' تمکن ہوا' شوکتِ سلیمانیؑ سطوتِ داودیؑ ان کو نصیب ہوئی۔ پھر اس کے بعد یہ ذلتوں کی پستیوں میں ایسے گرے کہ

ان کا مرکز بھی ختم ہوگیا' ان کی قومی حیثیت ختم ہوگئی' یہ The wandering Jews (آوارہ یہودی) بنے' دنیا کے اندر مارے مارے پھر رہے تھے' اس قوم پہ یہ کیفیت ہوئی تھی۔

یہ کیفیت تھی اس دور میں جب قرآن نازل ہوا ہے۔اس زمانے میں اتنی صدیوں تک مسلسل داستان جو کسی قوم کی سامنے آ سکتی تھی' وہ بنی اسرائیل ہی کی ہو سکتی تھی۔اور ان کا میل ملاپ عرب سے اور اہلِ مکہ سے اتنا زیادہ تھا کہ مکے اور مدینے میں تو یہ آدھی آبادیاں ان کی تھیں۔بالخصوص مدینے کے اندر تو آپ کو پتہ ہے کہ یہودیوں کی آبادیاں کتنی موثر تھیں۔یہ ان علاقوں کے اندر پھیلے ہوئے تھے۔اس لیے بنی اسرائیل کی داستان کو قرآن سامنے لایا ہے۔جب بھی یہ اشارہ کرے گا کہ ان کو کس قدر عروج نصیب ہوا تھا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہاں کے مخاطب عرب جانتے تھے کہ انہیں کتنا عروج نصیب ہوا تھا اور اُدھر اس نے جب یہ بتانا تھا کہ ذلتوں کی کن پستیوں میں یہ اس وقت زندگی بسر کر رہے ہیں' تو ان کی وہ ذلتیں ان کی آنکھوں کے سامنے تھیں جن سے وہ گزر رہے تھے۔اس لیے قرآن نے اس حقیقت کی صداقت کے لیے شہادت میں جو تاریخ پیش کی ہے' وہ مسلسل طور پر بنی اسرائیل کی ہے۔ویسے شدہ شدہ قومِ عاد اور قومِ ثمود اور قومِ لوط کی بھی تاریخیں آئی ہیں لیکن قرآنِ کریم کے اندر مسلسل داستان آپ کو بنی اسرائیل کی ہی ملے گی۔

قرآن حکیم نے قوموں کی عزت وتکریم کے پیمانوں کا خارجی معیار' داستان بنی اسرائیل میں پیش کر رکھا ہے

قرآنِ حکیم نے بات کہاں سے شروع کی؟ سورۃ الفاتحہ میں ہمیں ایک دعا سکھائی گئی تھی کہ اِهۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِيۡمَ - صِرَاطَ الَّذِيۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَيۡهِمۡ (1:5-6) ان قوموں کے راستے کی طرف رہنمائی فرما' جن پر تیری نعمتوں کی بارش ہوئی تھی۔اور پہلی تاریخی شہادت یہ کہہ کر پیش کی جا رہی ہے کہ يٰبَنِىۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ اذۡكُرُوۡا نِعۡمَتِىَ الَّتِىۡۤ اَنۡعَمۡتُ عَلَيۡكُمۡ (2:40) یہ بتانے کے لیے کہ نظری طور پر اپنے ذہن میں تم یہ نہ سمجھ لینا کہ انعاماتِ خداوندی یہ ہوتے ہیں کہ جیسے دنیا میں ذلت اور پستی کی زندگی بسر ہو رہی ہے اور ذہن ہی ذہن کے اندر آسمان پہ روحانی بادشاہوں کے مالک بنے بیٹھے ہیں۔قرآنِ حکیم ایک قوم کی زندہ اور پائندہ تاریخ سامنے لا رہا ہے اور کہہ رہا ہے کہ یہ دیکھیے! یہ ہے وہ قوم جس کے اوپر ہمارے انعامات کی بارش ہوئی تھی' دیکھیے ان کا وہ دور جس وقت ان کو اس دنیا کے اندر اتنا تمکن نصیب ہوا تھا۔یہ تو ہے (2:40) جہاں سے میں نے آغازِ کلام کیا ہے۔یہ انعامِ خداوندی کیا تھا؟ یہ چار ہی آیتوں کے بعد' قرآن نے (2:47) میں ہی بات واضح کر دی کہ نِعۡمَتِىَ الَّتِىۡۤ اَنۡعَمۡتُ عَلَيۡكُمۡ (2:47) خدا کی وہ نعمت جسے اس نے تم پر ارزاں کیا۔عزیزانِ من! قرآن کا جامع بیان دیکھیے کہ دو لفظوں کے اندر وہ بات کہہ گیا ہے جس پہ تاریخ کی کتابوں پہ کتابیں لکھی جا سکتی

ہیں۔ انعامِ خداوندی یہ تھا کہ اَنِّیْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ (2:47)۔ بات ختم ہوگئی: جتنی تمہاری اس وقت کی ہم عصر اقوام تھیں، ان اقوام کے اوپر تمہیں فضیلت حاصل تھی، غلبہ حاصل تھا، تمکن حاصل تھا Superiority (افضلیت) حاصل تھی۔ انعامِ خداوندی دو لفظوں میں سمٹ کر آ گیا، تفسیر اس کی کرتے جایئے جہاں تک جی چاہے، بات یہی ہے کہ انعاماتِ خداوندی میں بنیادی چیز یہ ہے کہ اس قوم کو اپنی ہم عصر اقوام میں Superiority (افضلیت) حاصل ہو، ان کا امتیازی مقام ہو۔ جس قوم کی یہ کیفیت ہو، اسے سمجھنا چاہیے کہ ہم منعم علیهم ہیں، ہم ہیں جن پہ خدا کا انعام ہوا ہے۔ اور جس قوم کو اپنے دور میں Contemporary (ہم عصر) قوموں کے مقابل میں یہ حیثیت حاصل نہ ہوئی ہو، اسے اس خود فریبی کے اندر نہیں رہنا چاہیے کہ ہم خدا کی انعام یافتہ قوم ہیں۔ کتنا بڑا ایک Objective Test (خارجی معیار) ہے، جس میں کوئی بھی کسی دھوکے میں نہیں رہ سکتا، Self deception (خود فریبی) میں آ ہی نہیں سکتا۔ یہ ہے ایک معیار، دیکھ لیجیے۔ یہ عالمین میں افضلیت کی حامل قوم ہے، اس دور کی اقوامِ عالم میں افضل ہے۔ یاد رکھیے! اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اپنی ہم عصر اقوام کے اندر، جس قوم کو یہ حیثیت حاصل ہے، اس کے متعلق کہا جائے گا کہ وہ خدا کی انعام یافتہ قوم ہے۔

آج کے دور میں کرہ ارض پر مسلمانوں کی حالتِ زار

غور فرمالیا آپ نے کہ یہ کیا مقام ہے! اور وہ جو اپنے ذہنوں میں اپنے آپ کو خدا کی سب سے زیادہ چہیتی قوم سمجھ رہی ہے، اس کے محبوب کی محبوب امت، مراکش سے لے کر انڈونیشیا تک پھیلی ہوئی ہے، اسے ذرا ذہن میں لایئے، ان مسلمان کہلوانے والی اقوام کی حیثیت وا اپنے سامنے رکھیے۔ یہ مسلمان کہلانے والی قومیں ہیں، یہ اپنے ذہن میں یہ سمجھنے والی قومیں ہیں کہ ہم انعاماتِ خداوندی کی مستحق قومیں ہیں، ذرا دیکھیے تو سہی کہ آیا اَنِّیْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ (2:47) کی ان کی کیفیت ہے یا ان کی کیفیت یہ ہے کہ دنیا میں یہ وہ قوم ہے جن پر ذلت کی انتہا ہو چکی ہے! یہ تو ان یہودیوں سے بھی بدتر ہے جن کے متعلق یہ تیرہ سو سال تک سمجھتے چلے آ رہے تھے کہ یہ دنیا کی ذلیل ترین قوم ہے اور آج وہ ذلیل ترین قوم بھی ان کے اوپر غالب آئی ہوئی ہے۔ اس سے زیادہ ذلت کی انتہا نہیں ہو سکتی۔ برادرانِ عزیز! اور پھر وہ کسی ایک خطے یا گروہ پہ غالب نہیں آئی ہوئی، وہ جس کو آپ اسلام کا مرکز بتا رہے ہیں، اس پر وہاں چھائی ہوئی ہے اور باقی جو اقوامِ عالم ہیں، وہ سوائے اس کے کہ دعائیں مانگیں کہ یا اللہ! ان کی توپوں میں کیڑے پڑیں، اس کے سوا کچھ نہیں کر سکتے۔ وہ یوں دبے ہوئے ہیں، باقیوں کی بے بسی کا یہ عالم ہے اور اس کے باوجود کبھی ان کو خیال نہیں آتا کہ دن میں پھر یہ چالیس مرتبہ یہ دعا مانگ رہے ہیں کہ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ - صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ (1:5-6)۔ یہ کتنا بڑا فریب ہے جو قومیں اپنے آپ کو دے لیتی ہیں! کوئی ایک دفعہ بات کہے، دو دفعہ کہے، چار دفعہ کہے، نہ سنی جائے، نہ پوری ہو تو چھوڑ دیتا ہے لیکن یہاں تو یہ کیفیت ہے کہ

نہ دکھ جائے نہ درماں راس آئے
مگر خبطِ دعا ہے اور میں ہوں

یہ کچھ کیے جایئے صاحب! قرآن تضاد سے Contrast (تقابل) سے بات کو واضح کرتا ہے۔ اِدھر کہا کہ اَنِّیۡ فَضَّلۡتُكُمۡ عَلَی الۡعٰلَمِیۡنَ (2:47)۔ تم اپنی ہم عصر اقوام میں ممتاز حیثیت کے مالک ہو گئے، کوئی اور قوم تمہارا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔ تمہاری یہ کیفیت تھی جب تم نے قوانینِ خداوندی کا اتباع کیا اور جب تم نے یہ اتباع چھوڑ دیا، تو جو قانون کا دوسرا حصہ ہے وہ لاگو ہوا تو کیفیت یہ ہوئی کہ وَضُرِبَتۡ عَلَیۡهِمُ الذِّلَّةُ وَ الۡمَسۡكَنَةُ ۚ وَ بَآءُوۡ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ (2:61)۔ ذلت و مسکنت کی تم پر مار ماری گئی، تم خدا کے غضب کے اندر آ گئے۔ خدا کا غضب بھی یہاں ثابت ہو گیا۔ ذلت اور مسکنت کیا ہوتا ہے؟ کسی قوم کے اوپر ذلت تو قوتوں کے اندر پست ہو جانا ہے، مسکنت جمود طاری ہو جانا ہے، کسی قوم کی حرکت کا ساکن ہو جانا ہے۔ کہا ہے کہ تمہاری یہ کیفیت طاری ہو گئی۔ ایک ہی آیت کے دو ٹکڑوں کے اندر قرآن دونوں چیزیں سامنے لے آیا۔

آخر کیا اس ذلت و مسکنت کا کوئی حل، کوئی علاج بھی ہے!

سوال پیدا ہوا کہ کیا اب یہ کیفیت ابدی طور پر رہے گی؟ کیا یہ جو یہودیوں پر خدا کا عذاب طاری ہوا ہے، بس اب قیامت تک کے لیے ان کی یہی صورت رہے گی؟ ویسے تو اس پر ہم نے اپنے ہاں ''طلوعِ اسلام'' میں بڑی تفصیل سے یہ لکھا تھا کہ یہ جو مسلمانوں کے ذہن کے اندر ایک خود فریبی سمائی ہوئی ہے کہ صاحب! بس قیامت تک کے لیے وہ یہودیوں کی حکومت قائم نہیں ہو سکتی، خدا نے یہ کہہ دیا، یہ بالکل غلط ہے، قرآن کی تعلیم کے خلاف ہے، یہ صورت نہیں ہے لیکن بہر حال میں اس تفصیل میں تو آگے چل کر آؤں گا، جہاں ان کی یہ داستان آئے گی کہ اسکے بعد ان کا مستقبل کیا ہو گا۔ نزولِ قرآن کے زمانے کے اندر یہ کہا گیا ہے، دیکھیے! قرآن امیدوں کا شہزادہ، اس قسم کی قوم کو اس وقت یہ کہہ رہا ہے کہ اَوۡفُوۡا بِعَهۡدِیۡۤ (2:40)۔ کوئی بات نہیں! آج تم پہ اگر یہ کیفیت طاری ہو گئی ہے، تم ذلت اور پستیوں کی ماریں مارے گئے ہو، کوئی بات نہیں، اب بھی وقت ہے کہ اَوۡفُوۡا بِعَهۡدِیۡۤ (2:40) ہمارے ساتھ تم نے جو عہد کیا تھا اس عہد کو پورا کرو۔ تم پورا کرو گے تو کیا ہو گا؟ یہ کہ اُوۡفِ بِعَهۡدِكُمۡ (2:40) ہم بھی اپنا وعدہ پورا کریں گے۔ آپ نے دیکھا کہ اس زمانے میں بھی ان کے لیے دروازہ کھلا تھا، تم اپنے عہد کو پورا کرو، ہم اپنے عہد کو پورا کریں گے۔ یہ عہد کیا ہے؟

جنتِ ارضی میں داخلے لیے خدا سے ایک عہد کرنا ضروری ہوتا ہے

برادرانِ عزیز! ہمارے ہاں تو آسانی ہے کہ وہ جو اَلَسۡتُ بِرَبِّكُمۡ ؕ قَالُوۡا بَلٰی (7:172) ہے، وہ آپ کو پتہ ہے، وہ پہلے آ چکا ہے، اسے ہر بار دہرانے کی ضرورت نہیں ہے لیکن قرآن جو ہے، وہ تو محسوس شکل میں بات سامنے لاتا ہے۔ عزیزانِ من! یہ عہد کیا ہے؟

جیسا کہ میں اس سے پیشتر کئی مرتبہ عرض کر چکا ہوں' آج تو ہمارے سامنے مسلمان ہونے کے لیے اتنا اقرار کافی ہے کہ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَ رَسُوْلُهٗ ۔ یہ چند الفاظ دہرا لیے جائیں یا امنتوا بالله و ملئکته و رسله کہہ دیا جائے اور جیسا کہ میں کہا کرتا ہوں کہ یہ بھی غیر مسلم کو مسلم بنانے کے لیے ضرورت ہے' جو ہم لوگ مسلمانوں کے گھروں میں پیدا ہو گئے ہیں' ہمارے لیے اتنی ضرورت بھی نہیں ہے کہ عمر بھر میں کبھی اس کا بھی اقرار کر لیں لیکن بات مسلمان ہونے کے لیے اتنی نہیں ہے' بات ایک عہد کی ہے جو یہاں کہا گیا ہے۔

وہ عہد کیا ہے؟ یہ کہ اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ (9:111) ایک معاہدے پہ دستخط کرنے پڑتے ہیں مسلمان ہونے کے لیے اور وعدہ یہ ہے کہ میں نے اپنی جان اور مال دونوں خدا کے ہاتھ میں بیچ دیئے۔ سن رہے ہیں' عزیزانِ من! اِدھر سے اس نے کہا ہے کہ تم اپنا عہد پورا کرو' میں اپنا عہد پورا کروں گا۔ وہ اگلا عہد کیا ہے؟ یہ کہ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ (9:111) ہم تمہیں جنت کی زندگی دیدیں گے' اس دنیا کے اندر بھی جنت کی زندگی' اُس دنیا کے اندر بھی جنت کی زندگی' یہ ہمارا عہد ہے' تم وہ پورا کرو' ہم یہ پورا کرتے ہیں۔ پھر یہ عہد پورا کیسے ہوتا ہے؟ یہی نہیں کہ دستخط کیا' معاہدہ ہو گیا' عہد پورا ہو گیا۔ وہ عہد لینے والا بڑا سخت قسم کا واقع ہوا ہے' وہ ہمارے فریب میں نہیں آ سکتا۔ عہد یوں پورا ہوتا ہے کہ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (9:111) وقت آنے پر سر بکف میدانِ جنگ میں آ جاتے ہیں' اللہ کی راہ کے اندر اپنی جان دینے کے لیے فَيَقْتُلُوْنَ وَ يُقْتَلُوْنَ (9:111) پھر یا فاتح اور منصور واپس لوٹتے ہیں یا میدان کے اندر اپنا سر دیدیتے ہیں۔ یہ ہے جو تم نے وعدہ کیا تھا۔

قرآن حکیم کے ارشاد کے مطابق یہ عہد و پیمان تو ہر قدم پر' ہر آن پورا کرنا ہوتا ہے

کہا جائے گا کہ یہ چیز تو مسلمانوں سے کہی گئی ہے اور میں نے ابھی یہ کہا ہے کہ یہ بات بنی اسرائیل سے کہی جا رہی ہے کہ تم اپنے اس عہد کو پورا کرو۔ یہ محض Logical Inference (منطقی استنباط) نہیں ہے جو میں نے پیش کیا ہے' یہ قرآن ہی کے الفاظ ہیں کہ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرٰىةِ وَ الْاِنْجِيْلِ وَ الْقُرْاٰنِ (9:111) تورات ماننے والوں سے بھی یہی وعدہ لیا گیا تھا' انجیل ماننے والوں سے بھی یہی وعدہ لیا گیا تھا یعنی اس سے جو اصل انجیل اور اصل تورات تھی۔ اس سے یہ نظر آیا کہ یہ کوئی نئی بات نہیں جو ہم سے لی جا رہی ہے' جہاں بھی کسی کو مسلم بنانا تھا' بنانا میں کہہ رہا ہوں' جہاں کسی نے اپنے آپ کو مسلم قرار دینا تھا' وہ پہلے دور کا نبی ہو یا نبیٔ آخر الزمان ﷺ ہوں' قرآن' تورات وانجیل وقرآن' تینوں کو یہاں لے آیا ہے کہ ہر عہد میں یہ چیز تھی' ہر نبی کے ساتھ یہ چیز تھی' ہر امت کے ساتھ یہ چیز تھی' یہی وعدہ تھا جو ہم ہر ایک سے لیتے تھے۔ ان سے کہا کہ اَوْفُوْا بِعَهْدِيْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ (2:40) یہ تھا جو تم سے

وعدہ لیا گیا تھا، تم نے اس معاہدے کے اوپر دستخط کیے تھے۔ اسے پورا کرو، ہم اپنا وعدہ پورا کریں گے۔ یہی چیز ذلت اور مسکنت میں پھنسی ہوئی قوم یہود سے کہی گئی تھی، یہی چیز آج ہم سے کہی جارہی ہے۔ آج کمیٹیاں بیٹھتی ہیں، کمیشن بیٹھتے ہیں، انکوائریاں ہورہی ہیں کہ ہمیں ہوا کیا ہے، اس کا علاج کیا ہے۔ وہی چیز جو اس نے کہی ہے، وہ کہتا ہے کہ تاریخ سے پوچھو کہ ہوا کیا ہے۔ علاج اس کا قرآن سے پوچھو: اَوۡفُوۡا بِعَهۡدِىۡۤ اُوۡفِ بِعَهۡدِكُمۡ (2:40)۔

اور اگلی چیز پھر بتائی، وہ نفسیاتی کیفیت کی ہے۔ کہا ہے کہ تم اس عہد کو کیوں نہیں پورا کرتے؟ نہ مال کو تم اس طرح سے کھلا رکھتے ہو کہ وہ ہماری راہ میں ضرورت مندوں کے کام آئے، نہ سر کو ہتھیلیوں پہ رکھتے ہو کہ تمہارے اس نظام کے راستے میں کھڑے ہونے والی مزاحمت کو دور کیا جائے۔ تم کیوں نہیں ایسا کرتے؟ کہا ہے کہ تمہارے سینے کے اندر ایک ڈر ہے، ڈر ہے کہ مال چلا جائے گا تو کیا ہوگا اور سب سے بڑا ڈر تو یہ ہے کہ جان چلی جائے گی تو کیا ہوگا۔ کہتا ہے کہ یہ جو خارج کے ڈر ہیں، یہ ہیں جو تمہیں اس عہد کے اوپر آنے نہیں دیتے اور اس کا ایک ہی علاج ہے کہ کسی اور کا ڈر اپنے اندر نہ رکھو: وَ اِيَّاىَ فَارۡهَبُوۡنِ (2:40)۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوگا اگر اس کے معنی یہی کیے جائیں کہ مجھ سے ہی ڈرو، تو نفسیاتی طور پر ڈر تو پھر بھی آ گیا Fear Complex (خوف کا الجھاؤ) تو پھر بھی پیدا ہوگیا اور Fear Complex سے تو آپ جانتے ہیں کہ Personality Crush (شخصیت کشی) ہوجاتی ہے، انسانی ذات کو کچلنے کے لیے سب سے زیادہ خطرناک جو چیز ہے وہ Fear Complex (خوف کا الجھاؤ) ہے۔ دبتا ہی انسان وہاں ہے، جہاں Fear (خوف) ہوتا ہے۔ پھر یہ جو چیز Fear (خوف) ہے، خوف خدا ہی کا کیوں نہ ہو، Fear تو ہے ہی، قرآن یہ نہیں سکھاتا۔

یہ چیز خدا کی شان کے شایان ہی نہیں کہ وہ کسی کو ڈرا کر اس سے اپنے احکام کی پیروی کروائے

برادرانِ عزیز! یہ جو ہمارے ہاں عام طور پر بہت بڑی بزرگی کی نشانی 'خوفِ خدا' ایمان کی نشانی بتائی جاتی ہے، خوف سے کسی سے کچھ کام کرانا بتایا جاتا ہے، کسی کام کی Completion (تکمیل) انتہا بتایا جاتا ہے، یہ اکراہ اور زبردستی کی انتہا ہے کہ کسی سے اس طرح سے کوئی کام کرایا جائے۔ کیا یہ نیکی ہوگی کہ ڈر سے کچھ کرایا جائے؟ یہاں اگر ہم کسی طرح سے بھی کسی کو ڈرا کر کوئی کام کرتے ہیں، تو اس میں اس کام کو کرنے والے کی ہم نیکی نہیں کہتے، اسے اس کی Helplessness (بے چارگی) کہتے ہیں، بے بسی کہتے ہیں، بیچارے کی کمزوری کہتے ہیں، یہ کوئی Creditable (مستحسن) چیز تو نہیں ہوتی، اور جو کرانے والا ہوتا ہے اس کے متعلق جو تصور ہوتا ہے، وہ تو ہمارے سامنے ہے۔ کیا آپ سوچتے ہیں کہ جو تصور آج ہمارے ذہن میں انسانوں کے متعلق ہو اور بعینہٖ وہی بات جب ہم خدا کی طرف منسوب کریں تو

یہ بڑی بڑی عظمتوں اور رفعتوں کی باعث بن جائے؟ وہ 'می نہ سزد خدائے را' ہے۔ اسے انگریزی میں یوں کہیں گے کہ

Whatever is the grading to man is equally the grading to God.

یاد رکھیے! جن چیزوں میں انسانیت کی ذلت ہوتی ہے' وہ شایانِ خداوندی نہیں ہوا کرتا' اس اصول کو یاد رکھیے گا۔ یہ خوف نہیں۔

ڈرنے اور محتاط رہنے میں بنیادی فرق ہوتا ہے

کہا ہے کہ وَ اِیَّایَ فَارۡهَبُوۡنِ (2:40)۔ ''ر ھ ب'' کے معنی ہوتا ہے ''کسی چیز کے نقصان رساں نتائج سے' احتیاط برتے ہوئے' اس سے ڈر کر پیچھے ہٹ جانا'' مثلاً آگ میں ہاتھ نہ ڈالنا کہ اس سے ہاتھ جل جائے گا' اس میں یہ شرط ہے۔ ایسا کرنے والے کو راہب کہتے ہیں۔ ہم آگ سے ڈرتے ہیں اس لیے ہم بچے کو آگ سے باز رکھتے ہیں۔ ہم سیلاب سے ڈرتے ہیں' زلزلوں سے ڈرتے ہیں' بیماریوں سے ڈرتے ہیں۔ یہ ڈر اور ایک ڈکیٹیٹر کا ڈر' آپ دیکھتے ہیں کہ ان دونوں میں کتنا فرق ہوتا ہے! یہاں ہم قانون سے ڈرتے ہیں' قانون کی خلاف ورزی سے ڈرتے ہیں' اس کی خلاف ورزی کے جو ہمارے لیے تباہ کن نتائج ہوتے ہیں' ان سے ڈرتے ہیں۔ اسی لیے کہتے ہیں کہ سنکھیے سے محتاط رہو۔ یاد رکھیے! راہب کے اندر احتیاط ضروری ہوتی ہے' اس کے بنیادی معنی میں یہ بات ہے کہ ''احتیاط کے طور پر کسی چیز سے ڈرنا۔'' ہم سانپ سے ڈرتے ہیں۔ یہ کہا ہے کہ تم صرف میرے قوانین کی خلاف ورزی کے تباہ کن نتائج سے ڈرو اور اِیَّایَ یعنی اس کے علاوہ کسی اور سے نہ ڈرو۔ اسی لیے تو کہا تھا کہ فَمَنۡ تَبِعَ هُدَایَ فَلَا خَوۡفٌ عَلَیۡهِمۡ وَ لَا هُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ (2:38) ان قوانین کا اتباع کرتے چلے جاو گے تو پھر کسی کا خوف اور حزن نہیں رہے گا۔ اور ان کا اتباع کرتے چلے جاؤ تو کیا پھر تمہارے دل کے اندر خدا کا خوف ہوگا؟ وہ تو اس صورت میں ہوگا کہ تم قوانین سے سرکشی برتو۔ ان کے جو فطری نتائج ہیں' ان نتائج کی تباہیوں کے احساس سے تمہارے اندر یہ چیز پیدا ہوگی۔ یہ ہے راہب' برادرانِ عزیز! کہا ہے کہ وَ اِیَّایَ فَارۡهَبُوۡنِ (2:40). لیجیے! آپ نے دیکھا کہ ایک احتیاط نے ساری دنیا کے خوف وحزن سے کس طرح سے مامون کر دیا۔ کیا کہا ہے اس کہنے والے نے؟ کہ

یہ ایک سجدہ جسے تُو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات

(اقبالؒ)

خدا کے قانون کی سرکشی کے نتائج کا خوف قوموں کو ہر قسم کی ذلت و رسوائی سے محفوظ رکھتا ہے

قوانینِ خداوندی کا اتباع اس خیال سے ہے کہ ان کی خلاف ورزی سے جو میری تباہی اور نقصان ہوگا' مجھے اس سے احتیاط برتنی

چاہیے' سرکشی نہیں برتنا چاہیے۔ اس ایک Feeling (احساس) سے دنیا بھر کی بڑی بڑی چوکھٹوں سے' انسان سرفرازی سے گزر جاتا ہے' کوئی خوف اور حزن اس کے اندر نہیں آتا۔ کہا ہے کہ یہ ہے قاعدہ۔ اے ذلت و مسکنت کے اندر پھنسی ہوئی قوموں! ہر دروازے کے اوپر جھکنے والو! اپنے آپ کو دنیا کی بے بس اور بے کس قوم سمجھنے والو! آؤ' اس معاہدے کو پورا کرو' ہم اپنا عہد پورا کریں گے۔ اس کے بعد ہمارے قوانین کی اطاعت کے علاوہ کسی اور کا خوف ہمارے اندر نہیں رہے گا اور جونہی کسی قوم کے دل سے خوف اترا' دنیا میں اس سے زیادہ بلندیوں کے اوپر کوئی قوم نہیں ہو سکتی' اس کے قوتِ بازو کا کوئی اندازہ نہیں کر سکتا ہے جس قوم میں خوف نہ رہے' ہم نے تین سال [1] پیشتر واہگہ کی سرحدوں پر ان کا مظاہرہ دیکھا تھا جن کے دل میں خوف نہیں رہا تھا۔ سر و سامان میں کمی تھی' تعداد میں بہت قلت تھی' حالات بہت زیادہ نامساعد تھے' دشمن سر پر چڑھ آیا تھا۔ وہ کیا ایک چیز تھی؟ یہ کہ خوف نہیں رہا تھا۔ خوف جو نکل جاتا ہے' تو وہ پوچھو نہیں' بکری شیر کو ڈھالیتی ہے' خوف نکل جاتا ہے وَ اِیَّایَ فَارْهَبُوْنِ (2:40)۔ قرآن نے کتنی بڑی بات کہہ دی ہے! کہ کسی سے خائف نہ ہونا' کسی سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ انسان کے برتاؤ (Behaviour) کے دو ہی تو جذبے ہوتے ہیں: جلبِ منفعت یا دفعِ مضرت۔

قرآنِ حکیم کی تعلیم انسان کو دو جذبوں سے روشناس کراتی ہے

برادرانِ عزیز! جس سے آدمی کی بنیادی وضروری Core Nerve دبتی ہے۔ وہ ہے' جلبِ منفعت' اور دفعِ مضرت۔ ایک میں لالچ ہے کہ اس سے مجھے یہ ملے گا' یہ ہے جلبِ منفعت اور دوسرا ڈر ہے کہ یہ اتنا نقصان پہنچا دے گا۔ یہ ہے دفعِ مضرت۔ دنیا کے اندر اپنے مقام سے گر جانے کے یہ دو ہی جذبے ہیں اور قرآنِ کریم نے بتایا ہے کہ ہمارے بندوں کی کیفیت یہ ہے کہ یَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّرَهَبًا (21:90)۔ جلبِ منفعت ہو' کسی سے فائدہ اٹھانے کی صورت ہو' تو بھی اور اگر کہیں سے اس قسم کے ڈر کی صورت ہو تو بھی' ان دونوں حالتوں میں' وہ ہمارے قانون کی طرف رخ کرتے ہیں۔ اب پہلے یہ بات کی کہ وہ جو عہد کیا ہے' اسے پورا کرو۔ آج وہ عہد کیسے پورا کریں؟ تورات وہ نہیں رہی' ان کے انبیاؑ سامنے نہیں ہیں' پریشان حال قوم' جن کا شیرازہ منتشر ہو چکا' مرکز ختم ہو چکا' خدا کی اصلی کتابِ راہنمائی بھی ان کے ہاں موجود نہیں ہے' عہد کیسے پورا کروں؟ کہا ہے کہ وَ اٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ (2:41) یہ جو ہم نے نازل کیا ہے' اس کی صداقتوں پر ایمان لے آؤ۔ عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ صاحب! یہ تو پھر کچھ بڑی' واوین میں کہتا ہوں' تنگ نظری سی ہے کہ یہ کہا جائے کہ صاحب! بس قرآن پہ ایمان لاؤ تو پھر تمہاری نجات ہو سکتی ہے۔ کیا یہ تنگ نظری نہیں ہے؟

---

[1] یہ 1965ء کی پاک و ہند جنگ کی طرف اشارہ ہے۔

نوعِ انسانی کے لیے کرہ ارض پر قرآنِ حکیم کی اہمیت

برادرانِ عزیز! قرآن نے بتایا یہ ہے کہ ہم نے دین حضرتِ نوحؑ سے لے کر رسول اللہ ﷺ تک‘ ہر نبی کو دیا اور جو دیا وہ ایک ہی دین تھا لیکن دنیا کی کسی قوم کے پاس خدا کی طرف سے یہ دیا ہوا دین‘ اپنی اصلی شکل میں باقی نہیں رہا۔ یہ دعویٰ بلا دلیل نہیں ہے۔ آج اس آسمان کے نیچے تمام مذاہبِ عالم میں سے کوئی مذہب ایسا نہیں ہے‘ جو یہ دعویٰ کرتا ہو یا اس کی شہادت بہم پہنچا سکتا ہو کہ ان کے پاس جو موجودہ آسمانی کتاب ہے‘ وہ حرفاً حرفاً وہی ہے‘ جو ان کے رسول کو ملی تھی۔ ان کے تاریخی اعترافات دیکھنے ہوں تو وہ میری جو کتاب ’’مذاہبِ عالم کی آسمانی کتابیں‘‘ ہے‘ اس میں دیکھیے۔ قرآنِ کریم دین کی طرف دعوت دے رہا ہے‘ انہیں بتا رہا ہے کہ تمہارے پاس وہ نہیں رہا۔ کہہ رہا ہے کہ کوئی نئی چیز میں نہیں لایا‘ یہ وہی دین ہے جو تمہیں دیا گیا تھا‘ تمہارے پاس نہیں رہا۔ اس کی طرف دعوت دینے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ کوئی ہماری اپنی چیز ہے‘ جسے ہم بیچ رہے ہیں‘ ہم یہ کہہ رہے ہیں کہ ’’کمہیاری اپنا بھانڈہ سلونڈی اے ❶۔‘‘ یہ بات نہیں ہے۔ ’’اے اپنا تے پرایا بھانڈہ ای نئیں ہیگا ❷‘‘ یہ تمام نوعِ انسانی کے لیے اسی خدا کی طرف سے ملا ہوا ایک دین ہے‘ اسے Accept (قبول) کر لو وہ عہد نامہ پورا ہو جائے گا۔

برادرانِ عزیز! اب سوال یہ ہے کہ اس کی خصوصیت کیا بتائی ہے؟ یہ کہ **مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ** (2:41)۔ اس کے یہ معنی کیے جاتے ہیں کہ جو کچھ تمہارے پاس ہے‘ یہ اس کی تصدیق کرتا ہے۔ ان معانی سے تو بات متضاد ہوگئی۔ جو اس وقت تمہارے پاس ہے‘ یہ اگر اس کی تصدیق کر رہا ہے‘ تو پھر اس کو کیوں نہیں ماننا۔ یہ تو اس کی تصدیق کرتا ہے‘ اسے تم مان ہی رہے ہو‘ پھر یہ نئی دعوت کاہے کی ہے؟

قرآن حکیم کے نزدیک موجودہ انجیل اور تورات اپنی اصل شکل میں موجود نہیں ہیں

یہ ایک دوسری غلط نگہی ہے کہ قرآن ان موجودہ انجیل اور تورات کی تصدیق کرتا ہے کہ یہ سچی کتابیں ہیں۔ آپ آگے چل کر دیکھیں گے کہ قرآن قدم قدم پہ یہ کہہ رہا ہے کہ ان میں تحریف ہو چکی ہے‘ تبدیلی ہو چکی ہے‘ وہ تمہارے پاس باقی نہیں رہیں‘ جو کچھ تم خدا کا کہہ کر پیش کرتے ہو‘ وہ خدا کا نہیں ہے۔ ایک طرف تو قرآن یہ کہے اور دوسری طرف یہ کہے کہ جو کچھ تمہارے پاس ہے‘ میں اس کی تصدیق کرتا ہوں‘ سوچیے! یہ تو تضاد ہو گیا۔ ’’مصدق‘‘ کے یہ معنی نہیں ہیں۔

---

❶ کمہاری اپنے برتن کی ہی تعریف وستائش کرتی ہے۔

❷ یہ اپنا پرایا برتن ہی نہیں ہے۔

بات یہاں کہی تھی کہ جو وعدہ تم سے کیا تھا' وہ ہم پورا کریں گے۔ صدق کے معنی ہوتا ہے ''کسی بات کو سچا کر کے دکھا دینا'' مصدق کے معنی ہوتا ہے ''کسی دعوے کو سچا کر کے دکھانے والا''۔ وہ جو ہم نے وعدہ کیا تھا' وہ جو ہم تم سے کہتے تھے کہ یہ کرو تو یہ کچھ مل جائے گا' یہ وہ ضابطۂ خداوندی ہے جو تمہارے اس دعوے کو سچا کر کے دکھا دے گا۔ اہلِ مذاہب میں سے دنیا کی ہر قوم' اس انتظار میں بیٹھی ہوئی تھی کہ آج تو ہماری یہ حالت ہے' اس کے بعد ایک وقت آئے گا کہ جب پھر ہمارا غلبہ ہوگا' یہ دین ہے جو دنیا کے اندر چلے گا' سرفرازیاں نصیب ہوں گی۔ اس نے کہا ہے کہ یہ کچھ تو تم مانتے چلے آ رہے ہو' آج بھی تمہارے ہاں یہ عقیدہ موجود ہے' تم اسی انتظار میں بیٹھے ہوئے ہو۔ یہ جو چیز تم خواب کی طرح لیے چلے آ رہے ہو' اس خواب کی تعبیر تمہارے سامنے ہو جائے گی۔ اگر تم اس کے اوپر ایمان لے آئے تو تمہاری یہ توقعات' یہ امیدیں' یہ آرزوئیں' یہ خواہشیں' یہ ساری کی ساری' قرآن سچ کر کے دکھا دے گا۔ یہاں ''معکم'' کہا ہے کہ جو خود تم آرزوئیں لے کر بیٹھے ہوئے ہو' جو خود دنیا کے سامنے دعوے کر رہے ہو کہ اس کے بعد تم نے دیکھنا کہ کس طرح سے ہمارا یہ دین غالب آتا ہے۔ اس نے کہا کہ یہ اس چیز کو سچ کر کے دکھا دے گا۔ تو کسی کو اور کیا چاہیے کہ جو آرزوئیں دل میں لے کر وہ بیٹھے ہوئے ہوں اور وہ آرزوئیں سچی نہ ہو رہی ہوں اور ایک آ کر یہ کہہ دے کہ اس نے میرا کوئی کام نہیں چھوڑا ہوا' مجھے کچھ محتاج نہیں ہے یہ جو تم دل میں لیے بیٹھے ہو اور پورا نہیں ہو رہا' میں اسے پورا کر کے دکھا دوں گا اور جو اس کا بھی ساتھ نہ دے اس سے زیادہ احمق تو کوئی نہیں ہو سکتا۔ کہا ہے کہ اس بات کا یقین کرو کہ یہ کروں گا اور پھر تم وہ ہو جو اس انتظار میں بیٹھے ہوئے تھے کہ تمہیں یقین تھا کہ اس کے بعد یہ ہوگا۔ میں یہ کہہ رہا ہوں کہ اس کے ذریعے سے ہوگا تو اس لیے وَ لَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۢ بِهٖ (2:41) ارے! اس سے یہ لوگ تو انکار کریں جن کو اس کا نہ یقین' نہ امید' نہ کوئی آرزوئیں ہیں' او! تم یہ سب کچھ کرتے ہوئے' تمہیں تو سب سے پہلے اس سے انکار کر دینا چاہیے۔

عزیزانِ من! یہ کیا بات ہوئی ہے؟ عقل دانش کا تقاضا تو یہ تھا کہ اس قسم کی آواز آتی تو سب سے پہلے تم لپک کر اس کی طرف بڑھتے۔ ارے! یہ کیا دانش و بینش ہے کہ تمہی سب سے پہلے اس کا انکار کرتے ہو۔ کیوں انکار کرتے ہو؟ بس! یہ آ گئی دکھتی ہوئی رگ کہ ''یہی ہوتا چلا آیا ہے''۔ آج بھی یہی ہو رہا ہے۔

خدا کی طرف جانے والے راستے میں کون لوگ حائل ہیں؟ مذہبی پیشوائیت کے متعلق قرآن حکیم کا ارشاد

عزیزانِ من! آج بھی آپ کی قوم میں ہر طرف سے یہ آواز اٹھتی ہے کہ قرآن کی طرف آ جاؤ' خدا کی طرف آ جاؤ' دین کی طرف آ جاؤ' یہ سنورے گا' وہ بنے گا۔ Back to Quran (مراجعت الی القرآن) کے یہ سارے نعرے بلند ہو رہے ہیں' کوئی نہیں آتا بلکہ کوئی نہیں آنے دیتا۔ یہ کون ہیں' جو نہیں آنے دیتے؟ دو لفظوں میں بات بتا دی کہ وَ لَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا (2:41) یہ جو تم

نے مذہب کو اپنا Profession (پیشہ) بنا رکھا ہے، کمائی کا ذریعہ بنا رکھا ہے، یہ چیز تمہیں اس طرف نہیں آنے دیتی۔ خدا کے دین کے راستے میں، برادرانِ عزیز! جب اور جہاں بھی، خدا کی طرف سے یہ دین آیا اور اس کا داعی کھڑا ہوا، سب سے پہلے مذہبی پیشوائیت نے اس کی مخالفت کی حالانکہ یہ وہی دعوت دے رہا تھا جس دعوت کو یہ اپنے اپنے ہاں پکارتے چلے آ رہے تھے۔ یہ پکارنا کیا تھا؟ بس یہ دوسروں کو دھوکا دینا تھا کہ ہم خدا کے نام کی تبلیغ کر رہے ہیں، دین کا پرچار ہو رہا ہے اور یہ ان کو معلوم تھا کہ اگر خدا کا دین آ گیا تو یہ جو ہم اس وقت دین فروشی کر رہے ہیں، یہ باقی نہیں رہے گی۔ یہی بنی اسرائیل تھے جن کی انتہائی تباہی کے زمانے میں ایک دمِ مسیحاؑ [1] آیا جس نے آ کر کہا کہ آ ؤ!

اگر یک قطرہ خوں داری اگر مشتِ پرے داری
بیا من باتو آموزم طریقِ شاہبازی را

اگر آج ایک بھی خون کا کوئی قطرہ تم میں باقی ہے، مٹھی بھر بھی باقی ہے، تو آ ؤ! میں تمہیں بتاؤں کہ تم آزادی کی فضائے بسیط میں کیسے اڑ کر جا سکتے ہو۔

بنی اسرائیل کے کاہنوں کی خفیہ میٹنگ کی رپورٹ

اس قومِ بنی اسرائیل سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے یہی کہا تھا اور آپ کو معلوم ہے کہ پھر کاہنوں نے اندر جا کر جو مشورہ کیا تھا، وہ کیا تھا؟ مشورہ یہ کیا تھا کہ بھئی! بات تو ٹھیک کہتا ہے لیکن آج تو ہماری حالت یہ ہے کہ ہمارا یہ جو موجودہ حاکم ہے، یہ ہمارے معاملے میں دخل نہیں دیتا، اسٹیٹ سیکولر ہے اور ہمارا بھی جو اختیارات کا دائرہ ہے، ہم اس میں آزاد ہیں۔ ان کے الفاظ سنیے گا کہ ''اگر کل کو اس کا بتایا ہوا دین غالب آ گیا تو پھر ہمیں روٹی مانگ کر کھانی پڑے گی [2]۔'' انہوں نے اندر یہ مشورہ کیا اور باہر آ کر یہ چیز کہی کہ تم خدا کے دین کی توہین کرتے ہو، تم اس کے اس ٹیمپل کی توہین کرتے ہو، اس توہین کے لیے تم پہ مقدمہ چلایا جائے گا۔ انہوں نے کفر کا فتویٰ دیدیا کہ مرتد کی سزا قتل ہے۔ اس لیے اسے پھانسی دیدیجیے۔ قرآن کریم نے کہا ہے کہ **وَ لَا تَشْتَرُوْا بِاٰیٰتِیْ ثَمَنًا قَلِیْلًا** (2:41)۔ **ثَمَنًا قَلِیْلًا** کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ''تھوڑے پیسے نہ لیا کرو، بہتے لیا کرو'' قرآن نے دوسرے مقام پہ کہا ہے کہ ان طریقوں سے دنیا کی جتنی بڑی متاع بھی تم لے لو گے، وہ مستقبل کے مقابلے میں ہمیشہ ثمنِ قلیل ہوگی۔ ہم تمہیں دیتے ہیں: **اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّ فِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً** (2:201) ایک طرف یہ متاع ہے، دوسری طرف تمہاری یہ متاع ہے کہ چار دن کے بعد تمہاری یہ متاع ختم ہو جائے گی۔ بتاؤ اس کے مقابلے میں یہ متاعِ قلیل ہے یا نہیں؟ یہ معنی ہیں **ثَمَنًا قَلِیْلًا** کے۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ کن چیزوں کے لیے قیمت لیتے ہیں؟

---

[1] یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف اشارہ ہے۔

[2] ان نکات کی مزید تفصیل کے لیے دیکھیے ''انجیل برناباس کی فصل ص-142''

مجھے کسی مذہبی فرد کی تنقید مقصود نہیں لیکن نماز پڑھنے کے بعد اس کا معاوضہ کیسا؟

برادرانِ عزیز! عجیب تماشا ہے۔ میں کسی فرد کی تنقیص نہیں کیا کرتا۔ یاد رکھیے! جب میں مذہبی پیشوائیت کہا کرتا ہوں' تو اس سے مقصود افراد نہیں ہوتے' آپ کے ہاں Priest-Hood (پیشوائیت) کا Institution (ادارہ) ہے۔ اس سے مقصود وہ ہوتا ہے۔ غیر دینی پیشوائیت کا یہ ادارہ ہوتا ہے۔ سوچیے! یہ کس چیز کے پیسے مانگتے ہیں؟ اس کے کہ نماز کا وقت ہو گیا' نمازی جمع ہیں' مسلمانوں نے وہاں نماز پڑھنی ہے' ان میں ایک شخص مسلمان نماز پڑھنے کے لیے آتا ہے' اس کی عزت کرتے ہیں کہ صاحب! آپ ذرا آگے بڑھ جائیے' اس نے باقیوں کی طرح اپنی نماز پڑھنی ہے۔ یہ ان سے زیادہ عزت کے مقام پہ کھڑے ہو کر اپنی نماز پڑھتا ہے' نماز پڑھنے کے بعد کہتا ہے: ''سٹو پیسے''۔ اوئے! ''اوکوئی ساڈا کم کرن آیا ہیگا[1] سیں!!! برادران عزیز! سوچنے کی بات ہے کہ کیا تم نے یہ نماز نہیں پڑھنی تھی' تم نے ہماری خاطر کوئی اور دو چار رکعتیں زیادہ پڑھی ہیں ''جیہدے پیسے منگن ڈیا ہویا ایں[2]۔ ''او ہم نے بھی پڑھی' تم نے بھی پڑھی' اپنی نماز تھی جو تم نے پڑھی'' کہن لگا: نئیں! سٹ پیسے[3]''۔ کہا کہ یہ ہے وہ چیز جو تمہیں نکلنے نہیں دیتی' اس طرف آنے نہیں دیتی۔ اس میں یہ چیز نہیں ہوگی' وہاں اپنی نماز پڑھ کر پیسے نہیں لینے ہوں گے' جس طرح سے یہ محنت کرتے آئے ہیں' اسی طرح سے تمہیں محنت کرنا پڑے گی۔ ''ایتھے ای تے موت پیندی اے[4]'' قرآن نے اس طبقے کو مترفین کہا ہے' قرآن نے سرمایہ داروں کو اور مذہبی پیشوائیت کو ایک کیٹگری (شق) میں رکھا ہے۔

قرآن حکیم کے نزدیک مترفین کی کیٹیگری (شق)

عزیزانِ من! عجیب بات ہے حالانکہ بظاہر نظر آتا ہے کہ صاحب! یہ تو بیچارے کنگلے سے ہوتے ہیں' ان کے پاس سرمایہ کہاں؟ سوال سرمائے کا نہیں ہے۔ کوئی شخص جو خود محنت نہیں کرتا' دوسرے کی محنت کی ہوئی میں سے اپنی پرورش کرتا ہے' وہ مترفین میں داخل ہے' وہ سرمایہ دار ہے۔ وہ محنت نہیں کرتا۔ کتنی دکھتی ہوئی رگ پکڑ لی قرآن نے! بات سامنے آ گئی ہے تو یوں کیوں جائیں۔

جو کچھ میں نے کہا ہے' عرض کروں' الفاظ میرے ہوتے ہیں' آیتیں قرآن کی ہوتی ہیں۔ کہا ہے کہ یہ قرآن اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ -

---

[1] رقم ادا کرو۔ ارے بھئی! کیا تم کوئی ہمارا کام کرنے آئے تھے!!!

[2] جس کے پیسے مانگ رہو ہو۔

[3] کہنے لگا کہ نہیں' رقم ادا کرو۔

[4] یہیں تو نہیں موت پڑتی ہے۔

فِیۡ کِتٰبٍ مَّکۡنُوۡنٍ ۙ لَّا یَمَسُّہٗۤ اِلَّا الۡمُطَہَّرُوۡنَ . تَنۡزِیۡلٌ مِّنۡ رَّبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ (56:78-79) ہے۔ کہا ہے کہ اَفَبِہٰذَا الۡحَدِیۡثِ اَنۡتُمۡ مُّدۡہِنُوۡنَ (56:81) ارے سوچو تو سہی کہ یہ اس قسم کی کتاب ہے اور تم اس سے پھسلتے ہو' سوچو تو ذرا! Contrast (تقابل) دیکھیے! کتنی باعظمت کتاب گنائی گئی ہے' اس سے پھسلتے ہو! آگے یہ بات ہے کہ وَتَجۡعَلُوۡنَ رِزۡقَکُمۡ اَنَّکُمۡ تُکَذِّبُوۡنَ (56:82) اور اس کی تکذیب اس لیے کرتے ہو کہ تمہیں چار روٹیاں مل جائیں۔ قرآن ہے' عزیزانِ من! کہتا ہے کہ پھر آپس میں تمہاری کیفیت یہ ہے کہ روز لٹھم لٹھا ہوتے رہتے ہو' ایک دوسرے کے خلاف کفر کے فتوے لگاتے ہو' مسجدوں پہ تمہارے تالے پڑ جاتے ہیں' مقدمے بازیاں ہوتی ہیں' قتل تک کی بھی نوبت آ جاتی ہے لیکن جب کبھی اس کے مقابلے میں کوئی قرآن یا دین کی بات آتی ہے' عقل و فکر کی بات آتی ہے' سمجھ سوچ کی بات آتی ہے' انسانیت کی بات آتی ہے' یہی تمہارے غلط معتقدات جو تم ایک کو جھٹلاتے ہو' انہی کی بنا کے اوپر تم اس کے خلاف ایک جتھہ بن جاتے ہو۔ آپ کو معلوم ہے کہ ہر پروفیشن والے آپس میں تو ایک دوسرے کے رقیب ہوتے ہیں اور جونہی اس پروفیشن کے خلاف کوئی Agitation (مظاہرہ) ہو' وہ سارے پروفیشن والے اکٹھے ہو جاتے ہیں' وہ پھر یونین بن جاتی ہے۔

باہمی اختلافات کے تحت الگ الگ شریعت کو ماننے والے بھی اپنے پروفیشن پر آنچ نہیں آنے دیتے

کیا بات ہے قرآن کی! کہا ہے کہ مَّوَدَّۃَ بَیۡنِکُمۡ فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا (29:25) حضرتِ ابراہیمؑ ان سے کہہ رہے ہیں کہ پتھر کے بت تم بھی جانتے ہو کہ ان کی حیثیت کیا ہے' ہم بھی جانتے ہیں' لوگوں کو دھوکا دیتے ہو کہ صاحب! ہم خدا کے نمائندے سمجھ کر ان کی پرستش کر رہے ہیں۔ کہا ہے کہ تمہیں بتاؤں کہ تم سب اس سے کیوں چمٹے ہوئے ہو' جب کہ آپس میں سر پھٹول کی یہ کیفیت ہے لیکن جب اس کے خلاف میں نے آواز اٹھائی ہے تو مَّوَدَّۃَ بَیۡنِکُمۡ فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا (29:25) اس دنیاوی زندگی کے مفاد کے لیے تم جتھہ بنا لیتے ہو' ان کی وجہ سے تمہارے لیے آپس میں ملنے کی یہ ایک Force (قوت) ہو جاتی ہے۔ اٹھو! اس کے اس مذہب کے خلاف' یہ شریعتِ حقہ کے خلاف بتا رہا ہے' یعنی ہر ایک کی شریعت الگ الگ ہے لیکن جونہی کوئی اس پروفیشن (پیشے) کے خلاف اٹھا ہے تو کہتے ہیں کہ شریعت کے خلاف ہے' اسلام کے خلاف ہے' سلفِ صالحین کے خلاف ہے حالانکہ سلفِ صالحین میں سے یہ ان کے اسلاف کو گالیاں دیتے ہیں' وہ اُن کے اسلاف کو گالیاں دے رہے ہوتے ہیں لیکن جونہی کوئی دین کی بات لے کر اٹھے مَوَدَّۃَ بَیۡنِکُمۡ فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا (29:25) دنیاوی زندگی کے مفاد کے لیے تم نے ان چیزوں کو آپس میں Cementing Force (قوتِ اتصال) بنا رکھا ہے' کہتا ہے کہ تمہارے ان معتقدات کی یہ حیثیت ہے وَ لَا تَلۡبِسُوا الۡحَقَّ بِالۡبَاطِلِ وَ تَکۡتُمُوا الۡحَقَّ وَ اَنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ (2:42) نگہداشت کرنی ہے' اطاعت کرنی ہے' ساتھ رہنا ہے' تو ہمارے قوانین کے ساتھ رہو۔

کس حیثیت سے ساتھ رہو؟ یہ جتنے بھی مذہب کا نام لینے والے ہیں، یہ سارے کہتے ہیں، ہم خدا اور رسول کے حکموں پہ چل رہے ہیں، ان میں سے یہ کوئی بھی تو انکار نہیں کرتا۔ کہا ہے کہ تمہاری کیفیت یہ ہے کہ جونہی تمہارا مفاد آتا ہے تو تم کرتے کیا ہو؟ **وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَ تَكْتُمُوا الْحَقَّ وَ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ** (2:42) کیا بات ہے! کہتا ہے کہ تم جانتے ہو کہ اصلِ دین کیا ہے، خدا کا فرمان کیا ہے، قرآن کیا ہے۔ پہلے تو تمہاری کوشش ہوتی ہے کہ اس کو چھپا ہی لو، ظاہر ہی نہ ہونے دو، اس چھپانے کے بڑے طریقے ہیں۔ اس تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔

نکاح کے وقت نکاح فارم پر لکھی جانے والی آدھی آیت کیوں؟

یہ ایک بڑا دلچسپ موقع آیا کرتا ہے، ان کے ہاں تو یہ مسئلہ ہے کہ ایک مرد کو اجازت ہے کہ ایک دو تین چار شادیاں کرتا چلا جائے۔ اس کی تائید میں قرآن کی ایک آیت پیش کی جاتی ہے، نکاح کے وقت اس آیت کو دہرایا جاتا ہے یعنی وہ جو بیچارہ پہلی دفعہ اس لڑکی کے ساتھ شادی کرنے آئے، اس کے کان میں یہ پھونکا جاتا ہے۔ نکاح نامے کے فارم کے اوپر قرآن کی ایک آیت لکھی ہوئی ہوتی ہے [1]۔ میں اس وقت صرف ایک چھوٹی سی مثال بطور اتمامِ حقیقت دے رہا ہوں۔ قرآن کی آیت ہے کہ **وَ اِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْيَتٰمٰى** (4:3) اگر تم میں وہ عورتیں ہوں کہ جن کے لیے شادی کا سامان نہیں، بیوہ ہوں، بڑی لڑکیاں ہوں، بچے ان کے ساتھ رہ جائیں، معاشرے میں یہ کیفیت پیدا ہو جائے کہ کہیں ان کے مسئلے کا کوئی منصفانہ حل نہ ملتا ہو، تو کہا ہے کہ وان (4:3)۔ یہ شرطیہ جملہ ہے کہ If یعنی جب یہ صورت ہو یا اگر یہ صورت ہو تو...... یہ ذرا سی عربی ہی نہیں، اردو جاننے والا بھی جانتا ہے کہ یہ شرطیہ جملہ ہوتا ہے، اس کے بعد ہوتا ہے تو پھر تم یہ کرو۔ اگر قوم میں کہیں ایسی Situation (صورتِ حال) Arise (پیدا) ہو جائے تو پھر اس مسئلے کے حل کے لیے اس کی اجازت دی جاتی ہے۔ اگر اسٹیٹ (ریاست) یہ سمجھے تو یہ اجازت ہے کہ ان بے کسوں، بے بسوں، لاسہارا کو گھروں کے اندر یوں آباد کر دے۔ بہر حال یہ آیت اور یہ بات جب آئے گی، اس وقت میں عرض کروں گا۔ میں کہہ یہ رہا تھا کہ یہ پوری آیت یوں ہے کہ **وَ اِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْيَتٰمٰى فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ** (4:3)۔ آگے دو تین اور چار شادیوں کی آیت ہے۔ آپ حیران ہوں گے کہ نکاح نامے کے فارم پر جو لکھا ہوا ہوتا ہے اس میں یہ "**اِنْ خِفْتُمْ**" کا پہلا ٹکڑا نہیں ہوتا، وہ آیت **فَانْكِحُوْا مَا طَابَ** (4:3) سے شروع کر دی جاتی ہے یعنی جملہ شرطیہ کے اندر وہ شرط والا فقرہ نہیں لکھا ہوتا۔ میں کہتا ہوں کہ تحریر یا عبارت کے اعتبار سے بھی آپ دیکھیے۔ کوئی آٹھویں جماعت کا لڑکا اس سے فقرہ شروع کر کے، اگر اتنا لکھ آئے، تو ماسٹر سارا کاٹ دے، زیرو نمبر دے، کہے گا

---

[1] یہ آج کل لکھی ہوئی نہیں ہوتی۔

کہ ارے! تم نے اگر سے شروع کیا' پہلے اگر کہے گا تو جملہ آخر میں آئے گا۔ آپ حیران ہوں گے کہ یہ جو آیت نکاح کے وقت پڑھتے ہیں' وہ بھی یہاں سے شروع کرتے ہیں: فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ (4:3)۔ یہ آیت نکاح نامے میں یوں لکھی ہوئی ہوتی ہے: فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ (4:3) اور وَ اِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا (4:3) کو انہوں نے چھپا ہی ڈالا ہے۔

قرآنی آیات کو چھپا کر حق کو باطل کے ساتھ ملا دیا جاتا ہے

یہ تو آپ کو چھوٹی سی بات کہی ہے۔ کیا بتاؤں' کیا کیا آیات چھپائی ہوئی ہیں! اس طرح سے یہ چھپتی نہیں ہیں' کوئی نہ کوئی بات باہر آ ہی جاتی ہے کہ گویہ وَ لَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ (2:42) کہا گیا ہے' حق و باطل کی تلبیس سے منع کیا گیا ہے مگر یہ التباسِ حق و باطل کر ہی دیا جاتا ہے۔ یہ التباس کیا لفظ ہے؟ عربی زبان ہے۔ اختلاط بھی ایک لفظ تھا۔ خلط اس وقت کہتے ہیں جیسے اونٹوں میں بھیڑیں شامل ہو جائیں۔ وہ بھی مل جاتی ہیں تو وہ تو ایک سیکنڈ میں آپ ان کو الگ کر سکتے ہیں۔ التباس ہوتا ہے جیسے دودھ میں پانی مل جاتا ہے' جو یوں ملایا ہوا ہو' اسے اختلاط کہتے ہیں۔ قرآن بالکل ٹھیک ہے صاحب' اجی صاحب! پھر قرآن کی آیت تو یہ کہتی ہے؟ کہ جی! وہ مثلہ معہ ایک اور بھی چیز ہے' قرآن کی مثل قرآن کے ساتھ ہے۔ ابھی میں نے اس دن یہ عرض کیا تھا کہ قرآن کہتا ہے کہ اگر تم اس دعوے میں سچے ہو کہ خدا کی کتاب نہیں ہے تو اس کی مثل لاؤ۔ یہ ایک چیلنج تھا اور آج بھی ہے۔ اس کے علی الرغم ہمارے ہاں یہ مثلہ معہ کا عقیدہ ہے۔

قرآن حکیم کی تفسیر کو قرآن حکیم کی بجائے فقہ اور اپنی روایات کی روشنی میں پیش کرنے کا نتیجہ

اب آیا وہ مثلہ معہ کا تصور۔ قرآن کی آیت تبرکاً اوپر لکھ دی' اس کی ساری تفسیر' جتنی بھی ہے' وہ ساری جناب! پہلے روایات سے اور پہلوں نے جو روایت سے تفسیر لکھی' پھر اس کے بعد اس تفسیر سے کی۔ آج کسی شخص سے ان کے ہاں جا کر آپ کوئی مسئلہ دریافت کر لیجئے' قرآن کی کوئی آیت' سند کے اندر نہیں پیش کی جائے گی۔ کہا جائے گا کہ فقہ میں یوں آیا ہے' اسلاف کی تفسیروں میں یہ فرمایا گیا ہے' روایات میں یہ لکھا ہے۔ بھئی! یہ تو قرآن کی آیت کے صریحاً خلاف جا رہا ہے تو اس پر کہا جاتا ہے' صاحب! پہلی چیز تو یہ ہے کہ یہ بھی تو قرآن جانتے تھے' اب تم سے تو بہتر ہی جانتے ہوں گے۔ بھئی! قرآن کہتا ہے کہ پہلے مرنے والے کی وصیت پوری کرو' پھر یہ ترکے کی تقسیم کرو۔ تم کہتے ہو کہ وارثوں کے حق میں وصیت جائز ہی نہیں ہے' اور جو جائز ہے' وہ ایک تہائی سے زیادہ نہیں ہے یہ بات تو قرآن کی آیت کے خلاف جاتی ہے۔ کہتا ہے کہ جی' ایک روایت آئی ہے جس میں کہا ہے۔ کیا کہا ہے؟ کہ یہ آیت منسوخ ہو گئی ہوئی ہے۔ چل بھئی! نہ رہے بانس' نہ بجے بانسری۔

ہمارے ہاں کیے جانے والے وعظوں کی نوعیت

اس کے بعد آپ کے ہاں کے یہ سارے قانونِ شریعت' آپ کی تفسیریں' آپ کے ہاں کے یہ وعظ' یہ سارا التباسِ حق و باطل ہے۔

قرآن کی آیت اس کے بیچ میں آتی ہے' سننے والے یہ سنتے ہیں کہ صاحب! واقعی انہوں نے قرآن وحدیث سے بڑے مسئلے بیان کیے۔ اس میں قرآن کا کچھ نہیں ہوتا۔ یہ سب التباس ہے۔ التباس کا یہ کیا لفظ قرآن لایا ہے! **وَلَا تَلۡبِسُوا الۡحَقَّ بِالۡبَاطِلِ وَ تَكۡتُمُوا الۡحَقَّ** (2:42)۔ یہاں کون ہیں جن سے یہ کہا جا رہا ہے؟ اگلے ٹکڑے میں یہ بات واضح کر دی۔ ایک تو عوام ہیں' بیٹھے ہوئے بیچارے سن رہے ہیں' ان کو پتہ نہیں ہوتا۔ **وَ اَنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ** (2:42) تم تو جانتے ہو کہ قرآن اس میں کیا کہتا ہے اور تم ان کو کیا بتا رہے ہو۔ **وَاَنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ** (2:42) کے ساتھ ہی 44ویں آیت بھی ملا لیجیے اور پھر کیفیت یہ ہے کہ **اَتَاۡمُرُوۡنَ النَّاسَ بِالۡبِرِّ وَ تَنۡسَوۡنَ اَنۡفُسَكُمۡ** (2:44) منبر پہ کھڑے ہوئے تمہارا وعظ سنیں تو ساری تلقین ان کو کیے چلے جا رہے ہو' سارے وعظ ان کے لیے ہیں اور تمہاری اپنی جو زندگی ہے' اس کے اوپر ان کا اطلاق ہی نہیں ہوتا۔ آج بھی آپ دیکھتے ہیں' منبر ہی نہیں' اسٹیجوں کے اوپر مسلمانو! قرآن کے سانچے میں اپنی زندگیاں ڈھال لو' تم اگر یہ کر لو گے تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا' ''میتوں نہ کچھ کہنا[1]''، تم قرآن کے سانچے میں اپنے آپ کو ڈھالو' قرآن کی طرف آؤ' اپنے اخلاق بلند کرو' یہ خرابی ہے' اس کو چھوڑو' یہ عیب ہے اس کو چھوڑو' تم چھوڑو اور اس کے ساتھ ہمیں بھی چھوڑ دو' یہ بھی چھوڑو۔ کہا ہے کہ **اَتَاۡمُرُوۡنَ النَّاسَ بِالۡبِرِّ** (2:44)۔ یہاں الناس کہا ہے۔

انسانی جذبات اور عقلِ انسانی کا باہمی تعلق اور قرآن حکیم کی راہنمائی

یہاں عجیب بات ہے! عوام سے تو یہ تلقین کی جا رہی ہے مگر **وَ تَنۡسَوۡنَ اَنۡفُسَكُمۡ** (2:44) اپنے آپ کو پسِ پشت رکھا جاتا ہے ''نسیا'' کے معنی ''بھلانا ہی نہیں ہوتا' پسِ پشت ڈال دینا ہوتا ہے۔'' اور اس کے بعد کہا ہے کہ یہ کچھ کیوں ہو رہا ہے؟ مفاد پرستی کے جذبات ہیں' جن کی رو سے یہ کر رہے ہیں۔ آپ دیکھیے ان کی کس چیز کو قرآن نے یہاں اپیل کیا ہے۔ **اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ** (2:44)۔ اور دین نہیں' اور کچھ نہیں' تو عقل سے ہی کام لو۔ کیا کسی کی عقل کسی کو یہ سکھاتی ہے کہ دوسرے سے یہ کہے کہ بھئی! آگے نہ جانا' پانی ڈوبو ہے اور آپ چلا جا رہا ہو۔ وہ کہتا ہے کہ اس میں کوئی دین کا' کوئی شریعت کا' کسی رسول کا' کسی جبریل کا' سوال ہی نہیں کہ تم اتنا اونچا جا کر کہو۔ وعظ میں کہتے چلے جانا کہ سنکھیا بڑا مہلک ہوتا ہے' بالکل نہ کھانا اور آپ پھانکتے چلے جانا۔ اسمگلنگ نہ کرو' ناجائز کمائی نہ کرو' رشوت نہ دو' یہ چیزیں نہ کرو اور خود یہ سب کچھ کرتے چلے جانا کہ سب کچھ تم کرو' چھوڑو کہ خدا کیا کہتا ہے' رسول کیا کہتا ہے' دین کیا کہتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ عقل سے پوچھو کہ اگر یہ چیزیں واقعی اتنی بری تھیں جیسی تم ان سے کہہ رہے تھے' تو تم جو کرتے ہو تو اب یہ بری نہیں رہیں؟

کہا ہے کہ **اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ** (2:44)۔ کیا بات ہے' برادرانِ عزیز! کرو کیا؟ دیدیا پروگرام' وہی جو پہلے ہی صفحے میں دیا تھا۔ کہا

---

[1] مجھے کرنے کے لیے کچھ نہ کہنا۔

ہے کہ اتنی سی بات کرنے کی ہے کہ وَ اَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتُوا الزَّکٰوۃَ (2:43). یہاں یہ کہا ہے۔ ایک ہی آیت کے بعد پھر 45ویں آیت بھی ملا لیجیے۔ کہا ہے کہ تمہاری حالت بڑی بے بسی کی ہے' کس مپرسی کی ہے' بیچارگی کی ہے' کوئی تمہارا والی وارث نہیں' کوئی تمہارا مددگار نہیں ہے' دوسروں کو مدد کے لیے پکار رہے ہو' کبھی اس آستانے پہ مدد کے لیے جاتے ہو' کبھی اُس آستانے پہ مدد کے لیے سر جھکاتے ہو۔ او! ادھر جو ذلت اور خواریوں میں جا رہے ہو' تو سنو! وَ اسۡتَعِیۡنُوۡا بِالصَّبۡرِ وَ الصَّلٰوۃِ (2:45)۔ آؤ! تمہیں ہم بتائیں کہ مدد کہاں سے ملے گی اور یہ جو باہر کی مدد کے پیچھے جا رہے ہو تو اس کا بھروسا کیا ہے' "اپنے اندر نظامِ خداوندی قائم کرو اور استقامت سے اس کے اوپر جم جاؤ" یہاں سے تمہیں مدد ملے گی۔

نوعِ انسانی کی سرفرازی کے لیے صلوٰۃ اور زکوٰۃ' دینِ خدوندی کے دو اہم ستونوں کی اہمیت اور افادیت

برادرانِ عزیز! اب تو آپ جانتے ہیں کہ اقامتِ صلوٰۃ کے معنی کیا ہوتے ہیں' اب تو آپ نے یہ سمجھ لیا کہ اس کے ساتھ صبر کی کیوں تلقین ہوئی ہے اور یہ بھی آپ کو پتہ ہے کہ صبر کے معنی "او پنجابی دا صبر نئیں کہ اچھا! میرا صبر شکر بھئی [1]!" یہ انتہائی بیچارگی کا نام صبر ہوتا ہے "میرا صبر ہی پئے تینوں [2]" یہ نہیں ہے۔ یہ استقامت ہے کہ کسی خطرے کے مقابلے میں پاؤں میں ذرا لغزش نہ آنے دینا۔ اسے صبر کہتے ہیں۔ یہ Balanced Personality (متوازن شخصیت) ہے۔ میں نے آپ کو بتایا تھا کہ کشتی جب پانی میں ڈولتی ہے تو ایک طرف ایک بڑا سا پتھر رکھ دیتے ہیں تاکہ اس کے وزن سے اس کا توازن قائم رہے۔ یہ جو بڑا سا پتھر رکھا جاتا ہے' جس سے ڈولتے ہوئے دلوں کا توازن قائم رہتا ہے' اسے صابورہ کہتے ہیں' یہاں سے ہی لفظ صبر آیا ہے یعنی لغزش نہ آنے پائے۔ اس نظام کو قائم کرو: وَاَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ (2:43)۔ پھر اس سے کیا کرو' نظام قائم کر لیا' اندر کی درستگی بھی ہو گئی' بس کیا یہ مقصود بالذات ہے؟ کہا ہے کہ نہیں! اتوا الزکوٰۃ بھی کرو۔

سارے دین کے دو ہی ستون ہیں' برادرانِ عزیز! اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ۔ دین کے بھی یہ دو ہی ستون ہیں اور مذہب کے فریب کے بھی یہ دو ہی ہیں۔ دین کے اندر صلوٰۃ ایسا نظام ہے کہ جس میں افرادِ معاشرہ قوانینِ خداوندی کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے جائیں۔ چل لیا پیچھے' کیا مقصودِ بالذات ہے یہ چیز؟ کہنے لگے کہ نہیں! اس کے لیے اٰتُوا الزَّکٰوۃَ (2:43) بھی ہے۔ لفظ زکوٰۃ کے معنی ہیں "سامانِ نشوونما یعنی Growth اور Development کے لیے جو کچھ چاہیے" زکیٰ کے معنی ہوتا ہے "کسی کی Growth" اس قسم کے نظام کے قائم کرنے سے مقصود یہ ہے کہ وہ جو ابتدا میں تم نے کہا تھا کہ اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ (1:1) ربوبیتِ عالمینؑ

---

[1] وہ پنجابی زبان والا صبر نہیں ہے کہ اچھا بھئی! میرا تو صبر اور شکر ہی ہے۔

[2] میرے صبر کرنے کی ہی تجھے مار پڑے۔

تمام نوعِ انسانی کو سامان نشو ونما بہم پہنچانا۔ وہ خدا براہِ راست نہیں پہنچایا کرتا' وہ بہم پہنچایا کرتا ہے' اس نظام کی وساطت سے' جو اس کے قوانین کے تابع متشکل ہوتا ہے۔ اسے کہیے اَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ (2:43) اور اس کے بعد اٰتُوا الزَّکٰوۃَ (2:43) پوری نوعِ انسانی کو سامانِ نشو ونما دیتے چلے جاؤ۔ سب سے پہلے اپنے معاشرے میں' پھر اسے پھیلایئے' اس کو باہر لے جایئے اور آگے بڑھتے چلے جایئے اور آگے بڑھتے چلے جایئے۔ یہ ایتائے زکٰوۃ ہے۔ عزیزانِ من! اس پروگرام کی یہ کتنی اہم دو شقیں ہیں جن سے یہ کہا ہے کہ تمہاری ذلت و مسکنت دور ہو جائے گی' تمہیں اقوامِ عالم میں سرفرازیاں نصیب ہو جائیں گی' تم سر اٹھا کر چلنے کے قابل ہو جاؤ گے' تمہارے دل میں کسی کا خوف نہیں رہے گا' کوئی حزن نہیں رہے گا۔

ہمارے ہاں صدیوں سے صلٰوۃ اور زکٰوۃ کا مروجہ مفہوم اور اس کا نتیجہ

اتنے بڑے نتائج جس چیز سے پیدا ہونے ہیں' وہ قرآن نے دو ہی بتائی ہیں: صلٰوۃ اور زکٰوۃ۔ آج ان کا مفہوم ہے نماز' اور یہ جو اڑھائی فیصد دیا جاتا ہے' وہ ہے زکٰوۃ۔ میں کوئی تنقید نہیں کر رہا' میں صرف پوچھتا یہ ہوں کہ قرآنِ کریم نے یہ جو نتائج بتائے ہیں' کیا ان دونوں سے یہ نتائج مرتب ہو رہے ہیں۔ سوچنے کا مقام ہے کہ پھر اس کے بعد دو ہی باتیں آئیں گی کہ یا تو (معاذ اللہ) یہ جو قرآن نے کہا تھا کہ اس کا یہ نتیجہ نکلے گا' یہ بات غلط کہی تھی (معاذ اللہ)' یہ تو کوئی بھی تسلیم نہیں کرے گا تو دوسری بات یہ ہوگی کہ جس چیز کا نام ہم نے صلٰوۃ و زکٰوۃ رکھا ہے' یہ وہ نہیں ہے۔ ڈاکٹر نے آپ کو ایک مکسچر بنا کر دیدیا۔ اس کے بعد یہ کہا کہ تین گھنٹے کے بعد بخار اتر جائے گا۔ تین گھنٹے کے بعد بخار نہیں اترا' سوچنے کے لیے کھڑے ہو جاؤ گے' کوئی تو یہ کہے گا کہ ''نہیں اوئے اوڈاکٹر ای ایہو جیا ہیگا' اوایویں ٹلی شٹلی ماردیندا' اے پیسے کھٹن واسطے پئی تیناں گھنٹیاں دے بعد بخار اتر جائے گا❶''۔ یعنی ڈاکٹر کی حذاقت کے متعلق یا تو آپ کو یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ وہ ڈاکٹر ٹھیک نہیں' کسی اور کے پاس جاؤ اور یا یہ چیز ہوگی کہ یار! پتہ لے لؤ دوائیاں ٹھیک تھیں' یہ وہی تھا جو کچھ اس نے لکھ کر دیا ہے۔ پھر اس کے بعد یہ آیا کرتا ہے کہ صاحب! آج کل کیا پوچھتے ہو' لیبل باہر کیا لگا ہوا ہوتا ہے اور اندر دوائی کچھ اور ہوتی ہے اور یہ کہ یہاں وہ دوائیاں بنتی ہیں جو اصلی ہوتی نہیں ہیں۔ عام طور پر آپ کی توجہ ادھر جائے گی کہ یہ دوائی وہ نہیں ہے۔ وہ کہیں گے لیبل کے اوپر لکھا ہوا ہے' شیشی کے اوپر نام لکھا ہوا ہے' وہ کہتا ہے کہ شیشی پہ نام ہی لکھا ہوا ہے' اندر وہ دوائی نہیں رہی۔ برادرانِ عزیز! یہ صلٰوۃ و زکٰوۃ کی شیشیوں پہ نام لکھے ہوئے ہیں' اندر دوائیاں وہ نہیں ہیں۔

ملتِ اسلامیہ کی زبوں حالی کے پیشِ نظر ''جاوید نامہ'' میں اقبالؒ کی زبانی ایک اہم سوال

میں نے کہا ہے کہ میں تنقیص نہیں کر رہا' یہ Logical Conclusion (منطقی نتیجہ) ہے کہ اگر یہ چیز وہ نتائج نہیں پیدا کر رہی' تو یا تو

---

❶ نہیں بھئی! وہ ڈاکٹر ایسا ہی تھا۔ وہ تو یونہی انٹ شنٹ کرتا ہے' اس نے محض پیسے بٹورنے کے کہہ دیا کہ تین گھنٹے بعد بخار اتر جائے گا۔

اسے مانیے جو وہ ''جاوید نامہ'' میں دھڑلے سے کہہ دیا تھا'۔(بات یہ تھی کہ) اقبالؒ (1877-1938) نے افغانی سے آسمانوں کے اوپر سوال کیا تھا کہ یہ جو سارا کچھ ہے' یہ وہ نتائج نہیں پیدا کر رہا تُو مجھے بتا' یا ''مسلماں مرد یا قرآن بمرد!'' مجھے بتاؤ کہ ان دونوں میں سے کونسی بات ہے[1]؟ یہ بڑا دھڑلے کا سوال ہے' کرنا بھی چاہیے۔ باہر کی قومیں یہ سوال کر رہی ہیں۔ جب بھی آپ یہ کہتے ہیں کہ یہ اسلام تو وہی ہے جو خدا نے دیا تھا تو اس کے بعد وہ کہتے ہیں کہ پھر تمہاری یہ حالت ہے' تو پھر اسلام میں یہ صلاحیت نہیں ہے کہ وہ تمہیں زندہ قوموں کی صف میں کھڑا کر دے۔ لامحالہ وہ اسی نتیجے پہ پہنچیں گے۔

ملت کی یہ ذلت و مسکنت اقبالؒ کے الفاظ میں عجمی اسلام کی طرف سے ملنے والی دوائی کے استعمال کا ہی نتیجہ ہے

بات یہ ہے' عزیزانِ من! شیشی بھی وہی ہے' لیبل بھی وہی ہے' نام بھی وہی ہیں' جو دوائیاں ہیں وہ Made in Pakistan (ساختۂ پاکستان) ہیں۔ یہ وہ چیز ہے' جسے اصطلاح میں اقبالؒ 'عجمی اسلام' کہا کرتا تھا یعنی عجم میں بنا ہوا اسلام کا لیبل۔ کھائے چلے جائیے' پھانکے چلے جائیے' وہ کونین ہی نہیں ہے' بخار اترے گا کیسے' صرف لکھا ہوا ہے کونین۔ عزیزانِ من! یہ چیز ہمارے ساتھ ہوگئی تھی۔ بات تو لمبی ہو جائے گی اور درس کا وقت ہے کہ نکلا جا رہا ہے لیکن میں چونکہ صلوٰۃ کے متعلق پہلے کہہ چکا ہوں کہ یہ ایک اجتماعی نظام ہے' انفرادی چیز نہیں' یہ ایک نظام ہے' جس میں پورا معاشرہ خدا کے قوانین کے پیچھے چلے گا' صلوٰۃ ہر سانس میں صلوٰۃ ہے' مسجد کے اندر بھی صلوٰۃ ہے' مسجد کے باہر بھی صلوٰۃ ہے' زندگی کے ہر سانس میں صلوٰۃ ہے۔ باقی رہی زکوٰۃ تو اس وقت تو یہ ہے کہ ''بے حد و نہایت آپ دولت جمع کرتے چلے جائیے' اس پہ کوئی پابندی نہیں ہے'' صاحب! اور ''سال کے بعد اس میں سے اڑھائی فیصد نکال دیجیے باقی پاک صاف ہے۔ اور اس اڑھائی فیصد میں بھی' اگر آپ تشریح میں جائیں' تو یہ ان کارخانوں میں سے نہیں نکالنی پڑتی۔'' آمزدور و بیچارا جنے ٹوکری ڈھوہ کے کڑی واسطے کوئی 52 روپیاں دی ٹونباں بنایاں ہویاں ہوندیاں نا[2]'' تو یہ باون روپے کی چاندی کے زیور پہ

---

[1] ''جاوید نامہ'' کے حصہ ''فلکِ عطارد'' میں ''زندہ رود'' نے جمال الدین افغانی (1897-1838ء) سے سوال کیا تھا کہ

رفت سوز سینۂ تاتار و کُرد　　یا مسلماں مُرد یا قرآں بمرد!

تاتاریوں اور کردوں کے سینوں کا سوز ختم ہوگیا۔ اب یا تو مسلمان مر گیا یا پھر قرآن مر گیا (مراد یہ ہے کہ وہ تاتاری اور کُرد نسل کے مسلمان جو کبھی اسلام کی خاطر ہر تگ و دو کرتے تھے۔ اب ان میں وہ لگن کیوں ختم ہوگئی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یا تو مسلمان بے عمل ہوگیا یا قرآنِ کریم کا پیغام باقی نہیں رہا' ذرا بتا تو سہی)

[2] یہ مزدور بیچارہ ہے کہ جس نے اپنی بیٹی کے لیے ٹوکریاں اٹھا اٹھا کر' کوئی 52 روپے کے (چاندی کے) زیور بنائے ہوتے ہیں۔

اڑھائی فیصد' یہ زکوٰۃ لاؤ۔ آپ کو پتہ ہے کہ یہ جو ساڑھے باون تولے چاندی ہے' اس کے اوپر زکوٰۃ ہوتی ہے۔ غریب اور سرمائے دار میں چھوٹا فرق دیکھیے۔ جو سونا ہے وہ تو ساڑھے سات تولے ہونا چاہیے' یعنی یہ ساڑھے باون تولے چاندی' سو' سوا سو روپے کی ہوگئی' غریبوں کے پاس ہوتی ہے' سونا اگر سات ہی تولے لے لیا جائے تو وہ بھی کم از کم کتنے روپے کا ہو جاتا ہے۔ آپ ہی بتا دیجیے' میں نے تو نہ کبھی بیچا' نہ خریدا۔ آپ نے دیکھا کہ کتنا فرق ہے اور آگے بڑھتے چلے جائیے انکم ٹیکس تو بڑھتا چلا جاتا ہے۔ یہ گھٹتی چلی جاتی ہے۔ اتنا دیدیجیے' کسے دیدیجیے' خدا کو دیدیجیے' بھئی! یہ ٹیکس' نہیں ہے! وہ قیصر کا ہے' وہ حکومت کے خزانے میں جائے گا' یہ صاحب! خدا کو دینا ہے۔ حکومت کی طرف سے تو چالان ملتا ہے' وہاں جا کر جمع کرنا پڑتا ہے' یہ کسے دیدیجیے؟ کہ جی! آ ڈاک خانہ جو بیٹھا ہویا ہیگا اے ساہنوں دیدیو اسی پہنچا دیاں گے' کہ جی او پیسے دتے سن تہانوں' پہنچ گئے جی' کیس طراں؟❶ '' کہ جی وہ قبولیت ہوگئی ہے بارگاہِ خداوندی میں۔'' او پوسٹ ماسٹر وی چٹھی رسان نوں پچھدا ہیگا پئی دستخط وکھا اوہدے جنوں دے کے آیا ایں منی آرڈر۔ کہ جی اے معاملے اللہ نال ہوئے❷ ۔''

ہم صدیوں سے سیکولر نظام میں مسلمان بھی ہیں اور نمازی بھی

عزیزانِ من! سوچیے کہ آپ کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ وہ کہہ رہا ہے کہ اس سے استعانت طلب کرو' اس ذلت و مسکنت میں سے نکلنا ہے تو وَ اَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتُوا الزَّکٰوۃَ (2:43) کرو۔ تو یہ آپ کے ہاں نہ دینے والوں کو تو چھوڑیئے' نمازیں پڑھنے والے' زکوٰۃ دینے والے اب بھی کروڑوں کی تعداد میں ہیں اور آپ کے ہاں کی یہ ذلت و مسکنت روز بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ آپ کو پتہ ہے کہ قرآن نے کیا کہا ہے؟ یہ صلوٰۃ اور یہ زکوٰۃ اس وقت تو آپ کے ہاں کی یہ صورت ہے' ہندوستان کا مسلمان سیکولر حکومت کا محکوم' نماز بھی پڑھتا ہے' زکوٰۃ بھی دیتا ہے' انگریزوں کی محکومی میں ہم نماز بھی پڑھتے تھے' زکوٰۃ بھی دیتے تھے' اب بھی دنیا کی کسی مملکت کے اندر بھی اگر دہریوں (Atheists) کی حکومت ہے' وہ بھی یہ کہتے ہیں کہ اس کی اجازت ہے' روس بھی یہ کہتا ہے کہ صاحب! ہمارے ہاں نمازوں کی بھی اجازت ہے' زکوٰۃ بھی دیتے چلے جائیں' بگڑتا کیا ہے؟ یعنی یہ چیز وہ ہے کہ جس کے لیے ضرورت ہی نہیں ہے کہ آپ کی اپنی حکومت ہو تو آپ یہ کریں۔

صلوٰۃ اور زکوٰۃ کے سلسلہ میں ایک اسلامی مملکت کا فریضہ

اسی زکوٰۃ کے متعلق سنیے! کہ قرآن کہتا ہے کہ اَلَّذِیۡنَ اِنۡ مَّکَّنّٰہُمۡ فِی الۡاَرۡضِ (22:41) یہ وہ لوگ ہیں' یہ جماعتِ مومنین ہے

---

❶ یہ جو ڈاک خانے میں بیٹھا ہوا ہے (کہتا ہے کہ) ہمیں دو' ہم پہنچا دیں گے۔ کہا کہ جناب! وہ جو رقم آپ کو دی تھی' کیا وہ پہنچ گئی؟ کس طرح پہنچے؟

❷ وہ پوسٹ ماسٹر بھی ڈاکیے سے پوچھتا ہے کہ جسے تُو وہ منی آرڈر دے کر آیا تھا' اس کے وصولی کے دستخط دکھاؤ۔ (مگر یہ) کہتے ہیں کہ جی! یہ تو (ہمارے) اللہ کے ساتھ معاملات ہیں۔

کہ جب ان کی ملک کے اندر حکومت قائم ہوئی۔ان کی جب حکومت قائم ہوئی تو پھر کیا ہوگا؟ کہا ہے کہ **اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتَوُا الزَّکٰوۃَ** (22:41) پھر یہ اقامتِ صلوٰۃ کریں گے' پھر یہ حکومت زکوٰۃ دے گی۔سوچ رہے ہیں آپ کہ یہ پھر کیا سے کیا ہوگیا۔اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کے لیے یہ تمکن فی الارض شرط ہے۔یہ شرط ہے کہ اس قوم کی اپنی حکومت ہو پھر یہ جو حکومت ہے' یہ زکوٰۃ دے گی۔ یعنی وہ بات بھی غلط ہے کہ صاحب! یہ جو حکومت کا ٹیکس ہے وہ زکوۃ بن جاتی ہے' اس کا سوال ہی نہیں ہے۔یہ تو آپ کے ہاں کی اسلامی حکومت کا فریضہ ہے۔کیا فریضہ ہے؟ کہ وہ سارے انسانوں کو سامانِ نشو ونما بہم پہنچائے اور یہ تو اپنی حکومت میں ہی ہوسکتا ہے۔اسلامی حکومت کے متعلق یہ کہا ہے کہ پہلے دن ان کا یہ اعلان ہوگا کہ **نَحْنُ نَرْزُقُکُمْ وَ اِیَّاھُمْ** (6:151) ہم تمہارے اور تمہارے بچوں کے رزق کی ذمہ داری لیتے ہیں۔

عزیزانِ من! بجلی کے فیل ہوجانے کی وجہ سے دو تین منٹ کا درس ریکارڈ نہیں ہوسکا لیکن چونکہ اس سلسلہ کو ہم اگلے درس سے مسلسل لے رہے ہیں' اس لیے ان الفاظ کے ریکارڈ نہ ہونے سے درس پر کوئی اثر نہیں پڑے گا' اس کے لیے آئندہ اتوار کے درس کا آپ انتظار کیجیے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ

❀......❀......❀

سولھواں باب: سورۃ البقرۃ (1)' (آیات 46 تا 48)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَاَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ﴿٤٦﴾ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿٤٧﴾ وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿٤٨﴾

عزیزانِ من! سب سے پہلے تو آج مجھے ایک معذرت چاہنا ہے کہ میں بھی اس فلو (Flu) کا شکار ہوں' گلا خراب ہے' نزلہ زکام ہے' کوشش کرونگا کہ آواز صاف بھی رہے اور آپ تک پہنچ بھی جائے' تھوڑا سا آپ کے کانوں کا تعاون چاہتا ہوں۔

آج ستمبر 1968ء کی 15 تاریخ ہے اور ہم اپنے درسِ قرآنِ کریم کے سلسلۂ نو میں سورۃ البقرۃ کی ابتدائی آیات میں چل رہے ہیں۔ سابقہ درس میں 45ویں آیت تک ہم آئے تھے۔ بات ادھوری رہ گئی تھی' پہلے اسی کو ہم آگے چلاتے ہیں۔ میں نے عرض کیا تھا کہ قرآنِ کریم کا انداز یہ ہے کہ وہ ایک دعویٰ پیش کرتا ہے' ایک قانون پیش کرتا ہے' ایک اصول دیتا ہے اور پھر اس کے ثبوت کے لیے تاریخی شواہد پیش کرتا ہے۔ دعویٰ اس نے یہ کیا تھا کہ جو قوم قوانینِ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرے گی' اسے زندگی کی سرفرازیاں اور شادابیاں حاصل ہو جائیں گی' جو ان قوانین کی خلاف ورزی کرے گی وہ ذلت اور خواریوں کے عذاب میں مبتلا ہو جائے گی۔ اس دعوے کی صداقت کی شہادت کے لیے اس نے بنی اسرائیل کی قوم کی تاریخ کو پیش کیا۔ ان سے کہا کہ تم دیکھو جس زمانے میں تم وحیٔ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرتے تھے' کتنے انعاماتِ خداوندی تھے جن سے تم نوازے گئے اور ان میں سب سے بڑی اہم یہ چیز تھی کہ تمہیں اپنی ہم عصر اقوام پر افضلیت حاصل ہو گئی تھی۔ جب تم نے ان قوانین کو چھوڑ دیا تو اس کے بعد تمہاری کیفیت یہ ہے کہ جہاں جاتے ہو ذلت اور مسکنت سائے کی طرح تمہارے پیچھے لگی رہتی ہے۔

خدا کے قانون میں تو ابدی مایوسی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا

اس کے بعد یہ کہا کہ یہ ابدی مایوسی نہیں ہے کہ بس اب تم ہمیشہ کے لیے راندۂ درگاہ ہو گئے' یہ چیز کسی کے ساتھ بھی نہیں ہوتی۔ اور ضمناً یہیں سے وہ بات بھی حل ہو جاتی ہے' اگرچہ اسکی تفصیل میں' میں کبھی بعد میں جاؤں گا۔ وہ بات یہ ہے جو ہمارے ذہنوں میں یونہی غلطی سے سمایا ہوا چلا آ رہا ہے کہ یہودیوں کی حکومت کبھی قائم نہیں ہو سکتی۔ یہ سوال ہی نہیں کہ دو تین ہزار سال پہلے کسی قوم کی کوئی پہلی نسل کسی قسم کی خرابیوں میں الجھ جائے' خدا کی نعمتوں سے محروم ہو جائے تو پھر آنے والی جو نسلیں ہیں' ان کے لیے اس کا امکان ہی نہ رہے کہ وہ اچھے کام کرنے سے اچھے نتائج پیدا کر سکیں' می نہ سزد خدائے را۔ یہ تو ہر Generation (نسل) جس قسم کے کام کرے گی' ان کے نتیجے وہی آئیں گے۔ وہ قوم جب تک اسی قسم کی روشِ زندگی پہ رہے گی وہی نتیجے ہونگے' جب اس روش کو چھوڑ دے گی دوسری روش اختیار کر لے گی' اس کے مطابق نتائج سامنے آنے شروع ہو جائیں گے۔ اسی لیے ان کو قرآن کے نزول کے زمانے میں یہ کہا کہ اب بھی کچھ بگڑا نہیں ہے' تم اپنے اس وعدے کو پورا کرو جو خدا کے ساتھ تم نے کیا تھا یعنی وحی کا اتباع کرو۔ خدا اپنے وعدوں کو پورا کر دے گا یعنی ان اچھے اعمال کے صحیح نتائج برآمد ہوں گے۔

برادرانِ عزیز! اب اس کے بعد کہا تھا کہ آؤ تمہیں بتائیں تمہاری یہ نکبت اور زبوں حالی' یہ ذلت اور پستی' یہ مسکنت پھر کس طرح سے مبدل بہ عروج ہو سکتی ہے' کس طرح پھر تمہیں زندگی کی وہی شوکتیں اور سطوتیں حاصل ہو سکتی ہیں۔ اور اس کے لیے اس نے پروگرام یہ دیا تھا کہ وَاسْتَعِينُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ (2:45) اس کے لیے تم اعانت طلب کرو۔ کس چیز سے؟ صلوٰۃ سے' بشرطیکہ استقامت کے ساتھ تم اس پر گامزن رہو۔ میں نے کہا تھا کہ یہ تو بہت بڑی بات سامنے آ گئی۔ ایک ایسی قوم کو جو اس زمانے میں بھی کم از کم ہزار ڈیڑھ ہزار سال سے موردِ عذاب چلی آ رہی تھی' تباہیوں میں مسلسل گرفتار چلی آ رہی تھی' دنیا کی ذلیل ترین قوم ہو چکی تھی' ہر قسم کے عروج اور سرفرازیوں کے نشانات ان سے مٹ چکے تھے' اس قوم سے کہا جا رہا ہے کہ اگر تم پھر اپنی پہلی پوزیشن کو حاصل کرنا چاہو' اگر پھر ان بلندیوں پہ پہنچنا چاہو تو اس کے لیے ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ ہے کہ تم نظامِ صلوٰۃ سے مدد حاصل کرو۔ صبر تو استقامت ہو گئی' یہ تو کوئی پروگرام نہیں' یہ تو ہے کہ اس پروگرام پر تم ثبات و استقامت سے گامزن رہو' پروگرام تو سارا الصلوٰۃ کا دیا ہے۔

سراپا قعرِ مذلت میں گری ہوئی قوم کے ہاتھوں ذلت آمیز گرفت

بات یہ سامنے آئی تھی کہ یہ الصلوٰۃ اگر ایسی چیز ہے' جس سے یہودیوں جیسی قعرِ مذلت میں گری ہوئی قوم پھر سے سرفرازیاں حاصل کر سکتی ہے تو پھر یہ کیا ہے کہ کم از کم ہزار برس سے مسلمان کی قوم تو اس صلوٰۃ پر اپنے زعم کے مطابق کاربند چلی آ رہی ہے اور ان کی حالت

یہ ہے کہ جنہیں یہ ذلیل ترین قوم یہودی کہتے تھے‘ اس ذلیل ترین قوم کے ہاتھوں سے یہ ذلیل ہو رہے ہیں۔ کل کا واقعہ ہے‘ ابھی تو ہمارا آنکھوں دیکھا واقعہ ہے کہ ایک دو ممالک صلٰوۃ کے پابند نہیں‘ ایک دو قومیں ایسی نہیں جن کا یہ ایمان ہے‘ پورے کی پورے عرب ممالک براہِ راست‘ ان کے ساتھ باقی ممالک بالواسطہ سہی‘ ان کی تائید و نصرت بھی ان کے ساتھ‘ قریباً سارے ممالکِ اسلامیہ‘ ان میں سے ان لوگوں کو چھوڑ دیجیے‘ جو نماز نہیں پڑھتے‘ بہرحال وہ بھی تو ان کے اندر شامل ہیں جو نماز کے پابند ہیں۔ عزیزانِ من! سوچنے کا مقام آ گیا کہ وہ یہودیوں سے یہ کہہ رہا ہے‘ بنی اسرائیل سے یہ کہہ رہا ہے کہ اپنی ذلت و مسکنت کے عذاب سے نکلنا چاہتے ہو تو صلٰوۃ کی طرف آ ؤ۔ اور یہاں ایک حقیقت ہمارے سامنے آ گئی کہ وہ قوم جسے ہم ذلیل ترین قوم سمجھتے تھے‘ اس نے ہمیں اس طرح سے ذلیل کر دیا۔ اور اس قوم کو کر دیا جو بہرحال اس صلٰوۃ کی ماننے والی ہے۔ میں نے عرض کیا کہ مقام بڑی گہری سوچ کا آ گیا۔ یا تو یہ (معاذ اللہ معاذ اللہ) کہ یہ جو کچھ کہا گیا ہے یہ صحیح نہیں ہے اور اس کا تو ہم تصور تک بھی نہیں کر سکتے **وَعۡدَ اللّٰہِ حَقًّا** (31:9) خدا کا ہر وعدہ حق ہے۔ اور اسی ایمان کے بعد تو ہم قرآن کو لے کر بیٹھے ہوئے ہیں‘ یہ ایمان نہ رہے تو پھر اس کی ضرورت ہی نہیں رہتی‘ نہ میرے کچھ کہنے کی‘ نہ آپ کے کچھ سننے کی۔ اور اگر یہ وعدہ سچا ہے تو پھر دوسری بات کہاں ہے جو کھوٹی ہے۔ وہ یہی چیز ہے‘ جسے وہ صلٰوۃ کہتا ہے۔ وہ یہ صلٰوۃ نہیں جسے ہم صلٰوۃ سمجھتے ہیں۔ آپ تیسرے نتیجے پہ پہنچ ہی نہیں سکتے۔ اور جب پہلی بات آپ کے ایمان کا جزو ہے‘ دوسری بات پھر یقینی اور حقیقی ہو گئی تو کیا کھڑے ہو کر یہ سوچنے کی بات نہیں ہے کہ ہم دیکھیں کہ پھر وہ صلٰوۃ‘ کیا کہتا تھا‘ آج وہ صلٰوۃ کیا ہو گئی۔ کونین نے اگر ملیریئے کو اتارنا ہے‘ یہ حقیقت ہے تو جس شیشی کو آپ کونین سمجھ کر استعمال کر رہے ہیں‘ اگر اس سے ملیریا نہیں اترتا تو آپ کو لامحالہ ماننا پڑے گا کہ شیشی کے اندر کونین نہیں ہے۔

قرآنی نظام صلٰوۃ کا قیام تو پہاڑ کی چوٹی پر چڑھنے کے مترادف ہے مگر ہمارا اندازِ فکر وہ نہیں

میں نے پچھلی مرتبہ بھی عرض کیا تھا کہ قیامِ صلٰوۃ اور ایتائے زکوٰۃ دو اہم ستون ہیں‘ یہی ہے دین‘ دین کا عملی نظام ہے۔ بہت بڑی حقیقت ہے۔ یہاں ایک اتنی سی چیز اور سمجھ لیجیے جو قرآن نے خود بتا دی۔ صلٰوۃ کے متعلق کہا ہے کہ **وَ اِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ** (2:45) یہ چیز جو ہم نے تمہیں کہی ہے بڑی گراں گزرنے والی بات ہے‘ بڑا مشقت طلب مرحلہ ہے۔ نظر آیا کہ یہ ایسی چیز ہے جس کے متعلق خود خدا نے یہ پروگرام دے کر کہہ دیا کہ یہ بڑی گراں گزرنے والی چیز ہے‘ بڑی مشقت طلب چیز ہے۔ ہماری نماز تو مشقت طلب نہیں ہے۔ یہ دلیل دیا کرتے ہیں صاحب! کہ نہیں صاحب! دیکھیے سردی کے موسم میں صبح پانچ بجے‘ تاروں کی چھاؤں میں‘ اٹھ کر ٹھنڈے پانی سے وضو کر کے‘ ایک شخص جو نماز پڑھتا ہے‘ وہ کتنی بڑی چیز ہے۔ ان سے کہا جاتا تھا کہ معاف فرمائیے یہ اس کی برکتیں اپنی

جگہ لیکن یہ فرمائیے کہ جس وقت' سردی کے موسم میں ہمارا یہ نمازی اٹھ کر گھر کی مسجد تک جا کر ٹھنڈے پانی سے صرف وضو کرتا ہے' اس وقت ہندوؤں کی عورتیں راوی سے نہا کر واپس آ رہی ہوتی ہیں۔ آپ لوگوں کا تو آنکھوں دیکھا واقعہ ہوگا۔

ہندوؤں کے ہاں اشنان صبح کا غسل ہے' پھر وہ ندی پہ دریا پہ جا کر' ان کی عورتیں اور وہ بھی اشنان کرتے تھے' کہیں وہ سمور پہنے ہوئے نہیں ہوتے تھے' وہی جو پتلی پتلی سی دھوتیاں تھیں گرمی ہو' سردی ہو' وہ دریا پر جا کر نہاتی تھیں اور انہوں نے سورج سے پہلے واپس آنا ہوتا تھا۔ اتنی سی چیز کہہ دینے سے تو یہ نہیں ہوسکتا کہ قرآن کا مطلب یہ ہے کہ یہ بڑی گراں گزرنے والی چیز ہے۔ عزیزانِ من! یہ تو ایک عادت ہے' صبح اٹھنے کی عادت بنا لیجیے' وہ گراں ہی نہیں گزرتی' اس کے لیے گراں گزرتا ہے' جس نے دس بجے اٹھنے کی عادت بنا رکھی ہو' اسے اگر پانچ بجے اٹھائیں گے تو وہ اسے واقعی گراں گزرے گا۔ جو عادتاً پانچ بجے اٹھتا ہے' اس کے لیے کوئی چیز گراں ہی نہیں ہوتی' یہ تو ایک عادت بنانے والی بات ہے۔ آپ کیا سمجھتے ہیں کہ قرآنِ عظیم اتنی بڑی بات کہہ کر کہ یہ ہے وہ پروگرام صلوٰۃ کا جس پروگرام سے بنی اسرائیل جیسی قعرِ مذلت میں گری ہوئی قوم پھر سے اپنی شوکتیں واپس لے لے گی' اس کے بعد کہے کہ یہ ہے گراں گزرنے والی بات۔ تو وہ ایسی بات نہیں کہے گا' جس کی اگر عادت پڑ جائے تو پھر وہ گراں ہی نہ رہے۔ بات کچھ اور تھی۔

قرآن حکیم نے جس صلوٰۃ کو مشقت طلب کہا ہے اس کے خدوخال تو کچھ یوں ہیں

صلوٰۃ کے متعلق سارے قرآن میں آتا چلا جائے گا اور آپ دیکھتے چلے جائیں گے کہ یہ کہتا کیا ہے۔ ایک فقرے میں پھر دہرا دوں جو پہلے میں کئی درسوں میں دہرا چکا ہوں' یہ ایک نظام ہے معاشرے کا' جس میں افرادِ معاشرہ قوانینِ خداوندی کے پیچھے پیچھے چلتے چلے جاتے ہیں' ہر فرد اتباعِ قوانینِ خداوندی کرتا جاتا ہے۔ مسجد کی نماز تو اس کی ایک Symbol (علامت) ہے' یہ صلوٰۃ مسجد کے اندر تو تھوڑے سے وقت کے لیے ہے' اور مسجد کے باہر زندگی کے ہر سانس میں ہوتی ہے' مرتے دم تک ہوتی ہے' سفرِ زندگی میں ہوتی ہے۔ یہ ٹھیک ہے جو کہا گیا ہے کہ نماز کسی جگہ بھی معاف نہیں ہوتی' معافی کا سوال ہی نہیں ہے۔ جیسے آپ کو کسی جگہ بھی سانس کی معافی نہیں دی جاسکتی کہ دو چار دن کے لیے آپ پہ یہ فریضہ ساکت کر دیا گیا ہے۔ یہ فرائض وہ ہیں جو ساکت ہوتے ہی نہیں ہیں' یہ سانس کی طرح مومن کے عروقِ حیات کے اندر چلنے والی چیز ہے' یہ معاف نہیں کیا جاسکتا' معافی ملے گی تو موت واقع ہوجائے گی۔ مومن نہیں رہے گا' جیسے انسان زندہ نہیں رہتا' اگر سانس نہ لے' مومن نہیں رہ سکتا اگر صلوٰۃ سے ایک لمحہ کے لیے بھی غافل ہوجائے۔ صلوٰۃ کے معنی ہیں ''زندگی کے ہر گوشے میں قوانینِ خداوندی کا اتباع کیے جانا'' اور چونکہ یہ اتباعِ قوانین ایک اجتماعی فریضہ ہے اس لیے صلوٰۃ اجتماعی فریضہ ہوا' انفرادی چیز نہیں ہے' اسی لیے اس کو نظام کہا گیا ہے۔ اقامتِ صلوٰۃ کے معنی ہی یہ ہیں کہ آپ نظام کو قائم کرتے ہیں۔

نظام صلوٰۃ کے تین پہلو نیز فحشا اور منکر کا مفہوم

یہ نظام کرتا کیا ہے؟ برادرانِ عزیز! اس نظام کی میں صرف دو تین چیزیں عرض کروں گا، جس سے پتہ چلے کہ قرآن نے جو کہا ہے کہ یہ بڑی گراں چیز ہے۔ وہ کیا ہے؟ پہلی پہچان تو اس کی یہ ہے کہ وَ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ (29:45) بہت اچھا! کیسے پتہ چلا کہ صلوٰۃ کی اقامت ہوگئی۔ کہا کہ اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْکَرِ (29:45)۔ یہ ذرا ''اِنَّ'' ملاحظہ فرمائیے۔ یہاں کہا ہے کہ یہ ایک یقینی بات ہے جو ہم کہہ رہے ہیں، اگر یہ نہیں ہے تو صلوٰۃ نہیں ہے، صلوٰۃ ہے تو یہ ہو کر رہے گا۔ کیا ہوگا؟ یہ فحشا اور منکر سے روک دے گی۔ عام طور پہ ہمارے ہاں فحشا کے معنی بے حیائی کر دیا جاتا ہے۔ عربوں کے ہاں اس کے معنی اس سے بہت آگے جاتے ہیں۔ ان کے ہاں فحش بنیادی طور پر بخل کو کہتے ہیں کہ سب کچھ خود سمیٹ کر رکھ لیا جائے، دوسروں کو اس میں سے کچھ نہ دیا جائے۔ اور یہ لفظ ان کے ہاں بعد میں اس لیے معیوب حرکات کے لیے بولا جاتا تھا کہ عربوں کے ہاں سخاوت، مہمان نوازی، دوسرے کو کچھ دینا، یہ بڑا ہی واجب التکریم ہوتا تھا، جس شخص میں یہ خوبی نہیں ہوتی تھی وہ اسے معاشرے کا ذلیل فرد سمجھتے تھے، اسی لیے بعد میں یہ جو لفظ جسے آپ فحش کہتے ہیں، یہ ان معنوں میں بھی استعمال ہونے لگا۔ بنیادی طور پر اس کے معنی یہ ہوتے ہیں۔ اور منکر ہر وہ شے ہے، جسے عقلِ فریب کار آپ کو آمادہ کرے کہ اپنے مفاد کی سوچو، تمہیں دوسروں کے سوچنے کی کیا پڑی ہوئی ہے۔ تو جو صلوٰۃ ہے، وہ ان چیزوں سے تم کو روک دے گی۔

صلوٰۃ کے قبول ہونے کا معیار اور اس کی محسوس شکل

آپ نے اب غور فرمایا کہ پہلی کسوٹی، پہلا Standard (معیار) یہ ہوگیا کہ یہ ایک ایسی چیز ہے، جو اس سے روک دے گی۔ اگر کسی کو روکتی ہے تو وہ سمجھ لے کہ اس کی نماز قبول ہے۔ اگر وہ یہ چیز نہیں کرتی تو اپنے آپ کو مغالطے کے اندر مت رکھیے کہ میں نے یہ فریضہ ادا کر دیا ہے۔ اور آگے چلیے۔ یہ تو ہوئی صلوٰۃ کہ وہ یہ کرے گی اور میں نے عرض کیا ہے کہ اس میں بنیادی چیز فحشا اور منکر کے اندر آجاتی ہے۔ عقلِ فریب کار جو انسان کو صرف بہبودِ خویش سمجھاتی ہے، بہبودِ غیر کی طرف نہیں آنے دیتی، یہ اس جذبے کو روک دے گی، یہ اس ذہنیت کو بدل دے گی۔ اسی لیے اس کے بعد اس نے کہا ہے کہ آؤ! تمہیں میں بتاؤں کہ جو مصلین ہیں، جو اس نظامِ صلوٰۃ کی پابندی کرتے ہیں، ان کی خصوصیات کیا ہوتی ہیں۔ اس کے لیے جہنم کا نقشہ سامنے لائیے۔ کہا ہے کہ تَدْعُوْا مَنْ اَدْبَرَ وَتَوَلّٰی (70:17) یہ اس کو آوازیں دے دے کر بلائے گی، جو قوانینِ خداوندی کے اتباع سے پیٹھ موڑ کر چل دیتا تھا، تَوَلّٰی یا اعراض برتتا تھا، گریز کی راہیں نکالتا تھا۔ اب برادرانِ عزیز! ایک تو وہ ہے کہ چھوڑ کر ہی الگ ہوگیا اور ایک وہ ہے، جو گریز کی راہیں نکال رہا ہے۔ پڑھتا ہے، صلوٰۃ قائم نہیں کرتا، اسے آوازیں دے دے کر جہنم بلا رہا ہے کہ اِدھر آؤ۔ یہ کون ہے؟ اس کی پہچان کے لیے کہا ہے کہ وَجَمَعَ فَاَوْعٰی

(70:18) دولت سمیٹتا تھا، جمع کرتا تھا اور اس کے بعد ایک ایسی میانی میں ڈال دیتا تھا کہ اس کا اگلا حصہ تو پہلے ہی بند تھا، اوپر کے منہ کو رسی سے کس کر باندھ دیتا تھا: اوْعٰی۔ قرآن نے تو انفاق کہا ہے۔ انفاق اس میانی کو کہتے ہیں، جس کے دونوں منہ کھلے ہوں، اوپر کا کھلا ہو کہ ڈالتے جائیے، نیچے کا کھلا ہو کہ نکلتا چلا جائے۔ آپ نے دیکھا کہ اس اوْعٰی کے اندر کس طرح سے انفاق کی خصوصیت ضد لے آیا ہے، قرآن بڑی عمدہ محسوس طریق سے بات سمجھاتا ہے: جَمَعَ فَاَوْعٰی (70:18)۔ انسان کیا کرتا ہے؟ قرآن کہتا ہے کہ اگر یہ صلوٰۃ کا اتباع نہ کرنے والا ہو، اس کو علیٰ حالہٖ چھوڑ دیا جائے تو یہ حیوانی سطح پر آ جاتا ہے۔ پھر اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا (70:19) اس کا یہ پیٹ ہی نہیں بھرتا، ہوس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ (102:1) یہ نہیں ہے کہ پھر جو ضروریاتِ زندگی ہیں، یہ اس تک اپنے آپ کو محدود رکھے۔ نہیں، ایک دوسرے سے بڑھنے کی ہوس ہے، تَكَاثُرْ ہے اور پھر یہ ہوس ایسی ہے کہ اس کا کنارا ہی کوئی نہیں ہے حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ (102:2) قبر تک پہنچ کر بھی یہ ریس ختم نہیں ہوتی۔ خُلِقَ هَلُوْعًا (70:19) یہ بہت تھڑدلا ہے، نیت نہیں بھرتی، پیٹ نہیں بھرتا۔ وَاِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا (70:20) ذرا سی تکلیف آتی ہے تو شور مچا دیتا ہے، واویلا مچا دیتا ہے۔ وَاِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًا (70:21) اور جب کچھ دولت حاصل ہو جاتی ہے تو پھر اس کو روک کر بیٹھ جاتا ہے۔ دیکھا، آپ نے انسان کا نقشہ! جو وحیٔ خداوندی کا اتباع نہیں کرتے، اپنے معاملات کو اپنی مفاد پرستیوں کے مطابق حل کرتے ہیں، کہتا ہے ان کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ انہیں پھر جہنم آوازیں دے دے کر بلاتی ہے۔ یہ ایک کیٹگری (شق) ہو گئی، انسانوں کا ایک گروہ ہو گیا۔ کہا ہے کہ اِلَّا الْمُصَلِّيْنَ (70:22) مصلین کی یہ کیفیت نہیں ہوتی۔

صلوٰۃ قائم کرنے والے مصلین کی پہچان

دیکھا برادرانِ عزیز! جس کا ترجمہ ہم نے نمازی کیا ہوا ہے، اس کی خصوصیت کیا بتائی جا رہی ہے کہ وہ یہ نہیں ہوتے۔ یہ! اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْكَرِ (29:45) کی کیسے تفسیر ہو گئی، کہ وہ ایسے نہیں ہوتے۔ یہ الْمُصَلِّيْنَ (70:22) الَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ (70:23) میں وہی صلوٰۃ دَآئِمُوْنَ ہے، یہ وقتی ہنگامی چیز نہیں ہے، یہ تو ایسی چیز ہے جس کو دآئمًا چلنا ہو گا اور پھر آگے بات صاف کر دی کہ وَالَّذِيْنَ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ - لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ (70:24-25) یہ وہ لوگ ہیں، جن کے مال میں، ہر اس شخص کا حق ہے، جس کی اپنی ضروریات، اپنی محنت سے پوری نہیں ہوتیں یا جو کمانے کے قابل ہی نہیں رہا۔ ان کی ضروریات پورا کرنے کے لیے یہ نہیں ہے کہ یہ ان کو خیرات دیتے ہیں یا یہ ان کی مدد کرتے ہیں، بلکہ وہ ان سے as of right (بطورِ حق) ڈیمانڈ کر سکتے ہیں، یہ ان کا حق ہے اور حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ہے، ہر شخص کو اس کا علم ہے۔ یہ Provision

(گنجائش) مملکت کے آئین میں، قوانین میں ہونی چاہیئے، ہر شخص کو علم ہو کہ وہ as of right (بطورِ حق) لے سکتے ہیں۔ یہ ہیں صلوٰۃ والے یعنی مصلین۔ برادرانِ عزیز! تشریح کروں گا تو بات دور نکل جائے گی لیکن ایک نکتہ تو بیان کیے بغیر چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔

شرفِ انسانیت کے پیشِ نظر دوسروں کو دینے والوں کی ذہنی کیفیت کا ادراک

قرآن نے یہ جو نظام قائم کیا تھا، کہ معاشرے میں محتاج اور مسکنت والے ہوجاتے ہیں، ایسے واقعات پیش آجاتے ہیں تو ان کا تدارک ہے۔ اس نے دینے والوں کے متعلق تو یہ کہا کہ ان کی ذہنیت یہ ہونی چاہیے کہ **لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا** (76:9) ہم تم سے کسی قسم کا بدلا نہیں، بدلا تو ایک طرف، شکریے کے بھی متمنی نہیں ہیں۔ عزیزانِ من! کہا جا سکتا ہے کہ دینے والے کے اندر یہ Superiority (افضلیت) ایک جذبہ پیدا ہو جائے۔ یہ قرآن ہے عزیزانِ من! اور یہ مقام ہے جہاں آ کر نظر آتا ہے کہ کتنی عظیم کتاب ہے اور خدا ہی کی ہوسکتی ہے۔ دینے والے کے دل میں تو ذرا سا یہ جو جذبہ ہے، وہ ہوسکتا ہے، آپ نے کیریکٹر اونچا کرنا ہے۔ لینے والے کے دل میں اگر ذرا سا یہ خیال گزر جائے کہ مجھے میری مظلومیت کی وجہ سے یہ کچھ خیرات کے طور پہ مل رہا ہے، تو وہ شرفِ انسانیت سے گر جائے گا۔ یہاں لینے والے کو یہ کہا جاتا ہے کہ کہیں تیرے دل میں یہ خیال نہ پیدا ہو جائے کہ مجھے خیرات ملتی ہے، تو اپنا حق لے رہا ہے۔ دینے والا شکریہ تک کا متمنی نہیں، اس کے دل میں اس کا خیال ہی نہیں پیدا ہوتا، لینے والا اس طرح بطورِ حق کے مانگ رہا ہے۔

شرفِ انسانیت کا مقام کتنا بلند اور اس کو قائم رکھنے کا عمل کتنا کٹھن مرحلہ ہے

آپ نے قرآن سے دیکھا کہ شرفِ انسانیت کا احترام کتنا ہے اور برادرانِ عزیز! دین کی لم یہ ہے کہ جہاں کسی انسان کے شرف وتکریمِ آدمیت کو ٹھیس لگی، سمجھ لیجیے کہ دین کا پلہ ہاتھ سے چھوٹ گیا، کوئی نیکی باقی نہیں رہ سکتی۔ بات ہی شرفِ انسانیت کو برقرار رکھنے کی ہے۔ یہ کتنا نازک مقام تھا کہ دینے والا تو شکریئے کا بھی متمنی نہیں، چلو ٹھیک ہے۔ اس سے تو اس کے دل میں دہرا خیال گزر جانا چاہیے کہ صاحب! مجھے دے بھی رہا ہے اور اس کا کتنا بڑا احسان ہے کہ پھر شکریہ تک بھی مجھ سے نہیں مانگتا۔ اگر اس کے دل میں یہ خیال پیدا ہوگیا تو اس کا جو شرفِ انسانیت ہے وہ مجروح ہوگیا۔ وہ کہتا ہے کہ دل میں یہ خیال نہ کرنا، تُو حق لے رہا ہے، خیرات نہیں لے رہا۔ مصلین یہ ہوئے، برادرانِ عزیز! کہ جن کے مال میں **حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ۙ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ** (70:24-25) ہے اور یہ ہیں **وَالَّذِيْنَ يُصَدِّقُوْنَ بِيَوْمِ الدِّيْنِ** (70:26) یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے اس ایمان کو سچ کر کے دکھاتے ہیں کہ ہم یومِ دین کو مانتے ہیں۔

قرآنی صلوٰۃ کے یہ وہ مراحل ہیں جو عادتاً نہیں ہوسکتے

کیوں' عزیزانِ من! بات سمجھ میں آئی کہ صلوٰۃ کو لکبیرۃ [1] کیوں کہا گیا ہے!! یہ ہے مشقت طلب بات یا نہیں؟ یہ کرنے والا ہی جانتا ہے۔ یہ چیزیں عادتاً نہیں ہوسکتیں' یہ چیزیں تو بڑا دل گردہ چاہتی ہیں:

رستم سے کوئی کہہ دے سر تیغ تلے دھر دے

پیارے یہ ہمیں سے ہو ہر کارے و ہر مردے

قرآن کا مصلی سر تیغ تلے دھرنے والی بات ہے' برادرانِ عزیز! ''ہر کارے و ہر مردے'' یہ قرآن ہی کے پیچھے چلنے والا کرسکتا ہے' کوئی اور نہیں کرسکتا۔ نہ دینے والے کے اندر کی ذہنیت بدل سکتی ہے' نہ لینے والے کو کبھی یہ احساس ستا سکتا ہے کہ میرے شرفِ انسانیت کی تذلیل ہوگئی۔ یہ ہیں مصلین' برادرانِ عزیز! اس نظام کا نام نظامِ صلوٰۃ ہے۔ قرآن تو ہر چیز کو Contrast (تقابل) سے لاتا ہے۔ یہاں کہا ہے کہ مصلین کون ہیں۔

تکذیب دین کرنے والے مصلین کے متعلق قرآن حکیم کا ارشاد

دوسرے مقام پہ بتایا کہ آؤ' تمہیں بتائیں کہ ان کے مقابلے میں جو اپنے آپ کو نمازی کہتے ہیں' وہ کون ہوتے ہیں۔ کہا ہے کہ **اَرَءَیۡتَ الَّذِیۡ یُکَذِّبُ بِالدِّیۡنِ** (107:1) کیا تم نے اس کو بھی دیکھا ہے' جو دین کی تکذیب کرتا ہے۔ وہاں یہ تھا کہ وہ دین کی تصدیق کرتے ہیں اور یہ جو ابھی میں نے آیت تلاوت کی ہے' اس میں کہا ہے کہ یہ وہ مصلین ہیں جو دین کی تکذیب کرتے ہیں۔ کہا ہے کہ تم نے اس کو بھی دیکھا ہے جو دین کی تکذیب کرتا ہے۔ وہ بھی مصلی تھا' یہ بھی مصلی ہے۔ جس کا ذکر اب آرہا ہے۔ کہتا ہے کہ پہلی چیز تو یہ ہے کہ **فَذٰلِکَ الَّذِیۡ یَدُعُّ الۡیَتِیۡمَ ۔ وَ لَا یَحُضُّ عَلٰی طَعَامِ الۡمِسۡکِیۡنِ** (107:2-3) اس کی کیفیت یہ ہے کہ جو شخص معاشرے میں تنہا رہ جاتا ہے' جس کا کوئی پرسانِ حال نہیں ہوتا' یہ اس کا کوئی نہ ہونے سے ناجائز فائدہ اٹھاتا ہے۔ جس کے متعلق پتہ ہے کہ اس کے ساتھ کوئی ہے' اس پہ ہاتھ ڈالتے ہوئے ڈرتا ہے' جونہی اس کو احساس ہوتا ہے کہ اس کا کوئی نہیں ہے' پھر اس کو یہ بری طرح سے دھکے دیتا ہے۔ دین کی تکذیب کرنے والا آپ نے دیکھا۔ جس کی حرکت رک جاتی ہے' بجائے اس کے کہ اس کی پھنسی ہوئی گاڑی کو دھکا دے کر آگے چلائے' خود بھی کچھ نہیں کرتا' جو آ کر اس کی مدد کرنا چاہتا ہے' اس کو بھی روکتا ہے۔ کون ہیں یہ لوگ؟ **فَوَیۡلٌ لِّلۡمُصَلِّیۡنَ** (107:4) یہ بھی مصلین کی ایک قسم ہے' یہ اپنے طور پہ مصلین ہیں۔

---

[1] یہ اشارہ انھا لکبیرۃ (2:45) کی طرف ہے۔

کہا جائے گا کہ لفظ تو وہاں بھی یہی آیا تھا' لفظ یہاں بھی یہی آیا ہے' یہ دونوں میں امتیاز کیسے ہو گیا۔ امتیاز قرآن خود کرتا ہے۔ کہا ہے کہ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ (107:5) وہ صلوٰۃ کا مفہوم نہیں سمجھتے' اس کی طرف سے غافل ہیں' اس کی طرف سے لاپرواہ ہیں۔ اب دونوں میں پتہ چل گیا کہ فرق کیا ہے۔ یہ نمازی ہیں' مصلین کا لفظ تو یہ کہہ رہا ہے لیکن صلوٰۃ ہوتی کیا ہے' صلوٰۃ کرتی کیا ہے' اس سے کوئی غرض نہیں۔ پھر کرتے کیا ہیں' جس سے یہ خود اپنے آپ کو مصلین سمجھتے ہیں؟ کہا ہے کہ الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ (107:6) جو چیزیں نظر آتی ہیں' وہ کچھ کر کے آ جاتے ہیں۔ قیام ہے' رکوع ہے' سجود ہے' پاؤں میں اتنا فاصلہ ہے' ہاتھ یہاں تک اٹھ رہے ہیں' یہاں بندھ رہے ہیں' یہ سارا کچھ يُرَآءُوْنَ (107:6) ہے کہ دیکھ رہے ہیں اور وہ کہتے ہیں ''اوئے تیری نماز نئیں ہوئی۔ کی ہویا اے؟ تیرے پیراں دے وچ چھ انچ دا فاصلہ نئیں سی ہیگا[1]'' اگر یہ سارا کچھ ہو گیا تو الحمدللہ! تیری نماز ہو گئی۔ یہ وہ ہیں کہ جن کی یہ يُرَآءُوْنَ والی نماز تو ہو گئی' یہ جس مقصد کے لیے صلوٰۃ تجویز کی ہوئی تھی' وہ تو نگاہ میں ہی نہیں ہے اور آگے وہ بات بتادی جس سے ایک ٹھٹھیار کی آ کر پڑتی ہے' ایک فقرے میں بات بتادی کہ اصل یہ ہے کہ یہ ہیں وہ لوگ کہ اس قسم کی نماز کے تو بڑے پابند ہیں اور کیفیت یہ ہے کہ وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ (107:7) رزق کے ان چشموں کو جنہیں بہتے پانی کی طرح' ہر دروازے سے گزرنا چاہیے' بند لگا کر اپنے لیے روک لیتے ہیں۔ غور فرمایا' عزیزانِ من! ہمارے سامنے دو قسم کے مصلین آ گئے۔ یہ صلوٰۃ کتنی آسان ہے کہ یہ جو کچھ اس میں مرئی (Visible) چیزیں ہیں' جو محسوس چیزیں ہیں' وہ سامنے ادا کیں اور اس کے بعد جو کچھ صلوٰۃ نے کرنا تھا' فحشا اور منکر سے روکنا تھا' اس پہ اور شدت سے کاربند ہوتے چلے گئے۔

صلوٰۃ کے اجتماعات کی نفی نہیں کی جا سکتی' یہ نظامِ صلوٰۃ کا ہی ایک حصہ ہیں

شروع میں جہاں اقامتِ صلوٰۃ آیا تھا' وہاں میں نے واضح کر دیا تھا کہ یہ نہ سمجھ لینا کہ یہ جو صلوٰۃ کے اجتماعات ہیں' میں ان کی نفی یا تردید کر رہا ہوں' اس پروگرام کے اندر ان کا ایک مقام ہے لیکن وہ مقام اس پروگرام کے اندر رہتے ہوئے ہے' یہ نہیں ہے کہ وہ کوئی مقصود بالذات چیز ہے' الگ وہاں جا کر کر لی تو نماز ہو گئی۔ وہ اس بہت لمبے چوڑے صلوٰۃ کے نظام کی ایک اندر کی کڑی ہے' جس طرح فوجیوں کے لیے صبح کی پریڈ اس نظام کی ایک کڑی ہوتی ہے' وہ روز کرتے ہیں' وہ مقصود بالذات تو نہیں ہوتی' وہ کسی عظیم مقصد کے حصول کا ذریعہ ہوتی ہے۔ اس کی اہمیت میں فرق نہیں ہے' اگر اسی کو مقصود بالذات سمجھ لیا جائے' چھ مہینے نہایت عمدگی سے وہ پی ٹی کرتا رہے' اس میں نمبر لے' جنگ میں جانے کا وقت آئے تو کہے کہ نہیں صاحب! وہ میرے پی ٹی کے جو نمبر ہیں' اس سے مجھے پاس کر دیجیے گا' جنگ پہ کسی اور کو بھیج دیجیے گا۔ یہ ایسا نہیں ہوتا۔ اسے کہتے ہیں کسی شے کے ایک پورے پروگرام کا جز ہونا۔

---

[1] ابے! تمہاری نماز نہیں ہوئی۔ یہ کیا ہوا؟ تمہارے پاؤں کے درمیان چھ انچ کا فاصلہ نہیں تھا۔

نظامِ صلوٰۃ کو قائم کرنے کے سلسلہ میں پیدا ہونے والی مشکلات کا تمثیلی ذکر

میں کہہ یہ رہا تھا کہ صلوٰۃ اسی کا نام نہیں ہے، صلوٰۃ تو اس نظام کا نام ہے جس میں رزق کے چشموں پہ بند نہیں لگائے جائیں گے اور کہا تو یہی ہے کہ یہ بڑی مشقت طلب چیز ہے۔ آپ نے غور فرمایا کہ یہ کتنی مشقت طلب چیز ہے! اس کو قرآن نے ایک لفظ میں دوسری جگہ بیان کیا ہے۔ کہا ہے کہ وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ (90:10) دونوں راستے اس کے سامنے کھلے ہیں، ایک راستہ ہے فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ (90:11) پہاڑی کی گھاٹی کے اوپر چڑھنا۔ یہاں سے وہ جو مشقت طلبی ہے، وہ محسوس شکل میں سامنے آتی ہے۔ کبھی آپ پہاڑی کے اوپر چڑھے ہوں تو آپ کو معلوم ہو کہ یہ چڑھنا کتنا مشقت طلب ہوتا ہے، بھاگ کر نہیں چڑھ سکتے، قدم قدم چلنا ہوتا ہے، ہر قدم پہ سانس پھولتا ہے، کھڑے ہونا پڑتا ہے، تھکتا ہے، پھر آگے قدم اٹھاتا ہے۔ کہا ہے کہ یہ راستہ ہے اور وَمَآ اَدْرٰكَ مَا الْعَقَبَةُ (90:12)۔ یہ الْعَقَبَةُ ہے، جو ہم نے کہا ہے، یہ پہاڑی کی گھاٹی پہ چڑھنا ہے، جو اتنی زیادہ دشوار گزار چیز ہے کہ ایک قدم اٹھانے کے بعد ستانا پڑتا ہے، دم پھول جاتا ہے۔

انسان کے اختیار و ارادے کی اہمیت

سنیئے، عزیزانِ من! قرآن ہے، اس کے اس ایجاز اور اختصار میں ہی تو اس کا اعجاز ہے۔ کہا ہے کہ فَكُّ رَقَبَةٍ (90:13)۔ دو الفاظ ہیں، اس کے عام معنی تو ''غلام آزاد کرنا'' کر دیئے۔ وہ اس کی ایک شکل ہو سکتی ہے جب کسی زمانے میں غلام تھے۔ لکھنے والے کہیں لکھنا چاہتے ہیں تو ایک فقرہ لکھ لیجیے کہ دین کی لم، غرض و غایت کیا ہے؟ وہ ہے، انسانیت کا شرف، اس کا اختیار اور ارادہ۔ یہ ایک بات ہوئی۔ کوئی ایسی صورت ہو جس میں کوئی انسان کسی دوسرے کے فیصلے ماننے پر مجبور ہو جائے، تو یہ انسانیت کے شرف سے اس کو گرا دیتا ہے کیونکہ اس کا اختیار و ارادہ باقی نہیں رہتا۔ وہ کسی دوسرے کے فیصلے کو ماننے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ دین یہ ہے کہ کوئی فرد کسی دوسرے کے فیصلے کے ماننے پر مجبور نہ ہو، مانے تو اپنے اختیار سے مانے حتیٰ کہ اس نے یہ کہا ہے کہ وہ خدا کے فیصلوں کو بھی ماننے پر مجبور نہ ہو، جی چاہے تو مانے جی چاہے تو نہ مانے قُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّ مَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ (18:29) یہ حق تمہارے سامنے آ گیا ہے جو چاہے اپنے اختیار و ارادے سے اس کو قبول کر لے، جو چاہے اپنے اختیار و ارادے سے اس سے انکار کر دے۔

جس نظام میں کوئی شخص دوسرے کے فیصلے کو ماننے پر مجبور ہو، وہ نظامِ صلوٰۃ یا خدا کا دین نہیں ہو سکتا

لَآ اِكْرَاهَ فِی الدِّيْنِ (2:256)۔ الدین یہ ہے جس میں کوئی شخص کسی بات کے ماننے پر اپنے آپ کو مجبور نہ پائے۔ اسے کسی بڑی اہم جگہ لکھ لیجیے گا، برادرانِ عزیز! زندگی کا کیا بھروسہ ہے، یہ باتیں آپ کے کام آئیں گی۔ یہ ہے دین اور زندگی کے ہر گوشے میں نگاہ

دوڑا کر آپ دیکھ لیجیے کہ آج ہماری کیا حالت ہوگئی ہے۔ یہ ہے وہ فضا' یہ ہے وہ نظام' یہ ہے وہ کیفیت جو صلوٰۃ کا نظام پیدا کرنا چاہتا ہے۔ بطیّب خاطر' اپنے فیصلے کے مطابق' اپنے اختیار کی رو سے' جو راستہ چاہتا ہے' اختیار کرتا ہے۔ پھر ٹھیک ہے اس کے بعد جو اپنے اختیار سے قبول کرتا ہے' اس کے مطابق اس کے نتائج بھی خود بھگتتا ہے۔ یہ تو بات ٹھیک ہے کسی کو مجبوراً نہیں چلایا جا سکتا' یہ یاد رکھیے۔

آپ کہیں گے کہ صاحب! ایک شخص برضا و رغبت اسلام قبول کرتا ہے' اس کے بعد آپ اسے کہتے ہیں کہ صاحب! یہ جو چیز ہے قرآن کے مطابق ہے' یہ کرنا ہوگی' یہ اسلام کے خلاف ہے یہ نہیں کرنا ہوگی تو آپ تو اس سے یہ بات مجبوراً منوا رہے ہیں۔ یہ بات نہیں ہے۔ اس نے جو پہلی چیز اپنے اختیار سے قبول کی ہے' وہ یہی قبول کی تھی کہ جو چیزیں اب اس ضابطے کے اندر ہیں' وہ میں مانوں گا' جو اس کے خلاف ہوں گی وہ میں نہیں کروں گا۔ آپ اپنے اختیار و ارادے سے پاکستان کی Nationality (قومیت) قبول کرتے ہیں۔ آپ کو کوئی مجبور نہیں کرتا۔ جب Nationality (قومیت) قبول کرتے ہیں تو اس کے بعد جو آپ کے ہاں تعزیراتِ پاکستان ہے' آئینِ پاکستان ہے' پھر اس کی پابندی آپ کے اوپر لازم آ جائے گی۔ یہ آپ پہ جبر نہیں کیا جا رہا ہے' یہ آپ کے پہلے اختیار کا لازمی نتیجہ ہے اور اگر آپ اسے جبر سمجھ رہے ہیں تو یہاں سے چلے جائیے۔

قرآن حکیم انسانی اختیار و ارادہ کے پیش نظر یک طرفہ ٹریفک کا قائل نہیں

اسلام میں داخل ہونے کے بعد' اگر آپ سمجھتے ہیں کہ یہ چیزیں مجھ پہ جبراً ہو رہی ہیں' میں ان کو بطیّب خاطر نہیں کرنا چاہتا تو آپ اسلام چھوڑ دیجیے' آپکے اوپر کوئی مواخذہ نہیں۔ جیسا اسلام قبول کرنے پہ جبر نہیں تھا' اسی طرح سے آپ کا اختیار و ارادہ ہر وقت آپ کے ساتھ ہے' چھوڑ دیجیے۔ میں قرآن کا اسلام کہہ رہا ہوں' مُلّا کے اسلام میں تو One way Traffic (یک طرفہ ٹریفک) ہے' آ تو جائیے' آپ واپس نہیں جا سکتے' اس کی سزا قتل ہے اور لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ (2:256) بھی ہے۔ یہاں تو قدم قدم پہ یہ چیزیں ہیں۔ نکاح کا معاہدہ مرد اور عورت' میاں بیوی دونوں کی رضامندی سے بالکل ٹھیک ہے' ان میں سے ایک کی بھی رضامندی نہ ہو' تو وہ نکاح نہیں ہو سکتا' یہ دونوں کی رضامندی سے ہے۔ آگے' اس معاہدے کے بعد پھر کیا ہے؟ کہ جی! ان میں سے ایک فریق کو تو ہر وقت حق حاصل ہے کہ جب جی چاہے' اس میں سے نکل جائے۔ یہ عجیب قسم کی One way (یک طرفہ راستہ) ہے۔ وہ جو کہتے ہیں کہ یہاں سے ٹھیلہ اور بیل گاڑی نہیں گزر سکتی' موٹر گزر سکتی ہے۔ خاوند تو جب جی چاہے نکل جائے اور یہ جس نے اپنی رضامندی سے اسی طرح سے یہ معاہدہ کیا تھا' اسے یہ حق حاصل نہیں ہوتا۔

انسان کا اپنے جذبات کا غلام بن جانا بھی اپنی آزادی سے محروم ہونے کے مترادف ہے

عزیزانِ من! بات میں دین کی لم کی کر رہا تھا۔ کوئی فرد اپنے آپ کو کسی کا فیصلہ ماننے پر مجبور نہ پائے' خواہ احتیاج سے ہو خواہ محکومیت سے ہو اور اگلی بات خواہ محبت کے جذبات کی وجہ سے بھی کیوں نہ ہو۔ قرآن تو اسی لیے جذبات کو قانون کے تابع رکھتا ہے۔ جسے آپ محبت کے جذبات کہتے ہیں' وہ درحقیقت' آپ کے جو اس قسم کے اپنے آپ کو Pleasure (لذت) دینے کے جذبات ہوتے ہیں' اس کا نام رکھا ہوا ہوتا ہے۔ اس میں بھی مجبوری ہو جاتی ہے۔ قرآن یہ نہیں مانتا' وہ کہتا ہے کہ وہ جو اپنے جذبات کو اپنا الہ بنا لیتا ہے' سب سے بڑا کفر کرتا ہے۔ اس نے کیوں کفر کہا؟ اس لیے کہ اس کا ارادہ' اس کا اختیار' سلب ہو گیا۔ غیر تو ایک طرف' عزیزانِ من! وہ تو آپ کو اپنے ہاتھوں بھی مجبور نہیں ہونے دیتا کہ اپنا اختیار و ارادہ سلب کر دیں۔ جذبات سے مجبور ہونے والا ایسا ہی ہے جیسا شراب کے نشے کے اندر کوئی کچھ کر دے۔ نشے کی قسمیں ہیں۔ بڑا فریب دیتا ہے انسان جو یہ کہتا ہے کہ نہیں صاحب! میں نے تو اپنے اختیار و ارادے سے یہ کچھ کیا ہے۔ کبھی ٹٹول کر دیکھیے کہ اس میں شدتِ جذبات کا کتنا اثر تھا اور اختیار و ارادہ کتنا تھا۔ اپنے اختیار و ارادے سے جو چیز آپ مانتے ہیں' بعد میں اس پہ Regret (تاسف) نہیں ہوتا' غلطی کا احساس ہوتا ہے کہ پلاننگ صحیح نہیں ہوئی' ندامت نہیں ہوتی۔ شدتِ جذبات میں جو آپ فیصلے کر لیتے ہیں' جذبات کی آندھی اتر جاتی ہے تو آپ کو اس کے اوپر ندامت ہوتی ہے۔ کیوں ہوتی ہے؟ شرفِ انسانیت کو ٹھیس لگ گئی۔ یہ دوسرے نے نہیں لگائی' آپ نے خود لگائی' ٹھیس تو لگ گئی۔ قرآن تو ان دو حیثیتوں' تمہارا اختیار و ارادہ اور تمہارا شدتِ جذبات' کو بھی Split (علاحدہ) کر دیتا ہے۔

قرآنی فلسفہ حیات' انسانی آزادی کو ہر صورت برقرار رکھنا چاہتا ہے

میں کہہ رہا تھا کہ دین کی لم یہ ہے کہ کوئی فرد کسی دوسرے کی بات ماننے پہ مجبور نہ ہو جائے۔ یہ چیز ہے فَكُّ رَقَبَةٍ (90:13) یعنی پہاڑ کی گھاٹی چڑھنا دین ہے۔ یہ کیا ہے؟ یہ ہے کہ ایسا نظام قائم کیا جائے کہ کسی کے گلے میں کسی دوسرے کی زنجیر نہ بندھی رہے۔ پتہ نہیں یہ کونسی دنیا ہو گی جس میں کبھی انسان کی یہ کیفیت ہو گی' یہاں تو رواں رواں اور بال بال دوسروں کی زنجیروں کے اندر جکڑا ہوا ہے۔

جمِ غفیر کے اندر اپنے آپ کو تنہا محسوس کرنا شدید ترین عذاب کی کیفیت لیے ہوتا ہے

برادرانِ عزیز! جسے ہم اپنا اختیار و ارادہ کہتے ہیں' وہ بھی یہ صورت ہے کہ مجبوریاں بھی غیر کے اختیار میں ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ فَكُّ رَقَبَةٍ . اَوْ اِطْعٰمٌ فِيْ يَوْمٍ ذِيْ مَسْغَبَةٍ (90:13-14) ایسے دور میں جہاں احتیاج عام پھیل رہی ہو' ایسے دور کے اندر کسی کو بھوکا نہ رہنے دینا۔ کہا ہے کہ یہ ہے پہاڑ کی گھاٹی پہ چڑھنا۔ يَّتِيْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ (90:15) ایسا دور جس میں سینکڑوں' ہزاروں کے اندر

بستا ہوا انسان بھی اپنے آپ کو تنہا Feel (محسوس) کرے' یہ نہ پیدا ہونے دینا۔ ذَا مَقۡرَبَةٍ عزیزان من! بتایئے کہ کیا ہم میں ہر ایک کی یہی کیفیت ہے کہ نہیں؟ بسنے کو ہم بستیوں میں بس رہے ہیں لیکن جس پہ مصیبت آئی ہے' وہ دیکھ رہا ہوتا ہے کہ قبرستان میں کھڑا ہوں۔ نہیں بھائی! قبرستان والے مردے تو اٹھ کر اس کے راستے میں کانٹے نہیں بور ہے ہوتے' رکاوٹیں نہیں ڈال رہے ہوتے' قبرستان میں بھی ہوتا تو اپنی مصیبت آپ بھگت لیتا۔ یہاں مصیبت پڑتی ہے تو اکیلا بھگتتا ہے' باقی جتنے گردونواح میں ہوتے ہیں' وہ اس کے راستے میں مصیبتوں کے پہاڑ کھڑے کر رہے ہوتے ہیں۔ یہ يَّتِيۡمًا ذَا مَقۡرَبَةٍ (90:15) کیا بات ہے! کہا ہے کہ یہ بات نہ پیدا ہونے دو۔ اور یہ بات نہ پیدا ہونے دو کہ اَوۡ مِسۡكِيۡنًا ذَا مَتۡرَبَةٍ (90:16) دن بھر مٹی میں بھی لتھڑا ہوا ہو اور شام کو بچوں کے آٹے کے لیے بھی پیسہ نہ ملے۔ ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَتَوَاصَوۡا بِالصَّبۡرِ وَتَوَاصَوۡا بِالۡمَرۡحَمَةِ (90:17) ہاں! اس کے برعکس اس کے متعلق کہا جائے گا کہ یہ مومنین میں سے ہوگیا' اس کے بعد یہ کہا جائے گا کہ اس نے اس صبر کی شرط کو پورا کر دیا جو ہم نے پہلے کہی تھی۔ پہاڑ کی گھاٹی پہ چڑھنے کے لیے بڑی استقامت کی ضرورت ہے۔ کہتا ہے کہ یہ ہیں وہ گھاٹیاں جن پہ صلوٰۃ اور صبر سے چڑھا سکتا ہے۔ کہا ہے کہ کہو وَاِنَّهَا لَكَبِيۡرَةٌ (2:45) جو کہا تھا' ہم نے ٹھیک بات کہی تھی یا نہیں کہ یہ بڑی گراں گزرنے والی بات ہے۔

بطیّب خاطر قوانین خداوندی کے سامنے سر تسلیم خم کرنے سے تمام گھاٹیاں با آسانی سر ہو جاتی ہیں

یاد رکھو! نسخہ تو ہم نے بتایا کہ ذلت اور پستیوں سے نکلنا چاہتے ہو تو یہ بڑا آسان سا ہے کہ صلوٰۃ پہ قائم ہو جاؤ مگر ہمارے ہاں تو بڑی موج ہوگئی کہ نماز پڑھ لیا کرو۔ قرآن نے کہا ہے کہ یہ ذرا گراں گزرنے والی چیز ہے' کہ جی! ذرا ارشاد فرما دیجیے۔ کہا کہ بس یہ ہے جو ہم نے پہاڑ کی گھاٹی پہ چڑھنے والی چیز کا کہہ دیا ہے لیکن اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ اس نے کہا ہے کہ پروگرام یہی ہے۔ یہ بڑی گراں گزرنے والی چیز ہے تو کہا کہ شاید انسانوں کے لیے ناممکن ہو پھر اِلَّا عَلَى الۡخٰشِعِيۡنَ (2:45) کہا ہے کہ یہ گراں نہیں گزرے گی۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ کس پہ گراں نہیں گزرے گی؟ اس پہ جو یہ فیصلہ کرلے کہ میں نے اس کے سامنے سر جھکا دینا ہے' سر تسلیم خم کر دینا ہے' اس کے قوانین کے سامنے میں نے جھک جانا ہے' اس کا اتباع کیے چلے جانا ہے۔ جو یہ فیصلہ کر لے اس کے لیے پھر یہ گراں نہیں گزرے گی۔ ایک یہ فیصلہ کرلو اور اس کے بعد پھر تم دیکھو کہ شرف و مجد کے کس مقام پہ پہنچتے ہو۔ وہی پھر اقبالؒ (1877-1938ء) کے الفاظ کہ

یہ ایک سجدہ جسے تُو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات

فَكُّ رَقَبَةٍ (90:13) ہو جاتا ہے' ساری زنجیریں' جو انسانوں نے دوسرے انسانوں کے گلے میں باندھی ہوئی ہوتی ہیں' ٹوٹ

جاتی ہیں۔کہا ہے کہ اِلَّا عَلَی الْخٰشِعِیْنَ - الَّذِیْنَ یَظُنُّوْنَ اَنَّھُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّھِمْ وَ اَنَّھُمْ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ (2:45-46) لیکن یہ بات وہی کر سکتے ہیں' جن کو اس کا یقین ہو کہ میرے ہر عمل کا نتیجہ مرتب ہو کر رہنا ہے۔قرآنِ کریم کے یہ الفاظ ہیں۔قرآن تو محسوس شکل میں بات سمجھاتا ہے۔ جسے آپ Accountability (جواب دہی) کہتے ہیں یعنی Responsible to such and such (فلاں فلاں کے سامنے جواب دہ ہونا)' آپ کے ہاں کا یہی لفظ ہوتا ہے۔آپ کے جتنے بھی کام ہیں' ان کے متعلق یہ دیکھنے کے لیے آیا ہے کہ وہ صحیح کیا ہے' ہمارے ہاں کی جو Term (اصطلاح) ہے' وہی Term (اصطلاح) قرآن Use (استعمال) کرتا ہے۔اسے کہتے ہیں خدا کے سامنے کھڑا ہونا۔اس کے معنی Accountability ہوتی ہے' جسے جوابدہی کہتے ہیں لیکن یہ بات سوال جواب والی بات نہیں ہے بلکہ یہ وہ چیز ہے جیسے اس کا یقین ہے کہ میرا ہر کام نتیجہ خیز ہو کر رہے گا اور یہ کہ میرا ہر قدم اس کی طرف اٹھ رہا ہے۔جو مفرور مجرم ہے' وہ مطمئن ہوتا ہے کہ میں پولیس کی گرفت سے باہر آ گیا ہوں' مجھے کوئی نہیں پکڑ سکتا لیکن انہی دنوں یہ واقعات ہمارے سامنے آئے ہیں کہ کس طرح سے وہ خود غیر شعوری طور پر اُدھر ہی قدم اُٹھا رہا تھا' جدھر پولیس بیٹھی ہوئی تھی [1]۔وہ کہتا ہے جسے یقین ہو کہ میں بھاگ کر کہیں نہیں جا سکتا' میرا ہر قدم اس کی طرف اٹھ رہا ہے۔

قرآنِ حکیم کے نزدیک اہم حقائق کو بیان کرنے کا انداز

قرآن کہتا ہے کہ یہ جو چیز ہے' یہ وہ شخص کر سکے گا' جس پر صلوٰۃ گراں نہیں گزرے گی۔قرآن اسی چیز کو آگے لے گیا' پھر دہرایا اور یہ قرآن کا انداز ہے کہ جس چیز کی اہمیت ہوتی ہے' یہ اس کو بہ تکرار واصرار دہراتا ہے۔کہا ہے کہ یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اذْکُرُوْا نِعْمَتِیَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتُ عَلَیْکُمْ وَ اَنِّیْ فَضَّلْتُکُمْ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ (2:47) اے بنی اسرائیل! ان نعمائے خداوندی کو پھر یاد کرو' جو تمہارے اوپر اس زمانے میں ہوئی تھیں' جب تم نے اس کے قوانین کے تابع زندگی بسر کی تھی۔یہ ایک ہی خصوصیت ہے جس کا ذکر میں پہلے بھی کر چکا ہوں کہ تمام ہم عصر اقوام کے مقابلے میں تمہیں افضلیت (Superiority) حاصل تھی۔یہ ہے انعامِ خداوندی۔جس قوم نے بھی یہ دیکھنا ہو کہ وہ منعم علیہ ہے یا نہیں' تو وہ یہ دیکھے کہ آیا اسے ہم عصر اقوام میں Superiority (افضلیت) حاصل ہے یا نہیں۔یہ تو وہی ہے جو پہلے آ چکا تھا۔اب کرنا کیا ہے؟ کہا یہ تھا کہ یہ وہی کر سکے گا جسے یقین ہو کہ جو کچھ میں نے کیا ہے' مجھے اس کا نتیجہ بھگتنا پڑے گا۔

جس قوم میں قانون کا احترام ختم ہو جائے' وہ قوم ہر قسم کی بیماریوں کا شکار ہو کر رہ جاتی ہے

آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہ جو معاشرے کے اندر بدنظمی' خرابیاں' فساد' وارداتیں' یہ تمام چیزیں پھیلتی ہیں' یہ کس زمانے میں عام ہوتی

---

[1] اس کے لیے دیکھیے اسی کتاب کا چودھواں باب' ایک SSP کے تجربات کا نچوڑ۔

ہیں؟اس زمانے میں جب قانون کا احترام اٹھ جاتا ہے' جب دلوں کے اندر کچھ یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کچھ کیا جائے تو کچھ بات نہیں ہے' اتنے سے پیسے دے تو آدمی چھوٹ جاتا ہے۔ جو کچھ ہوا' وہاں سے سفارش کی ایک چٹھی لا یئے معاملہ ختم ہو جاتا ہے' ٹھیک ہے کہیں رشوت دی' کہیں سفارش لے آئے' اپنی جگہ کسی دوسرے کو پکڑا دیا' بگڑے ہوئے معاشرے میں یہ کچھ ہوتا ہے۔ وہ کیا اور چھوٹ گئے۔ اگر معاشرے میں ہر شخص کو یہ معلوم ہو کہ جو کچھ میں کرتا ہوں' اس کے نتائج سے نہ کسی کی سفارش چھڑا سکتی ہے' نہ رشوت دے کر چھوٹ سکتا ہوں' نہ کوئی دوسرا میری جگہ پھنس سکتا ہے' نہ میں ہی Escape (فرار) کر کے' فرار کی راہ اختیار کر کے' کہیں بھاگ سکتا ہوں' میں ضرور پکڑا جاؤں گا تو پھر جرم نہیں ہوگا۔ آپ دیکھتے ہیں کہ آج اس معاشرے میں یہ چیز نہیں ہوتی۔

قانونِ مکافاتِ عمل کے معنی یہ ہیں' برادرانِ عزیز! کہ انسان اپنے اعمال کے نتائج بھگتے گا۔ ہمارے ہاں جو دنیا میں عدل کا نظام قائم ہوتا ہے' اس میں تو پھر بھی یہ چیز ہے کہ اگر جرم کو کوئی دیکھنے والا ہو تو پھر ہی باز پرس ہوتی ہے' مجرم کو کوئی پکڑنے والا ہو تو پھر ہی گرفت میں آتا ہے' کوئی عدالت سزا دینے والی ہو تو پھر ہی اس کو سزا ملتی ہے۔ اگر یہ چیزیں نہ ہوں یا ان چیزوں میں سے نکلنے کی کچھ صورتیں پیدا کر لی جائیں' تو پھر یہ چیز نہیں ہوتی لیکن قانونِ مکافاتِ عمل یہ ہے کہ کوئی دیکھنے والا نہ ہو' کوئی پکڑنے والا نہ ہو' کوئی سزا سنانے والا نہ ہو' تو پھر بھی سزا بھگتے۔ وہ جو میں مثال دیا کرتا ہوں کہ بند کمرے میں تنہا' جب کوئی دیکھ نہیں رہا' کوئی دوسرا شخص نہیں ہے' موم بتی جلا کر اس پہ انگلی رکھ دیجئے' اس کے بعد جو سزا آپ کو ملی ہے' جو رات بھر ہائے ہائے کرتے رہے ہیں' سو ہی نہیں سکے' تڑپ رہے ہیں' برادرانِ عزیز! بیس بیتوں کی اتنی سزا نہیں ہوتی جتنی وہ سزا ہے۔ نہ کسی نے جرم کرتے ہوئے دیکھا' نہ کوئی سپاہی آیا' نہ حوالات میں رہے' نہ عدالت میں پہنچے' نہ جج نے حکم سنایا' نہ جیل خانے گئے' نہ وہاں پولیس گئی' اور آپ ہیں کہ اس سے زیادہ تڑپ رہے ہیں۔ اسے کہتے ہیں قانونِ مکافاتِ عمل۔ اپنی انگلی پہ موم بتی کی لٹ' یہ محسوس چیزیں ہیں' اس کا تو ہمیں معلوم ہے کہ آگ میں انگلی ڈالنے سے یہ ہوتا ہے مگر اس کا ہمیں یقین نہیں ہے کہ جھوٹ بولنے سے بھی یہ کیفیت ہو جاتی ہے۔ اس کا تو ہمیں یقین ہے کہ سنکھیا کھانے سے ہلاکت ہو جاتی ہے' اس کا یقین نہیں ہے کہ حرام کا مال کھانے سے بھی ہلاکت ہو جاتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ بچے گا وہ جو اس پہ یقین رکھے گا کہ جیسے سنکھیا کھانے سے ہلاکت ہوتی ہے' اسی طرح سے کسی کا ناجائز مال کھانے سے بھی ہلاکت ہوتی ہے۔

جنت کے حصول کے لیے بنی اسرائیل کا عقیدہ اور ہمارے ہاں پائے جانے والے تصورات

سنیے! بنی اسرائیل سے کیا کہا گیا تھا؟ بنی اسرائیل اس مقام پہ پہنچ چکے تھے' جہاں ہم بھی پہنچے ہوئے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ نَحۡنُ اَبۡنٰٓؤُا اللّٰهِ (5:18) ہم اللہ کی چہیتی اولاد ہیں صاحب! کوئی اپنے بچے کو' اپنی اولاد کو' تنور میں نہیں جھونکتا' واہ! کیا اللہ ہمیں جہنم میں بھی بھیج

دے گا؟ قطعاً نہیں۔ عزیزانِ من! ہم اس کی اولاد ہونے کا تو دعویٰ نہیں کرتے لیکن اس کے محبوب کی محبوب امت ہونے کا تو دعویٰ ہے۔ ارے! کیا یہ اللہ میاں اپنے محبوب کو ناراض کرلیں گے؟ واہ! اور محبوب تو راضی نہیں ہوں گے جب تک ہم سب جنت میں نہ چلے جائیں۔ **نَحۡنُ اَبۡنٰٓؤُا اللّٰہِ** (5:18) اور **لَنۡ یَّدۡخُلَ الۡجَنَّۃَ اِلَّا مَنۡ کَانَ ہُوۡدًا اَوۡ نَصٰرٰی** (2:111) کوئی جنت میں نہیں جاسکتا' ہماری Monoply (اجارہ داری) ہے۔ صاحب! ہم جائیں گے جنت کے اندر۔ غیر شعوری طور پر کچھ اسی قسم کا اپنا بھی یہ تصور ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ **لَنۡ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّاۤ اَیَّامًا مَّعۡدُوۡدَۃً** (2:80) کوئی چند دنوں کے لیے جہنم ہوگا' جب تک اُدھر حساب کتاب ہو رہا ہوگا' اللہ میاں الجھے ہوئے ہوں گے' رسول اللہ ﷺ بھی معاملے میں مصروف ہوں گے' وہ اتنے میں' جتنے میں آدمی حوالات میں رہتا ہے بس پھر اس کے بعد چھٹی ہوئی' چھڑا لیا۔ بعینہٖ یہی کیفیت بنی اسرائیل کے ہاں ہوگئی تھی' جب ان کے ہاں معاشرے سے قانون کا احترام اُٹھ گیا تھا' ذلت اور مسکنت آ گئی تھی۔

کائنات کا ایک ایک ذرہ مکافاتِ عمل کی شہادت پیش کرنے میں مصروف کار ہے

کہا ہے کہ **وَ اتَّقُوۡا یَوۡمًا لَّا تَجۡزِیۡ نَفۡسٌ عَنۡ نَّفۡسٍ شَیۡئًا وَّ لَا یُقۡبَلُ مِنۡہَا شَفَاعَۃٌ وَّ لَا یُؤۡخَذُ مِنۡہَا عَدۡلٌ وَّ لَا ہُمۡ یُنۡصَرُوۡنَ** (2:48)۔ عزیزانِ من! یہ ایک آیہ جلیلہ ہی اگر ہمارے سامنے رکھی ہوئی ہو اور اس پر ہمارا ایمان ہو' تو پھر آپ دیکھیے گا کہ معاشرے میں کوئی جرم بھی نہیں ہوسکتا۔ کہتا ہے کہ ڈرو اس دور سے' اس دن سے' اس کیفیت سے' اس نظام سے' جس میں کیفیت یہ ہوگی کہ **لَّا تَجۡزِیۡ نَفۡسٌ عَنۡ نَّفۡسٍ شَیۡئًا** (2:48) کوئی فرد کسی دوسرے فرد کے لیے کچھ نہیں کرسکے گا۔ عارضی طور پر جہنم میں جانے کی بات کاٹ کر رکھ دی۔ قرآن کے سارے مقامات میں قانونِ مکافاتِ عمل ہی کی تشریح ملے گی۔ گیہوں بوؤ گے گیہوں اُگے گا' جو بوؤ گے جو اُگے گا۔ جو بونے کے بعد گورنر جنرل صاحب کی' President (صدر) صاحب کی' شفارشی چٹھی لے آیئے اور اس پودے کے ساتھ ٹانک دیجیے کہ "ہم سفارش کرتے ہیں کہ اس میں گیہوں کے دانے لگیں گے" سفارش نہیں وہاں سے Ordinance (آرڈیننس) لکھوا کر لے آیئے کہ "اسے حکم دیا جاتا ہے کہ جو بوئے جائیں گے اور گیہوں اُگے گا" لاکھ روپے کی رشوت کی تھیلی لاکر باندھ دیجیے۔ یہ نہیں ہوسکے گا۔ اسے قانونِ مکافاتِ عمل کہتے ہیں۔ کہا ہے کہ **لَّا تَجۡزِیۡ نَفۡسٌ عَنۡ نَّفۡسٍ شَیۡئًا** (2:48)۔ دوسرے مقام پہ تشریح کی ہے کہ **وَ لَا تَکۡسِبُ کُلُّ نَفۡسٍ اِلَّا عَلَیۡہَا** (6:164) جو کرے گا وہی بھرے گا۔ یہ کبھی نہیں ہوتا کہ انگلی آگ میں آپ ڈالیں' چیخیں مارنے لگ جائے آپ کا بھائی۔ یہ کبھی نہیں ہوتا ہے کہ پیاس میں پانی آپ پئیں' پیاس آپ کے بیٹے کی بجھ جائے۔ یہ ہے قانونِ مکافاتِ عمل کہ **وَ لَا تَکۡسِبُ کُلُّ نَفۡسٍ اِلَّا عَلَیۡہَا** (6:164) ہر فرد خود اپنا بھگتے گا۔ اور کیا بات ہے! یہ چار الفاظ پھر لکھنے کے ہیں

کہ وَ لَا تَزِرُ وَازِرَۃٌ وِّزْرَ اُخْرٰی (6:164) کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھا سکے گا۔ یہ تو ہو گیا کہ کوئی کسی دوسرے کے کام نہیں آئے گا۔

سفارش اور شفاعت کے متعلق ہمارے ہاں پایا جانے والا متضاد تصور

اب آ گیا اگلا مسئلہ، جس نے قوموں کو اور ہمیں تو سب سے پہلے تباہ کر کے رکھ دیا ہوا ہے۔ کہا ہے کہ لَا یُقْبَلُ مِنْھَا شَفَاعَۃٌ (2:48) کسی کی سفارش قبول نہیں کی جائے گی، صاحب! شفاعت ختم ہو گئی۔ عزیزانِ من! ذرا سوچیے تو سہی، یہاں آپ بگڑے ہوئے معاشرے کی جب برائیاں بیان کرنا شروع کرتے ہیں تو پہلی چیز یہ ہوتی ہے کہ صاحب! یا تو کیفیت یہ ہے کہ وہ افسر ایسا آ گیا، بس سفارش لے جائیے سب ٹھیک ہے، یہاں کام ہی سفارش پہ چلتا ہے۔ کسی کے متعلق نہایت عمدہ بات کہنی ہو تو وہ یہ چیز ہے کہ صاحب! اس میں سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ باپ کی سفارش بھی نہیں مانتا۔ اس سے بڑا احترام پیدا ہوتا ہے۔ یہاں تو ہمارے ہاں، یہ چیز، یہ تصور، یہ نظریہ، تکریم کا، احترام کا، اس کے منصف مزاج ہونے کا، قانون کے احترام کرنے والے ہونے کا، یہ ہے کہ وہ کسی کی سفارش نہیں مانتا اور اس کے ساتھ ہی ہمارا ایمان یہ ہے کہ ساری کی ساری امت مجرموں کے کٹہرے میں کھڑی ہے، ہتھکڑیاں بندھی ہیں، جہنم میں جا رہی ہے اور ایسے وقت میں رسول ﷺ سفارش کرتے ہیں، سفارش کرنے والے کی خدا سفارش مانتا ہے۔ او میرے بھائی! ذرا سوچ، ابھی ایک منٹ پہلے، یہاں کے حاکم کے متعلق آپ کیا کہہ رہے تھے۔ یہ چھوٹے پیمانے پہ یہ کچھ کرے تو آپ یہ کہیں، اور وہاں اتنے بڑے پیمانے پہ یہ کچھ ہو تو بڑے فخر سے آپ بیان کریں۔ مسلمان کبھی سوچتا نہیں کہ میں کیا کہہ رہا ہوں اور پھر جو میں نے عرض کیا ہے، معاملہ یہاں تک کا ہی نہیں ہے کہ یہ عدالتی جرم تھا، عدالت نے سزا دینی ہے، سفارش چل جائے گی، یہ تو آگ میں انگلی ڈالنے والی بات ہے، یہ جَو بو کر گیہوں کاٹنے کی امید خام ہے۔

برادرانِ عزیز! میں نے ابھی ابھی کہا تھا کہ آپ گورنر جنرل کی سفارش لے آئیے اور لگا دیجیے تو کیا اس سفارش سے پھر کیکر میں انگور کے خوشے لگیں گے؟ آپ یہ سفارش لٹکا دیجیے، بہت بڑی سفارش ہے صاحب! مگر قرآن نے کہا ہے کہ لَا یُقْبَلُ مِنْھَا شَفَاعَۃٌ (2:48) شفاعت نہیں ہو گی۔ ایک بات عرض کر دوں، عربی زبان میں یہ ''ش ف ع'' ہے، جہاں سے شفاعت کا لفظ نکلا ہے، اس کے معنی ہوتے ہیں ''کسی ایک شخص کے ساتھ کسی دوسرے شخص کا کھڑا ہو جانا''۔ یہ حقِ شفع ہوتا ہے، یہ ساتھ والا جو ہمسایہ کا مکان ہوتا ہے، یہ وہی چیز ہے ساتھ کھڑا ہونا۔ ساتھ کھڑے ہونے کے کئی پہلو ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ ہے جسے ہم سفارش کہتے ہیں کہ عدل کا، انصاف کا، حق کا، تقاضا کچھ ہے مگر سفارش یہ ہے کہ میری خاطر یوں کر دو، یہ اس کی سفارش ہے۔ یہ ساتھ کھڑے ہونا ہے۔ عدالت کے اندر ایک گواہ بھی آ کر ساتھ کھڑا ہوتا ہے۔ قرآنِ کریم نے اس معنی کے اندر یہ لفظ استعمال کیا ہے۔ میں اس لیے عرض کر رہا ہوں، شفاعت کے اوپر تو میں کبھی

آ گے آ ؤں گا' تو تفصیل سے سارے قرآن کی مختلف آیات بیان کروں گا' یہاں میں اس کا استعمال بیان کر رہا ہوں۔ شفاعت ''کسی بے گناہ کے لیے سچی شہادت دیدینا'' ہے۔ عدالت میں یہ بھی اس کے ساتھ کھڑا ہوتا ہے' مگر سفارش کرنے کے لیے نہیں' کسی بے گناہ کے لیے سچی شہادت دینے کے لیے۔

قرآن حکیم کے نزدیک شفاعت کا حقیقی مفہوم شہادت کا ہوتا ہے

سنیے' عزیزانِ من! قرآن ہے اس میں شفاعت بہ معنی شہادت آیا ہے۔ کہا ہے کہ **وَلَا يَمۡلِكُ الَّذِيۡنَ يَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِهِ الشَّفَاعَةَ** (43:86) وہ جو تمہارے تصور کے اندر کوئی چیز ہے' اس کا تو کسی کو اختیار نہیں ہے **اِلَّا مَنۡ شَهِدَ بِالۡحَقِّ** (43:86) لیکن بجز اس کے کہ جو آ کر کسی کو بھی سچی شہادت دے۔ قرآن نے تو کتمان شہادت کو بڑا جرم قرار دیا ہے۔ کہا ہے کہ **اِلَّا مَنۡ شَهِدَ بِالۡحَقِّ** (43:86) بے گناہ پھنسا ہوا ہے اس کے لیے ایک جو سچی شہادت ہے' اس کا کام دے سکتی ہے' عدالت میں جا کر اس کے ساتھ کھڑے ہو جایئے اور سچی شہادت دیجیے۔ اس معنی کے اندر جو ساتھ کھڑے ہونا ہے' اب یہ دیکھیے کہ یہ مستحسن ہو گیا۔ یا قرآن نے جو کہا ہے کہ **وَتَعَاوَنُوۡا عَلَى الۡبِرِّ وَ التَّقۡوٰى وَ لَا تَعَاوَنُوۡا عَلَى الۡاِثۡمِ وَ الۡعُدۡوَانِ** (5:2) اچھے کاموں کے اندر دوسروں کے ساتھ تعاون کرو' برے کاموں میں کسی کے ساتھ تعاون نہ کرو۔ یہ کسی کے ساتھ جو تعاون کرنا ہے یہ بھی تو اس کے ساتھ کھڑے ہو جانا ہے۔ ''بھئی! میرا ساتھ دیں گا نا اوہدے اچ[1]'' لفظ ہی ہم ''ساتھ'' کہتے ہیں ''کھلوئیں گا نا میرے نال فیر اوس ویلھے[2]'' ہر زبان میں یہ الفاظ استعمال ہوتے ہیں ''کسی کے ساتھ کھڑے ہو جانا' اچھی باتوں میں ساتھ دینا''۔

شفاعت کے مروجہ مفہوم میں خدا تعالیٰ کے متعلق پیدا ہونے والا غلط تصور

شفاعت کا لفظ عربوں کے ہاں اس معنی کے اندر بھی استعمال ہوتا ہے' قرآن نے بھی استعمال کیا ہے کہ **مَنۡ يَّشۡفَعۡ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَّكُنۡ لَّهٗ نَصِيۡبٌ مِّنۡهَا** (4:85) جو اچھے کام میں کسی کے ساتھ کھڑا ہو جاتا ہے' اس اچھائی کے بدلے میں اس کو بھی حصہ ملتا ہے اور **وَ مَنۡ يَّشۡفَعۡ شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَّكُنۡ لَّهٗ كِفۡلٌ مِّنۡهَا** (4:85) جو کسی برے کام کے اندر کسی کے ساتھ کھڑا ہوتا ہے تو پھر اس کے نقصان میں' اس کے نتیجے میں' اس کو بھی حصہ مل جاتا ہے' اس کے نقصان میں وہ بھی شریک ہو جاتا ہے اور یہ عام قانون بھی ہے' ہمارے ہاں کی یہ چیز ہے کہ جرم کی معاونت کرنے والا مجرم بنتا ہے۔ میں نے یہ کہا ہے کہ ان معنوں کے اندر تو یہ لفظ استعمال ہوتے ہیں' تعاون کے معنی میں'

---

[1] بھئی! اس کام میں میرا ساتھ دو گے نا؟

[2] پھر اس وقت میرے ساتھ کھڑے ہوں گے نا؟

صحیح شہادت دینے کے معنی میں' یہ مستحسن چیز ہے۔ سفارش کے معنوں کے اندر یہ جو چیز ہے' یہ عدل کے خلاف جاتی ہے اور کسی صورت میں بھی اسلام میں جائز نہیں ہو سکتی چہ جائیکہ ہم خدا کے متعلق کہیں کہ وہ سفارشیں مان مان کر مجرموں کو یوں چھوڑ دینے والا ہے اور جب قانونِ مکافاتِ عمل ہوگا تو اس میں تو اس کا سوال ہی نہیں پیدا ہوگا۔ قرآن نے کہا ہے کہ وَّ لَا یُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّ لَا هُمْ یُنْصَرُوْنَ (2:48) کفارہ دے کر بھی نہیں چھوٹا جا سکے گا۔ دیکھیے! کتنی بڑی بات ہے جو قرآن ایک لفظ کے اندر کہہ گیا ہے' یہ کتنا بڑا عظیم عقیدہ تھا ایک قوم کا کہ عیسائیت کی ساری عمارت بنیادوں سے اکھیڑ کر رکھ دی۔

شفاعت کے سلسلہ میں عیسائیت کا اپنا عقیدہ

عیسائیت کی بنیاد یہ ہے کہ ہر انسانی بچہ گنہگار پیدا ہوتا ہے اور اپنے کسی کام سے اپنے گناہ کو دھو نہیں سکتا۔ اس کے بعد یہ ہے کہ جب یہ صورت اللہ میاں نے پیدا کر دی تو پھر بیٹھا سوچے کہ اتنے انسان پیدا کیے چلا جا رہا ہوں اور ہر انسان گنہگار ہے۔ معاف رکھیے گا ''بقول اوہناں دے ایہڈا اوڈا جہنم لے جاواں گے کتھے۔ آ جیہڑی جیل خانیاں اچ تھڑ جاندی اے نا تھاں ❶۔'' کیا عقیدے ہیں۔ پھر کیا سوچا؟ یہ ان کے عقیدے کی بات کہتا ہوں کہ جی! وہاں بیٹھ کے باپ بیٹے نے مشورہ کیا۔ بیٹے نے کہا کہ ابا جان! کچھ ایسے مغموم ہونے کی بات نہیں ہے' یہ ہو گیا ہے تو اس کے لیے کچھ انتظام سوچ لیتے ہیں۔ کہا کہ انتظام ہے؟ کہا کہ مجھے سولی پہ چڑھا دیجیے' میرا جو خونِ ناحق ہے' وہ ان کے گناہوں کا کفارہ بن جائے گا۔ جیتے رہو بیٹے! ''ویکھیا نا اولاد کم اوندی ہیگی اے ❷۔'' چنانچہ اللہ میاں نے اپنا بیٹا بھیج دیا اور وہ صلیب پہ چڑھ گیا۔ آپ حیران ہوں گے' عزیزانِ من! کہ کوئی ایک دو جاہل نہیں' جن کا یہ عقیدہ ہے' یہ دو ہزار سال سے مسلسل چلا آ رہا ہے' کروڑوں کی تعداد کے اندر وہ لوگ موجود ہیں' جن کا عقیدہ یہ ہے کہ خدا نے انسانوں کے اس فطری گناہ کو دھونے کے لیے اپنے بیٹے کو بھیجا کہ اس کا خونِ ناحق ان کے گناہوں کا کفارہ بن جائے۔

دوسروں کے عقیدے پر تنقید کرنے والوں کے اپنے تصورات

اس پہ تو ہم' برادرانِ عزیز! استہزا سے مسکرا دیتے ہیں' ذرا دل میں سوچیے کہ ہمارے ہاں بھی کچھ اس قسم کے کفارے ہیں' ہمارے گناہوں کا کفارا کسی کا خون ہے۔ اس نے کہا ہے کہ وَّ لَا یُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ (2:48)۔ بالکل کفارے کی بات نہیں۔ عزیزانِ من! بچے کی انگلی آگ میں پڑی ہوئی ہو' درد سے تڑپ رہا ہو' یہ تو ہے کہ ماں مامتا کی ماری خود رات بھر نہ سوئے مگر اس کے درد کا کفارہ نہیں بن سکتی۔ اس کے قانونِ مکافاتِ عمل کے اندر سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کہا ہے کہ وَّ لَا هُمْ یُنْصَرُوْنَ (2:48) اور مجرم کی کوئی مدد بھی نہیں

---

❶ بقول ان کے اتنا بڑا جہنم کہاں لے جائیں گے۔ یہ تو جیل خانوں میں بھی جگہ کی کمی ہو جاتی ہے۔

❷ دیکھا کہ اولاد ہی کام آتی ہے۔

کر سکے گا۔ کہا ہے کہ وَ اتَّقُوْا یَوْمًا (2:48) اس وقت تک تم من مانیاں کرتے رہے، کہیں سفارشیں لا کر چھوٹ گئے، کہیں کفارے دے کر، کہیں رشوتیں دے کر، کہیں حمایتی بلا کر، چھوٹ گئے۔

نظامِ صلوٰۃ کی بنیاد یہ ہے کہ کسی انسان کا کوئی عمل نتیجہ پیدا کیے بغیر نہیں رہ سکتا

عزیزانِ من! یہ بات قیامت تک کے اوپر اٹھا رکھنے والی نہیں ہے۔ کہا ہے کہ اب دیکھیے قرآن آیا ہے، اس کا نظام صلوٰۃ قائم ہونے والا ہے، اس نظامِ صلوٰۃ کے اندر تمہاری کوئی بات نہیں چل سکے گی۔ اس کے اندر ہر مجرم کو اپنے کیے کی سزا بھگتنی پڑے گی، تمہیں کوئی سفارش نہیں بچا سکے گی، کہیں رشوت دے کر نہیں چھوٹ سکو گے۔

مدینے میں یہودیوں کا بڑا زور تھا، ان کو اس چیز کے اوپر بڑا مان تھا، ان کے ہاں Lawlessness (لاقانونیت) تھی، قانون کا احترام ہی اٹھ چکا تھا۔ کہا ہے کہ وہ دور گیا، اب جو یہاں قرآنی نظام قائم ہوگا تو اس نظام کے اندر اس قسم کی کوئی چیز نہیں چل سکے گی۔ واتقوا (2:48) ڈرو، اس آنے والے نظام سے، ابھی سیدھے ہو جاؤ اور اس کے بعد پھر قیامت تک کے لیے یہ چیز ہے۔ یہاں یہ نظام قائم ہو جائے، تو یہاں محسوس دنیا میں یہ کیفیت ہو جائے گی کہ ہمارے ہاں جتنے بھی انسان کے اعمال ہیں، یہ جو بھی کام کرتا ہے حتیٰ کہ دل کا ارادہ، نگاہ کی خیانت، وہ اسی طرح سے اپنے نتائج پیدا کرتے ہیں جیسے یہ محسوس اعمال نتائج پیدا کرتے ہیں، وہ بغیر کسی سپاہ کے عدالت کے جیل خانے کے، اپنے نتائج پیدا کیے چلے جاتے ہیں۔ یہ جو کیفیت ہے، یہ ہے وہ چیز جسے کہا تھا کہ ان لوگوں کے اوپر صلوٰۃ کچھ گراں نہیں گزرے گی، جو یہ یقین رکھیں کہ ہر عمل اپنا نتیجہ پیدا کرے گا اور دنیا کی کوئی قوت اس نتیجے کو روک نہیں سکے گی۔ جب تمہارا یہ ایمان ہو جائے گا تو اس کی رو سے نظامِ صلوٰۃ قائم ہوگا، پھر وہ جو نظام ہے، گراں نہیں گزرے گا، وہ تمہارا ایمان ہوگا، اس کے مطابق تم کرتے چلے جاؤ گے اور پھر تمہاری پستی اور ذلت اسی سرفرازی اور شادابی میں بدل جائے گی جو کبھی ایک دفعہ تمہیں نصیب ہوئی تھی۔ یہ دور اب آ گیا ہے جس میں پھر اس امر کی صداقت کی شہادت مل جائے گی کہ قوانینِ خداوندی کے تابع چلنے سے کس قسم کا نظامِ صلوٰۃ قائم ہوا کرتا ہے اور اس کا نتیجہ کیا ہوا کرتا ہے۔

عزیزانِ من! سورۃ البقرۃ کی آیت 48 پہ ہم آج آ گئے، اس کے بعد وہی داستانِ بنی اسرائیل آگے چلتی ہے۔ وہ بتائے گا کہ وہ ذلت و مسکنت جس کے اندر تم مبتلا ہوئے، کیا تھی، اس کی علامات کیا تھیں اور اس کے بعد یہ کہ جب تم نے ان قوانینِ خداوندی کا اتباع کیا تو پھر اس کا نتیجہ کیا نکلا، یہ چیز بھی اس کے بعد آگے آئے گی، اسے ہم آئندہ پر اٹھا رکھتے ہیں۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ط اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ

❀......❀......❀

سترھواں باب: سورۃ البقرۃ (1)‘ (آیات 49 تا 52)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

وَاِذْ نَجَّيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ ۭ وَفِيْ ذٰلِكُمْ بَلَاۗءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ ﴿٤٩﴾ وَاِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ فَاَنْجَيْنٰكُمْ وَاَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴿٥٠﴾ وَاِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰٓى اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿٥١﴾ ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿٥٢﴾

عزیزانِ من! آج ستمبر 1968ء کی 29 تاریخ ہے اور ہم اپنے درسِ قرآنِ کریم کے سلسلۂ نو میں آج سورۃ البقرۃ کی 49 ویں آیت سے آغازِ کلام کریں گے: (2:49)۔

سابقہ درس کی بازگشت

پچھلے اتوار کو چونکہ بجلی نہ ہونے کی وجہ سے درس کا ناغہ رہا اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ ذہنی ربط کے قائم رکھنے کے لیے تمہیداً چند الفاظ دہرا دوں کہ بات کیسے چلی آ رہی تھی۔ میں نے عرض کیا تھا کہ قرآنِ کریم کا انداز یہ ہے کہ وہ ایک بنیادی اصول دیتا ہے‘ ایک غیر متبدل قانون بیان کرتا ہے اور پھر تشریح اور اس کی صداقت کے ثبوت کے لیے تاریخِ انسانیت سے شواہد پیش کرتا ہے۔ سورۃ البقرۃ میں اس نے اصول یہ پیش کیا تھا کہ انسان فطرت کی قوتوں کو مسخر کر سکتا ہے‘ قرآن کے تشبیہی انداز میں یوں کہیے کہ ملائکہ‘ آدم کے سامنے سجدہ ریز ہوتے ہیں لیکن فطرت کی قوتوں کو مسخر کر لینا ہی مقصود نہیں‘ اس کے بعد ان قوتوں کے ماحصل کو جب مستقل اقدارِ خداوندی کے تابع‘ صرف کیا جاتا ہے تو اس سے ایک ایسا معاشرہ قائم ہوتا ہے جس میں کیفیت یہ ہوتی ہے اور پھر یہ کیفیت قرآن کے انداز میں چند سادہ سے الفاظ میں بیان کر دی کہ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا (2:35) اس میں جس شخص کو جہاں بھی بھوک لگتی ہے‘ اسے پورے اطمینان کے ساتھ کھانے کو مل جاتا ہے۔ اور اس کے بعد یہ کہا کہ پھر جب انسان ان اقدار کو چھوڑ کر‘ جن کا مقصد ربوبیتِ عالمینی ہے‘ زمین پر لکیریں کھینچ کر‘ میری اور تیری کے امتیازات پیدا کر لیتا ہے‘ جسے اس نے مشاجرت کہا تھا‘ تو پھر کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ اس جنت سے

نکال دیا جاتا ہے۔ لیکن اس جنت کے چھننے کے بعد ابدی مایوسی نہیں طاری ہوجاتی بلکہ اس کی باز آفرینی کا دروازہ کھلا رہتا ہے۔ فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (2:38) وہ اقدار بھی موجود ہیں، وہ قوانین بھی موجود ہیں، انسان بھی موجود ہے، پھر سے اگر ان کا اتباع کر لے، پھر سے اسی قسم کے معاشرہ کا قیام عمل میں آجائے تو پھر سے وہی کیفیت پیدا ہوجائے گی کہ نہ کوئی بیرونی خوف ہوگا، نہ قلبی افسردگی باقی رہے گی۔ اور یہ اصول دینے کے بعد اس نے اپنے انداز کے مطابق اس کی صداقت کے ثبوت میں تاریخ سے جو شہادت پیش کی ہے، وہ قوم بنی اسرائیل کی داستان ہے۔

قرآنِ کریم میں قوموں کے عروج و زوال کے ابدی قوانین بڑی صراحت سے بیان ہوئے ہیں۔ یہ انفرادی مذہب تو ہے نہیں، قرآن تو ہیئت اجتماعیہ انسانیہ کے لیے ایک ضابطہ ہے۔ وہ ایک معاشرہ متشکل کرنا چاہتا ہے، ایک اجتماعی زندگی بسر کرنا سکھاتا ہے اور اسی کا نام قوم کی زندگی ہوتا ہے۔ اس لیے وہ جب بھی مثالیں پیش کرتا ہے تو ہمیشہ اقوام عالم کی مثالیں پیش کرتا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ ان کے اندر ایک داعیٔ انقلاب آتا ہے لیکن وہ اس قوم کے اندر انقلاب پیدا کرتا ہے۔ اس لیے قرآن کی شہادات ہمیشہ اقوامِ عالم کے سوانح اور کوائف ہونگے۔

قوم بنی اسرائیل کی داستان اپنے اندر عروج وزوال کے دونوں پہلو لیے ہوئے ہے

قرآن نے بنی اسرائیل کی داستان اس لیے پیش کی کہ ایک طرف تو وہ یہ کہتا ہے کہ جب انہوں نے ان قوانین کا اتباع کیا، تو انہیں اپنی ہم عصر اقوام پر افضلیت حاصل ہوگئی۔ قرآن تو بڑی مختصر سی بات کرتا ہے اور خود وحی کے معنی ہی خفی سا اشارہ ہوتے ہیں تو وہ سمجھنے والوں کے لیے خفی سا اشارہ کر کے آگے بڑھتا ہے۔ کہتا ہے کہ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ (2:47) ان کی جو باقی ہم عصر اقوام تھیں، ان پہ انہیں ایک افضلیت (Superiority) حاصل ہوگئی اور جب انہوں نے ان قوانین کو چھوڑ دیا تو وَ ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَ الْمَسْكَنَةُ ۗ وَ بَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ (2:61) ان پر ذلت اور مسکنت کی مار ماری گئی، پستیوں کے گڑھے میں جا پڑے، ان کی حرکت مبدل بہ سکون ہوگئی اور حرکت کا ہی دوسرا نام زندگی ہے، یہ ختم ہوجائے تو اس کے بعد نفس شماری تو رہتی ہے، زندگی باقی نہیں رہتی۔ بنی اسرائیل کی داستان میں یہ دونوں نقاط انتہا کو پہنچے ہوئے ہیں، عروج ہے تو اس انداز کا کہ جسے آج بھی آپ سطوت داودی علیہ السلام اور شوکت سلیمانی علیہ السلام کے نام سے پکارتے ہیں اور ذلت ہے تو پھر ایسی کہ دنیا میں The Wandering Jews (آوارہ یہودی) ان کے لیے ایک خاص Epithet (لقب) بن کر رہ گیا۔ اور پھر اس لیے بھی کہ قرآن کی اولیں مخاطب عرب قوم ان کے احوال و کوائف سے اچھی طرح واقف تھی۔ یہ انہی میں رہتے سہتے تھے اور باقی دنیا میں ان کی داستان کچھ ڈھکی چھپی نہیں تھی۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مورث اعلیٰ کی حیثیت سے قوم بنی اسرائیل اور بنی اسماعیل کا تعارف

حضرت ابراہیم علیہ السلام، جنہیں بنی اسماعیل اور بنی اسرائیل، دونوں اقوام کا، مورث اعلیٰ قرار دیا جاتا ہے، کا تعارف تمہیداً عرض ہے کہ ان کے پوتے (حضرت اسحاق علیہ السلام کے بیٹے) حضرتِ یعقوب علیہ السلام فلسطین میں رہتے تھے۔ آپ کو معلوم ہے کہ حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کے ایک بیٹے حضرت اسحاق علیہ السلام تھے۔ وہ تو فلسطین کی سرسبز و شاداب آبادیوں کے وارث قرار پائے تھے اور دوسرے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام نے تولیتِ کعبہ کی خدمت اپنے ذمہ لی تھی اور یہ تھا وہ ذبحِ عظیم، بہت بڑی قربانی، جو انہوں نے دی تھی۔ یہ قوم جو فلسطین میں آباد ہوئی، اس کے لیے ذہن میں رکھیے کہ حضرتِ یعقوب علیہ السلام کا لقب اسرائیل تھا یعنی ''خدا کا مجاہد''۔ ان کے بیٹوں میں سے ایک (چوتھے بیٹے) کا نام یہودہ (Juda) تھا اور دوسرا بن یامین تھا۔ ان دو قبائل نے فلسطین میں سکونت اختیار کی (ان کے ان دو اسباط پر مشتمل ایک سلطنت تھی جس کا مرکز یروشلم تھا)۔ اور جو باقی دس قبائل تھے، یہ دوسری جگہ آباد ہوئے۔ (ان دس اسباط پر مشتمل دوسری سلطنت تھی جس کا دارالحکومت سماریہ تھا)۔ یہ جو دو قبیلے (یہودہ اور بن یامین) فلسطین میں تھے، یہودہ کی نسبت سے انہیں یہودی بھی کہا گیا اور باقیوں نے اپنے آپ کو بنی اسرائیل کہلایا لیکن آگے چل کر ان دونوں کا یہ امتیاز ختم ہوگیا اور ان سب کو یا یہودی ہی کہا جانے لگا یا یہ لوگ بنی اسرائیل کہلائے۔ یہ جو اسرائیل کے باقی دس قبائل (Ten Tribes) تھے، ان کے متعلق تو تاریخ میں پتہ ہی نہیں چلتا کہ ان کے ساتھ کیا ہوا[1]۔ یہ جو وہاں بسنے والے دو قبیلے (یہودہ اور بن یامین) تھے حضرتِ یوسف علیہ السلام انہیں باں شوکت وحشمت اپنے والد حضرت یعقوب علیہ السلام سمیت مصر میں لے گئے تھے۔ یہ وہاں جا کر متمکن ہوئے اور وہاں حضرت یوسف علیہ السلام کو جو تمکن اور حشمت حاصل تھی، اس کی بنا پر یہ پورا خاندان بڑی باعزت زندگی بسر کرتا تھا۔ یہ خاندان وہاں آہستہ آہستہ پھیلتا ہوا ایک قوم بن گیا۔

حضرت یوسف علیہ السلام کی قوم چار سو سال تک قبطی قوم فراعنہ کی غلامی کے شکنجے میں رہی

عزیزانِ من! اب اس کے ساتھ ہی (جب ان کی مرکزیت ختم ہوگئی) سیرت و کردار کی وہ بلندیاں ان میں نہ رہیں جنہوں نے یوسف علیہ السلام کو ایک بکتے ہوئے غلام کی پوزیشن سے اٹھا کر حکمرانی عطا کر دی تھی۔ جب ان کے کردار میں وہ خصوصیات باقی نہ رہیں تو یہ وہاں کی قبطی قوم فراعنہ کی غلامی کے اندر جکڑے گئے۔ قریب چار سو سال کا عرصہ، یہ اس سخت قسم کی غلامی میں رہے۔ اسے فرعون کی غلامی کہا جائے گا۔ فرعون کسی بادشاہ کا نام نہیں، مصر کے بادشاہوں کا لقب فرعون تھا، جیسے ایران کے شہنشاہ کسریٰ کہلاتے تھے، رومن امپائر

---

[1] ان کے متعلق اِدھر اُدھر سے اکٹھے کیے گئے قیاسی سراغ کے لیے دیکھیے: تواریخ حافظ رحمت خانی۔ مع حواشی، پشتو اکادمی، پشاور یونیورسٹی، 1976، نیز پرویزؒ: مطالب الفرقان جلد دوم، ادارہ طلوع اسلام، لاہور، 1983، ص-159۔

والوں کو قیصر کہا جاتا تھا' تو ان کا لقب فرعون تھا۔ یہ سورج دیوتا' آمن راع کی پرستش کرتے تھے اور شہنشاہ اپنے آپ کو اس دیوتا کا اوتار کہلاتا تھا۔ یہ جو ''آمن راع'' ہے' یہ اس سورج دیوتا کا نام ہے' (جو دیوتاؤں میں سب سے بڑا تھا)' اس کے اوتار کو فاراع کہتے تھے تو اس سے لقب فرعون ہوا۔ فرعون کے معنی تھے ''سورج دیوتا کا اوتار''۔ پھر ان کا اقتدار کتنا تھا' یوں کہیے کہ ان کا استبداد کس قسم کا تھا' اس کے لیے تو آج تک فرعونیت ضرب المثل بنی آ رہی ہے۔

ملوکیت یعنی فرعونی سیاست کے تین شعبے اور ان کا کردار

بنی اسرائیل کے لیے قرآن کہتا ہے کہ یہ صرف ملوکیت کا استبداد ہی نہیں تھا' آپ تاریخِ انسانیت پر غور کیجیے' تو نظر آئے گا کہ انسانیت کو کچلنے کے لیے تین ہی مستبد قوتیں کارفرما رہی ہیں: ملوکیت کا استبداد' مذہبی پیشوائیت کی دسیسہ کاریاں' اور نظامِ سرمایہ داری کی خون آشامیاں۔ شعبے تو یہ تین الگ ہیں' اصل میں یہ تینوں ایک ہی ہیں۔ ان کے اندر یہ روح کارفرما ہوتی ہے کہ دوسروں کی احتیاج سے فائدہ اٹھا کر ان کی محنت کو غصب کیا جائے۔ نظامِ سرمایہ داری ان کو محتاج بناتا ہے' ملوکیت طبعی قوت فراہم کرتی ہے اور ان کے احتیاج سے فائدہ اٹھاتی ہے اور درمیان میں مذہبی پیشوائیت ان کو افیون دے دے کر سلاتی رہتی ہے کہ یہ سب خدا کی تقدیر سے اور قسمت سے ہوتا ہے' کسی شخص کو اس کا حق حاصل نہیں ہے کہ وہ خدا کے فیصلوں کے خلاف لب پر حرفِ شکایت لائے۔ یہ حرفِ شکایت لانا تو ایک طرف' اس کے لیے تو یہ بھی نہیں ہے کہ دل میں بھی کسی قسم کی گلہ گزاری کرے۔ یہ تینوں' حقیقت میں' ایک ہی سکہ ہوتا ہے جس کے یہ رخ ہوتے ہیں۔ ان میں سے ایک ایک لعنت بھی انسانیت کو کچلنے کے لیے کچھ کم نہیں ہوتی لیکن جس دور میں یہ تینوں اکٹھی ہو جائیں تو آپ سوچ سکتے ہیں کہ ان کے نیچے انسانیت کس طرح تڑپتے پھڑکتے زندگی بسر کرتی ہوگی۔ بنی اسرائیل کے ساتھ مصر میں یہی ہوا۔ فرعون ملوکیت کا مجسمہ' ہامان مذہبی پیشوائیت کا نمائندہ اور قارون سرمایہ داری کے نظام کا ترجمان تھا۔ یہ تینوں یکجا تھے اور ان کی غلامی میں بنی اسرائیل کی مظلوم قوم تھی۔ آپ نے دیکھا کہ قرآن اپنے اس دعوے کی صداقت میں جو تاریخی شہادت لایا ہے' وہ کتنی جامع ہے۔ الگ الگ اقوام کو آپ لیں گے تو ان میں یہی قوتیں کارفرما ہوں گی۔ یہاں ایک ایسی قوم ہمارے سامنے آتی ہے جن کے اوپر ان تینوں مستبد قوتوں کا پورا جال چھایا ہوا تھا۔ یہ ہے وہ دور جس سے قرآن داستانِ بنی اسرائیل کی ابتدا کرتا ہے۔

کہتا ہے کہ وَ اِذۡ نَجَّیۡنٰکُمۡ مِّنۡ اٰلِ فِرۡعَوۡنَ یَسُوۡمُوۡنَکُمۡ سُوۡٓءَ الۡعَذَابِ (2:49)۔ چار سو سال کی غلامی کے بعد ان میں صاحبِ ضربِ کلیم علیہ السلام ہو گئے۔ انہوں نے ان تین بڑی مہیب قوتوں کے ساتھ آ کر ٹکر لی' اس سے آپ نے یہ بھی دیکھ لیا ہوگا کہ حضرات انبیائے کرام علیہم السلام محض وعظ کہنے کے لیے نہیں آیا کرتے تھے' یہ عظیم انقلابی دعوتوں کے پیامبر ہوتے تھے۔ یہ وہ دور ہے جہاں سے اس

داستان کی ابتدا ہوتی ہے۔ انہیں بتایا یہ جاتا ہے کہ اپنی تاریخ کے اس دور کو یاد کرو جب تم فرعون کے پنجۂ استبداد میں اس طرح جکڑے ہوئے تھے: یَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ (2:49). یہ یَسُوْمُوْنَكُمْ عجیب لفظ ہے' اس کے معنی ہوتے ہیں ''ڈھونڈ ڈھونڈ کر کسی کے خلاف عذاب کی' سزا کی اور تباہی کی تدبیریں اختیار کرنا' تلاش کر کر کے ڈھونڈ ڈھونڈ کر یہ چیزیں لانا''۔

فرعونیت (ملوکیت) کی سب سے بڑی گرفت کا ذکر نیز ذبح کرنے کا مفہوم

اب اس میں قرآن نے سب سے بڑی جو گرفت بتائی ہے' وہ یہ ہے کہ یُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَ كُمْ وَ یَسْتَحْیُوْنَ نِسَآءَ كُمْ (2:49)۔ اس کا عام ترجمہ یہی کیا جاتا ہے کہ وہ تمہارے بیٹوں کو ذبح کر دیتا تھا اور بیٹیوں کو زندہ رکھتا تھا۔ تورات میں یہ چیز ہے کہ وہ سچ مچ پیدا ہونے والے لڑکوں کو مروا دیتا تھا' ان کی لڑکیوں کو زندہ رکھتا تھا لیکن تاریخ نے ابھی تک اس کی شہادت ہم نہیں پہنچائی کہ فی الواقعہ یہ یوں ہوتا تھا کہ بنی اسرائیل کے ہاں جو لڑکا پیدا ہوا' اس کو پیدا ہونے کے ساتھ ہی مروا دیا اور لڑکیوں کو زندہ رکھا۔ قرآنِ کریم نے جو الفاظ استعمال کیے ہیں' ان سے نگاہ کا رخ دوسری طرف بھی جاتا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ میں ایک تو جو عام مروجہ معنی ہوتے ہیں' انہیں پیش کر دیا کرتا ہوں' میں اس پہ اصرار نہیں کیا کرتا کہ جو کچھ میں سمجھا ہوں' آپ بالضرور اس سے اتفاق کریں لیکن جب میں بیان کروں گا تو بہر حال وہی بیان کروں گا جو میری قرآنی بصیرت نے مجھے سمجھایا ہے۔ آپ اپنے طور پہ اس پہ غور کر لیجیے اور آپ جس چیز سے اتفاق کریں' اپنے ہاں اسے قبول کیجیے۔

ذبح ابناء میں ذبح کا لفظ غور طلب ہے۔ عربی زبان میں بھی اور قرآنِ کریم میں بھی ''ذبح'' کے معنی سچ مچ گلا کاٹنا نہیں ہوتا' ان کے ہاں قتل' ذبح کے الفاظ ''ذلیل کرنے'' کے معنوں میں بھی آتے ہیں' ''پامال کرنے'' کے معنوں میں بھی آتے ہیں۔ اس نے تو انہیں مار ڈالا صاحب! ہمارے ہاں محاورۃً یہ چیزیں عام استعمال ہوتی ہیں' مثلاً اس کو صاحب! ذبح کر کے رکھ دیا' انسانیت وہاں ذبح ہوتی ہے۔ اصل یہ ہے کہ ہم عربی زبان کا قرآن جب پڑھتے ہیں تو ہم یہ نہیں دیکھتے کہ اس زبان کے اندر یہ الفاظ کن معنی میں استعمال ہوتے تھے۔ ہم ان کا ایک مفہوم لے لیتے ہیں جو ہمارے ہاں استعمال ہوتا ہے اور اسی مفہوم کی رو سے ہم ان آیات کا مفہوم متعین کر لیتے ہیں ورنہ اگر عربی زبان سے ہی پوچھا جائے تو وہ بتائے گی کہ یہ مفہوم اس سے کہیں زیادہ وسعت اپنے اندر رکھتا ہے۔ ابنائے قوم آپ آج بھی استعمال کرتے ہیں' اس کے معنی ہوتے ہیں قوم کے اندر جوہرِ مردانگی رکھنے والے افراد۔ ان افراد کو ابنائے قوم کہا جاتا ہے حالانکہ معنی اس کے ہاں قوم کے بیٹے ہی ہوں گے۔ قوم کے ایسے افراد جن میں جوہرِ مردانگی ہو' انہیں وہ اس طرح سے دبا کر رکھتا تھا کہ وہ ابھرنے ہی نہ پائیں' انہیں ذلیل کرتا تھا اور انہیں آگے بڑھاتا تھا جن میں اس قسم کے مردانگی کے خصائص نہ ہوں' جسے عام محاورے کے اعتبار سے کہتے

ہیں کہ ان کے اندر زنانہ پن ہو۔ میں اپنی بیٹیوں اور بہنوں سے معذرت چاہوں گا کہ قرآن یہ نہیں کہتا کہ عورت ہونا یا عورت کے اندر کی جو خصوصیات ہیں، ان کو کسی طرح سے حقارت کی نگاہ سے دیکھا جائے۔ اس کے نزدیک مرد اور عورت دونوں انسان ہیں، یکساں واجب الاحترام ہیں۔ میں نے بات کی ہے ان قوموں کی ذہنیت کی اور زبان کے اس اعتبار سے جو ایک چیز مروج چلی آتی ہے۔ مختلف قومیں قوموں کو تباہ کرنے کے لیے کرتی ہی یہ ہیں۔

غلامی کا سب سے بڑا ہتھیار یہ ہے کہ باصلاحیت افراد کو اُوپر اٹھنے ہی نہ دیا جائے یا انہیں اپنا مقرب بنالیا جائے جو جوہرِ انسانیت سے عاری ہوں

قرآنِ کریم نے خود یہ چیز بتائی ہے کہ فرعون یہ کیا کرتا تھا۔ یاد رکھیے! کسی قوم کو خواہ وہ غلامی کے شکنجے میں بھی کیوں نہ جکڑی ہوئی ہو، اپنے استبداد کے جوئے کے نیچے رکھنا بڑی تدبیر چاہتا ہے اور یہ وہ تدبیر ہوتی ہے کہ اس قوم کے اندر ابھرنے والے جو افراد ہیں، ان کو ابھرنے نہ دیا جائے اور ان میں سے انہیں مقرب بنایا جائے، جنہیں ہمارے ہاں کی پہلی سیاسی اصطلاح میں، یور پی بچہ ہائے ہائے، کہا کرتے تھے، جو ان کے مطلب کے ہوں اور انسانیت کے جوہر سے عاری ہوں، انہیں مقرب بنایا جائے، انہیں آگے بڑھایا جائے تا کہ یہ بھی معلوم ہو کہ ہم نے اس قوم کو حقِ نمائندگی دیا ہوا ہے۔

انگریز کے دور کی تاریخ ہمارے ہاں کی نئی نسل کے سامنے تو ہے نہیں، بدقسمتی سے نہ ہی ہم نے کوئی ایسی تاریخ مرتب کر کے دی ہے ورنہ انہیں معلوم ہوتا کہ خود تحریکِ پاکستان کے دور میں لوگ کیا کیا کرتے تھے، یہ حاکم قوم کیا کیا کرتی تھی۔ وہ اس قوم کے ہمارے افراد کو آگے بڑھایا کرتی تھی، دنیا کو بتایا کرتی تھی کہ ہم نے تو انہیں اتنی بڑی نمائندگی دی ہوئی ہے، جو بلند ترین مناصب تھے، وہ ان کو دیدیئے جاتے تھے لیکن چن چن کر ان افراد کو دیتے تھے جن میں جوہرِ مردانگی نہ آنے پائے اور جس میں ذرا سا بھی انہیں نظر آتا تھا کہ حریت کے جوہر پائے جاتے تھے، وہ اس طرح سے ان کو کلک کر دیتا تھا جیسے ہمارے ہاں کے بڑے بڑے باغوں کے مالیوں (Gardners) نے اپنی ذہنی شکل کے اوپر پودوں کو بنایا ہوا ہوتا ہے، اور اس پودے میں سے کوئی کونپل جو اس نقشے میں سے ذرا الگ ہٹ کر، سر ابھارتی ہے، ایک دم قینچی سے اس کو کلک کر دیتا ہے۔ یہ استبداد ہوتا تھا اور یہ کسی خاص دور کی بات نہیں ہے۔ قرآن نے، جیسا کہ ملکۂ سبا نے کہا ہے دہرایا ہے کہ جہاں بھی ملوکیت ہوتی ہے، وہاں یہی کچھ ہوا کرتا ہے (27:34)۔ یہ آپ دیکھیے گا کہ یہی جو ذبح ابناءٔ، وَ یَسۡتَحۡیُوۡنَ نِسَآءَکُمۡ، الفاظ ہیں: یہ آئے کہاں ہیں۔ اس سے آپ اندازہ لگائیں گے کہ قرآن کا بات کو سمجھانے کا انداز کیا ہے۔

قرآن حکیم کو سمجھنے کا طریق نیز قوم کو پارٹیوں میں الجھائے رکھنے کے فرعونی عمل کی وضاحت

میں نے عرض کیا تھا کہ اس کا انداز یہ ہے کہ پہلے تو زبان کے اشتقاقات کی رو سے، Roots (مادوں) کی طرف سے، جہاں سے وہ

لفظ بنا ہے' وہاں معنی دیکھیے اور قرآن کے دوسرے مقامات میں اس کی تشریح دیکھیے۔ اب دیکھیے یہاں کیسے تشریح ہو رہی ہے۔ کہا ہے کہ اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِی الْاَرْضِ (28:4) فرعون نے بڑی سرکشی اختیار کر رکھی تھی۔ یہ سرکشی کن سہاروں پہ استوار تھی؟ وہ کرتا یہ تھا کہ وَجَعَلَ اَهْلَهَا شِيَعًا (28:4)۔ وہ ایک پارٹی کو ایک گروہ کو وَ جَعَلَ اَهْلَهَا شِيَعًا يَّسْتَضْعِفُ طَآئِفَةً مِّنْهُمْ (28:4)۔ اس طرح پارٹیاں بناتا رہتا تھا' ایک پارٹی کو کمزور کرتا تھا' دوسری پارٹی کو ابھارتا تھا۔ حکمتِ فرعونی ہے ہی یہ کہ قوم میں وحدت نہ رہنے دیجیے' ان کو پارٹیوں میں تقسیم کر دیجیے۔ اور پارٹیاں اس انداز سے بنائیے کہ ان میں سے ایک گروہ کو اوپر چڑھائیے' دوسرے کو ذلیل کیجیے۔ اور الفاظ دیکھیے يُذَبِّحُ اَبْنَآءَهُمْ وَ يَسْتَحْيِ نِسَآءَهُمْ (28:4) اس چیز کی وہ خود تشریح کرتا ہے کہ وہ کرتا کیا تھا اور ان الفاظ کے معنی کیا ہیں۔ وہ اس طرح سے پارٹیاں بناتا تھا کہ جہاں محکوم قوم کے افراد میں' اس کو کچھ مردانگی کا کہیں شعور' جوہر نظر آئے' اس کو ذبح کر کے رکھ دیا جائے اور ان میں سے جو لوگ زنانہ خصلتوں کے مالک ہوں' ان کو ابھارا جائے اور اس طرح سے وہ اپنے ہاں یوں اس قوم کے اندر تفرقہ ڈال کر' اس قسم کی حکمتِ فرعونی سے' اپنی سرکشی کو استوار رکھتا تھا۔

بات صاف ہے' برادرانِ عزیز! کہ وہ کرتا یہ تھا ورنہ ویسے بھی سوچا جائے کہ اگر یہ چیز کچھ تھوڑے ہی عرصے کے لیے کسی قوم میں روا رکھی جائے کہ ان کے ہاں کے جو لڑکے ہوں' ان سب کو مروا دیا جائے' کچھ عرصے کے بعد وہ قوم ہی ختم ہو جاتی ہے اور بنی اسرائیل کی قوم تو تاریخ کے کسی دور میں بھی ختم نہیں ہوئی۔ اس کے بعد اور چیزیں بھی ہمارے سامنے آتی ہیں۔ یہی چیز جو ہے کہ ملوکیت کرتی کیا ہے میں نے کہا تھا کہ قرآنِ کریم میں دوسری جگہ سورۂ نمل میں ملکہ سبا کی زبان سے ہے۔ اس نے اہل دربار سے مشورہ کیا کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے' وہ جو حضرتِ سلیمان علیہ السلام فوج کشی کر کے آئے تھے۔ وہ تو جب میں اس قصے پہ آؤں گا تو اس کی تفصیل اس وقت بیان کروں گا' اس وقت صرف ایک چھوٹی سے بات کہنی ہے۔ ملکہ سبا کے اہل دربار نے کہا کہ نہیں! ان کے ساتھ ہمیں لڑائی کرنی چاہیے۔ وہ یہ کہتی ہے کہ قَالَتْ اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا (27:34) تمہیں پتہ نہیں۔ دیکھیے یہاں بھی قرآن نے جو وہ (28:4) میں کہا تھا کہ: اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ (28:4) یاد رکھیے! وہ جو فرعون ہے' وہ مفسدین میں سے تھا' فساد برپا کرتا تھا۔ میں نے آپ سے عرض کیا تھا کہ ہمارے ہاں آج تو فساد کے معنی صرف دنگا فساد ہے' لڑائی جھگڑا ہے۔ فساد کے معنی ہوتے ہیں ''ناہمواریاں پیدا کرنا''۔ ''ہل وہائی ہوئی زمین اچ جیہڑے ڈھیلے ہوندے نیں او ہوندا اے فساد۔ جیس ویلے اوہدے تے سہاگا پھیر دیے تے او صلح کلہاندی ہیگی ❶''۔ فساد ہمواریاں پیدا کر دینا ہے۔ مفسد ناہمواریاں پیدا کرتا رہتا تھا۔ اب دیکھ لیا کہ وہ کیسے ناہمواریاں پیدا کرتا تھا۔ یہاں پھر یہ چیز آئی تھی کہ ابناء کو ذبح کرتا تھا' نساء کو وہ زندگی دیتا تھا۔ اب اس کی یہ تفصیل دیکھیے۔

---

❶ ہل چلائی ہوئی زمین میں جو ڈھیلے ہوتے ہیں' وہ ''فساد'' ہوتا ہے۔ جس وقت ان پہ سہاگا پھیر دیں تو وہ ''صلح'' کہلاتی ہے۔

کسی جابر سلطان کا کسی دوسرے ملک پر حملہ کرنے کے بعد اس کا پہلا ردِ عمل

ملکہ سبا کہتی ہے کہ دیکھیے! جب بادشاہ بھی کسی بستی میں کسی ملک میں کسی قوم میں حملہ کرنے کی حیثیت سے داخل ہوتے ہیں۔ **اَفۡسَدُوۡهَا** (27:34)۔فساد کے معنی دنگا فساد نہیں ہے یہ بات آپ آگے دیکھیے کہ قرآن کیا کہتا ہے: وہ وہاں پہلا کام یہ کرتے ہیں کہ ناہمواریاں پیدا کرتے ہیں۔کس قسم کی ناہمواریاں پیدا کرتے ہیں؟ کہا ہے کہ **وَجَعَلُوۡۤا اَعِزَّةَ اَهۡلِهَاۤ اَذِلَّةً** (27:34) اس قوم کے اندر جو سر برآوردہ شخصیتیں ہوتی ہیں سب سے پہلے یہ انہیں ذلیل کرتے ہیں۔دیکھیے یہاں اعزة اور اذلة الفاظ آگئے ہیں۔کہا ہے کہ وہ کرتے یہ ہیں۔اور قرآن کی اگلی بات قابلِ غور ہے۔قرآن کی کیا بات ہے! بات یوں ہو رہی ہے جیسے کسی پہلے دور کی ملکہ سبا کا ایک قول ہے اضافہ اس پہ یہ کرتا ہے۔کہا ہے کہ **وَكَذٰلِكَ يَفۡعَلُوۡنَ** (27:34) کسی ایک بادشاہ کی بات نہیں ہے ملوکیت جہاں بھی ہوگی یہی کرے گی۔یہ کون لوگ تھے جنہیں اس طرح سے ذبح ابناء کہا ہے جن کو یہ ذبح کرتا رہتا تھا کہ یہ ابھرنے نہ پائیں۔سنیے! یہ کون سے ابناء تھے؟ قوم و عوام تو وہ تھی کہ جو Slaves (غلام) تھے وہ اپنی اس خوئے غلامی میں پختہ ہو چکے ہوئے تھے اور اس پہ بالکل راضی تھے۔قفس کے پرندے کی طرح ان کی کیفیت یہ ہو چکی تھی آگے اس کی تشریح آئے گی کہ وہ خوئے غلامی میں اتنے پختہ ہو چکے تھے کہ وہ یہی کہتے تھے:

نے تیر کماں میں ہے نہ صیّاد کمیں میں
گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

(مرزا اسد اللہ خاں غالب)

غلامی میں بدل جاتے ہیں قوموں کے ضمیر

آگے آپ دیکھیں گے کہ جب ان کو قفس سے نکال کر صاحبِ ضربِ کلیم علیہ السلام اپنے یدِ بیضا کی روشنی میں ان کو آزادی کی فضاؤں میں لے جا رہے ہیں قدم قدم پہ اس کے ساتھ جھگڑتے ہیں لڑتے ہیں کہ تو ہمیں تباہ کر رہا ہے برباد کر رہا ہے کہاں لیے جا رہا ہے اور وہاں تورات میں کہا ہے کہ ہم ان کے باورچی خانے میں جب ہم باورچی کا کام کرتے تھے تو ان کی ہنڈیا میں سے بچا ہوا جو سالن کھاتے تھے اس کی لذتیں ہمیں بھول ہی نہیں رہیں۔ان کے عوام کی تو یہ حالت تھی لیکن ان کے اندر ایسے افراد تھے جنہوں نے دعوتِ حضرتِ موسیٰ علیہ السلام پہ لبیک کہا۔دیکھیے کہ وہ کن کو ذلیل کرتا ہے۔کہا ہے کہ **وَلَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا مُوۡسٰى بِاٰيٰتِنَا وَسُلۡطٰنٍ مُّبِيۡنٍ** (40:23) ان کی طرف اس صاحبِ ضربِ کلیم علیہ السلام کو بھیجا تھا۔ **اِلٰى فِرۡعَوۡنَ وَهَامٰنَ وَقَارُوۡنَ** (40:24) فرعون ہامان اور قارون کی طرف۔ **فَلَمَّا جَآءَهُمۡ بِالۡحَقِّ مِنۡ عِنۡدِنَا** (40:25) جب وہ ایک ضربِ کلیمی لیے ہوئے آ گیا **قَالُوا اقۡتُلُوۡۤا اَبۡنَآءَ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا**

مَـعَـهٗ (40:25) فرعون نے کہا کہ جو جو شخص بھی تمہیں اس کا ہمنوا نظر آئے' جو اس کی آواز پہ لبیک کہے' اس کو یا تو قتل کر دیا' اس کے معنی ہیں کہ اس کو ذلیل کرو وَاسۡتَحۡيُوۡا نِسَآءَهُمۡ (40:25) اور یہ جو باقی' اس قوم کے اندر یہ بالکل زنخے پھرتے ہیں' ان کو مقرب بناؤ' ان کو حیات کے سامان دو۔ موسیٰ علیہ السلام کی آواز پہ لبیک کہنے والوں کو ذلیل کر دیا قتل کرو۔

یہ ابنائے قوم تھے' عزیزانِ من! اور آگے تو بات بالکل صاف ہوگئی۔ اگر یہ سچ مچ کے ذبح کرنے والی بات ہے تو وہ تو کھلے بندوں کچھ کرنے کی چیز ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ وَمَا كَيۡدُ الۡكٰفِرِيۡنَ اِلَّا فِىۡ ضَلٰلٍ (40:25)۔ ''کید'' کہتے ہیں ''خفیہ تدبیر کو''۔ یہ اس کی اس قسم کی خفیہ سازش تھی' سچ مچ کسی کو قتل کر دینا' یا پھانسی دیدینا تو خفیہ سازش نہیں کہلاتی۔ سازش تو یہ ہے کہ خون کا آخری قطرہ تک نچوڑ لیا جائے لیکن ہاتھ کے اوپر کہیں اس کی رنگینی نہ آنے پائے۔ ذبح ہونے والا ذبح ہو رہا ہے اور اپنے قاتل کو دعائیں دے رہا ہے' کید اسے کہتے ہیں۔ آپ نے دیکھا کہ قرآن کیا لفظ لاتا ہے۔ یہ اس کی ایک خفیہ تدبیر تھی' جس کی رو سے وہ ایسے ابنائے قوم جن کے متعلق اسے خدشہ تھا کہ وہ دعوتِ موسوی پر لبیک کہہ کر خطرے کا موجب بن جائیں گے' وہ ان کے متعلق ایسی خفیہ تدبیریں کرتا تھا کہ ان کو ذلیل وخوار رکھا جائے' پیچھے رکھا جائے' کچل کر رکھ دیا جائے اور یہ کہنے کے لیے کہ ہم تو اس قوم کے ان افراد پہ زیادتی نہیں کرتے ہیں کہ جن کے متعلق اس قسم کا کوئی خطرہ نہ ہو' وہ انہیں آگے بڑھاتا تا اور اوپر چڑھاتا تھا۔ یہ ہے وَجَعَلُوۡۤا اَعِزَّةَ اَهۡلِهَاۤ اَذِلَّةً (27:34) ملوکیت کرتی یہ ہے کہ جن میں ذرا سی بھی وہ نمود کی صلاحیت دیکھتی ہے' انہیں کچل کر رکھ دیتی ہے۔ جو لوگ حضرتِ موسٰی علیہ السلام کی دعوت پر ایمان لانے والے ہوں' ان کو کچل کر رکھ دو۔ پھر بات صاف ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ اس کے بعد بہر حال میری قرآنی بصیرت نے جس نتیجے پر پہنچایا ہے' آپ دیکھ رہے ہونگے کہ میں نے اس کی تائید میں قرآن کی شہادات پیش کی ہیں کہ یہ بات سچ مچ ان لڑکوں کے قتل کر دینے کی نہیں تھی' بلکہ ابنائے قوم کو ذبح کرنے کی بات تھی' کچلنے کی بات تھی اور قوم کے اس قسم کے طبقے کو بڑھانے اور چڑھانے کی بات تھی۔ کہا ہے کہ یاد رکھو! فرعون ڈھونڈ ڈھونڈ کر تم پر عذاب لایا کرتا تھا اور سب سے بڑا عذاب یہ تھا کہ تمہاری قوم کے سر برآوردہ افراد کو ذلیل کرتا تھا اور اس قسم کے افراد کو چڑھاتا تھا۔ اِذۡ نَجَّيۡنٰكُمۡ (2:49) ہم نے تمہیں اس کے اس عذاب سے نجات دلائی۔ نظر آتا ہے کہ یہ بات اس دور سے شروع ہوئی ہے جب یہ مصر سے نکل کر فلسطین (کنعان) کی وادیوں میں چلے گئے اور وہاں آزادی کی فضاؤں میں پر کشا ہوئے۔

لفظ ''بلآء'' کا ہمارے ہاں کے غلط تراجم کے برعکس قرآنی مفہوم

اگلے الفاظ ہیں کہ وَفِىۡ ذٰلِكُمۡ بَلَآءٌ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ عَظِيۡمٌ (2:49)۔ اس کا ترجمہ پھر یہ کیا جاتا ہے کہ تم اس سے بہت بڑی ''بلا''

میں گرفتار تھے۔ اگر وہ پہلا دور ہے جس میں وہ فرعون کی غلامی کے اندر جکڑے ہوئے تھے تو اسے تو ''بلآء'' کہا جائے گا لیکن یہاں تو آ گیا ہے کہ مِّنۡ رَّبِّکُمۡ عَظِیۡمٌ (2:49) اپنے رب کی طرف سے ایک ''بلاء'' کے اندر تھے۔ تو رب کی طرف سے تو ''بلاء'' نہیں آتی۔ قرآن نے تو واضح طور پر کہا ہے کہ جو مصیبت بھی تمہارے اوپر آتی ہے وہ فَبِمَا کَسَبَتۡ اَیۡدِیۡکُمۡ (42:30) تمہارے اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی ہوتی ہے، خدا تو کسی کو مصیبتوں میں مبتلا نہیں کرتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ جو لفظ بلاء ہے، یہ عربی زبان کا لفظ ہے اور ہم ''پنجابی زبان دی بلا سمجھنے ہیگے آں [1]''۔ ہمارے ہاں تو بلا، ابتلا، مبتلا، ایک ہی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

عربی زبان میں بلاء کے معنی ہوتا ہے ''گردش دے کر کسی کا پہلو بدل دینا''۔ تمہاری غلامی کے زمانے کی پہلی کیفیت یہ تھی کہ فرعون یہ کچھ کرتا تھا، ہم نے ایک گردش دی اور اس گردش سے جو تمہارا پہلو بدلا ہے، دیکھو تو سہی، خدا کی طرف سے یہ کتنا بڑا انعام ہو گیا۔ یہ ٹھیک ہے کہ گردش دینے میں دونوں چیزیں آ جاتی ہیں: قوم کے اپنے ہاتھوں کی لائی تباہیوں سے بھی ایک گردش ہوتی ہے کہ جتنے انعاماتِ خداوندی ہوتے ہیں، وہ سارے چھن جاتے ہیں، ذلت ہوتی ہے، یہ بھی ایک بلا ہے اور اگر کوئی قوم ذلت کے گڑھے میں گری ہوئی ہے اور اس میں سے نکل کر ایک گردش سے وہ دوسرا پہلو لیتی ہے تو اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡہِمۡ (1:7) ہے اور اذۡکُرُوۡا نِعۡمَتِیَ الَّتِیۡۤ (2:40) یہ نعمت کی چیز ہے۔ ''بلاء'' کے معنی ''گردش'' کے ہوتے ہیں۔ یاد رکھیے! اگر بری حالت سے اچھی حالت میں آتا ہے تو یہ انعام ہے اور اگر اچھی حالت سے بری حالت کی طرف وہ گردش لے جاتی ہے تو یہ تباہی اور عذاب ہے۔ پہلی چیز یہ پیش کی۔

قرآن اور پیچھے گیا، عزیزانِ من! اگر اس نقطۂ خیال سے بھی دیکھا جائے کہ یہ کہانی کو بیان کیسے کرتا ہے۔ ایک تو یہ انداز ہوتا ہے کہ شروع سے بات لی جائے اور اس کے ساتھ ساتھ آخر تک چلایا جائے، یہ Narration ہوتا ہے، ڈرامائی نہیں ہوتا۔ ڈرامائی یہ ہوتا ہے کہ کسی کلائمکس سے بات شروع کی جائے اور کبھی اسی کے اندر سے پیچھے لے جائے، پھر وہاں سے ایک لنک آگے جا کر ملا دے۔ اور یوں جو محاکاتی تصویر سامنے آتی ہے اس میں ایک تنوع ہوتا ہے، اس سے ذہن بور نہیں ہوتا۔ بہرحال یہ دوسری بات ہے جہاں قرآن کے یہ انداز آئیں گے۔ میں عرض کروں گا کہ وہ کس انداز سے بات کرتا ہے۔ ادبی نگاہ سے بھی یہ عجیب کتاب ہے۔ وہاں کی بات ہو رہی ہے جب یہ کچھ کہا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے محلاتی تجربات اور وادیِ سینا کے گوشہ زندگی کے صبر آزما مراحل میں الداعی کا فریضہ

کہا ہے ذرا اس سے پیچھے چلو، وقت وہ آ گیا تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اس قوم کو مصر سے اپنے ساتھ نکال کر لے آئے۔ وہاں بھی بڑی

---

1. اور ہم پنجابی زبان میں جو ''بلا'' ہے، اسے سمجھتے ہیں۔

دلچسپ بات ہوئی تھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ چند الفاظ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی یہ بات بیان کردوں کہ یہ کہاں گئے' کیسے آئے۔ پیدا تو مصر میں ہوئے' پرورش فرعون کے محلات میں پائی تاکہ بساطِ سیاست کی مہرہ بازیوں سے بھی واقف ہو جائیں' ورنہ غلام قوم کے اس فرد کو یہ مواقع ہی نصیب نہیں ہو سکتے تھے جس سے معلوم ہو کہ ملوکیت کرتی کیا کچھ ہے اور ان کو تو نبرد آزمائی کرنی تھی' اتنی بڑی ملوکیت ہے' ضرورت تھی کہ جسے آپ محلاتی سیاست کہتے ہیں' اس سے بھی واقفیت ہو۔ یہ انتظام تھا اور ایک داعیٔ حقیقت کے لیے یہ ضروری ہے کہ ان چیزوں سے واقف ہو۔ پہلی زندگی کا حصہ محلات کے اندر بسر کیا گیا' وہ اچھی طرح سے واقف تھے کہ یہ کرتے کیا ہیں۔

اب وہ یہاں سے نکلے۔ اس کے بعد ایک داعی کے لیے بڑی ضرورت ہوتی ہے کہ وہ زندگی کے تمام نشیب و فراز سے واقف ہو' اگر آخر تک محلات ہی کے اندر رہتے تو یہ جو دوسرا گوشۂ زندگی تھا' یہ سامنے نہ آتا۔ یہاں سے جو نکلے ہیں تو پھر انہوں نے مدین کی وادیوں میں بارہ سال تک بکریاں بھی چرائی ہیں اور جو بکریاں نہیں چراتا' برادرانِ عزیز! وہ کبھی حکومت نہیں کر سکتا۔ نہیں' مجھے یوں کہنا چاہیے کہ حکومت تو وہ کر سکتا ہے' پرورش نہیں کر سکتا' حفاظت نہیں کر سکتا اور پھر اس کے لیے کتنے بڑے صبر آزما دل گردے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہم شہر کے رہنے والوں نے تو کبھی دیکھا نہیں' بکریاں کیا کیا کرتی ہیں۔ کبھی باہر جانے کا اتفاق ہو تو اس گڈریئے بیچارے کی حالت دیکھیے' رحم آتا ہے۔ سو پچاس کا بکریوں کا ایک ریوڑ ہو' کیفیت ان کی یہ ہوتی ہے کہ دو ادھر بھاگی جا رہی ہیں' بھاگا جا رہا ہے ان کو ادھر واپس لا رہا ہے' تین ادھر نکل گئی ہیں۔ سارا دن وہ تنا تو تو اور بھر بھر کر کے تھک جاتا ہے۔ بھاگ رہا ہے' بکری دس میل چلتی ہے گڈریا پچاس میل چلتا ہے۔ لاتا ہے تو ان کی ٹانگ نہیں توڑتا' بڑا صبر آزما مرحلہ ہوتا ہے غصہ تو اتنا آتا ہے لیکن یہ غصہ ایسا ہی ہوتا ہے جیسا ماں کا غصہ' ایک بگڑے ہوئے بچے پہ ہوتا ہے' مارتی ہے تو اس انداز سے کہ چوٹ زیادہ نہ آ جائے۔

عربی زبان میں الراعی کا مفہوم

عزیزانِ من! یہ عربی زبان والی عجیب قوم تھی' یہ جو اس قسم کا نگران ہوتا تھا' جسے بعد میں حکم کہا گیا ہے' اسے انہوں نے الراعی کہا تھا' گڈریا کہا تھا' رعیت کے لفظی معنی ہیں ''بکریوں کا ریوڑ''۔ اور اس کے بعد تو رعایا کے معنی ہی کچھ اور ہو گئے صاحب! اس کا ترجمہ Subject (رعایا) ہے' آپ دیکھتے ہیں کہ کس طرح سے اس کے اندر سے Subjugation (غلامی) آتا ہے۔ عربی زبان میں یہ بات نہیں تھی۔ یہ بڑی آزاد قوم تھی۔ انہوں نے لفظ ہی اس کے لیے رعیت اختیار کیا تھا' یہ راعی ہے' انہوں نے بارہ برس تک کا عرصہ اس مرحلے میں سے گزارا۔ یہاں سے یہ پتہ چلا کہ محنت کشوں پہ کیا گزرا کرتی ہے اور اس سفر کی تو ابتدا ہی اس سے ہوئی تھی۔

سرزمین مدین میں پیاسی بکریوں کا ماجرا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی حسّاس خیالی کا واقعہ

میں کیا کروں کہ قرآن کی بات جو آتی ہے تو چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ مصر میں دیکھا کہ ظلم اور استبداد کی کیا انتہا ہے' وہاں سے بھاگے' سب سے پہلے مدین کے باہر پیاؤ پر آئے۔ اس زمانے میں غلہ بانی' مویشی چرانا' یہی معیشت کا ذریعہ ہوا کرتا تھا۔ بستی کے باہر ایک چشمہ تھا' چشمے کے کنارے ایک درخت تھا' تھکے ہوئے تھے' دوپہر کا وقت تھا' درخت کے سائے میں ستانے کے لیے بیٹھ گئے۔ دیکھا کہ چرواہے لوگ آ رہے ہیں' اپنی اپنی بکریوں کو' بھیڑوں کو' پانی پلا رہے ہیں۔ دو لڑکیاں ہیں' قرآن کے الفاظ میں' عزیزانِ من! جن کی کیفیت یہ ہے کہ بکریاں پیاس کے مارے پانی کی طرف جا رہی ہیں اور وہ ان کو روک کر پیچھے ہٹا رہی ہیں۔ یہ دیکھ رہے ہیں کہ یہ انہیں آگے نہیں جانے دیتیں۔ انہوں نے ان سے پوچھا کہ! تم یہ کیا کر رہی ہو' انہیں کیوں نہیں آگے جانے دیتیں۔ بچیوں نے کہا کہ ہم غریب گھرانے کی بچیاں ہیں' گھر میں کوئی طاقتور مرد بھی نہیں ہے جو قوت بازو سے کچھ کر سکے' باپ بوڑھا ہے' ہم دونوں بچیاں ہیں۔ اب یہاں یہ لوگ اس پیاؤ کے اوپر صاحب قوت وثروت ہیں' جب تک ان کی بھیڑیں سیر ہو کر پانی نہ پی لیں گی ہماری بھیڑیں وہاں نہیں جا سکتیں' ہم روک رہے ہیں کہ پیاسی رہ جائیں' مار تو نہ دی جائیں۔ جس نے اتنی بڑی بھیڑوں کی رکھوالی کرنی تھی' وہ یہ کچھ کیسے سن لیتا۔ خاموشی سے اٹھا' ان کی بکریوں کو لیا' خود جا کر پانی پلایا۔ داعیٔ انقلاب یہی کرتا ہے۔ وہ یہ نہیں دیکھتا کہ کس کی بکریاں ہیں' وہ صرف یہ دیکھتا ہے کہ پیاسی بکریاں ہیں۔ پانی پلا کر آ کر پھر وہاں بیٹھ گئے اور وہاں سے قرآن کا منظر' کہنے لگے کہ بارِ الٰہا!

بہ ہرز مینے کہ رفتیم آسماں پیدا است

مصر سے بھاگا تھا کہ وہاں بھی یہی کچھ ہو رہا تھا' کوئی زبردست کسی زیردست کی بکری کو پانی نہیں پینے دیتا تھا۔ یہاں آیا ہوں کہ یہاں کچھ آزادی کی فضا میں' کہیں عدل وانصاف نظر آئے گا' یہاں بھی میں یہی کچھ دیکھ رہا ہوں۔ اب اس کے بعد وہاں یہ کہا کہ بارِ الٰہا! تو اپنی ہی طرف سے کوئی رہنمائی عطا کر دے تو پھر یہ کچھ سنور سکتی ہے' میرے بس کی بات تو نظر نہیں آتی۔ یہ آرزو دعا بن کر لب پہ آئی اور وہاں جو بابِ عالی سے ٹکرائی ہے تو وہاں کہا ہے کہ ہاں' موسیٰ علیہ السلام! ہم تمہیں وہ راہنمائی دیں گے جس سے تم ہر غریب کی بکری کو' بھیڑ کو' پانی پلاؤ گے۔

تصوف کے دور کی ایک ہڈ بیتی کہانی' پرویزؒ کی اپنی زبانی

پھر بات میں سے بات نکلی' یاد آ گئی تو' پھر آپ کو سناؤں کہ جب ہم کو ''افیون''❶ دی گئی تو کیا کیفیت ہوئی۔ بچپن کے تصوف کی پڑھی ہوئی چیزیں' کبھی کبھی ''یہ کھوٹے پیسے'' کام آ جاتے ہیں' اگرچہ ان وادیوں کو چھوڑے ہوئے مدت گزر گئی۔ قرآن کی تعلیم اور نظام یہ تھا کہ ہر پیاسی بکری کو پانی پلایا جائے۔ وہاں کیا سکھایا گیا؟ کہ یہ مرشد سے ہر وقت کہتا تھا کہ یا حضرت! کیا ہماری ساری عمر بھوک میں

---

❶ یہ اشارہ تصوف کی تماثیل وتشبیہات کی طرف ہے۔

ہی نکل جائے گی، فاقے کرتے ہی گزر جائیں گے؟ کہا: بیٹا! تمہیں ایک دن سمجھائیں گے۔ یہ کچھ شروع میں ہمیں پڑھایا جاتا تھا، یہ سارے قصے اب تک یاد ہیں: ''تمہیں یہ بات کسی دن سمجھائیں گے''۔ ایک دن باہر جا رہے تھے تو ایک تالاب کے کنارے دیکھا کہ کچھ بھیڑیں تھیں، جنہوں نے پانی پی لیا ہوا تھا، پیٹ بھر گیا تھا، یہ ادھر لیٹی ہوئی دھوپ کے اندر سو رہی تھیں، کچھ بھیڑیں پیاسی تھیں وہ پانی کی طرف دوڑ کر جا رہی تھیں۔ کہنے لگا: بیٹا! بات سمجھ گئے یا سمجھاؤں؟ کہنے لگے کہ جی! سمجھا دیجیے۔ کہنے لگے کہ جن کے پیٹ بھرتے ہیں، پھر وہ اس مولا کی طرف سے آنکھ بند کر کے یوں لیٹ جاتے ہیں، جو ابھی پیاسے بھوکے ہوتے ہیں، وہی دوڑ کر مولا کی طرف جاتے ہیں۔ اب بتاؤ بیٹا! کیا مانگتے ہو پیٹ بھر کر کھانا ہے یا بھوک؟ کہنے لگے کہ یا حضرت! بھوک کہ جو مولا کی طرف لے جائے۔ برادرانِ عزیز! آپ دیکھتے ہیں کہ یہ جو تشبیہات کا سحر ہے، یہ کیا کرتا ہے؟ سارا تصوف تشبیہات پہ مبنی ہے، ایسی چپکتی ہوئی تشبیہ دیتے ہیں کہ وہ نکلتی ہی نہیں ہے۔ وہ تو یہ قرآن کا مقناطیس ہے، جو ریت کے اندر سے ان فولاد کے ذروں کو کھینچ لیتا ہے، ورنہ بچنے کی کوئی صورت نہیں ہے۔

تصوف میں لطائف کو حقائق بنا کر شاعری میں تبدیل کر دیا جاتا ہے

عزیزانِ من! میں کہتا ہوں کہ اگر ایک چیلہ بھی ان کی تشبیہات کی تعلیم حاصل کر لے تو ساری عمر کے لیے ذہن ان کی گرفت میں آ جاتا ہے۔ میں پوچھتا ہوں کہ اس تمثیل سے ہی، آپ دیکھیے تو سہی، کہ بات کتنی چپک گئی کہ بات تو ٹھیک ہے۔ جو سرچشمۂ آب سے سیر ہو گئی ہیں، وہ اس سرچشمۂ آب کی طرف پیٹھ کرتی ہیں، لیٹی ہوئی ہیں، سورج کے سامنے آنکھ بند کر کے پڑی ہوئی ہیں۔ سرچشمۂ آب کی طرف وہ بھاگتی ہیں، جو ابھی پیاسی ہیں اور یہی چیز پھر آگے چلی جو شاعر نے کہا تھا کہ ''تصوف برائے شعر گفتن خوب است''۔ یہ ساری شاعری ہے، یہ حقائق نہیں ہیں، لطائف ہیں۔ شاعری میں لطائف کو حقائق بنا دیا جاتا ہے۔ اس کو شاعری کہتے ہیں اور پھر شاعری یہ آئی کہ

تپیدن و نرسیدن چہ عالمے دارد

تڑپتے رہنا، اور مقصود تک نہ پہنچنا عجیب لذت رکھتا ہے۔ یہ ہے زندگی

خوشا کسے کہ بدنبال محمل است ہنوز

ساری عمر محمل کا پیچھا کرتے ہوئے گزر جائے، کہیں اس کے اوپر جا کے ہاتھ نہ پڑ جائے۔

فرعون کی چڑھائی کے دوران حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے سمندر میں عصا مارنے کے واقعہ کی نوعیت اور حقیقت

میں کہہ یہ رہا تھا کہ پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بارہ سال تک بکریاں چرانے میں گزارے۔ وہاں سے جب یہ ہدایت ملی ہے، ہدایت

کیا ملی ہے‘ ایک عظیم ذمہ داری سونپ دی گئی کہ جاؤ‘ فرعون کی طرف اِنَّہٗ طَغٰی (20:24) اس نے بڑی سرکشی اختیار کر لی ہے۔ وہاں سے پھر مصر میں واپس آئے تھے‘ یہاں آ کر پھر فرعون اور ساحرین سے یہ ٹکراؤ ہوا تھا‘ یہاں سے اس ٹکراؤ کے بعد پھر اپنی قوم کو لے کر اسی سینا کی وادیوں میں لے جانے کے لیے نکلے تھے‘ یہ وہ مقام ہے جہاں اب ہم آئے کہ وَ اِذْ فَرَقْنَا بِکُمُ الْبَحْرَ فَاَنْجَیْنٰکُمْ وَ اَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ وَ اَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ (2:50) پھر ذرا سوچو تو سہی‘ وہاں سے تم نکل کر آئے‘ فرعون کی فوج نے پیچھا کیا۔ تم آگے آگے آ رہے تھے‘ اس مقام کے اوپر آ گئے جہاں آگے پانی پڑتا تھا۔ دریا‘ نہر‘ سمندر‘ جو الفاظ ہیں ان کے لیے عربی کا لفظ ’’بحر‘‘ آتا ہے۔ وہاں آ پہنچے۔ بظاہر یہ نظر آتا تھا کہ پھنس گئے: پیچھے اتنا فرعون کا لشکر جرار ہے اور آگے راستے کی یہ کیفیت ہے۔ یہاں آنے کے بعد پھر ہمارے سامنے بقول ان کے وہ معجزہ لایا جاتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سمندر میں‘ اپنا عصا مارا‘ پانی دو طرف پھٹ گیا‘ پھر یہ راستے میں سے گزر گئے۔ یہ پار چلے گئے تو ان کے پیچھے پیچھے فرعون کا لشکر آ گیا‘ پانی پھر اس طرح سے مل گیا‘ وہ غرق ہو گیا۔

عزیزانِ من! مقام پھر نازک آ گیا تو مجھے اس پہ اصرار نہیں ہے کہ جو میری بصیرت نے مجھے جہاں تک پہنچایا اسی تک آپ پہنچیں‘ لیکن میں یہ عرض کرتا ہوں کہ قرآن کے مطالعے نے مجھے کس چیز تک پہنچایا۔ بات یہاں معجزے کی آئی۔ قرآن یہ داستانیں بیان کرنے سے پہلے‘ یہ کہتا ہے کہ تمہارے لیے ان داستانوں کے اندر بڑی راہنمائی ہے‘ بڑی سبق آموزی ہے‘ اس سے یہ چیزیں سیکھو کہ قومیں کن کن وادیوں سے گزرتی ہیں‘ وہاں انہوں نے کیا کیا کیا‘ کس طرح سے پھر وہ آزادی کی فضاؤں میں پہنچے‘ کس طرح مشکلات کے اوپر انہوں نے قابو پایا‘ مصائب میں سے کس طرح انہوں نے اس کو ہمت سے سہا‘ کیا کیا تدبیریں اختیار کیں۔ اور کہا کہ تمہارے لیے ان کے اندر سامانِ عبرت وموعظت اور سبق ہے۔ اسی لیے رسول اللہ ﷺ کی زندگی کے متعلق بھی کہا کہ رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں تمہارے لیے لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْھِمْ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ (60:6) ایک بہترین نمونہ ہے۔

قدرت نے کسی ایسے عمل کے لیے کوئی ایسا حکم صادر نہیں کیا جو عقل انسانی کی طاقت سے باہر ہو

عزیزانِ من! کسی قوم کی داستان ہو یا کسی رسول کی حیاتِ طیبہ ہو‘ وہ اٰمنوا کے لیے تو اسی صورت میں نمونہ ہو سکتی ہے کہ ہم وہ کچھ بن کر دکھا سکیں اور اگر وہاں کوئی چیز ایسی ہوئی ہے کہ جو بطورِ معجزہ ہوئی ہے اور معجزہ تو ہم کر نہیں سکتے‘ وہ ہمارے لیے نمونہ کیسے بن جائے گی؟ کسی ایسی چیز کو نمونے کے طور پہ‘ ماڈل کے طور پہ‘ پیش کرنا‘ کہنا یہ کہ تم نے یہ کر کے دکھانا ہے‘ ایسا بننا ہے اور ویسا ہونا Humanly (انسانی انداز سے) بھی Impossible (ناممکن) ہو‘ انسانی ممکنات میں سے نہ ہو‘ وہ کوئی مافوق البشر قوتیں آ کر وہ کچھ کریں‘ مافوق البشر قوتیں ہمارے پاس تو نہیں ہونگی‘ ہم اس مقام کے اوپر کیا کریں گے؟ وہ ماڈل اور نمونہ ہمارے کس کام آئے گا؟ اس چیز کو بنیادی طور

یہ سامنے رکھیے۔ قرآن میں یہ واقعات محض تاریخی Narrations (بیانات) نہیں ہیں' یہ نہیں ہے کہ کوئی Chronicles ہیں' واقعات' حوادث' کوائف ہیں' جو تاریخ کے طور پر بیان کیے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ ہم نے یہ اس لیے بیان کیے ہیں کہ تم ان سے سبق سیکھو۔ اس اصول کو سامنے رکھتے ہوئے یہاں آ جائیے۔ ایک قوم' مستبد قوت کے پنجۂ استبداد سے' خلاصی حاصل کرتی ہے۔ قرآن نے ایسی عمدگی سے یہ ساری تفاصیل بیان کی ہیں کہ ہر قوم جو غلامی کے شکنجے میں جکڑی ہوئی ہو' وہ یہاں سے سبق لے کر یہی کچھ کر کے' اسی طرح سے آزادی حاصل کر سکتی ہے لیکن اگر اس میں ایسے مقامات آتے ہوں جو انسانوں کے امکان میں نہ ہوں' تو وہ چیز ہمارے لیے سبق آموز نہیں ہو سکتی۔ یہ تو میں نے اصول بیان کیا ہے۔ اگر قرآن اس کی تائید نہ کرتا ہو تو مجھے اس کا حق نہیں پہنچتا تھا کہ میں یہ کچھ کہتا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام قوم کو کسی سمندر سے لے کر نہیں گزرے تھے بلکہ وہاں تو مدوجزر کی کیفیت تھی

قرآن اس کی تائید کرتا ہے اور سنیے کہ کیسے کرتا ہے؟ وہاں وہ پہنچے ہیں۔ وہ سمندر کے کنارے نہیں پہنچے۔ تورات میں یہی تھا کہ سمندر کے کنارے پہنچے' عصا مارا' سمندر پھٹ گیا۔ آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ تورات کا اب جو (یہودیوں کی طرف سے) Latest (جدید ترین) نسخہ شائع ہوا ہے' اس کا English (انگریزی) میں Translation (ترجمہ) America (امریکا) میں' یہودیوں کی جو بہت بڑی آرگنائزیشن (Jewish Publication Society) ہے' اس نے (1962ء میں) شائع کیا ہے۔ اس کا پہلا حصہ چھپ کر آ چکا ہے۔ اس کے اندر جہاں یہ واقعہ آیا ہے' (اور اس کا اعلان امریکا کی آرگنائزیشن (Jewish Publication Society) کے ایگزیکٹو ڈائریکٹر Lisser Zussman کی طرف سے آیا ہے)۔ انہوں نے یہ لکھا ہے کہ اس وقت تک یہ غلط سمجھا جا رہا تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کو لے کر سمندر میں سے پار گئے۔ آپ کو معلوم ہے کہ آج تو اس Red Sea کو بحیرۂ روم سے نہرِ سویز ملا رہی ہے' یہ تو کل کی بات ہے۔ یہاں آ کر آگے خشکی آ جاتی تھی اور یہ اس پانی کا آخری حصہ تھا۔ اس آخری حصے میں پانی کی کیفیت یہ تھی کہ مدوجزر ا کبرآ تا تھا' پانی اوپر چڑھتا تھا تو وہاں تک آ جاتا تھا' مدوجزر صغیر کا تھا تو یہ پانی پیچھے مڑتا تھا' پھر پانی لوٹ جاتا تھا' نیچے دلدل کی سی جگہ رہ جاتی تھی' گیلی جگہ رہ جاتی تھی۔ انہوں نے لکھا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کو اس مقام سے لے کر پار گئے تھے' جہاں سرکنڈا اگا ہوا تھا اور اسے آج بھی Sea of Reeds کہا جاتا ہے۔ یہودیوں کے اپنے شائع کردہ نسخۂ تورات کے اندر اب یہ چیز لکھی ہوئی ہے کہ مقام وہ تھا جہاں پانی آتا تھا' ہٹتا تھا' جگہ خالی رہ جاتی تھی' تو دلدل ہوئی تھی' وہاں سرکنڈا اگا ہوا تھا' Sea of Reeds اس کا نام ہے۔ یہ یہودیوں نے آج کہا ہے اور لکھا ہے کہ اب تحقیقات نے ہمیں اس مقام پہ پہنچایا ہے۔

عزیزانِ من! چودہ سو سال پہلے قرآن نازل ہوتا ہے' جب یہ تاریخی تحقیق کسی انسان کے سامنے نہیں آئی تھی۔ دنیا کی کسی تاریخ میں

اس سے پیشتر یہ کوئی ایسی چیز نہیں لکھی تھی کہ یہ کس طرح سے پار گئے تھے' کہاں سے گئے تھے' کیفیت کیا تھی جہاں سے یہ پار گئے تھے۔ سنیئے' عزیزانِ من! انہی مقامات سے تو پتہ چلتا ہے کہ اس کتاب کا سرچشمہ انسانی فکر اور تجسس نہیں ہے۔ انسانی فکر اور تجسس تو ابھی کل تک اسی نتیجے پہ پہنچائے ہوئے تھے کہ انہوں نے فی الواقعہ سمندر میں اپنا عصا مار کر اس کو دو حصوں میں تقسیم کیا تھا۔ ہم نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا **فَاَسۡرِ بِعِبَادِیۡ لَیۡلًا** (44:23) ان کو راتوں رات لے کر نکل جاؤ' **اِنَّکُمۡ مُّتَّبَعُوۡنَ** (44:23) تمہارا پیچھا کیا جائے گا لیکن ہم تمہیں راستے کا نشان بتاتے ہیں کہ کہاں سے لے کر جانا ہے۔ غور سے سنیے۔ کہا ہے کہ **وَاتۡرُکِ الۡبَحۡرَ رَهۡوًا** (44:24)۔ یہ ایک لفظ رھــوًا آیا۔ عربی زبان میں رھــواً کہتے ہیں ''جہاں پانی آئے اور پھر ہٹ جائے' کبھی زمین نیچے آ جائے' کبھی زمین اوپر آ جائے۔'' کراچی میں سمندر کے کنارے آپ یہ زمین کا اونچا اور نیچا ہونا دیکھیے گا' زمین تو ویسے ہی وہاں ہی رہتی ہے لیکن جب وہ پانی چڑھتا ہے تو جہاں آپ کھڑے ہوتے ہیں' معلوم ہوتا ہے کہ اس سے یہ زمین نیچی ہوگئی' پانی پیچھے جاتا ہے تو زمین جیسے ابھر کر آتی ہے۔ رَهۡوًا کے معنی ہوتا ہے ''کسی چیز کا چڑھ کر آگے بڑھنا' پھر لوٹ کر چلے جانا' زمین کا ابھر کر اوپر آ جانا اور نیچے چلے جانا''۔ یہاں کہا ہے کہ **وَاتۡرُکِ الۡبَحۡرَ رَهۡوًا** (44:24)۔ پانی کو اس مقام سے چھوڑ جہاں یہ پیچھے ہٹا ہوا ہو اور تمہارے سامنے زمین ابھری ہوئی ہو اور دوسرے مقام میں تو بات اور بھی واضح کر دی۔ کہا ہے کہ **وَ لَقَدۡ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلٰی مُوۡسٰۤی اَنۡ اَسۡرِ بِعِبَادِیۡ فَاضۡرِبۡ لَهُمۡ** (20:77) ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو یہ بتایا کہ کدھر سے ان کو لے جانا ہے' ان کو لے جاؤ **فَاضۡرِبۡ لَهُمۡ طَرِیۡقًا فِی الۡبَحۡرِ یَبَسًا** (20:77) یہ ''یبس یبوست'' تو آپ بھی جانتے ہیں کہ خشکی کو کہتے ہیں۔ کہا ہے کہ ان کو لے کر اس مقام سے جا' جہاں راستہ خشک ہو گیا ہوا ہے' جہاں پانی خشک ہو گیا ہوا ہے: یبساً۔ اب قرآن کی ان شہادات کے بعد بات کے سمجھنے میں کیا دشواری رہتی ہے۔

قرآنی حقائق کو سمجھنے کا طریقہ

برادرانِ عزیز! جہاں وہ عصا کے الفاظ' ضرب کے معنی مارنے کے لیے آئے ہوئے ہیں' جب وہ آئیں گے تو وہاں میں عرض کروں گا کہ یہ بات کہاں سے لی گئی؟ لی تو ساری ہم نے تورات سے ہے۔ مشکل یہ ہے کہ قرآن کے الفاظ کو ہم نے نہ تو عربی زبان کے مشتقات کی رو سے سمجھا' نہ قرآن کے دیگر مقامات سے ہم نے اس کی تشریح چاہی۔ کہتا ہے کہ یہ کیفیت تھی جب وہ انہیں وہاں سے نکال کر لے گئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد جو پیچھے سے یہ لشکر آیا ہے تو جو لشکر دوسرے کا تعاقب کیا کرتا ہے' وہ نہ تو اس کا انتظار کیا کرتا ہے اور نہ وہ جو انتقام کا' جوش ہوتا ہے' ان کو زیادہ سمجھ بوجھ میں رکھتا ہے جسے اندھا دھند کہتے ہیں' وہ گھستے چلے جاتے ہیں۔ وہ گھستے چلے گئے' اس کے بعد وہ جو مد کا وقت تھا چڑھتا ہوا پانی تھا' ایسے وقت میں یہ اندر گئے ہیں' اس لیے وہ پانی میں ڈوبے ہیں۔ یہ رھواً اور یبساً کے

مقام کے اوپر قرآن نے کہا ہے کہ یہ گئے تھے' وہ غرق کا مقام آ گیا ہوا ہے۔ رھواً میں یہ مقام آ سکتا ہے۔ آپ یہاں سے چلے گئے' یہ راستے کا دوسرا مقام بنایا۔ کہا کہ ہم نے تو یہ کیا' اتنے بڑے عذابِ الیم سے تمہیں چھڑایا' ان طریقوں سے تمہیں ایک ہادی نہایت عمدہ راعی' اتنا بڑا دانشمند' ہوش مند دیا' وہ کس طرح تمہیں محفوظ مقامات میں سے لے کر آزادی کی فضاؤں میں لے آیا۔

وحی کی روشنی کے بغیر انسانی عقل وشعور کے ابتدائی دور کی کیفیت

اس کا ایک ہی پیغام تھا کہ جھکنا ہے تو صرف ایک آستاں پہ اور وہ ہیں' قوانینِ خداوندی۔ خدا کے سامنے جھکنا ہے' کسی اور کے سامنے نہیں۔ ''یہ کسی اور کے سامنے نہیں'' کیا چیز ہے؟ خدا سے ورے نیچے کسی کے بھی سامنے جھکیں گے تو اس کی دو صورتیں ہونگی' یا تو فطرت کی قوتوں کے سامنے جھکیں گے' جیسا کہ انسان نے اپنے ابتدائی دور میں کیا۔ Primitive Age (ابتدائی دور) کے اندر یہ فطرت کی قوتوں کو دیوی دیوتا بناتا تھا' بادل گرجا یہ ڈنڈوت بجالایا' بجلی کڑکی اس نے سجدہ کیا' مہیب دریا وہ دیوتا' سانپ دیوتا' شیر دیوتا' آگ دیوی حتیٰ کہ اگر کہیں بڑا تناور درخت نظر آیا' یہ اس کے سامنے بھی جھک گیا۔ انسان ڈرتا تھا' نہتا تھا' ابھی Tool making (ہتھیار بنانے) کی Stage (منزل) نہیں آئی تھی' جہاں اس نے اوزار بنانے سیکھے تھے' یہ تو اس دور میں آگے پھر اس نے فطرت کی قوتوں کو مسخر کرنا شروع کیا۔ اس دور میں یہ ہر ایک شے سے ڈرتا تھا اور ڈرنے کا علاج اس نے سمجھا تھا کسی کو جھک کر ''راضی کر لینا'' ''لو بابا! اسی ہتھ جوڑ لینے ہیگے آں[1]'' یہ پہلا دور تھا اور اس سے آگے انسان بڑھا تو پھر دوسرا دور وہ آیا کہ جونہی کوئی انسان جس نے دوسروں سے ذرا زیادہ عقل پائی تھی' سیانا ہوگیا' ان میں سے اس نے اپنے سامنے ان کو جھکانا شروع کر دیا۔ پھر جس نے کچھ قوت اپنے ہاتھ میں لی' اس نے جھکانا شروع کیا اور جس نے رزق کے سرچشمے ہاتھ میں لے لیے' اس نے تو پوچھو ہی نہیں کیا کچھ کرنا شروع کیا۔ انسان' یا فطرت کی قوتوں کے سامنے جھکا' یا اگلے دور میں انسان' انسان کے سامنے جھکا۔ فطرت کی قوتوں کے سامنے جھکا تو مقامِ آدمیت سے گر گیا اس لیے کہ ملائکہ تو اس کے سامنے سجدہ ریز ہوئے تھے۔ اور انسان' انسان کے سامنے جھکا تو انسان تو سارے برابر ہیں' اپنے برابر کے سامنے جھکنا شرفِ انسانیت میں ذلت آ گئی اور اسی کو شرک کہتے ہیں۔ اور عزیزانِ من! شرک اسی لیے ناقابلِ عفو جرم ہے کہ اس میں شرفِ انسانیت کی تذلیل ہوتی ہے' خدا کا تو کچھ نہیں بگڑتا' انسان اپنے مقام سے گر جاتا ہے' ورنہ **فَاِنَّ اللّٰہَ غَنِیٌّ عَنِ الْعٰلَمِیْنَ** (3:97) ہے۔ ایک چھوڑ کر آپ دسیوں معبود مانتے چلے جایئے اس کی قوت وجبروت میں تو ذرا سا بھی فرق نہیں پڑتا۔ وہ تو یہاں کی بادشاہتیں ہوتی ہیں کہ ایک کی مملکت میں رہتے ہوئے اگر آپ کسی دوسرے کے متعلق ذہن میں لائیں کہ وہ بھی حاکم ہوسکتا ہے

---

[1] لو بابا! ہم ہاتھ جوڑ لیتے ہیں۔

تو اس میں تزلزل آتا ہے' خدا کی مملکت میں تو تزلزل نہیں آتا۔ اس لیے یہ نہ سمجھیے کہ اگر انسان خدا کے علاوہ کسی اور کے سامنے جھکتا ہے تو اس سے خدا کو بہت طیش آجاتا ہے کہ "ہیں! ساہڈے ہوندیاں ہویاں اے گل؟ پنڈ دا چوہدری تے کردا ہیگا اے کچھ ❶"۔ می نہ سزد خدائے را' اس کا کچھ نہیں بگڑتا۔

انسان کا قوائے فطرت کے سامنے جھکنے کا دوسرا نام شرک ہے

یاد رکھیے' عزیزانِ من! دین کی تعلیم یہ ہے کہ وہ انسان کو اس کے صحیح مقام سے متعارف کرا دیتا ہے۔ اور جو چیز اس کے خلاف جاتی ہے اس کی انتہا شرک ہے کہ انسان یا اپنے سے پست قوائے فطرت کے سامنے جھکے یا اپنے ہاتھوں کی بنائی ہوئی مورتیوں کے سامنے جھکے۔ مورتیاں دو قسم کی ہوتی ہیں' پتھر کو تراش کر بھی آپ مورتی بناتے ہیں' اپنے ہاتھوں سے انسانوں کی بھی آپ مورتی بنا کر رکھ دیتے ہیں اور پھر اس کے سامنے جھکتے ہیں۔ تمہارے ہی بنائے ہوئے یہ سارے حکام ہوتے ہیں' عزیزانِ من!

تمہیں تو "تو" کے سوا کوئی کچھ نہ کہتا تھا
حضور ہم نے بنایا جناب ہم نے کیا

از خود بنا کر اس کے سامنے جھکتا ہے' ان کی قوت کا راز تمہارے جھکنے کے اندر ہوتا ہے

ایں صنم تا سجدہ اش کردی خدا ست
چوں یکے اندر قیام آئی فنا ست

(اقبالؒ: زبورِ عجم)

تیرے جھکاؤ سے ان کی قوت ہے' تم اٹھ کر کھڑے ہو جاؤ تو برف کے تودے کی طرح یہ پگھل جائیں گے۔

بنی اسرائیل کو تین مختلف مستبد قوتوں نے اپنے ہاں جکڑ رکھا تھا

برادرانِ عزیز! کسی انسان کا کسی دوسرے کے سامنے جھکنا تذلیلِ انسانیت ہے' یہی شرک ہے۔ یہ قوم بنی اسرائیل چار سو سال تک غلامی میں رہی' ہڈیوں کے گودے کے اندر تک غلامی کے جراثیم سرایت کر چکے تھے۔ انسانوں کی غلامی' فرعون جیسا مستبد' مذہبی پیشوائیت کی غلامی' ہامان جیسا دسیسہ کار جس کے لشکر موجود تھے' روٹی کے لیے قارونیت کے محتاج۔ جہالت کا یہ عالم تھا کہ مصر والے بیل کی پرستش

---

❶ ارے! ہمارے ہوتے ہوئے تجھے یہ کچھ کرتے یا کہنے کی جرأت کیسے ہوئی؟ گاؤں کا چودھری تو یہ کچھ کرتا ہے۔

کرتے تھے۔ یہ جو گائے کی پرستش ہمارے ہاں، پڑوس میں ہوتی ہے، یہ ان کے ہاں کا اپنا کچھ بھی نہیں ہے، یہ یاد رکھیے! یہ ہندومت میں ان کی تاریخ اگر آپ دیکھیے، تو معلوم ہوگا کہ انہوں نے یہ سارا کچھ مستعار لیا ہوا ہے، یہ آواگون کا چکر، تناسخ کا مسئلہ، فیثا غورث یونان کا Transmigration of Soul کا پورا فلسفہ ہے۔ بہرحال بات دوسری طرف نکل جائے گی۔ ان کے ہاں کوئی چیز اپنی نہیں ہے حتیٰ کہ گائے کی پرستش بھی نہیں:

آنکھ نرگس کی، دہن غنچے کا، حیرت میری
ان کی تصویر میں پوچھے کوئی ان کا کیا ہے

غلام قومیں تو دین و دانش کے علاوہ اپنی جان تک فروخت کر دیتی ہیں

مصر والے بیل کی پرستش کرتے تھے۔ زراعت پیشہ قوم پہلے دور میں ان چیزوں کی پرستش کرتی تھی۔ گنگا کی پوجا کیوں ہو رہی ہے؟ پانی کے بغیر کھیتی نہیں چلتی۔ گائے اور بیل کی پرستش اسی لیے ہوتی تھی کہ وہ مصر والے بھی کرتے تھے۔ وہاں انبیائے کرامؑ کی قوم ہے، ان کی اولاد میں سے، ان کی تعلیم کو لیے ہوئے چلی آ رہی ہے۔ پرستش اسی بیل کی ہو رہی ہے جس کی پرستش مصر والے کرتے ہیں۔ آپ دیکھتے ہیں کہ غلام کا اپنا مذہب کوئی نہیں ہوتا۔

'قوتِ فرماں روا معبودِ او'

اور اگر کہیں ہوتا بھی ہے تو اس کے بعد

'دین و دانش را غلام ارزاں دہد'

دین و دانش دونوں چیزیں بیچتا ہے۔ قیمت کیا لیتا ہے؟

'تا بدن را زندہ دارد جاں دہد'

بدن کو زندہ رکھنے کے لیے جان بیچتا ہے کم بخت۔ غلامی ہے توبہ توبہ جسدِ انسانیت کا انتہائی ناسور۔ چار سو سال تک یہ قوم ان کے اندر رہی، انہی کا معبود ان کا معبود تھا۔ صاحبِ ضربِ کلیمؑ وہاں سے چھڑا کر لائے ہیں، تربیت کا یہ عالم ہے کہ مصر میں رہتے ہوئے، ان کے گھروں کو قبلہ بنا دیا تھا۔

قبلہ او طاقت فرمانروا ست

قرآن کہتا ہے کہ وہی انفرادی طور پہ تعلیم دینی شروع کر دی تھی۔ ایک چھوڑ، دو، دو پیغمبر، حضرتِ موسیٰ علیہ السلام، حضرت ہارون علیہ السلام وہاں

موجود ہیں اور اگر تاریخ کا یہ بیان صحیح ہے تو حضرتِ شعیب علیہ السلام یہاں آ کر مدین میں تیسرے پیغمبر ہیں' اندازہ لگایئے لیکن خوئے غلامی کی پختگی ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی چند دنوں کی غیر حاضری اور سامری کے بنائے ہوئے بچھڑے کی پوجا اور لفظ ظلم کا مفہوم

حضرتِ موسیٰ علیہ السلام چند دنوں کے لیے الگ ہوئے۔ان کے اندر ایک سامری پیدا ہوا۔سامری کی تشریح میں اس آنے والے کنونشن میں کروں گا۔عزیزانِ من! اس کنونشن میں آخری دن میرا خطاب ہے:''عالمگیر افسانے جنہیں حقیقت سمجھ لیا گیا''۔اس میں یہ آئے گا کہ سامری کیا کیا کرتا ہے۔ یہ چند دنوں کے لیے اُدھر گئے اور اس کے بعد یہ ساری تعلیم' یہ ساری تربیت' دھری کی دھری رہ گئی۔ وہی مصر والوں کا معبود وہ بچھڑا بنایا اور انہوں نے اس کی پرستش شروع کر دی۔ جو کچھ ہمارے ساتھ ہوا' بھارت کی غلامی سے نکال کر ایک نجات دینے والا ہمیں لایا' بس ہم یہاں آ ہی گئے اور اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی ہے۔ کہا کہ **وَ اِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰٓى اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ** (2:51) چند دنوں کے لیے وہ تم سے الگ ہوا۔ دیکھیے! قرآن ایک بات کہتا ہے کہ تمہاری اس خوئے غلامی کا پیچھے لوٹ جانا کس مقام پہ تھا؟ انتہا ہوگئی' کوئی چھوٹی چھوٹی چیزیں بتا تا تو بات نہ بنتی' انتہا پہ پہنچایا کہ ایک ہی نکتہ تھا جو اتنے عرصے تک تمہیں سمجھا تا رہا کہ اپنے ہاتھوں کی بنائی ہوئی مورتیوں کے سامنے نہیں جھکنا۔ اور تمہاری کیفیت یہ ہوئی کہ چند دن کے لیے وہ الگ ہوا' تو تم اس کے بعد فوراً اسی انتہا پر پہنچ گئے: انسان ہو کر ہاتھوں کے بنائے ہوئے بچھڑے کے سامنے جھک گئے۔ لفظ ہے **و انتم ظلمون** (2:51)۔قرآن نے شرک کو ظلمِ عظیم کہا ہے۔

ہمارے ہاں تو ظلم کے ایک ہی معنی ہیں: نا انصافی سی' دھاندلی سی۔ سوال یہ ہے کہ وہ جو شرک ہے' وہ ظلم کیسے ہے؟ اس دھاندلی کا تو سوال ہی نہیں ہے۔ یہاں یہ جو کہا ہے کہ تم بچھڑے کے سامنے جھک گئے' بڑے ہی ظالم تھے' دیکھیے! ان معنی کے اعتبار سے ظالم کے معنی ہی یہاں سمجھ میں نہیں آتے۔ بات پھر وہی ہے کہ پوچھیے' عربی زبان سے کہ اس لفظ کے بنیادی معنی کیا ہیں۔ظلم کے معنی ہوتے ہیں''جس شے کو جس مقام پہ ہونا چاہیے وہ اس مقام پہ نہ رکھی جائے''۔ بچھڑے کو بچھڑے کے مقام پہ ہونا چاہیے' انسان کے سر کو انسان کے سر کے اوپر ہونا چاہیے' جونہی یہ اپنے مقام سے گرا ظلم ہو گیا۔ یاد رکھیے! غلو اور مبالغہ بھی ظلم ہوتا ہے' کسی کو اس کے مقام سے اونچا لے جانا بھی ظلم ہے۔ یہ وہ ظلم ہے جس کے لیے ہمارے پاس بڑے مقدس' جذباتی جواز کی دلیلیں ہوتی ہیں۔

مجھے معذور رکھ میں مستِ صہبائے محبت ہوں

محبت سے آپ انسان کو خدا بناتے ہیں' نفرت سے آپ انسان کو حیوان بناتے ہیں' دونوں ہی اپنے مقام سے گر گئے۔ ظلم کے معنی ہیں ''جس کو جس مقام پہ ہونا چاہیے' وہ وہاں نہ رہے''۔ انسان کو خدا بنایا تو کیا یہ ظلم نہیں ہے؟ اپنے آپ کو ان کے سامنے جھکایا' اپنے مقام سے گرے' جس کو تم نے خدا بنا دیا' اس کو اس کے مقام سے آگے بڑھا دیا' اس لیے دونوں نے ظلم کیا۔ وہ کہتا ہے کہ **اِنَّ الشِّرْکَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ** (31:13) شرک تو ظلمِ عظیم ہوتا ہے۔ یہاں کہا ہے کہ تم نے اپنے آپ کو بچھڑے کے سامنے جھکا دیا تو **وَ اَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ** (2:51)۔ دیکھا تم کیسے اپنے مقام سے گر گئے۔ کیا بات ہے قرآن کے الفاظ کی! عزیزانِ من! لیکن پھر بھی ابدی مایوسی نہیں ہے۔ مایوسی تو آپ کو پتہ ہے' ابلیسیت ہے۔ ابلیس کے معنی ہی: مایوس' مایوس کرنے والا ہیں۔ کہا ہے کہ **ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ** (2:52) کسی سے آگے بڑھ جانا: اوٹھیک ہے' اوٹھیک ہے' میں نئیں پھڑ داتینوں''[1] یہ عجیب لفظ ہوتا ہے' ورنہ گرفت ہو جاتی ہے۔ کہا ہے کہ **لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ** (2:52)۔

لفظ شکر کا مروجہ تصور اور اُس کا حقیقی مفہوم

برادرانِ عزیز! یہاں پھر یہ ایک لفظ شکر آ گیا' یہ وہی ہے جسے ہم شکر گزاری کہتے ہیں۔ یہ ہوتا کیا ہے؟ ہمیں تو اتنا ہی پتہ ہے اور وہ بھی اب تو ہمارے گھرانوں میں نہیں ہوتا' اس سے ذرا پیشتر ہوتا تھا ''آ روٹی کھان دے بعد یا اللہ! تیرا شکر الحمد للہ''[2] یہ ہوتا تھا۔ ایک اور بھی شکر ہوتا تھا: ''کی حال ہے بھئی! شکر ہے جی جیویں گذر دی ہے۔ گذر دی پئی ہیگی'' اک آ شکر ہونداسی[3] '' **لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ** (2:52) بات کیا ہوئی؟ کیوں تمہیں باز آفرینی کا موقع دیدیا؟ کیوں تم سے درگذر کر کے پھر سے تمہیں صفِ انسانیت میں کھڑا کر دیا؟ کیوں تمہیں پھر سے موسیٰؑ نے آ کر اپنی ہدایات دیدیں؟ اس لیے کہ **لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ** (2:52)۔ شکر کے معنی ہوتا ہے ''کسی کی کوششوں کا بھرپور نتیجہ مرتب کر دینا' جیسے بکری کے تھن سے دودھ خود ٹپکتا ہوا جا رہا ہو' یعنی'' کوششاں دے تھن دا ایوں بھر جانا' پئی چون نال نہ نکلے' آپ ای دودھ ٹپکدا تریا جان ڈیا ہووے۔[4] '' اسے عربی زبان میں شکر کہتے ہیں۔ پھر موقع بہم پہنچا دیا کہ آؤ! اپنی صلاحیتوں

---

[1] ارے بھئی! صحیح ہے' درست ہے' میں تجھے نہیں پکڑتا۔

[2] روٹی کمانے کے بعد کہتے ہیں کہ یا اللہ! تیرا شکر اور الحمد للہ

[3] کیا احوال ہیں بھائی؟ شکر ہے' جیسے بھی گزر رہی ہے۔ گزرتی جا رہی ہے۔ ایک شکر یہ بھی تھا۔

[4] کوششوں کے تھنوں کا اس طرح بھر جانا کہ بغیر دودھ نکالے ہی' وہ دودھ از خود ٹپکتا چلا جائے۔

کی اس طرح نشو ونما کرو، یہ نہیں کہ بہ مشقت، تمہیں تکلیف کر کے، ان کو نچوڑ کر باہر لانا پڑے، اس طرح سے اتنی نشو ونما یافتہ یہ چیز ہو کہ اس کے اندر سے نتائج خود ٹپکتے چلے جائیں، اس لیے ہم نے پھر تمہیں باز آفرینی کا موقع دیدیا۔

آیت 52 تک ہم، برادرانِ عزیز! آ گئے، 53 ویں آیت سے ہم آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ط اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ

❀……❀……❀

اٹھارھواں باب: سورۃ البقرۃ (1)' (آیات 53 تا 58)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَاِذۡ اٰتَيۡنَا مُوۡسَى الۡكِتٰبَ وَالۡفُرۡقَانَ لَعَلَّكُمۡ تَهۡتَدُوۡنَ ﴿٥٣﴾ وَاِذۡ قَالَ مُوۡسٰى لِقَوۡمِهٖ
يٰقَوۡمِ اِنَّكُمۡ ظَلَمۡتُمۡ اَنۡفُسَكُمۡ بِاتِّخَاذِكُمُ الۡعِجۡلَ فَتُوۡبُوۡٓا اِلٰى بَارِئِكُمۡ فَاقۡتُلُوۡٓا
اَنۡفُسَكُمۡ ؕ ذٰلِكُمۡ خَيۡرٌ لَّكُمۡ عِنۡدَ بَارِئِكُمۡ ؕ فَتَابَ عَلَيۡكُمۡ ؕ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ
الرَّحِيۡمُ ﴿٥٤﴾ وَاِذۡ قُلۡتُمۡ يٰمُوۡسٰى لَنۡ نُّؤۡمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهۡرَةً فَاَخَذَتۡكُمُ الصّٰعِقَةُ
وَاَنۡتُمۡ تَنۡظُرُوۡنَ ﴿٥٥﴾ ثُمَّ بَعَثۡنٰكُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ مَوۡتِكُمۡ لَعَلَّكُمۡ تَشۡكُرُوۡنَ ﴿٥٦﴾ وَظَلَّلۡنَا
عَلَيۡكُمُ الۡغَمَامَ وَاَنۡزَلۡنَا عَلَيۡكُمُ الۡمَنَّ وَالسَّلۡوٰى ؕ كُلُوۡا مِنۡ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقۡنٰكُمۡ ؕ
وَمَا ظَلَمُوۡنَا وَلٰكِنۡ كَانُوۡٓا اَنۡفُسَهُمۡ يَظۡلِمُوۡنَ ﴿٥٧﴾ وَاِذۡ قُلۡنَا ادۡخُلُوۡا هٰذِهِ الۡقَرۡيَةَ فَكُلُوۡا
مِنۡهَا حَيۡثُ شِئۡتُمۡ رَغَدًا وَّادۡخُلُوا الۡبَابَ سُجَّدًا وَّقُوۡلُوۡا حِطَّةٌ نَّغۡفِرۡ لَكُمۡ خَطٰيٰكُمۡ ؕ
وَسَنَزِيۡدُ الۡمُحۡسِنِيۡنَ ﴿٥٨﴾

عزیزانِ من! آج اکتوبر 1968ء کی 6 تاریخ ہے اور ہم اپنے درسِ قرآنِ کریم کے سلسلۂ نو میں سورۃ البقرۃ کی آیت 52 تک سابقہ درس میں پہنچے تھے' 53 ویں آیت سے آج آغازِ کلام ہوتا ہے: (2:53)۔

سابقہ درس کی تجدید یادداشت

داستانِ بنی اسرائیل ہمارے سامنے مسلسل چلی آ رہی ہے۔ میں نے یہ عرض کیا تھا کہ قرآن کا انداز یہ ہے کہ وہ ایک اصول بیان کرتا ہے اور پھر اس اصول کی صداقت کے ثبوت کے لیے کہیں فطری دلائل پیش کرتا ہے اور بالعموم تاریخ کی شہادتیں پیش کرتا ہے کیونکہ تاریخی شہادتیں محسوس ہوتی ہیں اس لیے یہ جلدی سے سمجھ میں بھی آ جاتی ہیں اور شہادت کے اعتبار سے بھی زیادہ محکم ہوتی ہیں۔ اس نے قصۂ آدم کے تمثیلی بیان میں اصول یہ پیش کیا تھا کہ جو قوم قوانینِ خداوندی کا اتباع کرے گی' اسے عروج اور شوکت و حشمت عطا ہو گی' جو ان قوانین سے سرکشی برتے گی وہ ذلت اور مسکینی کے عذاب میں مبتلا ہو جائے گی۔ اس اصول کے بیان کرنے کے بعد اس نے تاریخ میں سے قومِ بنی اسرائیل کی داستان کو بطور شہادت پیش کیا ہے کہ اس قوم کی داستان فی الواقعہ اس بنیادی اصول کی بڑی ہی محکم اور واضح

شہادت بنتی ہے۔

برادرانِ عزیز! بات یہ چلی آ رہی تھی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اس قوم کو فرعون کی غلامی سے چھڑا کر' سینا کی وادیوں میں لے گئے اور وہاں ان سے یہ کہا تھا کہ اگر تم نے غلامی کو چھوڑ دیا اور صحیح تربیت سے' قوانین کی پابندی سے' اپنی مضمر صلاحیتوں کو ابھار لیا' تو یہ ارضِ مقدس یعنی فلسطین کا علاقہ خدا نے تمہارے نام لکھ دیا ہے لیکن یہ اس چیز کے ساتھ مشروط تھا کہ تم اس کے قوانین کی پابندی کرتے چلے جاؤ گے۔ قرآن یہ بتاتا ہے کہ اس قوم میں ایک چھوڑ دو دو نبی تھے' بہ صراحت دو تھے اور اگر ہم تاریخ کا بیان صحیح تسلیم کریں تو حضرت شعیب علیہ السلام بھی مدین میں ان کے ساتھ مل گئے تھے' اب انہیں تین کہیے لیکن صدیوں کی غلامی سے ان کے انسانیت کے جوہر اگر اس قدر مفلوج نہیں تو جامد تو ضرور ہو چکے تھے کہ وہ قدم قدم پر ان کی تعلیم سے ہٹ کر' پھر اپنی پرانی روش پر جانے کے لیے' بے تاب نظر آتے تھے۔ یہ قدم قدم پر انہیں جھنجھوڑتے تھے' انہیں اٹھاتے تھے اور یہ اس کے بعد پھر وہیں جا گرتے تھے۔ یہ ہے وہ دور جس سے ہم گزر رہے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام چند دنوں کے لیے ان سے الگ ہوئے تو انہوں نے خدا کی جگہ بچھڑے کی پھر پرستش شروع کر دی۔ اس کے بعد پھر انہیں باز آفرینی کا موقع دیا گیا' پھر یہ پیغمبر علیہ السلام ان کو اسی راستے پہ لے آئے اور وہاں کہا کہ **وَاِذۡ اٰتَيۡنَا مُوۡسَى الۡكِتٰبَ وَ الۡفُرۡقَانَ لَعَلَّكُمۡ تَهۡتَدُوۡنَ** (2:53) موسیٰ علیہ السلام کو کتاب دی۔

جیسا کہ میں نے شروع میں عرض کیا تھا کہ **ذٰلِکَ الۡکِتٰبُ** (2:2) ہمارے سامنے آئی ہے۔ کتاب ضابطۂ قوانین کو کہتے ہیں' خدا کی طرف سے وحی کے ذریعے ایک ضابطۂ قوانین ملتا ہے' قانونِ حیات ملتا ہے۔ اس کے مطابق زندگی بسر کرنے سے اس دنیا کی سرفرازیاں بھی حاصل ہوتی ہیں اور اگلی زندگی کی شادابیاں بھی۔ یہ ہوتی ہے الکتاب۔ قرآن نے یہ بتایا ہے۔

سابقہ انبیائے کرام کے سلسلہ میں قرآن حکیم کے بیان کردہ غیر متبدل اصولوں کا ذکر اور اہمیت

اب دیکھیے کہ کتابِ موسیٰ علیہ السلام کا ذکر ہے۔ پہلے تو یہ دیکھیے کہ عام دنیا کی اصطلاح میں' دنیا کے تصور کے مطابق کشادہ نگہی کتنی ہے۔ یہودیوں کا مذہب اسلام سے الگ ہے۔ وہ قوم مسلمانوں سے الگ قوم ہے' ان کی سخت دشمن قوم ہے' آخر تک اسلام کی مخالفت کرتی چلی گئی ہے' آج تک اس کی مخالف ہے۔ زمانۂ نزولِ قرآن میں سب سے زیادہ مخالفت ان یہودیوں کی طرف سے ہوتی تھی اگر کوئی اور بھی انسان ہوتا تو کبھی بھی ایسا نہ ہوتا کہ ان کے لیے کوئی مدح اور ستائش اور تعریف کا کلمہ اس کی زبان پہ آتا لیکن قرآن کا تو انداز ہی اور ہے۔ وہ کہتا یہ ہے کہ دین خدا کی طرف سے ہے' مختلف زمانوں میں' مختلف اقوام میں' مختلف انبیائے کرامؑ کی وساطت سے ملتا رہا۔ دین کا سرچشمہ ایک تھا' دین کے اصول تھے۔ یہ وہ قومیں تھیں جنہوں نے اس دین میں انسانی تصورات کی آمیزش کر کے دین کو مذہب میں

تبدیل کردیا۔ وہ مخالفت اس مذہب کی کرتا ہے' جسے وہ قوم اپنے ہاں دین سمجھ لیتی ہے حالانکہ وہ دین ہوتا نہیں۔ وہ اس دین کی مخالفت نہیں کرتا جو خدا کی طرف سے ان کے نبی کی وساطت سے دنیا کو ملا تھا۔ وہ اس نبی کی بھی تعظیم کرتا ہے' ان کی کتاب کا بھی احترام کرتا ہے۔ تعظیم ہی نہیں' احترام ہی نہیں' وہ تو ایک شخص کے مسلمان ہونے کے لیے سب سے پہلے یہ کہتا ہے کہ تمہیں محمد ﷺ پر ایمان لانے سے پہلے تمام انبیائے سابقہؑ پر ایمان لانا ہوگا' قرآن پر ایمان لانے سے پہلے تمام کتبِ سابقہ پر ایمان لانا ہوگا۔ اور ایمان اس طرح سے کہ لَانُفَرِّقُ بَيۡنَ اَحَدٍ مِّنۡ رُّسُلِهٖ (2:285) ہم ان کے رسول ہونے کی جہت سے کسی میں کوئی تفریق نہیں کرتے ہیں۔ اس ایمان لانے کے معنی' میں پھر یہ سمجھا دوں کہ ایمان اس بات کا کہ اپنے وقت میں ان رسولوں کو خدا کی طرف سے بالکل صحیح' سچی تعلیم ملی تھی جو ان کی اس کتاب میں محفوظ تھی' جو اس زمانے میں اس رسول نے اپنی قوم کو دی تھی لیکن اس کے ساتھ ہی قرآن کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ نزولِ قرآن کے زمانے میں دنیا میں کسی قوم کے پاس اپنی اصلی سچی تعلیم محفوظ نہیں تھی۔ اور یہ وہ دعویٰ ہے' جس کی شہادت تمام اقوامِ عالم' دنیا کے ہر مذہب کے مدعی' خود اس کے لیے اعتراف کرتے ہیں کہ ان کے پاس ان کے رسول کی صحیح تعلیم اور کتاب اپنی اصلی شکل میں نہیں ہے۔

دنیا بھر کے انسانوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے کا بہترین اصول

قرآن نے' یہ کہنے کے بعد' کہا ہے کہ اب وہی دین جو ان انبیائے کرامؑ کو وقتاً فوقتاً ملتا رہا' وہی دین اصولی طور پر اس قرآن کے اندر محفوظ کر کے دیدیا گیا ہے۔ اس لیے اگر یہ اقوامِ سابقہ اس دین کو تسلیم کرلیں گی تو گویا انہوں نے اپنے اس دین کو تسلیم کرلیا' جو شروع میں ان کے نبی کی وساطت سے انہیں ملا تھا۔ آپ دیکھتے ہیں کہ دنیا میں صلح اور آشتی کے قائم کرنے کے لیے قرآن کا یہ اصول کتنا زریں اصول ہے جو قوموں کو دیا گیا۔

(2:53) میں کتابِ موسیٰ علیہ السلام کا ذکر آیا ہے۔ کتابِ موسیٰ علیہ السلام کیا تھی؟ یہ کہ وہ فرقان تھی۔ قرآن عجیب لفظ استعمال کرتا ہے۔ قرآن کے لیے بھی اس نے فرقان کا لفظ استعمال کیا ہے۔ ''فرق'' کہتے ہیں ''بالوں کی مانگ کو'' اور مانگ میں آپ کو پتہ ہے کہ اگر ایک بال بھی جو ادھر آنا ہو دوسری طرف ہو تو مانگ سیدھی نہیں کہلاتی' بال برابر فرق بھی اس کے سیدھے ہونے میں نہیں رہ سکتا۔ یعنی ایک تشبیہہ سے یہ بات بتائی کہ وہ حق اور باطل کو اس طرح سے نکھار کر' الگ الگ کر کے' رکھ دیتا ہے جیسے مانگ دائیں اور بائیں کے بالوں کو الگ الگ کردیتی ہے۔ دونوں راستے بالکل نکھر کر سامنے آجاتے ہیں۔ اسی لیے قرآن نے وَهَدَيۡنٰهُ النَّجۡدَيۡنِ (90:10) کہا ہے کہ انسان کو ہم نے پیدا کیا تو پھر دونوں راستے نکھار کر بتا دیئے۔ وحی کا کام ہی یہ ہے' ہدایت کہتے ہی اسی چیز کو ہیں کہ راستوں کو نکھار کر'

ابھار کر سامنے لے آیا جائے۔ خود لفظِ ہدایت کے اندر یہ چیز موجود ہے۔ اس کے معنی صرف راہنمائی نہیں ہوتا بلکہ صحیح اور غلط راستوں کو ابھار کر سامنے لے آنا اس کے معنی ہوتا ہے۔ ابھار کر' نکھار کر' اس انداز سے الگ الگ نکھار کر' جیسے مانگ بالوں کو الگ الگ کر دیتی ہے۔ ویسے ''فرق'' کے معنی ''پیمانہ'' بھی ہوتا ہے۔ پیمانہ بھی تو باقی چیزوں میں سے اتنی چیز کو الگ کر دیتا ہے۔ اور پیمانے کے اعتبار سے تو خود قرآنِ کریم کے متعلق کہا گیا ہے کہ اِنَّآ اَنۡزَلۡنٰهُ فِیۡ لَیۡلَةِ الۡقَدۡرِ (97:1)۔ قدر کے معنی بھی پیمانہ ہوتے ہیں۔

نیکی کا یا اخلاق کا وہ معیار جو قرآن متعین کرتا ہے اگر وہ سامنے نہ ہو تو اس کا نتیجہ انسانیت کی تباہی ہے

قرآن حکیم یہ پیمانے دیتا ہے اور بڑی عجیب چیز ہے جو قرآن کہہ جاتا ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ عام طور پر عالمگیر اقدار مسلّم ہیں: مثلاً جھوٹ نہ بولو' چوری نہ کرو' زنا نہ کرو' فریب نہ دو۔ ان میں کوئی دھوکا نہیں کھاتا۔ یہ عام طور پہ بالکل نکھری ہوئی سامنے آتی ہیں۔ جھوٹ بولنے والا بھی کبھی یہ نہیں کہتا کہ میں کوئی اچھا کام کرتا ہوں۔ التباس کہاں ہوتا ہے؟ غلطی کہاں لگتی ہے؟ یہ Wrong notion of morality ہے' یعنی یہ اخلاق کا غلط تصور ہے۔ انسان سمجھتا یہ ہے کہ یہ بڑا نیکی کا کام ہے لیکن درحقیقت اسے دیکھیے تو وہ انسانیت کے لیے تباہی کا موجب بن جاتا ہے۔ ایک گال پر طمانچہ کھا کر دوسری گال سامنے کر دینا' نظر بظاہر آپ دیکھیے کتنا اچھا اخلاق کا یہ ضابطہ نظر آتا ہے کہ وہ اگر تمہارا کوٹ اتارتا ہے تو واسکٹ اتار کر خود اس کو دیدو' اگر اس نے تمہارا اتنا سامان چرا کر باندھ لیا ہے' وہ گٹھڑی اس سے اپنے سر پہ اٹھائی نہیں جاتی' تو وہ گٹھڑی اپنے سر پہ رکھ کر اس کے گھر پہنچا دو۔ یہ بہت اچھی نیکیوں کے کام نظر آتے ہیں لیکن آپ دیکھیے کہ کیا اس سے انسانیت کا معاشرہ چل بھی سکتا ہے؟ اگر ظالم کی کلائی نہ مروڑی جائے اور اس کو اتنی چھٹی دیدی جائے تو جس حد تک وہ ظلم خود نہیں کر سکتا' تم اس کا ساتھ دے کر اس کو گھر تک پہنچا آؤ' آپ دیکھیے کہ ان کے بعد معاشرے کی کیفیت کیا ہو جائے گی؟ یا دان اور پُن کے وہ انداز جو اس سے پیشتر یہاں لالہ جی کے ہوتے تھے: بھیڑوں کو پانی پلانے کے لیے پیاؤ' چڑیوں کے لیے دانہ ڈالنے کے لیے چوگا' صبح ہی صبح اٹھے' آٹا لیے ہوئے ہیں' یہ کیڑے مکوڑے کا جسے بھن ہم کہتے ہیں' اس پہ وہ آٹا ڈالتے چلے جاتے ہیں۔ یہ بڑا خیرات کا کام' دان اور پن کا کام ہے۔ اور پھر وہ سارا دن انسانوں کا خون نچوڑتے چلے جاتے تھے اور اس میں سے ایک نمک کا اتنا بڑا ٹکڑا رکھ دیتے تھے کہ گائے اور بیل آئیں گے اور اسے چاٹیں گے۔ نظر بظاہر کتنا اچھا پن کا کام نظر آتا ہے لیکن وہ جو انسانوں کا خون نچوڑا جاتا ہے' وہ کسی کو نظر نہیں آتا تھا' یہ نظر آتا ہے۔ یا خیرات کا تصور کتنا حسین تصور ہے: محتاج کی مدد کرنا' اسے خیرات دینا لیکن آپ سوچیے تو سہی کہ خیرات دینے والا جو ہے' اس دینے کے تصور سے آپ دیکھیے کہ اس کے اندر کتنا ایک تکبر اور نخوت اور ego (ایغو) کا جذبہ ابھرتا ہے۔ اور جسے دیا جاتا ہے اس کی شرفِ انسانیت کی کس قدر ذلت ہوتی ہے۔ یہ Wrong notion of

morality ہے اور دنیا میں تباہی کی موجب ہے۔

عزیزانِ من! ابلیس کبھی برہنہ، بے نقاب، سامنے نہیں آتا، بڑے مقدس نقاب اوڑھ کر سامنے آتا ہے، اس کی کامیابی کا راز ہی اس میں ہے۔ ایک شخص آ کر آدھے گھنٹے تک قسمیں اٹھا اٹھا کر، نہایت عمدہ دلائل سے آپ کو ایک چیز پہ قائل کرتا ہے، آپ اس کا ساتھ دینے کا وعدہ کرتے ہیں۔ اٹھتے ہوئے اگر وہ یہ کہہ دے کہ بھائی! میں نے جو کچھ اس وقت کہا ہے، سب جھوٹ تھا، آپ کہیے کہ اس کے بعد آپ اس کا ساتھ دیں گے؟ آپ فریب میں اسی صورت میں آئیں گے کہ وہ آخر وقت تک کہتا چلا جائے کہ میں سچ بولتا ہوں۔ جھوٹ بے نقاب ہو کر کامیاب ہو نہیں سکتا، اسے سچ کا لباس پہننا پڑتا ہے اور یہی انسانیت کی تباہی ہے۔ ''فرقان'' یہ ہے کہ یہ جو چیزیں ہیں کہ مثلاً جھوٹ نہ بولو، چوری نہ کرو، ان کے لیے آپ دیکھیے گا کہ قرآن میں ان کے متعلق تو یونہی گزرتے ہوئے اشارہ کر دیا گیا ہے، اس سے زیادہ Stress (زور و تاکید) دینے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ اس میں نکھار کر وہ اس چیز کو سامنے لایا ہے کہ جن چیزوں کے کرنے کو عام طور پر نیکی سمجھا جاتا تھا، درحقیقت وہ نیکی نہیں تھی۔ فرقان اسی اعتبار سے نئے پیمانے کو کہا گیا کہ اِنَّآ اَنْزَلْنٰـهُ فِیْ لَیْلَةِ الْقَدْرِ (97:1) انسانیت کو نیکی کے نئے پیمانے دیئے۔ اس دور میں بھی نیکی تو اچھی چیز تھی مگر پیمانے غلط تھے۔ یہ وہ چیز ہے جو فرقان کے اندر ہے، یہ پیمانہ بنتی ہے۔ اب اس کے بعد نیکی کا وہ تصور نہیں، جسے میں نیکی سمجھوں، جسے آپ نیکی سمجھیں، جسے زید نیکی سمجھے، جسے بکر نیکی سمجھے۔ نیکی کا پیمانہ یہ ہے کہ جس کا Objective Standard، خارجی Standard (معیار)، نیکی کا ہو، وہ نیکی بنتی ہے، میرے اور آپ کے Subjective Standard (داخلی معیار) کے مطابق نہیں ورنہ ایک ٹھگ، جب اپنی دُرگا مائی کے سامنے یہ پَران لے کر جاتا تھا کہ میں جو کچھ لوٹوں گا، اس کا پانچواں حصہ آ کر تمہیں دیدوں گا، اور پانچواں حصہ نہایت دیانتداری سے وہاں جا کر دیدیتا تھا، وہ یہ بڑا نیکی کا کام کرتا تھا، نہایت دیانتداری سے، ایمانداری سے نیکی کا یہ کام کرتا تھا۔ وہ ڈاکوؤں کا گروہ جو کوئی ڈاکہ ڈال کر لے جاتے ہیں، آپس میں بانٹتے وقت اگر وہ عدل و انصاف سے کام لیتے ہیں تو وہ جو گروہ ہے، وہ ان کو بڑا شریف ڈاکو سمجھتا ہے، اچھے ساتھی سمجھتا ہے۔ وہ اس وقت کسی برائی کا مستوجب بنتا ہے جس وقت وہ آپس میں یہ مالِ غنیمت کے بانٹنے میں کوئی چیز بے ایمانی کی کرتے ہیں۔ اور اب تو ڈاکوؤں کی تلاش میں کہیں جنگلوں میں جانے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی، برادران عزیز! جب تک ان کا بھرم ''اوپر'' بنا رہتا ہے، مالِ غنیمت کی تقسیم میں آپ دیکھیں گے کہ بالکل آپس میں مہذب رہتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کے خلاف اس وقت ہوتے ہیں جب وہ وہاں کچھ بے ایمانی کرتا ہے۔ وہ یہ کبھی نہیں کہتے کہ تم نے دوسروں کو کیسے لوٹا تھا۔

قرآن نیکی کے پیمانے بدلتا ہے، قرآن Morality (اخلاق) کے اقدار بدلتا ہے۔ فرقان اس اعتبار سے ہے۔ اگر اس کو فرق لیا جائے، تو یہ پیمانے کے اعتبار سے ہے۔ اور اگر اس سے راستوں کا نکھیڑ کر بیان کرنے والا لیا جائے تو اسے عربی زبان میں مـفـرق

الطریق کہتے ہیں' یہ مُفرِّقُ الطَّرِیق راستے کے اس مقام کو کہتے ہیں' جہاں سے اس میں سے نیا راستہ پھٹتا ہو۔

قرآن حکیم زندگی کے ہر موڑ پر راستے کا تعین کرتا دکھائی دیتا ہے

برادرانِ عزیز! یہ پھر بڑی عجیب چیز آ گئی۔ سیدھا راستہ آپ چلتے چلے جائیں' نہ کسی سے پوچھنے کی ضرورت' نہ کسی سائن پوسٹ کی ضرورت' جہاں دوراہا آئے گا وہاں آپ کو کھڑا ہونا پڑے گا۔ دوراہے پہ اس چیز کی ضرورت پڑے گی کہ آپ کو معلوم ہو کہ مجھے دائیں کو جانا ہے یا بائیں کو۔ اور یہ وہ مقام ہے جہاں وحی اُسے مُفَرِّقُ الطَّرِیق کہتی ہے۔ فرقان کے معنی یہ ہوتے ہیں اور مُفَرِّقُ الطَّرِیق کے معنی ہوتا ہے "جہاں ایک راستے میں سے دوسرا راستہ نکلے" وہ اس مقام کے اوپر سائن پوسٹ دیدیتا ہے صرف یہ بتانے کے لیے کہ یہ راستہ گلبرگ کو جاتا ہے' اور یہ راستہ شہر کو جاتا ہے۔ وہ یہ چیز کہتا ہے کہ اِنَّا هَدَیْنٰهُ السَّبِیْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا (76:3) راستہ ہم بتا دیتے ہیں' اب اس کا جی چاہے تو یہ گلبرگ والے راستے پہ چلا جائے جدھر اس نے جانا ہے' جی چاہے تو اسے چھوڑ کر دوسرے راستے پہ چلا جائے۔ فَمَنْ شَآءَ فَلْیُؤْمِنْ وَّ مَنْ شَآءَ فَلْیَكْفُرْ ۙ(18:29) اس کا کام صرف دوراہے پر سائن پوسٹ نصب کرنا ہے' اسے بھی فرقان کہتے ہیں۔ اور اگلے دو الفاظ میں کہا ہے کہ یہ معنی زیادہ جچتے ہیں کہ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ (2:53) ہم نے فرقان دوراہے پر' یعنی سائن پوسٹ نصب کر دیا تاکہ تم صحیح راستے کی طرف چل سکو۔ سائن پوسٹ نہ ہونے کی صورت میں غلط راستے پہ قدم اٹھ سکتا ہے۔ پھر ہوتا یہ ہے کہ آپ دن بھر چلتے رہیں دوپہر کو' شام کو' تھکے ماندے جب آپ کہیں سے پتہ لیں تو معلوم ہو کہ صاحب! وہاں سے غلط مڑ گئے تھے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ یہ دن بھر آپ کی محنت کس طرح سے اکارت گئی۔ اسی کو قرآن کہتا ہے کہ فَاُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ (2:217)۔ ایک تو وہ تھا کہ جو گھر بیٹھا رہا' چلا ہی نہیں ہے' کم از کم تھکا تو نہیں' یہ جو وہاں سے غلط مڑ گیا ہے' دن بھر اس نے کام کیا ہے' سفر کیا ہے' پاؤں چلتے رہے ہیں' تھک بھی گیا ہے لیکن ہر قدم اس کا منزل سے دو قدم دور لے جاتا گیا۔ یہ وحی وہ محنت بچاتی ہے۔

عقل کے مقابلے میں وحی انسانیت کا بوجھ ہلکا کر دیتی ہے اور صدیوں کا سفر دنوں میں ہی مکمل ہو جاتا ہے

یہ ہو سکتا ہے کہ اتنے چکر کاٹنے کے بعد پھر یہ از خود دوسرے تیسرے دن کہیں جا پہنچے۔ اقبالؒ (1938-1877) کے الفاظ میں وحی کا کام یہ ہے: It economises human efforts

یہ انسان کی محنت بچا دیتا ہے۔ دوسرے مقام پہ اس سے زیادہ حسین الفاظ میں' یہ کہا ہے:

ہر دو بہ منزلے رواں' ہر دو امیر کارواں
عقل بہ حیلہ می برد عشق برد کشاں کشاں

بات اتنی ہی ہے کہ عقلِ انسانی Trial & Error (سعی وخطا) کے راستوں سے چلتی ہے' لمبا راستہ ہوتا ہے' مسافر تھک جاتا ہے' راستے میں لٹنے کا بھی خطرہ ہوتا ہے اور کئی قسم کی تباہیاں بھی آ سکتی ہیں۔ وحی صرف اس موڑ کے اوپر یہ بتا دیتی ہے کہ یہ راستہ سلامتی کا ہے اور سیدھا منزل میں چلا جائے گا۔ اتنا ہی فرق ہے۔ عزیزانِ من! Trial & Error (سعی وخطا) کے راستے بھی انسان لمبی مسافتیں کاٹتا ہوا وہیں آ سکتا ہے' فرق بس اتنا ہی ہے کہ ہڈیاں تڑوانے کے بعد' آگ کی خندقیں پھاندنے کے بعد' پھر کہیں جا کر ہزار ہزار سال میں کوئی ایک نکتہ واضح طور پہ سامنے آتا ہے' اسے زمانے کے تقاضے کہتے ہیں۔ وحی پہلے سے یہ کہہ دیتی ہے کہ اس راستے پہ چلو تو صحیح منزل پہ پہنچ جاؤ گے۔ **اَلْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ** (2:53) اس موڑ پہ ہم نے سائن پوسٹ لگا دیا تا کہ تم صحیح منزل تک پہنچ جاؤ۔

کہا ہے کہ **وَ اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ** (2:54) موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ تم نے اپنے ہاتھوں کی بنائی ہوئی مورتی کے سامنے اپنے سر کو جھکا دیا۔ بڑی عجیب چیز ہے' برادرانِ عزیز! کہا ہے کہ **ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ** (2:54) کسی پہ کوئی زیادتی نہیں ہوئی۔ ظلم کے معنی میں نے پچھلی دفعہ عرض کیے تھے: ''جس مقام پہ کسی کو ہونا چاہیے اس مقام پہ اس کو نہ رکھنا' یا اس کا وہاں نہ ہونا''۔ **ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ** (2:54) خدا کا کچھ نہیں بگڑا' تم اپنے مقام سے نیچے گر گئے۔ یہ صرف مقام انسانیت کی تذلیل ہے' عزیزانِ من! خدا کا اس سے کچھ نہیں بگڑتا۔

کائنات کا ایک ایک ذرہ انسان کے سامنے ساجد کی حیثیت اختیار کیے ہوئے ہے

انسان کا مقام یہ تھا کہ **وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ** (45:13) کائنات میں جو کچھ ہے' وہ اس کے تابع تسخیر کر دیا گیا ہے۔ خارجی کائنات کے مقابلے میں تو ایک انسان کا مقام یہ ہے کہ وہ سارے ساجد ہیں' یہ اس کا مسجود ہے' ملائکہ آدم کے سامنے سجدہ ریز ہوتے ہیں۔ اگر انسان اس خارجی کائنات میں کسی قوت کے سامنے سجدہ ریز ہو جائے تو یہ ظلم ہو گیا۔ اس نے تو مسجود ہونا تھا' یہ ساجد ہو گیا' یہ ظلم ہو گیا' یہ اپنے مقام پہ نہیں رہا' گر گیا' پستی میں جا گرا' شرفِ انسانیت کی ذلت ہو گئی۔ اب دوسری چیز دنیا کے اندر انسان ہی باقی رہ سکتے تھے اور انسانوں کے متعلق تو اس نے کہا ہے کہ **وَ لَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِىْٓ اٰدَمَ** (17:70) ہر انسان کا بچہ محض انسان کا بچہ ہونے کے اعتبار سے یکساں واجب الاحترام ہے' جو یکساں واجب الاحترام ہے اس کے سامنے جھک جانا پھر یہ انسانیت کی ذلت ہے' پھر یہ وجۂ تذلیلِ انسانیت ہے۔ **ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ** (2:54) تم نے اپنے آپ کو اپنے مقام سے گرا دیا۔

عزیزانِ من! دین کی لم یہ ہے کہ وہ آدمی کو مقامِ انسانیت عطا کرتا ہے۔ خدا کا یہ کچھ نہیں سنوارتا' نہ یہ اس کا کچھ بگاڑ سکتا ہے۔ جب کوئی انسان نہیں تھا' اس وقت بھی خدا کی خدائی اسی طرح سے چلتی تھی۔ یہ خود انسان کے اپنے ہی سنورنے کی بات ہے اور اس کے

سنورنے سے کائنات کا حسن سنورتا ہے برادرانِ عزیز! دین کی لم اتنی ہی ہے کہ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ (2:54) تم نے اپنے آپ کو اس مقام سے گرالیا۔

صحیح راستے پر گامزن ہونے کے لیے ''تاب'' کے بعد ''اصلح'' کا عمل ضروری قرار پاتا ہے

آگے کہا ہے کہ فَتُوْبُوْٓا اِلٰى بَارِىٕكُمْ (2:54)۔ اس آیت میں پھر وہی توبہ کا مفہوم سامنے آجائے گا۔ غلط راستے پہ قدم اٹھ گیا' کچھ فاصلے کے اوپر جا کر محسوس ہوا' پوچھا' پتہ چلا کہ راستہ غلط تھا۔ کیا کرتے ہیں آپ وہاں سے؟ آپ کو واپس لوٹنا پڑے گا' اس مقام پہ جہاں سے آپ نے غلط راستہ اختیار کیا تھا۔ یہ جو واپس لوٹنا ہے اسے عربی زبان میں ''تاب'' کہتے ہیں' یہ پھر اس مقام پہ آنا ہے۔ پہلے کو Undo (ختم) کرنا ہے' اس نقصان کو پورا کرنا ہے جو اس طرح غلط روش پہ چلنے سے ہوا۔ تو اس مقام پہ آگئے۔ کیا اس مقام پہ آنے کے بعد پھر توبہ کا جو مقصد تھا پورا ہو گیا؟ نہیں جی' پورا نہیں ہوا' یہاں سے پھر صحیح راستے کی طرف چلنا ہے اسی لیے قرآن نے تَابَ وَاَصْلَحَ ہمیشہ اکٹھا کہا ہے۔

تَابَ تو اس غلط احساس کے بعد اس مقام پہ واپس آنا ہے جہاں سے غلط قدم اٹھا تھا۔ اَصْلَحَ یہ ہے ''اس مقام پہ پہنچ کر صحیح راستے کی طرف قدم اٹھا کر چلنا''۔ ''یا اللہ! میری توبہ نال کم نئیں چلدا ایہدے اچ[1]'' جہاں آپ کو پتہ چلا ہے غلط راستہ ہے وہاں چھاؤں میں بیٹھ جایئے اور وہاں تسبیح ہاتھ میں لے لیجیے اور کہتے جایئے کہ میں غلط راستے پہ چلا' غلط راستے پہ چلا۔ یہ کہتے چلے جایئے' عمر بھر کہتے چلے جایئے حتیٰ کہ اگر آپ اس مقام پہ پہنچ گئے ہیں کہ آپ کی موت آرہی ہے' چلنے کی سکت نہیں رہی' لڑکھڑا کر گر رہے ہیں' یہ بھی توبہ کا مقام چھن گیا۔ یہی چیز ہے جو کہتے ہیں کہ جب موت سامنے آجائے تو توبہ نہیں ہوسکتی اس لیے کہ توبہ میں تو کچھ کرنا ہے اور دہرا کام کرنا ہے۔ ایک تو تلافیٔ مافات کرنا ہے' وہاں سے پلٹ کر آنا ہے' یہاں سے چل کر جانا ہے اور جب اس عمل کا موقع ہی نہ رہا تو توبہ کاہے کی ہوئی۔ اس لیے یہ تَابَ وَ اَصْلَحَ آیا ہے۔

یہ تلافیٔ مافات کیسے ہوتی ہے؟ کہا ہے کہ اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ (11:114) یاد رکھو! تخریبی کام جو تم کر چکے ہو' اس کی تلافی اس سے ہے کہ اس سے دوگنا اچھا کام کر کے دکھاؤ۔ دوگنا تو کرنا ہی پڑتا ہے: یہ جو چار میل چلے تھے' پھر چار میل واپس آئے' آٹھ میل تو یہ ہو گیا اور پھر چار میل اُدھر سے چلے آپ نے جدھر جانا ہے لیکن' عزیزانِ من! اس میں شارٹ کٹ کوئی مل نہیں سکتا' یہ تو چلنا ہی پڑے گا۔ یہ تلافیٔ مافات نہ آپ کے وہاں بیٹھ کر تسبیح پھیرنے سے' نہ کسی حضرت صاحب کی دعا اور سفارش سے ہوگی۔ آپ کو تو پہلے اپنی

---

[1] اس میں ''یا اللہ! میری توبہ'' سے کام نہیں چلتا۔

غلطی کے ازالے کے لیے یہ Undo (ختم) کرنا پڑے گا پھر صحیح راستے کے اوپر چلنا پڑے گا یہ تاب اور اصلح ہے۔ کہا ہے کہ فَتُوْبُوْٓا اِلٰی بَارِئِکُمْ (2:54)۔ یہ قرآن کے الفاظ ہیں' عزیزانِ من! یہاں قرآن کا بَارِئِکُمْ لفظ کیوں آیا ہے؟ کیا بات ہے قرآن کی! خدا کے اسماءِ الحسنیٰ یعنی خدا کی صفات ہیں' ایک ان میں سے الباری بھی ہے۔ جہاں یہ آیا ہے وہاں تو بڑے عجیب معنوں میں ہے۔ کہا ہے کہ هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى (59:24)۔ وہ بڑی عجیب چیز ہے۔ وہاں آؤں گا تو بتاؤں گا۔

لفظ فاطر کا لغوی معنی نیز انسانی زندگی اور حیوانی زندگی میں فرق

فاطر وہ ہوتا ہے "جو پہلے پہل کسی شے کو عدم سے وجود میں لانے والا ہو"' وہ ہم نہیں جان سکتے کہ کیسے ہوتا ہے۔ اس کے بعد ہوتا یہ ہے کہ جو اشیا وجود میں آ گئی ہیں' ان کی مناسب Proportion (تناسب) سے نئی نئی چیزیں تخلیق کرتے چلے جانا۔ یہ ہے تخلیق۔ اس عملِ تخلیق کے اندر خدا کے علاوہ اور بھی شامل ہیں یعنی انسان بھی شامل ہے۔ اسی لیے اس نے اپنے آپ کو احسن الخالقین کہا ہے یعنی Create (تخلیق) کرنے والوں میں سب سے زیادہ یعنی حسین تریں Creation (تخلیق) کرنے والا' وہ دوسروں کو خالق مانتا ہے۔ اور جس قوم یا جس فرد کے اندر قوت تخلیق نہیں ہے' وہ اقبالؒ کے الفاظ میں یوں ہے:

ہر کہ او را قوتِ تخلیق نیست
پیشِ ما جز کافر و زندیق نیست!

(جس کسی میں تخلیق کی قوت نہیں ہے وہ ہمارے نزدیک کافر اور زندیق کے سوا کچھ نہیں)۔

حیوان تخلیق نہیں کر سکتا' وہ تولید کر سکتا ہے' وہ Creation (تخلیق) نہیں کر سکتا' Procreation (تولید) کر سکتا ہے۔ مقصدِ زندگی' عزیزانِ من! اگر یہی ہے کہ کمایا' کھایا' اولاد پیدا کی' اس کی پرورش کی' اس کے بعد مر گئے تو یہ خالص حیوانی زندگی ہے' انسانی سطح اس کے نصیب میں نہیں ہوئی۔ یہ کچھ Create (تخلیق) کرتا ہے تو انسانیت کی صف میں شامل ہو سکتا ہے۔ اور Creation (تخلیق) کی کوئی انتہا نہیں ہو سکتی' اس میں تو ترتیب نو کی ضرورت ہے' یہ کرتے چلے جایئے۔

تخلیق نو کے سلسلہ میں الباری اور المصور کے عمل کا طریق

اس میں ایک اور چیز خالق کی ترتیب نو بھی ہے' اس کے بعد الباری ہے کہ اس ترتیبِ نو میں کوئی حشو و زوائد کی چیزیں جو اس طرح سے جمع ہو گئیں ہیں' ان کو الگ کرتے جایئے۔ آپ کو معلوم ہے کہ چاک کے اوپر کمہار بیٹھا ہوتا ہے' وہ اتنا مٹی کا تودہ لیتا ہے' اس کے اوپر رکھتا ہے۔ یہاں تو اب چاک ہیں نہیں' بہر حال آپ نے دیکھے تو ہوں گے۔ پھر وہ اس چاک کو گھماتا ہے' پھر اس کے بعد وہ اسے کرتا کیا

ہے؟ ایک تو یہ ہے کہ وہ اس کو Shape (شکل) دیتا ہے اور اس Shape (شکل) دینے میں جتنی مٹی زائد ہوتی ہے' وہ اس کو الگ کرتا چلا جاتا ہے۔ یہ جو اس میں سے حشو و زوائد کو الگ کرنا ہوتا ہے' یہ الباری کا کام ہے۔ تخلیق کا جو ارتقائی (Evolution) نظریہ ہے' اس کا آپ ان سائنٹسٹ سے پوچھیے کہ ابتدائی دور کے اندر جو تخلیق ہوئی تھی' اس کے بعد اس دور میں پہنچنے تک راستے میں کتنے حشو و زوائد تھے' جو الگ ہوتے چلے گئے اور اس کے بعد پیکرِ انسانیت کی یہ جو فارم ہے' یہ ہمارے سامنے آئی۔ یہ ہے وہ المصور' یعنی فارم عطا کرنے والا۔ الخالق ہے Proportion (تناسب) دینے والا' الباری ہے حشو و زوائد کو الگ کرنے والا اور المصور ہے پھر پیکرِ انسانی تک فارم عطا کرنے والا۔

قرآنِ حکیم کی شکل میں انسانی خیالات سے پاک وحی کا نزول اور اسکی اہمیت

یہاں کہا ہے کہ فَتُوْبُوْٓا اِلٰی بَارِئِکُمْ (2:54)۔ یہاں یہ لفظ بَارِئِکُمْ آیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہاں یہ بَارِئِکُمْ کیوں آیا ہے؟ اس نے کیا کیا تھا؟ کیا یہ تھا کہ اس نے جو خالص وحی دی گئی تھی انہوں نے انسانی خیالات کی آمیزش کر کے یہ شرک کیا تھا۔ باری آیا ہے کہ یہ جو انسانی خیالات کی آمیزش ہوئی تھی' اس کو اس نے الگ کر دیا' وحی کو پھر سامنے سے لے آیا۔ کہا ہے کہ فَتُوْبُوْٓا اِلٰی بَارِئِکُمْ (2:54)۔ مذہب کو دین میں تبدیل کرنے کا طریقہ یہ ہے' برادرانِ عزیز! کہ خدا کی جو صفت باری ہے اس کو لایا جائے۔ دین میں جب انسانی خیالات کی آمیزش ہو جاتی ہے تو مذہب بن جاتا ہے۔ مذہب سے ان آمیزشوں کو الگ کر دیا جائے تو دین بن جاتا ہے لیکن اس کے لیے تو آپ کے پاس پھر یہ خالص پیمانہ ہونا چاہیے۔ الگ کرتے وقت کہیں ایسا تو نہ ہو جائے کہ آپ یہ آمیزش کو الگ کرتے ہیں تو سرے سے سارے کا سارا ہی اٹھا کر پھینک دیں۔ مغرب نے یہی کیا۔ ان کے پاس عیسائیت مذہب کی شکل میں آئی' آگے نہیں چل سکتی تھی۔ چاہتے تھے کہ کسی طرح سے اس میں سے کچھ الگ کریں مگر ان کے پاس پیمانہ نہیں تھا۔ کس طرح سے الگ کرتے؟ صدیوں تک ٹکریں ماری گئیں' ان کے پاس اس حشو و زوائد کو الگ کرنے کا پیمانہ نہیں تھا۔ نہیں کر سکے تو انہوں نے اٹھا کر اس سارے کے سارے کو ہی الگ کیا' بھاڑ میں جائے وہ سونا جو کان کو کھائے۔

دنیا میں صرف مسلمان ہی اس پوزیشن میں ہے' عزیزانِ من! کہ اگر وہ چاہے تو مذہب سے الباری کی صفتِ خداوندی کے تابع' اس کو پھر دین میں تبدیل کر سکتا ہے' جو کچھ انسانی آمیزشوں نے کیا ہے وہ اس سے الگ کر دیا جائے۔ کس طرح الگ کیا جائے؟ خدا کا یہ پیمانہ' خدا کی یہ قدر' خدا کا یہ فرقان ہمارے پاس موجود ہے۔ لایئے مذہب کو اس چاک کے اوپر چڑھایئے' اس مٹی کے تودے کو دیکھیے کہ پھر اس عملِ خالقیت و باریت و مصوریت تصویر سے کس طرح سے نکھر کر ابھر کر اسی حسین منزہ شکل کے اندر دین آپ کے سامنے

آ جاتا ہے۔ کہا ہے کہ فَتُوْبُوْٓا اِلٰی بَارِءِ کُمْ (2:54)۔ یہ بنی اسرائیل سے ہی نہیں کہا گیا' دنیا کی ہر مذہب پرست قوم سے یہ کہا گیا ہے اور ہم سے تو پھر خاص طور پہ یہ کہا گیا ہے۔ آج ہمیں بھی اس کی ضرورت ہے۔

ایک بچھڑے کے بالمقابل آج ہماری ذہنی پستی کی حالت

برادرانِ عزیز! فَتُوْبُوْٓا اِلٰی بَارِءِ کُمْ (2:54) انہوں نے تو ایک معبود ایک بچھڑا بنایا تھا' انہوں نے اسے تراشا تھا ہمارے ہاں تو پوچھیے نہیں کہ کتنے معبود تراشتے چلے جاتے ہیں:

رہ مدہ در کعبہ اے پیر حرم اقبال را
ہر زماں در آستیں دارد خداوندے دگر

(اے حرم کے پیر! اقبال کو کعبہ میں داخل نہ ہونے دو۔ وہ تو ہر گھڑی اپنی آستین میں ایک نیا بت رکھتا ہے) اور اسی میں ہے کہ

می تراشد فکرِ ما ہر دم خداوندے دگر
رست از یک بند تا افتاد در بندے دگر

(ہماری فکر ہر لحظہ ایک نیا آقا تراشتی ہے۔ جب وہ ایک بند سے نکلتی ہے تو کسی اور بند میں گرفتار ہو جاتی ہے۔ ہماری ہوس نئی نئی آرزوئیں پیدا کرتی رہتی ہے)۔ اس طرح ہم تو ہر آن اپنے ذہن کے بت کدے میں نئے نئے بت تراشتے چلے جاتے ہیں' عزیزانِ من! ایک عجل کی کیا بات' ایک بچھڑے کی کیا بات!!! یہاں قدم قدم پہ سامری بیٹھے ہوئے ہیں جو اس قسم کے افسانوں کو حقیقت بنا کر آپ کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ گھبرانے کی' مایوس ہونے کی کوئی بات نہیں ہے' عزیزانِ من! بس آپ نے فَتُوْبُوْٓا اِلٰی بَارِءِ کُمْ (2:54) کرنا ہے۔ آپ نے غور فرمایا کہ یہ فَتُوْبُوْٓا اِلٰی بَارِءِ کُمْ (2:54) کتنی اہم چیز ہے۔ قرآن کے کسی لفظ سے' عزیزانِ من! یوں نہیں آگے گزر جانا چاہیے۔ وہ جب آپ سے تفکر و تدبر کا تقاضا کرتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ دیکھو کہ یہاں یہ لفظ کیوں لایا ہے۔ اور جیسا کہ میں عام طور پہ کہا کرتا ہوں کہ ہر آیت کے آخر میں جو یہ ایک چیز خدا کی صفت لایا کرتا ہے وہ چیز بڑی غور طلب ہوتی ہے کہ اتنی صفات میں سے وہ یہی صفت کیوں لایا ہے؟ حقیقت میں وہاں وہی آنی چاہیے۔

قتل یا ذبح کے دوسرے معنی قوانین کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے کے بھی ہوتے ہیں

کہا ہے کہ فَتُوْبُوْٓا اِلٰی بَارِءِ کُمْ فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَکُمْ ذٰلِکُمْ (2:54)۔ یہاں عام معنی کے اعتبار سے پھر وہی کہتے ہیں کہ

آپس میں ایک دوسرے کو قتل کرو۔ نظر آ جاتا ہے کہ یہ تو کوئی عام سی بات نہیں تھی تو پھر یہ ہوا کیا؟ میں نے پچھلی دفعہ بھی عرض کیا تھا کہ قتل ذبح کے یہ جو الفاظ ہیں یہ صرف اس طرح سے Kill (قتل) کرنے کے معنوں میں نہیں آتے' یہ جھک ❶ جانے کے معنوں کے اندر بھی آتے ہیں مثلاً تم نے قوانینِ خداوندی سے سرکشی برتی' تم ان قوانین کے سامنے جھک گئے' یہاں اپنے نفس کو جھکاؤ۔ یہ اندر سے ہی عقیدے کی سرکشی ہوتی ہے جو انسان کو قانون شکنی پر آمادہ کرتی ہے۔ اس کا علاج یہ ہے کہ پھر قانون کے سامنے جھک جانا چاہیے۔ اور یہ وہ قتل ہے جو قدم قدم پہ کرنا پڑتا ہے' عزیزانِ من! یہ ایک بار کا جو قتل ہے گردن کا الگ کر دینا یا ہو جانا ہے وہ تو کوئی بات نہیں ہے۔ ذبحِ عظیم جسے قرآن نے کہا ہے وہ تو یہ ہے کہ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ (1:132) آخری لمحے تک ان قوانین کے سامنے جھکتے ہوئے چلے جاؤ کیونکہ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِئِكُمْ (2:54)۔ یہ ہے وہ طریق کہ جو حشو و زوائد کو الگ کر کے' پھر نکھار کر تمہیں اس دین کی طرف لے آئے گا۔ یہی وہ طریق ہے کہ ان قوانین کے سامنے جھک جاؤ۔ تم یہ کرو گے۔

آگے کہا ہے کہ فَتَابَ عَلَيْكُمْ (2:54)۔ کیا بات ہے! وہاں پہنچ جاؤ جہاں سے غلط راستے پہ چلے تھے پھر صحیح راستے کی طرف قدم اٹھاؤ' تو منزل خود بڑھ کر تمہارے قدم چوم لے گی۔ اور یہاں تو یہ تاب Verb (فعل) کے معنوں میں کہا ہے۔ بندے کو تو اس نے تائب کہا ہے یعنی لوٹنے والا' اپنے آپ کو اس نے توّاب کہا ہے یعنی تم ایک قدم لوٹتے ہو' ہم دو قدم بڑھتے ہیں آؤ تو سہی تم ادھر۔ مایوس کرنا تو ایک طرف رہا' اس کی وہ منزل تو اس طرح سے بڑھ کر قدم چومتی ہے۔ کہا ہے کہ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ (2:54) اس توّاب کے ساتھ رحیم کیا بات ہے! تائب اور توبہ سے ابھی ہم نے یہ سمجھا کہ جو کچھ گیا تھا صرف اتنا ہی ملا' یہی بات ہے۔ جس منزل پہ پہنچنا تھا' نہیں پہنچ پائے' اتنا کچھ کرنے کے بعد تلافی مافات بھی کی' اتنا ہی ہوا' کچھ زیادہ تو نہ ہوا۔ وہ کہتا ہے کہ نہیں! اتنا ہی نہیں ہے کہ ہم اس کو اتنا ہی دیدیتے ہیں جو ہونا چاہیے۔ رحیم کے معنی یہ ہیں کہ ہم تمہاری ذات کی نشوونما کے سامان بھی ساتھ دیدیتے ہیں۔ "اے جیہڑا پورا تول کے مگروں اتوں تھوڑا جیا دے دیندے ہیگے نیں ❷" یہ الگ دینا ہی کیا! جونہی آپ نے منزل کی طرف صحیح قدم اٹھایا' ساتھ کے ساتھ آپ کی ذات کی نشوونما ہوتی چلی گئی۔ یوں وہ توّاب اور رحیم بنتا ہے۔

---

❶ امام راغب اصفہانی (م 502ھ) نے اپنی مشہور تصنیف "المفردات فی غریب القرآن" میں لکھا ہے کہ قَتَلْتُ فَلَانًا کے معنی "ذَلَّلْتُهٗ" آتے ہیں یعنی "اسے مطیع و فرمانبردار بنالیا۔ (2:54) میں اس کے معنی ہیں" اپنے آپ کو قوانین خداوندی کے تابع لے آؤ"۔ (راغب اصفہانی: المفردات فی غریب القرآن' مطبع میمنیہ' مصر' 1324ھ) نیز پرویزؒ: لغات القرآن (جلد سوم)' ادارہ طلوع اسلام' لاہور' 1961ء' ص ص 1328 تا 1330)۔

❷ یہ جو پورا تول کر' بعد میں اسمیں ذرا سا اور ڈال دیتے ہیں۔

غلامی کا طوق انسان کو محسوسات کے پیکر کا عادی بنا دیتا ہے

کہا ہے کہ وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً (2:55)۔عزیزانِ من! ایک اور آئی خوئے غلامی۔غلامی میں ذہن محسوسات کے دائرے میں گھر کر رہ جاتا ہے‘ اس میں بلندیٔ فکر نہیں رہتی۔اول تو اسے دن رات کی روٹی کے چکر میں ایسا پھنسایا جاتا ہے کہ وہ بیچارہ اس کے کسی بلند مقصد‘ بلند آئیڈیل کے لیے سوچنے کے قابل ہی نہیں رہتا۔سارا وقت اسی چکر کے اندر رہتا ہے‘ کسی بلند مقصد کو سوچ ہی نہیں سکتا۔پھر جب جہالت آتی ہے تو آپ کے ہاں یہ جتنی Abstract thought (غیر محسوس سوچ) والی چیزیں ہوتی ہیں‘ Imperceptible (غیر محسوس) ہوتی ہیں‘ یہ تو ایسی ہوتی نہیں ہیں کہ محسوس شکل میں سامنے آئیں اور اُدھر اس کی ذہنی سطح اتنی اونچی نہیں ہوتی تو پھر یہ ہر شے کو محسوس پیکر میں دیکھنے کا عادی ہو جاتا ہے۔یہ جتنے بت بنے ہوئے ہیں‘ مورتیاں بنی ہوئی ہیں‘ یہ انسان کے اس دور کی یادگار ہیں جب اس کے ذہن میں ابھی Abstract Truths (مجرد حقائق) کو Conceive (قبول) کرنے کی‘ اتنی صلاحیت پیدا نہیں ہوئی تھی۔ایک تصور آتا تھا لیکن اس کو محسوس دائرے میں دیکھنے کا وہ خوگر تھا۔تصور کسی بڑی ہستی کا آیا ہے تو اس نے اپنے سامنے ایک محسوس پیکر تراشا ہے۔جوں جوں ذہنِ انسانی اونچا ہوتا چلا جاتا ہے وہ محسوسات کے دائرے سے اپنے آپ کو بلند کرتا چلا جاتا ہے‘ پھر اس کے بعد غیر محسوس‘ غیر مرئی‘ مجرد حقائق اس کی سمجھ میں آنا شروع ہوتے ہیں۔

قانون کی قوت اس پر عمل کرنے میں پوشیدہ ہوتی ہے

سب سے پہلی چیز جو مجرد حقیقت ہوتی ہے‘ وہ Law (قانون) کا Concept (تصور) ہے۔قانون محسوس شے نہیں ہوتی‘ فارمولا محسوس شے نہیں ہوتا‘ جب وہ کسی Workable Form (قابلِ عمل صورت) میں آتا ہے‘ اس پہ عمل کیا جاتا ہے تو اس وقت اس کے محسوس نتائج ہمارے سامنے آتے ہیں‘ ہم ان نتائج سے اس قانون یا اس فارمولے کی صداقت پر یقین رکھتے ہیں ورنہ اگر یہ نہ کیا جائے تو محض قانون کی قوت سمجھ میں ہی نہیں آسکتی۔اسی لیے Law (قانون) اگر Practice (عمل) میں نہیں آتا‘ تو بیکار رہتا ہے۔یہ وہ دور ہے جس وقت انسان کا ذہن اونچا ہو جاتا ہے وہ ان مجرد حقائق کو سمجھنے کے قابل ہو جاتا ہے۔

خدا کا تصور قرآن حکیم کے آئینہ میں سمجھا تو جاتا ہے دیکھا نہیں جاتا

دین انسانی ذہن کو اتنی بلندیوں تک لے جاتا ہے اور سب سے پہلے ایک ایسے خدا کا تصور دیتا ہے جس کے متعلق وہ کہتا ہے کہ لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ ز وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ ز وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ (6:103) یہ تمہاری مادی آنکھیں اس کا ادراک نہیں کر سکتیں لیکن وہ ہر ایک کو پا رہا ہے‘ اس لیے کہ وہ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ ہے۔یہ خبر رکھنے والے دو قسم کے ہو سکتے ہیں: انسان بھی خبر رکھنے

والا ہوسکتا ہے' اس کے خبر رسانی کے ذرائع محسوس ہوتے ہیں۔ لطیف وہ ہے جس کے یہ ذرائع غیر محسوس ہوں لیکن یہ حقیقت ہے کہ لَا تُدۡرِکُهُ الۡاَبۡصَارُ (6:103) کوئی انسانی آنکھ اسے دیکھ نہیں سکتی۔ پہلا تصور وہ یہ دیتا ہے اور اس کے لیے اسے اس کا مکلّف نہیں قرار دیتا کہ وہ اس کی کنہ وحقیقت (Essence) معلوم کرے کہ خدا کیسا ہے کس طرح سے ہے؟ قطعاً نہیں! وہ صرف یہ کہتا ہے کہ اس نے کائنات کے اندر یہ قوانین بنائے ہیں' ان قوانین کے نتائج سے تم یہ دیکھو کہ وہ کس قدر محکم ہیں اور ان کے پیچھے پھر کتنی بڑی قوت ہوگی جو اس طرح سے ان قوانین کو پابندیوں کے اندر جکڑے ہوئے ہے۔ وہ خدا کا یہ تصور دیتا ہے لیکن محسوسات کا خوگر انسان اس کو محسوس پیکر میں دیکھتا ہے۔ یہ جو انہوں نے بچھڑے کو خدا بنا لیا تھا تو یہ وہی چیز تھی کہ وہ اپنے ذہن کو پھر جہالت اور توہم پرستی کی طرف لے گئے۔ یہاں سے تو انہیں نکالا تھا۔ اب اس کے بعد وہ کہتے ہیں کہ اے موسیٰؑ! ہم تو تمہاری کوئی بات نہیں مانیں گے تاوقتیکہ خدا کو اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لیں۔ یہ ذہن کی پستی کا وہی تقاضا تھا۔ اور خدا کے متعلق تو یہ بات ابھی امتِ موسیٰؑ کی تھی' خود حضرت موسیٰؑ کے متعلق یہ چیز ہے کہ انہوں نے کہا تھا کہ رَبِّ اَرِنِیۡۤ اَنۡظُرۡ اِلَیۡکَ ؕ قَالَ لَنۡ تَرٰىنِیۡ (7:143) ذرا بے حجابانہ میرے سامنے آیئے' تو کہہ دیا گیا تھا کہ نہیں' تو اُسے آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتا۔ محسوس آنکھوں سے محسوس شے کو دیکھا جا سکتا ہے۔ کہا تھا کہ تو اسے نہیں دیکھ سکتا لیکن آپ کو پتہ ہے کہ پھر مذہب میں کیا ہوا؟ یہ تقاضا کیا تھا کہ ہم خدا کو بے نقاب' محسوس شکل میں سامنے' دیکھنا چاہتے ہیں' ہم تمہاری اس وقت تک کوئی بات نہیں مانیں گے جب تک یہ نہ ہو۔ قرآن نے اس تقاضے کو کفر کہا۔ موسیٰؑ جیسے جلیل القدر پیغمبر کے متعلق یہ بات سمجھائی۔

مذہب کے دائرے میں اہلِ تصوف کی دنیا کی کیفیت

آپ کو پتہ ہے کہ حضرتِ موسیٰؑ کی یہ بات قرآن نے کیوں کہی ہے؟ یہ کہا ہے کہ یہ بات نہیں ہے کہ وہ کسی عامی کے سامنے بے نقاب نہیں آتا بلکہ جسے تم اپنے ذہن میں بلند ترین انسان کہتے ہو' جسے نبی اور رسول کہتے ہو' اس کے سامنے بھی وہ بے نقاب نہیں آتا' بے نقاب آ نہیں سکتا۔ یہ کاہے کے لیے کہا ہے؟ ہمارے لیے کہ جہاں قدم قدم کے اوپر اب آپ کو روحانیت کے جو دعوے دار ہیں' وہ کہتے ہیں کہ وہ ہر رات اس کے پاس ہوتے ہیں' اس کے سامنے ہوتے ہیں۔ ان کی تو باتیں سنیئے' ذرا دیکھیے ''ایہہ اوں نظر اوندا اے جیویں رب نوں لنگوٹیا جیا بنایا ہویا ہوندا اے [1]'' گویا ہر رات اس کی محفل میں بیٹھے ہیں' باتیں ہو رہی ہیں' تقاضے ہو رہے ہیں' سب کچھ ہو رہا ہے' کہا جا رہا ہے کہ رات جائیں گے تو وہاں سے یہ کرا لائیں گے۔ یہ سب کچھ ہوتا ہے' اس کے بعد جب اور آگے بڑھتا ہے تو یہ مدارج آتے ہیں تو وہ پھر دن بھر کے یہاں سے عرضیوں کے کاغذات لے جاتے ہیں اور وہاں جا کر وہ اللہ میاں سے اس کے اوپر دستخط کراتے ہیں جیسے وہ ریڈر پیش

---

[1] یوں نظر آتا ہے کہ انہوں نے رب کو اپنا لنگوٹیا یار بنایا ہوا ہے۔

کرتا چلا جاتا ہے' وہ رکھتے جاتے ہیں' وہ دستخط کرتے چلے جاتے ہیں حتیٰ کہ دستخط کرتے وقت وہ سرخ روشنائی کا جو قلم ہوتا ہے' وہ قلم اللہ میاں چھڑکتا ہے تو ان کے کرتے کے اوپر اس کے چھینٹے پڑ جاتے ہیں' وہ صبح لا کر دکھاتے ہیں اور پھر اسے اپنے ہاں میوزیم میں رکھا جاتا ہے کہ جی! وہ رات خدا کے دربار میں تھے' یہ دستخط کرا کر وہاں سے لاتے ہیں اور یہ دیکھیے! سرخ روشنائی کے چھینٹے پڑے ہوئے ہیں۔ یہ اس خدا کے متعلق تصور دیا جا رہا ہے جس کے متعلق اس نے کہا تھا کہ لَا تُدۡرِکُهُ الۡاَبۡصَارُ (6:103)۔ اب بات سمجھ میں آئی کہ اس نے کیوں موسیٰ کی بات ہمیں بتائی تھی؟ کہ وہ بھی نہیں دیکھ سکتا' نبی نہیں دیکھ سکتا تو اس کے نیچے اور کون دیکھ سکتا ہے! یہ سب اگر فریب دہی نہیں ہے تو فریبِ نفس ہے' نتیجہ دونوں کا ایک ہوتا ہے۔ خدا کا اور ہمارا تعلق صرف اس وحی کے ذریعے سے ہے جو اس نے اپنے انبیاء کی وساطت سے ہم تک پہنچا دی۔ ہم جب قرآن پڑھتے ہیں تو خدا ہم سے ہمکلام ہوتا ہے کیونکہ یہ خدا کا کلام ہے اور اس کے علاوہ خدا سے ہمکلام ہونے کا کوئی اور طریقہ نہیں ہے' نہ خدا کو کوئی دیکھ سکتا ہے' اس کا ادراک کر سکتا ہے' نہ اسے تصور میں لا سکتا ہے۔

خدا تعالیٰ کی ہستی کے متعلق غُلو سے کام لینا حقیقت سے بعید لے جاتا ہے

قرآنِ کریم نے ایک جگہ انہی بنی اسرائیل کو کہا تھا' ہمیں ہی کہا تھا ''دھیے توں گل سن' نوحے توں کن کر[1]''۔ قرآن اس انداز سے بات کرتا ہے' جیسے بنی اسرائیل کی بات ہو رہی ہوتی ہے' کہتا ہمیں چلا جاتا ہے۔ ان سے کہا تھا کہ یاد رکھو! اپنے دین میں غُلو نہ کرنا۔ ایک تو چیز ہے کفر' کہتے ہیں کہ کفر مخالفت سے پیدا ہوتا ہے' میں کہتا ہوں کہ کفر مخالفت کا نتیجہ ہے۔ غُلو ہمیشہ محبت کا نتیجہ ہوتا ہے کہ جیسا وہ ہے' اُس سے اُسے اور بھی زیادہ بڑا بنا دینا۔ قرآنِ کریم نے خاص طور پر اس سے منع کیا ہے جس طرح سے مخالفت بری چیز ہے' تم حقیقت پہ نہیں رہ سکتے' اسی طرح سے اگر محبت میں ایک قدم تم نے آگے بڑھا دیا' تو پھر بھی تم حقیقت پہ نہیں رہ سکو گے۔ کہا ہے کہ یہ نہ کر دینا۔ پہلی قومیں اس سے ڈوبی تھیں' کفر سے نہیں ڈوبی تھیں' محبت میں غُلو کرنے سے ڈوبی تھیں۔ جس کو جس مقام پہ ہونا چاہیے تھا اس کو اس مقام سے اونچا لے جانا بھی تو ظلم ہے۔ یاد رکھو! یہ نہ کرنا۔ اور ہم نے وہی کچھ کیا' برادرانِ عزیز! کفر نہیں کیا' غُلو کیا۔ قرآن نے یہ چیز کہی تھی کہ موسیٰ بھی رب کو نہیں دیکھ سکے۔ ہم نے کہا کہ پھر کیا ہوا؟ سنیے! نعت کا یہ شعر بڑے وجد و کیف سے پڑھا جاتا ہے۔ عوام میں نہیں' ہماری بڑی ہستیاں اس کو Quote (نقل) کرتی ہیں:

---

[1] اے بیٹی! تُو بات سُن اور اے بہو! تو ذرا اپنا کان ادھر کر' توجہ دے۔

موسیٰ زہوش رفت بیک جلوۂ صفات

موسیٰ کے سامنے خدا کی ذات کا صرف ایک جلوہ آیا' بے ہوش ہو کر گر گئے۔ اور رسول اللہ ﷺ سے وہ کہتے ہیں:

تُو عینِ ذات می نگری' در تبسّمی!

تُو خدا کو' بالکل اس کی ذات کو دیکھتا ہے اور مسکراتا ہے۔ اس کے بعد اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلیٰ مُحَمَّدٍ ہوتا ہے' برادرانِ عزیز! غور فرمایئے! جب کہا جائے کہ یہ کیا ہے؟ تو وہ یہ کہتے ہیں کہ

نجف میرا مدینہ ہے' مدینہ میرا کعبہ ہے
میں بندہ اور کا ہوں' امت شاہ ولایت [1] ہوں
جو سمجھوں اور کچھ خاک عرب میں سونے والے کو
مجھے معذور رکھ! میں مستِ صہبائے محبت ہوں

ارے! انہوں نے جو موسیٰ کو خدا بنایا تھا تو کیا یہ نفرت کی بنا پہ بنایا تھا؟ نہیں' محبت کی بنا پہ بنایا تھا۔ جس جس نے بھی کسی کو اپنے مقام سے آگے بڑھایا ہے نفرت کی بنا پہ تو بنا ہی نہیں سکتا' اس سے تو وہ نیچے اتارے گا' وہ محبت کی بنا پہ ایسا کرے گا۔ اسی کو دین میں غُلُو کہتے ہیں لیکن نہیں' یہاں تک ہی نہیں' وہ تو یہاں تک پہنچتے ہیں کہ

مجھے معذور رکھ میں مستِ صہبائے محبت ہوں

عزیزانِ من! نفرت کی بنا پر تو میں فریب میں نہیں آتیں۔ (معاذ اللہ معاذ اللہ) حضورِ نبی اکرم ﷺ کی شانِ اقدس میں ذرا سی گستاخی بھی کوئی کرے' ایک سیکنڈ کے لیے ہم برداشت نہیں کر سکتے' ہم اپنی جانیں دینے کے لیے تیار ہو سکتے ہیں لیکن ان کو ان کے مقام سے آگے بڑھانے کے متعلق کہتے چلے جایئے کہ

وہی جو مستویٔ عرش ہے خدا ہو کر
اتر پڑا وہ مدینے میں مصطفیٰ ﷺ ہو کر

(معاذ اللہ)

ہر طرف سے آپ کے اوپر پھول برسیں گے۔ کہتے چلے جایئے کہ

---

[1] شاہِ ولایت حضرت علیؓ کا متصوفانہ لقب ہے۔

اگرچہ ظاہر میں وہ عرب ہے
مگر حقیقت میں ع۔رب (عین رب) ہے!

واہ واہ واہ! کیا عرب، ع رب سے نکتہ پیدا کیا ہے! دین میں غُلُو۔ ''میں مستِ صہبائے محبت ہوں''۔

قوموں کی تباہی شدتِ جذبات کی بنا پر زیادہ ہوتی ہے

قوموں کی تباہی، برادرانِ عزیز! نفرت کے ہاتھوں نہیں آتی، یہ جو شدتِ جذبات ہے جس کا نام آپ نے غلطی سے محبت رکھ لیا ہے، اس سے آتی ہے۔ یہ دین کے اندر غُلُو ہے۔ اور یہ جتنے روحانیت کی سیڑھیوں پر یہاں سے وہاں آپ دیکھیں گے وہ آپ کے غُلُو کا نتیجہ ہوتا ہے جوان کو یہ مقام دے جاتے ہیں۔ وہ کہنے والا تو اپنے لیے کہہ گیا تھا کہ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ (18:110) وہ یہ کہہ کر گیا ہے اور (معاذ اللہ معاذ اللہ) ہم کہتے ہیں کہ تمہیں اپنے مقام کا پتہ نہیں، تُو تو عینِ رب ہے۔ ''ھو عبدہٗ'' ہمارے ہاں بڑے زور شور سے کہا جاتا ہے، اس پہ کوئی گرفت نہیں ہو رہی، کوئی چھرا نہیں گھونپ رہا، کہیں ہمیں کپکپی نہیں آتی، کہیں ارتعاش پیدا نہیں ہوتا، کہیں اشتعال پیدا نہیں ہوتا۔ ابلیس اپنا کام کر جاتا ہے۔ وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً (2:55)۔ محسوس شکل میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ یہ تقاضے پست ذہن کے تھے، یہ بات شاعری ہے۔ قوموں کو شاعری تباہ کرتی ہے، جب وہ کہتا ہے کہ

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

یعنی اگر تُو لباسِ مجاز میں نہیں آئے گا تو سجدہ ہی نہیں کریں گے۔ نہیں، عزیزانِ من! می نہ سزد خدائے را۔ خدا، خدا ہے اور انسان، انسان ہے۔

غُلُو پرستی انسان کو انسانیت کے مقام سے محروم کر دیتی ہے

قرآن فرقان ہے، یہ معیار ہے۔ جب اس نے نبی سے کہا ہے کہ لَنْ تَرٰىنِیْ (7:143) تو غیر از نبی کے لیے سوال ہی نہیں ہے کہ لباسِ مجاز میں اس کو ہم دیکھ سکیں۔ خدا کا اور ہمارا یہ تعلق اور ذریعہ یہیں تک ہے، یہیں تک قرآن لے جاتا ہے۔ اس سے ایک قدم بھی آگے آپ جائیں گے تو یہ دین کے اندر غُلُو ہو جائے گا۔ عزیزانِ من! کہا ہے کہ انہوں نے یہ تقاضا کیا لیکن کیفیت کیا تھی؟ قرآن کا عجیب تقابل ہے۔ انہوں نے گئوسالہ پرستی شروع کر دی یعنی اپنے آپ کو مقامِ انسانیت سے نیچے گرایا۔ اور میں نے کہا ہے کہ ذہنِ انسانی اپنے Primitive (قدیم) دور کے اندر، اگر فطرت کی قوت اس کے سامنے آئی، تو اس کے سامنے جھکا، بادل گرجا، ڈنڈوت بجا لایا، بجلی چمکی، اس کو دیوی بنا دیا، حتیٰ کہ بڑا محیط سا دریا دیکھا اس کے لیے بھی اس کو ماتا کہہ دیا۔ یہ انسان کا ذہن تھا۔ کہا ہے کہ ذہن تو تمہارا یہ ہے کہ

فطرت کی ان قوتوں کے سامنے تم سجدہ ریز ہو جاتے تھے' اور تقاضے تمہارے یہ تھے کہ خدا کو بے نقاب دیکھیں گے۔ کیا تقابل ہے! تقاضا یہ کرتے ہو کہ خدا کو بے نقاب دیکھو گے۔ کہا ہے کہ فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ (2:55) بجلی کی کڑک ہوئی اور تم بے ہوش ہو کر گر گئے اور تقاضے یہ کرتے ہو کہ خدا کو بے نقاب دیکھو گے۔ اقبالؒ (1877-1938ء) کے الفاظ میں حجاب قدرِ خود بے شناس' یہ بڑی عجیب بات کہہ جاتا ہے:

بآدمے نرسیدی خدا چہ می جوئی

(جاوید نامہ' ص-220)

''او بندے داپت تے بن پہلاں ❶ '' اور یہ کیا بات کہہ گیا ہے کہ بآدمے نرسیدی۔ قرآن نے آدم کا کیا تعارف کرایا تھا؟ سارے ملائکہ اس کے سامنے جھکے ہوئے' فطرت کی پوری قوتیں جب انسان کے سامنے جھکیں تو وہ مقامِ آدمی پہ آتا ہے۔ یہ صرف آدمی کے مقام پہ آنا اس کی معراج نہیں ہے۔ اور وہ (مرزا اسداللہ خان) غالب (1797-1869ء) ٹھیک کہہ گیا ہے کہ

آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

کائنات کی تمام قوتیں انسانیت کے سامنے سجدہ ریز ہیں اور یہ حضرتِ انسان رب کی بارگاہ میں سرنگوں ہے

مقامِ انسانیت اس سے اونچا ہے۔ یہ مقامِ انسانیت ہے جسے قرآن مومن کہتا ہے۔ فطرت کی ساری قوتیں اس کے سامنے جھکیں تو یہ پھر مقامِ آدمیت پہ پہنچتا ہے۔ اور فطرت کی قوتوں کا سارا سرمایہ لے کر خدا کی چوکھٹ کے سامنے جھک گیا' تو مقام انسانیت پہ پہنچ گیا۔ برادرانِ عزیز! دنیا کی بڑی بڑی قومیں جن کو ہم سمجھتے ہیں کہ دنیا میں بڑے عروج پہ پہنچی ہیں' زیادہ سے زیادہ مقام آدمیت پہ پہنچی ہوئی ہیں' مقامِ مومن کا اندازہ کیا ہو سکتا ہے! کہا ہے کہ فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ (2:55) سامنے دیکھ رہے تھے کہ بجلی ہے۔ یہ اَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ کی کیا بات ہے! ان دیکھے خدا کے متعلق تو تمہیں پتہ ہی نہیں چل سکتا کہ وہ کیا ہے' دیکھی بھالی ہوئی چیز سامنے چمک رہی ہے اور اس سے تمہاری یہ کیفیت پیدا ہو گئی۔ یہ ہے ظرف تمہارا! یہ مانگتے ہو' ذرا اپنے آپ کو اونچے تو لے جاؤ۔ پہلے ان کو تو کم از کم اپنا ساجد بنا' پھر ہمارے ہاں آنے کی آگے بات کرنا۔

قرآنِ حکیم کے نزدیک موت وحیات کے پیمانے الگ الگ ہیں

کہا ہے کہ ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (2:56)۔ ہمارے ہاں عام تراجم میں' تفاسیر میں' پھر وہی

---

❶ پہلے آدمی تو بنو مقامِ آدمی تک تو پہنچو۔

بات ہوگئی کہ موت (Death) کو' جو طبعی موت ہوتی ہے' کے معنوں میں لے لیا گیا۔ یہ کہا کہ پھر وہ سارے مر گئے تھے' مرنے کے بعد خدا نے پھر ان کو اٹھا دیا: لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (2:56)۔ میں نے عرض کیا تھا کہ قرآن عربی زبان میں نازل ہوا ہے' زبان انسانوں کی ہے۔ اس لیے جو حقائق بھی اس میں بیان ہوں' ان کے لیے دیکھنا یہ چاہیے کہ زبان کے اندر' محاورۂ عرب کے اندر' ان چیزوں کو کیسے استعمال کیا جاتا تھا' اس کی رو سے معنی متعین ہوتے ہیں۔ یا پھر یہ دیکھو کہ قرآن نے دیگر مقامات کے اوپر کس طرح کسی لفظ کو استعمال کیا ہے۔ موت اور حیات ٹھیک ہے' یہ ہے جسے Physical Death (طبعی موت) کہتے ہیں اور Physical Life (طبعی زندگی) کہتے ہیں۔ یہ موت اور حیات ہے۔ ان معنوں کے اندر بھی یہ لفظ قرآن کے اندر استعمال ہوا ہے لیکن ہر مقام پہ یہی بات نہیں ہے۔ روز مرہ صبح سے شام تک ہم یہ الفاظ بولتے ہیں: ''اونٹنیوں کی موت پے گئی'' یعنی کیا موت طاری ہوگئی' صاحب! اس میں زندگی کہیں نظر نہیں آتی۔ زندہ قوموں میں اس کا شمار نہیں ہوسکتا۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ یہ سارے قبرستان میں جا لیٹے ہیں۔ صبح سے شام تک ہم یہ الفاظ استعمال کرتے ہیں' عربی زبان میں بھی یہ الفاظ اس طرح سے استعمال ہوتے ہیں' خود قرآن کریم میں یہ الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔

قرآن کے متعلق رسول اللہ ﷺ سے کہا گیا ہے کہ لِيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا (36:70) تو اُس قرآن کے ذریعے اسی کو خطروں سے آگاہ کرسکتا ہے جو مَنْ كَانَ حَيًّا (36:70) زندہ ہے۔ اب ظاہر ہے کہ یہ تو ہے نہیں کہ یہ جا کر نبی اکرم ﷺ (معاذ اللہ) قبرستان میں وعظ کہا کرتے تھے۔ ان سے تو کہا تھا کہ یہاں نہیں وہاں بستی میں جاؤ۔ لِيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا (36:70) جس میں زندگی کی رمق ابھی باقی ہے' کوئی شرارہ زندگی اس کے جسد کے اندر باقی ہے' یہ اس کو صحیح راستے پہ لا کر زندگی کا مقام عطا کر سکے گا۔ یہ مردہ ہو چکے ہوئے ہیں' ان میں زندگی کا امکان ہی نہیں رہا۔ دوسری جگہ کہا ہے کہ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَ لِلرَّسُوْلِ (8:24) اے جماعتِ مومنین! لبیک کہو خدا اور اس کے رسول کی آواز کے اوپر اِذَا دَعَاكُمْ (8:24) جب وہ رسول تمہیں اس بات کی دعوت دیتا ہے لِمَا يُحْيِيْكُمْ (8:24) جو تمہیں زندہ کر دے گی۔ مومنین سے کہہ رہا ہے' وہ تو زندہ ہیں۔ کہہ رہا ہے کہ اس کی دعوت کے اوپر لبیک کہو لِمَا يُحْيِيْكُمْ جو تمہیں زندگی عطا کر دے گی۔ آپ نے دیکھا کہ یہاں زندگی اور حیات کے معنی کیا ہیں؟ اس کے مقابلے میں کہا ہے کہ اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى (27:80) اے رسول! تُو مردوں کو نہیں سنا سکتا۔ دیکھا زندہ کے مقابلے میں یہ کن کو لایا ہے! وَ لَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ اِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِيْنَ (27:80) یعنی وہ بہرہ ہے' پہلے تو بہرہ کہا کہ تُو اُسے نہیں سنا سکتا' بہرہ' جو پیٹھ موڑ کر چل دے' اس مردے کو کیا سنائے گا۔ سامنے کھڑا ہے تو کچھ اشارے سے ہی بات سمجھ لے گا اور جب بات کرو تو وہ پیٹھ موڑ کر چل دے۔ اسے کہا ہے کہ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى (27:80) تم اس مردے کو کیا سناؤ گے۔ دیکھا' عزیزانِ من! قرآن میں موت اور حیات کن معانی میں استعمال کیا ہے۔

عربی محاورے کے اندر یہ چیزیں آتی ہیں مثلاً وہ کہتے ہیں کہ مَاتَتِ الرِّیۡحُ جب ہوا ساکن ہو جائے' اس میں حرکت نہ رہے' مَاتَتِ النَّارُ کہتے ہیں جب آگ ماند پڑ جائے۔ یہاں کہا ہے کہ ثُمَّ بَعَثۡنٰکُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ مَوۡتِکُمۡ (2:56) جب تمہاری حرارتیں ماند پڑ گئیں' تمہاری جو حرکت تھی اس میں سکون آ گیا' تمہاری یہ کیفیت پیدا ہو گئی۔ بعث کے معنی اٹھانا ہوتا ہے۔ اس کے بنیادی معنی ہوتے ہیں ''کسی کی آزادی کے راستے میں جو موانع ہیں ان کو اٹھا دینا تاکہ وہ آگے چلنے کے قابل ہو جائے''۔ سنگِ راہ کو راستے سے ہٹانے کے معنی میں یہ لفظ آتا ہے' غلامی کی زنجیریں توڑنے کے معنوں میں یہ لفظ آتا ہے۔ آپ کو پتہ ہے وہاں (عراق) میں یہ بعث پارٹی ہے ❶۔ ذہن میں نہیں آتا کہ یہ بعث پارٹی کیا ہے؟ آزادی کے معنی میں یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔ بعث کے معنی ہوتا ہے کہ ''ہر وہ شے جو کسی کے آگے چلنے کے راستے میں رکاوٹ بن جائے' اس کو ہٹا دینا''۔ کہا ہے کہ ثُمَّ بَعَثۡنٰکُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ مَوۡتِکُمۡ (2:56) ان توہم پرستیوں سے تمہاری حرکت رک گئی تھی' ہم نے ان موانع کو دور کر دیا اور پھر تمہیں چلنے کے قابل بنا دیا۔ لَعَلَّکُمۡ تَشۡکُرُوۡنَ (2:56) تاکہ تمہاری محنتیں بھرپور نتائج پیدا کریں۔

من وسلویٰ کا وہ مفہوم جو قرآن حکیم اپنے ہاں متعین کرتا ہے

برادرانِ عزیز! تشکرون کے لیے دو چیزوں کی ضرورت تھی۔ ان میں انسان کے لیے طبعی سامانِ حیات سب سے پہلی ضروری چیز ہے۔ اس کے لیے کہا ہے کہ وَ ظَلَّلۡنَا عَلَیۡکُمُ الۡغَمَامَ وَ اَنۡزَلۡنَا عَلَیۡکُمُ الۡمَنَّ وَ السَّلۡوٰی (2:57) اس علاقے میں جہاں چٹانیں تھیں' بنجر زمین تھی' وہاں بارش برسانے والے بادل آئے۔ پانی کی قیمت ان علاقوں سے جا کر پوچھی جا سکتی ہے' ان کے لیے پانی زندگی ہے۔ پانی سے بھرے ہوئے بادل آئے' اس کے بعد کہا ہے کہ اَنۡزَلۡنَا عَلَیۡکُمُ الۡمَنَّ وَ السَّلۡوٰی (2:57)۔ یہاں دو الفاظ ہیں' عجیب اعجاز ہے قرآن کا! ویسے تو ان کے ہاں ''من'' کہتے تھے کہ رات کو شبنم کی طرح کی چیز برستی تھی' وہاں کچھ اس قسم کی جھاڑیاں ہیں' ان جھاڑیوں کے اوپر یہ گوندسی چیز جم جاتی تھی اور وہ بڑی میٹھی ہوتی ہے۔ کراچی میں وہ شام کے سفیر ❷ یہاں ہوتے تھے' ایک دفعہ میں نے ان سے کہا تھا کہ یہ مجھے دکھائیے تو انہوں نے وہاں سے تازہ ''من'' منگوایا تھا۔ وہ میٹھی گوندسی ہوتی تھی۔ ہمارے ہاں اسے ترنجبیں یا شیر خشت کہتے ہیں۔ ہم تو اس کو نہ شاید Appreciate (پسند) کر سکیں کہ صاحب! یہ بات کیا ہوئی؟ یہ ان لوگوں سے پوچھیے جنہیں کبھی سالن ہی نصیب نہیں ہوتا' کبھی کوئی پھل نہیں نظر آتا' اتنا ہی جو میٹھا ہے' ان کے لیے بڑی چیز ہوتی ہے۔ قیدی سے پوچھیے کہ اتنا جو ساگر ہے' کیا قیمت رکھتا ہے؟ سلویٰ کہتے ہیں کہ وہاں یہ کچھ جنگلی بٹیر کی قسم کے پرندے تھے' وہ وہاں کھانے کے لیے تھے' یہ دو معنی اس کے محسوس طور پہ آتے ہیں لیکن

---

❶ یاد رہے کہ یہ بات اکتوبر 1968 کی 6 تاریخ کو کہی گئی تھی۔

❷ یہ عبدالوہاب عزام کی طرف اشارہ ہے۔ ان کے ہاں سفارت خانہ کراچی میں ''مجلسِ قلندرانِ اقبال'' کی طرح پڑی تھی۔

قرآن کے الفاظ ہیں ''منّ'' وہ ہے جو بلامزدومعاوضہ کسی کو ملے۔ اسی لفظ سے آپ ممنون ہونا کہتے ہیں۔ بلامزدومعاوضہ کسی کو جو چیز مل جائے' وہ منّ ہوتا ہے۔ خدا کو منان کہتے ہیں' ممنون کا لفظ یہاں سے آیا ہوا ہے۔ وہاں تمہارے لیے یہ کیفیت پیدا کی۔ بادل برسے' پانی نکالنا نہیں پڑا۔ جب تک کھیتی باڑی نہیں ہوتی' مزارعے کے لیے بلامزدومعاوضہ کھانے کی چیزیں ہیں۔ سلویٰ وہ ہے جس سے تسکین حاصل ہو۔ تسلی یہاں سے لفظ ہے۔ کہا ہے کہ اتنے وقت کے لیے یہ سامان تمہارا کر دیا۔

حلال وطیّب کے متعلق قرآن حکیم کا تصور کیا ہے؟

کہا ہے کہ **كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ** (2:57) ۔ یہ بات پہلے آچکی ہے کہ قرآن نے **حَلٰلًا طَيِّبًا** کہا ہے کہ جتنی چیزیں ہم نے تمہارے لیے حلال کی ہیں' جن کے اوپر ہم نے پابندی نہیں لگائی ہے' انہیں کھاؤ اور اس کے ساتھ طیّب کا لفظ دیا ہے کہ ان میں سے جو تمہیں خوشگوار نظر آئیں۔ ہر حلال چیز کھانا فرض نہیں ہے۔ خدا انفرادی ذائقے کی بڑی رعایت رکھتا ہے۔ کہتا ہے کہ اپنے مزاج کے مطابق حلال چیز جو اچھی لگتی ہے' اسے کھاؤ۔ یہ جو ایک تصور ہے کہ ہر حلال چیز کھانا فرض ہے خلافِ قرآن ہے۔ مجھے یاد ہے کہ شروع شروع میں بہار کے کچھ لوگ آ کر بسے۔ کراچی سے ادھر حیدرآباد کی طرف آتے ہوئے راستے میں جو اس کی پہلی تحصیل ہے' وہاں آ کر بسے تھے۔ وہ یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ کتا حلال ہے۔ اچھا جی! حلال ہے' کھایا کرو لیکن وہ کہتے یہ تھے کہ جو اسے کھاتا نہیں ہے' وہ مسلمان نہیں ہوسکتا۔ اب لوگوں کو پکڑ پکڑ کر لے جاتے تھے۔

برادرانِ عزیز! میں اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتا کہ کیا حلال ہے' کیا حرام ہے؟ آپ غلط تصور دیکھیے' اس میں اگر کوئی اور چیز نہ ہوتو وہ طیّب تو نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے کہ بہت سی چیزیں جو چینی کھاتے ہیں' وہ حلال ہوں مگر ہمارے لیے وہ طیّب نہیں ہیں۔ دیکھا! قرآن نے حلال کے ساتھ طیّب کہہ کر کیا بات کہہ دی ہے۔ کہا ہے کہ جو کچھ تمہیں دیا ہے اُسے طیّب طریق سے کھاؤ۔ کہا ہے کہ **وَمَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ** (2:57) دیکھو تو سہی' ہم کیا کر رہے تھے' تم کیا کر رہے تھے؟ ہم تو تمہارے اوپر کچھ زیادتی نہیں کرتے تھے' نہ ہی ہم نے زیادتی کی ہے' تم اپنے اوپر زیادتی کرتے چلے جاتے تھے اور اپنے آپ کو اپنے مقام سے گراتے چلے جاتے تھے۔ کیا چیز تھی جس سے اپنے آپ پہ زیادتی کرتے تھے؟ قرآن کی اگلی چیز آئی' یہ ان کی زندگی کا اگلا واقعہ ہے۔ یہ ابھی سینا کی وادیوں میں ہیں' فلسطین (کنعان) میں فاتح کی حیثیت سے داخل نہیں ہوئے۔ خدا نے ان سے کہہ دیا تھا کہ ہم نے تمہارے نام پہ بابرکت بستی' فلسطین کی فتح' لکھ دی ہے۔ یہیں سے ایک اور بڑی چیز سامنے آئے گی کہ جسے آپ لکھ دی ہے کہتے ہیں یہ کیا ہے؟ اس کا پتہ بھی وہاں سے مل جاتا ہے' اس کے بعد یہ ہے کہ اس کا قبضہ لینا ہوتا ہے۔ عدالت تو آپ کے حق میں یہ فیصلہ دیدیتی ہے' آگے جو قبضہ لینا ہے' یہ تو آپ

کے بس کی بات ہے۔قرآن اس چیز کو لاتا ہے۔کہا ہے کہ وَ اِذۡ قُلۡنَا ادۡخُلُوۡا ھٰذِہِ الۡقَرۡیَۃَ فَکُلُوۡا مِنۡھَا حَیۡثُ شِئۡتُمۡ رَغَدًا (2:58) پھر ہم نے کہا کہ جاؤ۔قریہ کے معنی بستی ہی نہیں ہے بلکہ (اس سے مراد) فلسطین (کنعان) کا ملک ہے۔میں ابھی عرض کرتا ہوں کہ دوسری جگہ قرآنِ کریم نے اس کو ارضِ بابرکت کہا ہے۔کہا ہے کہ یٰقَوۡمِ ادۡخُلُوا الۡاَرۡضَ الۡمُقَدَّسَۃَ الَّتِیۡ کَتَبَ اللّٰہُ لَکُمۡ (5:21) اس ارضِ مقدس میں چلے جاؤ' یہ تمہارے لیے لکھ دیا گیا ہے۔

فلسطین کو ارضِ بابرکت یا ارضِ مقدس کہنے کا مقصد

اسے ارضِ بابرکت یا ارضِ مقدس کیوں کہا ہے؟ برادرانِ عزیز! قصۂ آدم میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ جنت کے متعلق یہ کہا تھا کہ وَ کُلَا مِنۡھَا رَغَدًا حَیۡثُ شِئۡتُمَا (2:35) جنتِ ارضی وہ ہے جہاں ہر بھوکے کو بھوک لگے تو وہاں سیر ہو کر کھانے کو مل جائے گا۔یہی تھے الفاظ۔اسے تو ہم نے سمجھ لیا کہ جی! وہ آسمانوں کی کوئی جنت تھی۔آپ دیکھتے ہیں کہ وہی الفاظ ہیں۔کہا ہے کہ فَکُلُوۡا مِنۡھَا حَیۡثُ شِئۡتُمۡ رَغَدًا (2:58) جس جنت سے نکالے گئے تھے' آؤ تمہیں اس جنت کی بازیابی کا راستہ بتائیں۔محکومی اور غلامی کی زندگی کے اندر جنت نہیں مل سکتی' فاتح کی حیثیت سے اس ارض مقدس میں چلو۔وہاں کیا ہوگا؟ کہا ہے کہ ہر بھوکے کو جہاں بھوک لگے گی' وہاں سیر ہو کر کھانے کو مل جائے گا۔اور اسی کو ارضِ مقدس کہتے ہیں' اسی کو جنت کہتے ہیں۔

فاتح کی مفتوح بستی میں داخل ہونے کے لیے قرآنی ہدایت

لیکن شرط ہے کہ وَّ ادۡخُلُوا الۡبَابَ سُجَّدًا (2:58) داخل ہو جاؤ۔آپ کو پتہ ہے کہ ایک جو فاتح ہے' وہ کسی مفتوح بستی میں کیسے داخل ہوا کرتا ہے؟ پوچھو ہی نہیں کہ اس کی سرکشی اور اکڑ کی کیفیت کیا ہوا کرتی ہے؟ اس کو اس قدر رعونت آتی ہے کہ صاحب! پوچھو ہی نہیں۔کسی قوم کو فتح کر لینا اور فاتح کی حیثیت سے اس رعونت میں اس ملک کے اندر داخل ہونا تو بعض اوقات بچپن کا چھچھور پن نظر آتا ہے۔جب جاپان فتح کیا ہے تو وہاں کا جو فاتح جرنیل تھا اس نے وہاں داخل ہونے سے پیشتر' میں عرض کرتا ہوں کہ جو فرعونیت ہے یا جو رعونت ہے' یا فاتح کا تکبر ہے وہ چھچھوراپن پیدا کرتا ہے' یہ کہا تھا کہ بادشاہ جس گھوڑے پہ نکل کر' جایا کرتا تھا' وہ گھوڑا لاؤ' ہم اس پہ سوار ہو کر ملک میں داخل ہونا چاہتے ہیں۔انسان کے اندر یہ کیفیت پیدا ہوتی ہے۔یہاں کہا ہے کہ داخل ہو تو کس طرح؟ کہ جی! اسجدًا جھکتے ہوئے داخل ہو' سرکشی میں داخل نہ ہو۔یہ ہیں وہ مقام جہاں قرآن آتا ہے' برادران عزیز! کہ جھکتے ہوئے داخل ہو۔جو فاتح' کہیں جھکتا ہوا داخل ہوتا ہے' اس کے ہاتھوں پھر اس ملک کی تخریب نہیں ہوسکتی۔اور وہیں یہ بات گنائی کہ تمہارے اندر جذبۂ تشکر ہونا چاہیے۔

آگے کہا ہے کہ وَّ قُوۡلُوۡا حِطَّۃٌ (2:58)۔کیا بات کہہ دی قرآن نے! عام طور پہ اس کے ترجمے میں معنی ہونگے کہ تم خدا سے

معافی مانگو۔ اس کے معنی کے لیے یہ دیکھیے کہ ان کی یہ ساری زندگی صحرانوردیوں کی تھی' صبح کہیں' شام کہیں' مارے مارے پھر رہے ہیں' نہ بسنے کو گھر ہے' نہ کوئی سکون کا سامان ہے۔ حِطَّةٌ کے معنی ہوتے ہیں ''سامانِ سفر کو سواریوں سے اتار کر' سفر کو ختم کر کے' حضر ❶ کی زندگی اختیار کر لینا''۔ داخل ہو جاؤ اور پھر یہ کہو کہ اب ہماری یہ جو دن رات کی صحرانوردیاں اور دشت پیمایاں تھیں' ہمارے ہاں کی یہ زندگی اب ختم ہوئی اب ہم یہاں سکون سے بسیں۔ کہا ہے کہ نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطٰيٰكُمْ (2:58) کیا بات ہے! اس دوران میں کئی سہو اور فروگزاشتیں بھی تم سے ہوئی ہونگی یا ہو جائیں گی۔ ہوتی ہیں' انسان ہیں اجتہادی غلطیاں بھی اس سے ہوتی ہیں' سہو اور فروگزاشتیں بھی ہوتی ہیں۔ کہا ہے کہ اگر فرعونیت کی بجائے' رعونیت کی بجائے' جھکتے ہوئے چلے گئے تو یہ اس قسم کی سہو اور فروگزاشتیں ہوئی ہیں ان سے جو کسی قسم کا تمہارا نقصان ہوا ہے' اس نقصان کو بھی ہم ڈھانپ دیں گے' اس کی حفاظت کا سامان تمہیں دیدیں گے۔ خدا کے قانون کے سامنے جھکنے کا سب سے بڑا ایک فائدہ تو یہ ہوتا ہے کہ جو انفرادی طور پہ سہو اور فروگزاشتیں ہو جاتی ہیں بعض اوقات اجتماعی طور پہ بھی اجتہادی غلطیاں ہو جاتی ہیں' ان سے جو کچھ نقصان ہوتا ہے' اس کی تلافی قوانینِ خداوندی کے اتباع سے ہو جاتی ہے۔ نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطٰيٰكُمْ (2:58)۔ یہ سارا کچھ تو Negative (منفی) ہی ہے جو نقصانات تمہارے ہوئے ہیں' ان سے سامانِ حفاظت ہم دیدیں۔ مغفرت کے معنی سامانِ حفاظت ہے' برادرانِ عزیز! یہ بخشش والی بات نہیں ہے۔ یہ ہماری قوم تو ایسی گداگروں کی ہوئی کہ محنت سے کچھ حاصل کرنے کا تصور ہی ذہن سے نکل گیا۔ یہ ہر وقت بخشش مانگتے ہیں کہ بخش دے۔ بخشیش میں لے رہے ہیں' محنت کا صلہ نہیں' بخشش ہے جو لینے کے لیے کہہ رہے ہیں۔ خود کہہ گیا ہے اقبالؒ (1877-1938ء):

آں بہشتے کہ خدائے بتو بخشد ہمہ ہیچ

خیرات کی جنت لیتا ہے فٹے منہ تیرا۔

تا جزائے عملِ تست جناں چیزے ہست

تیرے عمل کا نتیجہ جو جنت ہے' وہ ہے کچھ قیمت رکھنے والی۔ مگر صد افسوس کہ تو بخشیش سے مانگ رہا ہے حالانکہ

جنت تری پنہاں ہے ترے خون جگر میں

بخشیش کا تصور انسانی ذات کی شان کے شایاں ہی نہیں

صحت باہر سے تو کہیں نہیں بنتی' برادرانِ عزیز! بخشیش سے کوئی ایسی چیز نہیں مل سکتی جس کی نمود تمہارے اندر سے ہونی ہو۔ صحت کبھی

---

❶ ایک جگہ قیام۔ یہ لفظ سفر کا متضاد ہے۔

بھی بخشیش سے نہیں مل سکتی۔ Relative (اضافی) چیزیں، خارجی چیزیں، خیرات سے مل سکتی ہیں، بخشش سے مل سکتی ہیں۔ وہ Inclusive (متضمن) چیزیں، جن کا تعلق انسان کی اپنی ذات سے ہے، وہ بخشش سے نہیں مل سکتیں، یہ تو اپنے کچھ کرنے سے ملیں گی۔ صحت تو بخشیش سے نہیں مل سکتی۔ جنت تو انسان کی اپنی ذات کی، ایک نشو ونما یافتہ شکل کا نام ہے، یہ بخشش سے کیسے مل سکتی ہے؟ اس لیے یہ تصور جس کو ہم مغفرت کہتے ہیں، اس کے لفظی معنی میں مغفر کہتے ہیں یہ جو سر پہ ٹوپی رکھی ہوتی ہے، لوہے کی ہیلمٹ رکھی ہوئی ہوتی ہے۔ یہ ہے حفاظت کا سامان لیکن حفاظت کا سامان تو صرف Negative (منفی) چیز ہے، یہ تو کسی خطرے سے محفوظ رکھنے کی بات ہے۔ قرآن ہے، عزیزانِ من! کہا ہے کہ **نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطٰيٰكُمْ ؕ وَ سَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ** (2:58) حسن کارانہ انداز سے جو زندگی بسر کرتا ہے، ہم اس کو بڑے اضافے کر کے ساتھ اور دیا کرتے ہیں۔ یہ چیز Positive (مثبت) آ گئی۔

وقت ہو گیا، عزیزانِ من! اگرچہ اگلی آیت جو تھی وہ اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اسے آئندہ پہ اٹھا رکھیں، بات لمبی ہو جائے گی۔ بتایا یہ ہے کہ فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا (2:59) ہم نے کچھ کہا، تم نے کچھ اور کیا۔ یہ بات اور اس کی تفصیل کہ ہم نے کیا کہا تھا، تم نے کیا کیا، ذرا لمبی بات ہے، اسے ہم آئندہ درس تک اٹھا رکھتے ہیں۔ ہم آج سورۃ البقرۃ کی آیت 58 تک آئے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ

❀……❀……❀

انیسواں باب: سورۃ البقرۃ (1)' (آیات 59 تا 61)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ فَاَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ
بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴿۵۹﴾ وَاِذِ اسْتَسْقٰى مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ؕ فَانْفَجَرَتْ
مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ؕ قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ؕ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا مِنْ رِّزْقِ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا
فِى الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ﴿۶۰﴾ وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُخْرِجْ لَنَا
مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ مِنْۢ بَقْلِهَا وَقِثَّآئِهَا وَفُوْمِهَا وَعَدَسِهَا وَبَصَلِهَا ؕ قَالَ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِيْ
هُوَ اَدْنٰى بِالَّذِيْ هُوَ خَيْرٌ ؕ اِهْبِطُوْا مِصْرًا فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ ؕ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ
وَالْمَسْكَنَةُ ۗ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ
بِغَيْرِ الْحَقِّ ؕ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ﴿۶۱﴾

عزیزانِ من! آج اکتوبر 1968ء کی 20 تاریخ ہے اور ہم درسِ قرآنِ کریم کے اس سلسلۂ نو میں سورۃ البقرۃ کی 59 ویں آیت سے آغازِ کلام کریں گے: (2:59)۔

چونکہ پچھلے اتوار کنونشن [1] کی وجہ سے درس میں ناغہ رہا تھا' اس لیے تجدیدِ حافظہ کے لیے عرض کر دوں کہ داستانِ بنی اسرائیل کی بات ہمارے سامنے تھی۔ قرآنِ کریم قوموں کے عروج و زوال کے قوانین بیان کرتا ہے اور اپنے دعویٰ کی صداقت کی شہادت میں تاریخی شواہد پیش کرتا ہے۔ اور یہ شہادت بنی اسرائیل کی داستان میں جامع حیثیت سے ہمارے سامنے آتی ہے۔ ان مقامات کی اہمیت اس لیے بھی زیادہ ہے کہ میں دیکھتا یہ ہوں کہ خود ہماری قوم کی بھی مماثلت بنی اسرائیل کے اسی دور سے ہے جس کا ذکر قرآن کریم نے اس شرح و بسط سے کیا ہے۔

غلام قوم زندگی کی نعمتوں سے سرفراز ہو ہی نہیں سکتی بلکہ یوں کہیے کہ ہونا ہی نہیں چاہتی

قوموں کی زندگی میں ہوتا یہ ہے کہ اگر ایک قوم ایک مدت تک غیروں کی غلامی میں رہے تو وہ خوئے غلامی میں اس قدر پختہ ہو جاتی

---

[1] طلوعِ اسلام کی گیارہویں سالانہ کنونشن مورخہ 10 لغایت 13 / اکتوبر 1968ء

ہے کہ پھر آزادی کی قدر و قیمت اس کی نگاہوں میں رہتی ہی نہیں ہے۔ وہ اس زندگی کی عادی ہو جاتی ہے‘ عزتِ نفس کا احساس باقی نہیں رہتا اور اس لیے محکومی اور غلامی میں تن آسانی اور سہل انگاری کی اس قدر خوگر ہو جاتی ہے کہ تھوڑی سی محنت‘ تھوڑی سی مشقت‘ تھوڑی سی ہمت‘ ذرا سا حوصلہ‘ اس پر بڑا ہی بارِ گراں بن کر گزرتا ہے۔ وہ اپنی اس پہلی حالت سے نکلنا ہی نہیں چاہتی۔

اس کے لیے میں اس سے پہلے بھی وہ مثال سے سمجھایا کرتا ہوں۔ آج کل تو بہت کم نظر آتا ہے‘ اس سے پیشتر آپ دیکھتے ہونگے کہ صبح کے وقت ایک شخص تیتر کا پنجرہ ہاتھ میں لیے آگے آگے جا رہا ہے اور پنجرے سے تیتر کو نکال کر باہر چھوڑ دیا ہے۔ تیتر کے بال و پر بھی اسی طرح سے ہیں‘ اڑنے کی ہمت بھی موجود ہے لیکن وہ پنجرے کے پیچھے پیچھے دوڑتا چلا جا رہا ہے حتیٰ کہ بعض اوقات دیکھا گیا ہے کہ وہ پنجرے پہ چڑھ کر اگر دروازہ بند ہے تو وہ چونچ سے اس کو کھولنے کی کوشش کرتا ہے حالانکہ اس کی فطرت یہ تھی کہ اگر اس کو موقع مل جاتا یا یوں کہیے کہ جب پہلے پہل اسے پابندِ قفس کیا گیا تھا تو وہ سارا دن ٹکریں مارتا تھا کہ کسی طرح سے یہ دروازہ کھل جائے لیکن آج اس کی کیفیت یہ ہے کہ اسے اس پنجرے سے باہر نکال کر آزادی کی فضائے بسیط میں اذنِ بال کشائی دیدیا گیا ہے‘ اس کے باوجود اب اس کی کیفیت یہ ہوگئی ہے کہ وہ اس پنجرے کے پیچھے پیچھے دوڑتا ہوا جا رہا ہے‘ دروازہ کھلتا نہیں ہے تو چونچیں مار مار کر اسے کھول رہا ہے۔ جنگل میں چلا جا رہا ہے‘ اسی نوع کے دوسرے پرندے درختوں پہ بیٹھے چہچہاتے ہوئے اسے آوازیں دے رہے ہیں کہ تیرا مقام تو یہ تھا تو کہاں اس کے پیچھے پیچھے بھاگا جا رہا ہے۔ وہ ان آوازوں کو سنتا ہے اور ایک ہلکی سی مسکراہٹ سے کہہ دیتا ہے کہ یہ آزادیاں تمہیں مبارک‘ میری کیفیت یہ ہے یہاں کہ

نے تیر کماں میں ہے‘ نہ صیاد کمیں میں
گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

اسے ایسا آرام قفس کے گوشے میں ملتا ہے کہ پھر آزادی کی قدر و قیمت اس کی نگاہوں میں ہیچ ہو جاتی ہے۔ علامہ اقبالؒ (1877-1938ء) کے الفاظ میں کہ

دین و دانش را غلام ارزاں دہد
تا بدن را زندہ دارد جاں دہد

اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ مقصودِ حیات صرف نفس شماری ہوتا ہے۔ سانس کی آمد و رفت رہے‘ طبعی زندگی کسی طرح سے بچ جائے‘ اس میں حمیت جائے‘ اس میں غیرت بکے‘ اس میں آبرو نہ رہے‘ اس میں عزت باقی نہ رہے‘ اسے اس کا کوئی احساس نہیں ہوتا۔ اسے یہ ہوتا ہے کہ روٹی ملتی چلی جا رہی ہے۔

قومِ بنی اسرائیل قریباً چار سو برس تک فرعون جیسے مستبد خاندان کے ملوکیت کے دستۂ استبداد میں شکار رہی۔ انہوں نے اس کی جو کیفیت کر رکھی تھی' وہ قرآن کے دو الفاظ میں یہ تھی کہ انہوں نے قوم کے جوہرِ مردانگی کو ذبح کر دیا تھا' وہ کسی ایسے فرد کو ابھرنے ہی نہیں دیتے تھے جس کے اندر ذرا سا بھی خودی کا احساس باقی ہو۔ اس طرح خوئے غلامی میں انہوں نے ان کو پختہ کر دیا تھا کہ آزادی کا احساس ہی مٹ گیا تھا۔ اتنے میں ایک داعیٔ انقلاب اس میں پیدا ہوتا ہے۔ مختصراً یہ کہ وہ چار سو سالہ غلامی کے پنجے سے چھڑا کر اس قوم کو آزادی کی فضا میں لے آتا ہے۔ یہ پروسیس کیا تھا؟ یہ طریق کار کیا تھا؟ میں دیکھتا یہ ہوں کہ قومیں آزادی حاصل کرتی ہیں تو اس کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ آہستہ آہستہ ان قوموں کے اندر ایسی تبدیلی پیدا کی جاتی ہے کہ وہ غلامی کی زندگی سے نفرت کرنے لگیں' آزادی کی قدر و قیمت ان کے دلوں میں بیدار ہو جائے اور اس طرح وہ خود قربانیاں دے کر مسلسل جہاد سے' پیہم تگ و تاز سے' غلامی کے جوئے کو اتار کر آزادی حاصل کر لیں۔ یہ وہ قوم ہوتی ہے جسے آزادی کی قدر و قیمت ہوتی ہے

فرعون کی غلامی میں بنی اسرائیل قوم کی پست ذہنیت کا ماجرا

لیکن کبھی کبھی ایک طریق کار یہ بھی ہوتا ہے کہ قوم ویسے کی ویسی رہتی ہے' ان میں کوئی ایک داعیٔ انقلاب پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے حسنِ تدبیر سے ایسے حالات پیدا کرتا ہے کہ اس قوم کو اسی حالت میں' اس غلامی کے قفس سے نکال کر آزاد مملکت میں لے آتا ہے۔ قوم کے اندر ہنوز کوئی ذہنی قلبی تبدیلی نہیں پیدا ہوئی ہوتی' غلامی کے جراثیم جذام کی طرح اس کی ہڈیوں کے اندر ابھی پیوست ہوتے ہیں۔ یہ ہے وہ قوم جسے آزادی کی قدر و قیمت نہیں ہوتی۔ وہ یہاں پہنچنے کے بعد ذرا سی بھی اسے تکلیف ہوتی ہے تو چلانے لگ جاتے ہیں کہ ہمارے ساتھ کیا کیا گیا' ہم وہیں بہت اچھے تھے' مار دیا تو نے ہمیں یہاں لا کر۔ یہاں ایک نئی زندگی کے اندر' نئے 'Environment' (ماحول) میں' کچھ تو Adjust (مطابقت) کرنے کے لیے تگ و تاز کرنا پڑے گی' کچھ تو محنت اٹھانا پڑے گی' کچھ تو پہلی زندگی سے کچھ مختلف زندگی بسر کرنا پڑے گی' اپنی حفاظت کے لیے سپاہیانہ عادتیں پیدا کرنا پڑیں گی' اپنی رہائش میں' اپنی عادات و خصائل میں' کچھ تبدیلیاں پیدا کرنا پڑیں گی۔ یہ تبدیلیاں انہیں موت کی طرح ڈراتی تھیں۔ حضرت موسیٰؑ نے قومِ بنی اسرائیل کو فرعون کی غلامی سے آزادی اس پروسیس سے' اس طریق سے' دلائی تھی' قوم کے اندر تبدیلی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ ایک داعیٔ انقلاب انہیں اپنے حسنِ تدبر سے' وہاں سے نکال کر' آزادی کی فضا میں لے آیا تھا اور یہاں پہنچ کر ان کی تربیت ہونی تھی کہ ان میں پرانی عادات و خصائل کی جگہ اس نئی زندگی بسر کرنے کے لیے صلاحیتیں اور استعداد بیدار ہو جائیں۔ یہ ہے وہ مقام جہاں ہم پہنچے ہیں۔

آپ دیکھیے کہ اس قوم کے لیے یہ کتنی بڑی نعمت تھی کہ فرعون جیسے دستِ تظلم سے ایک قطرۂ خون بہائے بغیر آزادی مفت میں مل جائے' یہ بہت بڑی نعمت تھی لیکن چونکہ قلب و نگاہ میں ابھی ایسی تبدیلی نہیں پیدا ہوئی تھی اس لیے انہیں اس کی قدر ہی نہیں تھی۔ دیکھیے یہ قوم

کرتی کیا تھی؟ پہلی چیز یہ ہے کہ حضرتِ موسیٰؑ انہیں نکال کر لے آتے ہیں' اور یہ واقعہ پہلے گزر چکا ہے' وہ پانی کے کنارے' دریا کے کنارے یا سمندر کے کنارے' آجاتے ہیں۔ بظاہر انہیں نظر آتا ہے کہ اب موت آئی' پیچھے سے فرعون کا لشکر ہے' آگے پانی ہے۔تورات میں ہے کہ جب فرعون نزدیک ہوا اور بنی اسرائیل نے آنکھیں اوپر کیں اور مصریوں کو اپنے پیچھے آتے ہوئے دیکھا' تو وہ شدت سے ڈرے۔تب بنی اسرائیل نے خداوند سے فریاد کی اور موسیٰؑ سے کہا کہ کیا مصر میں قبروں کے لیے جگہ نہیں تھی کہ تُو ہم کو بیابان میں مرنے کے لیے لے آیا۔غور فرما رہے ہیں آپ؟ تُو نے ہم سے یہ کیا معاملہ کیا کہ تو ہم کو مصر سے نکال لایا؟ کیا یہ وہی بات نہیں جو ہم نے مصر میں تجھ سے کہی تھی کہ تُو ہاتھ اٹھا' تاکہ ہم مصریوں کی خدمت کریں' ہمارے لیے مصریوں کی خدمت کرنا بیابان میں مرنے سے بہتر ہے۔

غلامی کے سائے میں پرورش پانے والی قوم غلامی کی حالت میں ہی زیادہ سکون محسوس کرتی ہے

غور فرما رہے ہیں آپ کہ جب قوم خوئے غلامی میں پختہ ہوتی ہے تو اس کی کیفیت کیا ہوتی ہے؟ یہ کیفیت ہوجاتی ہے۔اقبالؒ (1877-1938ء) نے وہاں کہا تھا:

خودی کی موت سے ہندی شکستہ بالوں پر
قفس ہوا ہے حلال اور آشیانہ حرام!

(ضربِ کلیم)

قفس حلال ہوجاتا ہے' آشیانہ ان پہ حرام ہوجاتا ہے۔وہ کہتے ہیں کہ ہم نے کہا تھا کہ ہم سے ہاتھ اٹھا' مصریوں کی غلامی اور خدمت میں ہم بہت اچھے تھے' کہاں لے آیا ہمیں مارنے کے لیے؟ اور دوسرا واقعہ بھی ابھی ہمارے سامنے آتا ہے۔پانی کی ذرا سی دقت ہوگئی' تب سارے بنی اسرائیل کی جماعت نے اپنے ہم سفروں میں خداوند کے فرمان کے مطابق سین [1] کے بیابان سے کوچ کیا اور مدین میں ڈیرہ ڈالا۔وہاں لوگوں کو پینے کا پانی نہ تھا تو لوگ موسیٰؑ سے جھگڑنے لگے اور کہا کہ ہم کو پانی دے کہ پیئیں۔موسیٰؑ نے ان سے کہا کہ تم مجھ سے کیوں جھگڑتے ہو اور خداوند کا کیوں امتحان کرتے ہو۔اور وہ لوگ پانی کے پیاسے تھے تو لوگ موسیٰؑ پر جھنجھلائے اور کہا کہ تُو ہمیں مصر سے کیوں نکال لایا کہ ہمیں اور ہمارے لڑکوں اور ہمارے مویشیوں کو پیاس سے ہلاک کردے۔قدم قدم پہ یہ چیز ہے۔اور اگلی چیز ایک اور آتی ہے وہ میں وہیں بیان کرونگا' بڑی لطیف ہے۔

قومِ بنی اسرائیل اور تحریکِ پاکستان کی داستانِ آزادی اپنے اندر گہری مماثلت لیے ہوئے ہے

آپ دیکھتے ہیں کہ اس نئی زندگی میں' نئے ماحول میں' جب Adjust (تطابق) کرنا پڑتا ہے تو اس میں کچھ نہ کچھ دقتیں ہوتی ہیں'

---

[1] سین کا بیابان' ایلیم اور سینا کے درمیان ہے (خروج 16; 1-3)

کچھ نہ کچھ تکلیفیں برداشت کرنا پڑتی ہیں۔ ان کے مقابلے میں یہ جو آزادی کی نعمت ملتی ہے اس کی بڑی قدر و قیمت ہوتی ہے لیکن جب قوموں کے اندر قلب و ذہن کی تبدیلی نہ پیدا ہوئی ہو تو وہ ان تھوڑی سی دقتوں کو ان تھوڑی سی تکالیف کو اتنا بڑھاتے ہیں کہ اس کے مقابلے میں یہ کہتے ہیں کہ وہ پہلی زندگی جو ہماری غلامی کی تھی اس سے کہیں زیادہ اچھی تھی۔ میں نے عرض کیا تھا کہ قومِ بنی اسرائیل کا یہ جو مقام ہے ہماری داستان میں ان کے ساتھ مماثلت ہے۔ عجیب حسنِ اتفاق ہے کہ ہمیں بھی آزادی اسی طرح سے ملی۔ وہاں ہم نے اپنے آپ کو آزادی کے لیے تیار نہیں کیا تھا' اپنے قلب و نگاہ کے اندر کچھ تبدیلیاں پیدا نہیں کی تھیں۔

حصول پاکستان کے سلسلہ میں ایک غلط بیانی یا غلط فہمی کا ازالہ

ایک داعیٔ انقلاب [1] اٹھا' آپ دو کہہ لیجیے' اب کیونکہ فکری طور پر علامہ اقبالؒ شامل ہے' آپ تین کہہ لیجیے کہ سب سے پہلے اس کا نشان و پتہ دینے والے سرسیدؒ احمد خاں (1898-1817ء) تھے۔ ان کے حسنِ تدبر سے اس قوم کو بیٹھے بٹھائے ایک قطرۂ خون بہائے بغیر آزادی مل گئی۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ پاکستان حاصل کرنے کے لیے ہم نے بڑی قربانیاں دیں' قطعاً غلط ہے۔ یہ تو پاکستان حاصل ہونے کے بعد' جب یہاں یہ تقسیم ہوئی ہے اور اِدھر آنے لگے ہیں تو اس دور میں یہ ساری کچھ مصیبتیں ہم پہ آئیں اور یہ سارے خون ہوئے۔ پاکستان کے حصول کے لیے تو کوئی ایک فرد ایک دن کے لیے بھی کسی ہندو یا انگریز کی قید میں نہیں رہا' پنجاب میں جو ہوا' وہ تو اور بات تھی' وہ تو اپنوں کے ہاتھوں سے ہی کچھ ہوا تھا۔ ایک قطرۂ خون نہیں بہایا ہے۔ صرف ایک بات تھی جو اس زمانے میں کی اور ہم سے کہی گئی کہ صرف اتنا کہتے چلے جاؤ کہ مسلم لیگ ہماری نمائندہ جماعت ہے اور قائداعظمؒ [1] ہمارا وکیل ہے۔ اور ہندوستان کے ''مصر سے'' یہ قائداعظمؒ نکال کر آپ کو آزادی کی ''سینا کی وادیوں'' کے اندر لے آیا۔ قوم کی حالت ویسی کی ویسی تھی: ذرا کہیں سڑک کے اوپر' کیلے پر سے کسی کا پاؤں پھسلا' اس نے کہا کہ ہت تیرے پاکستان بنانے والے کی' ہڈی توڑ کر رکھ دی' کیسے اچھے بس رہے تھے وہاں۔ لو بھئی! مسلسل کیفیت یہ ہے۔ پانی بند ہوا' چیخ رہے ہیں صاحب! بجلی یوں ہوگئی ہے' طوفان آرہا ہے صاحب! ان کے اوپر۔ وہ جو ابتدائی دور تھا' اس میں ہم دیکھتے تھے کہ قدم قدم کے اوپر قوم کی کیفیت کیا تھی۔ اور ابتدائی دور ہی کیا' اب بھی کونسا زمانہ گزر گیا ہے' اب بھی کونسی ان کی نگاہوں کے اندر ایسی کچھ تبدیلی پیدا ہوگئی ہے؟ اب بھی یہ کیفیت ہے۔ اور ابھی تو خدا کا بڑا شکر ہے کہ ایک دھچکا [2] سترہ دن کا جو تھا وہ لگا' اس کے علاوہ اس بیس سال کے عرصے میں اس قوم کو تو ابھی تک کوئی مصیبت برداشت ہی نہیں کرنا پڑی' کوئی تکلیف ہی نہیں اس قوم کے اوپر آئی۔ خدا نہ کرے کہ کوئی ایسی صورت پیدا ہو ورنہ جن کی کیفیت یہ ہے کہ ابھی تک آزادی کی قدر و قیمت ان کی نگاہوں کے اندر بسی ہی نہیں ہے۔ یہ بعینہٖ وہی حالت ہے جو بنی اسرائیل کی وادیٔ سینا میں ہو رہی تھی۔

---

1. یہ اشارہ قائداعظم محمد علی جناحؒ (1948-1876ء) کی طرف ہے۔
2. یہ پاک و ہند 1965 کی جنگ کی طرف ہے۔

پچھلی آیت میں ان سے یہ کہا گیا تھا کہ کچھ نہ کرو' یہاں تو میں تمہیں لے آیا ہوں' یہ ہے فلسطین کا علاقہ' وہ ابھی فرعون والوں کے زیرِ نگیں تھا۔ یہ وہ علاقہ تھا جس کے متعلق کہا گیا تھا کہ یہاں تمہاری اپنی مملکت قائم ہوگی' یہ اس آزادی کا اگلا Phase (مرحلہ) تھا۔ پہلی چیز غلامی سے رہائی Negative (منفی) تھی' ابھی Positive (مثبت) چیز نہیں آئی تھی۔ مثبت چیز تھی اپنی مملکت کا قیام۔ کہا کہ یہ ہے وہ ارض' جسے ارضِ مقدس کہا گیا ہے یعنی بابرکت زمین' اٹھو! بس تمہارے داخل ہونے کی دیر ہے' تم دیکھو گے کہ تم اس کے اندر فاتح و منصور چلے جاؤ گے۔ جاؤ اور اپنی مملکت قائم کرو۔ کہا یہ تھا کہ جانا فاتحانہ انداز سے' اندر جاؤ گے تو تمہارے دل کے اندر سرکشی نہ پیدا ہو جائے' دل کے جھکاؤ کے ساتھ' قوانینِ خداوندی کے سامنے سرِ تسلیم کرتے ہوئے' اپنی کوتاہیوں سے حفاظت کا سامان مانگتے ہوئے' اس مملکت میں' اس سرزمین میں' جا کر داخل ہو جاؤ۔ اور اب بات آگے آئے گی۔

آزادی کی نعمت ملنے کے بعد قانونِ خداوندی سے سرتابی اختیار کرنے کا نتیجہ

کہا یہ گیا تھا کہ ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّ قُوْلُوْا حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطٰیٰكُمْ (2:58) فاتحانہ جاؤ! داخل ہو جاؤ جھکاؤ کے ساتھ' سرکشی کے ساتھ نہیں وَّ قُوْلُوْا حِطَّةٌ (2:58) اور پھر یہ کہتے ہوئے سجدۂ شکرانہ ادا کرو کہ وہ صحرانوردیوں' وہ دشت پیمائیوں کی زندگی ختم ہوئی' اب ہمیں تمکن عطا ہو گیا' اب ہم ایک جگہ بیٹھ کر اپنی مملکت قائم کریں گے۔ کہا ہے کہ یہ کہتے ہوئے تم داخل ہو جاؤ۔ آگے کہا ہے کہ فَبَدَّلَ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا غَیْرَ الَّذِیْ قِیْلَ لَهُمْ (2:59)۔ اس کا عام ترجمہ یہ ہے کہ اس قوم نے جو اپنے مقام سے واقف نہیں تھی' دیکھیے ظلموا کا یہ لفظ کہاں آیا ہے' جو مقام ان کو دیا گیا تھا' وہ اس مقام سے واقف نہیں تھی' وہ اس مقام پہ اپنے آپ کو رکھنا نہیں چاہتی تھی' یہ ظلم کے بنیادی معنی ہیں' انہوں نے بات بدل دی۔ قرآن یہاں اتنا ہی کہتا ہے۔ اور میں ضمناً عرض کر دوں کہ ہمارے ہاں آپ کو معلوم ہے کہ تفاسیر میں کیا چیزیں آتی ہیں؟ تفاسیر میں یہ ہے کہ خدا نے کہا تھا کہ حِطَّةٌ کہنا اور وہ حِنْطَةٌ حِنْطَةٌ کہنے لگے بس یہ حطة کو حنطة کہا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے اوپر فَاَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا یَفْسُقُوْنَ (2:59) عذاب نازل ہو گیا اور وہ قوم تباہ کر دی گئی کہ انہوں نے حِنْطَةٌ کیوں کہا' حِطَّةٌ کیوں نہیں کہا؟ یہ ٹھیک ہے' عزیزانِ من! کہ زبان کے اعتبار سے الفاظ صحیح ہونے چاہئیں لیکن آپ سوچیے تو سہی کہ اتنی بڑی قوم' اتنی بڑی مہم' کیا یہ جرم کہ ایک لفظ حِطَّةٌ کو حِنْطَةٌ کہہ دیا جائے تو خدا کا اتنا بڑا عذاب اس کے اوپر نازل ہو جائے کہ وہ مملکت بھی تباہ ہو اور قوم کے اوپر وَ ضُرِبَتْ عَلَیْهِمُ الذِّلَّةُ وَ الْمَسْكَنَةُ ق وَ بَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ (2:61) ان کے اوپر ذلت و مسکنت کی مار ماری گئی' مملکت چھین لی گئی' تباہیاں کر دی گئیں' کیوں بھئی؟ کہ ہم نے کہا تھا حِطَّةٌ کہو' تم نے حِنْطَةٌ کیوں کہہ دیا۔ می نہ سزد خدائے را۔

کیا مملکت کے چھن جانے کی اصل وجہ ایک لفظ کی غلط ادائیگی تھی یا کچھ اور؟

یہ ٹھیک ہے' میں نے عرض کیا ہے کہ الفاظ کا صحیح ہونا اپنی جگہ' اپنے مقام پر صحیح ہے لیکن کیا اس تبدیلی سے یہ چیز پیدا ہو جائے گی؟ میں ابھی عرض کرتا ہوں کہ تبدیلی کیا تھی۔ یہاں اتنا عرض کردوں کہ ہمارے ہاں بھی ابھی تک ایسا تصور ذہنوں میں پایا جارہا ہے' ان کے لیے عملی کوششیں کی جارہی ہیں کہ قوم کی ساری تباہیاں' ذلت' مسکنت' یہ خرابیاں' معاشرتی' اخلاقی' معاشی ساری اس لیے ہیں کہ قوم کلمۂ طیبہ صحیح طور پہ نہیں ادا کرتی۔ اس کے اعراب صحیح ہونے چاہئیں' اس کے حروف صحیح مخرج سے نکلنے چاہئیں' اگر ان کو کلمۂ صحیح الفاظ کے طور پر' کلمے کے الفاظ درست کرا دیئے جائیں تو بس قوم کی ساری بگڑی حالت ٹھیک ہو جائے گی۔ یعنی اب یہ حِنْطَةٌ کہتی ہے' اگر یہ حِطَّةٌ کہنے لگ جائے تو بس دیکھ لیجیے قوم کی قسمت بدل جائے گی۔ یہ وہی تصورات ہیں جو آج ہمارے ہاں رائج ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ میں یہ نہیں کہتا کہ الفاظ کو غلط طور پہ پڑھنا چاہیے لیکن اس کا تعلق کچھ زیادہ سے زیادہ جہالت سے ہے۔ قوموں کی تباہیاں اس لیے نہیں آتی ہیں کہ فلاں جو حرف ہے' وہ صحیح مخرج سے نہیں نکل رہا' بات کچھ اور ہوتی ہے۔ قرآن نے تو یہاں **قولوا** کہا' بس انہوں نے **قولوا** کو لیا اور کہا کہ بس کوئی ایسا لفظ ہے جو انہوں نے بدلا تھا۔ کہا کہ یہاں قرآن نے ان سے کہا کچھ تھا' کیا انہوں نے کچھ اور' ان کم بختوں نے بات ہی بدل دی' تو بات ہی کچھ اور ہو گئی۔ روز ہم یہ کہتے ہیں۔ حیرت ہوتی ہے کہ روزمرہ کی زبان ہے جس میں یہ قرآن محاورۂ عرب میں نازل ہوا۔ یہ چیز ہے کہ انہوں نے بات کچھ سے کچھ کر دی۔ اب سوال یہ ہے کہ انہوں نے یہ بات کچھ سے کچھ کیا کر دی؟

قرآن حکیم کو سمجھنے کا طریق: تصریفِ آیات کو پیشِ نظر رکھنا ہے

قرآن کا تو اعجاز یہ ہے کہ وہ ہر مقام پر ساری تفصیل نہیں بیان کرتا' نہ اسے ضرورت تھی۔ اس نے خود یہ کہہ دیا تھا کہ یاد رکھو! میرے سمجھنے کا طریق تصریفِ آیات ہے' میں نے ایک بات کو مختلف مقامات پر بیان کیا ہے۔ جب کوئی ایک مقام تمہارے سامنے آئے تو اس کو سمجھنے کے لیے یہ دیکھو کہ دوسرے مقامات میں قرآنِ کریم نے اس بات کو کیسے بیان کیا ہے۔ اور جب وہ مقامات آپ کے سامنے آجائیں گے تو آپ دیکھیں گے کہ ایک مقام کی تفسیر وتشریح کس حسن وخوبی سے دوسرے مقامات میں ہوتی ہے۔ یہ ہے سورۃ البقرۃ کی آیت (2:58)۔ سورۃ مائدۃ (5:21) میں وہی واقعہ دیکھیے گا کہ بات کیسے بدل رہی ہے؟ حضرتِ موسیٰ نے قوم سے کہا کہ **يٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِيْ كَتَبَ اللّٰهُ** (5:21) اے میری قوم! اٹھو اور جا کر اس مملکت میں داخل ہو جاؤ یہ تمہارے نام لکھ دی گئی ہے۔ یہ کتنی بڑی یقین دہانی ہے! خدا کا ایک پیغمبر' خدا کی بات کہتا ہے کہ **كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ** (5:21) خدا نے تمہارے لیے لکھ دی ہے۔ یہ تو خدا کہتا ہے' اس کے پیغمبر کی زبان سے بات آ رہی ہے۔

قرآن حکیم کی تعلیم انسان میں مومنانہ فراست پیدا کر دیتی ہے

عزیزانِ من! قرآنِ کریم کے غائر مطالعہ سے انسان کے اندر جو مومنانہ فراست پیدا ہوتی ہے‘ وہ بھی یہ استعداد پیدا کر دیتی ہے پھر اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے

حادثہ وہ جو ابھی پردۂ افلاک میں ہے
عکس اس کا مرے آئینہ ادراک میں ہے

اقبالؒ (1938-1877ء) نے 1930ء میں جو خطبہ دیا ہے‘ اس کے آخر میں اس نے لکھا ہے کہ میری نگاہیں یہ دیکھ رہی ہیں کہ کم از کم ہندوستان کے شمال مغربی علاقے میں مسلمانوں کی الگ مملکت ان کے نصیبوں میں لکھی جا چکی ہے: **كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ** (5:21) لکھی جا چکی ہے۔

فرعون کے مقابلے کی خاطر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم سے پکار اور اس کا جواب

آگے کہا ہے کہ **وَ لَا تَرْتَدُّوْا عَلٰٓى اَدْبَارِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِيْنَ** (5:21)۔ بات یہاں صاف ہو گئی۔ اٹھو‘ بڑھو! رکو نہیں۔ کہا یہ ہے کہ دیکھنا وہاں سے ڈر کر کہیں پیٹھ موڑ کر بھاگ نہ آنا۔ یاد رکھو! اگر ایسا کرو گے تو تم بے حد نقصان اٹھاؤ گے۔ اس وقت تو پھر بھی ابھی یہ کیفیت ہے کہ ایک موقع تمہارے ہاتھ ہے کہ آگے بڑھو‘ لیکن اگر تم شکست کھا کر‘ پیٹھ دکھا کر‘ وہاں کے مقام سے بھاگ آئے تو حوصلے پست ہو جائیں گے‘ دوبارہ اٹھ نہیں سکو گے‘ سمجھ کر آگے جانا۔ دیکھا! بات کیسے ہو رہی ہے۔ **قَالُوْا** (5:22) قوم کا جواب ملاحظہ فرماؤ۔ کہا یہ تھا کہ اٹھو! جاؤ۔ بات کیسے بدلی جا رہی ہے؟ کہا ہے کہ **قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِنَّ فِيْهَا قَوْمًا جَبَّارِيْنَ** (5:22) موسیٰ! ہم تو دیکھتے ہیں کہ وہاں تو بڑے بڑے جابر طاقتور سپاہی بیٹھے ہوئے ہیں۔ یعنی پوچھیے تو سہی کہ ایک بنی بنائی مملکت کے اندر‘ بہر حال کچھ بسنے والے‘ حفاظت کا سامان رکھنے والے‘ ہونگے۔ کہا کہ نہیں صاحب! وہاں تو بڑے بڑے جابر بیٹھے ہیں۔ **وَ اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَا حَتّٰى يَخْرُجُوْا مِنْهَا ۚ** (5:22) جب تک وہ وہاں سے خود نہیں نکل جاتے‘ ہم اندر داخل نہیں ہوں گے صاحب! ”گندھک دی دھونی دے جا کے‘ ایناں چوہیاں نوں ❶“۔ بس وہ نکلے‘ ہم اندر گئے: **فَاِنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا فَاِنَّا دٰخِلُوْنَ** (5:22) بس تم ان کو اگر نکال دو گے تو ہم اندر چلے جائیں گے‘ سیدھی سی بات ہے۔ دیکھ رہے ہیں آپ کہ بات کیسے بدل رہی ہے۔ کہا کہ **قَالَ رَجُلٰنِ مِنَ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمَا ادْخُلُوْا عَلَيْهِمُ الْبَابَ ۚ فَاِذَا دَخَلْتُمُوْهُ فَاِنَّكُمْ غٰلِبُوْنَ ۚ وَ عَلَى اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ**

---

❶ ان چوہیوں کو نکالنے کے لیے جا کر گندھک کی دھونی دو۔ (یہ بات مزاحیہ انداز میں کہی گئی ہے)۔

مُّؤۡمِنِيۡنَ (5:23)۔ یہ دو بندے ہیں جو اللہ کے بندے تھے۔ یہ حضرتِ موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ ہیں۔ یہ دونوں پیغمبر' داعیانِ انقلاب ان کے ساتھ ہیں' وہ کہتے ہیں کہ او کم بختو! کرنے کی بات صرف اتنی ہے کہ اٹھو! آگے بڑھ جاؤ۔ اور جب تم آگے بڑھو گے تو ہم تمہیں خدا کے کہنے کے اوپر یقین دلا رہے ہیں کہ تم بڑھو' تو تم ان کے اوپر غالب آ جاؤ گے۔ وہ اس طرح سے نکلیں گے۔ تمہارے بیٹھے ہوئے وہ وہاں سے کیسے نکل جائیں۔ قانونِ خداوندی پہ بھی بھروسہ کرو۔ جو کچھ تم سے کہا جاتا ہے اس کو بھی کچھ مانو' اٹھو تو سہی' چلو تو سہی۔ **قَالُوۡا يٰمُوۡسٰٓى اِنَّا لَنۡ نَّدۡخُلَهَآ اَبَدًا مَّا دَامُوۡا فِيۡهَا** (5:24) انہوں نے کہا کہ موسیٰ! یہ بالکل غلط ہے' ہم نے سب سن لیا' جناب! جو وعظ فرما رہے ہیں۔ ہم تو کبھی وہاں داخل نہیں ہونگے جب تک وہ وہاں سے نکل نہ جائیں گے۔

غلامی کے ماحول میں پرورش پانے والی قوم کی ذہنی کیفیت' انجام اور علاج

اور آگے سنیئے' عزیزانِ من! کہ خوئے غلامی کی پختگی کے جراثیم کیا ہوتے ہیں۔ **فَاذۡهَبۡ اَنۡتَ وَ رَبُّكَ فَقَاتِلَاۤ** (5:24)۔ تمہارا رب کہہ رہا ہے کہ یہ ارضِ مقدس تمہارے نام لکھ دی ہے اور تم ہمیں وہ پیغام دے رہے ہو تو سیدھی سی بات ہے کہ تُو اور تیرا رب دونوں وہاں جا کر ان سے لڑو: **فَقَاتِلَاۤ**۔ اور اس کے بعد کہا ہے کہ **اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوۡنَ** (5:24) ہم یہاں بیٹھے ہیں' کہیں بھاگے نہیں جا رہے ہیں۔ جب تم دونوں وہاں جا کر فتح حاصل کر لو' تو آواز دینا ہم آ جائیں گے اور کہیں گے نعرۂ تکبیر اللہ اکبر۔ کہا ہے کہ **اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوۡنَ** (5:24)۔ کیا انداز ہے قرآن کا! اتنی لمبی داستان کتنے چند لفظوں میں بات بتا گئی۔ کہا ہے کہ **فَاذۡهَبۡ اَنۡتَ وَ رَبُّكَ فَقَاتِلَاۤ** (5:24) یہ ''ربک'' آیا ہے عربی زبان میں ''رب'' بڑے بھائی کو بھی کہتے ہیں' رب کو بھی کہتے ہیں۔ حضرت ہارونؑ بڑے بھائی تھے یا تو یہ ہوگا کہ جاؤ! وہاں جا کر دونوں لڑو اور ہم یہاں بیٹھے ہیں' کہیں بھاگے نہیں جا رہے ہیں' آواز دینا ہم وہاں داخل ہو جائیں گے۔ نتیجہ اس کا؟ عزیزانِ من! **قَالَ** (5:26) کہا کہ یہ ہے قوموں کی قسمت۔ کہا تھا کہ **كَتَبَ اللّٰهُ** (5:21) اللہ نے تمہارے نام لکھ دیا ہے۔ **قَالَ فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيۡهِمۡ اَرۡبَعِيۡنَ سَنَةً** (5:26) کہا کہ جاؤ! یہی کیفیت ہے' چالیس سال تک تمہارے اوپر یہ زمین حرام کر دی گئی۔ **يَتِيۡهُوۡنَ فِى الۡاَرۡضِ** (5:26) جاؤ! اسی طرح سے صحرا نوردیوں کے اندر تمہاری زندگی سرگرداں بسر ہو جائے گی چالیس سال تک!

برادرانِ عزیز! یہ کیا بات تھی؟ یہ وہ قوم تھی جو وہاں سے ساتھ آئی تھی' وہی غلامی کے جذامی جراثیم اپنے دل و دماغ میں لیے ہوئے تھی جن کے تحت ان کی تربیت ہوئی تھی۔ جب تک یہ بڑے بوڑھے' اس ذہنیت کے رکھنے والے' ختم نہیں ہو جاتے' بات بنتی نہیں تھی۔ قرآن نے دوسرے مقام پہ یہ کہا ہے کہ پھر وہاں انہوں نے قوم کی نئی نسل کو سنبھال لیا۔ دو یہ پیغمبر تھے اور ان کے ساتھ' تاریخ بتاتی ہے' کہ حضرت شعیبؑ بھی تھے' انہوں نے قوم کی نئی نسل کو سنبھال لیا۔ دوسرے مقام پہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ پر اس زمانے میں قوم کی نئی نسل کے

افراد ایمان لائے۔ آپ نے دیکھا کہ کس طرح سے قرآن اشارہ دے جاتا ہے کہ ایسے حالات میں کرنے کی بات کیا ہوتی ہے؟ یہ کہ قوم کی نئی نسل کو سنبھال لیجیے' یہ پرانے جتنے بھی ان جراثیم کو لائے ہوئے ہیں' ان کو Segregate (الگ) کیجیے' یہ طاعون کے چوہے دوسروں میں بھی جراثیم پھیلائیں گے۔ کہا ہے کہ یَتِیۡہُوۡنَ فِی الۡاَرۡضِ (5:26) ان کو تو تم لیے لیے پھرو' جنگلوں میں لے جاؤ' صحراؤں میں لے جاؤ' ان کو الگ کردو' اور نئی نسل کو سنبھال لو۔ چالیس سال کے اندر یہ تو ختم ہو جائیں گے اور جو ایک دو نئی نسلیں ہیں' وہ پروان چڑھ جائیں گی۔

قرآن نے دوسرے مقام پہ یہ کہا ہے کہ جب وہ نئی نسل اس طرح سے تربیت یافتہ دل و دماغ میں یہ تبدیلیاں لیے ہوئے ابھری ہے تو وہ ایک بپھرے ہوئے سیلاب کی طرح اُمڈی اور مخالف کی ہر قوت کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے گئی اور فلسطین (کنعان) کے اندر ان کی مملکت قائم ہوگئی۔ دیکھتے ہیں قرآن بتاتا کیا ہے؟ کہ اگر قوم کی کیفیت یہ ہو کہ وہیں ان کی صحیح تربیت نہیں ہوئی' وہاں ان قلب و دماغ میں صحیح تبدیلیاں نہیں آئیں' اور کسی طرح سے اتفاقِ حسنہ سے ان کو ایک مملکت حاصل ہوگئی ہے' وہ آزادی کی سرزمین میں آگئے' تو اس کے بعد پہلے تو انہیں سمجھاؤ کہ کتنی بڑی نعمتِ کبریٰ تم لوگوں کو مفت میں ملی ہے' اس کی قدر کرو لیکن اگر ان کے جراثیم اس طرح سے نہیں مرتے' تو پھر اس قوم کو تو صرف ایسا رکھو' کھانے پینے کو دیئے جاؤ' اس زمین کے استحکام کی فکر رکھو' اس کی حفاظت کیے چلے جاؤ' ان کو مرنے دو لیکن نئی نسل کی تربیت اس طرح سے کرو کہ ان کے ذہن میں غلامی اور آزادی کا یہ فرق محسوس طور پر آجائے۔ اور جب یہ قوم ابھرے گی تو پھر وہی جو سرزمین ان کے نام لکھی گئی تھی' اس کا انتقال بھی ہو جائے گا اور بحالی کے رجسٹروں کے اندر اس کا اندراج بھی ہو جائے گا' پٹا ان کے نام لکھا جائے گا۔ انہوں نے یہ کیا۔

حصولِ پاکستان کے بعد ہمارے ہاں پائی جانے والی غلامانہ سوچ اور نئی نسل کی جانب سے مجرمانہ غفلت کا نتیجہ

دراصل داستانِ بنی اسرائیل ہمیں یہ سنا رہی ہے کہ اس کے بعد پھر وہ نئی نسل ابھری تھی اور اس نے یہ کچھ کیا تھا۔ ہماری مماثلت' برادرانِ عزیز! ابھی یہیں تک ہے کہ ہم نے اپنی اس نئی نسل کو سنبھالنے کا بھی انتظام نہیں کیا۔ یہ جو کچھ ہم یہاں قدم قدم پہ سنتے ہیں' چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں' Compaign (معرکہ آرائی) ہو رہی ہے' اور مملکت کے خلاف یہ کچھ ہو رہا ہے کہ پاکستان کیوں بنایا گیا' اس کا مقصد کیا تھا' خواہ مخواہ مخالفت مول لے لی' روز کا خطرہ سر پہ ہو گیا' ایک ہندوستان رہتا تو کیا اس میں ہم مارے جاتے' نماز روزہ کی وہاں بھی اجازت تھی' اس قسم کی یہاں بھی اجازت ہے' آئے دن یہ سب کچھ ہوتا رہتا ہے اور پھر جیسا ہم نے عرض کیا تھا کہ ذرا پانی نہ ملا اور بگڑ

بیٹھے جہاں کہیں روٹی کی تنگی آئی' لگے گالیاں دینے۔ یہ کیا ہے؟ وہ پرانی نسل اپنے جراثیم لے کر آئی ہوئی ہے۔ ہم میں اتنا حصہ جو تھا وہ مماثلت کا ہے' جو اگلا حصہ تھا' جو قرآن نے کہا تھا کہ ان کو مرنے دو' نئی نسل کو سنبھالو' ہم نے نئی نسل کو بھی نہیں سنبھالا۔ بیس اکیس برس ہو گئے' ہماری نئی نسل اس زمانے میں کچھ تو جھولوں میں تھی' بعض ایسے ہیں جن کی پیدائش اس کے بعد ہوئی' بہر حال یہ وہ نئی نسل ہے' اب جو پروان چڑھ رہی ہے' شباب میں ہے۔ اگر ہم ان کو سنبھال لیتے تو آج اسی نسل کا نام پاکستان کی قوم ہوتا۔ آج آپ' ہر قدم پہ' ہر آن پاکستان کی قوم کا رونا روتے ہیں:

اے چشمِ اشک بار ذرا دیکھ تو سہی
یہ گھر جو بہہ رہا ہے کہیں تیرا گھر نہ ہو

غلامانہ سوچ رکھنے والی قومیں اپنے ہاں افزائش نسل تو کرتی ہیں لیکن ان کی تربیت نہیں کرتیں

بات اصل میں یہ ہے کہ جو قومیں اپنی نئی نسلوں کو نہیں سنبھالتیں' وہی نئی نسل چند دنوں کے بعد جا کر قوم بن جاتی ہے۔ قوم کا رونا ہم روتے چلے جاتے ہیں اور قوم اسی قسم کی بناتے چلے جاتے ہیں۔ قوموں کی تاریخ بھی عجیب کیفیت لیے ہوتی ہے' روتے چلے جا رہے ہیں اور اسی ٹائپ میں' انہی قالبوں کے اندر' اسی ماڈل کے اندر' نئی نسل کو ڈھالتے چلے جاتے ہیں۔ جب وہ وہاں سے بن کر نکلتی ہے' تو روتے چلے جاتے ہیں' انہیں گالیاں دیتے چلے جاتے ہیں: دیکھیے! یہ نئے لونڈے پیدا کیا ہوئے ہیں صاحب! نہ شرم' نہ حیا' نہ عزت' نہ حمیت' نہ ادب' نہ تعظیم' نہ کوئی ولولہ' نہ کوئی امید' نہ آرزو۔ یعنی دیئے جا رہے ہیں گالیاں اور بعینہٖ اسی قسم کے' اسی ٹائپ کے' پھر پیدا بھی کیے چلے جا رہے ہیں۔ کیا بات ہے قوموں کی! غلام صرف افزائشِ نسل کرتا ہے' تربیت نہیں کرتا اور پھر ان کے ہاتھوں روتا بھی ہے۔

میں نے یہ کہا تھا کہ بنی اسرائیل سے یہ کہا گیا تھا کہ ذرا اپنے اندر سپاہیانہ خو پیدا کرو' یہ زمین تمہارے ہاں تمہارے نام لکھ دی گئی ہے' اٹھو اور جا کر قبضہ لے لو۔ وہ کہہ رہے ہیں کہ نہیں صاحب! ہم نہیں داخل ہونگے' ڈر رہے ہیں' کانپ رہے ہیں کہ وہاں تو صاحب! سپاہ بیٹھی ہے۔ اور پھر اس کے بعد یہ کیا کہ یہی ارض مقدس جو ان کے نام لکھی گئی تھی' چالیس سال تک ان کے اوپر مُحَرَّمَةٌ حرام قرار دیدی۔

حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

یہ کچھ کیوں ہوا؟ یہ نہیں کہ انہوں نے حِطَّةٌ کو حِنْطَةٌ کہہ دیا تھا۔ یہ نتیجہ تھا بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ (2:59) کا۔ آپ کو فسق کے معنی بتائے تھے۔ یہ عجیب چیز ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ ہر پھل اپنے اوپر کے خول کے اندر رہتا ہوا پکتا ہے' اس کی صلاحیتیں نشو ونما پاتی ہیں۔ اگر وہ اس قالب کو توڑ کر اس میں سے نکل کر' کسی ایک طرف کو چلا جاتا ہے تو آپ دیکھتے ہیں اس پھل کی کیفیت کیا ہوتی ہے۔ اسے فسق

کہتے ہیں ''صحیح قالب کو توڑ کر اپنے انداز کے مطابق، اپنی روش اختیار کر لینا''۔ جس قالب میں یہ خدا کے پیغمبران کو ڈھالنا چاہتے تھے، وہ اس سے نکل کر دوسری طرف چلے جا رہے تھے؛ اس وجہ سے کیا ہوا؟ اقوام کی زندگی میں یہ بڑا اہم سوال ہے۔

قرآنی نظام انسان کو انسانیت کی شاہراہِ حیات پر چلنے کی قوت اور شعور عطا کرتا ہے

برادرانِ عزیز! کہا ہے کہ رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ (2:59)۔ کیا بات ہے قرآن کے الفاظ کی! یہ جو رجز یا رجز ہے، عربی زبان میں یہ عجیب معنوں میں آتا ہے۔ اونٹوں میں بھی، بیلوں میں بھی، ایک بیماری ہوتی ہے۔ اونٹ تو ہم نے نہیں دیکھے، بیل دیکھے ہیں۔ ان کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ بیٹھے ہوئے وہ اٹھتے ہیں تو پچھلی ٹانگیں لڑکھڑاتی ہیں، ورنہ صحت مند جانور، بیل ہو یا اونٹ، وہ ایک ہی جھٹکے میں یوں اٹھ کھڑا ہوتا ہے لیکن وہ اٹھتے ہیں تو اٹھنے کی ہمت نہیں ہوتی، ان کی ٹانگیں لڑکھڑاتی ہیں، گر پڑتے ہیں، پھر ہمت سے ان کو اٹھانا پڑتا ہے، پھر گر پڑتے ہیں۔ یہ جو اس قسم کی لڑکھڑاہٹ پیدا ہو جاتی ہے، اسے رجز کہتے ہیں۔ کہا ہے کہ اس قوم کی ٹانگوں میں اس قسم کی لغزش، لرزش پیدا ہو گئی، ضعف پیدا ہو گیا کہ اپنے پاؤں پہ وہ کھڑا ہونے کے قابل نہ رہی، وہ اٹھاتے تھے یہ گر پڑتی تھی، پھر اٹھاتے تھے گر پڑتی تھی۔ یہ کیوں کہا؟ اس لیے کہ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ (2:59) صرف اس لیے کہ جس قالب کے اندر وہ ان کے دل و دماغ کی تربیت کرتے تھے، وہ اس سے نکل کر دوسری طرف چلے جاتے تھے، اس لیے یہ کچھ ہو گیا۔ اور یہاں پاکستان میں نئے قالب ہی نہ تیار ہوئے، آپ ذرا سوچیے تو سہی!

دہن کا ذکر کیا، یاں سر ہی غائب ہے گریباں سے

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عصا کے ذریعے بارہ چشموں کے پیدا ہونے کا مفہوم اور تفسیری داستانیں

آگے غلامی میں پھنسی ہوئی قوم کی ایک اور مثال آئی۔ کہا ہے کہ **وَ اِذِ اسْتَسْقٰى مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ؕ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ؕ قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ؕ كُلُوْا وَ اشْرَبُوْا مِنْ رِّزْقِ اللّٰهِ وَ لَا تَعْثَوْا فِى الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ** (2:60)۔ یہ اگلی بات آئی۔ میں نے ابھی ابھی یہاں آپ کو پڑھ کر سنایا تھا، پانی کی دقت ہوئی، نئے نئے انتظامات میں، نئی مملکت میں، نئی سرزمین میں، یہ ساری دقتیں ہوں گی۔ آپ اپنا مکان بدلتے ہیں تو اس میں بھی Readjustment (سرِ نو مطابقت) کرتے وقت آپ کو کئی دن، کئی مہینے لگ جاتے ہیں۔ ایک نئی مملکت کے اندر آپ آتے ہیں اور وہاں چاہتے یہ ہیں کہ صاحب! جس انداز سے، جس کمرے میں، جس رخ پہ کل چارپائی بچھی ہوئی تھی، بعینہٖ اسی طرح سے ایک دیو آئے، اس کو اٹھا کر اسی کمرے کے اندر ویسے ہی بچھا دے، وہاں ہم استراحت کریں گے، یہ تو ہوئی آزادی جناب! ایسا نہیں ہوتا۔ نئے سرے سے مطابقت پیدا کرنا پڑتی ہے۔

اب یہاں بنی اسرائیل کو پانی کی دقت ہوئی' روٹھ کر بیٹھ گئے۔ الفاظ وہی ہیں کہ موسیٰ! تُو کیوں ہمیں نکال کر لے آیا۔ ''ہندوستان'' میں رہتے ہوئے ہمیں کیا موت پڑ جاتی' تم کیوں یہ ایک نئی مملکت کے اندر آ گئے؟ بہر حال انہوں نے موسیٰ سے پانی مانگا۔ یہاں اس کے لیے یہ الفاظ آئے ہیں' کہ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ (2:60)۔ ہمارے ہاں اس کا ترجمہ بھی یہی کیا جاتا ہے' تفاسیر میں یہی چیز ہے کہ موسیٰ سے کہا کہ پتھر کے اوپر اپنا عصا مارو' عصا کے معنی لاٹھی' حجر کے معنی پتھر' انہوں نے وہ مارا تو اس میں سے بارہ چشمے بہہ نکلے۔ اب پھر چلی زیب داستان کہ وہ پتھر' کونسا پتھر تھا؟ ایک تفسیر میں تو یہ ہے حضرت آدمؑ جب جنت سے نکلے تھے تو بعض جگہ تو یہ ہے کہ حضرت حوا' اپنے ساتھ ایک سِل لے آئی تھی ''مصالحہ پین لنی ❶'' وہ جو پتھر تھا یا وہ جو سِل تھی' وہ متوارث چلی آ رہی تھی اور حضرتِ شعیبؑ نے انہیں دیدی تھی تو اس پتھر کے اندر انہوں نے مارا اور اس میں سے بارہ چشمے نکل آئے۔ روایات میں ایک اور پتھر بھی آتا ہے۔ کہا گیا ہے کہ یہ وہ پتھر تھا۔ وہ بات آگے آئے گی لیکن یہ اس مقام پہ بیان کرنے کی نہیں ہے۔

بخاری میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے متعلق غسل کے دوران ایک پتھر کا آپ کے کپڑے لے کر بھاگ جانے کا قصہ

برادرانِ عزیز! چونکہ اس پتھر کا ذکر آ گیا ہے' یہ قرآنِ کریم میں ایک جگہ ہے کہ مسلمانوں سے کہا گیا کہ دیکھو! تم پیغمبر کو اس قسم کی باتیں کر کے' اس قسم کے سوالات کر کے' خوامخواہ کے لیے اذیت نہ پہنچاؤ جیسے بنی اسرائیل نے پہنچائی تھی۔ بات تو اتنی ہی ہے۔ قدم قدم پہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ کس طرح سے اپنے اس نبی کو' اپنے اس رسول کو' وہ کس قدر تنگ کر رہے ہیں' کس قدر ہراساں کر رہے ہیں' یہ بات کہی گئی تھی۔ اب آ گئی تفسیر کہ بنی اسرائیل نے حضرتِ موسیٰ کو کیسے تنگ کیا تھا۔ کہا کہ ان کے متعلق مشہور کر دیا تھا' یہ تفاسیر تو نہیں' یہ ساری تفسیریں ہمارے ہاں کی احادیث کی کتابوں میں سے ہیں' ان کتابوں میں نہایت معتبر بخاری شریف کی وہ روایت ہے' کہ حضرتِ موسیٰ کو ستر کے مقام میں' ایک بیماری ہے اور اسی لیے یہ ہمارے سامنے نہیں نہاتے' کہیں دور جا کر پردے میں نہاتے ہیں۔ پردے میں تو نہانا چاہیے' یہ ستر کا تقاضا ہے کہ نہیں صاحب! یہ جو پردے میں جا کر نہاتے ہیں' بس انہیں یہ بیماری ہے۔ اب یہ مشہور کر دیا صاحب! حضرتِ موسیٰ اس سے زچ پڑے۔ بات ایسی نہیں تھی کہ ان کے سامنے کپڑے اتار کر ان کو بتا دیتے کہ نہیں' ایسی بات نہیں ہے۔ اب اس کا انتظام اللہ میاں کے ہاں ہوا' ایک دن ندی کے کنارے جا کر انہوں نے پتھر پہ کپڑے رکھے' ندی میں نہانے کے لیے گئے۔ اب جو نہا کر نکلے ہیں تو وہ پتھر ان کپڑوں کو لے کر آگے آگے بھاگ گیا۔ پتھر آگے آگے تھا' اب وہ کیا کرتے' کپڑا تو کوئی تھا ہی نہیں اور وہاں اگر پیچھے نہ دوڑتے تو کب تک ندی میں ننگے کھڑے رہتے۔ پیچھے پیچھے دوڑ پڑے۔ وہ آگے آگے چلا جا رہا ہے' یہ پیچھے پیچھے چلے جا رہے ہیں

---

❶ مصالحہ پیسنے کے لیے۔

صاحب! چلتے چلتے وہ جو پتھر تھا' وہ بنی اسرائیل کے کیمپ کے اندر آ گیا۔اب جو آیا تو انہوں نے' سب نے' ادھر اُدھر کھڑے دیکھا کہ حضرتِ موسیٰ ننگے کھڑے ہیں۔انہوں نے کہا ''نئیں نئیں او جھوٹی گل ہیگی سی' جھوٹی گل ہیگی سی۔او کپڑے پالئے او ہناں نیں ❶''۔

دوسری جگہ ہے کہ یہ پتھر تھا' جو پھر ساتھ رکھا ہوا تھا۔کیسا پتھر تھا جو سنبھال کر رکھا ہوا تھا!!!! اور یہ تھا جس پہ عصا مارا تھا اور اس میں سے وہ چشمے پھوٹ نکلے تھے۔کہیے کہ صاحب! اب سوال یہ ہے کہ اس میں یہ اتنی بڑی کرامات کیسے پیدا ہو گئیں؟ کہتے ہیں کہ چند ساعتوں کے لیے ایک مقربِ خدا کے کپڑوں سے اس کو تمسک حاصل ہوا' اس سے اس کے اندر اتنی بڑی چیز پیدا ہو گئی۔اگر تم کسی ایک کا قرب حاصل کر لو تو تمہارے دل کے اندر سے چشمے پھوٹ جائیں گے۔یہ مردِ خدا کا تقرب عجیب قسم کا ہوا!!!! ''ننگا پچھے نٹھا جان ڈیا ہیگا ❷''۔وہ تقرب کی ایک شکل یہ نکلی کہ ''پیر دے کپڑے لے کے نٹھ ❸ جا''۔

عصا کے بنیادی معنی اجتماعیت کے ہیں

بہرحال' برادرانِ عزیز! قرآن کی طرف آئیے۔کہا ہے کہ **فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ** (2:60)۔عصا کے ہمارے ہاں ایک ہی معنی ہیں: لاٹھی۔عربی زبان سے پوچھیے' عربوں سے پوچھیے' محاورۂ عرب سے پوچھیے کہ اس کے معنی کیا ہوتے ہیں؟ اس لفظ کے بنیادی معنی ہوتے ہیں ''اجتماعیت''۔**شق العصا** کے معنی ہوتے ہیں ''قوم میں افتراق پیدا کرنا'' وہ **عصاۃ القوم** کہتے ہیں' اس سے انہوں نے Verb بنایا' اس کے معنی ہیں ''میں نے قوم کو جمع کر لیا''۔اس لفظ کے معنی ہی' اجتماعیت کے ہیں' کسی چیز کو اکٹھا کر دینا' کسی چیز کو مجتمع کر دینا۔**عَصَا** کے معنی ہی ''جماعت'' کے ہوتے ہیں۔پھر وہ تو قوم ہی عجیب تھی۔چونکہ لٹھ (لاٹھی) کو پکڑنے کے لیے انگلیوں کا اکٹھا کرنا' اور ان میں ایتلاف اور اجتماعیت پیدا کرنا ضروری تھا' صرف اس نسبت سے اس کو یہ کہتے تھے کہ اس کو پوری گرفت سے' اجتماعیت سے' پکڑنا ہوتا تھا۔یہ اس کے ثانوی معنی تھے۔اس کے بنیادی معنی جماعت کے اور اجتماعیت کے ہیں۔محاورۂ عرب میں عصا' جماعت کو کہتے ہیں' **عَصَا الْمُسْلِمِيْنَ** مسلمانوں کی جماعت کو کہتے ہیں۔یہ جماعت ہے جو قوم ہے۔

یہ جو **ضــرب** ہے مارنا' عربی زبان میں اس کے بہت سے معنی ہیں' جیسے انگریزی زبان کے اندر بھی یہ جو Make کا لفظ ہوتا ہے' آپ دیکھتے ہیں اس کے معنی کتنے آ جاتے ہیں۔**ضرب فی الارض یاضرب الارض** کے معنی ہوتا ہے' تلاش رزق میں ''زمین میں

---

❶ نہیں' نہیں وہ سرتا پا جھوٹی بات تھی' تو انہوں نے وہ کپڑے پہن لیے۔

❷ ننگا پیچھے بھاگا جا رہا ہے۔

❸ پیر و مرشد کے کپڑے لے کر بھاگ جاؤ۔

چلنا‘‘۔ضرب الطیر وہ لوگ بولتے ہیں’’جب صبح پرندے اپنے اپنے آشیانوں سے تلاشِ رزق میں اڑ کر جاتے ہیں‘‘اسے ضرب الطیر کہتے ہیں۔ضرب کے معنی ہوتے ہیں’’چلنے کے‘روانہ ہونے کے‘‘۔اور خاص طور پر رزق کی تلاش میں جو چلنا ہوتا ہے‘اس کے لیے خاص طور پر وہ یہ لفظ بولتے تھے۔

یہ قرآن کریم کے اندر ضرب فی الارض آیا ہوا ہے کہ چلو پھرو زمین کے اندر‘یہ بے شمار مقامات میں ہے۔یہ بات کیا تھی؟یہ میدان میں پھر رہے تھے‘نئی سرزمین تھی‘وہاں ابھی اس کا جغرافیہ بھی معلوم نہیں تھا‘وہاں پانی کی کمی واقع ہوئی تھی۔بات سیدھی سی تھی کہ **فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ** (2:60) ہم نے ان سے کہا کہ اپنی جماعت کو لے کر اس علاقے کی طرف جاؤ جو پتھریلا ہے‘جہاں پہاڑیاں ہیں‘جہاں چٹانیں ہیں۔چنانچہ آج بھی‘جہاں حضرت موسیٰؑ‘فلسطین کے علاقے میں گئے تھے‘یہ کہتے ہیں کہ یہ اس زمانے کے وہ چشمے ہیں۔چشمے پہاڑی علاقے سے نکلتے ہیں‘وہ پہاڑی علاقہ ہے۔یہ کہا کہ اِس میدان سے‘اُس پہاڑی علاقے کی طرف چلے جاؤ‘وہاں تم جاؤ گے تو دیکھو گے کہ ہوسکتا ہے کہ ان چٹانوں کے اوپر کچھ مٹی بھی پڑی ہوئی ہو‘ہوسکتا ہے کہ اس مٹی کو بھی وہاں سے ہٹانا پڑا ہو۔وہ وہاں گئے تو وہاں جا کر دیکھا کہ ایک چھوڑ بارہ بارہ چشمے وہاں سے پھوٹ کر نکل رہے ہیں یا چشمے بہہ رہے ہیں یہ تلاش کیا ہے۔ہوسکتا ہے کہ وہاں جا کر کوئی کدالوں سے کام لیا ہو جیسے عام طریقہ بھی ہوتا ہے۔قرآن ساری تفاصیل تو دیتا نہیں ہے‘بات تو صرف یہ کہی ہے کہ ٹھیک ہے میدان کے اندر پانی کی تنگی آگئی ہے‘ذرا پہاڑی علاقے کی طرف چلے جاؤ‘وہاں تم دیکھو گے کہ تمہیں چشمے ملیں گے‘پہاڑیوں کے اندر چھپے ہوئے چشمے ہونگے۔چشمے مل گئے لیکن یہاں تو جب تک داستان میں کچھ رنگینی نہ پیدا کی جائے‘اس میں لطف نہیں پیدا ہوتا۔

فرقہ بندی کے تصور کو ختم کیے بغیر ملت اسلامیہ اجتماعت کے آبِ حیات سے لطف اندوز ہو ہی نہیں سکتی

کہا ہے کہ **قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ**(2:60) ۔اب یہاں ایک اور چیز آتی ہے۔قوم اس غلامی کے زمانے میں آرہی ہے‘وہاں فرعون نے ان کی پارٹیاں بنادی تھیں۔پچھلی دفعہ میں نے عرض کیا تھا‘سورۃ القصص کی چوتھی آیت تھی کہ پارٹیاں بنادیں‘وہ فرقے بن گئے‘ان میں فرقے بھی ہونگے‘پارٹیاں بھی ہونگی۔ابھی تک وہ ذہنیت ہے‘پوری قوم کسی ایک چشمے سے پانی نہیں پینا چاہتی‘ہر فرقہ چاہتا ہے ہمارے لیے الگ ہونا چاہیے۔ایک ایک فرقے نے اپنے لیے ایک ایک چشمہ سنبھال لیا‘قوم میں یک جہتی نہ پیدا ہونے پائی۔ہر گروہ‘ہر پارٹی‘ایک چشمہ سنبھال کر بیٹھ جائے اور پھر اس کے بعد اگلی فکر یہ ہوگی کہ جس کی پارٹی ذرا سی کمزور ہو تو اس کے چشمے کے اوپر بھی ہاتھ ڈال لیں۔دیکھتے ہیں آپ‘یہ بیس سال کی ہماری تاریخ کیا ہے؟ہر گروہ ایک ایک چشمہ سنبھال کر بیٹھا ہوا ہے۔جس کے پاس

قوت نہیں ہے، وہ پانی کو ترس رہا ہے۔ اور پھر ہر گروہ کی خواہش، آرزو، ہر وقت یہ ہے کہ دوسروں کے چشموں کو بھی کسی طرح اپنے تصرف میں لے آئے حالانکہ جب قوم کہا ہے تو اس میں یہ سوال ہی پیدا نہیں ہونا چاہیے تھا کہ وہ الگ الگ گروہ، اپنے لیے الگ الگ رزق کے سرچشموں کو مختص اور مخصوص کرلے۔ ہم نے کہا ہے کہ **كُلُوْا وَ اشْرَبُوْا مِنْ رِّزْقِ اللّٰهِ** (2:60) اللہ کا دیا ہوا سامانِ زیست ہے' 'نہ اے تسی کتھوں مُل لیا' 'نہ باپ دادا کی وراثت سے آیا، مفت کا ملا ہوا پانی، خدا کا دیا ہوا، کھاؤ پیؤ یہ اس مقصد کے لیے ہے۔ **وَ لَا تَعْثَوْا فِی الْاَرْضِ مُفْسِدِیْنَ** (2:60)۔ قرآن کیا بات کہہ گیا ہے! فساد کے معنی میں نے بتایا تھا' 'ناہمواریاں پیدا کرنا، طبقات میں تقسیم کردینا' '۔ کہا تھا کہ یہ کچھ تو نہ کرتے پھرو! کیا یہ تمہارے لیے اتنا کم ہے؟ کھاؤ پیؤ حلالاً طیباً یوں کھاؤ۔ حلال چیز کو بھی کیوں حرام کرلیتے ہو؟

قرآن حکیم نے کس چیز کو حلال اور کس کو حرام کہا ہے؟

آپ کو پتہ ہے، عزیزانِ من! بات میں سے بات نکل آئی۔ قرآن نے جو چار چیزیں حرام قرار دی ہیں، تین تو ان میں سے یہ کھانے پینے کی اشیاء ہیں یعنی لحم خنزیر، مردہ، بہتا ہوا لہو اور چوتھی چیز آپ کو پتہ ہے کیا ہے؟ یہ کہ خدا کے علاوہ کسی اور کی طرف، کسی چیز کو جو منسوب کردیا جائے، وہ حرام ہے۔ قرآن نے ارض کو ارض اللہ کہا ہے یعنی خدا کی زمین۔ جو کچھ پیدا ہوتا ہے اس کو رزق اللہ کہا ہے یعنی اللہ کا رزق جس طرح سے کعبہ بیت اللہ ہے۔ اگر بیت اللہ کو کسی شخص کے نام سے منسوب کرکے کہہ دیا جائے کہ صاحب! یہ جو ہے یہ محمد عمر کا گھر ہے، یہ شرک ہو جائے گا۔ خدا کے گھر کو کسی انسان کا گھر کہہ دینا شرک ہے۔ ہم پوچھتے یہ ہیں کہ ارض اللہ جو قرآن نے کہا ہے، زمین خدا کی، اس زمین کے ٹکڑوں کو کسی کی طرف جو منسوب کردینا ہے، تو انداداً من دون اللہ قرآن نے کہا تھا۔ اور غیر اللہ کی طرف منسوب کیا رزق حرام ہو گیا۔ نسبت غیر اللہ کی طرف کردینا اس چیز کی جسے اللہ نے اپنی طرف منسوب کیا ہے، حرام ہے۔

ارض کو ارض اللہ کہنے کا مقصد دراصل نوع انسانی کو شرک سے محفوظ رکھنا تھا

ہم نے تو سمجھا ہے کہ قرآن میں شاعری کی ہوئی ہے، ٹھیک ہے، جی! ارض اللہ کہہ دیا تو کیا ہوا یا محمد عمر کی زمین کہہ دیا تو پھر کیا ہوا؟ یہاں گاؤں کے اندر اگر کوئی یہ کہہ کر بتائے کہ' 'اے نتھو دی نئیں، اے خیرے دی اے ❶' ' آپ دیکھیے کہ کتنے مقدمے چلتے ہیں، لٹھم لٹھا بھی ہوتا ہے، پٹواری کے کاغذات میں یہ کچھ ہوتا ہے، میری زمین کسی اور کی طرف منسوب ہوگئی۔ یہ ارض اللہ کیوں کہا تھا خدا نے؟ قرآن کیوں رزق اللہ کہتا ہے؟ کیا اس مالک کو اتنا حق بھی نہیں ہے کہ اس کی جو ملکیت ہے اس کو آپ دوسروں کی طرف منسوب کرتے ہوئے چلے

---

❶ یہ نتھو کی نہیں ہے، یہ خیرے کی ہے۔

جائیں اور وہ بیٹھا ہوا دیکھتا رہے؟ اس نے یہی کہا ہے کہ حَلٰلًا طَیِّبًا. حلال کے تو معنی ہی لکیریں مٹا دینا ہیں' گرہیں کھول دینا'' او آجیہڑ یاں گنڈاں مار مار کے' اپناتے تیراتے میرا' بنایا ہویا ہیگا نا❶ ''لفظ حلال کے معنی ہیں'' گرہیں کھول دینا''۔ گرہیں کھولو' ارض کو ارض اللہ بناؤ: وَ لَا تَعْثَوْا فِی الْاَرْضِ مُفْسِدِیْنَ (2:60)۔ یہ ہوگئی بات پانی پینے کی۔

قوموں کی رہائش' خوراک' تن آسانی اور سہل انگاری بھی ان کی صلاحیتوں کو مفلوج کر دیتی ہے

آگے کہا ہے کہ وَ اِذْ قُلْتُمْ یٰمُوْسٰی لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰی طَعَامٍ وَّاحِدٍ (2:61)۔ اور روز صاحب کھانے کے لیے بٹیر کھاؤ' تیتر کھاؤ۔ میں یہ عرض کر دوں کہ یہ کھانے کی بات بھی کیوں قرآن اس طرح سے لایا ہے۔ یہ بڑی چیز ہے۔ یہ رہائش کا بڑا اثر پڑتا ہے قوموں کی روش کے اوپر' قوموں کی اندرونی کیفیات کے اوپر۔ تن آسانی کی' سہل انگاری کی جو شہری زندگی ہے' اس میں سپاہیانہ جدوجہد کرنے کی خوبی پیدا نہیں ہوسکتی۔ صحرا کی زندگی' بیابانوں کی زندگی' جنگلوں کی زندگی' آپ کو معلوم ہے کہ سپاہیوں کی ٹریننگ کے اندر یہ چیزیں داخل کی جاتی ہیں۔ ایک تو بنیادی طور پر سپاہیوں کو شہروں سے دور رکھا جاتا ہے' پھر ان کی اپنی بارکوں کے اندر بھی ذرا شہری تمدن کی خوبی آنے لگ جاتی ہے تو وقتاً فوقتاً ان کو اور باہر لے جاتے ہیں' بالکل جنگل میں چھوڑ دیتے ہیں' چٹیل میدانوں میں چھوڑ دیتے ہیں۔ زمین پہ سونے کی عادت' خندقوں میں سونے کی عادت' درختوں کے پتے کھانے کی عادت' بھوک برداشت کرنے کی عادت' پیاس برداشت کرنے کی عادت' سختیاں جھیلنے کی عادت' بڑی ضروری چیز ہے۔ یہ قوموں کے اندر تبدیلیاں پیدا کرنے کی ہیں۔ انہیں اس دشت میں' اس میدان میں' یہ لے گئے تھے کہ وہاں جا کر ان کو خالصتاً فطرت کی سادہ زندگی کے اوپر چھوڑ دیا تھا کہ ان میں قوتِ برداشت پیدا ہو۔

بنی اسرائیل کو غلامی کے دور کے نوالوں کے مقابلے میں آزادی کی فضا پسند نہ آئی

اب سوال یہ ہے کہ وہاں کھلی فضا میں کیا کیفیت ہوئی؟ کہ صاحب! روز یہی کھاتے کھاتے' ہم تو مر گئے۔ لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰی طَعَامٍ وَّاحِدٍ (2:61) کھانے کو ملتا ہے' اس میں چٹ پٹا کچھ نہیں۔ فَادْعُ لَنَا رَبَّکَ یُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْبِتُ الْاَرْضُ مِنْۢ بَقْلِهَا وَ قِثَّآئِهَا وَ فُوْمِهَا وَ عَدَسِهَا وَ بَصَلِهَا (2:61) او جی! یہ سبزیاں' یہ ترکاریاں' لہسن' گنڈا (پیاز)۔ کچھ مزا ہی نہیں ہے۔ یہ مانگ خدا سے' یہ چیزیں ہمارے لیے لے کے آ۔ میں نے کہا تھا کہ اس مقام پہ میں پھر تورات کا اقتباس دوں گا جو اس مقام پہ کہتی ہے۔ کونسی چیز کی کمی ہے اس جنگل میں؟ کھانے پینے کو مل رہا ہے' صاف اور سادہ غذا مل رہی ہے' پینے کو چشموں کا پانی مل رہا ہے' یہ سب کچھ

---

❶ وہ جو گانٹھیں لگا کر اپنا تیرا اور میرا بنا رکھا ہے۔

وہاں موجود ہے۔ دیکھیے کیا موجود نہیں ہے؟ یہ مصر کی زندگی میں یہ غلام قوم' حاکم قوم کے گھروں میں کام کاج کرنے کے لیے خداموں کی طرح' نوکروں کی طرح' بھٹیاروں کی طرح' رکھی ہوئی ہوتی تھی۔ یہ جو ہمارے پوربی ہوتے تھے یہ اس قسم کے کام کرتے تھے۔ یہ اُن کے گھروں میں کھانا وانا پکاتے تھے' باورچیوں کا بھی کام کرتے تھے' برتن بھی مانجھتے تھے' یہ سب کچھ کرتے تھے۔ کاہے کے لیے کرتے تھے؟ اس لیے کہ بچا کھچا ہی سہی' کچھ مزیدار تو کھانے کو ملتا ہے۔ پھر وہ ایلیم کے لیے روانہ ہوئے۔ ''بنی اسرائیل کی ساری جماعت' زمینِ مصر سے خارج ہو کر' دوسرے مہینے کے پندرھویں دن سین کے بیابانِ میں' جو ایلیم اور سینا کے درمیان ہے' پہنچے۔ اور ساری جماعتِ بنی اسرائیل بولے کہ کاش! ہم خداوند کے ہاتھ سے زمینِ مصر میں جس وقت کہ ہم گوشت کی ہانڈیوں کے پاس بیٹھتے تھے اور روٹی من بھر کے کھاتے تھے' مارے جاتے۔ تم ہم کو اس بیابان میں نکال لائے ہو کہ سارے مجمع کو بھوک سے ہلاک کر دو ❶''۔ وہاں ہم ہانڈیوں کے پاس بیٹھے ہوئے گوشت بھون رہے ہوتے تھے' انہیں یہ یاد ستا رہی ہے۔

دین و دانش را غلام ارزاں دہد
تا بدن را زندہ دارد جاں دہد

اقبالؒ کی نظر میں غلام قوم کی ذہنیت اور نفسیاتی کیفیت

اتفاق سے یہ شعر سامنے آ گئے اور اقبالؒ کے شعر' میں سمجھتا ہوں' غلامی کی ذہنیت کو ان سے بہتر الفاظ میں شاید ہی بیان کیا جا سکتا ہو:

از غلامی دل بمیرد در بدن
از غلامی روح گردد بارِ تن
از غلامی بزمِ ملت فرد فرد
ایں وآں از ایں وآں اندر نبرد

بڑی عجیب چیز کہی ہے کہ

آں یکے اندر سجود ایں در قیام
کاروبارش چوں صلوٰۃ بے امام

---

❶ حوالہ: خروج 3-16:1۔

نماز با جماعت کے دوران اجتماعیت کا ایک روح پرور نظارہ اور اس کے بعد انفرادی عمل کا نتیجہ

عزیزانِ من! عجیب چیز ہے' مسجد میں با جماعت نماز کو آپ دیکھیے' حسنِ اجتماعیت کا جنتی نظارہ سامنے ہوگا' ہزاروں کی تعداد کے اندر' لاکھ کی تعداد کے اندر' صفوں کے اندر کھڑے ہوئے ایک شخص کی آواز کے اوپر اٹھتے ہیں' جھکتے ہیں' سجدے میں گرتے ہیں' ایک ایکشن' ایک فکر' ایک نگاہ' ایک طرف رخ' کتنا بڑا اتحاد کا یہ منظر ہے۔ یہ با جماعت کے بعد امام نے سلام پھیرا' دعا مانگی' بد دعا مانگی اور اس کے بعد یہ اپنی سنتوں میں لگے۔ یہ نظارہ بھی پھر اسی مسجد میں دیکھیے' کسی کی کوئی نقل و حرکت دوسرے سے نہیں ملتی:

ایں یکے اندر سجود ایں در قیام

کاروبارش چوں صلوٰۃ بے امام

بس ایک امام کے نہ ہونے سے' عزیزانِ من! وہی جماعت' وہی نماز' وہی مسجد' وہی ان کی عبادت' آپ دیکھتے ہیں اس کی کیفیت کیا ہو جاتی ہے۔ یہ ہے امام' آپ کے ہاں کی مرکزیت۔ اسی سے دین قائم ہوتا ہے' یہ نہ رہے تو دین مذہب بن جاتا ہے' مذہب میں انفرادیت ہوتی ہے' دین میں اجتماعیت ہوتی ہے۔ دین کی اجتماعیت ہی تو ہے اس امام کی آواز پہ اٹھنا اور جھکنا تو ایک طرف' عزیزانِ من! امام اگر کہیں اپنی نماز میں غلطی کر جاتا ہے تو ساری جماعت کو سجدۂ سہو ادا کرنا پڑتا ہے۔

کیشِ 'او تقلید' کارش آذری است

کام کیا کرتے ہیں بت تراشی کا۔

ندرت اندر مذہبِ او کافری است

مگر ان کے اندر نئی چیز پیدا کرنا کفر ہے۔ **کل بدعۃ ضلالۃ کل ضلالۃ فی النار** ہر نئی چیز گمراہی' ہر گمراہی جہنم میں۔

تازگی ہا وہم و شک افزائدش

جونہی کسی نے کوئی نئی بات کہی اور شکوک وشبہات پیدا ہوئے' کفر کے فتوے لگنے لگے۔

کہنہ و فرسودہ خوش می آیدش

جو پرانی بات چلی آ رہی ہے مست ہو کر اس کے اوپر بیٹھے ہیں۔

کاروانِ شوق بے ذوق رحیل

اب نہ راحلہ ہی ہے' اور نہ دل کے اندر سفر کا ذوق ہی ہے اور اب ہیں:

بے یقین و بے سبیل و بے دلیل

سچ کہا تھا اقبالؒ نے کہ

دین و دانش را غلام ارزاں دہد
تا بدن را زندہ دارد جاں دہد

صحرائے سینا میں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بنی اسرائیل قوم کا مطالبہ

کہہ یہ رہے ہیں کہ مصریوں کے گھروں کے اندر باورچی کی حیثیت سے جب ہم ہنڈیا بھونتے تھے' کیا زندگی تھی صاحب!!! تُو کہاں لے آیا ہے' روز صبح شام وہی کچھ کھانے کے لیے ہے۔ ہم یہ نہیں کھائیں گے صاحب! نہیں رہیں گے تمہارے ساتھ۔ اچھا جی! کیا کیا جائے؟ یہ لا ہمارے لیے ''آلہسن گنڈا لے آ کچھ''❶۔ دیکھیے مانگ کیا رہے ہیں۔ کہا ہے کہ **قَالَ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِیْ هُوَ اَدْنٰی بِالَّذِیْ هُوَ خَیْرٌ** (2:61)۔ کیا بات ہے صاحب! یوں کہنے کو تو یہ کہا جائے گا کہ صاحب! یہ کیا چیز ہو گئی کہ یہ ہم نہیں کھانا چاہتے' وہ کھانا چاہتے ہیں؟ آپ دیکھتے ہیں کہ اِس غذا اور اُس خوراک کے اوپر اندرونی تبدیلیوں کا کتنا دارومدار ہے۔ اس زندگی میں جو تمہیں ہم بنانا چاہتے تھے اس کو چھوڑ کر کیا بننا چاہتے ہو؟ انہوں نے کہا کہ ٹھیک ہے جی! ہم جو بننا چاہتے ہیں بس بننا چاہتے ہیں۔ کہا کہ **اِهْبِطُوْا مِصْرًا فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ** (2:61) ٹھیک ہے کسی شہر میں جا بسو' ٹھیک ہے وہاں نوکری مل جائے گی' پھر اسی طرح سے ''جاو بھانڈے مانجھوتے فیر او تھے جا کے ہانڈیاں پکاؤ'' جاؤ کسی شہر میں چلے جاؤ' وہی زندگی بسر کرنا چاہتے ہو تو کرو۔ برتن صاف کرنا چاہتے تو کرو اور ہنڈیاں پکانا چاہتے ہو تو جاؤ پکاؤ۔

عزت وذلت اور مسکنت کا بنیادی مفہوم

نتیجہ اس کا' عزیزانِ من! اس کے بعد کی کڑیاں تو آگے جا کر آتی ہیں لیکن یہاں تو قرآن Sum up (تلخیص) کر کے رکھ دیتا ہے۔ انہوں نے اپنی ذہنیت کو نہیں بدلا تو **وَ ضُرِبَتْ عَلَیْهِمُ الذِّلَّةُ وَ الْمَسْكَنَةُ ۗ وَ بَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ** (2:61) ان کے اوپر ذلت و مسکنت کی مار ماری گئی۔ ذلت عزت کے مقابلے میں ہے۔ یہ عزت ہمارے ہاں تو صرف Respect (تعظیم) کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ محاورۂ عرب میں عزیز یا عزت کے معنی ہوتا ہے ''صاحبِ غلبہ'' ذلیل کے معنی ''محکوم'' کے ہوتے ہیں۔ محکومیت سے بڑی ذلت اور کیا ہو سکتی ہے۔ ایک انسان کا کسی انسان کے سامنے سر جھکا دینا اس سے بڑی ذلت کیا ہو سکتی ہے؟ لیکن بات اگلی ہے جو قرآن نے کہا ہے: مسـکـنـة۔ ہمارے ہاں تو اس کے لیے بھی مسکینی کا لفظ لے آئے ہیں ''ڈاہڈا مسکین ہے''۔ مسکین ہے سکن سے۔ زندگی Dynamic (حرکت) ہے' حرکت کا نام ہے' یہ ہر آن آگے بڑھنے کا نام ہے' مسکنت ساکن ہو جانے کا نام ہے' جمود کا نام ہے' تعطل کا

---

❶ یہ کچھ لہسن اور پیاز لے آؤ۔

نام ہے ایک مقام پہ کھڑے ہو جانے کا نام ہے۔ کہا ہے کہ **بَغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ** (2:61) قوموں کے لیے خدا کا سب سے بڑا غضب یہ ہے کہ ان پر جمود اور تعطل طاری ہو جائے ان کی حرکت مبدل بہ سکون ہو جائے۔

ملتِ اسلامیہ کی جوئے رواں تو صدیوں سے جوہڑ کی شکل اختیار کیے ہوئے ہے

ندی رواں ہے تو ندی ہے جہاں کھڑی ہوئی جوہڑ ہوئی چند دنوں کھڑا رہا پانی متعفن ہو گیا۔ وہی پانی جو ممدِ حیات تھا اس میں ایسے جراثیم پیدا ہو جاتے ہیں کہ وہ مہلک ہو جاتا ہے۔ یہ کس چیز سے مہلک ہوا؟ اس سے کہ حرکت مبدل بہ سکون ہو گئی۔ قوموں کی زندگی میں ہوتا یہ ہے کہ ان کو آگے نہیں بڑھنے دیا جاتا روک دیا جاتا ہے ساکن کر دیا جاتا ہے متحرک نہیں رہنے دیا جاتا۔ اس کا نام مذہب ہے عزیزانِ من! ہزار برس سے جو ہوتا چلا آ رہا ہے اسی طرح سے ہوتا چلا جائے۔ ذرا آگے نہیں بڑھنے دیا جاتا Nation (قوم) جامد ہو جاتی ہے یاد رکھیے گا۔ یہ ہے جس کو مسکنت کہا ہے۔ ذلت کہہ کر تو یہ کہا کہ وہ جو غلبوں کی قوت تھی وہ ختم ہو گئی۔ وہ ختم کیوں ہو گئی؟ مسکنت کی وجہ سے ختم ہو گئی۔ چلنے والا پانی آبشاروں سے گرنے والا پانی تو اتنی بجلیاں پیدا کرتا ہے کہ اس سے ساری قوم کی مشینریاں حرکت میں آ جاتی ہیں۔ اسی پانی کو جوہڑ بنا دیجیے تو جیسا میں نے ابھی عرض کیا ہے متعفن ہو جاتا ہے۔ پھر ایک دو دن کی بات نہیں زندگی کا آبِ حیات اگر صدیوں تک کسی جوہڑ میں ساکن رہے اور متعفن ہو جائے اس میں سے آپ پھر حیاتِ تازہ کی نمود کیسے چاہ سکتے ہیں۔

علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں قرآن حکیم کے ہاں اس بے چارگی کا علاج افکارِ تازہ کی نمود سے ہے

ایک ہی طریقہ ہے: بند کھولیے بہایئے۔ لیکن بند کھولیے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ سیلاب کی طرح سرکش ہو جانے دیجیے۔ قرآن کی اقدار کے ساحلوں کے اندر اس کو بہنے دیجیے اس کو ندی بنا دیجیے۔ پھر وہی حرکت ہو گی پھر وہی حرارت ہو گی پھر وہی اس کے اندر روانیاں ہوں گی پھر وہ بجلیاں پیدا کرے گا۔ **ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَ الْمَسْكَنَةُ ۗ وَ بَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ** (2:61)۔ آپ نے غور کیا یہاں **بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ** (2:61) کہا ہے۔ اللہ کا غضب کس چیز کو کہا ہے؟ کسی قوم میں سکون اور حرکت کا معطل ہو جانا خدا کا غضب ہے اس قوم کے اوپر جس پہ یہ طاری ہو جائے۔ **ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ** (2:61)۔ کیوں یہ کچھ ہوا؟ **بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ** (2:61) سے یوں نظر آتا ہے جیسے غصہ چڑھ گیا۔ غضب کے معنی ہی ہمارے ہاں غصہ کر دیتے ہیں "اللہ میاں نوں آ گیا غصہ ہیں! "تمہاری یہ حرکتیں!"۔ قرآن ہے عزیزانِ من! کتاب کے ساتھ حکمت ہے The why of it ہے کہ کیوں ایسا ہوا ہے قدم قدم پہ بتا دیتا ہے تاکہ سننے والو! تمہیں معلوم ہو کہ ہم بھی ایسا نہ کریں ایسا کریں گے تو یہ ہو جائے گا۔ یہ کیوں ہوا؟ **بِمَا كَانُوْا** اس وجہ سے کہ **يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ** (2:61) قوانینِ خداوندی سے انکار اور سرکشی برتی۔ اس کا نتیجہ یہ ہو گیا۔

نبی کے متعلق یہودیوں کا تصور اور قرآن حکیم کا ارشاد

کہا ہے کہ وَ يَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ (2:61)۔ یہاں یہ ہے کہ انبیاء کو قتل کرتے تھے۔ ایک تو میں یہ عرض کر دوں کہ قرآنِ کریم میں نبی کا لفظ تو خاص اصطلاحی معنوں میں استعمال ہوتا ہے یعنی خدا کی طرف سے وحی پانے والا۔ یہودیوں کے لٹریچر میں ان کا جو ہیکل یا Temple (گرجا) تھا' ان کا جو معبد تھا' اس میں ایک منصب ہوتا تھا۔ وہ تھا نبی یعنی پیشین گوئیاں کرنے والے کا۔ یہ جو پیشین گوئیاں کرنے والا تھا اس کا جو منصب تھا اس کو وہاں نبی کہتے تھے۔ وہاں جو ان کے ہاں یہ لفظ تھا یہ نباء سے مشتق مانا جاتا تھا' اس کے معنی ہوتا ہے خبریں دینے والا' اسی وجہ سے یہ نبی کا لفظ عبرانی یا یہودی تصور کا ہے' انگریزی میں اس کا ترجمہ Prophet ہوا یعنی Prophecies کرنے والا۔ یہ ترجمہ بالکل غلط ہے۔ قرآن یہ لفظ یہاں سے نہیں لایا۔ یہ لفظ نبوۃ سے لایا ہے یعنی مقامِ بلند کے اوپر کھڑا' جس کی تفسیر حضورِ نبی اکرم ﷺ نے اپنی پہلی دعوت کے دن بتائی تھی۔

مقامِ نبوت اور اس کی طرف سے دعوت دینے کا طریق

عزیزانِ من! کیا بات ہے اسوۂ رسول اللہ ﷺ بھی جب سامنے آتا ہے تو آنکھوں میں چمک پیدا ہو جاتی ہے کہ نبی کا مقام کتنا بلند ہے۔ آپ ﷺ نے اس نئے پیغام کی دعوت دینی تھی' آپؐ کس انداز سے دعوت دیتے ہیں؟ سنیے! آپؐ ایک چھوٹی سی پہاڑی کی چوٹی پہ کھڑے ہو جاتے ہیں۔ عربوں کے قاعدے کے مطابق جب کوئی خطرہ آتا تھا تو ان کے ہاں قاعدہ تھا کہ اونچے مقام پہ کھڑے ہو کر کپڑے سے وہ اس طرح سے ہلا دیتے تھے کہ آؤ آؤ' یہ خطرے کا نشان ہے۔ بلانے کا نشان ان کے ہاں کپڑے کا ہوتا تھا۔ آپ ﷺ نے آواز دی' قوم میں امین اور صادق کے لفظ سے مشہور تھے یعنی سچ کہنے والا۔ قوم نیچے جمع ہو گئی۔ کہا کہ یہ بتاؤ کہ اگر میں تمہیں یہ کہوں کہ اس پہاڑی کی دوسری طرف ایک مہیب لشکر تمہاری تباہی کے لیے امڈے چلا آ رہا ہے تو تم اسے مانو گے؟ انہوں نے کہا کہ کیوں نہیں مانیں گے۔ انہوں ﷺ نے کہا کہ کیوں مانو گے؟ انہوں نے کہا کہ تم نے کبھی جھوٹ نہیں بولا' تم سچے ہو۔ کہا کہ یہ بات ٹھیک ہے لیکن اس میں ایک اور بات بھی ہے' میری پوزیشن تمہارے مقابلے میں ذرا Advantageous (فائدہ مند) ہے' تم وہاں دامن کوہ میں کھڑے ہو جہاں سے تم اِدھر کی بات تو دیکھ سکتے ہو' اُدھر کی نہیں دیکھ سکتے۔ میں اُس مقام پہ کھڑا ہوں جو ادھر کو بھی دیکھ سکتا ہوں اُدھر بھی میں دیکھ سکتا ہوں۔ نبی کا مقام یہ ہوتا ہے۔ بس اتنا فرق ہوتا ہے کہ اس کی آنکھ جب وحی کی طرف ہوتی ہے تو ان حقائق کو دیکھتا ہے کہ جو ان کے سامنے ابھی مشہود ہو کر نہیں آئے ہوئے ہوتے۔ پھر وہ یہ نہیں ہے کہ اسی نظارے کے اندر محو ہو کر وہاں غرق ہو جاتا ہے' مجذوب ہو جاتا ہے' پھر وہ اسے ادھر بھی دیکھنا ہوتا ہے کہ انہی حقائق کو ان حالات پہ منطبق کر کے اس کے اندر کس طرح تبدیلی پیدا کی جائے۔ یہ ہے مقامِ نبوت۔

قرآن نے نبی کا لفظ ان اصطلاحی معنوں میں استعمال کیا۔ جو خدا کے ہاں سے وحی پانے والا نہیں ہے اس کو قرآن کی رو سے نبی نہیں کہا جا سکتا۔ اور جو نبوت کا دعویٰ کرتا ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ خدا کی طرف سے وہ وحی پانے کا مدعی ہے۔ اور جو یہ کہا جائے کہ نہیں صاحب! یہ تو پیشین گوئیاں کرنے والا ہے' تو یہ یہودیوں کا تصور ہے' قرآن کا تصور نہیں ہے۔ برادرانِ عزیز! اسے ذہن میں رکھیے گا۔

یہودیوں کے ہاں اب یہ جو ہے کہ وَ یَقْتُلُوْنَ النَّبِیّٖنَ بِغَیْرِ الْحَقِّ (2:61) ہوسکتا ہے کہ ان معنوں میں بھی جو خدا کے انبیاء آتے ہوں' اور میں نے کہا تھا کہ قتل کے معنی ذبح' ان کے ہاں سچ مچ ذبح کر دینا ہی نہیں ہوتا' ذلیل کر دینا' کسی کو خوار کرنا' عزت نہ کرنا بھی ہوتے ہیں اور قتل کے معنی بھی ہوتے ہیں۔ اس لیے ہوسکتا ہے کہ وہ اپنے ہاں کے انبیاء کے ساتھ یہ کچھ کرتے ہوں۔ اور سچ مچ کے قتل کا تو پتہ نہیں' حضرتِ عیسیٰؑ کے ساتھ جو یہودیوں نے کیا' وہ انہوں نے اپنی طرف سے تو ان کو بہرحال قتل کر دیا تھا' صلیب پہ چڑھا ہی دیا تھا۔ جرم یہ ہے۔ کیا یہ بات قرآن نے کہی؟ کہا یہ کہ تمہاری اپنی کیفیت تو یہ ہے کہ اپنے اندر کوئی تبدیلی پیدا نہیں کرنا چاہتے۔ اور جو شخص آ کر تم سے یہ کہتا ہے کہ تمہاری حالت اتنی خراب ہو چکی ہے' اس کے اندر تبدیلی کی ضرورت ہے' اس کو لیتے ہؤاس کو بے عزت کرتے ہؤاس کو ذلیل کرتے ہؤاس کو خراب کرتے ہؤاس کی جان کے لاگو ہو جاتے ہؤاس کو قتل کر دیتے ہو۔ جس قوم کی اپنی حالت یہ ہو اور جو قوم کے اندر کوئی مصلح آئے اس کے ساتھ وہ یہ کچھ کرے تو آپ سوچیے تو سہی اس قوم کی ذلت اور مسکنت کے اندر پھر شبہہ کیا رہ جاتا ہے۔ پھر یہ بتایا وہ اس لیے کرتے تھے کہ ذٰلِکَ بِمَا عَصَوْا وَّ کَانُوْا یَعْتَدُوْنَ (2:61) قوانینِ خداوندی سے سرکشی اختیار کرتے تھے۔ یَعْتَدُوْنَ (2:61) وہ حدود فراموش ہو گئے تھے۔ آزادی بڑی نعمت ہے بشرطیکہ وہ حدودِ خداوندی کے اندر رہتے ہوئے آزادی ہو۔ اور جونہی آپ نے ان حدود کو بھی پھاندا تو پھر یہ جو چیز ہے یہ کفر ہو گئی' معصیت ہو گئی۔ یہ وہ چیز ہے جو ابِ ندی ساحلوں کے اندر بہتے ہوئے حیات بخش پانی کی حامل نہ رہی' سیلاب بن گئی جو تباہیاں مچاتا ہے۔ یہاں یَعْتَدُوْنَ (2:61) کہا ہے کہ حدود فراموش ہو گئے تھے۔

یہودیوں کے متعلق پایا جانے والا ایک غلط تصور اور اس کی حقیقت

وقت ہے تھوڑا سا لیکن اس میں ایک اہم بات نکلتی ہے۔ عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ صاحب! قرآن کریم نے کہا ہے کہ یہودیوں کو قیامت تک کے لیے حکومت نصیب نہیں ہوگی۔ اور یہ جو تفسیر ہمارے ہاں چلی ہے' چلتی آئی ہے' کہ یہ قیامت تک کے لیے ذلیل و خوار رہیں گے' محکوم رہیں گے' غلام رہیں گے' ان کی حکومت قائم نہیں ہوسکتی۔ اور اب جو یہ کیفیت پیدا ہوئی ہے کہ انہوں نے حکومت ہی قائم نہیں کی بلکہ ایسی حکومت قائم کی کہ یہ لوگ جو اس چیز کے متعلق دعویٰ کرتے چلے آ رہے تھے اور بدقسمتی کہ دعویٰ کرتے تھے' یہ کہہ کر کہ ہمارے خدا نے یہ کہا ہے کہ ان کی حکومت قائم نہیں ہوگی' اب یہ دعویٰ کرنے والوں کی ساری متحدہ قوتیں ان کو شکست نہیں دے سکیں۔ اب بیٹھے ہوئے ہیں' داڑھی کھجا رہے ہیں کہ یہ ہوا کیا؟ یہ سوال بڑا غور طلب ہے۔

آپ نے دیکھا کہ قومیں جب کھڑی ہو کر سوچتی نہیں ہیں' ایک بات جو کبھی کسی زمانے میں ہو جاتی ہے' اسی کو لے کر آگے چلتی رہتی ہیں' پھر زمانے کے تقاضے ان کو کس طرح مجبور کر دیتے ہیں کہ کھڑے ہو کر وہ سوچیں لیکن سوچنے کے بعد پھر مشکل یہ ہے کہ کوئی نئی بات کہتے ہیں تو جو کچھ اسلاف کہتے چلے آئے ہیں' ان کے خلاف جاتی ہے' وہ بھی نہیں کہہ سکتے۔ وہ کہتے نہیں ہیں تو ایک ایسا ٹھوس واقعہ ہے جس کی تردید نہیں ہو سکتی۔ یہ بھی مشکل ہے۔ او کیا ہوا پھر یہ؟ ''او جی ایویں ایویں ایویں ہے حکومت وکومت کوئی نہیں ہیگی' ایویں ای کوئی چار دن دی کھیڈ ہیگی اے میاں! تیل دیکھ تیل دی دھار دیکھ' دیکھ کل ہوندا کی ہیگا وے[1] ''۔ ان کی کیفیت یہ ہے کہ اس کے بعد آپ کے یہ جو سارے عرب ممالک ہیں' انہیں مل کر بھی شکست نہیں دے سکے۔ باقی مسلمانوں کی جتنی اقوام ہیں' سوائے اس کے کہ جمعہ میں دعا کرلیں' ان سے کچھ اور بن ہی نہیں پڑتا۔ اور اپنے آپ کو آنکھیں بند کر کے دھوکا یہ دیا جا رہا ہے کہ بلی چلی گئی ہے' نہیں! کوئی بات ہی نہیں ہے۔ عزیزانِ من! کھڑے ہو کر سوچتے تو بات صاف ظاہر ہو جاتی۔ اور کوئی ایسا مشکل مسئلہ نہیں ہے جس کے لیے کسی رازی[2] اور رومی[3] کی عقل کی ضرورت ہو۔ آپ سوچیے! کسی قوم کی کسی زمانے میں دو ہزار سال پہلے کسی نسل نے کوئی غلط کام کیے' کوئی جرائم کیے' ان جرائم کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس قوم کے ہاتھوں سے مملکت چھن گئی' یہ سب کچھ ہو گیا۔ کیا خدا کا قانونِ مکافاتِ عمل یہ ہے کہ دو ہزار سال کے بعد آنے والی جوان کی جنریشن ہے' وہ ان کے جرائم کی وجہ سے اسی طرح سے سزا کے اندر محبوس رکھی جائے؟ اس کا سوال ہی نہیں ہے۔ اگر یہی چیز ہے تو ہمارے بھی پہلوں نے جو جرم کیے' جن کی وجہ سے ہم اس ذلت کی حالت کے اندر ہیں' تو پھر تو وہ ٹھیک ہے' ہم بھی یہاں سے نہیں نکل سکتے۔

خدا کسی قوم کے عمل کو بھی نظر انداز نہیں کرتا

عزیزانِ من! ہر فرد کے عمل کا اپنا حساب ہے۔ قوم کا جو ایک زمانہ یا ایک نسل ہوتی ہے' اس میں جو کچھ وہ قوم کرتی ہے' اس کے نتائج مرتب ہوتے ہیں۔ اس کے بعد آنے والی نسلیں اگر ان جرائم کو ان چیزوں کو' چھوڑ دیتی ہے' جس کی وجہ سے ان میں ضعف پیدا ہوا تھا' ان کو ترک کر دیتی ہے' اس کے بعد وہ کردار اختیار کر لیتی ہے جس سے قوموں کے اندر تازہ زندگی' حرارتیں' صلاحیتیں ابھر آتی ہیں' کسی قوم یا نسل کے اوپر خدا دراز وے بند نہیں کر دیتا۔ عزیزانِ من! خدا کسی گروہ کا خدا نہیں ہے' وہ رب العالمین ہے' پوری نوعِ انسانی کا وہ خدا ہے۔ جو قوم جس وقت بھی اس کے قانون سے منہ موڑے گی' نتائج بھگتے گی۔ اسی کی اولاد' اسی کی نسل' جس وقت بھی ان قوانین کی طرف پھر سے آ جائے گی' اس کے خوشگوار نتائج اس کے سامنے آ جائیں گے۔

---

1. او جی! یہ کچھ یونہی سا ہے۔ حکومت کوئی نہیں ہوگی۔ بس یہی کوئی چار دن کا کھیل تماشا ہے میاں! تیل دیکھو تیل کی دھار دیکھو۔ دیکھ کل ہوتا کیا ہے۔
2. رازی' امام فخر الدین (543-606/1149-1209)
3. رومی' مولانا جلال الدین (604-672/1207-1273)

بنی اسرائیل کا جرم اور خود ساختہ عقیدہ: جنت صرف انہی کے لیے مخصوص ہے

بنی اسرائیل کی یہ حالت اس لیے ہوئی تھی کہ جن جرائم کی وجہ سے ان کے اندر یہ ضعف' ذلت اور مسکنت آئی تھی ان جرائم کو انہوں نے اپنے ہاں ماحصل بنالیا ہوا تھا۔ وہ انہیں اپنی خوبیاں گناتے تھے' اسی قسم کا رہنا چاہتے تھے۔ قرآن نے یہ کہا ہے کہ جب تک یہ ان چیزوں کو ماحصل بنائے رکھیں گے' ان خوبیوں پہ اتراتے رہیں گے' اپنے اسلاف کی روش کے اوپر جانے کے لیے فخر محسوس کریں گے۔ اور اس کے بعد عقیدہ ان کا یہ تھا کہ ہم خدا کی چہیتی اولاد ہیں نَحۡنُ اَبۡنٰٓـؤُا اللّٰهِ (5:18)' خدا کی اولاد ہیں' بڑی چہیتی اولاد ہیں۔ او! یہ تمہارے ساتھ ہو کیا رہا ہے؟ کہ جی ہمارے لیے عاقبت کی جنت ہے۔ اچھا جی!!۔ لَنۡ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعۡدُوۡدَةً (2:80) کہ وہ جو کچھ دن ہم نے وہ سامری کے گؤ سالے کی پرستش کر لی تھی بس اس کے لیے ہم چند دنوں کے لیے جہنم میں بھیج دیئے جائیں گے' باقی ہمارے علاوہ کوئی دوسرا جنت میں جا ہی نہیں سکتا' صاحب! سیدھی سی بات ہے۔ وہ ہم نے تو Allot (الاٹ) کرا رکھی ہے۔

برادرانِ عزیز! یہ عقیدہ متوارث چلا آ رہا تھا کہ ہم چہیتی اولاد ہیں' کچھ بھی کریں جنت ہمارے لیے مختص ہے' عمل کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ میں جب ان آیات پہ آؤں گا جب انہوں نے یہ کہا تھا کہ جنت ہمارے لیے مختص ہے' وہاں ان کی بڑی دلچسپ باتیں سامنے آئیں گی۔ ان کے ہاں یہ عقیدہ تھا۔ یہاں قرآن نے یہ کہا ہے کہ جو قوم بھی اس قسم کا عقیدہ رکھے گی کہ ہم خدا کی چہیتی اولاد ہیں' ہمارے سوا کوئی جنت میں جا ہی نہیں سکتا' ہم کچھ کریں یا نہ کریں' ہمارے لیے تو وہ الاٹ ہو چکی ہوئی ہے' قرآن کہتا ہے کہ جب تک کوئی قوم یہ عقائد اپنے ذہنوں کے اندر رکھے گی ذلت و مسکنت کی مار ان کے اوپر ماری جائے گی۔ جونہی انہوں نے اس تصورِ باطل کو بدلا اور یہ دیکھا کہ نہیں! یہ ذلت و مسکنت اور عروج و زوال جو چیزیں بھی ہیں خدا کے قوانین کی پابندی اور سرکشی سے یہ نتائج مرتب ہوتے ہیں' جب بھی کسی قوم نے اپنے ذہن کے اندر یہ تبدیلی پیدا کر لی' اس کے عمل کے اندر تبدیلی پیدا ہوگئی اور جب عمل کے اندر تبدیلی ہوگی تو اس کا نتیجہ وہ ہوگا۔ سوال ہی نہیں ہے کہ خدا کسی قوم کو صحیح نتائج سے اس لیے محروم کر دے کہ دو ہزار سال پہلے ان کی کسی جنریشن نے غلط کام کیے تھے۔ خدا کا قانونِ مکافاتِ عمل اس کے خلاف جاتا ہے۔

نظریات و تصورات بدلے بغیر انسانوں کی خارجی دنیا میں تبدیلی ممکن ہی نہیں

عزیزانِ من! یہ ہے وہ چیز جو قرآن نے کہی تھی۔ اس کے لیے سورۃ آل عمران کی آیت 112 ہے۔ میں آگے ان مقامات کے اوپر آؤنگا تو اور زیادہ تشریح کرونگا۔ یہاں بھی وہی الفاظ ہیں کہ ضُرِبَتۡ عَلَيۡهِمُ الذِّلَّةُ اَيۡنَ مَا ثُقِفُوۡۤا (3:112) ان حالات میں ان نظریات' تصورات اور اعتقادات کو لیے ہوئے یہ جہاں بھی جائیں گے' وہاں ان کی یہی حالت ہوگی۔ کیسی بات کہی ہے؟ قرآن نے کہا

ہے کہ ماحول کے بدل دینے سے، ملک کے بدل دینے سے، ان کی حالت میں تبدیلی نہیں آئے گی اس لیے کہ یہ ذہنوں کے صنم کدوں کو تو اسی طرح ساتھ لے کر جائیں گے۔ کیا بات قرآن نے کہی ہے کہ اَیۡنَ مَا ثُقِفُوۡۤا (3:112) ان تصورات کو لے کر محض تبدیلیٔ مساکن سے، تبدیلیٔ ممالک سے، تبدیلیٔ آب وہوا سے، کچھ فرق نہیں پڑے گا۔ ہاں! تبدیلی کی ایک شکل ہے کہ اِلَّا بِحَبۡلٍ مِّنَ اللّٰہِ وَ حَبۡلٍ مِّنَ النَّاسِ (3:112) ایسی صورت ہو سکتی ہے کہ کبھی کوئی قوم ان کو سہارا دیدے اور اس کی بنا پر یہ سنبھل جائیں۔ کچھ وقت کے لیے ایسا بھی ہو سکتا ہے لیکن اصل چیز یہ حَبۡلٍ مِّنَ اللّٰہِ (3:112) ہے یہ جو قانونِ خداوندی ہے، اس کی رسی کو تھام کر جب یہ اٹھ کھڑے ہوں گے تو پھر یہ جو ان کی چیز ہے، بدل جائے گی۔

کائنات کا ایک ایک گوشہ کافر اور مومن کے لیے برابر نشو ونما کا حامل ہے

قرآن تو خود یہ کہتا ہے کہ قوموں کے سنبھلنے کی یہ دو صورتیں ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ دوسری قوموں کے سہارے سے عارضی اور وقتی طور پر قوم سنبھل جاتی ہے۔ یہ حَبۡلٍ مِّنَ النَّاسِ (3:112) کے سہارے کے اوپر ہے جو ہم آج کھڑے ہیں۔ یہ پائیدار سہارے نہیں ہوتے، ان سے وقتی طور پہ سنبھل سکتے ہیں۔ اس قوم نے یہ کیا: پہلے تو واقعی دوسری قوموں نے سہارا دے کر ان کو اٹھایا، اس کے بعد دوسری صورت حَبۡلٍ مِّنَ اللّٰہِ ہے انہوں نے خود وہاں طبعی قوانینِ خداوندی کی اطاعت شروع کر دی۔ اس کا نتیجہ جو لوگ وہاں گئے ہیں، وہ بتاتے ہیں کہ ان کی حد سے ذرا ادھر کھڑے ہوئے، وہ گیارہ لاکھ کے قریب مہاجر، پناہ گزیں عرب ہیں۔ اس زمانے میں جو ان کو خرید کر ٹینٹ اور خیمے دیئے ہیں، پتہ نہیں کوئی بیس تیس سال ہو گئے، وہ ان کے اندر زندگی گزار رہے ہیں۔ وہ سردی ہو، گرمی ہو، بارش ہو، وہ انہی پھٹے ہوئے چیتھڑے اڑے ہوئے ٹینٹوں میں ہیں۔ اور ان سے آگے چل کر دیکھیں کہ انہوں نے اپنا یہ سارا علاقہ جنت نظیر بنا دیا ہے۔ یہ طبعی قوانین خداوندی کے اتباع کا نتیجہ ہے۔

عزیزانِ من! حَبۡلٍ مِّنَ اللّٰہِ (3:112) کے معنی صرف اقدارِ خداوندی کا وہ حصہ نہیں جو انسانی زندگی کے لیے ہے، یہ جو Physical Laws (طبعی قوانین) ہیں یہ بھی ان کا ایک حصہ ہیں، ان کی اطاعت کا نتیجہ یہ زمینوں سے رزق حاصل کرنا، پانیوں سے بجلیاں بنانا، پہاڑوں کے سینے شق کر دینا ہے۔ یہ تمام چیزیں جو قوم کرتی چلی جائے گی اس کے طبعی نتائج اس کے سامنے آتے چلے جائیں گے۔ یہ سوال ہی نہیں ہے کہ یہ کچھ کرنے والا کافر ہے یا مومن ہے۔ Injection (ٹیکا) اگر آپ مسلمان ڈاکٹر کے ہاتھ سے لگوائیں گے یا ہندو کے ہاتھ سے لگوائیں گے، وہ دوائی تو اپنا اثر اسی طرح سے کرے گی۔

کائنات کی قوتوں کو مسخر کرنا اور انہیں نوعِ انسانی کی منفعت کے لیے صرف کرنے کا نام اسلام ہے

برادرانِ عزیز! حَبۡلٍ مِّنَ اللّٰهِ (3:112) کا ایک حصہ یہ طبعی قوانین خداوندی ہے۔ اس میں، جیسا کہ میں نے کئی دفعہ کہا ہے، کفر بھی اپنے نتائج رکھتا ہے گو یہ نتائج پائیدار نہیں ہوتے۔ ان سے معاشرے کے اندر سکون اور قلب کے اندر اطمینان کی کیفیت نہیں ہوتی، انسانیت نہیں ابھرتی، صحیح صلاحیتیں نشو ونما نہیں پاتیں۔ طبعی زندگی کے اندر یہ سارا انقلاب آ جاتا ہے۔ اور اگر حبل من اللہ میں مستقل اقدار خداوندی یعنی وحی کی راہنمائی بھی ساتھ شامل کر لی جائے تو پھر آپ دیکھیے کہ جسے آپ اٰتِنَا فِی الدُّنۡیَا حَسَنَةً وَّ فِی الۡاٰخِرَةِ حَسَنَةً (2:201) کہتے ہیں، پھر وہ چیز بھی ہوتی ہے۔ ان مستقل اقدار خداوندی سے پھر یہ طبعی زندگی بھی خوشگوار ہو جاتی ہے اور انسانوں کی انسانی زندگی بھی طیّب ہو جاتی ہے۔ قرآن نے خود یہ بتایا ہے کہ ان یہودیوں کے بچ جانے کا یہ طریقہ ہے کہ یا تو کوئی قوم ان کو کبھی سہارا دیدے، یہ وقتی طور پہ اٹھ کھڑے ہوں اور پھر اگر انہوں نے قوانینِ خداوندی کا اتباع شروع کیا تو یہ قوم اپنے پاؤں پہ کھڑی ہو جائے گی۔ آپ دیکھیے گا کہ کس طرح سے قرآن کہتا ہے کہ یہ بات نہیں ہے کہ دو ہزار سال پیشتر کسی قوم کی پہلی جنریشن نے کچھ غلط کام کیے تو ان کی وجہ سے تو وہ ہر قسم کی جدوجہد کے صحیح نتائج سے متمتع ہونے سے ابدی طور پر محروم کر دی گئی۔ خدا کا قانون یہ نہیں ہے۔

ہم سورۃ البقرۃ کی آیت 61 تک آ گئے۔ 62 ویں آیت میں ایک عظیم حقیقت سامنے آتی ہے۔ یہ ایسی آیت ہے کہ جس میں کہا گیا کہ اسی قرآن کے غلط مفہوم سے بہت سے دماغ بے راہرو ہو جاتے ہیں یعنی یُضِلُّ بِهٖ کَثِیۡرًا وَّیَهۡدِیۡ بِهٖ کَثِیۡرًا (2:26) یہ ہے وہ آیت۔ یہ آگے آئے گی، جس کا غلط مفہوم لینے سے اتنی زیادہ گمراہیاں پھیلائی جاتی ہیں، پھیلتی ہیں کہ جن کا کوئی حساب ہی نہیں ہے۔ یہ چیز کہ اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ الَّذِیۡنَ هَادُوۡا وَ النَّصٰرٰی وَ الصّٰبِئِیۡنَ مَنۡ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَ عَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمۡ اَجۡرُهُمۡ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ وَلَا خَوۡفٌ عَلَیۡهِمۡ وَلَا هُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ (2:62)۔ یہ آیت میں اگلے درس میں لوں گا اور بتاؤں گا کہ اس کا جو غلط مفہوم ہے وہ کیا تباہیاں پیدا کرتا ہے اور اس کا صحیح مفہوم کس طرح قرآن کی صحیح تعلیم کو سامنے لاتا ہے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ

❀......❀......❀

بیسواں باب: سورة البقرة (1)' (آیت 62: کیا اسلام بھی ایک مذہب ہے؟)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰی وَالصّٰبِـِٕیْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ۝۶۲

عزیزانِ من! آج اکتوبر 1968ء کی 27 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کے سلسلۂ نو میں آج سورۃ البقرۃ کی 62 ویں آیت ہمارے سامنے ہے: (2:62)۔

ایک اہم آیت کے غلط مفہوم کا ازالہ

جیسا کہ میں نے سابقہ درس کے اختتام پر عرض کیا تھا' یہ آیت اس اعتبار سے بڑی اہم ہے کہ اس کے غلط مفہوم سے یوں کہیے کہ اسلام کا کچھ بھی باقی نہیں رہتا۔ اور یہ غلط مفہوم ایک عرصہ سے چلا آ رہا ہے۔ اس لیے اس کے صحیح مفہوم کا سمجھنا بڑا ہی ضروری ہے۔ آیت یہ ہے کہ اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ الَّذِیْنَ هَادُوْا وَ النَّصٰرٰی وَ الصّٰبِئِیْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَ عَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَ لَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَ لَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ (2:62)۔ یہ بات عام طور پر سنتے چلے آ رہے ہونگے کہ دنیا میں مختلف مذاہب ہیں اور مذاہب میں شروع سے جنگ وجدل چلی آ رہی ہے۔ جتنی خوں ریزیاں اور فساد انگیزیاں مذہب کے نام پر ہوئی ہیں' دنیا میں کسی اور Cause (وجہ) کے نام پر یہ کچھ نہیں ہوا۔ اس صورتِ حال سے تنگ آ کر پھر بعض ذہن بلبلا اٹھتے ہیں کہ صاحب! مذاہب بالآخر اپنے اپنے وقت میں خدا ہی کی طرف سے آئے تھے بجز ایک آدھ کے۔ ہر مذہب کا یہی دعویٰ ہے کہ وہ خدا کی طرف سے آیا تھا۔ جب یہ صورت ہے تو اسے تسلیم کر لینا چاہیے کہ تمام مذاہب اپنی اپنی جگہ سچے ہیں۔ یہ ساری خرابیاں' یہ ساری سر پھٹول' یہ جنگ وجدل' اس بات کا نتیجہ ہے کہ ہر مذہب یہ دعویٰ کرتا ہے کہ میں ہی سچا مذہب ہوں' کوئی دوسرا مذہب سچا نہیں ہے۔ اور اس دعویٰ کرنے میں

کیونکہ اسلام پیش پیش ہے' اس لیے سب سے بڑا اعتراض خود مسلمانوں کے خلاف ہوتا ہے کہ ان کی بھی یہی کیفیت ہے۔ اور اتفاق یہ ہے کہ مذاہب کے سلسلے میں یہ آخری مذہب ہے' اس لیے جب یہ دعویٰ کرتا ہے کہ سچا مذہب یہی ہے' کوئی دوسرا مذہب سچا نہیں ہے تو کہا جاتا ہے کہ اپنے ہی مذہب کو سچا کہنا اور باقی مذاہب کے متعلق یہ کہنا کہ ان میں سچائی نہیں ہے' بڑی ہی تنگ نظری ہے۔ وسعتِ ظرف کا تقاضا یہ ہے کہ ہر ایک کے متعلق کہا جائے کہ اس میں سچائی ہے۔

اخلاقی طور پر اچھی اچھی باتیں یک جا کرتے ہوئے ایک نیا مذہب بنانے کی کوشش

پھر بعض ذہن اس سے آگے بھی بڑھے' انہوں نے کہا کہ یہ مختلف مذاہب کی جو الگ الگ شناختیں ہیں' ان کی الگ الگ تصریح ہے' اس کو ختم کر دینا چاہیے۔ ان میں جتنے Common Denominators (مشترک باتیں) ہیں' وہ بڑی اچھی اخلاقی باتیں ہیں' ان کو ایک جگہ اکٹھا کر لینا چاہیے اور اس کا نام سچا مذہب رکھنا چاہیے۔ وہ اخلاقی باتیں قریباً قریباً تمام مذاہب میں یکساں ہیں مثلاً جھوٹ نہ بولو' چوری نہ کرو' کسی کو فریب نہ دو' ظلم نہ کرو' استبداد نہ کرو' کسی کو ستاؤ نہیں وغیرہ وغیرہ۔ یہ اس قسم کے جتنے اخلاقی محاصل ہیں' وہ تمام مذاہب میں مشترک طور پر موجود ہیں' ان کو کیوں نہ ایک جگہ اکٹھا کر لیا جائے اور اس کا نام سچا مذہب رکھ لیا جائے۔ چنانچہ ہندوستان میں اس پہ عملاً پہلے اکبر (1542-1605ء) نے تجربہ [1] کرنا چاہا' اس کے دینِ الٰہی کے پیچھے جذبۂ محرکہ یہی تھا۔ اگرچہ اس میں بعض چیزیں اور بھی تھیں' میں اس وقت ان پہ بحث نہیں کرنا چاہتا لیکن بنیادی جذبہ یہی تھا۔ اس کے بعد داراشکوہ (1615-1659ء) نے بھی اس آواز [2] کو اٹھایا۔ چونکہ داراشکوہ (1615-1659ء) تصوف کا شدت سے قائل تھا اس لیے اس نے یوں کہیے کہ ہندی تصوف کی بنیاد ہی اس پہ رکھی کہ رام بھی وہی ہے' رحیم بھی وہی ہے۔ اس نے یہ خیال عام کیا۔ آپ کو معلوم ہے کہ ہندوستان میں یہ کبیر' پنکھیے' سورداسیے [3] حتیٰ کہ ابتدا میں گرونانک بھی اسی کے پرچارک تھے۔ یہ سارے فقیر منش لوگ اسی خیال کو لے کر اٹھے تھے۔ وہ اور ان کے چیلے عام فہم زبان میں کوتیاں (اشعار) سناتے اور گیت گاتے۔ ان سب کا مقصد یہی تھا کہ بھئی! یہ رام اور رحیم ایک ہی ہے' ان کی تفریق پہ آپس میں خوں ریزیاں کرنا کوئی انسانیت نہیں ہے۔ اپنے اپنے طور پہ نیچے سے اوپر تک' کوئی رام کو بھجے' کوئی رحیم کی پوجا پرستش کر لے' کوئی مندر میں چلا جائے' کوئی مسجد میں چلا جائے' ان چیزوں کے اوپر تو سر پھٹول نہیں ہونا چاہیے' اس لیے کفر اور اسلام میں کوئی فرق نہیں۔ ان کا

---

[1] اسی لیے شاہنشاہ اکبر (1542-1605ء) نے مہابھارت' رامائن اور اسی نوع کی دیگر سنسکرت کی کتابوں کا فارسی میں ترجمہ کرایا۔

[2] داراشکوہ نے بنارس کے پنڈتوں کی مدد سے اپنشدوں کا ترجمہ فارسی زبان میں کرایا اور اس کا نام سترا کبر رکھا۔ وہ اس کے مقدمہ میں لکھتا ہے کہ قرآنِ کریم میں جس ''کتاب مکنون'' کا ذکر آیا ہے وہ اُپنشد ہیں۔ اس نے یوگ بششٹ کا فارسی ترجمہ' منہاج السالکین کے نام سے کرایا۔ ان کتابوں میں وحدۃ الوجود کا فلسفہ (تصوف) اس کی شدید ترین شکل میں بیان کیا گیا ہے۔ (پرویزؒ: تصوف کی حقیقت' 1992' ص۔ 87)۔

[3] یہ ان ناموں کی طرف اشارہ ہے: بھگت سورداس' گووندداس' بھگت کبیر' میراں بائی۔

مسلک' بھگت کبیر (1518-1440ء) کے الفاظ میں یہ ہے کہ

گنگا ایک گھاٹ بہترے

کہت کبیر عقل کے پھیرے

آپ نے دیکھا کہ تصوف کی بنیاد ہمیشہ تشبیہات پہ ہوتی ہے اور تشبیہہ ان کی ایسی چپک جانے والی ہوتی ہے کہ اس کے بعد کوئی منطقی توجیہہ باقی نہیں رہتی۔ کہا کہ ''گنگا ایک' گھاٹ بہترے''۔ یہ کتنی صحیح بات نظر آتی ہے کہ گھاٹ کے اختلافات کے اوپر گنگا کا اختلاف ذہن میں لے آنا تو بڑی نامعقول سی بات ہے۔ یہ جتنے پنگھ تھے' یہ جتنے سادھو' سنیاسی تھے' جوننگ دھڑنگ رہتے' بھنگ پیتے' چرس کے دم لگاتے' اکتارے بجاتے' کھڑتالیں پیٹتے تھے' اور اِدھر ہمارے ہاں یہ فقیر منش لوگ' یہ سارے اسی خیال کو لے کر آگے بڑھے۔ اس سے اور آگے بڑھے تو ہمارے ہاں برہموسماجی فرقہ (1830ء) پیدا ہوا۔ (اس کے بانی) راجہ رام موہن رائے نے بھی یہی خیال عام کیا کہ مختلف مذاہب کی جو سچائیاں' اخلاقی اقدار ہیں' ان کو اکٹھا کیا جائے چنانچہ ان کے ہاں یہ تھا کہ کسی مذہب کے رسول یا کتاب کو ماننا ضروری نہیں ہے بلکہ ماننا ہی نہیں چاہیے۔ وہ کہتے تھے کہ اسی سے اختلافات پیدا ہوتے ہیں۔ نیک عملی کی زندگی ہو' خدا کو مان لیا جائے' بس یہ نجات کے لیے کافی ہے۔ لیکن یہ چیزیں آگے نہیں بڑھیں' تا آنکہ ہمارے ہاں پچھلے سیاسی دور میں اس نے ایک خاص سیاسی رنگ اختیار کر لیا۔

برادرانِ عزیز! تحریکِ پاکستان میں اور اس سے پہلے علامہ اقبالؒ (1938-1877ء) نے جب یہ تصور دیا تھا کہ مسلمان اپنے دین کی بنیادوں پر ایک الگ قومیت رکھتے ہیں' تو یہ چیز ہندوؤں کے دل میں خارِ مغیلاں بن کر کھٹکی اور وہاں سے یہ خیال پیدا ہوا کہ یہ جو الگ مذہب کا تصور ہے اور تصور بھی یہ ہے کہ مسلمانوں کے ذہن میں یہ خیال ہے کہ ان کا مذہب دیگر مذاہب سے افضل ہے' جب تک یہ خیال ان مسلمانوں کے دل سے نہ نکالا جائے' یہ الگ جداگانہ قومیت کا تصور بر بنائے آئیڈیالوجی' ان کے ذہن سے محو نہیں ہو سکتا۔ یہ تھی اس چیز کی وہ سیاسی بنیاد جس بنا پر کہا کہ پھر اس قسم کی تبلیغ کی جائے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ اس تبلیغ میں نظر بظاہر کس قدر معصومیت نظر آتی ہے۔ مہاتما گاندھی (1948-1869ء) نے اس تبلیغ کو عام کیا کہ صاحب! مذاہب کی آپس کی یہ جنگ وجدل کاہے کے لیے ہو؟ اس کی بنیاد یہ ہے کہ ذہن میں یہ ڈال دیا جاتا ہے کہ صاحب! ہمارا مذہب سچا ہے' دوسرا مذہب سچا نہیں ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہم ہندو تو اپنے بچوں کو یہ نہیں سکھاتے' یہ مسلمان بچپن سے ہی اپنے بچوں کے ذہن میں یہ بات ڈال دیتے ہیں کہ سچا' افضل مذہب اسلام ہی ہے' دوسرا مذہب نہیں ہے۔ اس لیے یہاں بچوں کی تعلیم ایسی ہونی چاہیے کہ جس میں ان مذہبی تفریقات کو الگ کر کے انہیں سمجھایا یہ جائے کہ تمام مذاہب اپنی اپنی جگہ یکساں طور پر سچے ہیں' کسی ایک کو دوسرے پر کسی قسم کی فوقیت اور افضلیت حاصل نہیں ہے۔

ہندوؤں کے مذہبی تصور کی آبیاری کرنے کے سلسلہ میں ابوکلام آزادؒ کی قرآنی تفسیر

ظاہر ہے کہ ایک ہندو کی زبان سے جب یہ بات نکلے تو مسلمان تو اس کو Accept (قبول) کرنے کے لیے تیار نہیں ہو سکتے تھے'

نہ ہی وہ بات مؤثر ثابت ہوسکتی تھی۔ اس کے لیے ضرورت تھی کہ کسی مسلمان کی طرف سے یہ بات آئے۔ اور یہ خدمت ہمارے ہاں اس دور کے امام الہند (احمد محی الدین) مولانا ابوالکلام آزاد صاحب (1958-1888ء) نے سرانجام دی۔ انہوں نے اپنی تفسیر ''ترجمان القرآن'' لکھی۔ اس تفسیر کی ابتدا میں انہوں نے سورۃ الفاتحۃ کی تفسیر لکھی گو کہ ''ترجمان القرآن'' تفسیر نہیں ہے وہ تو ترجمہ ہے' کچھ اس کے ساتھ تشریحی نوٹس ہیں۔ اس تفسیر کی ابتدا میں انہوں نے سورۃ الفاتحۃ کی ایک بڑی مبسوط تفصیلی تفسیر لکھی تھی اور اس تفسیر میں انہوں نے اس تفسیر کا عمودی نکتہ یہ لکھا تھا کہ یہ بتایا جائے کہ کسی مذہب کو دوسرے مذہب پر کوئی فوقیت نہیں ہے' تمام مذاہب یکساں طور پر سچے ہیں۔ یہ تفسیر (پہلی مرتبہ) 1931ء یا (1932ء) میں شائع ہوئی تھی۔ پھر وہ ''میں'' والی بات آ جاتی ہے لیکن بعض اوقات ناگزیر ہو جاتی ہے۔ دور وہ تھا جب ابوالکلام آزاد (1958-1888ء) قلم کا سلطان اور کلام کا شہنشاہ مانا جاتا تھا۔ ان کے علم کی بڑی دھاک تھی۔ اس تفسیر کا قریباً پچیس تیس برس سے ولولہ چلا آ رہا تھا' لوگوں کو اس کا بڑا انتظار تھا' بڑے ہی انتظار کے زمانے میں وہ شائع ہوئی تھی' لوگوں نے اس کو سر آنکھوں پر لیا۔ اور یہ تفسیر ہندوستان میں عام ہونی شروع ہوگئی۔

1933 میں اس تفسیر کے خلاف پرویزؒ کا لکھا جانے والا پہلا تنقیدی مضمون

اس نکتے کے خلاف کسی شخص نے کچھ نہیں کہا تھا کہ تمام مذاہب میں عالمگیر سچائیاں یکساں طور پر موجود ہیں۔ میں بطور تحدیثِ نعمت عرض کرونگا کہ یہ سعادت اسی فقیر کے حصے میں آئی' صرف میرا پہلا مضمون تھا جو اس کے خلاف جنوری 1933ء کے معارف ❶ میں شائع ہوا۔ میرا یہ مضمون اس تفسیر کے اوپر تنقید تھی جو شائع ہوئی تھی۔ اللہ تعالیٰ کا یہ فضل تھا کہ اس ایک تنقید نے تاریخ کے دھارے کا رخ موڑ دیا۔ اور وہ ہندوستان کے اندر جتنا اثر پیدا کرنا چاہتے تھے اس کی وجہ سے وہ سارا وہیں کا وہیں رک گیا۔ مہاتما گاندھی (1948-1869ء) کی واردا کی تعلیمی اسکیم جسے ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب نے مرتب فرمایا تھا' جو آج کل وہاں کے صدر ❷ ہیں اور جس کا بنیادی نکتہ یہی تفسیر تھی' وہ اسکیم فیل ہوئی ❸۔ اس کی بنیادوں پر جو نصاب (Curricula) مرتب ہوا تھا وہ انہیں بمبئی کے ساحل پر سمندر میں ڈبونا پڑا۔ اور ہندوستان میں یہ خیال آئندہ کے لیے ختم ہوا۔ وہ جو تفسیر تھی' اس میں انہوں نے لکھا یہ ہے اور وہ اب موجود ہے' یہاں بھی اس کے ایڈیشن بعد میں چھپے' کہ قرآن نے نوعِ انسانی کے سامنے مذہب کی عالمگیر سچائی کا اصول پیش کیا۔ اس نے نہ صرف یہی بتلایا کہ ہر مذہب میں

---

❶ ہندوستان کا معروف علمی مجلّہ

❷ یاد رہے یہ بات اکتوبر 1968ء کی 27 تاریخ کو کہی گئی تھی۔

❸ طلوعِ اسلام کی اگست 1938ء کی اشاعت میں' اس اسکیم کے خلاف چالیس صفحات پر مشتمل ایک بھرپور مضمون شائع ہوا' جس نے ملک میں دھوم مچا دی۔ اس تنقید کی مقبولیت کا اندازہ اس سے لگایئے کہ یہ الگ پمفلٹ کی شکل میں چھ مختلف زبانوں میں' ہزارہا کی تعداد میں' شائع ہوا۔ نتیجہ یہ کہ واردھا کی اسکیم' معہ اس کے نصاب کے' غرقِ مئے ناب ہوگئی اور یوں مسلمانوں کی قوم اس عظیم خطرہ سے محفوظ ہوگئی۔

سچائی ہے بلکہ صاف صاف کہہ دیا کہ تمام مذاہب سچے ہیں۔اس نے کہا ہے کہ دین خدا کی عام بخشش ہے‘اس لیے ممکن نہیں کہ کسی ایک قوم اور جماعت کو دیا گیا ہو اور دوسروں کو اس میں سے کوئی حصہ نہ ملا ہو۔ٹھیک ہے۔میں آگے چل کر عرض کرونگا کہ اس میں مغالطہ کہاں ڈالا جارہا ہے۔اس نے یہ بتایا ہے کہ تمہاری مذہب کی گروہ بندیوں کے اور ان کے انسانی نجات وسعادت کے ظواہر ورسوم میں کوئی فرق نہیں‘ یہ گروہ بندیاں تمہاری اپنی بنائی ہوئی ہیں ورنہ خدا کا ٹھہرایا ہوا دین تو ایک ہی ہے۔

وہ دینِ حقیقی کیا ہے؟ وہ کہتا ہے کہ یہ ایک خدا کی پرستش اور نیک عملی کی زندگی ہے۔جو انسان بھی ایمان اور نیک عملی کی راہ اختیار کرے گا اس کے لیے نجات ہے خواہ وہ تمہاری گروہ بندیوں میں داخل ہو یا نہ ہو۔اس نے صاف صاف لفظوں میں اعلان کر دیا کہ اس کی دعوت کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ تمام مذاہب اپنی مشترک اور متفقہ سچائی پر جمع ہو جائیں۔وہ کہتا ہے کہ تمام مذاہب سچے ہیں لیکن کاروانِ مذاہب سچائی سے منحرف ہوگئے ہیں۔اگر وہ اپنی فراموش کردہ سچائی کو از سرِ نو اختیار کرلیں تو میرا کام پورا ہوگیا‘انہوں نے مجھے قبول کرلیا۔تمام مذاہب کی مشترک اور متفقہ سچائی یہی ہے جسے وہ الدین اور الاسلام کے نام سے پکارتا ہے۔دوسرے مقام پہ انہوں نے لکھا ہے کہ قرآن کہتا ہے کہ یہ اعمال ورسوم نہ تو اصل وحقیقت ہیں‘ نہ ان کا اختلاف حق وباطل کا اختلاف ہے‘ یہ محض مذہب کی عملی زندگی کا ظاہری ڈھانچہ ہے لیکن روحِ حقیقت ان سے بالاتر ہے اور وہی اصلِ دین ہے۔

یہ اصلِ دین کیا ہے؟ اس کے لیے وہ یہ کہتا ہے کہ یہ ایک خدا کی پرستش اور نیک عملی کی زندگی ہے۔یہ کسی ایک گروہ کی میراث نہیں ہے کہ اس کے سوا کسی انسان کو نہ ملی ہو۔اصل فقرہ یہ ہے کہ وہ تمام مذاہب میں یکساں طور پر موجود ہے۔دنیا میں جتنے مذاہب بھی موجود ہیں ان میں یہ دین اپنی حقیقی شکل میں موجود ہے اس لیے تمام مذاہب سچے ہیں۔ان کے ماننے والے اس کی تعلیم سے منحرف ہوگئے ہیں اور اس کا ہر ایک کو اقرار ہوتا ہے۔اگر وہ اپنے اپنے مذہب کی ان سچائیوں کے اوپر عمل پیرا ہو جائیں تو پھر وہ کہتا ہے کہ اسلام کہتا ہے کہ میرا کام ہوگیا۔یعنی اسلام آیا اسی لیے تھا کہ وہ تمام اہلِ مذاہب سے یہ کہے کہ اپنے اپنے طریقے پہ‘ اپنے اپنے طور پر‘ جس طرح بھی تم خدا کو مانتے ہو‘ جو جو چیزیں بھی تم اپنے ہاں نیکی کی سمجھتے ہو‘ ان کے اوپر تم عمل کرلو تو میرا کام ہوگیا۔

مولانا ابوکلام آزاد مرحوم کی قرآنی تفسیر کی سیاسی اہمیت کے پیشِ نظر اس کے تراجم

آپ نے دیکھا کہ یہ وہی چیز کس انداز سے پیش کی گئی‘ اس کی سیاسی اہمیت کا اندازہ اس سے لگائیے کہ ان کی تفسیر کے اس حصے کا کانگریس نے ہندی اور گجراتی زبان میں ترجمہ کرایا تھا اور سارے ہندوستان میں اس کی عام اشاعت کی گئی تھی۔جو حضرات اس زمانے سے تحریکِ پاکستان سے دلچسپی رکھتے ہیں‘ انہیں یاد ہوگا۔یہ واقعات ان کے سامنے رونما ہوئے تھے۔یہاں ہندوستان کے اندر اس تحریک

کے متعلق یہ کچھ ہو رہا تھا۔ اور میں یہاں یہ عرض کردوں کہ اصل بات یہ تھی کہ مولانا آزادؒ (1888-1958ء) کو زندگی کے اس دور میں آ کر خود اسلام کے مستقبل کی طرف سے مایوسی ہو چکی تھی۔ اور میں یہ چیز ایک شخص کی موت کے بعد الزام کے طور پہ عائد نہیں کرتا' ان کی کتاب India Wins Freedom (آزادیِ ہند)' جو ان کی آخری کتاب ہے اور ان کی وفات کے بعد شائع ہوئی ہے' اس کے آخر میں صاف الفاظ میں وہ شخص لکھتا ہے کہ اسلام نے درحقیقت دین کی بنیادوں پر ایک قومیت تشکیل کرنے کا تجربہ کیا تھا' یہ تجربہ بری طرح سے ناکام ثابت ہوا' اس لیے اب اس کو دہرانا حماقت ہے۔ کتاب موجود ہے اس میں یہ الفاظ موجود ہیں۔ تو یہ وہ چیز ہے جو وہ شخص اپنے مرنے کے قریب کہہ کر چلا گیا۔ نظر آتا ہے کہ اس شخص کو اسلام کے متعلق یہ یقین ہی نہیں رہا تھا۔ جب یہ چیز باقی نہ رہے تو پھر یہ چیزیں تو آ ہی جاتی ہیں کہ ٹھیک ہے صاحب! اپنے اپنے طور پہ رام بھی وہی ہے' رحیم بھی وہی ہے۔ یہ ہے پس منظر اور اس کی تائید وہ لاتے ہیں اس آیت سے جو میں نے آپ کے سامنے پیش کی۔ اس آیت (2:62) کا ترجمہ عام طور پہ یہ کیا جاتا ہے کہ جو لوگ بھی ایمان لائے یعنی مسلمان ہوں' یہودی ہوں' نصاریٰ ہوں' صابئین ہوں' یہ ایک ستارہ پرست قوم تھی جیسے مجوسی' جو بھی اللہ اور آخرت پر ایمان لے آئے اور نیک عمل کرے' تو ان کے لیے ان کا اجر ان کے خدا کے ہاں ہے' ان کو کسی قسم کا خوف اور حزن نہیں ہوگا۔ اب وہ اس میں کہتے ہیں کہ کوئی عیسائی رہے' یہودی رہے' مسلمان رہے' مجوسی رہے' بس اللہ اور آخرت پر ایمان لائے' نیک عملی کی زندگی ہو تو بس پھر یہ ٹھیک ہے' اس سے زیادہ کچھ اور چاہیے ہی نہیں ہے۔

کیا اخلاقیات کی چند باتوں سے دین اسلام مکمل ہو جاتا ہے؟

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ نیک عملی کی زندگی' جسے آپ نے یہ چند اخلاقی چیزیں کہی ہیں مثلاً چوری نہ کرو' جھوٹ نہ بولو' فریب نہ دو' ظلم نہ کرو' اس کے لیے یہ جو شرط بھی رکھی ہے کہ اللہ اور آخرت پر ایمان رکھیں' اس کی بھی پھر کیا ضرورت ہے۔ اگر ایک دہریہ یہی کچھ کرتا ہے' جھوٹ نہیں بولتا' فریب نہیں دیتا' ظلم نہیں کرتا' استبداد نہیں کرتا' اگر اس کا یہ ایمان نہ بھی ہو تو یہ بھی شرط کیا ضروری ہے' کیا کسی مذہب کے ساتھ وابستہ ہونا ضروری ہوگیا؟ یہ خدا پر ایمان کیوں ضروری ہے؟ یہ آخرت پر ایمان کیوں ضروری ہے؟ کیا خدا اس کو اس لیے اس کا اجر نہ دے گا کہ تم نے مجھے مانا کیوں نہ تھا؟ ان چیزوں کا تعلق کیا ہے؟ اگر اتنی سی بات ہے تو یہ شرط بھی نہیں ہونی چاہیے تھی۔ وہ جو مولانا آزادؒ (1888-1958ء) کہتے ہیں کہ صاحب! خدا پرستی اور نیک عملی ہو' تو یہ خدا پرستی بھی اس کے اندر کیوں ہو؟ پھر تمہارے تصور کے مطابق یہ نیک عملی ٹھیک ہے۔ نظر بظاہر آپ دیکھیے کہ یہ چیز بڑی ہی معصوم سی نظر آتی ہے۔ بنیادی غلطی اس میں' برادرانِ عزیز! وہی ہے جو میں برسوں سے دہرائے چلا آ رہا ہوں کہ اسلام کو ایک مذہب سمجھ لیا گیا ہے۔ مذہب کے تصور کی رو سے یہ سب باتیں ٹھیک ہیں۔

مذہبی طور پر ہم نے اپنے اپنے تصور کے مطابق ثواب اور پھر نجات کا' مکتی کا' حصول ممکن بنا رکھا ہے

مذہب ہے کیا؟ یہ کہ انفرادی طور پر' اپنے طور پر' آپ کچھ کر لیں۔ انفرادی طور پر' اپنے طور پر' آپ کی نجات ہو جائے۔ نجات ہوگئی یا نہیں ہوگئی اس کے لیے کوئی خارجی ثبوت تو کسی کے پاس نہیں ہے۔ یہ تو محض ایک عقیدے کی چیز ہے۔ میں نے اپنے ذہن میں یہ سمجھ لیا کہ اس طریقے سے نماز پڑھ لوں' اس طریقے سے یہ فلاں رسوم ادا کر لوں' یہ کلمات زبان سے ادا کر دوں' اس کا مجھے ثواب ملے گا' ثواب ملنے کے بعد میری نجات ہو جائے گی۔ ساتھ ہی میرے پڑوس میں ایک ہندو بیٹھا ہو' وہ کہے کہ صبح کے وقت اٹھ کر میں اگر شیو جی کی مورتی کے سامنے کچھ پھول چڑھا دوں' کچھ گھنٹی بجاؤں' اس کی عقیدت کے کچھ منتر' شردھا کے کچھ اشلوک' اس کے چرنوں میں پھول چڑھا کر' کچھ منتر کا الاپ لوں' اس طرح سے مجھے ثواب مل جائے گا' یہ پن کی باتیں ہیں' میری مکتی ہو جائے گی۔ عیسائی اپنے گرجا میں اپنی Salvation (نجات) کے لیے یہ کچھ کر لے گا' ہندو اپنے مندر میں کر لے گا' مسلمان مسجد میں یا اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا کر لے گا۔ یہ جو آپ کے ہاں نجات کا انفرادی تصور ہے' مذہب کے متعلق جو یہ کہا گیا ہے کہ یہ ایک پرائیویٹ عقیدے کا نام ہے' اس بنا پہ لیا جائے تو پھر تو یہ ٹھیک ہے۔ اپنے اپنے طریقے پہ جس طور پہ کسی نے کچھ کر لیا' اپنے ذہن میں اس نے سمجھ لیا کہ میری نجات ہوگئی ہے۔

اسے غور سے سنیے کہ ''اس نے اپنے ذہن میں یہ سمجھ لیا کہ میری نجات ہوگئی''۔ اس بات کا ثبوت نہ مسلمان کے پاس ہوتا ہے' نہ ہندو کے پاس ہوتا ہے کہ ایسا کرنے سے نجات ہوتی ہے اور ویسا کرنے سے نجات نہیں ہوتی۔ اسے کوئی ثابت ہی نہیں کر سکتا۔ کوئی شخص اپنے متعلق ساری عمر بھی نہیں کہہ سکتا کہ مجھے یقین ہے کہ میری نجات ہوگئی۔ ارے تمہارے پاس ثبوت کیا ہے کہ نجات ہوگئی؟ ثبوت پھر ایک عقیدہ ہے۔ پہلے عقیدہ یہ ہے کہ اگر یہ یہ چیزیں یوں کر لی جائیں' نماز وقت پہ پڑھ لی جائے' روزے رکھ لیے جائیں یا ہندوؤں کے ہاں ایشور کی یہ کوئی بھگتی کر لی جائے' پرماتما کے لیے یہ کچھ کیا جائے' اس قسم کے رسومات ادا کر لیے جائیں' یہ کام کر لیے جائیں' تو وہ اپنے ذہن میں اس عقیدے کے مطابق سمجھتا ہے کہ نجات ہوگئی' مکتی ہوگئی۔ نہ ثبوت اس کے پاس ہوتا ہے' نہ اُس کے پاس ہوتا ہے۔ دوسرے پر ثابت کرنا تو ایک طرف' اپنے متعلق بھی وہ یقین سے نہیں کہہ سکتا سوائے اس کے کہ اس کا عقیدہ یہ ہے کہ ایسا کرنے سے میری نجات ہو جاتی ہے۔ لہٰذا مذہب میں جب صورت یہ ہو تو وہاں تو یہ بات بڑی خوش آئند سی نظر آتی ہے کہ بھئی! ٹھیک ہے' اپنے اپنے طور پر اچھے کام کر لیے۔ ایشور کو' پرماتما کو' خدا کو' God کو مان لیا' اس سے نجات ہوگئی۔ بنیادی چیز تو یہ ہوئی کہ کیا مذہب اسی لیے آتا ہے؟ کیا اسی چیز کا نام مذہب ہے؟ مذہب تو اسی لیے ہے اور اسی چیز کا نام ہے۔

خدا تعالیٰ نے انسانیت کو مذہب نہیں بلکہ دین یعنی اجتماعی نظامِ حیات عطا کیا ہے

برادرانِ عزیز! جیسا کہ میں شروع سے آج تک عرض کرتا چلا آ رہا ہوں کہ خدا کی طرف سے مذہب نہیں ملتا' خدا کی طرف سے دین ملتا ہے۔اور دین کوئی ایسی چیز نہیں تھی کہ پہلی دفعہ نبی اکرم ﷺ ہی کو ملا ہو' پہلے دن سے الدین ہی ملتا چلا آ رہا ہے' ہر نبی کو الدین ہی ملا تھا۔ اس نبی کے جانے کے بعد اس الدین میں انسانی خیالات کی آمیزش ہوئی' اس کے پیغام میں تحریف ہوئی' اسے بھلا دیا گیا' اسے مٹا دیا گیا' وہ اپنی شکل میں باقی نہ رہا' انسانی خیالات کا مجموعہ جو بعد میں بنا' اس کا نام مذہب رکھا گیا جس کا ترجمہ Religion کیا گیا۔اس کے بعد پھر ایک نبی آتا تھا' وہ نبی کیا کرتا تھا؟ وہ پھر الدین کو لے کر آجاتا تھا جو اس مذہب کے خلاف چیلنج ہوتا تھا۔وہ اس پہلے نبی کے دین کو' جسے مسخ کر کے مذہب کی شکل دیدی جاتی تھی' وہ اس مذہب کی شکل کے خلاف ایک چیلنج ہوتا تھا' وہ اسے مٹا کر پھر الدین کو ثبت (Establish) کرتا تھا' پھر الدین آجاتا تھا۔ پھر لوگ وہی کچھ اس کے ساتھ کرتے تھے' پھر ایک اور رسول آجاتا تھا' پھر وہ الدین دے جاتا تھا۔ ہوتا پھر یہ رہا کہ الدین تو اس نبی کی زندگی میں تھوڑے سے وقت کے لیے سامنے رہتا اور اس نبی یا رسول کے بعد اس دین کے نام لیوا ایک مذہب کو وضع کر لیتے' نسبت اس کی اُسی رسول کی طرف کرتے' نسبت اپنی انہی کتابوں کی طرف کرتے لیکن دین کی جگہ اپنا تراشیدہ مذہب اختیار کر لیتے۔

سلسلہ نبوت کی آخری کڑی نے بھی انسانوں کے تراشیدہ مذہب کی بجائے دین عطا کیا تھا

یہ ہیں وہ مذاہب' جن کی نسبت بھی رسولوں کی طرف ہوتی ہے' بانیانِ مذاہب کی طرف ہوتی ہے۔ یہ بتایا جاتا ہے کہ یہ اس میں خدا کی طرف سے عطا کردہ ہے۔ آخر میں نبی اکرم ﷺ کی وساطت سے بھی الدین آیا' اسؐ نے آ کر بھی وہی کیا۔ یہ الدین کسی ایک مذہب کے خلاف چیلنج نہیں ہوتا تھا' یہ نفسِ مذہب کے خلاف چیلنج ہوتا تھا تا کہ دنیا میں جہاں جہاں بھی دین کو بگاڑ کر مذہب بنا دیا گیا ہے' یہ ان کو مٹا کر ان کی جگہ الدین کو ثبت کر دے۔ یہ آتا ہی اس کام کے لیے تھا۔ اسے کہتے ہیں مذہب کے خلاف چیلنج۔ دین کرتا یہ تھا۔ آخری مرتبہ نبی اکرم ﷺ نے ایسا کیا۔ حضور ﷺ تشریف لے گئے اور آپ ﷺ کی تشریف براری کے کچھ عرصے کے بعد مسلمانوں نے بھی وہی کچھ کیا' جو پہلے اہلِ دین کیا کرتے تھے' پھر یہ مذہب کے اندر تبدیل کیا گیا' پھر اسلام مذہب بن کر رہ گیا۔

مسلمانوں میں اور دیگر اہلِ مذاہب میں فرق: قرآن حکیم کا محفوظ ہونا ہی ہے

مسلمانوں میں اور دیگر اہلِ مذاہب میں ایک بنیادی فرق ہو گیا اور وہ بنیادی فرق یہ تھا کہ باقی اہلِ مذاہب میں سے کسی کے پاس خدا کا وہ ضابطہ' جس کے اندر الدین ہوتا تھا' خدا کی وحی' خدا کی کتاب' وہ اپنی اصلی غیر محرف شکل میں دنیا میں کہیں موجود نہیں تھا۔ اور اسلام

کا ضابطۂ دین جو نبی اکرم ﷺ کو خدا کی طرف سے ملا تھا' وہ حرفاً حرفاً اپنی اصلی منزہ غیر محرف شکل کے اندر آج تک موجود ہے۔ یہ بہت بڑا بنیادی فرق ہوا۔ باقی اہلِ مذاہب اگر آج چاہیں بھی کہ وہ مذہب کی جگہ الدین اپنے ہاں رائج کر لیں' تو یہ ان کے لیے ناممکن ہے۔ وہ الدین جو ان کے بانیٔ مذہب کو یا ان کے رسول کو ملا تھا' وہ تو آج کسی جگہ موجود ہی نہیں ہے۔ اور یہ جو موجود ہے' وہ چیز نہیں ہے' جو ہم مسلمان یا اسلام کے ماننے والے اس کا دعویٰ کرتے ہیں۔ جیسا کہ میں نے اپنی کتاب ''مذاہبِ عالم کی آسمانی کتابیں'' میں تمام مذاہبِ عالم کی کتابوں کی تاریخ لکھ کر ان کی اپنی زبان سے یہ بتایا ہے کہ خود وہ اہلِ مذاہب اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ ہمارے پاس اپنے مذہب کی اصلی کتاب موجود نہیں ہے۔ اور وہی غیر مسلم جو لوگ ہیں' محققین اور مورخین ہیں' وہ اس کے ساتھ اس کی بھی شہادت دیتے ہیں کہ قرآن اپنی اصلی شکل میں واقعی دنیا میں موجود ہے۔ لہٰذا قرآن کو الدین ماننے والوں کا یہ دعویٰ کہ خدا کی طرف سے دیا ہوا دین' صرف اس کے اندر ہے' کہیں اور نہیں ہے' ایک ایسا دعویٰ ہے جس کی شہادت تاریخ دے رہی ہے۔ یہ نہیں ہے کہ'' کمہیاری اپناای بھانڈا سوار دی ہیگی اے''، یعنی ہر دوکاندار یہ کہتا ہے کہ صاحب! اصلی کھر امال یہاں ملے گا' باقی دوکانوں کے اوپر سب ''جاپانی'' ہے۔ یہ چیز نہیں ہے بلکہ یہ علم' تاریخ' بصیرت' فکر کی دنیا کا ایک فیصلہ ہے کہ خدا کی طرف سے عطا کردہ کتاب اپنی اصلی شکل کے اندر قرآن کے علاوہ دنیا میں اور کہیں نہیں ہے۔ یہ مسلمان کا دعویٰ نہیں ہے' یہ تاریخ کی شہادت ہے۔

لہٰذا اگر یہ مسلمہ مان لیا جائے کہ دین وہی سچا ہے جو خدا کی طرف سے ملا تھا تو اس کا لازمی منطقی نتیجہ یہ ہے کہ خدا کی طرف سے جو دین ملا تھا وہ قرآن کے علاوہ کہیں اور ہے نہیں۔ ساری دنیا اس چیز کو مانتی ہے۔ لہٰذا اگر پہلی چیز مان لی جائے کہ سچا دین وہی ہے جو خدا کی طرف سے ملا تھا تو جو اگلا نتیجہ ہے وہ اس کا منطقی نتیجہ ہے کہ اب قرآن کے علاوہ پھر الدین اور کہیں ہے نہیں۔ اس لیے آپ نے یہ دیکھا کہ باقی اہلِ مذاہب اگر یہ کہیں کہ نہیں صاحب! سب مذاہب یکساں طور پر سچے ہیں تو ان کا وہ دعویٰ بے بنیاد ہے کیونکہ وہاں تو الدین ہے ہی نہیں' وہاں خدا کی وہ کتاب ہے ہی نہیں جس کے اندر الدین تھا۔ جو بھی ان کے پاس ہے' وہ انسانی خیالات کے مجموعے ہیں لیکن اسکے مقابلے میں اگر قرآن کو ماننے والا یہ کہے کہ الدین صرف اس کتاب کے اندر ہے تو اس کا یہ دعویٰ' یہ نہیں کہا جائے گا کہ یہ اپنے دین کو سچا کہتا ہے' باقیوں کو جھوٹا کہتا ہے' بلکہ یہ ایک علمی اور تاریخی شہادت کا بیان ہوگا۔

یہ ہے وہ مغالطہ جو یہ لوگ دیتے ہیں' جب کہتے ہیں کہ صاحب! تمام مذاہب خدا کی طرف سے ملے تھے' جیسا کہ ابوالکلام آزادؒ (1888-1958ء) نے لکھا' یہ نہیں ہوسکتا کہ کسی ایک قوم کو ہی دیا گیا ہو اور دوسری کو نہ دیا گیا ہو۔ یہ بالکل صحیح ہے۔ قرآن خود یہ کہتا ہے کہ دنیا کی کوئی قوم ایسی نہیں جس کے اندر ہم نے اپنا ہدایت دینے والا نہیں بھیجا۔ دنیا کی ہر قوم میں' ہر ملک میں' خدا کی طرف سے ہدایت دینے والے انبیائے کرامؑ آئے۔ یہاں تک تو یہ صحیح ہے لیکن وہاں مغالطہ آگے چل کر ہے۔

دنیا بھر میں اگر کسی قوم کے پاس سچا دین اپنی اصلی شکل میں ہے تو وہ پیش کرے

سوال تو یہ ہے کہ وہ جو الدین ان کو ملا تھا' وہ آج کہیں کسی کے پاس موجود ہے بھی؟ اگر کسی اہلِ مذہب کے پاس وہ الدین موجود ہے جو ان کے بانی مذہب کو خدا کی طرف سے ملا تھا تو وہ دنیا میں پیش کرے۔ اگر وہ اپنی اصلی شکل میں کہیں ہوگا تو اس میں اور قرآن میں دین کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں ہوگا لیکن وہ تو دنیا میں کہیں اور ہے ہی نہیں۔ لہٰذا یہ کہنا کہ صاحب! مسلمان جب یہ کہتا ہے کہ الدین اسی کے اندر ہے تو یہ تو اسکی بڑی تنگ نظری ہے۔ یہ تنگ نظری نہیں ہے' ایک حقیقت کا اعلان ہے' تاریخ کی شہادت کا بیان ہے۔ یہ اس لیے نہیں ہے کہ میں قرآن کو مانتا ہوں' اس لیے میں یہ دعویٰ کرتا ہوں۔ اس دعویٰ کے ثبوت کی شہادت تو وہ لوگ بھی دیتے ہیں جو قرآن کو دین نہیں مانتے ہیں۔ خالص تاریخی طور پہ بھی وہ اس کی شہادت دیتے ہیں کہ یہی کتاب ہے جو اپنی اصلی شکل میں' اہلِ مذاہب کے ہاں موجود ہے' کسی اور کے پاس اپنی اصلی کتاب موجود نہیں ہے۔ اور اگلی چیز یہ ہے کہ الدین مذہب نہیں ہوتا' اس میں یہ سوال ہی نہیں ہے کہ میں نے اپنے طور پر ذہن میں فیصلہ کر لیا کہ ہاں صاحب! میری نجات ہوگئی تو ٹھیک ہے' میں مذہب کا سچا پیرو بن گیا۔ دوسرے کے متعلق میں نے فیصلہ کیا کہ یوں کہنے سے اس کی نجات نہیں ہوئی' تو وہ فیصلہ ہوگیا کہ وہ جہنم میں چلا گیا کیونکہ جی! میں نے جو کہہ دیا۔ یعنی اپنے متعلق میں نے کہہ دیا کہ میری نجات ہوگئی تو اس کا ثبوت کیا ہے' اس کے متعلق میں نے کہہ دیا کہ وہ جہنم میں گیا تو اس کا ثبوت کیا ہے؟ ثبوت تو میرا عقیدہ ہے تو عقیدہ تو سند نہیں ہوسکتا۔ یہ سوال نہیں ہے۔ اس لیے مذہب کی دنیا کے اندر سر پھٹول ہوتی ہے۔

قوموں کے یا انسانوں کے مابین سر پھٹول ہونے کی بنیادی وجہ نظام ہائے زندگی ہے

دین میں سر پھٹول کا سوال ہی نہیں ہے۔ اس لیے کہ دین کا مطمع نگاہ صرف آخرت کی نجات نہیں ہے بلکہ وہ اس دنیا کے اندر ایک نظامِ تمدن' نظامِ تہذیب' نظامِ معاشرت' نظامِ معیشت' نظامِ سیاست' یعنی ایک نظام دیتا ہے' وہ اس دنیا کے اندر ایک نظام قائم کرنے کے لیے ہے۔ اور اس کا دعویٰ یہ ہے کہ انسانیت کی جتنی مشکلات ہیں' ان کا حل اس نظام کے اندر ہے جو الدین دیتا ہے' اس کے علاوہ کسی اور نظام میں نہیں مل سکتا۔ آپ نے دعویٰ سن لیا۔ اس کا ثبوت اب اعتقادی نہیں ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ علمی اور نظری طور پہ آپ کہتے ہیں کہ یہ جو نظام ہے اس کے جتنے بنیادی اصول ہیں' ان کو آپ پرکھ کر دیکھ لیجیے اور اگلا ثبوت یہ ہے کہ اسے عملاً متشکل کر کے دیکھ لیجیے۔ اور اس کی تاریخی شہادت یہ ہے کہ جب یہ متشکل ہوا تو اس نے اسی دنیا کے اندر کس قسم کے نتائج پیدا کیے۔ محسوس نتائج' مرئی نتائج' تاریخی شہادت کی بنیاد کے اوپر وہ نتائج تمہارے سامنے ہیں۔ جب دعویٰ یہ ہو تو پھر تو یہ سوال ہی نہیں ہے کہ صاحب! میں اپنے دین کو سچا کہتا ہوں' وہ اپنے مذاہب کو سچا کہتے ہیں۔ سوال تو یہ ہے کہ ایک نظامِ زندگی ہے' اس نظامِ زندگی کو متشکل کر کے دیکھ لو۔ اگر اس کے وہ نتائج

نکلتے ہیں تو وہ سچا ہے۔ اگر وہ نتائج برآمد نہیں ہوتے، وہ جھوٹا ہے۔ اور جو نتائج مرتب ہوتے ہیں اگر وہ کسی اور نظام سے بھی مرتب ہو سکتے ہیں پھر آپ کہہ سکتے ہیں کہ دونوں نظام یکساں ہیں۔ اور اگر وہ کسی اور نظام سے نہیں ہو سکتے، اسی ایک نظام سے ہوتے ہیں، تو پھر تو یہ کہنا پڑے گا کہ واقعی یہ نظام افضل ہے۔ یہ ہے الدین۔

آج پوری دنیا کے کمیونزم اور کیپٹل ازم کے نتائج ہمارے سامنے ہیں

اس سے پہلے تو یہ بات شاید سمجھ میں نہ آتی، ہمارے دور میں یہ باتیں آسانی سے سمجھ میں آ جاتی ہیں۔ ایک دین ہے کمیونسٹ کا۔ میں الدین نہیں کہہ رہا، الدین تو ایک ہی ہوتا ہے جو خدا کی طرف سے ملتا ہے۔ دین کے معنی نظامِ زندگی ہیں۔ کمیونزم ایک دین کی حیثیت سے وہ پیش کرتے ہیں، یہ نظامِ زندگی ہے۔ کیپٹل ازم بھی اس کے مقابلے میں ایک دوسرا دین ہے، نظامِ زندگی ہے۔ ان میں آپس میں جو اختلاف ہے، وہ اعتقادی نہیں ہے۔ کمیونسٹ یہ کہتا ہے کہ اس نظام کو ہم نے متشکل کر کے دکھا دیا، اس کے نتائج دیکھ لیجیے۔ اس کے مقابلے میں وہ یہ کہتے ہیں کہ ہم اپنے ہاں اس نظام کو متشکل کیے ہوئے ہیں، اس کے نتائج دیکھ لیجیے۔ اب کسی شخص کا یہ کہنا کہ صاحب! کمیونزم بھی صحیح ہے، کیپٹل ازم بھی صحیح ہے حماقت ہے۔ ان دونوں میں کوئی موازنہ کیجیے، ان کا ایک تقابل ہوگا، یہ تو ایک دوسرے سے متضاد ہیں، ان کے اندر Contradiction (تضاد) ہے۔ تو Self Contradictory (باہم متضاد) چیزیں دونوں تو سچی نہیں ہو سکتیں۔ ان میں سے کسی ایک نتیجے پہ پہنچنا ہوگا۔

مغربی جمہوریت کا نظام جس میں آدمیوں کو گنا جاتا ہے تولا نہیں جاتا

جمہوریت اور ملوکیت یہ دو دین ہیں، یہ دو نظامِ سیاست ہیں۔ جمہوریت کے علمبردار یہ کہتے ہیں کہ یہ نظام ہے جو انسانیت کو Suit (خواہش کردہ چیز مہیا) کرتا ہے۔ اس کے مقابلے میں پہلے ملوکیت یا آج ڈکٹیٹرشپ، نازی ازم یا فاشزم قسم کی ڈکٹیٹرشپ سمجھ لیجیے۔ ڈکٹیٹرشپ کا یہ دعویٰ ہے کہ نہیں صاحب! یہ نظام ہے جو انسانیت کے لیے صحیح نتائج پیدا کرتا ہے۔ اس کا فیصلہ اعتقاد کے طور پہ نہیں ہو سکتا، اس کا فیصلہ یہ ہوتا ہے کہ دونوں نظام جہاں عملاً متشکل ہوں وہ کیا نتائج پیدا کرتے ہیں۔ وہ نتائج یہ بتا دیں گے کہ ان میں سے کس نظام کا دعویٰ سچا ہے اور کس نظام کا دعویٰ جھوٹا ہے۔ اسے کہیں گے کہ ان دونوں میں سے کونسا دین سچا ہے اور کونسا دین جھوٹا ہے۔ آپ نے دیکھا کہ مذہب کی دنیا کے اندر تو کوئی فیصلہ کن معیار ہے ہی نہیں، کوئی Objective Standard (معروضی معیار) ہی نہیں ہوتا، اس میں کوئی خارجی معیار نہیں ہوتا۔ ایک Subjective (داخلی) عقیدہ ہے، ذہنی طور پہ آپ یوں مانتے ہیں، دوسرا یوں مانتا ہے۔ اور دین میں معیار خارجی ہوتا ہے اور معیار ہوتے ہیں وہ نتائج جو اس دین سے پیدا ہوتے ہیں۔

نظام ہائے زندگی کے متعلق نبی اکرمؐ کا اعلانِ عظیم

یہ تھا وہ معیار پر کھنے کا جس کے متعلق نبی اکرم ﷺ مخالفین سے بار بار کہتے تھے کہ **قُلۡ یٰقَوۡمِ اعۡمَلُوۡا عَلٰی مَکَانَتِکُمۡ اِنِّیۡ عَامِلٌ فَسَوۡفَ تَعۡلَمُوۡنَ** (39:39) تم اپنے اس دین کے مطابق' اپنے نظام کے مطابق' جو تمہاری یہ روش ہے' جسے تم کہتے ہو کہ یہ صحیح نظامِ زندگی ہے' اس کے مطابق کام کرتے جاؤ' میں اس میں Interfere (مداخلت) نہیں کرتا' تم اسے اپنے ہاں عملاً متشکل کرو۔ میں صرف چاہتا یہ ہوں کہ اس دین کو اپنے ہاں متشکل کرنے دو' اس میں تم Interfere (مداخلت) نہ کرو **فَسَوۡفَ تَعۡلَمُوۡنَ** (39:39) یہ عنقریب تم جان لوگے کہ ان میں سے کونسا دین ہے' کونسا نظام ہے' جو صحیح نتائج پیدا کرتا ہے جس کا یہ مدعی ہے' بات صاف ہو جائے گی۔ آپ دیکھتے ہیں کہ یہ Pragmatic Test (استنتاجی آزمائش) ہے یعنی نتائج سے کسی دعوے کی تصدیق یا تثبیت کا ثبوت بہم پہنچانا۔ یہ دین میں ممکن ہے۔ مذہب میں نہیں ہے۔ مذہب کے سارے نتائج آخرت پہ چھوڑ دیتے ہیں' وہاں سے نہ کوئی پلٹ کر آیا' نہ کسی نے آکر بتایا' نہ یہاں بیٹھے ہوئے ہم دیکھ سکتے ہیں کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔ اس کا سارا مدار انفرادی عقیدے پہ ہوتا ہے کہ یہاں کی زندگی جس طرح سے جی چاہے بسر کیجئے' وہاں جا کر آپ کی نجات و سعادت ہے۔

دین کہتا ہے کہ یہاں کی زندگی کس طرح سے بسر کی جائے گی۔ یہ ہے میرا دعویٰ۔ اور میں یہ کہتا ہوں کہ اس نظام کے تابع آپ زندگی بسر کریں گے تو پھر آپ دیکھیں گے کہ انسانیت جس جہنم میں مبتلا چلی آ رہی ہے' اس سے اس کا چھٹکارا ہوگا اور تمہاری یہ دنیا کی زندگی جنت کی زندگی ہوگی۔ اور چونکہ یہی زندگی آگے چلتی ہے جس کی یہاں کی زندگی' جنت کی زندگی ہوگی' اس کی آخرت کی زندگی بھی جنت کی زندگی ہوگی۔ وہ اس زندگی کو یہاں سے الگ نہیں کرتا' وہ یہاں کا تسلسل (Continuity) ہے۔ تو معیار جو ہے وہ یہاں کے نظام کے نتائج ہونگے' معیار دین کے اندر ہے۔ اب یہ چیز تو کہی جا سکتی ہے کہ مذاہب سب سچے ہیں' یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ ادیان سب سچے ہیں۔ نظامِ حیات کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا اور اگر کوئی کہتا ہے تو اسکے بعد یہ ہے کہ صاحب! بہت اچھے! ان کو عملاً متشکل کر کے دیکھ لیجیے۔ یہ Scientific Process (سائنسی عمل) ہے' سائنٹسٹ اپنے فارمولے کے متعلق یہ کہتا ہے کہ اس کے یہ نتائج مرتب ہونگے۔ اس دعوے کا ثبوت کیا ہے؟ لیبارٹری ہے' ٹیسٹ ٹیوب ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس کے مطابق وہاں تم بیٹھ کر یہ کچھ کر کے دیکھ لو' دیکھو تو سہی اس کے بعد پھر یہ نتیجہ مرتب ہوتا ہے یا نہیں مرتب ہوتا؟ دو متضاد فارمولے تو بیک وقت صحیح نہیں ہو سکتے میرے بھائی! اگر دو متضاد فارمولوں کا دعویٰ کرنے والا ایسا کرتا ہے تو لیبارٹری دونوں میں سے ایک کو جھوٹا ثابت کر دے گی۔ لہٰذا یہ کہنا حماقت ہوگا کہ سائنس کے دو متضاد فارمولے بیک وقت سچے ہو سکتے ہیں۔

الدین کے ہوتے ہوئے دنیا بھر کے مسلمان صدیوں سے مذہب کے ہی پیروکار ہیں

دین تو ایک سائنٹفک حقیقت ہے' یہی اس کا معیار ہے۔ لہٰذا یوں کہیے کہ یہ اتفاق ہے کہ ہم ان گھروں میں پیدا ہو گئے جن گھروں کے اندر قرآن اپنی اصلی شکل میں موجود ہے۔ لہٰذا ہماری یہ پوزیشن Advantageous (افادی) ہے کہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ جو دین ہے وہ ہمارے ہی ہاں ہے۔ اگرچہ یہ چیز بھی ہمارے ہاں اب محض عقیدے کی حیثیت رکھتی ہے' ثابت ہم بھی نہیں کر سکتے۔ یہ تو ثابت کر سکتے ہیں کہ دین جو اس قرآن کے اندر ہے' قرآن غیر محرف شکل کے اندر ہمارے پاس ہے' دین جس طرح سے ثابت کیا جاتا ہے کہ یہی سچا ہے' وہ تو ہمارے ہاں بھی نہیں ہے' ہم بھی مذہب کے پیرو ہیں۔ دین تو ہمارے ہاں بھی عملاً متشکل نہیں ہو رہا' فارمولا ہمارے ہاں بھی لیبارٹری میں جا کر ٹیسٹ کے اندر نہیں آ رہا۔ اس لیے ہم بھی دنیا سے جو گفتگو کرتے ہیں' مذہب کی بنیاد پہ کرتے ہیں۔ یہ روز مناظرے' روز مباحثے ہندوؤں سے عیسائیوں سے ہوتے ہیں۔ اب تو خیر یہ چیز کم ہو گئی' یہاں وہ ہندو عیسائی نہیں رہے۔

ہمارے ہاں ہونے والے مناظروں کی کیفیت میں ہماری ایک بنیادی غلطی

اس لیے ہمارے ہاں مناظرے بھی آپس میں ہی ہوتے ہیں۔ یہ مناظرے دیوبندیوں سے' بریلیوں سے ہوتے ہیں۔ بہرحال یہ جو ہمارے مناظرے اور مباحثے دوسرے اہلِ مذاہب سے ہوتے تھے وہ ہوتے کس بنا پہ تھے؟ اس پر کہ ہم نے بھی اپنے آپ کو مذاہب میں سے ایک مذہب تسلیم کر لیا ہوا ہے۔ اور جونہی آپ نے اپنے آپ کو ایک مذہب کا حامل کہا' آپ کے پاس کوئی دلیل وثبوت نہیں رہا کہ آپ یہ بتا سکیں کہ نجات اسی مذہب سے ہوتی ہے' کسی اور اس سے نہیں ہوتی۔ دین کی سطح پہ گفتگو کیجیے تو اس وقت آپ کا تقابل ہندو مت یا عیسائیت کے مذہب سے نہیں ہوگا' وہ نظامِ زندگی سے ہوگا۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہیے کہ الاسلام جو الدین ہے' اس کا موازنہ کمیونزم سے کرنا ہوگا' کیپٹل ازم سے کرنا ہوگا' ڈیما کریسی سے کرنا ہوگا' ڈکٹیٹر شپ سے کرنا ہوگا۔ یہ جو دنیا میں ادیان ہیں' ان کو آپ باطل کہہ دیجیے' وہ الدین نہیں ہیں' آپ کو ان کا جو مقابلہ کرنا ہوگا' تو وہ کسی نظامِ زندگی سے کرنا ہوگا۔ ہماری ہزار برس سے بنیادی غلطی یہ چلی آ رہی ہے کہ ہم خود اسلام کو مذہب کی صف کے اندر لے آئے ہوئے ہیں۔ اور جب آپ اسے مذہب کی صف پہ لے آئیں گے تو پھر آپ کے پاس کوئی اس قسم کا Objective Standard (خارجی معیار) نہیں ہوگا کہ آپ یہ حتمی طور پر علیٰ رؤسِ الاشہاد ثابت کر دیں کہ صداقت اسی کے اندر ہے' دوسرے کے اندر نہیں ہے۔ مذہب میں صداقت کے معنی نجات ہوں گے۔ اور نجات کا میں نے عرض کر دیا ہے کہ وہ تو ایک ذہنی عقیدے کا نام ہے' خارج میں آپ اسے کیسے ثابت کر سکتے ہیں؟ یہ ہے ہماری بنیادی غلطی۔

تمام انبیائے کرامؑ کو وہی دین تھا جو شروع سے آخر تک ملتا چلا آیا۔ دین پر عمل کرنے کے جو طریقے تھے' ان میں مختلف زمانوں میں'

مختلف احوال وظروف کے تابع' تبدیلیاں ہوتی رہیں لیکن الدین اپنے اصول کے اعتبار سے ایک ہی تھا اور خدا ہی کی طرف سے ملتا تھا' انبیائے کرامؑ کی وساطت سے ملتا تھا' اور یہ دنیا کی ہر قوم کو ملا۔ کہا ہے کہ شَرَعَ لَكُم مِّنَ الدِّيْنِ (42:13)۔ الدین کا راستہ خدا نے دکھایا۔ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا (42:13) قرآن ہمیشہ سلسلۂ انبیائے کرامؑ کی ابتدا حضرت نوحؑ سے کرتا ہے۔ پہلے نبی کا ذکر کیا اور اس کے بعد وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ (42:13) آخری نبی کا ذکر کیا۔ پہلے نبی کو بھی وہی الدین دیا اور یہ جو اے رسول! تم پہ وحی کیا جاتا ہے' یہ بھی وہی ہے اور درمیان میں جو وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى (42:13) ہیں یعنی ان حضرت ابراہیمؑ' حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ تمام انبیاء کو یہی کچھ کہا گیا۔

اب' برادران عزیز! سوال یہ ہے کہ ان سے کیا کہا گیا؟ کہا یہ گیا کہ اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ (42:13) یہ جو الدین ہے' یہ جو نظامِ زندگی تمہیں وحی کی رو سے ملتا ہے' اس کے مطابق اَنْ اَقِيْمُوْا اس کو قائم کرو' اس کو Establish کرو۔ اب یہ اعتقادی اور ذہنی بات نہ رہی کیونکہ اس کے تو نتائج ہی اس صورت میں برآمد ہونے تھے جب اس کو قائم (Establish) کیا جاتا۔ کہا کہ اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ط (42:13) یاد رکھو! اسے قائم کرو اور یہ بھی یاد رکھو! اس میں کسی قسم کی تفریق نہیں کرنی ہے اس لیے کہ وہ الدین تو ایک ہے' اس کے اندر فرق نہ کر لینا۔ سوال یہ ہے کہ فرق کرنے سے کیا ہوگا؟ کہا کہ كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَيْهِ (42:13) یہ جو خدا کے دین کے اندر شرک کرنے والے ہیں اور اپنی طرف سے اصولِ زندگی بنا دینے والے ہیں' ان پر یہ بات بڑی گراں گزرے گی کیونکہ صداقت اِسی کے اندر ہے' اُن کے اندر نہیں ہے جس میں انہوں نے اپنے خیالات کی آمیزش کر دی تھی۔ کہا ہے اَللّٰهُ يَجْتَبِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ (42:13) یہ تو خدا کا قانون ہے' اس کے مطابق وہ تمہیں اس کی طرف دعوت دیتا ہے۔

الدین کو مذہب کی شکل میں کس طرح بدلا' کس نے بدلا اور اس کی لم کیا تھی؟

برادران عزیز! اس کے بعد ہے کہ وَمَا تَفَرَّقُوْٓا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًاۢ بَيْنَهُمْ (42:14)۔ یہ مذاہب کیسے بن گئے؟ اس طرح کہ ہر دین لانے والے کے بعد' اس کے جو Followers (متبعین) تھے' انہوں نے باہمی ضد کی بنا پر' اپنے مفاد کی خاطر' اس کے اندر اختلاف پیدا کر لیا۔ برادرانِ عزیز! یہ بات کتنی واضح ہوگئی! یہ جو ان کے ہاں اس طرح اختلافات پیدا ہوئے تھے قرآنِ کریم اسکی شہادت دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہمارا طریقہ یہ رہا کہ یا یوں کہیے کہ ہم کرتے یہ تھے کہ مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا (2:106) الدین بھیجتے تھے' اس کے بعد یا تو حوادثِ ارضی وسماوی کی وجہ سے یا خود لوگوں کی سازشوں کی وجہ سے' اس کا

کچھ حصہ تو ایسا تھا جو مٹ ہی جایا کرتا تھا' باقی ہی نہیں رہتا تھا' کچھ حصہ ایسا تھا جس کے اندر وہ تحریف کر دیتے تھے۔ پھر ایک اور رسول آ جاتا۔ پھر ہم یہ کرتے کہ جو حصہ مٹ گیا ہوتا اور اس کو اسی طرح سے باقی رکھنا مقصود ہوتا' اس جیسا ہی اور حصہ ہم وحی کے ذریعے دیدیتے۔ جتنا حصہ اس میں ایسا تھا جو صرف وقتی طور پہ رکھنے کے قابل تھا یعنی وہ طریقے' وہ انداز' وہ طرز جس سے وہ دین قائم ہوتا ہے' اس میں سے بھی بیشتر حصہ وحی کے ذریعے سے ملتا تھا' اس سے بہتر طریق اگر اس دور کے لیے ضروری ہوتا تو ہم وہ دیدیتے اور اس طرح سے دوسرا نبی آ کر پھر اسی دین کو Establish (قائم) کر کے چلا جاتا۔

آپ نے دیکھا کہ وحی کا یہ کیا انداز رہا ہے؟ یہ کہ ہر نبی اپنے پہلے نبی کی اصلی تعلیم کو لے کر آتا اور اگر کوئی چیزیں پہلے نبی کے ہاں ایسی تھیں' جو صرف وقتی طور پہ ملی تھیں' اس سے اس کے زمانے کے حالات کے مطابق جو چیزیں ملنی تھیں' وہ اس کی جگہ انہیں Substitute (متبادل) کر جاتا' یہ پھر الدین قائم ہو جاتا' یہ پھر چلا جاتا۔ پھر قرآن نے یہ بتایا کہ کتبِ سابقہ کے اندر ان کتابوں کے ماننے والوں نے کتنی تحریف کی؟ کہا ہے کہ **وَ لَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسَی الْکِتٰبَ فَاخْتُلِفَ فِیْهِ** (11:110) ہم نے موسیٰؑ کو کتاب دی اور اس کے متبعین نے اس کے اندر اختلافات پیدا کر لیے۔ دوسری جگہ اس کے متعلق کہا ہے کہ **یُحَرِّفُوْنَ الْکَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ وَ نَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُکِّرُوْا بِهٖ ج** (5:13) ان لوگوں نے' جو وحی دی تھی' اس کا کچھ حصہ تو فراموش ہی کر دیا اور باقی حصے کے اندر تحریف کر دی' اسے بدل دیا۔ آپ قرآن کے یہ دعاوی دیکھ رہے ہیں۔ پھر ایک جگہ ہے کہ **فَوَیْلٌ لِّلَّذِیْنَ یَکْتُبُوْنَ الْکِتٰبَ بِاَیْدِیْهِمْ ق ثُمَّ یَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ** (2:79) تو تباہی ہے ان لوگوں کو کہ اپنے ہاتھ سے وہ کچھ لکھتے ہیں اور پھر کہتے ہیں کہ خدا کی طرف سے آئی ہوئی جو وحی تھی' وہ یہ ہے۔ اب دیکھیے کہ قرآن خود یہ شہادت دے رہا ہے کہ پہلے انبیائے کرامؑ کو جو الدین دیا تھا' جو الکتاب دی تھی' ان کتابوں میں ان کے ماننے والوں نے بعد میں تحریف کی' تبدیلیاں کیں' اختلافات کیے' جو بہت سا حصہ تھا محو ہو گیا' فراموش کر دیا۔

نظامِ زندگی کی شکل میں الدین کی آخری محفوظ شکل کی نوعیت وافادیت

اس طرح سے آگے آتے آتے بات یہاں تک پہنچی کہ قرآنِ کریم نازل ہوا۔ یہ اس دور میں نازل ہوا اور زندگی کے مستقل اصول و اقدار مکمل شکل میں' آخری شکل میں' اس آخری کتاب کے اندر درج کر دیئے۔ قرآن بتاتا ہے کہ **وَ تَمَّتْ کَلِمَتُ رَبِّکَ صِدْقًا وَّ عَدْلًا ط لَا مُبَدِّلَ لِکَلِمٰتِهٖ ج وَ هُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ** (6:115) تیرے خدا کی باتیں صدق وعدل کے ساتھ مکمل ہو گئیں' اب کوئی ان میں تبدیلی نہیں پیدا کر سکتا۔ دو باتیں قرآن میں آ گئیں کہ دین تکمیل تک پہنچ گیا اور غیر متبدل ہو گیا' اب اس میں تبدیلی کی ضرورت نہیں۔ اور دوسری جگہ یہ کہہ دیا کہ **اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ** (15:9) ہم نے اس قرآن کو نازل کیا اور ہم اس کی

حفاظت کے ذمہ دار ہیں۔ یہ تین باتیں آ گئیں کہ دین قرآن میں مکمل ہو گیا' جو کچھ اس میں دیا گیا ہے اس میں کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں ہے۔ لہٰذا یہی چیز ختم نبوتﷺ پہ دلیل ہے۔ اور تیسری چیز یہ ہے کہ خدا نے اس کی حفاظت کا ذمہ لے لیا۔ اب یہ محفوظ' مکمل' غیر متبدل ہے۔ اور یہ دعویٰ دنیا میں کسی اہلِ مذہب کو نہیں ہے۔ یہ عجیب چیز ہے کہ جس شکل میں بھی ان کی کتابیں موجود ہیں' ان میں کسی کتاب میں بھی یہ بات نہیں ہے کہ اس کے اندر دین کی تکمیل ہو گئی ہے۔ ان میں سے کسی میں بھی یہ چیز نہیں ہے کہ اس کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لے لیا۔ اور ان کے دعاوی کو تو چھوڑیئے جیسا میں نے ابھی عرض کیا ہے اب تو تاریخی شہادتیں ہمارے سامنے موجود ہیں' وہ اہلِ مذاہب خود اس کا دعویٰ ہی نہیں کرتے کہ جو کچھ ہمارے پاس ہے' یہ اصلی ہے جو ہمارے نبی کو ملا تھا یا ہمارے بانیٔ مذہب کو ملا تھا۔ اس کے برعکس قرآن کے محفوظ ہونے کی شہادت تاریخ دے رہی ہے۔ اور جو قرآن کو خدا کی طرف سے دیا ہوا وحی کا ضابطہ مانتا ہے' اس کا ایمان یہ ہے کہ یہ مکمل ہے' یہ غیر متبدل ہے۔ اس کی شہادت کہ اب یہی الدین ہے' وہ میں نے جیسا عرض کیا کہ یہ اس کا Pragmatic Test (استنتاجی ٹسٹ) ہو گا۔ اس کی حفاظت کی شہادت تو تاریخ دیتی ہے اور یہ کہتی ہے کہ یہی نظامِ زندگی ہے جس کے مطابق اب انسانیت کی مشکلات کا حل ہو گا۔

الدین کے بنیادی خدوخال اور ان کا نتیجہ

برادرانِ عزیز! اب اس کا ثبوت اسی صورت میں مل سکتا ہے کہ جس قوم کا جی چاہے' اس کو اپنے ہاں قائم کر کے دیکھ لے' اس نظام کو عملاً رائج کر کے دیکھ لے۔ اس نے خود بتایا ہے کہ یہ رائج کرو گے تو اس کا نتیجہ یہ نکلے گا۔ اور وہ ایسے نتائج ہیں جو ذہنی نہیں ہیں کہ تمہیں کیف ملے گا' ایک سرور ملے گا' آسمانوں کی سیر کرو گے یہاں بیٹھے ہوئے' جلوۂ ربانی کی تابانیاں تمہارے ہاں تنویر آسمانی پیدا کر دیں گی' نہیں' قطعاً نہیں۔ دعویٰ یہ ہے کہ یہ نظام قائم کرو تو کوئی شخص رات کو بھوکا نہیں سوئے گا۔ اب سیدھی سی بات ہے کہ یہ نظام قائم کرو تو کوئی انسان کسی دوسرے انسان کے سامنے نہیں جھکے گا۔ یہ کس قدر محسوس نتائج ہیں۔ وہ انہیں آخرت پہ اٹھا رکھنا تو ایک طرف رہا' میں نے عرض کیا ہے کہ اس دنیا کے اندر بھی یہ چیز نہیں ہے کہ

ذوقِ ایں بادہ ندانی بخدا تا نہ چشی!

کہ اس شراب کے نشے کی کیفیت تو جبھی معلوم ہو سکتی ہے کہ خود پیو' پینے والے کا جو نشہ ہے وہ دوسرے کو بتا ہی نہیں سکتا کہ یہ کیفیت کیا ہے۔ یہ ساری چیزیں مذہب کی فریب انگیزیاں ہیں' یہ ساری چیزیں تصوف کی سحر کاریاں ہیں۔ الدین اپنے نتائج ہتھیلی پہ سرسوں جما کر بتاتا ہے کہ یہ نظام قائم کرو تو کوئی فرد رات کو بھوکا نہیں سوئے گا۔ ٹیسٹ کر کے دیکھ لو کہ یہ نظام قائم کرو گے تو کسی انسان کے شرفِ انسانیت

میں قطعاً ذرا سی بھی تذلیل نہیں ہوگی۔ یہ نظام قائم کرو گے تو ہر شخص کے مدارج معاشرے کے اندر اس کے اعمال و کردار و اخلاق کی رو سے قائم ہونگے' ان کے لیے کوئی اور معیار نہیں ہوگا۔ یہ نظام قائم کرو تو پیدائش کی رو سے ایک انسانی بچے اور دوسرے انسانی بچے میں کوئی تفریق نہیں ہوگی۔

ہندوؤں کا دین وحی کی طرف سے عطا کردہ الدین کا کیونکر ہم پلہ ہوسکتا ہے؟

اب سوال یہ ہے کہ کیا ان نتائج کا تعلق محض اعتقادات سے ہے؟ کیا اس کے متعلق بھی کہا جا سکتا ہے کہ ہاں صاحب! یہ بھی سچا دین ہے اور وہ ہندوؤں کا بھی سچا دین ہے جس میں پیدائش کی رو سے چار ورن مسلّم مانے جاتے ہیں؟ برہمن کے گھر میں پیدا ہونے والا برہمن' ایشور کے سر سے پیدا ہوا' ساری عمر دوسروں سے خدمت لینے والا ہے حتیٰ کہ ان کے دھرم کی یہ چیز ہے کہ اگر کسی عورت کو دس حمل بھی کیوں نہ ہوں' یہ ان کا وید کا اشلوک ہے' برہمن اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھ دے تو وہ عورت برہمن کی ہو جائے گی اس لیے کہ برہمن کا درجہ تو اتنا بڑا ہوا۔ شودر پیدا ہی اس لیے ہوتا ہے کہ وہ ان تین ورنوں کی خدمت کرے۔ وہ اس سڑک پہ نہیں چل سکتا جس سڑک کے اوپر برہمن چل سکتا ہے۔ یہ دونوں نظامِ زندگی ہیں اور پیدائش کے اعتبار سے ان دونوں انسانی بچوں میں کسی قسم کا فرق نہیں ہے' تفریق نہیں ہے' تکریم کے اعتبار سے دونوں یکساں ہیں۔ میں پوچھتا ہوں کہ یہ جو دونوں نظام زندگی ہیں کیا بیک وقت یہ دونوں سچے ہو سکتے ہیں؟

مولانا ابوالکلام آزادؒ صاحب (1958-1888ء) کہتے ہیں کہ تمام مذاہب میں عالمگیر سچائیاں پائی جاتی ہیں' تمام مذاہب اپنی اپنی جگہ پہ سچے ہیں۔ ٹھیک ہے' پوچھنے کی بات یہ ہے کہ اتنی سی بات ہی صرف لے لیجئے' کیا یہ دو چیزیں بیک وقت سچی ہو سکتی ہیں؟ کیا یہ چیز کہ جو راجہ ہے' ایشور کا اوتار ہے اور اس کا ہر حکم خدا کے حکم کی طرح ماننا ہوگا؟ کیا یہ نظامِ زندگی وہ نظامِ زندگی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ **وَاَمۡرُهُمۡ شُوۡرٰى بَيۡنَهُمۡ** (42:38)؟ یہ اپنے معاملات باہمی مشاورت سے طے کریں گے اور یہ کہ کسی شخص کو یہ حق حاصل نہیں خواہ وہ نبی بھی کیوں نہ ہو کہ اپنا حکم دوسرے کے اوپر چلائے۔ میں پوچھتا یہ ہوں کہ کیا یہ دونوں نظام یکساں ہو سکتے ہیں؟ کیا ایک ہی وقت میں ان دونوں کو سچا مانا جا سکے گا؟ کیا یہ نظامِ زندگی ہے کہ صاحب! رزق کی بسط و کشاد اس نے اپنے ہاتھ میں رکھی ہوئی ہے کہ جس کو چاہے لاکھوں دے' جس سے چاہے سب کچھ چھین لے' جس سے وہ چھینتا ہے بھوکا مرے محتاج ہو اس کو حق حاصل نہیں ہے کہ وہ شکایت کا حرف بھی زبان پہ لائے؟ اور اس کے مقابلے میں یہ نظامِ زندگی ہے کہ یہ تمام چیزیں' جتنی بھی ہوتی ہیں' یہ انسان کے اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی ہوتی ہیں' ان تمام چیزوں کا معاشرہ ذمہ دار ہے' خدا ان کا ذمہ دار نہیں ہے۔ میں پوچھتا ہوں کہ کیا یہ دونوں نظام بیک وقت سچے ہو سکتے ہیں؟ عالمگیر سچائیاں تمام مذاہب میں یکساں طور پہ پائی جاتی ہیں' میں کہتا ہوں کہ مذاہب کا کیا ذکر ہے' دنیا میں تو کوئی دہریہ بھی یہ نہیں کہتا

کہ جھوٹ بولا کرو، فریب دیا کرو، زنا کیا کرو۔ اس کے اندر مذاہب کی بھی کیا شرط ہے، خدا پرستی کی کیا شرط ہے۔ یہاں یہ شرط ہے کہ یہ جو نظامِ زندگی تھا یہ اس کا اصولِ دین ہے کہ پیدائش کے اعتبار سے تمام انسانی بچے یکساں طور پہ واجب التکریم ہیں۔ یہ انسانوں کا بنایا ہوا نہیں ہے، خدا کا بنایا ہوا ہے، غیر متبدل ہے، کوئی انسان اس میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں پیدا کر سکتا۔ یہ ہیں خدا پر ایمان کے معنی۔ اب آپ نے سمجھ لیا کہ عملاً خدا پر ایمان کا تعلق کیا ہے۔

آخرت پر ایمان کا بنیادی مفہوم

اب سوال یہ ہے کہ جسے آپ آخرت پر ایمان کہتے ہیں، وہ آخرت پر ایمان کیا ہے؟ برادرانِ عزیز! آخرت پر ایمان کے معنی ہیں ''ہر عمل اپنا غیر متبدل نتیجہ برآمد کر کے رہتا ہے، یہ وہیں نہیں جا کر ہوتا یہاں بھی ہوتا ہے''۔ آخرت کے معنی ''مستقبل'' ہیں۔ عمل کے بعد نتیجہ سامنے آتا ہے، وہ عمل کا مستقبل ہوتا ہے۔ ہر عمل کی اپنی آخرت ہوتی ہے۔ آخرت پر ایمان کے معنی یہ ہیں کہ یہ دیکھنے کے لیے کہ میرا عمل صحیح ہے یا غلط ہے، جو کچھ میں کر رہا ہوں، اس کے بعد دیکھو کہ آنے والا جو نتیجہ ہے، اسے آخرت کہتے ہیں کہ کیا واقعی وہ نتیجہ پیدا ہو گیا ہے جو اس نے دعویٰ کیا تھا کہ پیدا ہو گا؟ کیا ٹیسٹ ٹیوب نے یہ بتا دیا ہے کہ یہ واقعی وہ چیز پیدا ہوئی جو فارمولے نے دعویٰ کیا تھا؟ یہ ہے عزیزانِ من! خدا پر ایمان، یہ ہے آخرت پر ایمان۔ مذہب کی دنیا کو اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

اجر کا مفہوم کیا ہے اور نیکی کسے کہتے ہیں؟

جیسا میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ سچ بولو، جھوٹ نہ بولو، تو اس میں خدا پر ایمان کے کیا معنی ہیں؟ دہریہ اگر سچ بولتا ہے تو کیا اس کو اس کا اجر نہیں ملے گا؟ اجر کیا ہے؟ عزیزانِ من! ایک نظامِ زندگی ہے جس کے نتائج کا نام انسانوں کے لیے اجر ہوتا ہے۔ میں پوچھتا یہ ہوں کہ نظامِ سرمایہ داری کے اندر ایک شخص باپ سے کروڑوں روپے وراثت میں پاتا ہے، چار فیکٹریاں اس کی ہیں، اس کے اندر دس ہزار مزدور کام کر رہا ہے۔ صبح سے شام تک ایک مزدور دس روپے کما کر دیتا ہے، وہ اس میں سے تین روپے اس کو دیتا ہے، باقی اپنے گھر لے جاتا ہے، اس کے بعد گھوڑوں کو پانی پلانے کے لیے وہ ایک سبیل لگا لیتا ہے، کسی جگہ خیرات کے اندر ہزار روپیہ چندہ دیدیتا ہے، مسجد میں قالین بچھا دیتا ہے، کعبے میں پنکھے لٹکا دیتا ہے۔ یہ بڑے نیکی کے کام ہیں۔ کیا اس نظام کے تابع، جو اس نے اپنے ہاں قائم کر رکھا ہے، اس فیکٹری کے اندر جہاں وہ ہزار آدمی کی محنت کی کمائی میں سے سات روپے روز لے جاتا ہے، اس میں اگر اس نے چار آنے صدقے اور خیرات کے کام میں دیدیئے تو کیا آپ اسے نیکی کہیں گے؟ قرآن نے نیکی کے اس تصور کو جھٹک کر رکھ دیا ہے۔ کہا ہے کہ لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ (2:177) اپنے آپ کو فریب میں مت رکھو کہ نیکی یہ ہوتی ہے کہ منہ اس طرف کر لیا یا اس

طرف کرلیا۔ ابھی ابھی آپ کے سامنے آیتیں آتی ہیں۔ وہ یہ چیزیں کہتا ہے کہ آپ نے حاجیوں کے لیے سبیلیں لگا دیں' کعبے کی تزئین و آرائش کا سامان پیدا کر دیا' کیا تم اس کو نیکی سمجھتے ہو؟

نیکی یہ ہے کہ تم نے انسانیت کی منفعت بخشی کے لیے کیا کیا ہے۔ مذہب اسے نیکی کہتا ہے کہ منہ طرف قبلہ شریف کے' یہ نہ کہو تو نماز نہیں ہوتی' نماز نہیں ہوتی تو پھر نجات نہیں ہوتی۔ وہ کہتا ہے کہ **لَيۡسَ الۡبِرَّ اَنۡ تُوَلُّوۡا وُجُوۡهَكُمۡ قِبَلَ الۡمَشۡرِقِ وَالۡمَغۡرِبِ** (2:177) کیوں اپنے آپ کو فریب دیتے ہو؟ وہ جو میں کئی دفعہ کہا کرتا ہوں کہ Wrong Notions of Morality (اخلاق کا غلط تصور) نے دنیا کو تباہ کیا ہے۔ یہ جو برائیاں ہیں' ان سے تو کوئی بھی فریب میں نہیں آتا۔ کون اس کے فریب میں آئے گا؟ وہ جو یہ نہ کہے گا کہ میں ہر جگہ فریب دیتا ہوں' ہر جگہ جھوٹ بولتا ہوں۔ وہ جو اخلاق کا غلط تصور ہے' نیکی کا غلط تصور ہے اس کے لیے الدین' برادرانِ عزیز! کام کرتا ہے۔ برائیوں کے متعلق یہ کہنا کہ کوئی بڑی بات ہی نہیں ہے' غلط ہے۔ آپ دیکھیے کہ قرآن نے اس قسم کی کوئی بڑی لمبی چوڑی لسٹیں ہی نہیں دیں۔ وہ تو ضمناً بات کر جاتا ہے کہ ٹھیک ہے سچ بولنا چاہیے' جھوٹ نہیں بولنا چاہیے' فریب نہیں دینا چاہیے' اصل چیز وہ یہ کہتا ہے کہ یہ جو تم نے اپنے ذہن میں نیکیوں کا غلط تصور قائم کر رکھا ہے' یہ تصور باطل ہے۔

قرآنی نظامِ زندگی کی تعریف: صرف نوعِ انسانی کی منفعت بخشی کا پروگرام ہے

کہا ہے کہ **وَ اَمَّا مَا يَنۡفَعُ النَّاسَ فَيَمۡكُثُ فِى الۡاَرۡضِ ؕ** (13:17)۔ بس ایک اصول ہے کہ بقا اسی عمل کے لیے ہے جو نوعِ انسانی کے لیے منفعت بخش ہوتا ہے۔ اسے نظامِ زندگی کہتے ہیں' اسے ضابطۂ حیات کہتے ہیں۔ یہ ضابطہ ایک ہی ہو سکتا ہے' دو ضابطے نہیں ہو سکتے۔ ہاں یہ تو ہو سکتا ہے کہ ایک نوعِ انسانی کے لیے منفعت بخش ہو' اور دوسرا نوعِ انسانی کے لیے مضرت رساں ہو۔ میں پوچھتا ہوں کہ کیا یہ دونوں نظامِ زندگی یکساں سچے ہو سکتے ہیں؟ یہ نہیں ہو سکتا۔ یا یہ پوری عالمِ انسانیت کے لیے منفعت بخش ہوگا اور یا یہ کسی ایک گروہ' ایک خاندان' ایک گروپ' ایک قبیلہ' ایک قوم کے لیے' منفعت بخش ہوگا اور باقیوں کے لیے مضرت رساں۔ کیا یہ دونوں نظام یکساں ہو سکتے ہیں؟ یہ ہے اصل سوال!

قومِ بنی اسرائیل کا بنیادی عقیدہ جس کی بنا پر یہ قوم تباہ ہوئی: وہ نسبی طور پر ایک قوم ہے

آیئے اب قرآنِ کریم کی طرف۔ یہ جو آیت (2:62) قرآن نے دی تھی یہ اس مقام پہ آئی ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ بنی اسرائیل کی داستان چلی آ رہی ہے۔ بنی اسرائیل نے جہاں جہاں دھوکے کھائے تھے' جہاں جہاں ان میں تباہیاں آئی تھیں قرآن ان کی وہ وجوہات بیان کرتا ہے۔ بنی اسرائیل کا بنیادی عقیدہ یہ تھا کہ کوئی شخص جنت میں نہیں جا سکتا جب تک وہ بنی اسرائیل کی نسل میں نہ پیدا ہوا

ہو۔ یاد رکھیے! یہودیت نسلی مذہب ہے، وہ صرف ایک نسل کے اندر محدود ہے۔ بنی اسرائیل نسبی طور پر ایک قوم ہے، وہ اپنے سے باہر شادی نہیں کرتے۔ اور کوئی غیر بنی اسرائیل Convert (تبدیل) ہو کر، یہودی نہیں ہو سکتا۔ وہ تبلیغی مذہب نہیں ہے۔ وہ اس نسل کے اندر محدود ہے۔ اب یہ عقیدہ دیکھیے کہ یہ ایک نسل ہے جس میں اس نسل کے علاوہ کوئی انسان داخل نہیں ہو سکتا، یعنی نسل تو ایک ایسی چیز ہے، اِس میں دوسری نسل کا انسان داخل ہی نہیں ہو سکتا، وہ تو پیدائشی چیز ہوتی ہے۔ اور اس کے ساتھ عقیدہ یہ ہے کہ جنت صرف ان کے لیے ہے، ان کے علاوہ کسی اور کے لیے نہیں ہے۔ یہ عقیدہ کتنی بڑی تباہی کا موجب ہے! کتنا غلط ہے! کتنا فریب انگیز ہے! کتنا خود فریبی پر مبنی ہے یہ عقیدہ! اور خود فریبی پر ہی نہیں، اگر اس کو سچا مان لیا جائے تو بنی اسرائیل کی اس نسل کے علاوہ ساری انسانیت ہمیشہ کے لیے Condemn (موردِ الزام) ہو گئی۔ اور پھر یہ کسی انسان کے بس میں ہی نہ رہا کہ وہ نجات حاصل کر سکے۔ اس لیے کہ وہ بنی اسرائیل کے گھر میں پیدا ہی نہیں ہوا۔ پیدا ہو نہیں سکتا ''جنی مرضی ٹل لالے ❶''۔ آپ نے دیکھا کہ یہ کتنی بنیادی چیز تھی۔ قرآن نے کہا ہے کہ تم یہ کیا کہہ رہے ہو کہ الدین جیسی چیز جو انسانیت کی فوز و فلاح کے لیے خدا کی طرف سے ملتی ہے، اس کے متعلق یہ عقیدہ پیدا کر لینا کہ وہ ایک نسل کے اندر محدود ہے سرتا پا غلط ہے۔ بنی اسرائیل کے ہاں اس نسل میں پیدا ہونے والا جو بچہ ہے اس کی تو کوئی خوبی نہیں ہے کہ وہ ان کے گھر میں پیدا ہو گیا۔ محض اس لیے کہ وہ وہاں پیدا ہو گیا وہ جنت میں جائے گا، اور جو ان کے ہاں پیدا نہیں ہوا، وہ لاکھ نیک عملی کی زندگی بسر کرے، کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو، وہ جہنم میں جائے گا۔ یہ سراسر غلط ہے۔

کوئی بچہ خواہ وہ کسی قوم میں پیدا ہوا اسے برابر کی حیثیت حاصل ہوتی ہے، وہ نہ کافر ہوتا ہے نہ مسلم

کہا ہے کہ تم کیا عقیدہ لے کر آئے ہو۔ یہ سب باطل ہے۔ اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ الَّذِیۡنَ ہَادُوۡا وَ النَّصٰرٰی وَ الصّٰبِئِیۡنَ مَنۡ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَ الۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَ عَمِلَ صَالِحًا فَلَہُمۡ اَجۡرُہُمۡ عِنۡدَ رَبِّہِمۡ ۚ (2:62)۔ دینِ خداوندی کا پیدائش سے کوئی تعلق نہیں۔ تمام عالمِ انسانی اپنے نام نصاریٰ لکھا لیں، یہودی لکھا لیں، مجوسی لکھا لیں، مسلمانوں کے گھر میں بھی کیوں نہ پیدا ہو جائے، یا یہودیوں کے گھر، عیسائیوں کے ہاں یا صابئین کے گھر، کسے باشد، پیدائش کے اعتبار سے یہاں یہ کوئی چیز نہیں ہے۔ اسے نئے سرے سے یہ اللہ اور آخرت پر ایمان لانا ہوگا اور یہ دروازہ ہر ایک کے لیے کھلا ہے۔ ہر شخص ان بنیادی حقیقتوں کے اوپر ایمان لے آئے۔ اعمالِ صالحہ کرے تو اسے اس کا اجر اس کے رب کے ہاں سے ملے گا، پھر اسے کسی قسم کا خوف اور حزن نہیں ہوگا۔ اس لحاظ سے وہ کسی قوم میں پیدا ہوا، اسے برابر کی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ پیدائشی طور پر وہ نہ کافر ہوتا ہے، نہ مسلم۔

---

❶ جو کچھ چاہے وہ کر دیکھے، جو زور آزمائی کرنی ہے کر دیکھے۔

ایک مسلمان بچے کو بھی بنیادی حقیقتوں پر نئے سرے سے ایمان لانا ہوتا ہے

برادرانِ عزیز! اب اس میں دو چیزیں آئی ہیں صاحب! کہ **اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ** (2:62) یہ دو ہی باتیں ہیں، اس کے ساتھ ہی ابھی **وَ عَمِلَ صَالِحًا** (2:62) کہا ہے۔ اس کی تشریح قرآن خود کرے گا کہ کیا ضابطۂ زندگی یا جسے ہم الکتاب کہتے ہیں، اس پہ بھی ایمان لانا ضروری ہے یا بس یہی چیز ہے؟ اور پھر جو ایمان لانا ہے، اس کے اندر آپ نے دیکھا ہے کہ **اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا** (2:62) بھی آیا ہوا ہے یعنی یہود و نصاریٰ اور مجوس و صابئین تو ایک طرف رہے، وہ تو مسلمانوں سے بھی یہ کہہ رہا ہے۔ آپ نے دیکھا کہ یہ تصور کہ پیدائش کے اعتبار سے جس مذہب والوں کے ہاں ہم پیدا ہو جائیں، اس کی نسبت سے ہمیں اجر مل جائے گا، قرآن اس تصور کو یہاں کاٹ کر رکھ دیتا ہے۔ یہ جو Incidence of Birth (پیدائش کا واقعہ) ہے، یہ کوئی شے نہیں ہے، اس میں بچے کو کوئی اختیار ہی نہیں ہوتا۔ اس چیز کو نجات و سعادت کا معیار قرار دینا کیا ہی لغو بات ہے!! کسی گھر میں کوئی پیدا ہوا اور جیسا میں نے عرض کیا ہے، وہ یہودی ہو، وہ نصرانی ہو یا وہ صابی ہو اور دوسری جگہ سورۃ مائدہ میں بھی یہ آیت آئی ہے، وہ تو ایک طرف رہے، وہ تو ان الذین اٰمنوا سے بھی یہ کہتا ہے کہ مسلمان کے گھر میں پیدا ہو جانے والا بھی، اپنے ذہن میں کبھی یہ تصور نہ لے آئے کہ ہم مسلمان ہیں اس لیے ہماری نجات تو ہوگی کسی اور کی نہیں ہوگی۔ یہاں یہ سوال ہی نہیں ہے۔ کسے باشد، کوئی بھی ہو، کسی کے گھر میں پیدا ہوا، اس کے لیے ہی کیا، یہاں تو ہر شخص کے لیے اپنے طور پہ ان صداقتوں پر ایمان لانا ہے۔ کیا ایمان لانا ہے؟ یہ کہ اس فارمولے کو صحیح سمجھنا ہے۔ یہ ہے ایمان، عمل تو آگے شروع ہوتا ہے۔ اگر فارمولے کو کوئی صحیح نہیں سمجھتا تو اس کو وہاں لیبارٹری میں جا کر ٹیسٹ ہی نہیں کرتا، اس کو کہتا ہے کہ تمہاری مت ماری ہوئی ہے، میں اپنا وقت کیوں ضائع کروں۔ ایمان اسے کہتے ہیں۔

مسلمان ہونے کے لیے کتاب پر ایمان بنیادی شرط ہے

برادرانِ عزیز! یہ ایمان تو کسی فارمولے کی صداقت پر یقین رکھنا ہے۔ اور عملِ صالح اس فارمولے کو لیبارٹری لے جا کر ٹیسٹ کرنا ہوتا ہے۔ یہ چیز ہر انسان کے لیے ہے، یہ ایک کھلی بات ہے۔ اب میرے سامنے یہ بات آئی کہ کیا یہ ایمان صرف اللہ اور آخرت پر ہے؟ اس میں سے آپ دیکھتے ہیں کہ وہ جو رسول پہ اور کتاب پہ ایمان کی بات تھی، وہ کہاں گئی۔ تو اصل چیز تو الکتاب ہے۔ اصل میں خدا اور بندے کا تعلق، عزیزانِ من! اس وحی کی رو سے ہوتا ہے جو خدا انسانوں کی ہدایت کے لیے بھیجتا ہے اور اس کے سوا کوئی اور تعلق نہیں ہوتا۔ اصل الکتاب ہے، یہ باقی جتنا قصہ ہے وہ خدا کی طرف سے ضابطہ کا ملنا ہے۔ پہلی چیز یہ ہے کہ وہ کسی انسان کا بنایا ہوا نہیں ہوسکتا۔ کسی انسان کا بنایا ہوا غیر متبدل نہیں ہوسکتا خواہ وہ افلاطون (BC 384-322 BC) کے سے دماغ کا کیوں نہ بنایا ہوا ہو، خواہ آئن سٹائن

(1879-1955ء) سا بھی سائنسدان کیوں نہ ہو۔ تھوڑے سے عرصے کے بعد آپ دیکھیں گے ہر انسانی خیال میں تبدیلی پیدا ہوتی ہے۔ صرف خدا کی طرف سے ملی ہوئی جو وحی ہے' وہی غیر متبدل ہو سکتی ہے۔ اس پہ میں پھر کبھی بات کرونگا۔

اللہ پہ ایمان کے یہ معنی ہیں اور جسے میں نے آخرت کہا ہے اس پہ ایمان کے معنی یہ ہیں کہ یہ محض اعتقادی شے نہیں ہے' یہ زندگی کے فارمولے ہیں جن کے نتائج مرتب ہونے ہیں۔ اب یہ دیکھیے کہ کیا قرآن کی رو سے ایمان یہی ہے یا وہ الکتاب کے اوپر بھی ایمان کے لیے زور دیتا ہے؟ اصل چیز تو وہ الکتاب ہے۔ رسول بھی اپنے وقت میں آ کر کتاب دے کر' دین کو متشکل کر کے چلا جاتا ہے۔ خدا کی ذات ہمارے قیاس اور گمان اور خیال میں بھی نہیں آ سکتی' اس سے ہمارا تعلق کس کی رو سے ہے؟ خدا کے ساتھ ہمارا تعلق اس کتاب کی رو سے باقی رہتا ہے' جو ہمارے پاس ہوتی ہے' اس لیے اسے کلام اللہ کہا گیا ہے۔ جب ہم صبح کو قرآن پڑھتے ہیں تو خدا ہم سے ہم کلام ہو رہا ہوتا ہے۔ اور اس میں وہ غیر متبدل فارمولے دیئے ہوئے ہیں' اس پر جب عمل کرتے ہیں' نتائج سامنے آتے ہیں تو یہ آخرت پر ایمان ہوتا ہے۔

قرآن حکیم کے مطابق ایمان کے صرف پانچ اجزا ہیں

قرآنِ کریم کی رو سے ایمان کے اجزا پانچ چیزیں ہیں: وَ لٰکِنَّ الۡبِرَّ مَنۡ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَ الۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَ الۡمَلٰٓئِکَۃِ وَ الۡکِتٰبِ وَ النَّبِیّٖنَ (2:177)۔ سارے قرآن میں ایمان کے یہی پانچ اجزا ہیں: اللہ پر ایمان' ملائکہ پر ایمان' رسولوں پر ایمان' کتابوں پر ایمان' آخرت پر ایمان۔ ان میں کتابیں اور آخرت موجود ہے۔ ایمان کے یہ جو اجزا ہیں' ان کے متعلق بھی میں پھر کبھی تفصیل سے عرض کرونگا کہ یہ اس فارمولے کے اجزائے لاینفک کیسے بنتے ہیں؟ اس وقت میں صرف یہ بتاوں گا کہ یہ نہیں ہے جو اس آیت (2:62) میں کہہ دیا گیا کہ اللہ اور آخرت پہ ایمان کافی ہو گیا۔ قرآن ایمان یہ کہتا ہے اور دوسری جگہ کہا ہے کہ وَ مَنۡ یَّکۡفُرۡ بِاللّٰہِ (4:136) جو کفر باللہ کرتا ہے۔ ان پانچ چیزوں کو ماننے سے ایمان ہے۔ کہا ہے کہ وَ مَنۡ یَّکۡفُرۡ بِاللّٰہِ وَ مَلٰٓئِکَتِہٖ وَ کُتُبِہٖ وَ رُسُلِہٖ وَ الۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ فَقَدۡ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِیۡدًا (4:136) یہ پانچوں اجزائے ایمان ہیں۔ ان میں سے کسی ایک سے بھی انکار کیا تو کفر ہوا' یہ پورے مانے تو ایمان ہوا۔

قرآن حکیم کو سمجھنے کا طریق ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہیے

قرآن کا انداز یہ ہے کہ وہ کہیں تو تفصیل سے بات بیان کرتا ہے' کہیں اجمالاً اس کا ذکر کرتا ہے۔ یہ سارے قرآن کا انداز ہے اور اسی لیے اس نے کہا ہے کہ میرے سمجھنے کا طریقہ یہ ہے کہ کسی ایک مقام پہ ایک آیت کو لے کر نہ بیٹھ جاؤ' یہ دیکھو کہ میں نے دیگر مقامات میں اس کی تفصیل کیا دی ہے۔ یہ پانچ میں نے آپ کے سامنے گنا دیئے۔ اب یہ دیکھیے کہ وہ ان کا کہیں اجمالاً ذکر کرتا ہے۔ ایک جگہ صرف خدا کا ذکر ہے کہ اِنَّ الَّذِیۡنَ قَالُوۡا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسۡتَقَامُوۡا تَتَنَزَّلُ عَلَیۡہِمُ الۡمَلٰٓئِکَۃُ (41:30) جنہوں نے کہہ دیا کہ ہمارا

رب اللہ ہے اور پھر اس پر جم کر کھڑے ہو گئے' ان پہ فرشتے نازل ہونے شروع ہو جاتے ہیں۔ صرف اتنی سی چیز کہ ''ہمارا رب اللہ ہے'' کہی ہے۔ اور اگر اس پہ کوئی کہہ دے کہ صاحب! قرآن تو صرف خدا پر ایمان کا تقاضا کرتا ہے' دیکھیے یہاں صرف اللہ کا ذکر ہے' تو وہ غلط کہتا ہے۔ قرآن کے ان مقامات کو بھی دیکھیے جہاں اللہ اور آخرت کا ذکر ہے' یہی جو آیت (2:62) ہمارے سامنے ہے کہ **مَنۡ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَ عَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمۡ اَجۡرُهُمۡ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ** (2:62)۔ یہ جو آیت ہے اس میں اللہ اور آخرت کا ذکر ہے۔ ایک مقام پہ یہ ہے کہ **فَاٰمِنُوۡا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ** (3:178) اللہ پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ۔ ایک جگہ یہ ہے کہ **فَاٰمِنُوۡا بِاللّٰهِ وَرَسُوۡلِهٖ وَالنُّوۡرِ الَّذِىۡۤ اَنۡزَلۡنَا** (64:8) اللہ پر ایمان لاؤ' اس کے رسول پر ایمان لاؤ' اور اس نور پر' اس کتاب پر ایمان لاؤ جو اس نے نازل کی۔ یہاں تین ہی ٹکڑے آئے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ قرآنِ کریم پانچ اجزائے ایمان گنتا ہے اور پھر مختلف مقامات پر کہیں ان میں سے ایک کا ذکر کر دیتا ہے۔ وہاں ان کا ذکر کیوں ہے جب یہ آیات آئیں گی تو میں عرض کرونگا کہ وہ یونہی نہیں کہ (معاذ اللہ) ''چلو پنج نئیں سی اکوای لکھ دیا' ہور کوئی گل نئیں ہیگی ❶'' یا وہ شاعری میں فٹ نہیں بیٹھتا ''ستا پیندا اے شعر''۔ یہ بات نہیں ہے۔ وہ آیات آئیں گی تو میں عرض کرونگا۔ اس نے اگر کسی ایک مقام پہ' کسی ایک چیز کو خاص طور پہ زور دینا ہوتا ہے وہاں وہ صرف اسی چیز کا ذکر کرتا ہے۔ بہر حال اب ان میں سے یہ کہنا کہ صاحب! اس آیت میں دیکھیے کہ اللہ اور آخرت پر ہی ذکر ہے' قرآن پر ایمان کا ذکر نہیں' رسول اللہ ﷺ پر ایمان کا ذکر نہیں ہے' یہ قرآن سے بیگانگی کی دلیل ہے' یا فریب دہی ہے یا فریبِ نفس ہے یا جہالت ہے۔ قرآن ان تمام چیزوں کے اوپر ایمان لانے کو کہتا ہے اور جیسا میں نے ابھی عرض کیا' وہ تو مسلمان کے گھر میں پیدا ہونے والے کو بھی کہتا ہے کہ ایمان لاؤ۔ اگر ایک شخص مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہو' وہ یہ پانچ چیزیں مانتا ہے' ان سے کہنا کہ نہیں صاحب! دو ہی پہ ایمان لاؤ' اللہ اور آخرت پہ' یہ باقی تین چھوڑ دو جو پہلے مانتے چلے آ رہے ہو' تو یہ مذاق ہے۔

ایمان اور کفر میں حدِ امتیاز خدا کی طرف سے نازل کردہ کتاب کے مطابق فیصلے کرنا ہے

خدا پر ایمان کے معنی تو اس نے واضح کر دیئے۔ یہ بات کیا ہے؟ کہا ہے کہ **اِتَّبِعُوۡا مَاۤ اُنۡزِلَ اِلَيۡكُمۡ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ وَ لَا تَتَّبِعُوۡا مِنۡ دُوۡنِهٖۤ اَوۡلِيَآءَ ‌ؕ قَلِيۡلًا مَّا تَذَكَّرُوۡنَ** (7:3) جو تمہارے رب کی طرف سے نازل ہوا ہے' صرف اس کا اتباع کرو' اس کے علاوہ کسی اور چیز کا اتباع نہ کرو۔ یہ ہوا خدا پر ایمان۔ اور ایمان اور کفر کے اندر تمیز یہ کی کہ **وَ مَنۡ لَّمۡ يَحۡكُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓـئِكَ هُمُ الۡكٰفِرُوۡنَ** (5:44) جو خدا کی طرف سے نازل کردہ کتاب کے فیصلے نہیں کرتا' یہی لوگ تو ہیں جنہیں کافر کہا جاتا ہے۔ یہ تو کفر اور ایمان کا

---

❶ پانچ نہیں تو ایک ہی لکھ دیا سہی۔ اور کوئی بات نہیں ہے۔

فیصلہ یہاں ایک چیز پہ ہو رہا ہے۔ میں نے کہا ہے کہ بنیادی کتاب ہے۔ اب یہاں بِمَآ اَنۡزَلَ اللّٰہُ (5:44) کہا ہے کہ جو اللہ نے نازل کیا ہے۔ تو ہوسکتا ہے وہ کہیں کہ ٹھیک ہے صاحب! تورات پہ ایمان لے آیئے' انجیل پہ لایئے اللہ ہی نے نازل کیا تھا لیکن برادرانِ عزیز! وہ قرآن ہے' ابوالکلام آزادؒ (1888.1958ء) نہیں ہے۔ وہ کہتا ہے کہ بِمَآ اَنۡزَلَ اللّٰہُ (5:44)۔ اب اس کے معنی کیا ہیں؟ یہ کہ بِمَآ نُزِّلَ عَلٰی مُحَمَّدٍ (47:2)۔ ان تصریحات کے بعد کوئی غیر مسلم بات کرتا ہے تو اس سے ہم دوسرے انداز سے بات کرتے' اس کے لیے یہ سند نہ ہوتا' ہم اس سے دوسرے انداز سے بات کرتے اور جس کو وہ دعوے میں پیش کرتا ہم اس کی تردید کرتے۔ ایک مسلمان قرآن کو ماننے والا ہے وہ یہ بات کہے کہ صاحب! اپنے اپنے مذہب کی تمہارے ہاں جو بھی تعلیم ہے' اس کے اوپر تم عمل پیرا ہو جاؤ' تمہیں ضرورت ہی نہیں ہے کہ اللہ اور آخرت پر ایمان لے آؤ اور اپنے ہاں وہ ڈنڈوت اور پرستش کرلو' بس ٹھیک ہے نجات وسعادت ہے۔ وہ ان آیتوں کو کہاں لے جائے گا یہ بِمَآ نُزِّلَ عَلٰی مُحَمَّدٍ (47:2) کو کہاں لے جائے گا۔ اس آیت کو وہ کہاں لے جائے گا کہ جو اللہ کے نازل کردہ کے مطابق فیصلے نہیں کرتا اسے کافر کہتے ہیں۔

مملکت کے ہر شہری کے لیے ضروری ہوگا کہ وہ مملکت کے قانون کو پیش نظر رکھے

یہ کیوں ہے؟ برادرانِ عزیز! معاف رکھیے گا تھوڑا سا وقت ہے شاید میں اسے آگے لے لوں۔ وہ اس لیے کہ میں نے عرض کیا ہے کہ دین نظامِ زندگی ہے' ضابطۂ حیات ہے' یہ ایک مملکت کا Constitution (آئین) ہے۔ کسی مملکت کے Constitution (آئین) سے آپ انکار کر دیجیے' پھر دیکھیے کہ کیا ہوتا ہے۔ اب میں یہاں اگلے حصے عَمِلَ صَالِحًا (2:62) پہ آ گیا۔ میں کہہ یہ رہا تھا کہ پاکستان کے Constitution (آئین) سے انکار کیجیے کہہ دیجیے' کہ میں اسے نہیں مانتا' اس کے خلاف سرکشی کیجیے' یہ کہیے کہ یہ غلط ہے اور یہاں نہایت پرامن شہری بن کر رہیے۔ کیا آپ کو پتہ ہے کہ پھر سزا کیا ہوگی؟ یہ ملک سے بغاوت ہے' یہ جرمِ بغاوت ہے۔ اس مملکت میں رہنا ہے تو اس کے Constitution (آئین) کو ماننا پڑے گا' جس چیز کو وہ Lawful (قانونی) کہتا ہے' اس کو Lawful (قانونی) ماننا ہوگا' جسے وہ Illegal (غیر قانونی) کہتا ہے اسے Illegal (غیر قانونی) ماننا پڑے گا۔ اگر یہ نہیں ماننا چاہتے' تو اس ملک کو چھوڑ دو۔ اس کی اس نے اجازت دی ہے کہ جس کا جی چاہے' اس کو مانے جس کا جی چاہے' نہ مانے۔ یہاں تو ایک Territory (علاقہ) کے اندر یہ چیز ہے' مملکت کے اندر رہتے ہوئے' Constitution (آئین) کو ماننا ہوتا ہے۔

غیر مسلموں کیلیے حکومتِ وقت کا فریضہ اور اُن کے حقوق کا تعین

قرآن اس کی اجازت دیتا ہے کہ اسلامی مملکت میں رہتے ہوئے بھی اگر کوئی قرآن کو اپنا ضابطۂ زندگی نہیں ماننا چاہتا تو کہتا ہے کہ تم

دوسرا مذہب اختیار کرلو تم پہ کوئی سزا نہیں ہے۔ پھر تمہیں ہم غیر مسلم کی طرح سے Treat (برتاؤ) کریں گے۔ اسلامی مملکت میں غیر مسلم بھی انسانی حیثیت سے رہ سکتے ہیں' اس کی اجازت ہے لیکن اگر ایک شخص Citizen of Pakistan (پاکستان کے شہری) کے طور پر اس مملکت میں رہتا ہے مگر Constitution (آئین) کی Opposition (مخالفت) کرتا ہے' اس کے خلاف جذباتِ نفرت پھیلاتا ہے' سرکشی برتتا ہے' تو اس کو گرفتار کرلیا جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ صاحب! میں نے تمام قوانین کی پابندی کی ہے' میں تو بڑا پرامن شہری ہوں' یہ ہوئی نیک عملی کہ جی! میں تو Keep to the Left (بائیں طرف چلو) بھی کرتا ہوں۔ تو یہ جو اس کے نیک عمل ہیں' یہ اس جرم کے مقابلے میں کوئی وزن رکھیں گے؟ یہ تو بنیادی چیز ہے۔ یہ نظامِ زندگی کا ضابطۂ حیات ہے جسے آپ الکتاب کہتے ہیں۔ اور یہی چیز ہے' برادرانِ عزیز! جو قرآنِ کریم نے کہی' جسے تم عملِ صالح کہتے ہو۔

اب ہمارے سامنے وہ چیزیں آ گئیں۔ وہی چیز کہ میں تو صاحب! Keep to the left (بائیں طرف چلو) کرتا تھا' کہا ہے کہ لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ (2:177) یہ نیکی کا کام نہیں ہے کہ تم اپنا منہ مشرق کی طرف کرتے ہو یا مغرب کی طرف۔ یاد رکھیے! قانون کا جہاں اتباع آئے گا' یہ بھی ضروری چیز ہو جائے گی' اس مملکت کے اندر Keep to the left (بائیں طرف چلو) بھی بڑا ضروری ہے' وہ اگر آپ نہیں کریں گے تو وہ ایک جرم ہو جائے گا۔ یہ معنی نہیں کہ اس سے کچھ مقصد ہی نہیں ہے۔ وہ کہتا یہ ہے کہ Constitution (آئین) کی Opposition (مخالفت) کرنے والا اگر یہ کہے کہ صاحب! میں تو ہمیشہ Keep to the left (بائیں طرف چلو) کا اصول مانتا چلا آتا ہوں' اس لیے میرے خلاف یہ جرم کیوں عائد کیا جاتا ہے تو اس سے یہ کہا جاتا ہے کہ وہ اس کے مقابلے میں کوئی شے ہی نہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَ لٰكِنَّ الْبِرَّ (2:177)۔ نیکی کس کی ہے؟ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ الْمَلٰٓئِكَةِ وَ الْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ (2:177) اس پہ تو ایمان ہے یہ جو اس مملکت کی پوری Constitution (آئین) ہے' اس کے اوپر ایمان ہو اور آگے عملِ صالح ہو تو اس کے لیے آپ سن لیجیے یہ ہے کہ وَ اٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى الْقُرْبٰى وَ الْيَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِيْنَ وَ ابْنَ السَّبِيْلِ وَ السَّآئِلِيْنَ وَ فِى الرِّقَابِ (2:177) اور وہ اپنا مال ان کے لیے صرف کرنا شروع کرے۔

قرآن حکیم کے نزدیک نیکی کے عمل کی وضاحت

دیکھا کہ نیکی کیا ہے؟ یہ کہ ان محتاجوں کے لیے' مسکینوں کے لیے' وہ جن کی گردنیں کسی کی غلامی کی زنجیر میں ہیں' ان سے چھڑانے کے لیے ہے۔ان کے لیے یہ اپنا مال خرچ کرے۔اور **وَ اَقَامَ الصَّلٰوۃَ وَ اٰتَی الزَّکٰوۃَ وَ الْمُوْفُوْنَ بِعَھْدِھِمْ اِذَا عٰھَدُوْا** ج (2:177) اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کرے' اپنے عہدوں کو پورا کرے' وعدوں کو پورا کرے' **وَ الصّٰبِرِیْنَ فِی الْبَاْسَآءِ وَ الضَّرَّآءِ وَ حِیْنَ الْبَاْسِ** (2:177) جب دشمنوں کی طرف سے کوئی حملے ہوں' اس مملکت کے اوپر کہیں آفت آئے' ہر مصیبت کو مردانہ وار جھیلے' استقامت سے وہاں جیے' ان کا مقابلہ کرے تو **اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا** (2:177) یہ لوگ ہیں جو دعوائے ایمان میں سچے ہیں۔ **وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُتَّقُوْنَ** (2:177) یہ ہیں جنہیں متقی کہا جا سکتا ہے۔محض یہ اتنی سی چیز نہیں ہے کہ صاحب! میں نے اپنا منہ مشرق کو کر لیا یا مغرب کو کر لیا تو دین اسلام کا مقصد پورا ہو گیا۔

برادرانِ عزیز! کئی آیتیں قرآنِ کریم میں اس قسم کی ہیں۔دوسری آیت سورۃ التوبۃ کی ہے کہ **اَجَعَلْتُمْ سِقَایَۃَ الْحَآجِّ وَ عِمَارَۃَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ** (9:19) کیا تم نے یہ کہ میں نے حاجیوں کے لیے سبیلیں لگا دی تھیں اور کعبے میں' میں نے فانوس ٹانگ دیئے اور قالینیں بچھا دیں اور میں نے یہ یہ چیزیں کر دیں۔کہا ہے کہ **کَمَنْ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ** (9:19) کیا یہ اس کے برابر ہو جائے گا کہ جو دین کے ان بنیادی اصولوں کی صداقت پر یقین رکھتا ہے؟ **وَ جٰھَدَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ** (9:19) اور پھر اس کی راہ کے اندر جہاد کرتا ہے' مسلسل جدوجہد کرتا ہے۔کیا تم ان دونوں کو یکساں سمجھ رہے ہو؟ **لَا یَسْتَوٗنَ عِنْدَ اللّٰہِ** (9:19) تمہاری خود فریبیاں تمہیں کسی نتیجے پہ کیوں نہ پہنچا ئیں' خدا کے نزدیک تو یہ دونوں یکساں نہیں ہو سکتے۔ **وَ اللّٰہُ لَا یَھْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ** (9:19) ظالم ہیں وہ جو ایسا سمجھتے ہیں کہ سبیلیں لگا لگا کر' مسجدوں کی آرائش کر کے' ہم ان کے برابر ہو جائیں گے جو جان اور مال سے اس کے راستے کے اندر مسلسل پیہم تگ و تاز کرتے رہتے ہیں۔تم اپنے آپ کو تو فریب دے سکتے ہو' خدا کو فریب نہیں دے سکتے۔کہا ہے کہ یہ بھی ظلم ہے۔ دیکھیے یہاں پہ ظلم کہاں آیا ہے؟ یہ Wrong Notion of Morality (اخلاق کا غلط تصور) ظلم ہے۔یہاں فریب دہی نہیں ہے' یہاں کسی کے اوپر استبداد اور ظلم نہیں ہو رہا۔او بھئی! حاجیوں کے پانی پینے کے لیے سبیلیں لگائی ہیں' مسجد میں آرائش کا سامان کیا ہے یعنی اس کو اچھا ہی کام کہا جائے گا۔قرآن کہتا ہے کہ یہ ظالمین ہیں جو یوں سمجھتے ہیں کہ یہ بات اُس کے لیے برابر ہو گئی۔

یہ ہے عملِ صالح' برادرانِ عزیز! وہ ہے ایمان۔اب بات ٹھیک ہو گئی کہ یوں جو ایمان اور یہ جو اعمالِ صالحہ ہیں' ان سے وہ الدین

قائم ہوتا ہے جس میں نوعِ انسانی کی نجات مضمر ہے۔ یاد رکھیے! یہ وہاں جا کر فرد کی نجات کا تصور نہیں ہے' یہ تو نوعِ انسانی کی فوز و فلاح ہے اور یہ اس کے اوپر مضمر ہے۔

بغاوت کے سلسلہ میں قرآن حکیم کی وضاحت اور نیکی کا معیار

قرآن نے تو' برادرانِ عزیز! مملکت کے آئین کی مخالفت کرنے کو' اس کے خلاف سرکشی کرنے کو' بغاوت کا جرم کہا ہے' معاف رکھیے گا' میں آج پانچ سات منٹ زیادہ لے لوں گا' بات اہم ہے' دو ایک چیزیں باقی رہ گئی ہیں' میں اگر انہیں اگلے درس پہ اٹھا رکھونگا تو پھر یہ بات مکمل نہیں پہنچے گی۔ قرآن کی تو کیفیت یہ ہے کہ جو شخص بنیادی طور پر مملکت کے Constitituion (آئین) کو مانتا ہی نہیں ہے' وہ کہتا ہے کہ وہ عدالت میں جا کر جنہیں تم اپنی یہ چھوٹی چھوٹی نیکیاں کہتے ہو' اگر وہ ان کو گنا تا رہتا ہے' تو وہ عدالت ان کے ریکارڈ کرنے سے بھی اسے کوئی فائدہ نہیں دے سکتی۔ یہ اس کے جرمِ بغاوت کے مقابلے میں کچھ نہیں۔ ایک خود ہی دیکھ لیجئے' کہ اگر وہ یہ کہے کہ میں تو کبھی بھی ٹریفک کے جرم میں محصور نہیں ہوا' یہ کہے کہ میں نے کبھی کسی کی جیب نہیں کاٹی' اور یہ اسی طرح کی اچھی باتیں کہتا چلا جائے کہ میں نے کبھی چوری نہیں کی' میں نے کبھی ڈاکا نہیں ڈالا' سب چیزیں ٹھیک ہیں لیکن یہ جو مملکت کا آئین ہے' اس کے خلاف سرکشی کرتے ہو تو جرم بغاوت کی سزا ملے گی۔ کہا ہے کہ **اَفَحَسِبَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡۤا اَنۡ یَّتَّخِذُوۡا عِبَادِیۡ مِنۡ دُوۡنِیۡۤ اَوۡلِیَآءَ ؕ اِنَّاۤ اَعۡتَدۡنَا جَہَنَّمَ لِلۡکٰفِرِیۡنَ نُزُلًا** (18:102) وہ جو ہمارے سوا اور انسانوں کو بھی اپنا رفیق سمجھتے ہیں' کیا وہ سمجھتے ہیں کہ ہم بڑے نیک کام کرتے ہیں؟ جرم دیکھیے' عزیزانِ من! **قُلۡ ہَلۡ نُنَبِّئُکُمۡ بِالۡاَخۡسَرِیۡنَ اَعۡمَالًا** (18:103) نیک کام کرنا تو ایک طرف' کہا ہے کہ آؤ ہم تمہیں بتائیں کہ سب سے زیادہ تباہی میں وہ ہیں جن کے اعمال انہیں سب سے زیادہ نقصان پہنچا رہے ہیں۔ ایک تو بدعملی ہے' ایک بے عملی ہے' انہوں نے کچھ کیا ہی نہیں۔ یہاں کہا ہے کہ جن کے اعمال ان کو بہت سا نقصان پہنچا رہے ہیں۔ آپ غور فرمایئے! **اَلَّذِیۡنَ ضَلَّ سَعۡیُہُمۡ فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا وَ ہُمۡ یَحۡسَبُوۡنَ اَنَّہُمۡ یُحۡسِنُوۡنَ صُنۡعًا** (18:104) تصورِ زندگی یہ رکھتے ہیں کہ زندگی یہی طبعی زندگی ہے' کھایا پیا مر گئے' جس انداز سے بھی چاہا کسی سے لیا' جس انداز سے چاہا خرچ کیا اور **اَنَّہُمۡ یُحۡسِنُوۡنَ صُنۡعًا** (18:104) اور اپنے ذہن میں یہ سمجھتے ہیں کہ ہم بہت نیک کام کر رہے ہیں۔ یہ ان ڈاکوؤں اور چوروں کا ذکر نہیں ہو رہا' یہ بزعمِ خویش سمجھ رہے ہیں کہ بڑے نیک کام کر رہے ہیں۔ کہا ہے کہ **اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا بِاٰیٰتِ رَبِّہِمۡ وَ لِقَآئِہٖ** (18:105) یہ وہ لوگ ہیں جو اس آئین' دستور (Constitution) سے انکار کر رہے ہیں' وایتہ اس کے قوانین سے انکار کر رہے ہیں' ولقآئہ اس بات سے انکار کر رہے ہیں کہ

ہم نے ایک دن اس کے سامنے جا کر اس کو حساب دینا ہے' We are Responsible to Such and Such' (ہم فلاں اور فلاں کے آگے ذمہ دار ہیں)۔ یہ ہے اس کا ترجمہ' یہ ان سے انکار کرتے ہیں۔ سنیئے! کہا ہے کہ **فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ** (18:105) ان کے جو اعمال ہیں' یہ سارے بے نتیجہ رہ گئے' رائیگاں چلے گئے' انہیں مملکت کے خلاف بغاوت کے جرم میں کچھ فائدہ نہیں دے سکتے۔ **فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا** (18:105) ان کے لیے تو میزان بھی کھڑی کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی حالانکہ وہاں میزان کے متعلق کہا ہے [1]۔ (وہ اپنی بے مائیگی کی شہادت آپ ہوں گے۔)

(عزیزانِ من! اگر میں اس تمام تفصیل کو Sum up کروں تو اس زیرِ درس آیت (2:62) کا مفہوم یہ ہوگا کہ اے قوم بنی اسرائیل! یہ تو تمہاری روش رہی ہے' اور اس کے باوجود تمہارا عقیدہ یہ ہے کہ تم خدا کی چہیتی اولاد ہو (5:18) اور جنت تمہاری نسل کے لیے مخصوص ہے (2:111)۔ سنو! یہ تمہاری خام خیالی ہے۔ جنت کسی نسل کے لیے مخصوص نہیں۔ ہمارا قانون یہ ہے کہ یہودی ہوں یا نصرانی' صابی ہوں یا وہ لوگ جو بغیر رسمی گروہ میں داخل ہوئے ویسے ہی خدا کو مانتے ہیں یا خود مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہونے والے ہیں' غرضیکہ کوئی بھی ہو' جو بھی خدا کے اقتدارِ اعلیٰ' زندگی کے تسلسل اور اُس کے قانونِ مکافات پر اُس طرح ایمان رکھے' جس طرح اس قرآن میں بتایا گیا ہے (2:137)' اور اس کے دیئے ہوئے پروگرام کے مطابق صلاحیت بخش کام کرے' تو اُن کے نشوونما دینے والے کے قانونِ مکافات کے مطابق' اُن کا اجر ملے گا' جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ نہ کسی قسم کا خوف اُن کے دامن گیر ہوگا۔ نہ حزن وجۂ افسردگی بنے گا۔

عزیزانِ من! آج ہم سورۃ البقرۃ کی ایک ہی آیت (2:62) لے سکے۔ 63 ویں آیت سے ہم آئندہ لیں گے)۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ط

❀......❀......❀

---

[1] نوٹ: ریکارڈنگ یہیں تک ہے۔ اس سے آگے ٹیپ خالی ہے۔

قرآن حکیم کے طالب علموں کے خوشخبری

علامہ غلام احمد پرویزؒ کے سات سو سے زائد دروسِ قرآنی پر مبنی تفسیری سلسلہ کے تحت بزمِ طلوعِ اسلام لاہور کی طرف سے مندرجہ ذیل تفسیری کتب کی اشاعت الگ الگ جلدوں میں ہو چکی ہے۔ یہ جلدیں بڑے سائز کے بہترین کاغذ پر خوبصورت طباعت اور مضبوط جلد بندی کے ساتھ خصوصی رعایتی ہدیوں پر دستیاب ہیں۔ جن کی تفصیل درج ذیل ہے

نام کتاب	صفحات	نام کتاب	صفحات
سورۃ الفاتحہ (سٹوڈنٹ/اعلیٰ)	240	سورۃ الفرقان	389
سورۃ بقرہ مکمل تین جلدوں میں	1600	سورۃ الشعراء	453
سورۃ النحل	334	سورۃ النمل	280
سورۃ بنی اسرائیل	396	سورۃ قصص	334
سورۃ الکہف و مریم	511	سورۃ العنکبوت	387
سورۃ طٰہٰ	416	سورۃ روم، لقمان، السجدہ	444
سورۃ الانبیاء	336	سورۃ الاحزاب، سبا، فاطر	569
سورۃ الحج	380	سورۃ یٰسٓ	151
سورۃ المومنون	408	29واں پارہ (مکمل)	541
سورۃ النور	263	30واں پارہ (مکمل)	624

مجھے اپنے فہمِ قرآن کے متعلق کبھی یہ دعویٰ نہیں ہوسکتا کہ وہ سہو وخطا سے منزہ ہے۔ یہ قرآن فہمی کی ایک انسانی کوشش ہے اور ہر انسانی کوشش کی طرح اس میں غلطیوں کا امکان ہے۔ لہٰذا! میری تحریر میں جو کچھ آپ کو صحیح نظر آئے وہ نورِ قرآنی کا تصدق ہے اور جہاں کہیں سہو وخطا دکھائی دے وہ میرے ذہن کی نارسائی۔

(پرویز۔ معراجِ انسانیت)